سوانحِ معاویہؓ

یعنی امیر المؤمنین حضرت معاویہؓ کی تفصیلی و تحقیقی سوانح عمری

رسول اکرمؐ کے ساتھ ان کی خصوصی رفاقت، نظامِ خلافت راشدہ کے اہم رکن کے بطور ان کی جلیل القدر خدمات، اور پھر بطور خلیفہ ان کے عظیم دینی، جہادی، سیاسی اور تمدنی کارناموں نیز ان کے بلند علمی مقام، اعلیٰ دینی و اخلاقی صفات و کمالات کا تذکرہ، سیدنا علیؓ کے ساتھ ان کے اختلاف کی نوعیت کی تحقیق و اعتدال کے ساتھ تفصیل، ایک مستند دستاویز، جس میں صحیح روایات کو معیار بنا کر، محدثین کے اصول پر، تاریخی روایات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

مولانا یحییٰ نعمانی

سوانح معاویہؓ

یعنی امیرالمؤمنین حضرت معاویہؓ کی تفصیلی و تحقیقی سوانح عمری

رسول اکرمؐ کے ساتھ ان کی خصوصی رفاقت، نظامِ خلافت راشدہ کے اہم رکن کے بطور ان کی جلیل القدر خدمات، اور پھر بطور خلیفہ ان کے عظیم دینی، جہادی، سیاسی اور تمدنی کارناموں نیز ان کے بلند علمی مقام، اعلیٰ دینی واخلاقی صفات وکمالات کا تذکرہ، سیدنا علیؓ کے ساتھ ان کے اختلاف کی نوعیت کی تحقیق واعتدال کے ساتھ تفصیل، ایک مستند دستاویز، جس میں صحیح روایات کو معیار بنا کر، محدثین کے اصول پر، تاریخی روایات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

مولانا یحییٰ نعمانی

اشاعت اول .... فروری ۲۰۲۵ء شعبان المعظم ۱۴۴۶ھ

نام کتاب .... سوانح معاویہؓ

نام مصنف .... مولانا یحییٰ نعمانی

کمپوزنگ .... عبدالقدوس ندوی، موبائل نمبر 8853532162

صفحات ۵۰۲

تعداد ....

ناشر ....

طباعت ....

قیمت ....

فہرست مضامین

دوسرا باب

تیسرا باب

چوتھا باب

دسواں باب

رومن امپائر سے جہاد اور فتوحات ۲۳۴

گیارہواں باب

بیزنطینی افریقہ کی فتوحات ۲۵۴

مقدمہ

امیر المؤمنین حضرت معاویہؓ کی سوانح اسلامی تاریخ کی ایک اہم کڑی ہے۔حضرت معاویہؓ،ان کا کردار اوران کا عہد اس لیے اور بھی زیادہ اہم ہے کہ یہ دور (بحیثیت ایک پیغام بر اور صاحب کتاب جماعت) امت مسلمہ کی تاسیس اور اس کے افکار وتہذیب کی بنیادی تشکیل کا دور ہے۔ یہ ان نسلوں کا دور یا اس کی ایک کڑی تھا جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ''خیر القرون'' کا دور قرار دیا تھا۔خود حضرت معاویہؓ کی اسلام لانے کے بعد ساری زندگی نصرت اسلام وتمکین دین کی جدوجہد میں گزری۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خادم اور کاتب کے فرائض انجام دیے، جہادوغزوات میں شرکت فرمائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد خلافت راشدہ کے دور میں جہاد کی مہمات میں اہم کردار نبھایا،عہد صدیقی میں ہی امارت وقیادت سے سرفراز کیے گئے۔حضرت عمر فاروقؓ کا دور توان کے عروج کا دور تھا،جس میں انہوں نے نظامِ خلافتِ راشدہ کے ایک اہم رکن اور امیر کی حیثیت پائی۔اور پھر لگا تار ان کی اہمیت ومرکزیت میں اضافہ ہوتا رہا۔

حضرت معاویہؓ کی سوانح ان کے تاریخ ساز کارناموں کی وجہ سے بھی اسلامی تاریخ کے ذمہ ایک قرض ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد اسلام کے سامنے سب سے بڑا خطرہ بیزنطینی رومن امپائر تھا۔رومی سلطنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آخری دور میں ہی اسلام اور مسلمانوں کے لیے سب سے بڑے خطرے کے طور پر سامنے آچکی تھی۔ ہر وقت اس کی طرف سے خطرہ لگا رہتا تھا۔مسلمانوں کے دل مدینے کے اندر بھی ہر آن چوکنا اور اندیشناک رہتے تھے۔ یہ اس وقت کی سب سے بڑی فوجی ومعاشی طاقت تھی،عرب کے شمال سے لے کر شام ومغربی افریقہ تک اس کی قلم رو وسیع تھی۔ بحر روم اس کی عسکری جولانیوں کی آماج گاہ تھا۔حضرت معاویہؓ چالیس سال تک رومیوں کے مقابل محاذ پر اسلام کی حفاظت ودفاع فرماتے رہے۔اور جب یہ مجاہد بادشاہ اس دنیا کو خیر باد کہہ کر اپنے رب کے حضور حاضر ہوا؛تو آرمینیہ سے لے کر شام تک،اور شام سے لے کر مصر اور مغربی افریقہ تک کے ممالک مسلمانوں کے تابع

آچکے تھے۔اور عظیم مملکت روم سُکڑ سمٹ کر اپنے پایۂ تخت قسطنطنیہ کی خیر منا رہی تھی۔ یہ آفتاب نصف النہار جیسی روشن حقیقت ہے کہ اس سب سے بڑے دشمن کا مقابلہ اور اس کو پسپا و کمزور کرنے میں سب سے بڑا کردار حضرت معاویہ کا ہی تھا۔ اکیلا یہ کارنامہ اس قابل تھا کہ مسلمان اس کو سدا یاد رکھتے اور ممنون رہتے۔

اس کتاب کی تالیف کے دوران راقم سطور کو اللہ تعالیٰ نے توفیق بخشی کہ حضرت معاویہؓ اور ان کے عہد کا وسیع، گہرا تجزیاتی اور تحقیقی مطالعہ کرے۔ اگرچہ حضرت معاویہ کے سلسلے میں اہل سنت کے موقف میں نہ مجھے کبھی کوئی شبہہ رہا تھا نہ حضرت معاویہؓ کی شخصیت و کردار کے بارے میں کوئی اشتباہ یا خلش۔ لیکن اب یہ کہنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ حضرت معاویہؓ کے صفات و کمالات اور عظیم الشان کارناموں کے بارے میں جو بہتر سے بہتر حسن ظن پہلے قائم تھا۔ اس مطالعہ کے بعد علم ہوا کہ وہ حسن ظن ان کے مقام سے کم تھا۔ ان کمالات اور کارناموں سے صحیح اور کافی واقفیت نہ ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر حضرت معاویہؓ اور ان کے دور حکومت کی کچھ ستائش بھی کی جاتی ہے تو، لہجہ کمزور و لرزیدہ اور انداز اعتماد سے خالی ہوتا ہے۔

سوانح معاویہؓ کی مشکلات:

مگر اللہ کی تقدیر کہ حضرت معاویہؓ کا دور مسلمانوں کے باہمی اختلاف و جنگ کا بھی شکار رہا۔ جس کا آغاز خلیفۂ راشد سیدنا حضرت عثمانؓ کے بدبختانہ قتل سے ہوا اور اختتام حضرت حسن مجتبیٰؓ اور حضرت معاویہؓ کی صلح پر ہوا۔ اس اختلاف و جنگ میں ایک فریق حضرت معاویہؓ بھی تھے، جن کی سیدنا حضرت علیؓ کے ساتھ جنگ ہوئی اور حضرت علیؓ کی پوری مدتِ خلافت محاذ آرائی جاری رہی۔ یہ پانچ سالہ زمانہ خلافت اسلامیہ کا شدید بحرانی دور رہا۔ خانہ جنگی کے نتیجے میں سرحدیں غیر محفوظ ہوئیں اور اطراف مملکت میں بغاوتوں اور انتشار کا دور دورہ رہا۔ مسلمانوں کو صرف عراق و شام اور اندرون عرب میں استحکام حاصل تھا۔ مگر یہ اس بحران کا صرف ایک پہلو تھا۔ اس بحران کا سب سے پر پیچ و خطرناک پہلو یہ تھا کہ اس سیاسی انتشار کے ساتھ امت کے وجود کو کھوکھلا کرنے والے نظریات اور افواہوں کا بازار گرم ہو گیا تھا، دینی و اعتقادی انحراف کا بھی دروازہ کھل گیا تھا اور علاقائی و قبائلی عصبیتوں نے بھی سر ابھار لیا تھا۔ ان حالات نے عام مسلمانوں پر ایک افسردگی و بے یقینی کی کیفیت طاری کر دی تھی۔ ان کی قومی زندگی کا مقصد موہوم اور مستقبل مبہم تھا۔ اس پر پیچ بحرانی دور میں حضرت معاویہؓ نے صرف حکومت و اقتدار کو ہی نہیں سنبھالا، مسلمانوں کے اجتماعی و دینی وجود کو بھی اس طرح منظم کیا کہ مختلف وقتی بحرانوں اور مسائل کے باوجود اس کا شیرازہ سیکڑوں سال مجتمع رہا۔ یہ حضرت معاویہؓ کا ایک اور تاریخ ساز کارنامہ تھا۔

اختلاف و جنگ کے اس بحرانی دور کے سلسلے میں (جیسا کہ آپ کتاب میں کسی قدر تفصیل سے مطالعہ فرمائیں

گے)ایک ضروری بات یہ مدنظر رکھنے کی ہے کہ عہد صحابہ وتابعین میں اس دور کو ’’فتنہ‘‘ کا دور کہا جاتا تھا۔ یہ دور اس لیے بھی فتنہ تھا کہ ان جنگوں اور اختلافات کے پیچھے ایک خفیہ زیرزمین سازش کام کررہی تھی، جس کی ساری مشینری جھوٹی خبروں اور تہمتوں کے ذریعے چلتی تھی۔ اس سازشی تحریک کی پوری پارٹی تھی۔ جس کے مرکز میں عبداللہ بن سبا نامی ایک یہودی شخص تھا۔ اس تحریک کا سب سے بڑا ہتھکنڈہ جھوٹی خبریں اور افواہیں پھیلانا تھا۔ سیدنا عثمان کے خلاف بغاوت اور بالآخران کے دردناک قتل میں سب سے بڑا حصہ ان جھوٹے الزامات اور فتنہ ساماں افواہوں کا تھا۔ صلح حسن ومعاویہ کے ذریعہ اس فتنے کا دروازہ بند کیا گیا تو بھی حضرت معاویہ اور ان کی حکومت کو غیر مستحکم کرنے کے لیے جھوٹی حکایتوں اور تہمتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ جس میں سازشی عناصر کے علاوہ ان نفرتوں کا بھی کردار رہا ہوگا جن کی آگ قدیم عصبیتوں نے جدید کشمکش کے پیدا کردہ جذبات سے مل کر بھڑکائی تھی۔ جلد ہی اس سیاسی اختلاف کے بطن سے رفض وتشیع کے خیالات وافکار پیدا ہوگئے، اور ان کی اساس پر ایک مستقل فرقہ وجود میں آ گیا۔ ان تمام عوامل کے نتیجے میں اس عہد کی تاریخ نویسی پر پیچ راہوں کا ایک مشکلات سے بھرا سفر بن گئی۔

سیدنا علیؓ خود بارہا ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ میرا حال حضرت عیسیٰؑ جیسا ہے، میری ذات کے سلسلے میں بھی دوقسم کے لوگ گمراہ ہوئے ہیں۔ محبت میں غلو کرنے والے اور بغض ونفرت کرنے والے (مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۲۱۳۳، مصنف عبدالرزاق: ۲۰۶۴۷، بسند صحیح)۔ غرض اس غلو اور دیگر مختلف اسباب کے نتیجے میں حضرت معاویہؓ اور ان کے عہد کے سلسلے کی روایات میں ایسے شنیع جھوٹے بیانات کا طومار شامل ہوگیا کہ ہماری پوری تاریخ مسخ ہوکے رہ گئی۔ نہ جانے کیسے کیسے فسانے تیار کیے گئے اور ایسی ناممکن باتیں گھڑی گئیں کہ کوئی معمولی سی سمجھ رکھنے والا بھی ان کو نہ مان سکے۔ علامہ شبلیؒ نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کو بدنام کرنے والوں نے اپنے کذب وافترا میں ’’رنگ آرائی کے لیے سیاہی ہمارے ہی ہاں سے مستعار لی ہے‘‘ (سیرت النبی: ۱/۱۰۳، دارالمصنفین ۲۰۱۹ء)۔ سوانح معاویہ کا بھی یہی حال ہے۔

اس عہد کی تاریخ کا جب مطالعہ کیا جاتا ہے تو متضاد روایات کا ایک وسیع ذخیرہ سامنے آتا ہے۔ ان روایات سے حضرت معاویہؓ کی دو بالکل متضاد تصویریں بنائی جاسکتی ہیں۔ ایک تصویر ایک بلند کردار، عالی ہمت، مخلص مومن، مرد مجاہد اور صاحب تقویٰ شخصیت کی بنتی ہے۔ جو علم وفضل میں اپنے دور میں امامت کا درجہ رکھتا ہے، لوگ اس کو ایک قابل اتباع عالم کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ جس کی حکومت اقامت دین اور نفاذ شرع میں مصروف ہے اور عدل وانصاف قائم کررہی ہے۔ اور بلاشبہ ایک دوسری تصویر بھی بن سکتی ہے، جو ایک بے ضمیر وبے اخلاق، خالص دنیادار، بلکہ خوف خدا سے عاری، امارت وحکومت کے حریص شخص کی ہے، جس کو بہر قیمت اقتدار چاہیے تھا اور اس

کے لیے وہ اصول واخلاق کی ہر قربانی دے سکتا تھا۔ جور شوتوں سے لوگوں کے ضمیر خریدتا اور ظلم وجبر سے ان کے منہ بند کرتا تھا۔ اور جس کی حکومت میں خیانت، عوامی مال پر داد عیش دینا، ظلم وجبر اور ناحق قتل روز کا معمول تھا۔

کتاب کا منہج تحقیق:

عموماً ہوتا یہ آیا کہ جس کاتب ومصنف کا جس جانب طبعی میلان یا فکری رجحان ہوا اس نے ایک قسم کی روایتیں لے لیں اور دوسری قسم کی روایتوں کو نظر انداز یا رد کر دیا۔ ایک نے ایک حسین وزیبا تصویر بنا دی اور دوسرے نے ایک سیاہ وتاریک مرقع کھینچ دیا۔ ایک ذہین اور صاحب فہم قاری حیران ہوتا ہے کہ دونوں قسم کی تصویریں ایک ہی قسم کے تاریخی مآخذ کے حوالوں سے تیار کی جاتی ہیں۔ اور وہ اس سوال میں بجا ہے کہ روایات کے اخذ وقبول یا رد وانکار کا معیار کیا ہے؟

صحیح علمی رویہ یہ نہیں ہے کہ کوئی مصنف صرف اپنے میلان طبع سے روایات کا انتخاب کر کے سوانح یا تاریخ لکھ دے۔ افسوس حضرت معاویہ کے حالات میں یا ان پر کیے جانے والے اعتراضات کے جواب میں جو تحریریں لکھی گئیں اسی طرز پر لکھ دی گئیں، کہ عموماً صرف اپنے نقطۂ نظر کی مؤید روایات پیش کر کے کام مکمل سمجھ لیا گیا۔ اگر کچھ مزید دفاع کیا گیا تو علماء وائمہ کے اقوال یا معتبر مورخین کے بیانات درج کر دیے گئے۔ جب کہ علمی تحقیق کا تقاضہ ہے کہ سوانح معاویہؓ کی روایات کے اخذ ورد کے لیے پہلے مضبوط علمی اصول اور روایات کی تنقید کے ضابطے مقرر کیے جائیں۔ اور پھر یہ دکھایا جائے کہ معتبر وصحیح روایات کی روشنی میں حضرت معاویہ کی کیسی تصویر بنتی ہے اور ان کا کیسا کردار سامنے آتا ہے۔

صحابۂ کرام کے حالات اور ان کے عہد کی تاریخ میں بنیادی حیثیت روایت کی قوت ووثوق کی ہے۔ ہمارے پاس تاریخی روایات کو جانچنے کے لیے ''سند'' موجود ہوتی ہے۔ محدثین نے سند وروایت اور متن کی تحقیق کے اصول طے کر دیے ہیں، جو مسلمانوں کی شاندار وبے مثال علمی روایت کے عکاس ہیں۔ ہمارے پاس راویوں کے حالات بھی موجود ہوتے ہیں، اور یہ ریکارڈ بھی کہ کن راویوں نے ایک دوسرے سے براہ راست (یعنی اتصال کے ساتھ) روایت لی ہے اور کن راویوں نے نہیں۔ محدثین کے معیار تنقید میں اِن عام فہم باتوں کے علاوہ ایسے گہرے دقیق اصول مقرر ہیں کہ دیگر اقوام ان کا تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ یہ اصولِ تنقید مسلمانوں کا وہ علمی امتیاز ہے جس میں دنیا کی کوئی قوم شریک نہیں۔ کسی قوم کے پاس اس کی تاریخ کا Data (مواد) سند اور راوی کے تعین اور اتصال وانقطاع کی تفصیل کے ساتھ نہیں ہے، کسی کے پاس بھی نہیں۔ ہم اپنی تاریخ کو جس وثوق واعتماد سے جان سکتے ہیں اور پیش کر سکتے ہیں، کوئی اور نہیں کر سکتا۔ یہ وثوق واعتماد سند کی جانچ پرکھ کے ذریعے ہی پیدا ہوتا ہے۔

محدثین کی روایات میں کثرت کے ساتھ سند مذکور ہوتی ہے اور ہم علم الرجال کی مدد سے اس کا مرتبہ اور حیثیت معین کر سکتے ہیں۔ جب کہ مورخین کی روایات بکثرت بے سند بھی ہوتی ہیں یا ادھوری سند کے ساتھ مذکور ہوتی ہیں، یعنی ایسے راویوں کا بیان ہوتی ہیں جو نہ واقعے کے وقت موجود تھے، نہ صاحب واقعہ شخصیت سے کبھی ملے ہوتے تھے۔ اس لیے سوانح معاویہ میں محدثین کی، اور مورخین کی بھی، صحیح وقوی روایات کو اصل مرکزی مقام دیا جائے گا۔ اس کے بعد وہ روایات جو سند کی تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہیں، اہم قرار پائیں گی۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مورخین کی عام روایات کو یکسر چھوڑ دیا جائے۔ نہیں یہ روایات سیاست، معاشرت، تہذیب وتمدن، واقعات کی تفصیلات اور دیگر بے شمار پہلوؤں سے اہم معلومات فراہم کرتی ہیں۔ لیکن جب ہمارے سامنے محدثانہ اصولوں پر کھری اترنے والی صحیح روایات کی ایک خاص مقدار موجود ہے، تو متضاد روایات کے درمیان اُن کو معیار اور کسوٹی کا درجہ دیا جائے گا۔ اور دیگر روایات میں سے وہی قابل قبول ٹھیریں گی جو ان صحیح روایات کے مخالف اور ان سے متصادم نہیں ہوں گی۔ قرون اولیٰ کے مطالعۂ تاریخ کا یہ بنیادی اصول ہے کہ پہلے صحیح وقوی روایات کو جمع کر کے اس عہد کی تاریخ کا ایک بنیادی تصور اور خاکہ تیار کر لیا جائے، جو افراد وشخصیات کے مزاج واخلاق اور اداروں کے کردار کے بنیادی خاکے طے کر دیتی ہیں۔ پھر قدیم تاریخی مآخذ میں جو معلومات ایسی دستیاب ہوں جو ان صحیح وقوی روایات کے مطابق ہوں یا کم از کم ان سے متصادم نہ ہوں، ان کو قبول کیا جائے گا۔ اور جو تاریخی معلومات وحکایات صحیح اسانید سے ثابت روایات کے خلاف ہوں، ان کو قطعاً نا قابل قبول قرار دے دیا جائے گا۔ اہل سنت والجماعت کے نزدیک قرآن مجید اور سنت رسول کی تصریحات کی بنا پر صحابۂ کرام کی جماعت کا جو منفرد و واجب الاحترام مقام ہے اس کا تقاضہ بھی ہے کہ حضرت معاویہؓ کی شخصیت وکردار کے سلسلے میں اس اصول کو حتمی طور پر لازم پکڑا جائے۔ اسلام کی اولین تاریخ پر سبائی پروپیگنڈے کا جو شب خون مارا گیا، اس کے پیش نظر سند وراوی کی پرکھ کا یہ عمل نہایت ضروری وناگزیر ہے۔ اس نقد وتمحیص کے بغیر ہم صرف افترا وتلبیس کی اینٹوں سے اپنی تاریخ کی فرضی عمارت بناتے رہیں گے۔

ہم نے انھی اصولوں پر اس تصنیف کی عمارت کھڑی کی ہے اور اسی منہاج وطرز تحقیق کو معیار بنایا ہے۔ خوش قسمتی سے حضرت معاویہؓ کے ذاتی حالات وکمالات، شخصیت وکردار، ان کے عہد کے معاشرتی حالات، سیاسی حوادث واقعات اور نظام حکومت کے سلسلے میں بے شمار معلومات محدثین کی کتابوں میں ملتی ہیں۔ ظاہر ہے محدثین کے یہاں روایت ودرایت کا جو معیار رہا ہے وہ مورخین نے ملحوظ نہیں رکھا ہے۔ ہاں کتب حدیث میں یہ سارا مواد بے انتہا منتشر اور پھیلا ہوا ہے۔ اس کو جمع کرنا چیونٹیوں کے منہ سے شکر بیننے سے زیادہ صبر طلب اور دقیقہ رسی چاہتا تھا۔ لیکن تحقیق وانصاف کا حق ادا کرنے کے لیے اس طویل ڈگر کے سفر سے چارہ بھی نہیں

تھا۔ مصنف کو اس میں اندازے سے کہیں زیادہ وقت لگانا پڑا۔ دیگر مصروفیات کے ساتھ کم وبیش چار سال مطالعہ وتحقیق کا یہ سفر جاری رہا۔ الحمدللہ والمِنَّۃ للہ، مصنف کم ازکم اپنے ضمیر کے سامنے مطمئن ہے کہ اس نے بنیادی طور پر صحیح روایات کو میزان بنایا ہے۔ کثیر تعداد میں کتب حدیث وتاریخ اور طبقات وتراجم کی بادیہ پیمائی کرتے ہوئے روایتوں اور اسانید کی جانچ پڑتال کی ہے۔ بے سند اور غیر صحیح سندوں سے وارد تاریخی بیانات کے ذریعہ خاکوں اور واقعات کے سلسلے کو مکمل کرنے کا کام ضرور کیا ہے، لیکن اسی شرط پر کہ وہ صحیح روایات سے متصادم نہ ہوں۔

مصنف اس حقیقت کا اظہار ایسے وثوق کے ساتھ کرسکتا ہے جس میں تردد کا کوئی شائبہ بھی نہیں کہ؛ جب صحت سند اور درایت ونقد کے محدثانہ اصولوں کی روشنی میں روایات کی جانچ پرکھ کی جاتی ہے تو یہ حقیقت روشن ہو کے سامنے آتی ہے کہ حضرت معاویہؓ کے کردار کو داغدار کرنے والی یا ان کو ایمان واخلاق کے اعلیٰ معیار سے کم تر ثابت کرنے والی کوئی بات صحیح اور معتبر روایات میں نہیں ملتی۔ ایسی تمام روایتیں یا تو بے سند تہمتیں ہیں، یا منقطع ومنکر اور ضعیف۔ یا کہیں کوئی روایت نامکمل ہونے کی وجہ سے واقعے کی حقیقت واضح نہیں کرپاتی، مکمل روایت جب پیش کی جاتی ہے سارا شبہہ رفع کردیتی ہے۔

ہماری کتب تاریخ کا حال:

حضرت معاویہؓ کی کردار کشی کرنے والی روایات کی بڑی تعداد تو ابو مخنف، نصر بن مزاحم اور ہشام کلبی جیسے متروک اور بغض صحابہ کے شکار راویوں کی کارستانیاں ہیں۔ ہماری تاریخ کی کتابیں اس سلسلے میں سخت بے احتیاط واقع ہوئی ہیں۔ طبری کی کتاب گویا ام التواریخ مانی جاتی ہے۔ اور حال یہ ہے کہ کذاب راویوں اور بے سند بیانات سے بھری پڑی ہے۔ جنگ صفین کا پورا بیان ابو مخنف کی روایات پر قائم ہے۔ اور یہ شخص بالکل غیر معتبر بلکہ سخت متہم ہے۔ حافظ ابن عدی کہتے ہیں:

> اس شخص کا معمول سلف صالحین (صحابہؓ) کی شان میں بدزبانی والزام تراشی ہے، یہ جلا بھنا شیعہ اور شیعوں کی (بنائی) روایات اور کہانیوں کا ناقل ہے۔ صحابہ کو برا بھلا کہنا اس کے لیے معمولی بات ہے۔ ایسی ایسی مکروہ روایتیں بیان کرتا ہے کہ میں ذکر تک کرنا پسند نہیں کرتا۔ (الکامل فی ضعفاء الرجال: ۷/۲۴۱)۔

طبری نے واقعہ صفین میں ابو مخنف کی سات روایات ذکر کی ہیں۔ اس کے علاوہ جو کچھ روایات ہیں، وہ سب مل کر بھی ابو مخنف کی ایک طویل روایت کے برابر نہیں۔ اسی لیے صحیح ومستند روایات کو معیار بنائے بغیر تاریخی روایات کا بے اصول مطالعہ صرف افتراء ودجل کی وادیوں ہی میں بھٹکائے گا۔ جیسا کہ بہت سے مصنفین کے ساتھ ہوا ہے۔

بہت سی ایسی روایتیں ہیں جو اپنی اصل میں اعتراض والزام کا کوئی پہلو نہیں رکھتیں، صحیح ہیں، لیکن ان کو مغالطہ انگیزی کے ذریعے بالکل غلط معنیٰ پہنائے جاتے ہیں۔ بہت سی ایسی روایتیں ہیں، جن کو کمان بنا کر حضرت

معاویہؓ پرالزامات کے تیر چلائے جاتے رہے ہیں، لوگ ان کی توجیہ وتاویل کی کوشش کرتے آئے ہیں، لیکن بسا اوقات ان تاویلات سے تاثر یہ قائم ہوتا ہے کہ ''بتکلف بات بنانے کی کوشش کی جارہی ہے''۔ لیکن جب ان روایات کا محدثین کے گہرے اصولوں کی روشنی میں جائزہ لیا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ منکر وغیر معتبر روایات ہیں اور صحیح ومحفوظ روایت (جو زیادہ ثقہ لوگوں نے بیان کی ہے) کسی بھی ایسی بات سے خالی ہے جو حضرت معاویہ پر الزام کا باعث بن سکے۔ اس کی ایک اہم اور دلچسپ مثال ''حضرت علی مرتضیٰؓ کو سبّ وشتم؟ جھوٹی روایات کی ایک اور مصیبت'' کے زیرعنوان آئے گی۔

کتاب کا مرکزی مقصد:

لیکن بہرحال اس کتاب کا مقصد محض یہ نہیں کہ حضرت معاویہؓ اور حضرت علیؓ کے بیچ پیش آنے والے اختلاف کو دونوں صحابیان والا تبار کے احترام اور اعتدال کے ساتھ بیان کر دیا جائے۔ اور نہ مطمح نظر یہ ہے کہ شیعی یا متعصّبانہ رجحانات رکھنے والے راویوں نے حضرت معاویہؓ پر جو الزامات اور تہمتیں دھری ہیں ان کی صفائی پیش کی جائے۔ (اگرچہ کتاب سے یہ مقصد مثبت انداز سے پورا ضرور ہوتا ہے، اس لیے کہ بہرحال سیدنا معاویہؓ پر جب بھی لکھا جائے گا تو تاریخ کے یہ افسوسناک اور نازک معاملات بھی زیر بحث آئیں گے)۔ اس کے بجائے کتاب کا مرکزی تخیل یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ کی شخصیت کو صحیح اور مکمل طور پر کم جانا گیا ہے۔ وہ تاریخ انسانی کی ایک مظلوم شخصیت ہیں، جن کے اوصاف وکمالات کا تذکرہ کم ہوا اور اسلام کی خدمت میں ان کے عظیم الشان کارناموں پر پردہ پڑا رہا ہے۔ ان کی شخصیت اِن تنازعات کے علاوہ بھی بہت سے حوالوں سے لائق مطالعہ ہے۔ خدمت ونصرتِ رسول میں ان کا کردار، خلافت راشدہ کے دور میں ان کا جہاد اور لشکروں کی قیادت، خصوصاً ان کا یہ کارنامہ کہ امت کی کشتی کو انہوں نے فتنوں کی منجدھار سے نکالا، اسلام کے سب سے بڑے دشمن رومن امپائر کا کامیاب مقابلہ اور اس کو پسپا وکمزور کرنے کا بے مثال کارنامہ، پھر امارت وخلافت کے دور میں ان کا نہایت عادلانہ اور کامیاب نظام حکومت اور امت مسلمہ کے نظم اجتماعی کی ترتیب وتشکیل، نیز ان کے غیر معمولی ذاتی اوصاف وکمالات اور اخلاق، یہ سب بے بنیاد افواہوں کے طومار تلے دفن کر دیا گیا۔ ان کی سیرت میں یہ سب کارنامے اور کمالات اور ان جیسے بے شمار ایسے پہلو ہیں، جن کی وجہ سے سوانح معاویہ ہماری علمی ودینی ضرورت ہے۔

متعدد احادیث میں صحیح اسانید سے آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ خواب دیکھا تھا کہ ''قرآن کا عمود'' (یعنی مرکز) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تکیہ کے نیچے سے نکال کر شام لے جایا گیا۔ پھر آپؐ نے اس کی یہ تعبیر بیان فرمائی کہ فتنوں کے وقت ایمان کا مرکز شام ہوگا۔ یہ اشارہ تھا کہ خلافت اسلامیہ اور قوت اسلام کا مرکز شام میں ہوگا۔

(ملاحظہ ہو کتاب کے آٹھویں باب کا آغاز اور بارہویں باب کا آغاز)۔ اس لیے خلافت معاویہ دین وملت کے سنہرے دور کی ایک کڑی ہے۔

کج فکریوں کی بنیاد اور صحابہ واہل سنت کا طریق:

اس سلسلے میں پائی جانے والی ساری کج فکری کی بنیاد یہ ہے کہ حضرت علی کی محبت کے لیے ضروری سمجھا جاتا ہے کہ حضرت معاویہ کی تنقیص کی جائے اور ان کی تصویر ایک ظالم اور دنیا کے طالب کی شکل میں پیش کی جائے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے (اور صحابۂ کرام اور تابعین عظام سے لے کر متأخرین ائمۂ اہل سنت تک کا موقف بھی یہی ہے) کہ سارے اختلاف کی بنیاد ''فتنہ'' کے غیر معمولی حد تک ہوش ربا حالات میں رائے کا اختلاف تھا، جس فریق نے جو صحیح سمجھا اور دین وملت کے لیے بہتر جانا اس کے مطابق عمل کیا۔ نہ کسی پر کوئی ملامت نہ کوئی مؤاخذہ۔ کوئی شبہہ نہیں کہ خلافت معاویہؓ کا دور جن صحابۂ کرام نے پایا بلا استثنا سب نے یہی رویہ اختیار کیا، کتاب میں آپ اس کی تفصیل پڑھیں گے۔

سیدنا علیؓ کی فضیلت وفوقیت ہر شبہے سے بالاتر:

یہاں مصنف اس کا واضح اظہار ضروری سمجھتا ہے کہ سیدنا علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان اختلاف کو جس زاویہ سے بھی دیکھا جائے، سیدنا علی کی فضیلت وفوقیت اور حقانیت ایک امر واقعہ بھی ہے اور اہل سنت کا مسلمہ فکر وخیال بھی۔ اس علمی سفر کے دوران سیدنا علی کی عظمتِ کردار، شرافت اور خلوص ونصح کے ایسے مناظر راقم سطور کے سامنے آئے کہ بے ساختہ آنکھیں اشکبار اور جبین عقیدت خم ہوگئی۔ سیدنا علی کرم اللہ وجہہ سابقین اولین کی بھی صف اول میں تھے۔ ان کی فضیلت کا راز جمل وصفین کے کارزاروں میں تلاش کرنا حد درجے ناواقفی وکج فکری کی بات ہے۔ جب کہ حضرت معاویہ مقام صحابیت، علمی وعملی کمالات اور اپنے تاریخ ساز کارناموں کے باوجود متأخرین ولاحقین کی صف میں ہی تھے۔ سابقین اولین کے بارے میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لاحقین، یعنی بعد کے صحابہ، کو آگاہ کیا تھا کہ تم اگر احد پہاڑ کے برابر سونا اللہ کے راستے میں خرچ کردو تو بھی ان سابقین کے چند سیر غلے کے برابر درجہ نہیں پاؤگے (صحیح بخاری: ۳۶۷۳، صحیح مسلم: ۲۵۴۱)۔ سابقین اولین اور لاحقین کے درمیان کسی موازنے کا خیال ہمیں ہی نہیں، قرن اول میں کسی بھی قابل ذکر ہستی کو نہیں تھا۔ بلکہ خود حضرت معاویہ کو بھی نہیں تھا۔ حیرت ناک حد تک افسوس کی بات ہے کہ بعض لوگ شیعیت اور شیعیت زدگان سے حضرت معاویہؓ کے دفاع میں انتہا پسندی کے شکار ہوجاتے ہیں۔ اور سیدنا علیؓ اور حضرات حسنینؓ کے احترام ومحبت کا دامن ان سے چھوٹنے لگتا ہے۔ یہ بڑی محرومی کی بات ہے۔

(۲) راقم سطور کو اطمینان ہے کہ شیعہ حضرات میں سے بھی اگر منصف مزاج حضرات ہماری اس کتاب

کا مطالعہ کریں گے وہ کم از کم یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہیں گے کہ اہل سنت یقیناً خلوص وصدق کے ساتھ سیدنا علیؓ اور ان کے اولاد واخلاف سے سچی محبت وتعظیم کا معاملہ رکھتے ہیں۔ ان کا حضرت معاویہؓ سے پہلے اور کہیں زیادہ سیدنا علیؓ سے رشتہ ہے۔ ہاں وہ حبّ علی کے لیے بغض معاویہ کو ضروری نہیں سمجھتے۔ اور اسی رویے کو دین وامانت اور حق وعدل کا تقاضہ سمجھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو حق کی اتباع نصیب فرمائے۔

بہر حال، علم وانصاف کا تقاضہ اور اہل سنت کے تصور تاریخ وتصور دین کا لازمہ ہے، کہ حضرت معاویہؓ کی عظیم خدمات اور شان دار کمالات کا تذکرہ واعتراف کیا جائے۔ اور اختلافی مسائل میں ان کے نقطہائے نظر کو بھی پورے انصاف وغیر جانب داری کے ساتھ جانا جائے۔ مصنف کو اس موضوع پر کام کرنے کا تقاضہ ایک عرصے سے تھا۔ اہل سنت کے عوام میں تشیع کے جراثیم اور میلانات زمانۂ قدیم سے چلے آئے ہیں۔ ہمارے مورخین ومصنفین کے یہاں بھی جا بجا ان میلانات اور تعصّبات کے بدنما مظاہر دکھائی دیتے ہیں۔ اپنے قارئین کو یہ اندازہ کرانے کے لیے کہ ہمارے لیے ایسے منصفانہ اور تحقیقی کام کی کتنی ضرورت ہے، ایک مقبول ومشہور عربی مصنف کی تحریر سے ایک اقتباس پیش کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔ عباس محمود العقاد مصر کے ایک بہت ممتاز مفکر ومصنف مانے جاتے تھے۔ ان کی کتابیں شہرہ آفاق ہیں۔ اہل سنت ہی میں شمار ہوتے ہیں، یا یوں کہیے شیعہ نہیں کہے جاتے۔ لیکن حضرت معاویہؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ وغیرہ صحابہ کے بارے میں ذہن نہایت مسموم، متعصّبانہ اور قطعاً غیر علمی ہے۔ جو کچھ بھی بے بنیاد روایات میں الزامات اور تہمتیں ملیں، موصوف نے سب ہی جمع کر ڈالیں۔ پھر تاریخی تجزیہ کے نام پر خوب ہی توطوطا مینا اڑائے۔ تعصب ودشمنی کا یہ حال ہے کہ حضرت معاویہ اور حضرت عمرو بن العاص کے سلسلے میں صاف اقرار کرتے ہیں کہ چاہے علمی دلائل کچھ بھی کہیں اور ان دونوں پر الزامات کی روایتیں کیسی ہی ضعیف، بودی اور من گھڑت ہی کیوں نہ ہوں اور چاہے تاریخی شہادتیں کیسی بھی خلاف ہوں، مگر وہ عمرو بن العاص اور معاویہ کو ایسے مکار اور چالباز اشخاص ہی کہیں گے، جن کا کوئی اصول سوائے دولت اور حکومت کی حرص کے کچھ نہیں۔ دریدہ دہنی کی انتہا ہے۔

عقاد ایک روایت نقل کرتے ہیں، جس کا راوی وہی شیعہ کذاب نصر بن مزاحم اور اس کا شیعی شیخ عمر بن سعد ہے۔ روایت کا حاصل یہ ہے کہ معاویہ نے عمرو بن العاص کو علی کے خلاف جنگ صفین میں ساتھ دینے کو کہا، انہوں نے کہا: تمہارے پاس آخرت تو ہے نہیں، وہ تو علی کے ساتھ ہے۔ تمہارے پاس تو دنیا ہے، تم بتاؤ میرا حصہ کیا ہوگا؟ انہوں نے پوچھا تم ہی بتاؤ۔ عمرو بن العاص نے کہا: مجھے کھانے کے لیے رشوت میں مصر کی حکومت چاہیے (جو عظیم محصولات کا ایک وسیع ملک تھا)۔ روایت کہتی ہے کہ معاویہ کو اتنی بڑی رشوت دینے میں تذبذب تھا، مگر عمرو نے اس سے کم قیمت قبول نہیں کی۔ معاویہ سے ان کے ایک بھائی عتبہ نے کہا: تمہارے لیے تو شام کا مال بھی بہت ہے، مصر

دے دو۔آخر یہی سودا طے ہو گیا۔(وقعۃ صفین:37-42)عقاد کو ایسی رافضی روایتوں سے عشق ہے۔کہتے ہیں:

وليقل الناقدون التاريخيون ما بدا لهم أن يقولوا في صدق هذا الحوار، وصحة هذه الكلمات، وما ثبت نقله وما لم يثبت منه سنده ولا نصه، فالذي لا ريب فيه، ولو اجتمعت التواريخ قاطبة على نقضه، إن الاتفاق بين الرجلين كان اتفاق مساومة ومعاونة على الملك والولاية، وإن المساومة بينهما كانت على النصيب الذي آل إلى كل منهما، ولو لاه لما كان بينهما اتفاق. فكان معاوية يطمح إلى الخلافة يتولاها ويورثها أعقابه من بعده. وكان عمرو يطمح إلى ولاية مصر جامعة... ويترك ولايته ميراثا من بعده لولده عبد الله.

چاہے تاریخ کے ناقدان روایتوں کو کچھ بھی کہیں اور چاہے ان کا نہ متن ثابت ہو نہ سند صحیح ہو، (میں تو یہی کہوں گا) کہ ان دونوں (معاویہؓ و عمروؓ) میں جو جوڑ تھا وہ سراسر لین دین اور مول بھاؤ کا اور صرف حکومت پر قبضہ کرنے کے لیے تھا۔دونوں کا مطمح نظر صرف ''اپنا اپنا حصہ'' تھا۔چاہے ساری تاریخی شہادتیں اس کو غلط قرار دیں، مگر میں تو یوں ہی کہوں گا۔معاویہ کا منصوبہ بس یہ تھا کہ خلافت پر خود قبضہ کریں اور اپنے بعد اپنی اولاد کو اس کا وارث بنا جائیں۔......اور عمرو کی نیت یہ تھی کہ پورے مصر کی حکومت اور مالیہ پر قبضہ جمائیں اور اپنے بعد اپنے بیٹے عبداللہ بن عمروؓ کو اس کا وارث بنا جائیں۔(ملاحظہ ہو عقاد کی تصنیف: عمرو بن العاص:١٦٦)۔

العیاذ باللہ۔ہم نے یہ مثال صرف اس لیے ذکر کی کہ ہمارے قارئین اندازہ کرسکیں کہ اہل سنت کہلانے والوں میں شیعیت کیسی کھلم کھلا موجود ہے۔حضرت معاویہ اور حضرت علی پر جو سب سے غیر معتبر کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں اِن مصنف کی کتابوں کا خاص مقام ہے۔انہوں نے اپنی متعدد کتابوں میں حضرت معاویہ کی مکمل رافضی تصویر پیش کی ہے۔اور اس تصویر سے ان کے عشق کو ایسا شغف ہے کہ اس کے خلاف تاریخ وحدیث کی کوئی طاقت ور سے طاقت ور شہادت ان کے لیے قابل اعتنا نہیں۔یہ رافضیت کی اس تصویر سے صرف عشق نہیں، عشقِ دیوانہ گر ہے۔یہ صرف بغضِ معاویہ نہیں، بغضِ خرد سوز ہے۔

ہمیں عقاد کی کتاب سے کوئی دل چسپی نہیں۔یہ مثال تو بس یہ دکھانے کے لیے پیش کی گئی کہ اہل سنت کہلانے والوں کے یہاں بھی کیسی غلط فکری اور بے انصافی موجود ہے۔اور غلط فہمیوں اور تعصّبات کے پردوں کو چاک کرنے کی کتنی کوششوں کی ضرورت ہے۔ایک عرصے سے اس ضرورت کے احساس کے باوجود ابھی یہ کام کتنا ٹلتا، بلکہ معلوم نہیں نہ جانے اس کام کا وقت آتا بھی یا نہیں۔لیکن کچھ عرصے سے نظر آنا شروع ہوا کہ بعض خاص معلوم حالات واسباب کے تحت اہل سنت میں شیعیت کی دعوت بڑے فن کارانہ طرز سے پھیلائی جارہی ہے۔اور اس کے

لیے آسان جذباتی عنوان سیدنا علیؓ کی محبت کی آڑ میں حضرت معاویہؓ اور دیگر صحابہ کو مطعون کرنا ہے۔ اس مقصد کے لیے مختلف ذرائع اختیار کیے جا رہے ہیں۔ بے حد و بے شمار جھوٹ پھیلایا جا رہا ہے۔ موضوع اور بے اصل روایتوں کا سہارا لیا جا رہا ہے اور پروپیگنڈے کے تمام ذرائع استعمال کیے جا رہے ہیں۔

سنی کہلانے والوں میں جو اہل بدعت حلقے ہیں ان میں شیعیت کے رجحانات پیدا کرنے والوں کی کثرت تو عرصے سے تھی اور ہے۔ یہاں سنیت کے دعوے کے ساتھ علم، تعزیہ، چہلم سب کچھ زبردست دھوم سے انجام پاتے ہیں۔ مگر اب تو جو صحیح الفکر حلقے تھے ان میں بھی کئی مقررین و مبلغین کھلم کھلا شیعیت کے بیج بو رہے ہیں۔ اور سادہ لوح عوام کو بڑی فن کاری سے مغالطے دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ایسے لوگ بلا تحقیق موضوع و بے اصل اور غلط روایات بیان کرتے ہیں اور بہت سے پوری تلبیس سے کام لیتے ہیں اور صحیح واقعات کو آدھا ادھورا یا حقیقت کے خلاف رنگ میں پیش کر رہے ہیں۔ اس کا اثر راقم سطور نے بچشم خود یہ دیکھا کہ اہل سنت کے بہت سے نوجوان شبہات کے شکار ہیں۔ انتہا تو یہ ہے کہ نوجوان فارغین مدارس کی ایک تعداد اپنے صحیح عقیدہ و مسلک سے منحرف ہو رہی ہے۔ یہاں تک کہ ان میں سے بعض تو شیعوں کی مناظرانہ کتابوں سے 'استفادہ فرما کر' الزامات کو بے تحقیق و تفتیش نقل کر رہے ہیں اور کھلم کھلا حضرت معاویہؓ کو سبّ و شتم کر رہے ہیں۔ بس انہی حالات اور احساسات نے ہمت کو مہمیز کیا اور یہ کتاب تیار ہو گئی۔

دار العلوم الصفہ کی ذمہ داری کے کے علاوہ دیگر دعوتی مصروفیات کی بنا پر اس عاجز کو ایسے طویل و عرق ریز تحقیقی کام کی فرصت ملنا یقیناً مشکل تھی، مگر عزیز گرامی قدر مولانا فیض الدین عثمانی شکریے کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اپنی نیک طبعی اور احساس ذمہ داری سے دار العلوم کے مسائل میں مجھے بڑی حد تک سبک دوش کر رکھا ہے۔ اسی طرح عزیز گرامی مولانا ازھار الحق کا شکریہ بھی لازم ہے کہ کتاب کی فہارس سازی اور تصحیح وغیرہ کے کام میں ان سے بڑی مدد ملی۔ اللہ تعالیٰ میرے ہر معاون کو جزاء خیر عطا فرمائے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ایک صحابی رسول، اسلام کے ایک مجاہد بادشاہ، اور مسلم تاریخ کے ایک عظیم حکم راں کے حالات و سوانح کو پیش کرنے کی اس حقیر کوشش کو قبول فرمائے، غلطیوں سے حفاظت فرمائے اور مصنف کے لیے مغفرت اور رضاء الٰہی کا ذریعہ بنائے۔ آمین۔

فقط

یحییٰ نعمانی

دار العلوم الصفۃ، لکھنؤ۔

۲۰ رجب المرجب ۱۴۴۶ھ مطابق ۲۱ جنوری ۲۰۲۵ء

پہلا باب

خاندانی پس منظر، پیدائش اور قبول اسلام

نام ونسب:

معاویہؓ بن ابی سفیان صخر بن حرب بن امیہ بن عبد شمس بن عبد مناف۔عبد مناف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت معاویہؓ کے مشترک مورث اعلی ہیں۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عبد مناف کے دوسرے بیٹے ہاشم کی شاخ میں ہیں۔عبد مناف قریش کا نامی قبیلہ تھا، جوعزوشرف اور مال ومنال کے علاوہ کعبے کی تولیت کی وجہ سے عرب کی دینی قیادت کا منصب بھی رکھتا تھا۔قریش نسلوں سے اخلاقی ومعاشرتی اقدار اور صفات وکمالات میں بھی معروف ومشہور تھے۔اور عرب قبائل ان کی امامت وقیادت اور بلند مرتبے کے معترف تھے۔

شخصیت ومزاج کی تشکیل میں خاندانی پس منظر کا کردار:

تاریخ کا تجربہ ہے کہ انسان کی سیرت ومزاج کی تشکیل میں اس کے خاندانی اثرات کا بھی کافی کردار ہوتا ہے۔اس کو کسی حد تک جینیاتی اور موروثی (Genetic and Biological) عوامل کا اثر بھی تسلیم کیا جاتا ہے۔ اگر کسی خاندان میں عظیم شخصیتوں اور کارہائے نمایاں انجام دینے والے افراد کا پشتینی سلسلہ رہا ہے تو ان کی اولوالعزمی، شجاعت، خوش خصالی اور کارناموں کے خاندانی تذکروں اور قصوں کا بھی نفس ومزاج پر اثر پڑتا ہے۔کوئی شخص اگر اپنی بدخوئی وبدکرداری اور جہالت سے ان اثرات کو مٹا ہی نہ ڈالے تو یہ کمالات معمولی سے صیقل سے چمک اٹھتے ہیں۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نسلی اثرات کے اس تسلسل کو اپنے اس ارشاد سے سند عطا فرمادی ہے:

تجدون الناس معادن،فخیارھم فی الجاھلیة خیارھم فی الاسلام، اذا فقھوا۔ وتجدون من خیر الناس فی ھذا الامر أکرھھم له قبل ان یقع فیه۔ (صحیح مسلم:۲۵۲۶، وصحیح بخاری:۳۴۹۳)

لوگ اپنے خاندانوں کے مطابق ہوتے ہیں (جیسے سونے کی کان سے سونا اور لوہے کی کان سے لوہا ہی نکلتا ہے)۔ اسی طرح جاہلیت کے اچھے خاندانوں کے لوگ اسلام میں بھی اچھے ثابت ہوتے ہیں، بشرطیکہ دین کی اچھی سمجھ پیدا کرلیں۔ اور تم پاؤ گے کہ اس دین میں جو لوگ سب سے بہتر ثابت ہوئے، ان میں سے بہت سے اسلام لانے سے پہلے اس کو سخت ناپسند کرتے تھے۔

صحابۂ کرام میں اس حقیقت کا خوب مشاہدہ و تجربہ ہوا۔ قریش اور مدینہ کے وہ خاندان جن میں نسلوں سے ہمدردی و احسان، شرافت و سخاوت، مروّت و وفا اور صدق و شجاعت کی روایات چلی آ رہی تھیں، ان کے لوگوں نے اسلام میں بھی نمایاں مقام حاصل کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس حدیث میں اور دیگر احادیث میں اس کی یہ شرط صاف طور پر بیان کی تھی کہ وہ اسلام لانے کے بعد دین کی سمجھ اور کردار کی پختگی اور عمل کی صفائی کی ضرور پابندی کریں۔ "من بطأ به عمله لم يسرع به نسبه"(صحیح مسلم:۲۶۹۹)۔ جو عمل میں پیچھے رہ جائے گا اس کا نسب اس کو آگے نہیں بڑھا سکتا۔

حضرت معاویہؓ کی شخصیت کے پس منظر کے طور پر قبیلۂ قریش، پھر بنی عبد مناف (جو ان کا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا متحدہ و مشترک خاندان تھا) اور خاندان بنی امیہ کے حالات و امتیازات پر نظر ڈالنا ان کی سیرت و کردار کو سمجھنے میں بہت معاون ہوگا۔

قبیلۂ قریش:

قریش سیدنا حضرت ابراہیمؑ کی اولاد تھے، جن کو انہوں نے اللہ کے حکم سے، اپنے نبوی مشن کے تحت مکہ میں اس دعا کے ساتھ بسایا تھا کہ:

رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ (سورۂ ابراہیم:۳۷)۔

خدایا میں نے اپنے خاندان کی ایک شاخ کو ایک بے آب و گیاہ وادی میں، تیرے بیت حرام کے پاس لا بسایا ہے۔ اے ہمارے رب! مقصد یہ ہے کہ یہ نماز قائم کریں۔

قریش نے اپنی جاہلیت کے دور میں میراث ابراہیمی میں سے بہت کچھ ضائع کر دیا تھا، لیکن وہ (شرک میں ملوث ہونے کے باوجود) توحید کے ایک حد تک معترف تھے، ملت ابراہیمی کے رسوم ادا کرتے تھے، اعلی اخلاقی اقدار مسلم تھیں۔ اعراب و دیگر قبائل سے وہ بہت ممتاز تھے۔ شجاعت، صلہ رحمی اور غیرت و حمیت میں یکتا، فصاحت و بلاغت میں فرد اور اولوالعزمی میں بے نظیر تھے۔ ان کی قومی سیرت میں نفاق و مکر اور جھوٹ کا گذر نہیں تھا۔ ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی اولاد ہونے اور عربوں کے دینی و عبادتی مرکز کعبہ کے متولی ہونے کی وجہ سے

ان کو عربوں میں خاص احترام حاصل تھا[1]۔

اس قبیلہ کی ایک فضیلت توسلِ ابراہیمی سے ہونا ہے۔ دوسری بات یہ کہ قریش سے خدا کے آخری پیغام کی نگہبانی اور آخری رسول ﷺ کی تائید ونصرت اور جانشینی کا کام لیا جانا تھا، اس لیے ان میں اعلی صفات وکمالات کی آبیاری حکمت خداوندی خود کر رہی تھی۔ رسول اللہ ﷺ کی بعثت ورسالت سے مدتوں پہلے سے ان پر اللہ تعالی کی نگاہ انتخاب پڑ چکی بھی۔ آل ابراہیم کو رسالت اور اقوام عالم کی دینی امامت کے لئے منتخب کیا جا چکا تھا۔ (آل عمران ۳۳)۔ پھر آخری دین کے لئے قریش کا انتخاب عمل میں آیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے خود اس حقیقت کو بیان فرمایا ہے:

ان الله اصطفی کنانة من ولد اسماعیل،واصطفی قریشا من کنانة واصطفی من قریش بنی ہاشم، واصطفانی من بنی ہاشم۔ (صحیح مسلم:۶۰۷۷)

اللہ تعالیٰ نے بنی اسماعیل میں کنانہ کا، ان میں سے قریش کا، پھر قریش میں سے بنی ہاشم کا انتخاب کیا۔ پھر بنی ہاشم میں سے میرا انتخاب فرمایا۔

قریش کے اس اجتماعی مقام کے تمام عرب قبائل معترف اور اس قبیلے کی سیادت وسربراہی کو تسلیم کرتے تھے۔ اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے اپنے بعد امامت کبری اور سلسلۂ خلافت کے لئے امت کو حکم دیا تھا کہ اس منصب جلیل پر قریش ہی کے کسی شخص کو طے کیا جائے۔ واضح رہے کہ یہ کسی خاندانی اقتدار کی تاسیس نہیں تھی، بلکہ عرب کی سماجی حقیقت اور سیاسی صورت حال کو ملحوظ رکھ کر کیا گیا ایک فیصلہ تھا۔ عربوں کا اتحاد قریش ہی پر ہو سکتا تھا۔ اسی لئے جب انصار کے بزرگوں کو خیال ہوا کہ مدینہ ان کا ہے، لہذا رسول اللہ ﷺ کے بعد سربراہی وامامت کے لئے ان میں سے کسی کو منتخب کیا جائے، تو ان کو حضرت ابو بکر وعمرؓ نے عرب کی اسی سماجی صورت حال کو یاد دلایا، کہ یہاں صرف قریش کا اقتدار ہی تسلیم کیا جا سکتا ہے۔

ولن یعرف العرب ہذا الامر الا لہذا الحیّ من قریش.

عرب سوائے قریش کے کسی کی امارت قبول نہیں کریں گے۔ (صحیح بخاری ۶۸۳۰)

خاندان نبوی بنو عبد مناف کی شاخ بنو امیہ:

حضرت معاویہ قبیلہ قریش کے سب سے اہم ومعزز خاندان بنو عبد مناف کے فرد تھے۔ ان کی شاخ (بنو امیہ بن عبد شمس) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شاخ بنو ہاشم کے بھائیوں کی شاخ تھی۔ عبد مناف دونوں کے

[1] قریش کی ان صفات پر تاریخ عرب کی ہر کتاب اور جاہلی ادب وشاعری کا ہر گوشہ شاہد ہے۔ اجمالی انداز کے لئے جواد علی کی "المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام" بھی کافی ہے۔

مشترکہ جدامجد تھے۔بنوہاشم اور بنوامیہ کے درمیان ایک خصوصیت یہ تھی کہ ہاشم اور بنوامیہ کے جدامجد عبدشمس کی ماں ایک تھیں۔(فتح الباری: ۳۲۸/۸)۔ ابن اسحاق سیرت نگار رسول اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاندانی حالات وحقائق کے گہرے واقف کار ہیں۔لکھتے ہیں:

وانما کان بنو عبد مناف أهل بیت واحد، شرف بعضهم لبعض شرف، وفضل بعضهم لبعض فضل۔(سیرت ابن ہشام: ۱۵۰/۱)

بنوعبدمناف ایک متحدہ خاندان تھے۔کسی شاخ کی عزت دوسرے کے لئے بھی باعثِ افتخار تھی اور کسی ایک کی فضیلت دوسرے کے لئے باعث فضیلت۔

صحیح بخاری میں ہے کہ صلح حدیبیہ کے بعد جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دعوتی خط ہرقل قیصر کو پہنچا تو وہ اس وقت شام میں تھا۔اس کو ضرورت محسوس ہوئی کہ اسلام اور رسول اسلام کے متعلق تحقیق کی جائے، اتفاقاً اس وقت ابوسفیان ایک تجارتی قافلے کے ہمراہ شام میں تھے۔قیصر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے مکہ کے قافلے کو دربار میں طلب کیا۔اس نے پوچھا ان میں اس ''مدعیِ رسالت'' کا قریب ترین رشتہ دار کون ہے؟ سب ہی قریشی تھے لیکن سب سے قریبی ابوسفیان تھے۔خود کہتے ہیں:

قافلے میں میرے علاوہ خاندان بنوعبدمناف کا کوئی نہیں تھا، اس لیے میں نے کہا، میں ان کا سب سے قریبی رشتے دار ہوں۔وہ میرے چچازاد بھائی ہیں۔(صحیح بخاری: ۲۹۴۱)

فتح مکہ کے موقعہ پر ابوسفیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔سیدنا حضرت عمرؓ نے ان کو سخت طعنہ دیا، تو ابوسفیان نے حضرت عمر کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنے اسی رشتے کو یاد دلاتے ہوئے کہا: ابن خطاب میں تمہارے پاس نہیں، اپنے چچازاد بھائی کے پاس آیا ہوں۔(مصنف عبدالرزاق: ۳۷۴/۵)

مکی ریاست میں بنوامیہ کا سیاسی مقام:

سیرت ابن ہشام، تاریخ مکہ (ازرقی) وغیرہ مآخذ کے مطابق مکہ کی شہری ریاست میں بنوعبد مناف میں تین اہم سیاسی و اجتماعی عہدے تھے۔رفادہ (حجاج کی میزبانی) اور سقایہ (زمزم کا انتظام) بنوہاشم کے پاس تھے۔اور بنوامیہ کے پاس قیادہ (یعنی محکمہ دفاع و جنگ) تھا۔جاہلیت کی مشہور جنگ حرب فجار میں قریش اور کنانہ کی متحدہ افواج کی قیادت بنوامیہ کے سردار حرب ابن امیہ کے ہاتھ میں تھی۔(الروض الانف: ۱۴۹/۲) ازرقی نے تاریخ مکہ (۱۰۹/۱) میں لکھا ہے کہ مکہ میں جنگی مہمات کی قیادت بنوامیہ کے مورث اعلی عبدشمس، پھر امیہ، پھر حرب بن امیہ کے پاس رہی۔جنہوں نے جنگ عکاظ، ذات نکیف، فجار اولی اور فجار ثانیہ میں قریش کی فاتحانہ قیادت کی۔حرب کے بعد یہ منصب ان کے بیٹے ابوسفیان کو ملا۔حرب ہی وہ شخص تھے جو

سب سے پہلے حیرہ سے عربی خط حجاز کے علاقے میں لے کر آئے [1]۔

ابوسفیان بن حرب:

حضرت ابوسفیان عرب کی بڑی شخصیتوں میں سے تھے۔ وہ قریش کے اہم قائدین میں شمار ہوتے تھے اور عربوں میں قریش کی سیادت تو مسلم ہے۔ ابن کثیر کہتے ہیں۔

من سادات قریش فی الجاھلیة وتفرد بالسؤدد بعد بدر۔ (البدایہ والنہایہ: ۱۲۵/۸)

جاہلیت کے دور میں قریش کے سرداروں میں سے تھے، اور بدر کے بعد تو وہی سب سے بڑی شخصیت تھے۔

مکہ کی شہری ریاست میں بنوامیہ کو دفاع و جنگ کی قیادت کا جو منصب تفویض تھا، آخر میں وہ ابوسفیان ہی کے پاس تھا، اس کے علاوہ تجارت میں بھی ابوسفیان کا غیر معمولی مقام تھا، قریش بہت دولت مند قوم تھے ان کی جس شامی تجارت کا تذکرہ تاریخی مآخذ کرتے ہیں، بار ہا ابوسفیان ہمیں ان تجارتی وفدوں کے قائد نظر آتے ہیں۔ حدیث کی کتابوں میں بھی قریش کے تجارتی قافلوں میں امیر کی حیثیت سے متعدد موقعوں پر ابوسفیان کا نام ملتا ہے۔ ابن کثیر کہتے ہیں: وکان رئیسا مطاعا ذا مال جزیل"۔ اپنی قوم کے مسلّم سردار اور بہت مالدار تھے۔ (البدایہ والنہایہ: ۲۳/۸)

حالت کفر میں بھی امانت دار تھے۔ ہجرت سے قبل ابوسفیان کے ساتھ رسول اللہؐ نے بھی اپنا مال تجارت شام بھیجا تھا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی موقعے پر یہ بھی کہا تھا کہ مجھے ابوسفیان کی امانت پر اعتماد ہے [2]۔

اسلام سے قبل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص معاون چچا حضرت عباس رضی اللہ تعالی عنہ کے بہت قریبی دوست اور ساتھی (خدنا و صدیقاً) کے طور پر بھی معروف تھے۔ (مصنف عبدالرزاق: ۹۷۳۹)۔

کفر کے دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اسلام سے ابوسفیان کے تعلق کی نوعیت:

ابوسفیان مکہ کے سیاسی رہنما اور محکمۂ جنگ کے قائد تھے۔ اس منصب کی حیثیت سے ان کا اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلے میں وہی موقف رہا جو اجتماعی طور پر اسلام لانے سے قریش کا تھا، یعنی کفر و مخالفت اور حرب و جنگ۔ غزوۂ بدر میں تو وہ موجود نہیں تھے، اسی لئے سپہ سالاری ان کے چچازاد بھائی عتبہ

---

[1] الطبقات الکبریٰ متمم الصحابة، الطبقة الرابعة: ۷۳، مطبوعہ مکتبۃ الصدیق، طائف، ۱۴۱۶ھ۔

[2] انساب الاشراف: ۱۰/۵۔۱۱۔

بن ربیعہ بن عبدشمس کے ہاتھ میں تھی، جو ان کے خسر بھی تھے۔ لیکن اس کے بعد احد اور خندق دونوں جنگوں کے قائد وہی تھے۔ پھر فتح مکہ کے موقعہ پر جب قریش نے ہتھیار ڈالے اور اسلام قبول کیا تو اس موقف کی نمائندگی بھی حضرت ابوسفیان نے ہی کی۔

ابوسفیان چونکہ محکمۂ جنگ کے قائد تھے اس لئے جنگوں کی قیادت و امارت سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سلسلے میں ان کے رویے میں عام عبد مناف کے خاندانوں کے کفر و انکار کے علاوہ کوئی خاص عناد و دشمنی یا ایذا رسانی کا تذکرہ نہیں ملتا۔ جو عام افراد خاندان کا رویہ تھا وہی ابوسفیان کا تھا۔ جب کہ اسی خاندان کے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریب ترین خاندان بنو ہاشم کے کچھ افراد مثلاً ابولہب دشمنی وعداوت اور ایذا رسانی میں ابوسفیان سے بہت آگے تھے۔ ابوسفیان بن الحارث بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا زاد بھائی تھے، رضاعی بھائی بھی تھے، اسلام سے پہلے بہت دوستانہ تعلق تھا، مگر بعد میں دشمن ہو گئے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجو میں نہایت سخت جارحانہ اشعار کہتے تھے [۱]۔

دیگر سرداران قریش ابوجہل وغیرہ کی جن بدگوئیوں اور ایذا رسانیوں کے تذکرے مآخذ نے کیے ہیں ابوسفیان کے حوالے سے ایسا کچھ نہیں ملتا۔ بلکہ مآخذ میں متعدد ایسی مثالیں ہیں جو ان کی ایسی شخصیت کا تعارف کراتی ہیں جو کفر و انکار کے باوجود ایک شریفانہ معاملہ استوار رکھتی تھی۔ بلاذری نے اس کی صراحت کی ہے کہ قریش کے متعدد افراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سخت مخالف اور دشمن تھے۔ جن میں سب سے سخت ابولہب، ابوجہل اور عقبہ تھے۔ ابوسفیان، عتبہ اور شیبہ (تینوں ایک ہی خاندان کے اشخاص) بھی دشمن تھے، مگر اوپر مذکور سخت دشمنوں کی طرح نہیں تھے۔ یہ بس قریش کے عام جاہلوں جیسے تھے (انساب الاشراف: ۱/ ۱۲۴)۔

ابن سعد نے بسند صحیح و متصل ثابت بنانی (تابعی محدث) سے نقل کیا ہے کہ مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جب ایذا رسانیوں کا سامنا ہوتا تھا تو کبھی کبھی آپ ابوسفیان کے گھر میں (پناہ لینے) چلے جایا کرتے تھے۔ ثابت کہتے ہیں کہ اسی حسن سلوک کا بدلہ تھا کہ آپ نے فتح مکہ میں اعلان فرما دیا جو ابوسفیان کے گھر میں چلا جائے مامون ہے۔ ابن سعد نے ہی عکرمہ تابعی سے روایت کیا ہے کہ ایک مرتبہ مدینہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابوسفیان

---

[۱] المواھب اللدنیہ مع شرح الزرقانی: ۵/ ۳۱۴، اسلام سے دلوں کی کیسی کایا پلٹ ہوتی تھی، اس کی ایک مثال یہ ابوسفیان بن الحارث بھی تھے، اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دشمنی چھوڑ کے فتح مکہ میں اسلام لائے۔ فوراً بعد غزوۂ حنین پیش آیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سو جان نثار تھے، نہایت خطرناک موقعے پر، جب اکثر صحابہ کے پاؤں اکھڑ گئے تھے، سو سے بھی کم لوگ ساتھ رہ گئے تھے (سنن ترمذی: ۱۶۸۹) ابوبکر و عمر، علی اور مہاجرین وانصار رضی اللہ عنہم کے چند افراد اور چند اہل خاندان کے ساتھ ابوسفیان بن حارث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس موجود رہے اور دوسروں کو بھی آواز دے دے کے بلا لیا۔ (ابن اسحاق، بسند حسن، سیرت ابن ہشام: ۲/ ۴۴۳)۔

کو عجوہ کھجوریں ہدیہ میں بھیجیں۔ اوران سے فرمائش کی کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے کچھ چمڑا ہدیہ میں بھیج دیں۔ حافظ ابن حجر نے عکرمہ مولیٰ ابن العباس تک اس کی سند کو صحیح کہا ہے [۱]۔

یہ دونوں روایتیں اگرچہ حدیثی معیار نقد سے مرسل و منقطع ہیں مگر تاریخی استناد کے معیار پر پوری اترتی ہیں۔ احادیث کی بعض صحیح روایات ابوسفیان کے شریفانہ رویہ کی شہادت دیتی ہیں، ان کے بعد یہ مرسل روایات بھی قرینِ قیاس ٹھہرتی ہیں۔ اسی لیے ہم نے ان کو ذکر کیا ہے۔ اور یہی ہماری کتاب کا طرز ہے۔ حدیث کی کتابوں میں ایک اور واقعہ آتا ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ عہد کفر میں بھی ابوسفیان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس نظر سے نہیں دیکھتے تھے، جس سے ابوجہل جیسے شدید العداوت مخالفین کو دیکھتے تھے۔ واقعہ کچھ یوں ہوا کہ حضرت علیؓ نے ابوجہل کی بیٹی سے نکاح کرنا چاہا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی کو اس سے سختی سے منع فرمایا، اور اس منع فرمانے کا ایک سبب یہ بتایا کہ خدا کے رسول اور خدا کے دشمن کی بیٹیاں ایک گھر میں نہیں ہوسکتیں (صحیح بخاری: ۳۱۱۰)۔ دوسری طرف آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابوسفیان کے اسلام لانے سے بہت پہلے ان کی صاحبزادی حضرت ام حبیبہؓ سے نکاح فرمایا۔ اور ابوسفیان نے اس کو تسلیم کیا اور رشتہ رکھا۔

ابوسفیان اسلام کے خلاف جنگوں کے قائد:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ ہجرت کر جانے کے بعد مکہ کو عرب میں اپنی برتر پوزیشن پر خطرہ نظر آنے لگا تھا۔ قریش نے یہود کے ذریعہ مدینہ سے مہاجرین کو نکلوانے کی سازشیں کیں (سنن ابوداؤد: ۳۰۰۴)۔ قبائل عرب کے ساتھ ان کے معاہدات تھے۔ انہوں نے انکے ساتھ اپنے تعلقات اور رسوخ کا استعمال کرکے مسلمانوں کی اقتصادی ناکہ بندی کی۔ یہاں تک کہ مہاجرین اپنے آبائی پیشے تجارت کے لیے مدینہ سے باہر بھی نہیں نکل سکتے تھے [۲]۔ مدینہ پر مسلسل شب خون کا خطرہ طاری رہتا تھا۔ قریش کی اسلام اور مسلمانوں سے اس طویل و مسلسل جنگ کے قائد ابوسفیان ہی تھے۔ دراصل قریش میں جنگی قیادت کا منصب بنوامیہ (عبد شمس) میں ہی ہوتا تھا، اور اس دور میں اس پر ابوسفیان ہی فائز تھے۔

بدر میں ابوسفیان خود شریک نہیں ہوئے، وہ اس تجارتی قافلہ کے سردار تھے جو شام سے واپس آرہا تھا اور وہی جنگ بدر کا اصل سبب بنا تھا۔ لیکن اس کے بعد غزوۂ احد اور خندق میں وہی قریش لشکر کے قائد تھے۔ اس پورے دور (فتح مکہ تک) کی تاریخی روایات ان کو اسلام مخالف محاذ کے سپہ سالار کی حیثیت میں دکھاتی ہیں۔

---

[۱] الطبقات الکبری، متمم الصحابة، الطبقة الرابعة: ۸۳، الاصابه: ۳/ ۳۳۳۔

[۲] ملاحظہ ہو: سورۂ بقرہ: ۲۷۳، اور اس کی تفسیر تفسیرِ ابن کثیر میں۔

نازک موقع پر ایک شریف مخالف کا انداز:

اس کے بعد صلح حدیبیہ ہوتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صلح حدیبیہ کے بعد فرمانروایان عالم کو خطوط ارسال فرمائے تھے۔ قیصر کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خط اس وقت موصول ہوا جب وہ بیت المقدس آیا ہوا تھا۔ اس نے فوراً حکم دیا کہ شامی علاقوں میں اگر قریش کا کوئی تجارتی قافلہ ہو تو حاضر کیا جائے۔ ایک قافلہ ''غزّہ'' میں مل گیا، دربار میں حاضر کیا گیا۔ چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قیصر کو دعوت اسلام دی تھی، اس لیے دربار میں وزراء واعیان سلطنت کے علاوہ اہم ترین مذہبی شخصیات بھی بلائی گئی تھیں۔ ابوسفیان اس قافلہ میں موجود تھے۔ قیصر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احوال جاننے کے لیے پوچھا کہ تم میں سے اس شخص کا سب سے قریبی رشتے دار کون ہے؟ ابوسفیان کہتے ہیں کہ اس وفد میں خاندان عبدمناف کا میں ہی تھا۔ میں نے بادشاہ سے کہا: وہ میرے چچازاد ہیں۔

ابوسفیان کے لیے یہ بڑا مشکل اور نازک موقعہ تھا۔ وہ دیکھ رہے تھے، جیسا کہ بخاری وغیرہ کی یہی روایت بتا رہی ہے، کہ دنیا کی ایک سپر پاور کو دعوت اسلام دی گئی ہے، دربار میں اس پر مشورہ ہو رہا ہے، بادشاہ خود بڑا مذہبی عالم ہے، بہت سنجیدگی سے اسلام پر غور کر رہا ہے، وہ صاف کہہ رہا تھا کہ دل محمدؐ کی دعوت سے متأثر ہے۔ ابوسفیان خود کہتے ہیں کہ میں سمجھ گیا کہ محمد کا ستارہ عروج پہ ہے۔ قیصر روم اس کی تعظیم کر رہا ہے۔ ان کو اندیشہ ہوا کہ اگر قیصر اس دعوت کو قبول کر لے گا تو دنیا میں اسلام کا بول بالا ہونے سے کوئی روک نہیں سکتا۔ اور پھر قریش کے لیے کوئی جائے پناہ مشکل ہے۔ مگر اس سب کے باوجود قیصر کے سوالات پر انہوں نے سب سچ سچ بتایا، کچھ جھوٹ نہیں بولا۔ انہوں نے واضح لفظوں میں گواہی دی کہ وہ شخص (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) عالی نسب ہے، سچا و امانت دار ہے، وفائے عہد اور اخلاقی کمالات سے متصف ہے۔ قیصر نے پوچھا کہ اس نبی کی دعوت کیا ہے؟ ابوسفیان نے صاف کہا:

> اس کی دعوت خدا پرستی کی ہے، کہتا ہے: صرف اللہ کی عبادت کرو۔ ہمیں نماز کا حکم دیتا ہے۔ صدقہ کرنے کو کہتا ہے۔ اس کی تعلیم پاک دامنی کی ہے۔ وہ کہتا ہے: عہد پورے کرو اور امانت ادا کرو۔

غرض انہوں نے قیصری دربار کے سوالات کے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کی دعوت کا ایسا تعارف کرایا کہ قیصر کہہ اٹھا:

> هذه صفة النبي، قد كنت اعلم انه خارج، ولكن لم أ ظن أنه منكم، وان يك ما قلت حقاً فسيملك موضع قدميّ هاتين، ولو أرجو أن أخلص اليه لتجشمت لقياه،

ولو کنت عندہ لغسلت قدمیہ۔

یہ تو اسی نبی کی نشانیاں ہیں (جس کا ہم اہل کتاب کو انتظار ہے)۔ مجھے یقین تھا کہ ''اس نبی'' کا وقت آ گیا ہے۔ مگر یہ نہیں سمجھتا تھا کہ وہ تم میں آ جائیں گے۔ اگر تم جو کہہ رہے ہو وہ سچ ہے تو ایک دن یہ سرزمین شام بھی ان کے زیر اقتدار ہوگی۔ میرے لیے اگر ممکن ہوتا تو جا کر ملاقات کرتا اور ان کے پاؤں دھوتا۔ (صحیح بخاری ۲۹۴۱۔ ۴۵۵۳)۔

خود حضرت ابوسفیانؓ کہتے ہیں اس موقعہ پر رسول اللہ ﷺ کے بارے میں سچ سچ بتانا مجھ کو شاق گزر رہا تھا۔ مگر ''کیا کرتا؟ جھوٹ بول نہیں سکتا تھا''۔ یہ واقعہ ابوسفیان کی ماقبل اسلام شخصیت، کردار و مزاج اور نفسیات کا کافی کچھ پتہ دیتا ہے۔

ابوسفیان کا قبول اسلام:

ابوسفیان فرمایا کرتے تھے کہ قیصر کی مذکورہ بالا شہادت کے وقت ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اب اسلام اور رسول اللہ ﷺ کے غلبے کو کوئی روک نہیں سکتا۔ یہاں تک کہ اللہ نے مجھے اسلام پر مجبور کر دیا۔ حتی ادخل اللہ علیّ الاسلام (صحیح بخاری:۷)۔

رسول اللہ ﷺ نے جنت میں داخل ہونے والے ایسے خوش نصیبوں کے بارے میں بھی خبر دی ہے جن پر اللہ تعالی کا یہ خصوصی کرم ہوگا کہ ان کو حالات مجبور کر کے اسلام میں داخل کر دیں گے۔ اور پھر وہ جنت میں جائیں گے۔ عجب اللہ من قوم یدخلون الجنۃ فی السلاسل (صحیح بخاری:۳۰۱۰) شاید حضرت ابوسفیانؓ بھی ایسے ہی خوش نصیب لوگوں میں تھے۔

فتح مکہ میں رسول اللہ ﷺ کا عظیم لشکر مکہ مکرمہ اچانک جا پہنچا۔ مکہ والوں کو ان کا خفیہ اطلاعات کا نظام آگاہ نہیں کر سکا۔ لشکر نے مکہ سے 16 میل دور مرّ الظہر ان کے مقام پر پڑاؤ ڈالا تو قریش کو کچھ آہٹ ملی۔ اس سے پہلے ہی حضرت عباس (جو بہت پہلے اسلام لا چکے تھے لیکن مصلحۃً ظاہر نہیں کرتے تھے) رسول اللہ ﷺ سے جا ملے تھے۔ مرّ الظہر ان میں پڑاؤ ڈالے جانے کے بعد حضرت عبّاس نکلے۔ اور قریش کے سرداروں کو ہتھیار ڈالنے پر آمادہ کرنے کی کامیاب کوشش فرمائی۔ اس سلسلے میں ابوسفیان سے ملاقات ہوئی۔ جو خود حالات کا جائزہ لینے نکلے ہوئے تھے۔ حضرت عباسؓ اور ابوسفیان کے درمیان بہت قریبی دوستانہ تعلقات تھے۔ انہوں نے ابوسفیان سے کہا کہ مکہ والے اب مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ چلو میں تم کو رسول اللہ ﷺ سے امان دلوا دیتا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے ابوسفیان کو اسلام کی دعوت دی۔ ابوسفیان نے نرم گفتگو کی، لیکن اسلام قبول

کرنے میں تردد کا اظہار کیا۔ یہ غالبا رات کا وقت تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عباس ؓ سے کہا کہ ان کو اپنے خیمے میں ٹھہرائیں۔ صبح پھر ملاقات کے لیے لے کر آئیں۔ اگلے دن انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ حضرت عباس ؓ ان کو ایک ایسے پہاڑی ناکہ پر لے کر بیٹھے جہاں سے لشکر اسلام گزرے، تو ابوسفیان اس کی شوکت و رعب کا مشاہدہ کر سکیں۔ یہاں سے حضرت ابوسفیان مکہ گئے اور آخر کار سارے قریش نے اطاعت قبول کی۔

یہاں یہ امر خاص طور پر قابل غور ہے کہ حضرت ابوسفیان نے اس وقت اسلام قبول فرمایا تھا جب ابھی مکہ فتح نہیں ہوا تھا، اور صرف یہی نہیں، بلکہ اہل مکہ میں سے ایک تعداد نے بہر حال جنگ کرنے کا فیصلہ بھی کیا تھا، اور مکہ کے باہر سے بھی لڑاکے منگوا لیے تھے، جس کے نتیجے میں مسلمانوں کو جنگ کرنے کی ضرورت بھی پڑی تھی اور حضرت خالد بن ولید ؓ کی بٹالین کے دو مسلمان شہید بھی ہوئے تھے۔ (صحیح بخاری: ۴۲۸۰)۔

ابوسفیان کی تالیف قلب:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت عباس ؓ نے ابوسفیان کے ساتھ بڑی رعایت و مدارات کا معاملہ فرمایا۔ جس کا نمایاں واقعہ یہ ہے کہ حضرت عباس ؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے درخواست کی کہ ''ابوسفیان ذرا فخر پسند ہیں، کچھ اس کی تسکین کے لئے بھی فرما دیجئے''، تو آپ نے وہ مشہور اعلان فرمایا کہ: **من دخل دار ابی سفیان فھو آمن**'' مکہ میں جو ابوسفیان کے گھر میں چلا جائے گا وہ مامون ہے [۱]۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ کے نئے اسلام قبول کرنے والے بااثر لوگوں کو خصوصی طور سے اور بعض دیگر عرب سرداروں کو بھی غزوۂ حنین کے مال غنیمت میں سے بہت عطا فرمایا۔ اس کا مقصد ان کے دلوں میں محبتِ اسلام کی آبیاری، ایمان میں رسوخ پیدا کرنا، اور پچھلی نفرتوں کا خاتمہ تھا۔ فاتح وہی ہے جو دلوں کو فتح کر لے۔ اور یہی ہوا۔ مکہ کے ان نئے مسلمانوں نے مستقبل میں اسلام کے لیے عظیم کارنامے انجام دیے۔ ان میں ابوسفیان بھی تھے۔ ان کو بھی سو اونٹ کی خطیر دولت عطا فرمائی۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سرداران عرب کو جس مصلحت کے پیش نظر ان بخششوں سے نوازا تھا، وہ مصلحت، بتوفیق خداوندی، حاصل ہوئی۔ اس عام معافی اور فیاضانہ بخشش نے ان سرداروں کا دل جیت لیا اور اسلام اور مسلمانوں کی گہری محبت ان کے دلوں میں پیدا ہو گئی۔ فتح مکہ کے بعد ایک سیل رواں کی طرح یکلخت اسلام سارے عرب میں جو پھیل گیا، اور قبائل میں سے کسی خاص بڑی مزاحمت کی نوبت نہیں آئی، اہلِ نظر سمجھتے ہیں کہ اس میں رسول اللہ صلی وسلم کی اس حکمت عملی کا بڑا کردار تھا۔

---

[۱] سنن ابوداؤد: ۳۰۲۱، معجم کبیر: ۷۲۶۴ بسند حسن، صحیح مسلم: ۱۷۸۰

اس دادو دہش کا اثر ان لوگوں پر، جنہوں نے فتح کے بعد بھی اسلام قبول نہیں کیا تھا، عجیب ہوا۔ نہ صرف یہ کہ انہوں نے اسلام قبول کیا، بلکہ ان کے دل پلٹ گئے۔ حضرت صفوان بن امیہؓ فرماتے تھے: پہلے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے سخت ناپسند تھے۔ مگر آپ نے مجھے اتنا عطا فرمایا اور بار بار عطا فرمایا کہ مجھے ان سے سب سے زیادہ محبت ہو گئی [۱]۔

حضرت حکیم ابن حزامؓ (جو اسی موقعے پر اسلام لائے) بار بار مانگے جاتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بر سر موقعہ نصیحت فرمائی، حرص کی مذمت بیان کی اور مال میں اللہ کے حقوق یاد دلائے۔ بس فوراً دل بدل گیا۔ عرض کیا: اے اللہ کے رسول! قسم اس خدائے عالی شان کی، جس نے آپ کو رسول برحق بنایا، اب مرتے دم تک کسی سے کچھ نہیں لوں گا۔ حضرت حکیم بن حزام نے پھر اس عہد کو اس حد تک نبھا کر دکھا دیا کہ بیت المال سے جو عطایا اور وظائف عام مسلمانوں کے لیے جاری ہوتے تھے، ان کو بھی کبھی قبول نہیں کیا۔ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ بلاتے رہ جاتے، مگر حضرت حکیمؓ قبول نہیں فرماتے تھے۔ حضرت معاویہ کی خلافت کے دسویں سال انتقال فرمایا اور اس معمول میں فرق نہ آنے دیا [۲]۔

آن حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس بخشش فراواں کا حال بیان کرنے کے بعد حضرت انس رضی اللہ تعالی عنہ اس کے اثرات کو بیان فرماتے ہیں:

> ان كان الرجل ليسلم ما يريد الا الدنيا، فما يسلم حتى يكون الاسلام أحب اليه من الدنيا وما عليها (صحیح مسلم: ۲۳۱۲)
>
> کچھ لوگ صرف دنیاوی مفاد کے لیے اسلام قبول کرتے تھے۔ لیکن اسلام لاتے ہی ان کا حال یہ ہو جاتا تھا کہ اسلام ان کو دنیا و مافیہا سے زیادہ محبوب و عزیز ہو جاتا تھا۔

حکومتی مناصب و ذمہ داریاں:

مختلف مآخذ کی روایت کے مطابق حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے موقعہ بہ موقعہ اپنی حکومت کے انتظامی امور سپرد فرمائے۔ اس میں غالباً سب سے پہلی مہم جو ان کے حوالے کی گئی وہ حنین کے قیدیوں کی نگرانی تھی۔ مصنف عبدالرزاق میں حضرت سعید بن مسیب تابعی کی مرسل روایت بسند صحیح موجود ہے کہ رسول اللہ

۱۔ صحیح مسلم: ۲۳۱۳، صحابہ کی سچائی اور سادگی کا مسحور کن نمونہ دیکھیے کہ حضرت صفوانؓ خود ہی فرماتے ہیں کہ میرا یہ انقلاب حال مال پا کر ہوا، رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ۔ عربوں کی یہ سچائی اور صاف گوئی ان صفات میں سے تھی، غالباً جن کی بنا پر اللہ تعالی نے ان کا خصوصی انتخاب واجتباء فرمایا تھا۔

۲۔ صحیح بخاری: ۱۴۷۲، مصنف عبدالرزاق: ۱۶۴۰۷، فتح الباری: ۳/ ۳۳۶۔

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو ہوازن کے قیدیوں کا نگراں مقرر فرمایا تھا (مصنف: ۵/ ۳۸۱)۔

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوسفیانؓ اور حضرت مغیرہ بن شعبہ ثقفیؓ کو ثقیف کے خاص بت ''الطاغیۃ'' کو توڑنے کی مہم پر بھیجا۔ طائف کے لوگ اسلام تو لے آئے تھے، مگر انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے درخواست کی تھی کہ طاغیۃ ہمارا بت ہم سے نہ توڑا جائے گا، اسے توڑنے کے لیے آپ ہی کسی کو بھیج دیں۱۔

جب نجران کے عیسائی لیڈران کا ایک وفد مدینہ آیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے ساتھ صلح کا تحریری معاہدہ فرمایا، تو اس پر حضرت ابوسفیان کے بھی بطور گواہ دستخط ہیں، یہ معاہدہ متعدد مآخذ میں موجود ہے۔ مآخذ میں یہ بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ وسلم نے ان کو نجران کا عامل بنایا تھا۲۔

ان کے علاوہ بھی حضرت ابوسفیانؓ کو بعض مناصب پر سرفراز کیے جانے کی روایات تاریخی مآخذ میں ملتی ہیں۔ مگر ہم نے صرف وہی ذکر کی ہیں، جن کے ہم کو طاقت ور شواہد ملے ہیں، اسی لیے مشہور محدث قسطلانی اور معروف محقق سیرت نگار علامہ زرقانی نے حضرت ابوسفیانؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے امراء اور آپ کی حکومت کے عہدے داروں کی فہرست میں ذکر کیا ہے۳۔

تاریخی روایات میں استناد کا وہ معیار نہیں ہوتا جو حدیث کی کتابوں میں برتا جاتا ہے۔ لیکن حضرت ابوسفیانؓ کے بارے میں مختلف ریاستی امور و مناصب کی سپردگی کے اتنے شواہد ہیں کہ یہ تسلیم کئے بنا چارہ نہیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معتمد اور امور سلطنت میں کارکن تھے۔

حضرت ابوسفیانؓ خلافت راشدہ کے دور میں:

حضرت عمر کے دور میں شام کے علاقے میں ''یرموک'' کا ایک بڑا فیصلہ کن معرکہ پیش آیا۔ شام میں اہل اسلام کی چار فوجیں متحرک تھیں۔ حضرت عمرؓ نے ابوسفیانؓ کے ایک بیٹے حضرت یزیدؓ بن ابی سفیانؓ کو اس جنگ میں ان میں سے ایک کا سربراہ طے فرمایا۔ حضرت ابوسفیان اس جہاد میں شریک ہوئے اور بڑے ایمان اور جذبۂ جہاد کے ساتھ شریک ہوئے۔ کثیر تعداد میں تاریخی مآخذ نے اس موقعہ پر حضرت ابوسفیان کے جہاد و صدق کی تفصیلات ذکر کی ہیں۔

---

۱ یہ واقعہ ابن اسحاق، موسی بن عقبہ اور واقدی سمیت بہت سے مؤرخین نے ذکر کیا ہے۔ (البدایہ والنہایہ: ۵/ ۳۶)

۲ ابن سعد: ۱/ ۳۸۵ فتوح البلدان: ۷۲، ڈاکٹر حمید اللہ مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ: ۱۷۹۔ فتوح البلدان: ۷۶، و تاریخ طبری: ۳/ ۳۱۸۔

۳ المواہب اللدنیہ مع شرح الزرقانی: ۴/ ۵۵۲۔

حضرت سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ اپنے والد حضرت مسیبؓ سے (جو جنگ یرموک میں شریک تھے) روایت کیا ہے کہ جنگ یرموک کے دوران ایک وقت ایسا ہول کا سناٹا طاری ہوا کہ کوئی آواز ہی نہیں تھی۔ بس ایک آواز گونج رہی تھی اور وہ حضرت ابوسفیانؓ کی تھی۔ وہ اپنے بیٹے یزید کی جماعت میں کھڑے دعا کر رہے تھے: اواللہ! مدد جلد بھیج دے۔ یا نصر اللہ اقترب۔ کبھی پکار لگاتے: مسلمانو! جم کر لڑنا'' اسی جنگ میں ان کی ایک آنکھ بھی شہید ہوگئی [1]۔

اس لشکر میں حضرت ابوسفیان ''القاص'' (یعنی جہاد میں ولولہ وجوش پیدا کرنے والے خطیب) کے منصب پر فائز تھے۔ ابن کثیر نے ان کے خطبوں کے ہمت آفریں اور ولولہ انگیز جملے نقل کیے ہیں، جن سے وہ شوق شہادت پیدا کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ ''یہ موقعہ ہے، لوگو!۔۔ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جناب میں سرخ رو ہوکر پیش ہو سکتے ہو''۔۔۔۔ لشکر کی ایک ایک ٹکڑی کے پاس جاتے اور ندا لگاتے:

الله الله !أنتم دارة العرب و أنصار الإسلام، وإنهم دارة الروم و أنصار الشرك.

اللہ کو یاد کرو، اللہ کو یاد کرو، تم عرب ہو اور اسلام کے حامی وناصر۔ اور وہ رومی ہیں اور شرک کے حامی وداعی۔

کبھی دعا کرنے لگتے:

اللهم أنزل نصرك على عبادك، اللهم هذا يوم من أيامك۔

خداوندا! اپنے عاجز بندوں کی مدد فرما۔ اے اللہ آج کا دن تیرا دن ہے۔

اپنے بیٹے یزید کے پاس جاتے اور کہتے تقویٰ اختیار کرو۔ اور جمے رہنا۔ کمزوری مت دکھانا۔ تمہارے ماتحتوں میں کوئی اجرآخرت کے شوق میں تم سے آگے نہ ہو۔ (ابن کثیر: ۷/ ۱۳، سیر الاعلام: ۲/ ۱۰۶)

حضرت ابوسفیانؓ کی خاندانی عظمت کی وجہ سے صحابۂ کرام یہاں تک کہ حضرت عمر فاروقؓ بھی ان کا احترام کرتے تھے۔ امام ذہبی فرماتے ہیں: وكان عمر يحترمه، وذلك لانه كان كبير بني أمية (سیر الاعلام: ۲/ ۱۰۷)۔ بنی امیہ کے سردار ہونے کی وجہ سے حضرت عمرؓ ان کا احترام کرتے تھے۔

حضرت معاویہؓ کی والدہ ہندؓ:

ہند خاندان عبد مناف کی عبشمی شاخ کے اہم فرد اور قریش کے سردار عتبہ بن ربیعہ کی بیٹی تھیں۔ جیسا کہ گذر چکا ہے۔ یہ خاندان عرب کا نہایت معزز خاندان تھا۔ خود ہند قریش کی ایک بڑی باحیثیت خاتون شمار ہوتی تھیں۔ ابن کثیر لکھتے ہیں: وكانت من سيدات نساء قريش ذات رأى ودهاء ورياسة (البداية والنهاية:

[1] الطبقات الكبرىٰ، متمم الصحابة، الطبقة الرابعة: ۹۱، بسند صحیح۔ حافظ ابن حجر نے فرمایا ہے کہ ابن سعد اور یعقوب بن سفیان فسوی نے اس کو سند صحیح سے روایت کیا ہے۔ الاصابہ: ۳/ ۳۳۴

۷/ ۵۹)۔یعنی قریش کی سردار خواتین میں سے تھیں، نہایت عقل مند و زیرک اور بلند مرتبہ تھیں۔ھند کفار کے ایک اہم خاندان کی فرد تھیں۔اور کوئی تعجب نہیں کہ مسلمانوں کی مخالفت میں سخت تھیں۔جنگوں کے موقعہ پر قریش کی دیگر خواتین کے ساتھ اس دور کے دستور کے مطابق فوج کو جوش دلاتیں۔

مگر معلوم ہوتا ہے کہ، بالکل اپنے شوہر (اور باپ) کی طرح، یہ شدت قومی معاملات میں تھی، لیکن انفرادی سطح پر ہند کا معاملہ بھی شرافت کا آئینہ دار تھا۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا بنوامیہ ہی کے خاندان میں بیاہی گئی تھیں۔ہجرت نبوی کے بعد مکہ میں پھنسی رہ گئی تھیں۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو لینے کے لئے دو آدمی بھیجے۔اُدھر حضرت زینب رضی اللہ عنہا ہجرت کی تیاری کر رہی تھیں۔ابن اسحاق کی روایت ہے کہ اس موقعہ پر ہند نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے بڑی ہمدردی سے معلوم کیا کہ اگر سفر کے اسباب میں کچھ کمی ہو، یا سفری اخراجات کے لیے پیسوں کی ضرورت ہو تو مجھے خاموشی سے بتا دینا۔سیاسی لڑائیاں اپنی جگہ، میں تمہاری مدد کر دوں گی۔حضرت زینب رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ”میں اگر چہ ان کی اس پیشکش کو سچ ہی سمجھ رہی تھی، مگر احتیاطاً یہی کہنا مناسب سمجھا کہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے“۔

آخر کار حضرت زینب رضی اللہ عنہا اپنے دیور کنانہ بن الربیع کے ساتھ نکلیں۔ان کے شوہر کے گھر والوں سے، جو بنی امیہ میں سے تھے، ایک غلطی یہ ہوگئی کہ وہ دن کی روشنی میں ان کو لے کر مدینہ بھیجنے کے لیے علانیہ نکلے۔قریش کے دیگر خاندانوں نے اس کو چیلنج سمجھا اور ان میں غصہ کی لہر دوڑ گئی۔غزوۂ بدر کا زخم ابھی تازہ تھا۔وہ تلملا اٹھے۔حضرت زینب رضی اللہ عنہا اور ان کے ساتھ جانے والے دیور کنانہ اموی کو گھیر لیا گیا۔حضرت زینب کجاوہ سے گر پڑیں۔خطرہ تھا کہ مزید نقصان نہ ہو جائے۔اس موقعہ پر ابوسفیان (جو اسی خاندان سے تھے) آئے اور حضرت زینب کے دیور (کنانہ) سے بات کی کہ بھائی یہ تم نے کیا کیا؟ تم کو معلوم ہے، بدر میں قریش کو محمد سے کیسی بھاری شکست ہوئی ہے! کتنے بڑے بڑے لوگ مارے گئے ہیں! تم ہی بتاؤ، اگر اس طرح اعلانیہ محمد کی بیٹی مکہ سے چلی گئی تو حرم میں ہماری کمزوری کا کیسا تاثر پیدا ہوگا؟ اور قریش کے لیے ایک مزید ذلت کی بات ہوگی۔اس وقت واپس لے جاؤ، چند دنوں بعد لوگ ٹھنڈے پڑ جائیں گے، تو خاموشی سے نکال لے جانا۔آخر ایسا ہی کیا گیا۔(سیرت ابن ہشام: ۱/ ۶۵۵)۔

غزوۂ احد میں ہند کا کردار:

غزوۂ بدر میں قریش کے بڑے بڑے سردار مسلمانوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ان میں ہند کے باپ عتبہ، بھائی ولید اور چچا شیبہ تینوں شامل تھے۔قریش کے ہر گھر میں ماتم اور ہر سینے میں جوش انتقام تھا۔احد

کے حملے میں خواتین بھی ساتھ گئیں، ان میں ہند بھی تھیں۔ میدان معرکہ کے چاروں طرف گھوم گھوم کر جوش وولولہ پیدا کررہی تھیں۔

ابن اسحاق اورواقدی نے بلا سند روایت میں ذکر کیا ہے کہ وہ مکہ کے ایک حبشی غلام وحشی کو بار بار حضرت حمزہؓ کے قتل پر ابھارتی اور انعام کا وعدہ کرتی تھیں۔ (ابن ہشام: ۶۲/۲) روایت اگرچہ بلا سند ہے مگر ہند کا ایسا کرنا کوئی بعید بھی نہیں۔ اس لیے کہ ان کا باپ عتبہ حضرت حمزہ ہی کے ہاتھ مارا گیا تھا۔ تو بالکل ممکن ہے کہ ہند انتقام کی آگ بجھانے کے لیے حضرت حمزہ کے قتل کی متمنی ہوں۔ مگر صحیح بخاری کی روایت کے مطابق، جو ابن اسحاق نے بھی اپنی صحیح سند سے روایت کی ہے، جب خود حضرت وحشیؓ سے حضرت حمزہ کے قتل کی تفصیل پوچھی گئی تو انہوں نے ہند کا نام نہیں لیا بلکہ یوں کہا کہ میں جبیر بن مطعم کا غلام تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ بدر میں حمزہ نے میرے چچا (طیمہ) کو قتل کیا تھا۔ تم اگر ان کو قتل کردو تو تم آزاد ہو۔ (صحیح بخاری: ۴۰۷۲)۔ لہٰذا اب یہ بعید ہے کہ ہند نے وحشی کو حضرت حمزہ کے پیچھے لگایا ہو۔

صحیح بخاری (۴۰۴۳) اور دیگر صحیح روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین نے مسلمان شہداء کے ساتھ مثلہ کی حرکت کی تھی۔ اور غالباً حضرت حمزہ کے جسم مبارک کے ساتھ بھی ایسا ہونا روایات سے ثابت ہے [۱]۔ جہاں تک اس میں ہند کے کردار کا تعلق ہے، تو تاریخی مآخذ میں کثرت سے اس کا مجرم ہند (مع دیگر مشرک خواتین) کو قرار دیا گیا ہے۔ ان میں کوئی روایت صحیح نہیں ہے۔ یہ روایات ایسی دل دوز تفصیلات ذکر کرتی ہیں کہ ان کو نقل کرنا مشکل ہے۔ یہ بتاتی ہیں کہ ہند اور اس کے ساتھ کی مشرک عورتوں نے حضرت حمزہ کے اعضاء کے ہار بنا کے پہنے۔ ہند نے حضرت حمزہ کا جگر منھ میں دے کر چبایا۔ اکثر مورخین نے اس سلسلہ میں ابن اسحاق کی جس روایت پر اعتماد کیا ہے وہ (تقریبا) بے سند ہے (سیرت ابن ہشام: ۹۱/۲)۔ اس کے علاوہ واقدی اور ابن سعد (طبقات: ۹/۳) نے بھی اس مضمون کی روایات ذکر کی ہیں۔ مگر سب کی سندیں منقطع ہیں اور ضعیف راویوں سے بھری ہیں۔

ان میں سب سے بہتر روایت امام احمد کی مسند (۴۴۱۴) ہے جو بعینہ اسی سند سے ابن سعد کے یہاں بھی ہے۔ مگر وہ بھی منقطع ہے۔ اس کی سند شعبی عن عبداللہ بن مسعود ہے۔ اور شعبی نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایات براہ راست نہیں لی ہیں (تہذیب التہذیب: ۶۵/۵)۔ اس کے علاوہ اس کی سند میں عطاء ابن السائب ہیں، جو مختلط تھے۔ ہیثمی نے اس روایت کی یہی وجہِ ضعف ذکر کی ہے اور ابن کثیر نے بھی اسی بنا پر روایت کو

---

[۱] السیرۃ النبویۃ، مہدی رزق اللہ احمد: ۳۹۸

ضعیف ٹھہرایا ہے ؎۱۔

جہاں تک صرف مثلہ یعنی اعضاء کاٹنے کا تعلق ہے، اس کی نظیریں عربوں کی جنگوں میں ملتی ہیں۔ اسلام نے قانون جنگ میں جو اصلاحات کیں ان میں اِس عمل کو حرام قرار دیا گیا۔ لیکن جگر چبانا، دل گردوں کا ہار پہننا، اس درندگی کی مجھے عربوں کے یہاں کوئی نظیر نہیں ملتی۔ مثلہ میں ہند کا کردار بیان کرنے والی روایات میں ضعیف اور منکر ہونے کے علاوہ، یہ پہلو بھی باعث حیرت و استبعاد ہے۔

ان روایات کے غلط ہونے کا ایک قرینہ ہم کو اسلام لانے کے بعد حضرت ہندؓ کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معاملے سے بھی ملتا ہے۔ حضرت حمزہؓ کے قتل سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اتنی تکلیف پہنچی تھی کہ وحشیؓ جب ایمان لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے پوچھا: کیا تم ہی حمزہ کے قاتل ہو؟ انہوں نے اثبات میں جواب دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان سے فرمایا: کیا اب ایسا ہو سکتا ہے کہ آئندہ مجھے اپنا منہ نہ دکھاؤ؟ اب دیکھیے! ایک طرف قاتل حمزہ سے ایسی کبیدگی، دوسری طرف حضرت ہندؓ جب اسلام لائیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بیعت کے لیے حاضر ہوئیں، تو یہی نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے ایسی کوئی بات نہیں فرمائی، بلکہ جیسا کہ صحیح بخاری وغیرہ کے حوالے سے آگے آتا ہے، انہوں نے جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خبر دی کہ پہلے جتنی شدت کفر میں تھی، اب دل میں اتنی ہی محبت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے دین سے ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے ان مومنانہ جذبات کی تصدیق فرمائی۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوسفیانؓ کی جیسی عزت افزائی اور تالیف قلب فرمائی وہ بھی معلوم ہے اور حضرت معاویہؓ کو اپنی جناب عالی میں جس قرب و خصوصیت سے نوازا وہ بھی پردۂ خفا میں نہیں۔ تو کیا وحشیؓ سے آپ کی طبع مبارک کی اس درجہ کبیدگی وکشیدگی اور حضرت ہندؓ اور ان کے خاندان سے اس درجہ انشراح و شگفتگی کی کوئی توجیہ ممکن ہے؟ کیا اگر اس درندگی کے واقعے میں صداقت ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت ہند اور ان کے گھر والوں کے ساتھ ایسی ملاطفت کا معاملہ فرماتے؟

ہندؓ کا قبولِ اسلام اور بیعت:

فتح مکہ کے بعد ہند نے بھی اسلام قبول کیا۔ مکہ کی سربرآوردہ خواتین نے باقاعدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے

؎۱ (مجمع الزوائد: ۶/۱۰۹، البدایۃ والنھایۃ: ۴/۴۶، نیز ملاحظہ ہو تہذیب التہذیب: ۷/۲۰۷۔ اس کے علاوہ اس کے متن میں ایک ظاہر قسم کا معنوی سقم (نکارت) بھی ہے۔ یہ روایت کہتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سنانے والے سے پوچھا کہ کیا ہند نے حمزہؓ کے جسم کے کسی حصے کو نگل بھی لیا؟ لوگوں نے بتایا کہ نہیں وہ نگل نہیں سکی۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: اللہ حمزہ کے جسم کے کسی حصے کو جہنم میں نہیں ڈال سکتا تھا۔ بعد میں ہند کے اسلام لے آنے سے (اور خصوصا بخاری کی روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے ان کی محبت رسول کی تصدیق بھی کیے جانے سے) یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ روایت غلط ہے۔ سندی ضعف سے قطع نظر یہ معنوی سقم روایت کو منکر و مخدوش ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔

بیعت کی، ان میں ہند بھی آئیں۔ اس بیعت کی کچھ تفصیلی روایات کتب تاریخ میں آئی ہیں۔ البتہ صحیح بخاری میں حضرت ہند کا ایک بہت اہم اعتراف درج ہوا ہے۔ بیعت کے بعد حضرت ہند نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! خدا کی قسم، پہلے میرا حال یہ تھا کہ دنیا میں آپ کی جماعت سے زیادہ کسی کی شکست وخواری پسند نہیں تھی۔ اوراب ایسا انقلاب ہوا ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ آپ کی جماعت کا غلبہ محبوب ہوگیا ہے۔

یا رسول اللہ ما کان علی ظهر الارض من اهل خباء احب الیّ ان یذلوا من اهل خبائك، ثم ما اصبح الیوم علی ظهر الارض اهل خباء احب الی ان یعزّوا من اهل خبائك۔

حضرت ہند نے اپنے جذبات میں جس تبدیلی کا اظہار کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی تصدیق فرمائی اور مستقبل میں اِس ایمان اور محبت میں، بتوفیق خداوندی، مزید اضافہ کی خوش خبری دی۔ آپ نے فرمایا: وأیضاً، والذی نفسی بیده"۔ (صحیح بخاری: ۳۸۲۵) علامہ عینی اسی فقرے کے معنی بتاتے ہوئے فرماتے ہیں:

وأیضا، ستزیدین فی ذلك ویتمكن الایمان فی قلبك، فیزید حبك لرسول اللہ ﷺ۔

ابھی اس محبت کی کیفیت میں اوراضافہ ہوگا۔ ایمان تمہارے دل میں اور راسخ ہوگا، جس کے نتیجہ میں اللہ کے رسولؐ سے مزید محبت بڑھے گی۔ (عمدۃ القاری: ۶/ ۲۸۴)

حضرت ہند بنت عتبہ رضی اللہ تعالی عنہا کی فضیلت کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس شہادت وتصدیق سے زیادہ کچھ نہیں ہوسکتا۔ رضی اللہ عنہا۔ امام بخاری نے ان کی منقبت وفضیلت کے طور پر یہ حدیث ذکر کی ہے۔

حضرت یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما:

حضرت معاویہؓ کے بھائی حضرت یزیدؓ بھی فتح مکہ میں اسلام لائے تھے۔ جماعت صحابہ میں بھی صاحب فضیلت شمار ہوتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کواُن کی نانیہال قبیلہ بنوفراس میں مال گزاری کا افسر بنایا تھا۔ حضرت ابوبکر نے سن ۱۳ ہجری کے شروع میں بلادشام کے لیے چار لشکر بنائے تھے۔ ان میں سے ایک کا امیر انہی کو مقرر کیا۔ شامی علاقے فتح ہوئے تو حضرت عمر نے ان کو فلسطین کا گورنر بنایا، اس کے بعد شام کا مرکز دمشق فتح ہوا تو اس کی امارت بھی انہی کو دی (الاصابہ: ۶/ ۵۱۶، ۵۱۷)۔

حضرت معاویہؓ کے ماموں ابوحذیفہؓ اور ابوہاشمؓ:

حضرت معاویہؓ کے گھر میں اسلام بالکل اولین دور میں داخل ہو چکا تھا۔ ان کے ماموں ابوحذیفہ بن عتبہ بڑے درجے کے صحابہ میں سے تھے سابقین اولین میں شمار تھا۔ ہجرت حبشہ اور ہجرت مدینہ دونوں کا شرف پایا۔

بدر اور اس کے بعد کے تمام غزوات نبوی میں شریک رہے اور جنگ یمامہ میں شہادت ہوئی۔ دوسرے ماموں ابو ہاشم بن عتبہؓ بھی بہت معزز صحابہ میں سے تھے۔ حضرت عثمانؓ کی خلافت کے دور میں شام آ بسے تھے۔ حضرت ابو ہریرہؓ ان کا تذکرہ کرتے تو ان کو 'مرد صالح'' کہتے۔ اور بتاتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جناب میں آپ کو سوال پوچھنے کی ہمت ہوتی تھی، جب کہ ہم کو کم ہوتی تھی [۱]۔

سنن ترمذی (۲۳۲۷) وغیرہ میں بسند صحیح مذکور ہے کہ وفات کے وقت حضرت معاویہؓ حاضر ہوئے۔ تو حضرت ابو ہاشم رو دیے۔ حضرت معاویہؓ نے دریافت کیا: ماموں جان! کیوں رو رہے ہیں؟ کوئی تکلیف؟ یا دنیا چھوٹنے کا غم؟ کہنے لگے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے ایک وصیت کی تھی۔ مجھ سے اس پر عمل نہیں ہو پایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا کہ: میرے بعد کچھ لوگوں پر مال کی فراوانی ہوگی۔ تمہارے لیے بس اتنا کافی ہے کہ ایک سواری اور ایک خادم کا انتظام ہو جائے۔ مگر میں سمجھتا ہوں میں نے زیادہ دنیا رکھی۔ اس پر سخت ندامت ہے۔

حضرت معاویہؓ کا اسلام:

حضرت معاویہؓ نے عمرۃ القضاء (۷ ہجری) کے موقع پر اسلام قبول کیا۔ حدیث کی روایات سے قطعی طور پر فتح مکہ کے موقعہ پر حضرت معاویہ مسلمان نظر آتے ہیں۔ مگر، جس طرح ان کے والدین کا نقل کیا جاتا ہے، ان کے بارے میں کہیں یہ نہیں ملتا کہ انہوں نے اس موقعہ پر اسلام قبول کیا۔ ابن سعد وغیرہ نے خود حضرت معاویہ کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ میں عمرۃ القضاء کے موقعہ پر یعنی فتح مکہ سے ایک سال قبل ہی اسلام لے آیا تھا، اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاقات کر کے اس کا اظہار بھی کر دیا تھا۔ لیکن عمر کم ہونے کی وجہ سے اپنے والدین سے ڈرتا تھا اور ان کے خلاف نہیں کر سکتا تھا۔ روایت سنداً کمزور ہے۔ لیکن تاریخی مآخذ میں اس کے خلاف کوئی بیان موجود نہیں ہے۔ اس لیے اسی کو قبول کرنا چاہیے۔ حافظ ذہبی نے تاریخ الاسلام میں اسی کو اختیار کیا ہے کہ حضرت معاویہؓ خاموشی سے سن ۷ ہجری میں عمرۃ القضاء کے موقعے پر اسلام لا چکے تھے [۲]۔ جب فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کرنے کی کوئی روایت نہیں ملتی تو نہ جانے کیوں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کیا؟

فتح مکہ میں اسلام کے اظہار کے بعد حضرت معاویہ ایک تاریخی اور اہم شخصیت بننے کے تدریجی عمل (Process) میں داخل ہو گئے۔

مدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ قیام:

بہر حال فتح مکہ کے بعد حضرت معاویہ ایک مسلم نوجوان کی حیثیت سے مکہ سے مدینہ منتقل ہوئے۔ فتح

---

[۱] الاصابۃ: ۷/۲۴۷، المعجم الکبیر: ۷/۳۰۱، نیز الاصابہ: ۷/۳۴۶۔

[۲] الطبقات الکبریٰ، متمم الصحابۃ، الطبقۃ الرابعۃ: ۱۰۶، البدایہ والنہایہ: ۸/۱۲۵، تاریخ الاسلام: ۲/۵۴۰۔

مکہ کے بعد عام لوگوں کے لئے ہجرت کا سلسلہ بند کر دیا گیا تھا، اس لئے حضرت معاویہؓ کا یہ انتقالِ سکونت بہت قابل غور ہے۔ حضرت معاویہؓ کے والد یا تو فتح مکہ کے بعد نجران کے والی کے طور پر نجران میں مقیم تھے، یا کچھ لوگوں کے نزدیک مکہ ہی میں مقیم تھے۔ بہر حال حضرت معاویہ اور ان کے بھائی یزید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تعاون اور آپؐ کے دین کی نصرت وحمایت کے لئے مدینہ آگئے۔ اپنے مقصد کے اعتبار سے یہ دین کی نصرت وجہاد کے لیے ہجرت ہی تھی۔ لیکن چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فتح مکہ میں اعلان فرما دیا تھا کہ "لا هجرة بعد الفتح، ولكن جهاد ونية"، یعنی فتح مکہ کے بعد ہجرت کا حکم نہیں رہا۔ اب بس جہاد اور نیتِ جہاد کی ضرورت ہے۔ اس لیے حضرت معاویہ کے اس انتقال سکونت کو ہجرت نہیں کہا گیا۔ لیکن ہم کہہ سکتے ہیں کہ اپنی حقیقت ومقصد کے اعتبار سے یہ 'ہجرت' ہی تھی۔ واقعات کی یقینی شہادت ہے کہ حضرت معاویہؓ (اور ان کے بھائی یزیدؓ بن ابی سفیانؓ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت وصحبت اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حکومت ودعوت میں تعاون اور نصرت دین کے کاموں میں شرکت کے لیے (جو اصلا ہجرت کا مقصد تھا اور جس کو حدیث کے مختصر سے لفظوں میں جہاد ونیۃ کہا گیا ہے) مدینہ منتقل ہو گئے۔

متعدد مآخذ کے حوالے سے حافظ ابن حجر نے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ میں حضرت معاویہؓ اور حضرت حُتات بن زید مجاشعیؓ کے درمیان مواخات کرائی تھی۔ جس کا حضرت معاویہؓ نے تازندگی اپنی معروف بلند ظرفی کے ساتھ خیال رکھا (الاصابۃ: ۲/ ۲۵، ۲۶)۔

حضرت معاویہؓ رسول اللہؐ کے سکریٹری مقرر ہوتے ہیں:

مدینہ میں حضرت معاویہ کو اپنی غیر معمولی صلاحیتوں اور خاندانی شرف کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سکریٹری اور کاتب کا عہدہ دیا گیا۔ تمام اہل علم محدثین و مؤرخین نے ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کاتبوں (سکریٹریز) میں شمار کیا ہے۔ مسند احمد کی صحیح روایت میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ معاویہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کاتب تھے [۱]۔ بلکہ ابن کثیر اور اکثر علماء نے حضرت معاویہ کو ان خاص صحابہ میں بھی شمار کیا ہے جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن لکھوایا کرتے تھے۔

فتح مکہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت کا دائرہ بھی بہت وسیع ہو گیا۔ نیز خارجہ تعلقات اور مالیاتی امور کی نظارت کو زیادہ منظم کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ ان دونوں شعبوں کو منظم کرنے کے لیے حضرت

[۱] حدیث: ۲۶۵۱، حافظ ذہبی نے تاریخ الاسلام: ۲/ ۵۴۰ میں اس کو صحیح قرار دیا ہے البدایۃ والنھایۃ: ۸/ ۱۲۶، =

معاویہ کی خدمات لی گئیں۔حدیث کی کتابوں میں ایسے حوالے کثرت سے ملتے ہیں جو حضرت معاویہؓ کی ان شعبوں میں کارکردگی اور خدمات کا پتہ دیتے ہیں۔

(۱) عرب کے ایک سردار بلال بن حارث مزنی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک جاگیر کا فرمان دیا جو حضرت معاویہ سے لکھوایا تھا (مستدرک حاکم: ۳/ ۵۹۳)۔

(۲) فتح یمن کے بعد حضرت معاویہؓ کو اسلامی حکومت کے خاص نمائندے اور کچھ احکام کی تنفیذ وانتظام کے لیے یمن بھیجا گیا۔قبیلہ کندہ کے سردار حضرت وائل بن حجر کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یمن کے اقیال (نوابوں) کا امیر طے فرمایا اور ایک بڑی جاگیر عطا فرمائی۔اس کی ادائیگی وسپردگی کے لیے حضرت معاویہ کو اپنے فرستادہ اور حکومت کے نمائندہ افسر کے طور پر ساتھ بھیجا[۱]۔

(۳) یمن ایک زرعی وزرخیز خطہ تھا۔جاگیروں کا از سرنو انتظام ہر نئی حکومت کے لیے ایک نازک مرحلہ ہوتا ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے اسلامی حکومت کے قیام کے ساتھ وہاں کی جاگیروں اور زمینداریوں کا انتظام ایک مشکل اور پیچیدہ مسئلہ تھا۔عہد نبوی میں حضرت معاویہ کے لکھے ہوئے فرامین کی ایک بڑی تعداد یمن اور کچھ دیگر علاقوں کے ایسے ہی مسائل سے متعلق ہے۔ان میں سے کئی تحریریں معاہدات کی شکل کی ہیں، جن پر حضرت معاویہؓ کا نام بطور گواہ کے درج ملتا ہے[۲]۔

حضرت وائل بن حجر کے مذکورہ واقعہ کا پس منظر یہ ہے کہ یمن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حکومت سے پہلے نوابوں اور راجاؤں کی چھوٹی چھوٹی کئی ریاستیں قائم تھیں، یہ نواب اقیال کہلاتے تھے، سلاطین حمیر کی اولاد تھے (شرح الزرقانی: ۵/ ۵۳۴)۔کچھ آزاد قبائل اپنے علاقوں میں خودمختار تھے۔فتح مکہ کے بعد وہاں کسی طرح معاملات حل نہیں ہوتے تھے۔کئی قبائل اسلام قبول نہیں کرتے تھے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فطری طور پر اس طرف سے فکر دامن گیر رہتی تھی۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پہلے وہاں اسلام کی دعوت اور امن کے قیام کے لیے حضرت خالد بن الولیدؓ کو بھیجا۔لیکن ان کو مکمل کامیابی نہیں۔کچھ دیگر کوششیں بھی کی گئیں۔جن کے نتیجہ میں یمنی قبائل اشعر وغیرہ کے وفود خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آ آ کر اسلام قبول کرتے اور اطاعت وتسلیم کا اظہار کرتے گئے۔

= حضرت عبداللہ بن عمرو بھی دربار نبوی میں حضرت معاویہؓ کے اس منصب کا تذکرہ کرتے ہیں۔ملاحظہ ہو: المعجم الکبیر، ہیثمی لکھتے ہیں اس کی سند حسن ہے، مجمع الزوائد: ۹/ ۳۵۷۔

[۱] مسند احمد: ۲۷۲۳۹ محقق شعیب ارناؤوط نے اس کی سند حسن قرار دی ہے۔اس روایت کو ابن حبان: ۷۲۰۵ نے بھی اپنی صحیح میں نقل کیا ہے۔اور اس کی سند کو بھی شیخ شعیب ارناؤوط نے صحیح قرار دیا ہے۔

[۲] ملاحظہ ہو: مجموعۃ الوثائق السیاسیہ از ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم

حضرت وائل بن حجرؓ کی مدینہ آمد اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاقات بھی اسی سلسلہ کی بات تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو تمام اقیال (نوابوں) کا امیر بنایا اور ان کی سابقہ جاگیر بھی بحال فرمائیں (البدایۃ ۵/۳۹)۔

حضرت وائلؓ کو خدشہ تھا کہ یمن میں ان فیصلوں کی تنفیذ میں ان کو مشکلات پیش آئیں گی۔ دیگر نواب (اقیال) اور سرداراُن کی حیثیت تسلیم نہیں کریں گے اور ان کی جاگیر بھی خطرے میں پڑے گی۔ انہوں نے درخواست کی کہ میرے لیے حکومت اسلامیہ کی طرف سے فرمان بھی لکھ دیا جائے اور کسی نمائندۂ حکومت کو میرے ساتھ نئے نظام کے اعلان کے لیے بھی بھیج دیا جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت معاویہ سے تین فرامین لکھوائے۔ اور انہیں اپنے نمائندے کے طور پر وائل بن حجر کے ساتھ بھیجا (المعجم الکبیر: ۲۲/۴۶)۔

(۴) سرداران عرب میں سے دو بڑے سردار عیینہ بن حصن اور اقرع بن حابس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مال کے طلبگار رہتے تھے۔ ایک مرتبہ دونوں خدمت نبوی میں حاضر ہوئے اور مال مانگا۔ آپؐ نے ان کو (غالباً کسی جاگیر کا پروانہ عطا کیا، یا اس علاقے کے عامل کو حکم جاری کیا کہ ان کو مال دیا جائے۔ بہرحال جو بھی واقعہ ہو) یہ تحریر حضرت معاویہ سے لکھوائی گئی[1]۔

حضرت معاویہؓ کی کتابت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دربار حکومت میں بطور سکریٹری کارکردگی کے یہ صرف چند نمونے ہیں۔ ان کے علاوہ حدیث کی مستند کتابوں اور تاریخ وسیر کے ذخیرے میں حضرت معاویہ کی کتابت وتعاون کی اس قدر کثرت سے شہادتیں اور اتنے واقعات ملتے ہیں کہ علماء ان سے اِس نتیجہ تک پہنچے ہیں کہ فتح مکہ سے پہلے حضرت زید بن ثابتؓ اور فتح مکہ کے بعد حضرت معاویہ تمام سیکریٹریز اور کاتبین میں سب سے زیادہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے یہ خدمت انجام دیتے تھے اور سب سے زیادہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر رہتے تھے۔ مشہور محدث ملا علی قاری نے شرح شفا میں تصریح کی ہے کہ متعدد حفاظ محدثین نے یہ بات ذکر فرمائی ہے۔ واکثرهم ملازمة لكتابه عليه السلام زيد بن ثابت ثم معاوية بن ابي سفيان بعد الفتح، ذكر ذلك غير واحد من الحفاظ (شرح الشفاء: ۱/۷۶)۔

غزوۂ تبوک میں شرکت:

آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارکہ میں حضرت معاویہؓ کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ جہاد وغزا میں شرکت کی سعادت عظمٰی حاصل ہوئی۔ غزوۂ تبوک میں شرکت عام غزوات سے اس پہلو سے افضل اور قرار دی گئی ہے کہ یہ نہات طاقت ور دشمن کے مقابلہمیں ہوا تھا۔ پھر سفر لمبا تھا، موسم نہایت سخت گرمی کا اور مدینے میں معاشی حالات

[1] مسند احمد: ۱۷۶۲۵، بسند صحیح علی شرط مسلم۔ سنن ابوداود: ۱۶۲۹۔

بھی بہت کمزور تھے۔اس لیےاس غزوے میں نکلنا سخت مشکل اور ایمان کا امتحان تھا،اس لیے منافقین نے طرح طرح کے بہانوں سے کام لیااور باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تاکید کے کہ مدینے کے سارے ہی مسلمانوں کو جانا ہے،اس میں نہیں گئے۔جولوگ غزوے میں نکلےان کے بارے میں قرآن نے مدح وتعریف کی خاص شہادت دی:

لَكِنِ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ جَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ وَأُولَئِكَ لَهُمُ الْخَيْرَاتُ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ [التوبة: ۸۸]

لیکن رسول اور جولوگ ان کے ساتھ ایمان لائے ہیں،انہوں نے اپنے مال اور جان سے جہاد کیا۔اور انہی لوگوں کے لیے اچھے انعامات ہیں۔اور یہی لوگ فلاح یاب ہونے والے ہیں۔

یہ آیت غزوۂ تبوک میں شرکت کرنے والے تمام ہی لوگوں کے لئے توصیف وثنااور خوش خبری کی آیات ہیں۔پھرغزوہ تبوک میں شرکت کرنے والے مہاجرین وانصار کے سلسلے میں ایک غیر معمولی انداز میں اس طرح خوش خبری دی گئی کہ:

لَقَدْ تَابَ اللَّهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ فِي سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيغُ قُلُوبُ فَرِيقٍ مِنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ إِنَّهُ بِهِمْ رَءُوفٌ رَحِيمٌ [التوبة: ۱۱۷]

ضرور اللہ مہربان ہوا نبی اور ان مہاجرین وانصار پر، جو نبی کے ساتھ رہے مشکل کی گھڑی میں، بعد اس کے کہ قریب تھا کہ بعضوں کے دل پھر جائیں۔پھر اللہ نے اُن پر مزید مہر وکرم فرمایا۔بے شک وہ ان پر بے حد رحم کرنے والا مہربان ہے۔

حضرت معاویہؓ اس غزوے میں نہ صرف شریک تھے، بلکہ روایات شاہد ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مصاحبین وخدام خاص میں سے تھے۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں فرمانروائے مملکتِ روم قیصر کا قاصد آیا۔دربار نبوی میں حاضر ہوا تو مجلس خاص میں حضرت معاویہ حضوؐر کے پیچھے کھڑے تھے۔اس نے قیصر کا خط خدمت میں پیش کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت معاویہؓ سے ہی پڑھوایا[۱]۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتی خدمت:

حضرت معاویہؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذاتی خادم ہونے کا شرف بھی حاصل تھا۔حدیث کی کتابوں میں اس سلسلے کے متعدد واقعات روایت کیے گئے ہیں۔صحیحین کی روایت ہے کہ حضرت معاویہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بال مبارک پہاڑی مروہ کے پاس اپنے ہاتھ سے تراشے ہیں(صحیح بخاری:

۱؎ مسند احمد: ۱۶۶۹۳، ابویعلی: ۳/۱۷۰۱، مجمع الزوائد: ۸/۲۳۵۔ہیثمی نے مسند احمد اور مسند ابویعلی دونوں کے راویوں کو ثقہ قرار دیا ہے۔ابن کثیر نے (البدایہ والنہایہ: ۵/۲۱)اس کی اسناد کو 'لاباس بہ' کسی اعتراض سے پاک قرار دیا ہے۔

۱۷۳۰)۔اس خاص خدمت کا شرف پانا بتاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو ان پر کتنی شفقت تھی۔

وہ آپ ﷺ کی سواری کے بھی منتظم تھے۔(الآحاد والمثانی: ۵۱۸، بسند حسن) اس کے علاوہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وضو بھی کرایا کرتے تھے۔آخر عمر میں یہ خدمت اصلا حضرت ابو ہریرہؓ کی ذمہ تھی۔لیکن وہ بیمار ہوتے تو حضرت معاویہؓ وضو کا برتن لیے حضور ﷺ کے پیچھے پیچھے رہتے تھے، جیسے ہی آپ ﷺ وضو کا ارادہ فرماتے حضرت معاویہ پانی ڈالنے کی خدمت انجام دیتے۔(مسند احمد: ۱۶۹۳۳، ومسند ابویعلی: ۷۳۸۰)۔

اس اعتماد اور قرب وخصوصیت کی وجہ:

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت معاویہ عمرۃ القضاء کے موقعہ پر ایمان لاتے ہیں، پھر بھی رسول اللہ ﷺ کی ذاتی خدمت، دیوانی امور میں فرامین کی تحریر، اسلامی حکومت کے انتظامی امور میں رسول ﷺ کی مدد وتعاون، بلکہ قرآن کی تحریر تک، کا شرف ان کو کیوں کر حاصل ہوتا ہے؟ اور آپ ﷺ ان کے ساتھ اس قرب وخصوصیت کا معاملہ کیوں فرماتے ہیں؟ اس اعتماد کا راز کیا ہے؟ واقعات وروایات پر نظر اور تاریخی پس منظر کے تجزیہ کے نتیجہ میں راقم سطور کے نزدیک اس کے مندرجہ ذیل تین اسباب ہیں۔

(۱) حضرت معاویہؓ کی خاندانی شرافت ونجابت اور عرب میں بنوامیہ کا قدیم وقار ومرتبہ، جس کا حکومتوں کے استقلال واستحکام، عوامی مقبولیت، نیز کاروبار حکومت کے حسن انتظام میں بہت اہم کردار ہوتا تھا، اسی کا نتیجہ تھا کہ مکہ فتح ہوا تو حضور ﷺ نے اس پر کسی اور کو نہیں بنوامیہ ہی کے ایک نوجوان نومسلم عتاب ابن اسید کو گورنر متعین فرمایا۔بنی امیہ کے اسی مرتبہ وعزت کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاویہؓ کے ساتھ اس قرب وخصوصیت کا معاملہ فرمایا۔

(۲) حضرت معاویہؓ اسی خاندان بنوعبد مناف کے ایک جوان تھے، جس سے رسول اللہ ﷺ تعلق رکھتے تھے۔نیز جیسا کہ ہم اوپر تفصیلی شواہد ذکر کر چکے ہیں، حضرت ابوسفیانؓ سے قبلِ اسلام بھی خاندانی رشتہ استوار تھا۔اور آپ ﷺ کو اس کا لحاظ واعتبار تھا۔جس کا ایک نمونہ فتح مکہ میں حضرت ابوسفیانؓ کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کا وہ معاملہ بھی تھا جو دیگر سرداران مکہ سے بالکل ممتاز اور خصوصیت کا تھا۔

(۳) اس سلسلے کی تیسری چیز اور غالباً سب سے اہم، حضرت معاویہ کی فطری لیاقت، ذہانت، حلم وبردباری اور دیگر وہ صفات تھیں جو ان کی شخصیت میں اعلی درجہ کی قائدانہ صلاحیت کا پتہ دیتی تھیں، اور جس کا اندازہ ان کی بالکل ابتدائی عمر سے لوگوں کو ہونے لگا تھا۔یہاں تک کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ جو سیاسی موقف میں حضرت علیؓ کے دست راست معاون تھے، فرمایا کرتے تھے: ما رأيت رجلا كان أخلق للملك من

معاویۃ۔،، معاویہ سے زیادہ میں نے حکومت کے لائق کسی کونہیں دیکھا (مصنف عبدالرزاق: ۲۰۹۸۵،بسند صحیح)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رفاقت کی خاطر فقر و ناداری پر صبر:

حضرت معاویہ کا خاندان بڑا صاحب ثروت خاندان تھا۔ابوسفیان صرف ایک بڑے سردار ہی نہیں، بہت بڑے تاجر بھی تھے۔حضرت معاویہ اگر خاندانی تجارت وکاروبار کو فروغ دیتے تو سارے قرائن کہتے ہیں کہ بڑے سرمایہ دار ہوتے۔لیکن انہوں نے فقر و ناداری برداشت کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رفاقت ومعیت اور خدمت کو سعادت وخوش بختی جانا۔مدینہ میں وہ نہایت غربت کے حال میں رہے۔ایک موقعہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود کسی سے کہا کہ معاویہ بالکل فقیر آدمی ہے۔اس کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ اما معاویۃ فصعلوك لا مال لہ(صحیح مسلم: ۱۴۸۰)۔

دوسرا باب

معتبر احادیث میں وارد

حضرت معاویہؓ کے لئے رسول اللہ ﷺ کی چند دعائیں

حضرت معاویہؓ کے فضائل میں سب سے اہم اور مایہ صد افتخار تو ان کی صحابیت، رسول اللہ کی محبانہ خدمت، رفاقت ومعیت، کتابت فرامین، غزوہ وجہاد میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ شرکت اور دینی مشن میں نصرت ومدد کی وہ سعادت یابی ہے، جس کا کچھ تفصیلی بیان گزشتہ صفحات میں کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی محدثین نے اپنی کتابوں میں حضرت معاویہؓ کے فضائل ومناقب کے لیے خصوصی ابواب قائم کر کے روایات ذکر کی ہیں۔ مثلا امام بخاری نے صحابہ کے فضائل ومناقب کے تحت جہاں دیگر صحابہ کے لیے مستقل ابواب قائم کیے ہیں، وہیں حضرت معاویہؓ کے لیے ایک مستقل باب ''باب ذکر معاویہؓ'' کے عنوان سے قائم فرمایا ہے اور اس کے ذیل میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی زبانی یہ اعتراف نقل کیا ہے کہ وہ بہت ذی علم صحابی ہیں [۱]۔

---

[۱] کچھ لوگ اس بنیاد پر یہ مغالطہ دیتے ہیں کہ حضرت معاویہؓ کے چونکہ مناقب وفضائل نہیں ہے اسی لئے امام بخاری نے ''ذکر معاویہؓ'' کے عنوان کو اختیار کیا، اور یہ گویا ان کی طرف سے اس کا اعتراف وبیان ہے کہ حضرت معاویہ کے فضائل نہیں ہیں۔
یہ سراسر شیعی پروپیگنڈے کا تاثر ہے۔ امام بخاری کے نزدیک حضرت معاویہؓ اگر صاحب فضائل نہیں ہیں تو دیگر صحابہ کے مناقب وفضائل کے باب میں ان کے نام کا عنوان لگانا کیا معنی رکھتا ہے؟ جس شخص کی صحیح بخاری اور امام بخاری کے طریق تراجم پر نظر ہو وہ اس غلط فہمی کا کبھی شکار نہیں ہو سکتا۔ امام بخاری بہت سے صاحب مناقب وفضائل شخصیت کے لئے ''باب ذکر'' کا عنوان اختیار کرتے ہیں۔ حتی کہ انہوں نے حضرت ادریس علیہ السلام کے لئے بھی ''باب ذکر ادریس'' کا عنوان اختیار کیا ہے۔ اسی طرح حضرت طلحہ بن عبید اللہ جو صحابہ کے سب سے برتر وافضل طائفہ: عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں، ان کے لئے بھی عنوان ''باب ذکر طلحۃ بن عبید اللہ'' قائم فرمایا ہے۔ حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے محبوب ابن محبوب حضرت اسامہ کے لئے بھی یہی انداز اختیار کیا ہے۔ اس انداز کے متعدد عناوین فضائل صحابہ کے سلسلے میں صحیح بخاری میں ملتے ہیں۔ اور ہاں! شیعی غلو کے شکار لوگوں کی اطلاع کیلئے عرض ہے کہ حضرت عباسؓ اور ان کے عالی مرتبت صاحب زادے حضرت عبداللہؓ کے لیے بھی ''باب ذکر ۔۔'' کا ہی عنوان قائم فرمایا ہے۔ تو کیا امام بخاری یہ کہنا چاہتے ہیں کہ حضرت ادریسؑ حضرت طلحہؓ اور اوپر مذکور دیگر صحابہ کے سلسلے میں کوئی فضیلت وارد نہیں ہوئی ہے؟

ذیل میں ہم حضرت معاویہ کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دو دعائیں جو صحیح وثابت ہیں، ذکر کرتے ہیں:

اے اللہ! معاویہ کو ہادی ومہدی بنا اور اس کے ذریعہ ہدایت عام فرما:

امام ترمذی اور دیگر بہت سے محدثین نے حضرت عبدالرحمن بن ابی عمیرہؓ کی روایت ذکر کی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معاویہؓ کو یہ دعا دیتے ہوئے سنا کہ:

اللھم اجعله هادیا مهدیا، و اهدبه

اے اللہ! اس کو ہادی ومہدی (یعنی ہدایت یافتہ اور دوسروں کو ہدایت دینے والا) بنا اور اس کے ذریعہ اپنے بندوں کو راہ حق پر چلا۔ (سنن ترمذی: ۳۸۴۲، مسند احمد: ۱۷۸۹۵)

امام ترمذی کی سند نہایت اعلی درجے کی ہے: مُحَمَّدُ بْنُ يَحْيَى الذهلي، أَبُو مُسْهِرٍ، سَعِيدُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيزِ، رَبِيعَةُ بْنِ يَزِيدَ، عَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ أَبِي عُمَيْرَةَ،

یہ سب اعلیٰ درجے کے ثقہ ہیں۔ واضح رہے کہ سعید بن عبدالعزیز سے اس حدیث کو متعدد (۵) ثقہ راویوں نے روایت کیا ہے۔ (السلسلۃ الصحیحۃ: ۴/ ۶۱۵) اور صرف ابومسہر سے روایت کرنے والے تو بہت زیادہ ائمۂ حدیث ہیں۔

ابومسہر کے شیخ سعید بن عبدالعزیز اعلی درجے کے ثقہ ہیں۔ امام اوزاعی کے بعد شام کے سب سے بڑے عالم ومفتی وہی تھے۔ امام احمد ان کو امام اوزاعی کے درجہ کا محدث قرار دیتے تھے۔ امام یحیی بن معین کہتے ہیں: ثقہ ابن اسحاق جیسے لوگ ہیں۔ مگر حجت تو بس عبیداللہ بن عمر، مالک، اوزاعی اور سعید بن عبدالعزیز ہیں۔ نہایت عابد اور صاحب خشیت بزرگ تھے، ان کے خاص شاگرد ابومسہران کو امام اوزاعی پر فوقیت دیتے تھے۔ امام ابوحاتم کہتے ہیں کہ میرے نزدیک شام میں امام اوزاعی کے بعد سعید بن عبدالعزیز سب سے اونچے درجہ کے عالم تھے۔

اس روایت پر بعض محدثین نے ایک اعتراض یہ کیا ہے کہ خود سعید کے اہم اور خاص شاگرد اور اسی روایت کے راوی ابومسہر نے بتایا ہے کہ سعید بن عبدالعزیز آخر عمر میں حافظہ کی کمزوری کے شکار ہو گئے تھے، جس کو علم حدیث کی اصطلاح میں اختلاط کہتے ہیں۔ محدثین کے یہاں احتیاط کا یہ عالم ہے کہ مشائخ میں سے جن کا یہ حال ہوا ان سے صرف ان شاگردوں کی روایت لیتے ہیں جن کے بارے میں یہ شہادت ملتی ہوں کہ انہوں نے ''اختلاط'' سے قبل روایات سنی ہیں۔ جب تک کسی شاگرد کے بارے میں صراحۃً یہ شہادت نہ ملے، اس وقت تک

شیخ سے اس کی روایت ضعیف قرار پاتی ہے۔

اس اصول کی بنا پر بعض محدثین نے اس روایت کو کمزور خیال کیا ہے۔مگر جب ہم جائزہ لیتے ہیں تو امام ترمذی اوران دیگر محدثین کی رائے طاقتور نظر آتی ہے جو اس روایت کو طاقتور اور قابل استناد کہتے ہیں۔جس کی تین وجوہات ہیں۔

(۱) سعید بن عبدالعزیز نہایت اونچے درجے کے ائمہ میں شمار ہوتے ہیں۔اکثر ائمہ ان کو حجت اور امام قرار دیتے ہیں، اور صرف دو ایک لوگ ہی ان کے اختلاط کا تذکرہ کرتے ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ سعید کا اختلاط ایسا تھا جس کا کچھ خاص اعتبار نہیں ہوتا۔اسی بنا پر شیخ ناصرالدین البانی نے اس روایت کو امام مسلم کی شرط کے مطابق اعلی درجہ کی صحیح قرار دیا ہے۔

(۲) دوسری بات شیخ البانی نے یہ فرمائی ہے کہ سعید کے اختلاط کی وضاحت کرنے والی دو شخصیات میں ایک ابومسہر بھی ہیں، جو خود نہایت محتاط ائمہ میں ہیں۔اس لیے کیسے ممکن ہے کہ وہی خود سعید بن عبدالعزیز کے اختلاط کے بارے میں بتائیں اور پھر اختلاط کے بعد ان سے روایات لیں؟؟ یہ خود اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ روایت اختلاط سے پہلے کی ہے۔شیخ البانی مزید فرماتے ہیں کہ سعید سے اس حدیث کو پانچ ثقہ علماء راوی بیان کرتے ہیں۔کیا پانچوں نے اس کو اختلاط کے بعد سنا ہوگا؟

راقم سطور عرض کرتا ہے کہ شیخ البانی کی یہ دونوں باتیں بہت قرین قیاس ہیں۔خصوصاً اگر ہم ابومسہر اور سعید کے تعلق کی نوعیت پر نظر رکھتے ہوں۔ابومسہر نے سعید بن عبدالعزیز کی ۱۲ سال صحبت اٹھائی ہے، وہ جس کو محدثین ''ملازمۃ'' کہتے ہیں۔وہ امام اوزاعی جیسے مشہور امام کے حین حیات بھی سعید کے ساتھ رہتے تھے۔ابومسہر خود بیان کرتے ہیں کہ میں نے کسی اور شیخ سے علم حاصل نہیں کیا ہے، صرف سعید بن عبدالعزیز ہی سے چمٹا رہا۔ (تاریخ الاسلام ذھبی: ۸۷۳/۴)۔لہذا بہت معقول بات ہے کہ سعید بن عبدالعزیز سے ابومسہر کی روایات یقیناً اختلاط سے قبل کی تھیں۔اس لیے کہ وہ روایت میں بڑے محتاط عالم تھے۔

(۳) دوران تحقیق راقم سطور کو بہت فیصلہ کن قسم کی کچھ اور معلومات دستیاب ہوئیں جن کے بعد یہ روایت ہر شک سے بالاتر ہوجاتی ہے۔سعید بن عبدالعزیز کا حافظہ کمزور ہوگیا، تو انہوں نے، اپنی روایت کردہ احادیث کی حفاظت کی خاطر، خود ہی احادیث بیان کرنا مکمل طور پر بند کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ اہل طلب کے اصرار پر بھی حدیث بیان نہیں کرتے تھے۔ان کی بیان کردہ روایات میں سے کوئی اختلاط کے بعد کی نہیں۔لہذا اختلاط کی وجہ سے ان کی کوئی روایت کمزور نہیں قرار پائیگی۔امام یحییٰ ابن معین کی تاریخ میں ہے کہ ابومسہر بتاتے

ہیں کہ حضرت سعید کو بالکل آخر عمر میں اختلاط لاحق ہو گیا تھا، اس کے بعد طلبۂ علم ان کو حدیث سنا کر اجازت طلب کرتے تو وہ صاف منع کر دیتے:

قال ابو مسهر كان سعيد بن عبد العزيز قد اختلط قبل موته، وكان يعرض عليه قبل ان يموت فيقول: لا اجيزها۔ (تاريخ يحيى بن معين، رواية عباس الدوري: ۷۹/۴)

یحییٰ الوحاظی نے سعید بن عبدالعزیز سے ایک حدیث سنانے کا مطالبہ کیا تو صاف منع کر دیا۔ امام ذہبی اس کو نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں: قلت: شاخ... واشتغل بالله عن الرواية۔ یعنی آخر عمر میں روایت حدیث ترک کر دی تھی اور عبادت میں مشغول ہو گئے تھے۔ امام ذہبی ہی ایک اور واقعہ نقل کرتے ہیں کہ ابو مسہر فرماتے ہیں کہ ہمارے کچھ ساتھی آئے اور انہوں نے حافظ سعید بن عبدالعزیز کے سامنے قراءۃ علی الشیخ کے طریقے پر معراج کی وہ روایت پڑھنی شروع کی جو یزید بن ابی مالک حضرت انس کے حوالے سے بیان کرتے ہیں۔ (مگر سعیدؒ خاموش رہے، یعنی ان کو اجازت روایت نہیں دی) تو میں (ابو مسہر) نے عرض کیا کہ یہ حدیث تو آپ نے ہم کو سنائی ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: حدیث تو سنائی تھی، مگر اس وقت میں ان کو اجازت نہیں دیتا اور ان کی قرات نہیں سنتا۔

رايت اصحابنا يعرضون على سعيد بن عبد العزيز حديث المعراج عن يزيد بن ابى مالك عن انس، فقلت له: يا ابا محمد أليس حدثتنا عن يزيد بن ابى مالك... قال: نعم، انما يقرأون على أنفسهم" (سير اعلام النبلاء: ۵/۸۳۔ تاريخ الاسلام: ۳۸۰/۴)

بہر حال یہ تیسری بات بالکل فیصلہ کن ہے کہ اگر چہ سعید کو وفات سے قبل تغیر و اختلاط لاحق ہو گیا تھا، مگر یہ بالکل آخری عمر کا واقعہ تھا۔ انہوں نے اس کے بعد احادیث بیان ہی نہیں کی ہیں۔ اسی لیے امام مسلم اور دیگر ائمہ نے سعید بن عبدالعزیز کی تمام روایات بلا کسی امتیاز و تردد کے قبول کی ہیں۔ اور کسی امام نے بھی ان کی کسی ایک حدیث کو بھی اختلاط کی بنیاد پر ضعیف نہیں ٹھہرایا ہے۔ اس لیے یہ روایت بالکل صحیح اور مستند ہے، والحمد للہ۔

حافظ ابن عساکر نے اس روایت پر بڑی تفصیل سے کلام کیا ہے۔ اسانید و طرق جمع کر کے گویا تمام اشکالات و شبہات کی وضاحت کا مواد جمع کر دیا ہے۔ عظیم محدث و ناقدِ حدیث حافظ ابن کثیر ابن عساکر کا کلام پڑھ کر نہایت فرحت و مسرت کے ساتھ، بلکہ وجد میں آ کر لکھتے ہیں:

وقد اعتنى ابن عساكر بهذا الحديث و أطنب فيه وأطيب، وأفاد وأجاد، وأحسن الانتقاد، فرحمه الله، كم له من موطن قد تبرّز فيه على غيره من الحفاظ والنقاد۔

ترجمہ: ابن عساکرؒ نے اس حدیث پر بہت شاندار، مفید اور نہایت مفصل ناقدانہ کلام کیا ہے، ۔اللہ ان پر اپنی رحمت نازل فرمائے ، بہت سے ایسے مقامات ومباحث ہیں جہاں دیگر علماء وحفاظ حدیث پر ان کا تفوّق صاف ظاہر ہوتا ہے۔ (البدایہ والنھایۃ: ۱۳۰/۸)

حافظ ابن کثیر نے حضرت معاویہ کے فضائل میں جو چند احادیث ذکر کی ہیں اور ان کی صحت وقوت کی صراحت کی ہے، ان میں یہ حدیث بھی ہے (البدایۃ والنھایۃ: ۱۳۱/۸)۔اور (ہمارے نزدیک) ان میں بھی اول درجے کی ہے۔

اے اللہ! معاویہ کو قرآن اور حساب کا علم عطا فرما اور اس کو عذاب سے محفوظ فرما:

حضرت عرباض بن ساریہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معاویہ کو سحری کھانے کی دعوت یہ کہہ کر دی کہ ''آؤ بابرکت کھانا کھالو''۔ پھر میں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو (اس مبارک وقت میں) معاویہ کے لیے یہ دعا کرتے ہوئے سنا کہ: **اللھم علم معاویۃ الکتاب والحساب وقه العذاب**'' یعنی اے اللہ! معاویہ کو علم قرآن اور حساب سکھلا دے۔اور اس کو عذاب سے محفوظ فرما[۱]۔

متاخر ائمہ میں سے حافظ ذھبی اور ابن کثیر نے اس حدیث کو معتبر وقوی قرار دیا ہے[۲]۔

روایت لا أشبع اللہ بطنه:

حضرت عبداللہ بن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مرتبہ اُن سے کہا کہ معاویہ کو بلا لاؤ، وہ گئے تو دیکھا کہ حضرت معاویہ کھانا کھا رہے ہیں۔آ کے کہا وہ کھانا کھا رہے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھر بھیجا، تو انہوں نے آ کر یہی اطلاع دی کہ وہ کھانا کھا رہے ہیں۔اس پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **لا أشبع اللہ بطنه**'' خدا اس کا پیٹ نہ بھرے (صحیح مسلم: ۲۶۰۴)۔

---

۱ صحیح ابن خزیمہ: ۱۹۳۸، صحیح ابن حبان بترتیب ابن بلبان: ۷۲۱۰، مسند احمد: ۱۷۱۵۲۔

۲ سیر الاعلام: ۱۲۴/۳، تاریخ الاسلام: ۵۴۰/۲، البدایۃ والنھایۃ: ۱۲۱/۸-۱۳۰۔ شیخ ناصر الدین البانیؒ نے اس حدیث کے تمام طرق اور دیگر صحابہ سے مروی اس کی تائیدات (شواہد) اور متعدد مرسل روایات جمع کر دی ہیں (السلسلۃ الصحیحۃ: ۶۸۷/۷-۶۹۵)۔شیخ البانی کی تحقیق حافظ ذھبی اور ابن کثیر کی تائید اور ان کی علمی رائے کی تفصیل فراہم کرتی ہے۔اس میں ان سوالات وشبہات سے تفصیلی بحث ہے، جن کی بنیاد پر اس روایت کو کمزور قرار دیا گیا ہے۔ان کے مطالعہ کے بعد علم حدیث کے قواعد اور تعدد طرق نیز مراسیل سے روایات کی تائید (اعتضاد) کے اصول سے واقف شخص کو اطمینان ہو جاتا ہے کہ اس حدیث کی کچھ منفرد سندوں پر چاہے کلام ممکن ہو، لیکن سب روایات مل کر واضح طور پر صحیح اور طاقتور حدیث کا مقام ضرور حاصل کر لیتی ہیں۔

''خدا اس کا پیٹ نہ بھرے'' اس جملے سے حضرت معاویہ کے ''خیر خواہوں'' کو یہ کہنے کا موقعہ مل گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معاویہ کو بد دعا دی۔ یہ دراصل عربی کے اسلوب کلام سے ناواقفی کی دلیل ہے۔ دراصل عربوں کا یہ خاص اسلوب کلام ہے کہ وہ کسی سے (ازراہ ملاطفت) بد دعا کے کلمات کہتے ہیں، اور مراد بد دعا نہیں ہوتی۔ اہل بلاغت کہتے ہیں کہ اس طرح کے کلمات سے کلام میں ایک زور پیدا ہوتا ہے۔ جیسے کہ عرب قسم کے الفاظ 'لا و اللہ' یا 'بلیٰ و اللہ' کہتے تھے اور ان کا قسم کا ارادہ نہیں ہوتا تھا۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث میں اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ اسی قبیل سے عربوں کا مشہور مقولہ ہے ''ثکلتک أمک'' جو لفظی اعتبار سے بد دعا ہے کہ تو مر جا اور تیری ماں غم میں روئے۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے محبوب صحابی حضرت معاذ اور دیگر صحابہ کو دوران گفتگو اس سے مخاطب فرمایا ہے۔ اسی طرح آپ نے اپنی بعض ازواج مطہرات کو ''عقریٰ، حلقیٰ'' کہا۔ جس کے لفظی معنیٰ تو یہی ہیں کہ اس پر بری ناگہانی مصیبت آئے۔ کسی سے آپ نے کہا ''تربت یمینک'' جس کے معنیٰ ہیں تو فقیر و نادار ہو جائے۔ امام نووی نے لکھا ہے کہ اس طرح کے کلمات کے بارے میں محقق علماء کی رائے یہی ہے کہ ان کلمات کے لفظی معنیٰ مراد نہیں ہوتے ہیں، جیسے 'تربت یداک' یا 'قاتله الله' (تجھ سے اللہ جنگ فرمائے) یا 'لا اب لک' (تو یتیم ہو جا) وغیرہ (شرح مسلم: ۲۲۱/۳، نیز ۱۵۲/۶)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت پر شفقت کا حال یہ تھا کہ آپ کو خیال ہوا کہ ایسے کلمات زبان سے نکل گئے ہیں، مبادا یہ عام الفاظ بارگاہ الٰہی میں بد دعا کے طور پر قبول ہو جائیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائی، اور وہ دعا قبول بھی ہوئی، کہ جس کسی مسلمان کے لیے ایسی بد دعا کے کلمات آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلے ہوں، وہ اس کے لیے تطہیر و کفارہ اور رحمت و برکت کا ذریعہ بنا دیے جائیں۔ امام مسلمؒ نے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اِس دعا کا تذکرہ کیا۔ اور پھر اس کے بعد 'لا أشبع الله بطنه' کی حدیث ذکر کی۔ مقصود یہ تھا کہ یہ کلمہ جو ازراہ ملاطفت نکلا تھا وہ انجام کار حضرت معاویہؓ کے لیے رحمت و برکت کا ذریعہ تھے (صحیح مسلم: ۸۸۔۹۷)۔

یہاں اس پر غور کیجیے کہ ان دشمنان معاویہؓ نے یہ بھی نہ سوچا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے براہ راست اس کو سننے والے اور روایت کرنے والے حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ ہیں۔ جو سیدنا علیؓ کے بعد ان کی جماعت کی سب سے بڑی شخصیتوں میں سے ایک تھے۔ وہ اگر اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بد دعا ہی سمجھتے تو وہ اِس کو اُس وقت ضرور سنایا کرتے جب وہ حضرت معاویہؓ سے کشمکش اور جنگ کی حالت میں تھے۔ یقینا پھر اس کو سیدنا علیؓ بھی جانتے اور حضرات حسنینؓ بھی۔ مگر ہم نہیں دیکھتے کہ سیدنا علیؓ نے کبھی مسلمانوں کو یاد دلایا ہو کہ لوگو! یہ جس سے میں جنگ کر رہا ہوں یہ ایسا بد نصیب ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان سے اس کو بد دعا ملی ہے۔ پھر سیدنا حسنؓ بھی سوچتے کہ وہ کس سے صلح کرنے جا رہے ہیں؟ مگر کوئی اس راز کو نہیں جان پایا، جو آج دشمنان معاویہ کو سمجھ میں آ رہا ہے۔

پھر سوچیے !اگر حضرت ابن عباس اس کو بد دعا سمجھتے تو کیا وہ حضرت معاویہؓ کے ساتھ اس محبت و اکرام کا معاملہ رکھتے جو انہوں نے مستقل رکھا؟ وہ تو امیر المومنینؓ کے دربار میں جاتے، اعزاز پاتے اور علمی مذاکرے کرتے تھے۔ حضرت معاویہؓ مکے تحاضر ہوتے تو حضرت ابن عباسؓ ان کے ساتھ طواف کرتے تھے۔ مزید برآں اُن کی تعریف و ستائش کرتے تھے، ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا صحابی بتاتے تھے۔ کوئی ان کی علمی رائے پر تعجب کرتا تو اپنے شاگردوں سے کہتے کہ معاویہ دین کے بڑے عالم ہیں، ہم میں سے کوئی اُن سے بڑا عالم نہیں۔ (یہ سب صحیح اسانید سے وارد روایتوں میں آیا ہے اور اسی کتاب میں آپ پڑھیں گے)۔ اس حدیث کا جو مطلب خود حضرت ابن عباس، سیدنا علی، حضرات حسنین رضی اللہ عنہم اور کسی صحابی نے نہیں سمجھا، آج یہ لوگ سمجھ رہے ہیں۔ اِن کی سمجھ پر تُف ہے تُف۔

روایت کی سندی حیثیت:

اس کے علاوہ اس روایت کی سندی حیثیت بھی مخدوش ہے۔ اس قصے کو اکیلے ابوحمزہ القصاب جن کا نام عمران بن ابی عطاء ہے، روایت کرتے ہیں۔ متعدد محدثین مثلاً امام ابوزرعہ رازی، ابوحاتم، امام نسائی اور امام ابو داوود نے ان کو ضعیف قرار دیا ہے (تہذیب الکمال: ۲۲/ ۳۴۳۔ ۳۴۴)۔ جن لوگوں نے ضعیف نہیں ٹھیرایا ہے، انہوں نے بھی کہا ہے کہ سچے تو تھے، لیکن ''لا یتابع علیٰ حدیثه'' (یعنی نئی نئی روایتیں بیان کرتے تھے، جن کو اور کوئی نہیں بیان کرتا) جس شخص پر یہ حکم لگایا جاتا ہے، اس کا تفرد قبول نہیں کیا جاتا۔ حافظ عقیلی نے ان کو اپنی کتاب الضعفاء الکبیر (۳/ ۲۹۹۔ ۳۰۰) میں ضعیف ٹھیرایا۔ اور ان سے جن روایتوں کو بیان کرنے میں غلطی ہوئی، ان کی مثال میں یہی روایت ذکر کی ہے۔ حافظ ابن حجر کی اصطلاح ہے کہ وہ جس راوی کو 'صدوق' کہیں اس کی کوئی ایسی روایت نہیں قبول کی جاتی جس میں وہ اکیلا ہو اور کوئی 'متابع' ساتھ دینے والا نہ ہو۔ ابوحمزہ کو انہوں نے تقریب التہذیب میں **صدوق** ہی کہا ہے۔ اور آگے مزید اضافہ فرمایا **یھم**, یعنی صرف اتنا ہی نہیں، بلکہ مزید کمزوری کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: روایات میں وہم ونسیان کے شکار ہوتے ہیں۔

اب سمجھا جاسکتا ہے کہ ابوحمزہ القصاب کے تفرد کی کیا حیثیت ہوگی۔ اسی لیے امام احمد ابن حنبل جیسا جلیل القدر امامِ حدیث اس روایت کو اپنی مسند میں چار جگہ ذکر کرتا ہے، مگر کسی جگہ اس لفظ ''**لا اشبع اللہ بطنه**'' کو ذکر نہیں کرتا۔ وجہ یہی ہے کہ ان کے نزدیک ابوحمزہ اس درجے کے راوی نہیں ہیں کہ ان کی بنیاد پر ایسی بات قبول کرلی جائے۔ (مسند: ۲۱۵۰، ۲۶۵۱، ۳۱۰۴، ۳۱۳۱)۔ اس سے محدثین کی دقیقہ رس تنقید اور باریک بینی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

تیسرا باب

خلافت صدیقی میں
حضرت معاویہؓ کی خدمات اور کارنامے

اسلام میں خلافت راشدہ کا امتیازی مقام:

قرآن وسنت کے بے شمار نصوص سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ خلافت راشدہ (اور خصوصاً حضرت ابوبکرو عمرؓ کا عہد) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے کارنامۂ دعوت واصلاح اور غلبۂ واظہارِ دین کی تکمیل کا خدائی انتظام تھا۔ حضور خاتم النّبیّین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر دین کا نزول تو مکمل ہو گیا تھا، لیکن قرآن نے پیشین گوئی کی تھی کہ زمین پر اس کے اظہار وتمکین اور قیام وغلبہ کا کام خلفائے رسول اور صحابۂ کرام کی جماعت کے حکمرانوں کے ذریعے ہی تکمیل پائے گا۔ اس سلسلے کی آیات واحادیث بے شمار ہیں، امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ نے اپنی علمی شاہ کار "ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء" میں ان آیات واحادیث کو جمع فرما کے ان کی نہایت اطمینان بخش تشریح فرمائی ہے۔ اہل علم ونظر کے لیے یہ پورا کلام قابل دید ہے، اس سے اسلام میں صحابۂ کرام کے مقام پر بھی اچھی روشنی پڑتی ہے، اور خصوصاً صحابۂ کرام میں جو فاتحین وحکام ہوئے ہیں اور جن کو اللہ تعالیٰ نے نظام خلافت راشدہ کے عمال (گویا کل پرزے) بننے کی سعادت بخشی تھی، ان کی مقبولیت وعنداللہ محبوبیت کا بھی پتہ چلتا ہے۔ حضرت معاویہؓ خلافت راشدہ کے اہم گورنر، فوجی جنرل اور رہنما ہونے کی وجہ سے یقینی طور پر اس گروہ کے فرد اور اس سعادت سے بہرہ مند تھے۔

یہاں ہم اس سلسلے کی ایک آیت درج کرتے ہیں:

" وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ، وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ "۔

یعنی تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے، اُن سے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ انہیں ضرور زمین میں اپنا خلیفہ بنائے گا، جس طرح اس نے ان سے پہلے لوگوں کو بنایا تھا۔ اور ان کے اُس

دین کوضرور اقتدار بخشے گا جس کواُس نے اُن کے لئے پسند فرمایا ہے۔(سورۃ النور:۵۵)

اس آیت کریمہ کے تحت حضرت شاہ ولی اللہؒ کے کلام کا حاصل یہ ہے کہ اس آیت میں جن لوگوں سے حکومت واقتدار دینے کا یہ وعدہ کیا جارہا ہے، وہ خدا کی شہادت کے مطابق، صاحب ایمان اور عمل صالح سے متصف ہیں۔ اس آیت کے نزول کے کچھ ہی عرصہ بعد اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو عظیم اقتدار و حکمرانی عطا فرمائی تھی۔ اور یہ حقیقت بھی دنیا کے سامنے ہے کہ آیت کے مخاطب مسلمانوں میں جن خدا کے منتخب بندوں کو اللہ نے حاکم وصاحبِ اقتدار بنایا ان میں سب سے پہلے حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما، ان کے گورنر اور فوجی سپہ سالاران تھے۔ اللہ کا یہ وعدہ کہ 'وہ اپنے دین کو زمینی اقتدار وقوت عطا کرے گا'، انہی حضرات کے ذریعہ پورا ہو۔ نیز آیت نے یہ بھی خبر دی تھی کہ صحابۂ کرام کے خلفاء وحکامِ کے ذریعہ جس دین کو اللہ اقتدار بخشے گا اور جو شرعی احکام نافذ فرمائے گا وہ اللہ کے پسند دیدہ احکام ہوں گے اور اسی دین اور شریعت کے احکام ہوں گے، جس کو اللہ نے پسند فرمایا ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی یا انحراف واقع نہیں ہوگا۔ (**وليمكنن لهم دينهم الذى ارتضى لهم**)۔ یہ سب باتیں اس آیت سے واضح طور پر معلوم ہوتی ہیں۔

رسول اللہ ﷺ پر نبوت ختم ہوئی تھی اور دین کی تکمیل واتمام کر دیا گیا تھا، لیکن آپ ﷺ کے دور میں زمین پر اس کا قلعہ ایسا مضبوط اور عرصۂ دراز تک کے لیے ایسا مستحکم و ناقابل تسخیر نہیں ہوا تھا، جس کی خاتم النبیین کے لیے اور خدا کی آخری شریعت کی تدوین ونفاذ کے لیے ضرورت تھی۔ اور نہ مسلمان بحیثیت ایک قوم وملت کے ایسے طاقتور ہوئے تھے کہ سارے عالم کے لیے ایک مستقل تہذیب اور صالح تمدن قائم کر سکتے۔ یہ کام خلافت صدیقی وفاروقی میں بڑی حد تک انجام پا گیا اور اس کی تکمیل بقیہ دور خلافت راشدہ اور اس کے بعد حضرت معاویہؓ کی دورِ پادشاہی میں ہوئی۔ اس حقیقت کا انکار ممکن نہیں ہے۔

دارالخلافہ میں فرامین واحکام کی تحریر:

حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت میں حضرت معاویہؓ بطور محرر وکاتب وثیقہ نویسی اور فرمان لکھنے کی خدمت انجام دے رہے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی حکومت میں وہ اس خدمت پر برقرار رہے۔ اس دوران انہوں نے حضرت ابوبکر کے حکم سے ایک جاگیر (قطعۂ آراضی) کا وثیقہ لکھ کر حضرت زبیر کو دیا تھا۔ امام بیہقیؒ نے روایت کیا ہے کہ حضرت زبیرؓ کے صاحبزادے عروہؒ حضرت معاویہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو ان سے حضرت معاویہ نے دریافت کیا۔ تمہارے پاس وہ وثیقہ محفوظ ہے جو 'المسلول' کے نام سے معروف ہے؟ عروہؒ نے کہا کہ ہاں وہ ہے۔ حضرت معاویہؓ نے فرمایا، وہ میرے ہی ہاتھ کا لکھا ہوا ہے (سنن کبری:۶/۲۴۰)۔

خلافت صدیقی کے دو اہم کارنامے اور دونوں میں حضرت معاویہؓ کی شرکت:

خلافت صدیقی کے دو سب سے بڑے کارنامے تھے۔ دونوں میں حضرت معاویہؓ کی اہم اور فعال شرکت رہی ہے۔ پہلا یہ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات سے پہلے ہی اندرون عرب میں بغاوت وانتشار شروع ہو چکے تھے۔ خلافت صدیقی میں اس کو دفن کرنے میں کامیابی حاصل کی گئی۔ اور دوسرا یہ کہ دنیا کی سپر پاور رومن بیزنطینی سلطنت عرب پر چڑھائی اور اسلام کو بیخ و بن سے اکھاڑ دینے کے ارادے سے فوج کشی کر رہی تھی۔ مسلمانوں نے قلیل وسائل اور معمولی قوت سے اس کا کامیاب مقابلہ ہی نہیں کیا، بڑی فتوحات بھی حاصل کیں۔

اب کچھ تفصیل سنیے! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کی خبر نے باغیوں اور مدعیان نبوت کو جری کر دیا تھا۔ مسیلمہ کذاب ایک بڑی طاقت بن کر خطرناک ہوا جا رہا تھا، مشرقی قبائل الگ سرکش ہونے لگے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے خلافت سنبھالی تو ارتداد کے فتنے اور عرب کی بغاوتوں ایسے خوفناک انداز میں سر اٹھایا کہ (بظاہر) اسلام کا مستقبل غیر یقینی نظر آنے لگا تھا۔ حالات ایسے نازک ہو گئے کہ جھوٹی نبوت کے دعویدار مسیلمہ کی بغاوت تک کے سلسلے میں حضرت عمر فاروقؓ جیسے مضبوط شخص کی رائے یہ تھی کہ اقدام کے بجائے (فی الوقت) صرف مدینہ منورہ کا دفاع کیا جائے۔ حضرت ابوبکرؓ کی مختصر مدتِ خلافت میں پہلا اور تاریخ ساز کارنامہ یہ انجام پایا کہ ان بغاوتوں کو نہایت مختصر وقت میں بڑی کامیابی سے کچل دیا گیا۔ اور سرزمین عرب جو اسلام کا قلعہ و مرکز تھی، کم از کم داخلی خطرات وانتشار اور بغاوت سے محفوظ ہو گئی۔ یہ بڑا نازک وقت تھا۔ مرتد قبائل کے مقابلہ میں سب سے اہم جنگ یمامہ کی جنگ مسیلمہ کذاب کے مقابلے میں تھی۔ یہ بڑی خونریز جنگ تھی۔ حضرت معاویہ اس جنگ میں شریک تھے۔ اور اس فتنے کے سرغنے مسیلمہ کذاب کے قتل میں دوسروں کے ساتھ ان کا بھی حصہ تھا۔ یہ ایک بڑے خطرے اور شر کا خاتمہ تھا۔ (البدایۃ والنہایۃ: ٨/ ٢٥)۔

داخلی بغاوتوں کو دور کرنے کے بعد اب حضرت ابوبکرؓ نے باہر کے خطرات کی طرف توجہ کی جن میں سب سے بڑے خطرے فارس و روم کے وہ دونوں سپر پاور تھے جو اپنے بالکل پڑوس میں ایک صالح دعوت اور نوخیز مملکت کو کچل دینے کا عزم کر چکے تھے۔ سرزمین شام اور جزیرۂ عرب کے شمال میں جو عرب قبائل آباد تھے وہ عیسائی ہو گئے تھے اور رومیوں کے تابع اور حامی تھے۔ رومیوں سے پہلے انہوں نے دشمنی کے تیور دکھاتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قاصدوں اور سفیروں کو قتل کر دیا تھا۔ ان کے مقابلہ کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لشکر بھیجا تھا، جس نے موتہ میں ان سے جنگ کی اور کافی نقصان اٹھا کر مدینہ واپس آیا۔ پھر براہ راست قیصر روم نے ایک

زبردست حملے کی تیاری کی، جب یقینی خبریں موصول ہوئیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوری تیاری کر کے شام کی طرف خود پیش قدمی فرمائی۔ آپ تبوک تک تشریف لے گئے۔ اس ہمت کے مظاہرے سے رومیوں کے قدم رک گئے۔ مگر مدینے پر مسلسل رومیوں کے حملے کا خدشہ لگا رہتا تھا۔

رومیوں کی سلطنت حدود عراق سے مغربی افریقہ تک، اور آرمینیہ سے مشرقی یورپ تک پھیلی ایک وسیع و منظم حکومت تھی۔ اس کی افواج کی تعداد لاکھوں میں تھی، اسلحہ کی کوئی حد نہ تھی، اور اس کی پشت پر مال کی بھی بڑی طاقت تھی۔ غرض یہ ایک سپر پاور کا خطرہ تھا، اور اب اسلام کی بقا اس پر منحصر تھی کہ مسلمان اس سپر پاور کا کیسے مقابلہ کرتے ہیں۔ ہرقل فرمانروائے مملکت روم مختلف سمتوں سے حملہ کرنے کے لیے لاکھوں کی تعداد میں فوجیں تیار کر رہا تھا۔ خطرہ ہر طرف سے بڑھ رہا تھا۔ ۱۱ھ میں حضرت ابوبکرؓ نے شام کے محاذ کے لیے نہایت عجلت میں انتظامات فرمائے۔ سارے عرب کے قبائل کو خطوط لکھ کر مجاہدین جمع کیے۔ حضرت معاویہؓ ان مہمات کی مرکزی شخصیتوں میں سے تھے۔ ان کو اپنے بھائی یزیدؓ کے تابع رکھا گیا، جن کے ساتھ وہ قیادت کی ذمہ داریوں میں شریک رہے۔

جماعت مجاہدین کی امارت:

شام کے علاقوں کی طرف چار لشکر بھیجے گئے۔ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت ابوعبیدہؓ کو حمص، حضرت شرحبیل بن حسنہؓ کو اردن، حضرت عمرو ابن العاصؓ کو فلسطین اور حضرت معاویہؓ کے بھائی حضرت یزیدؓ بن ابی سفیانؓ کو دمشق کی مہمات کا امیر طے کیا۔ اور ان کے ساتھ ان کے بھائی معاویہؓ کو بھی ان کے تعاون کے لیے ساتھ بھیجا تھا۔ (تاریخ طبری: ۳/ ۳۸۷، ۳۸۸)۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ شام کی مہمات یکے بعد دیگر اس طرح بھیجی گئی تھیں کہ عرب کے اطراف و اکناف سے فوجیں اور رسالے مدینہ آتے رہتے تھے اور حکومت ان کو آگے پیچھے بھیجتی جاتی تھی۔ سب سے پہلے لشکر کے امیر حضرت معاویہؓ کے بڑے بھائی یزید بن ابی سفیانؓ ہی تھے۔ اسی سلسلے میں ایک جماعت کا امیر حضرت معاویہؓ کو بنایا گیا۔ اور ان کو حکم دیا گیا کہ حضرت یزید بن ابی سفیان کے لشکر میں شامل ہو جائیں [۱]۔ اس لشکر میں حضرت معاویہ مقدمۃ الجیش کے امیر ہوتے تھے۔ عرقہ کی فتح کے لیے حضرت معاویہ کی قیادت میں فوج گئی تھی (فتوح البلدان: ۱۲۹)۔ نیز حضرت عمرؓ نے عسقلان کی مہم پر ان کو ہی براہ راست خط لکھ کر مامور کیا

[۱] طبری: ۳/ ۳۹۱، نیز ملاحظہ ہو البدایہ والنہایہ ۵: ۷/ ۷۔

تھا(فتوح البلدان: ۱۴۴)۔

فتح بصری:

قیصر نے شام میں لاکھوں فوجوں کومختلف محاذوں پر لگادیا تھاجس سے مسلمانوں کی پیش قدمی رک گئی۔ حضرت ابوبکر نے کئی مرتبہ کمکیں بھیجیں۔آخرکارعراق کے محاذوں سے نصف فوج نکال کرحضرت خالد کوشام بھیجا۔اوران کوشام میں موجودافواج کا سپہ سالاراعظم مقرر کیا۔وہ نہایت سرعت سے پہنچے اوردمشق کومرکز بنا کر کارروائیاں شروع کیں، جہاں حضرت یزید بن ابی سفیان (اورحضرت معاویہؓ) کی فوج پہلے سے موجودتھی۔ ملک شام کی بڑی فتوحات میں غالباً سب سے پہلے بصری فتح ہوا۔بصری رومن تہذیب کا شام میں سب سے بڑا مرکز تھا۔آج بھی آثارقدیمہ کی شاندارنشانیوں کے لیے جانا جاتا ہے۔یہ چونکہ دمشق کے ملحقات میں ایک ضلع تھا،اوردمشق کی مہم کے سربراہ حضرت یزید بن ابی سفیانؓ تھے،اسی لیے بعض مؤرخین کی رائے یہ ہے کہ بصری کی جنگ کے امیر بھی وہی تھے(فتوح البلدان، بلاذری:۱۱۶)۔

اجنادین:

بصری کی شکست اوراس کے مسلمانوں کی زیرنگیں آجانے کے بعد ہرقل کوفوری اورسنگین خطرے کا احساس ہوا، مذہبی اورسیاسی نقطۂ نظر سے ارض شام میں فلسطین سب سے اہم تھا۔اس نے جنگی حکمت عملی بدلی۔ شام کے سارے محاذوں سے اپنی فوجوں کوفلسطین کے علاقہ میں (موجودہ شہرالخلیل کے قریب) جمع کیا۔حضرت خالد بن الولید نے بھی حضرت ابوعبیدہ اوریزید بن ابی سفیان کی فوجوں کوساتھ لیااورحضرت شرحبیل بن حسنہ اور حضرت عمرو بن العاص کوخط لکھا کہ فلاں مقام پر پہنچیں۔اس معرکہ میں چوں کہ دونوں فریقوں نے اپنے مختلف لشکروں (اجناد) کوجمع کرلیا تھا،اس لیے اس کا نام اجنادین پڑ گیا۔

حضرت معاویہؓ مجاہدین کے ساتھ شریک جنگ رہے۔یہ ایک بڑا تاریخی معرکہ ثابت ہوا،رومی تقریبا ایک لاکھ اورمسلمان تیس ہزار کے قریب تھے۔قیصر(ہرقل) نے اب مسلمانوں کوفیصلہ کن شکست دینے کی نیت سے پوری طاقت جھونک دی تھی۔شام میں موجودافواج کے علاوہ اپنی الگ افواج بھی بھیجیں۔اوراپنے بھائی تھیوڈر کوسپہ سالارجنگ بنا کرارسال کیا۔جنگ میں سخت رن پڑا۔صحابہ کی ایک بڑی تعدادشہید ہوئی اوررومی لشکر کے تین ہزارفوجی مارے گئے۔ہرقل خودحمص میں مقیم ہوکرلگاتارمعرکہ کی خبرلے رہا تھا۔شکست کی خبرسے سخت بے چین ہوا۔اورحمص سے صوبہ شام کے اس وقت کے دارالحکومت انطاکیہ(موجودہ Antakya ترکی) منتقل ہوگیا(فتوح البلدان: ۱۱۷)۔

چوتھا باب

خلافت فاروقی کے عہد میں
حضرت معاویہؓ کی خدمات وکردار

اسلام میں خلافت فاروقی کا خاص مقام:

حضرت معاویہؓ نے حضرت عمر فاروقؓ کے عہد میں نہایت وسیع اور شان دار خدمات انجام دیں۔ اسلام کی تاریخ میں اس دور کی جو اہمیت ہے، وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔غلبۂ اسلام، فتوحات کی وسعت، شریعت کے نفاذ اور محاسن اسلام کو منصۂ شہود پر آشکارا کرنے کا جو منفرد کارنامہ خلافت فاروقی کے حصے میں آیا ہے، بالکل بے نظیر ہے۔اسلامی تاریخ سے معمولی سے واقفیت رکھنے والے کسی شخص کو اس میں ذرہ برابر تردد نہیں ہوسکتا کہ اسلام کو جو تقویت سیدنا عمر فاروقؓ سے ملی وہ کسی سے نہیں ملی۔اور ان کے مبارک و پرشکوہ دور خلافت میں اسلام کی جو حفاظت واشاعت ہوئی، خطرات کا جس درجہ قلع قمع کیا گیا اور شاندار فتوحات کا جو عظیم وطویل سلسلہ ہے، وہ اسلام کو کسی دور حکومت میں نصیب نہ ہوسکا۔اسی طرح انصاف کے قیام، مخلوق کی دادرسی اور کمزوروں کی خدمت کی جو اعلیٰ مثال اس دور میں قائم ہوئی، وہ بھی آج تک لاثانی ہے۔حضرت امیر معاویہؓ کے عزوشرف کی بات ہے کہ وہ عہدِ فاروقی کے نمایاں قائدین اور معماروں میں سے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کا عہد فاروقی سے متعلق ایک مبارک خواب:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حضرت عمر کے دور میں اسلام کی تائید ونصرت اور فتح وشوکت کی عالمِ رؤیا میں ایک مثالی تصویر دکھائی گئی تھی۔آپؐ نے فرمایا: کہ مجھے دکھایا گیا کہ میں اور ابوبکر وعمر ایک کنویں پر کھڑے ہیں۔میں ایک ڈول کے ذریعہ پانی نکال کر لوگوں کو پلا رہا ہوں۔پھر مجھ سے وہ ڈول ابوبکر نے لے لیا، انہوں نے ایک دو ڈول نکالے، مگر ان کے نکالنے میں دھیما پن تھا، اور اللہ ان کی مغفرت فرمائے گا۔اس کے بعد عمر نے ڈول اپنے

ہاتھ میں لے لیا، ان کے ہاتھ میں جاتے ہی ڈول نہایت بڑا ہو گیا۔ اور عمر نے بہت زوروں سے نکالنا شروع کیا، میں نے کسی بڑے پہلوان کو بھی عمر کی طرح ڈول کھینچتے نہیں دیکھا۔ عمر نے خوب پانی کھینچا، یہاں تک کہ سارے لوگ سیراب ہو گئے اور اپنے جانوروں کو بھی سیراب کر کے پڑاؤ ڈال دیا۔ (بخاری: ۷۰۱۹، صحیح مسلم: ۲۳۹۳)۔ جیسا کہ واضح ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت عمر کے دور میں اسلام کو حاصل ہونے والی عزت و شوکت اور استحکام وقوت کی خوشخبری ہے۔

رومیوں کے مقابلہ میں خلافت اسلامیہ کے سالار:

یہ دور حضرت معاویہؓ کے کارناموں کا آغاز شباب ثابت ہوا، جس میں ان کی خداداد قائدانہ صلاحیتوں کا خوب خوب ظہور ہوا۔ عہد فاروقی کے اہم ترین کارناموں میں شام و مصر اور شمال افریقہ کی وہ عظیم فتوحات بھی ہیں، جن کے ذریعہ ایشیا و افریقہ کے وسیع علاقے بیزنطینی مملکت سے واگزار کرائے گئے۔ اور وہاں کی انسانیت تک خدا کا دین پہنچایا گیا۔ مصر کے لیے گزرگاہ شام (اردن و فلسطین) کے علاقے ہی تھے، جو رومیوں کے قبضے میں تھے۔ لہٰذا مصر کی فتوحات بھی دراصل اردن و فلسطین کے علاقوں کی فتح کے بعد ہی ممکن ہو سکتی تھیں۔ اور ان علاقوں کی مہمات کے قائدین میں حضرت ابوسفیانؓ کے دونوں صاحب زادگان یزید و معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا نام شامل ہے۔

خطۂ شام اس وقت ایک جغرافیائی اور سیاسی اکائی سمجھا جاتا تھا، آج اس میں اسرائیل کے مقبوضہ ملک کے علاوہ فلسطین، اردن، لبنان، اور ترکی و عراق کے بھی کچھ صوبے شامل ہیں۔ مختلف پہلوؤں سے شام بیزنطینی سلطنت کے لیے اقتصادی اور فوجی لحاظ سے بہت اہم خطہ تھا۔ مصر و افریقہ کی پیداوار روم تک جانے کے لیے شام ہی واحد زمینی گزرگاہ بھی تھا۔ گویا یہی وہ شہ رگ تھی جس سے رومیوں کو اقتصادی خون پہنچتا تھا۔ مسلمانوں کے لیے شام کی یہ خاص اہمیت تھی کہ (خدانخواستہ) اس کے سقوط کا مطلب بالآخر عراق کا سقوط بھی تھا۔ عراق کے بعد عرب کا دروازہ بھی کھل جاتا تھا۔ اور بیزنطینی حملوں کے لیے برّی راستہ کھل جانے کے بعد مصر بھی محفوظ نہیں رہ سکتا تھا۔ حضرت معاویہؓ اس محاذ کے سب سے بڑے سالار اور ان مہمات مجاہد اعظم تھے۔

فتح عسقلان:

حضرت معاویہؓ کا لشکر شمالی شام میں دمشق پر مامور تھا۔ عہد صدیقی میں فلسطینی علاقوں کی مہمات شام کے دیگر لشکروں کے ذریعے انجام دی گئی تھیں، اب حضرت عمرؓ کا حضرت معاویہ کو خط آیا کہ فلسطین کے باقی ماندہ حصہ کی فکر کی جائے۔ اس علاقہ میں عسقلان ایک اہم رومی چھاؤنی اور شہری مرکز تھا۔ حضرت عمرو ابن العاص نے فتح

کرلیا تھا، مگر پھر ہاتھ سے نکل گیا تھا، آخر حضرت معاویہؓ نے اس کا رخ کیا، فتح فرمایا اور استحکام کے لیے وہاں مستقل فوجی چھاؤنی قائم کر کے کچھ فوجوں کو وہاں بسایا۔ (فتوح البلدان، بلاذری: ۱۴۴)۔

فتح دمشق:

دمشق علاقۂ شام (بلکہ مشرقی یورپ تک کے علاقوں کے لیے) ایک بڑے تجارتی وفوجی مرکز کی حیثیت رکھتا تھا۔ اسی لیے حضرت ابوبکرؓ نے شامی افواج کے امیر الامراء حضرت ابوعبیدہؓ کو لکھا کہ پہلے دمشق فتح کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ معرکہ شروع تو عہد صدیقی میں ہوا تھا لیکن اسی دوران جمادی الثانیہ ۱۳ھ میں حضرت ابوبکر صدیق کی وفات ہوگئی۔ اس لیے اس کو عہد عمری میں درج کیا جا رہا ہے۔

حضرت ابوبکر نے اس مہم کا امیر حضرت یزیدؓ کو بنایا تھا۔ حضرت خالد بطور متحدہ افواج کے سپہ سالار کے اس معرکہ کے قائد اعظم تھے۔ مسلم افواج نے شہر کا شدید محاصرہ کیا، مگر رومیوں کی تیاریاں اچھی تھیں۔ عسکری اعتبار سے دمشق میں قسطنطنیہ کے انداز پر حفاظتی انتظامات تھے۔ شہر پناہ نہایت مضبوط اور قلعے شان دار تھے۔ شہر پناہ کے باہر ایک خندق تھی جس میں دریا کا پانی آتا تھا۔ برجیوں میں تیر انداز، تیر اور دیگر پھینکے جانے والے ہتھیاروں سے لیس تعینات رہتے تھے۔ شہر کے چار دروازے تھے۔ ہر دروازے پر مسلمانوں کی ایک فوج نے پڑاؤ ڈال دیا۔ حضرت یزیدؓ اور حضرت معاویہؓ کی فوج باب الجابیہ الصغیر پر، جسے باب کیسان بھی کہتے تھے، تعینات تھی۔ مؤرخین نے بیان کیا ہے کہ ان مہمات میں اس فوج کے ہراول دستہ کے سپہ سالار معاویہؓ تھے۔ ۶ رمہینوں تک مسلمانوں کو کامیابی نہیں ملی۔ حضرت خالد جاں بازی کی مثال قائم کرتے ہوئے، چند فوجیوں کے ساتھ، شہر پناہ پھاند گئے اور اندر جا کر دروازہ کھول دیا۔ دوسری طرف سے حضرت یزید بن ابی سفیانؓ اور حضرت معاویہؓ نے بھی شدید حملہ کیا، رومیوں کے دل دہل گئے۔ گھبراہٹ میں شکست کھا کے پسپا ہوئے اور اس جانب کا دروازہ بھی کھول ڈالا۔ اس حملے سے رومی ڈر گئے اور شہر پناہ کے دوسرے دروازے خود کھول دیے اور ہتھیار ڈال دیے[۱]۔

دمشق کے اضلاع و ملحقات میں سے کچھ صلح اور کچھ جنگ کے ذریعہ مسلمانوں نے فتح کیے۔ حضرت معاویہؓ جس فوج کے سربراہوں میں تھے (یعنی ان کے بھائی یزید کی فوج) اس نے اذرعات کی طرف پیش قدمی کی، وہاں کے لوگوں نے بغیر مزاحمت کے اطاعت قبول کر لی۔ پھر ان کی فوج نے عمّان پر حملہ کیا۔ اس کی فتح کے بعد عرندل اور اس کے قریب کے وسیع و عریض میدانی اور پہاڑی علاقے اسلامی حکومت کے زیر نگیں آئے۔

---

۱ الامویون والبیزنطیون: ۱۳۳۔ البدایہ والنہایہ: ۷/ ۲۴، فتوح البلدان: ۱۲۷۔ ۱۳۰، تاریخ دمشق: ۲/ ۱۱۷۔

دمشق کے مغرب میں بحر متوسط کا ساحل تھا، جہاں رومیوں کے بڑے فوجی اڈے اور مراکز تھے۔ حضرت معاویہؓ کی فوج کو اس جانب بھیجا گیا۔انہوں نے صیدا، جبیل اور بیروت جیسے علاقے فتح کیے۔عرقۃ فتح کرنے کے لیے حضرت معاویہ کو مستقلاً ایک بٹالین کا امیر بنا کر بھیجا گیا تھا(فتوح البلدان:۱۲۷۔۱۳۰)۔

سواحل اردن کی فتوحات:

اردن کے علاقہ میں حضرت عمرو بن العاص جہاد کے امیر تھے۔ جب اس علاقے میں رومیوں کی بہت زیادہ فوجیں آ گئیں، تو انہوں نے امیر شام حضرت ابوعبیدہؓ سے کمک مانگی۔انہوں نے فوراً محاذِ دمشق کے کمانڈر حضرت یزیدؓ کو روانہ کیا۔حضرت یزیدؓ فوج لے کر بڑھے۔مقدمۃ الجیش پر حضرت معاویہ کو متعین کیا، جنہوں نے اس جنگ میں بڑی بہادری کا مظاہرہ کیا اور شان دار کارنامے انجام دیے۔بالآخر یہ علاقے فتح ہوئے۔ بلاذری نے نقل کیا ہے کہ اس جنگ میں حضرت معاویہؓ کا بڑا اہم اور شاندار کردار تھا(فتوح البلدان:۱۲۰)۔

جنگ یرموک اور سفیانی خانوادے کے شاندار کارنامے:

جنگ یرموک مسلمانوں کی بلکہ دنیا کی تاریخ کی فیصلہ کن جنگوں میں شمار کی جاتی ہے۔شام میں مسلمانوں کی فتوحات نے رومن امپائر کی چولیں ہلا دی تھیں۔فتح دمشق کے بعد مختلف سمتوں سے رومی افسران اور پادری بادشاہ ہرقل کے پاس پہنچے اور مذہب وقومیت کے حوالوں سے فریادیں کیں کہ حضور! یسوع مسیح کا واسطہ، شام وفلسطین کو بچائیے۔ ہرقل خود بہت متفکر تھا۔اس نے نہایت ولولہ سے مسلمانوں پر فیصلہ کن حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔ مملکت کے تمام اضلاع وصوبہ جات سے افواج جمع کرنے کے احکام دیے۔نئے فوجیوں کی بھی بھرتی کرائی۔ آخر بیزنطینی مملکت کی ہر جانب سے فوجوں کے سیلاب مذہبی غیظ سے ابلتے ہوئے (مرکز شام) انطاکیہ کی طرف چل دیے۔عیسائیوں نے ساری طاقت جھونک کر ارض شام کو عربوں کا مدفن بنانے کی قسم کھائی تھی۔

امیر شام حضرت ابوعبیدہ بن الجراح کو حالات کی اطلاع ہوئی کہ رومی فوجیں اب لاکھوں کی تعداد میں آ رہی ہیں۔مسلمان فطری طور پر خوفزدہ ہوئے۔وطن دور، کمک پہنچنے کے لیے لمبا وقت چاہیے۔اور واپس جانے کا امکان نہیں۔حضرت یزیدؓ بن ابی سفیانؓ اور حضرت شرحبیلؓ سے مشورہ کیا گیا۔آخر طے ہوا کہ شمال شام میں حمص وبعلبک وغیرہ جو علاقے فتح ہوئے ہیں، ان کے علاوہ بھی ملک میں جہاں جہاں مسلمان افواج قیام پذیر ہیں، وہ سب ایک جگہ جنوب شام میں نہر یرموک کے کنارے میدانی علاقوں میں جمع ہو جائیں۔

حضرت عمر کو اطلاع ہوئی کہ مسلمان رومیوں کی تعداد سے ڈر کر دمشق اور حمص وغیرہ خالی کر آئے ہیں تو غمگین ہوئے۔آخر یرموک کے میدان میں ۲ لاکھ سے زائد رومی افواج اور تیس ہزار مسلم فوج کے بیچ جنگ ہوئی۔قیامت کا رن پڑا۔رومی مذہبی جوش سے سرشار اور تعداد کے غرور میں ڈوب کر حملہ آور تھے۔مذہبی جذبے کا یہ عالم تھا کہ ہزاروں پادری صلیبیں لیے دعائیں پڑھتے ساتھ چلے آتے تھے۔

اس جنگ میں حضرت ابوسفیان کے خاندان نے حمیت دینی اور استقلال وشجاعت کے عجب جوہر دکھلائے۔حضرت معاویہ اپنے بھائی یزید کے لشکر میں تھے،جن کو میسرہ سپرد کیا گیا تھا۔یہ بڑا نازک و پرخطر موقعہ تھا، کہاں دو لاکھ کا آہن پوش لشکر، ہر طرح کے اسلحہ سے لیس، تیز طرار گھوڑوں پر سوار، کہاں مسلمان صرف تیس ہزار اور وہ بھی سادہ اسلحہ کے ساتھ۔اس وقت اگر کچھ مقابلہ ہوسکتا تھا تو بس بہادری، ہمت، استقلال، جوش جہاد اور شوق شہادت سے۔مسلمانوں کی قیادت نے حضرت ابوسفیان کو ولولہ انگیزی کی خدمت پر مامور کیا، کہ وہ واعظ عام کی حیثیت سے لشکر میں ہمت وجوش جہاد پیدا کریں۔صورت حال کی نزاکت نے ان کو بے چین کر رکھا تھا، کہیں قرار نہ تھا۔بڑھاپے کے باوجود میدان میں موجود، اسلحہ پوش اور گھوڑے پر سوار ہو کر صفوں میں ہر طرف گھومتے جاتے تھے اور ہمت آفریں اور ولولہ انگیز خطبوں سے جوش پیدا کرتے جاتے تھے۔ایک تقریر میں انہوں نے کہا:

''او مسلمانو! تم عرب ہو۔آج علاقہ عجم میں وطن سے اتنے دور ہو کہ امیر المومنین کی مدد بھی تم تک پہنچنا ممکن نہیں ہے۔تمہارا دشمن تعداد میں تم سے بہت زیادہ ہے، وہ پر غیظ ہے، اس کے غضب کی ہانڈی میں ابال آرہا ہے کہ تم نے اس کے علاقوں کو فتح کرلیا ہے۔اب دنیا میں اس سے بچنے اور آخرت میں اللہ کی رضا وجنت حاصل کرنے کا راستہ صرف یہ ہے کہ جم کر لڑو اور ہمت وصبر سے کام لو۔جان لو! فرار کا کوئی امکان نہیں۔عرب بہت دور، ریگستانوں کے پار ہے۔اللہ کے وعدوں پر یقین کے ساتھ اپنی تلواروں کو اپنا قلعہ بنالو''۔

یہاں تک کہ عورتوں کے پاس بھی تشریف لے گئے اور ان کو بھی جہاد و ہمت کی نصیحت کی۔پھر صفوں کے بیچ واپس آگئے اور مسلمانوں کو خطاب کر کے کہا:

''او مسلمانو! تم دیکھ رہے ہو کیسا نازک وقت آن پڑا ہے؟ وہ دیکھو، اوپر جنت ہے، رسول اللہ ﷺ تمہارے منتظر ہیں۔اور اگر تم نے کمزوری دکھائی اور فرار کی سوچی تو جہنم ہے۔

اسلامی فوج کو ۳۶ ٹکڑیوں پر تقسیم کر دیا گیا تھا حضرت ابوسفیان ہر ہر جماعت کے بیچ مستقل خطبہ دیتے، اور جہاد کی فضیلت میں قرآنی آیات سناتے اور کہتے:

اللہ، اللہ، لوگو! تم عرب ہو اور اسلام کے رکھوالے۔اور یہ رومی ہیں، شرک کے حامی۔اے اللہ، آج تیرا

دن ہے۔اپنے بندوں کی مدد فرما‘‘

رومی لشکر کی تعداد مسلمانوں کو دہلا دہلا دیتی تھی۔ان میں جوش بھی بلا کا تھا۔بعض موقعوں پر اسلامی فوج کے قدم بھی اکھڑ گئے۔مگر کچھ بٹالینوں نے پامردی کے ساتھ سنبھالے رکھا۔حضرت یزیدؓ میسرہ کے قائد تھے، نہایت مردانگی سے لڑ رہے تھے۔اسی درمیان حضرت ابوسفیانؓ ان کے پاس آئے اور کہا:

بیٹا!اس وقت تقوی اور ہمت سے کام لو۔اس وادیِ یرموک میں ہر مسلمان جہاد پر مامور ہے۔تم تو جماعت مجاھدین کے امیر و قائد ہو۔تم پر حق ہے کہ ثابت قدمی سے جنگ کرو اور اسلام کی خیر خواہی کو سامنے رکھو۔بیٹا!اللہ سے ڈرو،تمہارے لئے شرم کی بات ہے اگر تمہاری فوج کا کوئی بھی سپاہی شوق جنت اور ہمت و مردانگی میں تم سے آگے بڑھ گیا۔(البدایۃ والنھایۃ: ۷/ ۱۲، ۱۳)

حضرت سعید بن المسیب کے والد مسیّبؓ اس معرکہ میں شریک تھے،ابن سعد اور یعقوب بن سفیان فسوی نے حضرت مسیبؓ سے بسند صحیح روایات کیا ہے کہ جب شدت کا رن پڑا تو ایسی دہشت چھائی کہ ہر سو خاموشی کا سناٹا تھا۔بس اک آواز رہ رہ کر سناٹے کو چیر جاتی۔

یا نصرالله اقترب، یا نصر الله اقترب۔

الثبات، الثبات، یا معشر المسلمین۔

خدایا!اب مدد بھیج دے۔بارالہا:اب تیری مدد ہی کا آسرا ہے۔اومسلمانو!جم کر لڑو،اواللہ کے بندو! ثابت قدم رہو۔

مسیبؓ کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا،تو یہ حضرت ابوسفیانؓ کی صدائیں تھیں جو مصروفِ دعا تھے[۱]۔

اس معرکہ میں حضرت ابوسفیان کی آنکھ میں آکر ایک تیر لگا،اور وہ جاتی رہی۔حضرت معاویہ کی والدہ ہندؓ بھی عورتوں کے ساتھ فوج کے پیچھے خیمہ زن تھیں اور اپنے اشعار کے ذریعہ ہمت بڑھا رہی تھیں۔

آخر کار اس فیصلہ کن جنگ میں مسلمانوں کی فتح ہوئی۔رومیوں کی عظیم تعداد قتل ہوئی۔اور باقیوں نے پسپائی اختیار کی۔

قیصر (ہرقل) شام کے صدر مقام انطاکیہ میں تھا،اس نے شام چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور قسطنطنیہ کے لیے روانہ ہوا،شام پر آخری نظر ڈالی اور کہا ’’الوداع اے ملک شام‘‘۔یرموک تاریخ کا رخ طے کرنے والی جنگ ثابت ہوئی اور اسلام کی اس عظیم خدمت کے قائدین میں مجاہد صحابی حضرت معاویہ کی شمولیت ان کی سرخروئی کا ذریعہ اور سرمایۂ صدعز وافتخار بنی۔

۱؎ ابن سعد، جزء متمم الصحابۃ، الطبقۃ الرابعۃ: ۹۲، ابن حجر نے اس اسناد کو صحیح قرار دیا ہے۔الاصابہ: ۳/ ۳۳۴۔

قیساریہ کی فتح:

قیساریہ فلسطین کے اضلاع میں سے ایک نہایت بڑا اور پرشکوہ شہر تھا۔ بلاذری نے لکھا ہے کہ اس میں تین سو بازار تھے۔ رومی اپنے ہر شہر کی حفاظت کے لیے زبردست فصیل، شہر پناہ، اور قلعے بناتے تھے۔ شام ان کی شوکت کی نشانی تھی، قیساریہ کی بھی ایک مضبوط قلعہ وشہر پناہ حفاظت کرتے تھے۔ مسلمانوں نے کئی مرتبہ محاصرہ کیا، مگر کامیابی نہیں ملی تھی۔ سات سال تک مسلمان کوششیں کرتے رہے، مگر کامیابی ہاتھ نہ آتی تھی۔ آخر کار یہ شہر حضرت معاویہؓ نے فتح کیا۔ یرموک کی فتح کے بعد حضرت عمر نے حضرت یزید بن ابی سفیانؓ کو قیساریہ پر حملے کا حکم دیا۔ دوران محاصرہ وہ بیمار ہوگئے، لہٰذا انہوں نے حضرت معاویہ کو سپہ سالار فوج بنایا۔ اِدھر حضرت عمرؓ نے حضرت معاویہؓ کے نام خط لکھ کر ہدایات دیں کہ دعاوانابت کا اہتمام رکھو اور اللہ پر توکل کر کے لڑو۔ خط کے الفاظ یہ تھے:

اما بعد! میں تم کو قیساریہ پر فوج کشی کا ذمہ دار اور سپہ سالار بناتا ہوں۔ اللہ سے نصرت و مدد مانگتے ہوئے اس کی طرف کوچ کرو۔ تم لوگ کثرت سے یہ کلمات پڑھتے رہنا: ''لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ، اللّٰهُ رَبُّنَا وَثِقَتُنَا وَرَجَاؤُنَا وَمَوْلَانَا، نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ''۔ (طبری: ۳/ ۶۰۴)

مسلمانوں نے بڑے ساز وسامان سے شہر کا محاصرہ کیا۔ رومی کئی دفعہ نکل کر لڑے، حضرت معاویہ نے بڑی جاں بازی سے جنگ کی۔ رومی ہر دفعہ پسپا ہوئے۔ لیکن قیساریہ جنوبی ساحل پر ان کی طاقت کا مرکز تھا، یہاں ان کا بحری اڈہ تھا، اس جیسا شہر ہاتھ سے جانے دینا ان کے لیے بہت بڑے نقصان کی بات تھی، وہ ہر قیمت پر اس کی حفاظت کرنا چاہتے تھے۔ قیساریہ کے سقوط کے بعد ان کے لیے خطۂ شام واپس لینے کی امیدیں کمزور پڑ نا طے تھا۔ دوسری جانب مسلمانوں کے لیے بیت المقدس اور فلسطین کی فتح کے لیے قیساریہ پر قبضہ ضروری تھا۔ دونوں گروہوں نے پورے عزم کا مظاہرہ کیا۔ حضرت معاویہ نے سخت جدوجہد سے شہر کا محاصرہ جاری رکھا، مگر قیساریہ کی شہر پناہ سدِ آہنی بنی کھڑی تھی۔ آخر ایک مخفی سرنگ کا پتہ ایک یہودی نے دیا، حضرت معاویہ نے چند بہادر مجاہدین کو بھیجا، انہوں نے جا کر شہر پناہ کا دروازہ کھول دیا اور حضرت معاویہ اپنی فوج کے ساتھ شہر میں داخل ہوگئے۔ (البدایہ: ۷/ ۶۳، فتوح البلدان: ۱۴۱)

اسلامی فتوحات کا راز:

ان فتوحات نے انسانی تاریخ کا رخ موڑ دیا۔ یہ کوئی عام فتح، یا جنگ و فتح کا کوئی سادہ واقعہ نہیں تھا، بلکہ افکار واخلاق سے لے کر تمدن و معاش تک ہر پہلو سے انسانی زندگی پر اثر انداز ہونے والا ایک تاریخ ساز واقعہ تھا۔ اس لیے مورخین و مفکرین نے اس کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ عرب مسلمان اپنے صحراء سے اٹھے اور ایک گھٹا

کی طرح چھاتے گئے۔ یہ فتوحات جس سرعت اور سہولت سے انجام پائیں اس سے مورخین انگشت بدنداں ہیں۔
مسلمان تو روز اول سے اس کو اصلا توفیق الٰہی کا کرشمہ اور نصرت ربانی کی کارفرمائی سمجھتے آئے ہیں، مگر واقعات کے جس پیرہن میں اور اسباب کے جس پردے میں یہ توفیق ونصرت ظاہر ہوئی وہ بھی کچھ کم عجب نہ تھے۔ شام ومصر کے عیسائی اپنے ہم مذہب رومیوں کے ظلم سے عاجز آچکے تھے۔ یہاں کے لوگ Monophesiate مَنو فسائٹ عیسائی تھے، رومیوں کا مذہب Miaphysiate میافسائٹ تھا (مشرقی کیتھولک چرچ کے ان دو کلامی فرقوں میں چیرہ دستی چلی آتی تھی۔ منوفسائٹ کا خیال تھا کہ عیسیٰؑ صرف ایک الوہی طبیعت رکھتے تھے، جب کہ میافسائٹ کا موقف تھا کہ وہ تھے تو خدا، لیکن ان میں انسانی اور الوہی دونوں طبیعتیں تھیں۔ عیسائیت میں ایسی دقیق کلامی بحثوں پر بڑا کشت وخون ہوتا آیا تھا، سورۂ بقرہ کی آیت: ۲۵۳ میں ان خونریزیوں کا تذکرہ آیا ہے)۔ میافسائٹ حکومت منوفسائٹ فرقے پر سخت ظلم وجبر کرتی تھی، جس سے ان میں شورش پیدا ہوتی تھی۔
دوسرا سبب رومیوں کے گراں بار ظالمانہ ٹیکس تھے، جس سے مصر وشام سخت پریشان تھے۔ مسلمان آئے تو انھوں نے عیسائیوں کو مذہبی آزادی بھی دی اور ٹیکس میں بھی بہت نرم قوانین نافذ کیے۔ انگریز مورخ Archibald Lewis (آرکیبالڈ لویس) کا کہنا ہے کہ عربوں کے ہاتھوں جس سہولت سے شام ومصر فتح ہوئے، وہ بہت حیرت انگیز امر ہے۔ اس کے متعدد اسباب بیان کیے گئے ہیں، جن میں یہ بھی ہے کہ رومی سوسال سے فارسی امپائر سے جنگ کر کر کے تھک چکے تھے۔ اور یہ بھی کہ مسلمان غیر معمولی جذبۂ دینی سے سرشار تھے۔ کچھ اور پہلو بھی بیان کیے جاتے ہیں۔ لیکن اصل اور بڑا سبب یہ تھا کہ شام ومصر کے عوام نے مسلمانوں کی مزاحمت سے صاف انکار کردیا تھا۔ ہرقل کی ظالمانہ پالیسیوں، خصوصاً منوفسائٹ فرقہ پر مذہبی جبر اور ظالمانہ ٹیکسوں کی وصولی سے وہ تنگ آچکے تھے۔ مسلمانوں نے اِن عیسائیوں اور یہودیوں کو مذہبی آزادیاں دیں، ٹیکس کے نرم اور سہل ضابطے طے کیے، جس سے یکے بعد دیگرے شہروں نے اپنے دروازے ان کے لیے کھول دیے۔ ان علاقوں کے عوام مسلمانوں کو فاتح نہیں، مظلوموں کو آزادی دلانے والے کی نظر سے دیکھتے تھے [۱]۔

ملک شام کے بڑے صوبوں کی گورنری اور لشکر اسلام کی امارت:

عمواس کے طاعون میں جن بڑے بڑے امراء اسلام نے وفات پائی، ان میں حضرت یزیدؓ بن ابی

---

[۱] ملاحظہ ہو: Navel Power and Trade in The Mediterranean, Archibald Lewis : 53-54

سفیانؓ بھی تھے، یہ صحیح قول کے مطابق ۱۸ھ کا واقعہ ہے۔ حضرت عمرؓ نے ان کی جگہ پر حضرت معاویہؓ کو ذمے دار بنایا۔ حضرت یزیدؓ کے ماتحت صوبۂ دمشق (جو شام کا مرکزی علاقہ تھا اور جس کے ملحقات میں بعلبک و بلقاء وغیرہ بہت سے شہر تھے) اور یہاں کی افواج تھے۔ حضرت عمر نے جب فلسطین واردن کے امیر حضرت عمرو بن العاص کو مصر بھیجا تو ان کے علاقے بھی حضرت یزیدؓ کی عمل داری میں داخل کر دیے تھے [۱]۔ لہٰذا وہ علاقے بھی حضرت معاویہ کے تحت آ گئے۔ حضرت عمر حضرت معاویہ کو دیگر علاقوں کی امارت دیتے جاتے تھے۔ سن ۲۱ھ کے آتے آتے حضرت معاویہؓ کی عمل داری میں صوبۂ دمشق کے علاوہ اردن، قلقیہ، سواحل شام، فلسطین، انطاکیہ وغیرہ متعدد صوبہ جات داخل ہو چکے تھے۔ واضح رہے کہ انطاکیہ انتہائی شمال میں (موجودہ ترکی میں) ہے، دمشق ومضافات موجودہ سیریا کا بڑا حصہ بنتا ہے، اور فلسطین واردن الگ ممالک ہیں۔ (طبری: ۴/۱۴۴۔۱۴۵، الولایہ علی البلدان: ۱۲۶)۔ یہاں تک کہ ابن اسحاق جیسے مورخ کا بیان ہے کہ حضرت عمر ہی کے عہد میں حضرت معاویہؓ پورے شامی ممالک کے گورنر مقرر کر دیا تھا۔ نہایت متقدم مورخ خلیفہ بن خیاط (وفات: ۲۴۰ھ) کا بھی یہی بیان ہے کہ حضرت عمر نے ہی حضرت معاویہؓ کو پورے شامی اقلیم کا حاکم مقرر کر دیا تھا: **جمع الشّام كلها لمعاوية بن أبي سُفيان** [۲]۔ اگرچہ اکثر علماء کے نزدیک چونکہ حمص وقنسرین کے اضلاع پر ابھی حضرت عمیر بن سعد انصاریؓ امیر تھے، اس لئے حضرت معاویہؓ اس وقت پورے شام کے گورنر بنے جب یہ کچھ علاقے بھی ان سے لے کر عہد عثمانی میں حضرت معاویہؓ کے حوالے کر دیئے گئے۔ (تاریخ اسلام: ۲/۵۴۰)۔ لیکن یہ بہر حال طے ہے کہ حضرت عمر نے ہی اقلیم شام کا غالب تر حصہ حضرت معاویہ کے زیر امارت دے دیا تھا۔ لہٰذا حضرت عثمان کو یہ الزام دینا کہ؛ انہوں نے حضرت معاویہؓ کے اختیارات میں اپنی رشتے داری کی وجہ سے بہت اضافہ کر دیا تھا جو مصلحت کے خلاف تھا، ایک بے بنیاد بات ہے اور شیعیت زدگی کا نشان ہے۔

اس موقعے پر حضرت عمرؓ نے ان کو اصول حکم رانی اور اخلاقی قواعد سے متعلق ایک تفصیلی ہدایت نامہ بھی تحریر فرمایا تھا، جس میں حکومتی معاملات میں خاص طور پر تقویٰ اور خوف خدا کی تلقین کی گئی تھی (تاریخ دمشق: ۵۹/۱۱۷)۔

مسلسل جہاد، صوائف وشواتی:

حضرت عمرؓ کی خلافت میں حضرت معاویہؓ جہاد میں سب سے سرگرم گورنر ثابت ہوئے۔ موسم سرما میں شمال شام اور اناضول میں سخت سردی ہوتی، لہٰذا ان علاقوں میں وہ ہر سال گرمی میں مہمات بھیجتے۔ انہیں صوائف کہا جاتا تھا۔ کبھی ضرورت کے مطابق لشکر سردیوں میں بھی ان علاقوں کو جاتا اور پورا موسم سرما وہیں گزار

۱۔ فتوح البلدان: ۱۴۶، البدایہ والنہایہ: ۸/۲۳۔

۲۔ تاریخ دمشق: ۵۹/۱۱۱، تاریخ خلیفہ بن خیاط: ۱۵۵۔

کرآتا۔سردیوں میں جنوب شام اور فلسطین کے علاقوں میں مہمات بھیجتے، انہیں شواتی کہتے تھے۔شام کے شمال میں امانوس (Amanus) کا پہاڑی سلسلہ اور سخت دشوار گزار علاقہ تھا۔اس میں گزرگاہوں اور درّوں پر رومیوں کے قلعے اور چھاونیاں تھیں۔یہ فوجی قلعے ان کے شام پر قبضے کے ضمانت کے سامان تھے۔اور اپنے علاقے (موجودہ ترکی و مشرقی یورپ) سے شام و مصر پر برّی حملوں کے لیے ان قلعوں اور چھاونیوں کی بڑی اہمیت تھی۔حضرت عمر جب شام تشریف لائے اور ان محاذوں کے تفصیلی حالات معلوم ہوئے تو احکام جاری کیے کہ ان دروں اور راستوں کا منھ بند کرنے کے لیے مسلسل تدابیر کی جائیں۔(طبری: ۴/ ۶۴)۔

مزید اقدامی پالیسی:

حضرت معاویہؓ نہایت اولوالعزم و بلند ہمت ہونے کے ساتھ دور بینی میں بھی یکتا تھے۔انہوں نے مزید اقدامی نقشۂ کار طے کیا۔وہ یہ کہ معرکہ مسلمانوں کے علاقوں کے بجائے رومی علاقوں میں منتقل کردیا جائے۔اس کے لیے انہوں نے یہ اسٹریٹجی بنائی کہ رومیوں کے قلعوں اور دروں پر خود قبضہ کرکے ان کو مسلمانوں کی پیش قدمیوں کے لیے مرکز کے طور پر استعمال کرنا ہے۔اس کے لیے طے فرمایا کہ موسم گرما میں، جب شمالی شام اور رومی علاقوں میں برفباری نہیں ہوتی، تو ہر سال جہاد اور پیش قدمی کی جائے گی۔حضرت معاویہؓ بنفس نفیس ان جہادی مہمات کی بکثرت قیادت کرتے اور فتح مند ہوتے۔طبری نے روایت کیا ہے کہ ۲۲ھ کی مہم میں حضرت معاویہ نے دس ہزار کی تعداد کے ساتھ غزوہ فرمایا۔(۴/ ۱۶۰)۔

عموریہ (Amorium) کی مہم:

عموریہ اناضول میں رومیوں کا ایک مضبوط فوجی مرکز تھا۔جب شام رومیوں کے ہاتھ سے نکل گیا تو انہوں نے اس کو فوجی اعتبار سے بہت وسعت و ترقی دی تھی۔یہ شہر پناہ اور قلعوں، گڑھوں سے گھرا ہوا شہر تھا۔حضرت معاویہؓ نے اسی اہمیت کے پیش نظر اس پر ایک بڑے حملے کا منصوبہ بنایا۔خود قیادت فرمائی اور کچھ دن اس کا محاصرہ کرکے واپس آئے۔یہ سن ۲۳ کا واقعہ ہے [۱]۔یہ عموریہ پر پہلا حملہ تھا۔اس مہم میں حضرت ابوذرؓ، ابوایوبؓ، عبادۃ بن الصامتؓ جیسے صحابہ ان کے لشکر میں شامل تھے۔عموریہ ایشیاء کوچک کے مغرب میں بحر مرمرہ سے قریب تھا۔اب مسلمان گویا باسفورس کے پاس پہنچ گئے تھے اور رومن امپائر کا پایۂ تخت قسطنطنیہ ان کے سامنے تھا (طبری: ۴/ ۲۴۱)۔

---

[۱] ملاحظہ ہو عموریہ پر Christopher Lightfoot کا مقالہ
https://www.metmuseum.org/toah/hd/amor/hd_amor.htm

سمندری بیڑے کی خواہش اور منصوبہ:

رومیوں کے پاس اس وقت دنیا کا سب سے بڑا بحری بیڑا تھا۔جس کی ترک تازیوں سے نہ صرف شام کے ساحلی مقامات مسلسل خطروں میں رہتے تھے، بلکہ ہر وقت یہ اندیشہ لگا رہتا تھا کہ رومی فوجیں بحری جہازوں سے آ کر حملہ نہ کر دیں۔رومیوں نے شام میں اپنے دورِ حکومت میں ساحلی مقامات پر بہت سے فوجی اڈے، گڑھیاں اور جہازوں کے لنگر انداز ہونے کے اسٹیشنز بھی بنا رکھے تھے، جو ابھی بھی باقی تھے۔حضرت معاویہ نے حضرت عمر کو مشورے کے لیے حالات لکھے، تو انھوں نے حکم دیا کہ ساحلی قلعوں اور گڑھیوں کی مرمت کی جائے، چھاؤنیاں قائم کی جائیں، چوکیوں اور ساحل کے بلند مقامات پر چوکیدار رکھے جائیں۔اور سمندر میں رات کی نگرانی کے لیے روشنیوں کا انتظام کیا جائے (فتوح البلدان:ص ۱۳۰)

حضرت معاویہ نہایت بلند حوصلہ اور اقدامی مزاج رکھتے تھے، ان کی پختہ رائے تھی کہ رومی سمندر میں اپنے بحری بیڑوں کی وجہ سے برتر ہیں اور مستقل خطرہ رہتا ہے کہ رومی سمندر کے راستے شام پر حملہ نہ کر دیں۔اس لیے مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ ان سے اس میدان میں بھی لوہا لیا جائے، یعنی بحری بیڑے تیار کیے جائیں اور سمندری تاختوں کے ذریعہ رومیوں کو پسپا کیا جائے۔حضرت عمر کو مسلمانوں پر جو شفقت تھی وہ کسی طرح اِس تجویز کو قبول نہیں کرنے دیتی تھی۔دوسری طرف حضرت معاویہ کا جوشِ جہاد اور میدانی حقیقتوں کا براہ راست تجربہ اُن سے بار بار اصرار کرواتا تھا۔ایک مرتبہ عریضہ میں تحریر کیا کہ حمص سے ساحل سمندر کی طرف رومیوں کے مقبوضات چند قدم کے فاصلے پر ہیں۔"حمص کے بعض گاووں میں رومیوں کے کتوں کی آواز اور مرغوں کی بانگ سنائی دیتی ہے"۔لہذا حمص غیر محفوظ ہے۔غالبا یہ اشارہ تھا طرابلس کی طرف، جہاں رومیوں کا مضبوط بحری اڈہ تھا اور جس سے مسلسل خطرہ رہتا تھا۔طبری نے متعدد حضرات سے نقل کیا ہے کہ حضرت عمر تقریباً راضی ہو گئے، آخری مشورے کے لیے مصر کے گورنر حضرت عمرو بن العاص کو خط لکھ کر رائے مانگی، وہ بحری سفروں کے تجربہ کار تھے، انھوں نے مثبت رائے نہیں دی۔اس لیے حضرت عمر نے منع فرما دیا (۴/ ۲۵۷۔۲۵۸)۔

حضرت عمر فاروقؓ کے عُمّال کا معیار اور حضرت معاویہؓ کے لیے ایک بڑی سند:

عُمّالِ فاروقی میں ہونا حضرت معاویہؓ کے لیے ایک شہادت ہے۔حضرت عمر کے عمال کا معیار خود ان کی نظر میں کیا تھا، اور وہ کس نظر سے اپنے عمال کا انتخاب کرتے تھے، اس کا اندازہ صحیح سند سے وارد طبری کی دو روایات سے ہوتا ہے۔

طارق بن شہابؓ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ جب بھی کسی کو عامل مقرر کرتے برسرعام اعلان کرتے:

إني لم أبعثهم ليأخذوا أموالهم، ولا ليضربوا أبشارهم، من ظلمه أميره فلا إمرة عليه دوني.

میں نے ان کو اس لیے امیر نہیں بنایا ہے کہ لوگوں کا مال ہڑپ کریں اوران پر تشدد کریں۔ جو عامل ظلم کرے تو مظلوم کو مجھ تک شکایت پہنچانے کی مکمل آزادی ہے ۱۔

دوسری روایت ہے کہ معدان بن طلحہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر نے ایک مرتبہ جمعہ کے خطبے کے دوران اپنے عاملوں کے بارے میں کہا:

اللهم إني أشهدك على أمراء الأمصار أني إنما بعثتهم ليُعَلِّموا الناس دينهم وسنة نبيهم، وان يقسموا فيهم فيئهم، وأن يعدلوا، فإن أشكل عليهم شيء رفعوه إليّ.

اے اللہ! تو گواہ رہنا، میں نے ان کو اِس لیے گورنر یا افسر بنایا ہے کہ وہ لوگوں کو اللہ کے دین کی تعلیم اور سنت نبوی سکھانے کا انتظام کریں۔عوام میں مال کی صحیح تقسیم کریں۔عدل قائم کریں۔اور کسی مسئلے میں اگر کچھ اشتباہ ہو تو مجھ سے رجوع کریں ۲۔

حضرت معاویہ نے اس مقصد و نقطۂ نظر سے اپنے عُمّال کا انتخاب کیا تھا اور وہ اسی معیار سے اپنے گورنروں اور کارپردازوں کا امتحان وجائزہ لیتے تھے۔اب آگے پڑھیے کہ حضرت فاروق حضرت معاویہؓ کو اپنی طرف سے پسندیدگی اور رضامندی کی سند بھی دیتے تھے۔

عمال کے سلسلے میں حضرت عمر کا سخت امتحان اور حضرت معاویہؓ کی کامیابی:

حضرت معاویہ پر خلفاء راشدین کے اعتماد کا اندازہ اس سے کیجیے کہ حضرت عمر فاروقؓ جیسے عاملوں پر سخت نظر رکھنے والے اور محاسبہ کرنے والے خلیفہ کے دور میں لگاتار ان کو ترقی دی جاتی رہی اور ان کی عملداری اور اختیارات میں اضافہ کیا جاتا رہا۔انسانی تاریخ عدل وانصاف اور حسن انتظام سے آراستہ کاروبار حکومت میں حضرت عمر کی کوئی نظیر نہیں پیش کرسکتی۔گورنروں اور عہدے داروں کے انتخاب میں حضرت عمر کا طرز حیرت انگیز حد تک بے نظیر ہے۔ان کی شخصی عظمت اور امت کے دلوں میں ان کی ہیبت اور محبوبیت نے ان کو اپنے گورنروں

۱۔ طبری: ۴/ ۲۰۳، سند اس طرح ہے: حدثنا محمد بن المثنى، قال: حدثنا عبد الرحمن بن مهدي، قال: حدثنا شعبة، عن يحيى بن حضين، سمع طارق بن شهاب۔

۲۔ طبری: ۴/ ۲۰۳، ۲۰۴، سند یوں ہے: حدثنا ابن بشار، قال: حدثنا ابن ابی عدی، عن شعبة، عن قتادة، عن سالم بن ابی الجعد، عن معدان بن ابی طلحة

اور عہدے داران کی شدید نگرانی اور محاسبہ کی جو قدرت بخشی تھی وہ بھی بے مثال ہے۔ تاریخ انسانی گورنروں اور وزراء کے طرز حکومت کی ایسی شدید نگرانی اور محاسبہ کی نظیر نہیں پیش کر سکتی۔ ان کے دور میں بڑے بڑے فیصلے چٹکیوں میں لیے جاتے تھے، مصلحت کے تقاضے سے یا شکایت پر بڑے بڑے گورنروں اور عاملوں کو ایسی آسانی سے سبک دوش کیا جاتا تھا جیسے کوئی مسئلہ ہی نہ ہو۔ اس میں جہاں ان عاملوں کی بے نفسی اور اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ خلوص ووفاداری کو دخل تھا، وہیں حضرت عمرؓ کی عظمت واحترام اور بلند شخصیت کا بھی کردار تھا۔ ایسے عظیم الشان خلیفہ کے دور میں ملک شام کی حکومت اور مملکت روما (بیزنطین) کے خلاف جہاد کی سربراہی پر قائم رہنا، بلکہ ذمہ داریوں اور دائرہ کار میں توسیع پاتے جانا حضرت معاویہؓ کی بیش قیمت اور منفرد صلاحیتوں، منصفانہ طرز حکومت، صاف ستھرے کردار اور قابلِ فخر خدمات کی یقینی اور عظیم الشان شہادت ہے۔

حضرت عمر کے دور میں کسی کا قائدانہ جوہر یا انتظامی صلاحیتیں اس کو حکومت کا عہدہ دینے کے لیے کافی نہیں تھیں، بلکہ اس میں دیانت وامانت، بلکہ باطنی کیفیات وحالات کی صفائی بھی لازمی شرط تھی۔ وہ اپنے ارکان کو کن کن معیاروں پر شدت سے پرکھتے تھے اس کا اندازہ احنف بن قیسؒ کے قصہ سے ہوتا ہے۔ یہ بنوتمیم کے بڑے سردار تھے، اور بصرہ کے اہم قائدین میں شمار ہوتے تھے[۱]۔ حضرت عمر کو ان کے سماجی مرتبے اور غیر معمولی صلاحیتوں کی خبر ملی، بلا بھیجا اور مدینہ میں اپنے سامنے رہنے کا حکم دیا۔ حضرت عمر لگاتار ان کو دیکھتے اور پرکھتے رہے۔ پورے ایک سال تک اپنے پاس روکے رکھا۔ سال بھر دیکھنے کے بعد کہا: احنف تمہارا ظاہر بہت اچھا ہے۔ امید ہے کہ باطن بھی اچھا ہوگا۔ اصل میں میں نے تم کو پرکھنے اور امتحان لینے کے لیے سال بھر اپنے سامنے رکھا۔ اب جاؤ فلاں علاقے کی حکومت سنبھالو (سیر اعلام النبلاء: ۸۹/۴)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر کس درجہ جانچ پرکھ کے بعد کسی کو ذمے داری دیتے تھے۔ حضرت معاویہؓ پر جو اس درجے اعتماد تھا، اس کے پیچھے کتنی پرکھ اور تجربہ ہوگا اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اہل علم کے نزدیک حضرت معاویہ کے لیے یہ بڑی سند ہے کہ وہ حضرت عمرؓ کے منظور نظر تھے۔

حضرت عمرؓ اپنے زیر حکومت اقالیم کے امور سے متعلق مدینہ کی مرکزی مجلس شوری سے، جو کبار مہاجرین پر مشتمل تھی (اور جس میں حضرت علیؓ کی اہم حیثیت تھی) مشورہ لیتے رہتے۔ اہم امور میں مدینہ کے مہاجرین

[۱] احنف بن قیس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد میں ایمان لا چکے تھے۔ آپؐ نے ان کی قوم کی طرف ایک صحابی کو دعوت اسلام کے لیے بھیجا، احنف بن قیس نے ان کی خوب تائید کی اور قوم کو اسلام پر آمادہ کیا۔ وہ صحابی واپس آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا کہ احنف نے اسلام کی بہت تحسین وتائید کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعا فرمائی: اللھم اغفر للاحنف۔ (مسند احمد: ۲۳۶۳۱)

وانصار کو جمع کیا جاتا اور سب سے یہاں تک کہ نو جوانوں سے بھی مشورہ لیتے تھے۔اسی طرح عوام سے بھی مشورے لیتے ،خصوصاً گورنروں اورافسران فوج کے بارے میں،ان سے کہتے تھے،اچھے لوگوں کا نام بتاؤ جن سے حکومت کے کاروبار میں مدد لوں۔عمومی طور پر فرماتے: وہ شخص فاجر ہے جو کسی فاجر کو عہدہ دے دے [۱]۔ لازمی ہے کہ حضرت معاویہ کے طرزِ عمل کو اس مجلس شوریٰ کے بھی رضامندی حاصل تھی اور کوئی شکایت نہیں تھی۔

تمام امراء کو حکم تھا کہ وہ حج کے موقع پر ضرور مدینہ آئیں۔سب آجاتے تو حضرت عمرؓ لوگوں کے بیچ اعلان عام فرماتے کہ میں نے اپنے گورنروں کو تم پر ظلم کرنے کے لیے حاکم نہیں بنایا ہے۔کسی کو کوئی شکایت ہو تو برملا کہے۔ ہر سال لوگ بڑی سہولت سے امراء کی شکایت پیش کر دیتے، تحقیق کی جاتی، اگر شکایت ثابت ہوتی تو فوراً اس کا فیصلہ ہوتا [۲]۔

حضرت عمرو بن العاص ان لوگوں میں تھے جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حاکم بنایا تھا۔انہوں نے کسی شخص کو غصے میں منافق کہہ دیا۔اس نے بھی قسم کھالی کہ حضرت عمرؓ سے شکایت کیے بغیر سکون سے نہیں بیٹھے گا۔حضرت عمر نے حکم جاری کیا کہ اگر مدعی گواہ پیش کر دے تو گورنر کو اسی کے ہاتھ چالیس کوڑے لگوائے جائیں۔اس نے گواہ پیش کر دیے۔لوگوں میں کھلبلی مچ گئی ،عمرو بن العاصؓ کو، جو فلسطین وجنوب شام کے امیر اور پھر فاتح مصر اور گورنر تھے، ایک عام انسان درے لگانے جا رہا تھا۔لوگوں نے اس کی خوشامد کی کہ پیسے لے کر معاف کر دو۔وہ اڑ گیا، نہ مانا، آخر حضرت عمرو بن العاصؓ سزا کے لیے تیار ہو گئے۔عجب منظر تھا، اتنا بڑا گورنر اور سپہ سالار ایک عام انسان سے کوڑے کھانے جا رہا تھا، گورنر کی طاقت کمزور تھی اور اسلام وانصاف کی شوکت بلند۔اب اس شخص نے حضرت عمرو بن العاصؓ سے پوچھا: دیکھ لو، تم کو اب تمہارا حاکم ہونا تو نہیں بچا سکتا؟ انہوں نے کہا نہیں۔اس نے کہا: بس! مجھے یہی دکھانا تھا۔میں نے معاف کیا(تاریخ المدینہ: ۸۰۸/۳)۔

امام ابو یوسف نے کتاب الخراج میں، طبری نے حضرت عمر کی وفات کے تذکرے کے بعد اور ابنِ شبّہ نے تاریخ مدینہ میں اس طرح کے بہت سے بے مثال عبرت انگیز واقعات نقل کئے ہیں۔طبری وغیرہ مؤرخین کی متعدد روایات سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت محمد بن مسلمہ انصاریؓ کو صوبائی عمال کے جائزے کے لیے مرکزی حکومت سے بھیجا جاتا تھا۔اور اُن کو بر سر موقعہ اصلاح وتنبیہ کی اجازت بلکہ حکم ہوا کرتا تھا۔یہ ان کا باقاعدہ عہدہ تھا۔طبری (۱۲۱/۴) نے ان کا حکومتی عہدہ ’افسر برائے جائزۂ امراء‘ لکھا ہے۔

۱۔ فتوح البلدان: ۲۶۲،مناقب عمر لابن الجوزی: ۱۹۱، ۱۲۰۔ملاحظہ ہو: ولایۃ البلدان فی عہد الخلافۃ الراشدۃ: ۸۸۔

۲۔ ابن شبّہ، تاریخ مدینہ: ۸۰۸/۳، طبری: ۲۰۴/۴

''وكان محمد بن مسلمة صاحب العمّال الذي يقتص آثار من شُكِيَ زمان عمر ''
خلافت فاروقی میں عمال کے جائزے اور شکایات کی چھان بین کے لیے مرکزی افسر کے طور پر محمد بن مسلمہ مقرر تھے۔

حضرت محمد بن مسلمہؓ کا انتخاب اس عہدے کے لیے اِس لیے کیا گیا تھا کہ وہ نہایت کھرے صاف آدمی تھے، کسی کی رورعایت میں حق چھپانا نہیں جانتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت عمر نے ان سے اپنے بارے میں پوچھا، توانہوں نے کہا کہ آپ کا طرز بالکل معیاری ہے، اور حکومت منصفانہ وفیاض ہے۔ اور اگر آپ بھی کچھ راستے سے ہٹے تو ہم آپ کو ٹھیک کر دیں گے۔ اور اس طرح سیدھا کر دیں گے جیسے تیر کو سیدھا کیا جاتا ہے۔ اس بے باکی پر حضرت عمرؓ نہایت خوش ہوئے اور ان کو حکومت کا اخلاقی نگراں متعین کر دیا[1]۔ حضرت محمد بن مسلمہؓ بلا کسی رو رعایت تنبیہی کارروائی کرتے تھے، یہاں تک کہ حضرت سعد بن ابی وقاص جیسے جلیل القدر صحابی اور فاتح کا بھی محاسبہ اور جائزہ لیا گیا۔

ظاہر و یقینی ہے کہ حضرت معاویہؓ کے طرز عمل اور سیرت و کردار کا بھی اسی باریک بینی اور اونچے معیار سے جائزہ لیا جاتا رہا ہوگا۔ جب اس سب کے بعد حضرت عمر فاروقؓ کے نزدیک ان کی شخصیت اتنی قابل اعتماد قرار پاتی تھی تو یہ حضرت معاویہؓ کے لیے کیسی بڑی سند و حجت اور کتنے شرف کی بات ہے!! عہد عمری میں حضرت معاویہ دس سال تک امیر رہے، ان کو لگاتار ترقی دی جاتی رہی۔ کسی کو اگر اس میں حضرت معاویہ اور ان کے طرز حکومت کی سندِ توثیق نظر نہ آئے تو اس کو تعصب وضد یا شپرہ چشمی کے علاوہ اور کچھ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

حکومت کی شان وشوکت پر حضرت عمر فاروقؓ کا سوال اور امیر معاویہؓ کی توجیہ:

حضرت عمر اگر چہ خود نہایت زاہدانہ و متقشفانہ زندگی بسر کرتے تھے اور اپنے حکام و عہدیداران کو بھی سادگی و جفاکشی پر مجبور کرتے تھے، لیکن متعدد معتبر روایات اور واقعات کی شہادت ہے کہ اس مسئلے میں حضرت معاویہ کو رخصت دے دیتے تھے اور ان کی اس رائے کو تسلیم کر لیتے تھے کہ شام میں عرصے سے تمدن کی رعنائیوں نے لوگوں کو پر تکلف زندگی کا عادی بنا دیا ہے، آبادی کی ایک بڑی تعداد عیسائی ہے اس لیے اسلامی حکومت کے استحکام کے لیے شان و شوکت کا اظہار ضروری ہے، تاکہ دلوں پر اس کی ہیبت کا نقش اور رعب و دبدبہ قائم ہو اور بغاوت و شورش سے حفاظت رہے۔

---

[1] الزھد لابن المبارک: ۱/۱۷۹، طبری: ۴/۷۴۔

حضرت فاروقؓ شام تشریف لے گئے۔ حضرت معاویہ (فوج کے) ایک عظیم الشان جلوس کے ساتھ استقبال کو نکلے۔ اگرچہ یہ گورنر کی ذاتی شان وشوکت نہیں تھی، بلکہ خلیفۂ اسلام کے استقبال کا پروٹوکول تھا، لیکن پھر بھی امیر المومنینؓ کو کچھ بھایا نہیں۔ سوال کیا کہ حکومت کے پاس ضرورت مندوں کی ابھی بڑی جماعت باقی ہے، اور یہ طرز و اندازِ استقبال؟ انہوں نے عرض کیا: امیر المؤمنین! ہم دشمن کے مقابلہ پر ہیں، رومیوں کے جاسوس ہر وقت ہم کو دیکھ رہے ہیں۔ حکومت اگر شان وشکوہ کا مظاہرہ کرے گی تو وہ اس کی خبریں رومیوں کو دیں گے اوران پر رعب پڑے گا، دوسری صورت میں ان کی ہمت بڑھے گی۔ اب آپ اگر اس طرز کو ترک کرنے کا حکم فرمائیں گے، تو ہم ضرور آپ کا حکم مانیں گے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: معاویہ! تم بھی خوب ہو، میں جب بھی کچھ باز پرس کرتا ہوں، تم مجھے ہی حیرت میں ڈال دیتے ہو۔ تم جو کہہ رہے ہو اگر واقعہ ہے، تو تمہاری رائے بڑی ہوشمندانہ ہے۔ اور اگر واقعہ کے خلاف ہے، تو دھوکہ ہے۔ عرض کیا: آپ کا جو حکم ہو ہم مانیں گے، ارشاد فرمائیں۔ حضرت عمر نے فیصلہ حضرت معاویہ پر ہی چھوڑ دیا۔ حاضرِ موقعہ کسی شخص نے کہا کہ آپ نے معاویہ کی ذہانت دیکھی؟ حضرت عمر نے فرمایا اس ذہانت و ہوشیاری کی وجہ سے ہی تو ہم نے ان پر اتنی بڑی ذمہ داریاں ڈالی ہیں [۱]۔

حضرت معاویہؓ مدینہ میں جب تک رہے نہایت فقر و سادگی سے بسر کی۔ اگر حضرت عمرؓ کے نزدیک حضرت معاویہؓ کے طرزِ عمل کی دینی واخلاقی طور پر گنجائش نہ ہوتی، یا مصلحت اس کی متقاضی نہ ہوتی تو وہ ضرور معزول فرمادیتے۔ ان کی طاقتور و بارعب شخصیت کے لیے یہ کوئی مسئلہ کبھی نہیں رہا۔ حضرت معاویہ سے بہت بڑے اور زیادہ محترم لوگوں کو معزول کرنے میں ان کو مطلق دیر نہیں لگی۔

حضرت معاویہ کی مقبولیت ومحبوبیت:

اگرچہ (جیسا کہ گذر چکا) حضرت عمر کی طرف سے اعلان عام ہوا کرتا تھا کہ کسی اقلیم کے عامل کی کوئی شکایت ہو تو مجھ تک ضرور پہنچائی جائے۔ نیز آپ حج کے موقع پر ہر علاقے کے لوگوں سے خود بھی براہ راست پوچھتے تھے، لیکن (میری تلاش اور مطالعہ کی حد تک) حضرت معاویہ کے بارے میں عوام نے یا افسران نے کبھی حضرت عمرؓ سے کوئی شکایت نہیں کی۔ یہ غیر معمولی حد تک فکر انگیز نقطہ ہے۔ حضرت معاویہ کی حکومت وسیاست اور طرز وکردار کے لیے یہ کتنی بڑی شہادت ہے، اس کا بخوبی اندازہ عہد عمری کی تاریخ پر نظر رکھنے والے کو ہی ہوسکتا ہے۔

اسی لیے حضرت معاویہؓ معترضین کے جواب میں کہا کرتے تھے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معصوم تھے، انہوں نے مجھے اپنا عامل بنایا اور کارپردازانِ حکومت میں شامل کیا۔ پھر حضرت ابو بکرؓ نے مجھے حاکم بنایا، پھر حضرت عمرؓ

---

[۱] حلم معاویۃ لابن ابی الدنیا، ص:۱۹، البدایۃ والنھایۃ :۸/۱۳۳، تاریخ طبری :۵/۳۳۱، نیز انساب الاشراف:۵/۱۴۷۔

نے مجھے والی مقرر فرمایا۔ اس کے بعد حضرت عثمانؓ کا دور آیا، انہوں نے بھی مجھے حاکم طے کیا۔ اور ان میں سے ہر ایک میرے طرز عمل سے مطمئن رہا'' (طبری: ۴/ ۳۱۲)۔

حکومت کی فطری لیاقت اور حضرت عمرؓ کی تصدیق:

اہل نظر حضرت معاویہؓ میں نوجوانی سے ہی امارت وقیادت کی فطری لیاقت محسوس کرتے تھے۔ حضرت عمر کی جوہر شناس نگاہ سے وہ کیسے چھپ سکتی تھی۔ اس فطری جوہر وصلاحیت اور سیاسی زیرکی وتدبیر کے نتیجہ میں وہ ایک مدبر حکمراں (Real Statesman) بن کرابھرے تھے۔ حضرت عمرؓ کی جوہر شناس نگاہ نے ان کی طاقت ور شخصیت اور قیادت وانتظام کی صلاحیت کو دیکھ لیا تھا۔ عہد فاروقی کے شروع میں حضرت معاویہؓ اپنے بھائی یزید کے ساتھ بطور معاون کام کررہے تھے، ابن سعد نے صحیح سند سے روایت کیا ہے کہ جب ان کی وفات ہوئی تو حضرت عمر نے حضرت معاویہؓ کو امیر مقرر کیا اور یہ فرمایا کہ کسی اچھے کام کرنے والے کو ذمے داری نہ دینا ہمارے لیے صحیح نہیں ہے[1]۔

شام کے ایک علاقہ پر حضرت شرحبیل بن حسنہؓ گورنر اور فوجی قائد کے طور پر حضرت ابوبکرؓ کے عہد سے چلے آتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے ان کو سبکدوش کرکے ان کا علاقہ بھی حضرت معاویہؓ کے تابع کردیا۔ حضرت شرحبیل قدیم الاسلام صحابی اور مہاجرین میں سے تھے، ان کو غم ہوا کہ یہ گویا میرے خامی کا اعلان ہے۔ حضرت عمرؓ کے پاس آکر دریافت کیا کہ مجھ میں کوئی کمی ہے؟، تو انہوں نے فرمایا: نہیں نہیں، تم بہت اچھے آدمی ہو۔ لیکن مجھے ایک زیادہ باصلاحیت آدمی کی تلاش تھی۔ ''ولكني اريد رجلا اقوى من رجل'' (طبری: ۴/ ۶۵)۔

حضرت عمرؓ کے نزدیک تدبیر مملکت میں سب پر فائق:

سیاست وتدبیر حکومت میں حضرت عمر اپنے تمام والیوں اور قائدین میں حضرت معاویہ کو فوقیت دیتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ: تعجب ہے، تم لوگ قیصر وکسریٰ کی سیاسی زیرکی ''دھاء'' پر حیرت کرتے ہو، معاویہ کو نہیں دیکھتے؟[2]۔ بعض حضرات کو بدگمانی ہوئی ہے کہ اس میں حضرت معاویہ کی مذمت ہے۔ لیکن جو شخص حضرت عمرؓ کے طرز حکومت اور حکام مملکت کے سلسلے میں ان کے اعلیٰ معیار، سخت محاسبے اور بڑوں بڑوں کی معزولی کے

[1] الطبقات الکبری، القسم المتمم للصحابۃ، الطبقۃ الرابعۃ: ۱۱۳۔

[2] طبری: ۵/ ۳۳۰۔ تاریخ الاسلام: ۴/ ۳۱۱۔

واقعات پر نظر رکھتا ہو؛ وہ اس غلط فہمی میں نہیں پڑ سکتا۔ وہ اگر ناپسند فرماتے تو یا تو معزول کر دیتے یا طرزِ عمل کی تبدیلی یقینی بناتے۔

حضرت عمرؓ کی طرف سے ایک واضح شہادت:

ایک مرتبہ واقعہ کچھ یوں ہوا کہ حضرت معاویہ ہرا خوبصورت جوڑا پہنے ہوئے، حضرت عمر کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت عمر نے درے سے خبر لی، معاویہ عرض کرتے رہے: امیر المومنین! کیوں؟ کیوں؟ لوگوں نے عرض کیا: امیر المومنین آپ کی جماعت میں اس جیسا کوئی نہیں، پھر آپ اس شدت سے کیوں پیش آئے؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا: واقعۃً مجھے ہمیشہ اچھا ہی تجربہ ہوا ہے اور جو اطلاعات ملتی ہیں وہ بھی اچھی ہی ملتی ہیں (واللہ ما رأیت الا خیرا وما بلغنی الا خیر)۔ لیکن، مجھے لگا کہ ان میں کچھ غرور اور خود بینی نہ آجائے، اس لیے کچھ سرزنش کر دی[۱]۔

حضرت عمرؓ کا حضرت معاویہؓ کے ساتھ خاص تربیت کا معاملہ:

حضرت معاویہؓ کے ساتھ حضرت فاروق کا اِسی طرح کا خاص تربیت و اصلاح کا معاملہ تھا۔ کوئی ایسی خاص قابلِ مواخذہ بات نہ ہوتے ہوئے بھی انہوں نے مربیانہ سرزنش کی اور ساتھ ہی یہ بھی ارشاد فرمایا کہ وہ ان کے طرزِ عمل سے پوری طرح مطمئن ہیں۔ کوئی بالغ نظر مربی و مصلح ایسا مربیانہ سلوک ہر ہما شما کے ساتھ نہیں کرتا، بلکہ اپنے انہی چھوٹوں سے کرتا ہے جن پر اس کی خصوصی نظر ہوتی ہے۔ اسی طرح کا ایک اور واقعہ ہمارے سامنے ہے۔ حضرت عمرؓ حج میں تھے، حضرت معاویہ آئے، سرخ سپید رنگت، رعنا صورت و شکل اور جسم پر خوش حالی کے آثار تھے۔ سارے مجمع میں چمک رہے تھے۔ حضرت عمرؓ نے دیکھا اور (از راہ تلطّف) حضرت معاویہؓ کی کمر پر ہاتھ رکھا، اور کہا: واہ، واہ۔ اگر اس طرح دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائیاں جمع ہو سکتی ہیں تو ہم بڑے خوش نصیب ہیں۔ حضرت معاویہ نے عرض کیا: امیر المومنین میں بتاتا ہوں، ہم ایک ایسے خوش حال ملک میں ہیں جہاں اچھے کھانے بھی دستیاب ہیں اور حمام وغیرہ ہوتے ہیں، (تو اس کا اثر جسم پر پڑتا ہے)۔ حضرت عمر نے فرمایا: جی نہیں، میں بتاتا ہوں اس کا راز یہ ہے کہ تم نے اپنے آپ کو لطیف اور پر تکلّف غذاؤں کا عادی بنا لیا ہے،

---

[۱] ابن سعد الطبقات الکبری، القسم المتمم للصحابۃ، الطبقۃ الرابعۃ: ۱۱۳، یہاں یہ ملحوظ رہے کہ حضرت عمرؓ کو صوبوں اور ان کے حکام کی ہر ہر خبر پہنچتی رہتی تھی۔

عیش سے رہتے ہو،ضرورت مند باہر کھڑے انتظار کرتے رہتے ہیں اورتم دیر تک سوئے رہتے ہو۔اس لیے موٹے تازے ہو گئے ہو۔

اسلم کہتے ہیں کہ ایک دن ہم نے دیکھا کہ معاویہ نے ایک جوڑا پہنا جس میں حضرت عمر کو کچھ خوش بو محسوس ہوئی،تو حضرت عمر نے پھر ڈانٹا۔تو حضرت معاویہ نے (ناز کے انداز میں) عرض کیا،آپ شام سے لے کر مکہ تک ہر جگہ مجھے تنگ فرماتے رہتے ہیں۔مجھے آج اپنے خاندان والوں سے ملنے جانا تھا اس لیے پہن لیا،مگر اسلم کہتے ہیں: میں نے دیکھا کہ معاویہ پر شرمندگی کے آثار تھے۔فوراُن کپڑوں کو اتار کر احرام کے کپڑے جن میں حج کیا تھا پھر پہن لیے۔(الزهد لابن المبارك: ۱/ ۲۰۳،حافظ ابن حجر نے اس کی سند کو قوی قرار دیا ہے۔ الاصابۃ:۶/ ۱۲۲)۔

بیرونی سازشوں کا آغاز اور حضرت عمرؓ کی شہادت:

۲۷ ذی الحجۃ ۲۳ھ کو سیدنا عمرؓ کو ایک فارسی النسل کے ذریعے شہید کر دیا گیا۔طاقتور قرائن کی بنیاد پر کہا جاتا ہے کہ یہ ایک سادہ قتل کا واقعہ نہیں تھا،بلکہ کسروی حکومت کے اہم ارکان کے ذریعے رچی گئی سازش تھی۔ سیدنا عمرؓ مسلمانوں میں دینی و دنیوی اقتدار کے مرکز تھے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پیشین گوئی فرمائی تھی کہ ان کی شہادت سے وہ دروازہ ٹوٹ جائے گا جو فتنوں کو روکے ہوگا۔کچھ ہی مدت میں مسلمانوں نے اس پیشین گوئی کا مصداق ان فتنوں کی شکل میں دیکھ لیا،جن کا آغاز سیدنا عثمان کے دور میں ہوا۔یہ فتنے مدّتوں امت کے جسم میں کسی نیزے کی طرح پیوست رہے۔

پانچواں باب

حضرت معاویہؓ خلافت عثمانی کے دور میں

حضرت عثمان کی خلافت کا آغاز سن ۲۴ھ کے ابتدائی ایام سے ہوا۔حضرت معاویہؓ اس وقت تقریباً پورے اقلیم شام کے حکم راں تھے،حضرت عثمان نے باقی حصہ بھی ان کے تابع کر دیا۔ جہاد وغزا کی جن سرگرم جولانیوں کو ہم عہد فاروقی میں دیکھتے آئے تھے،وہ بدستور اس عہد میں بھی جاری تھیں۔مگر قلعۂ اسلام کو رومن امپائر سے محفوظ رکھنے کے لیے ابھی کافی مہمات انجام دینی ضروری تھیں۔

سرحدوں کے تحفظ کے اقدامات:

اس دور میں حضرت معاویہؓ کا ایک بڑا کارنامہ سرحدوں پر اہم تزویراتی حصولیابیاں (Strategic Gains) تھیں۔شام اور الجزیرہ کی سرحدوں پر رومیوں کے ساتھ کشمکش تھی۔اِن کو اس دور میں ثغور کہتے تھے۔رومی سیکڑوں سال سے جنگی طاقت جمع کرتے آرہے تھے۔ان کی دفاعی تنصیبات اس دور کے تمدن کا نقطۂ عروج اور دنیا کی عسکری تاریخ میں بے نظیر تھیں۔انہوں نے ان پورے پہاڑی علاقوں پر قلعوں اور گڑھیوں کا ایک نہایت طویل سلسلہ بنا رکھا تھا، جو عراق کے شمال مغرب میں ملطیہ سے لے کر سلسلۂ امانوس سے ہوتا ہوا بحرِ متوسط کے ساحل پر طرسوس تک پھیلا ہوا تھا۔ یہ دو حصوں میں منقسم تھا۔اس کا شمال مشرقی حصہ ثغور جزریہ کہلاتا تھا۔اس کے اہم فوجی مراکز اور قلعے تھے:ملطیہ، زبطرہ، حصن منصور، حدث، مرعش اور شمشاط۔ان کے درمیان ہر قابل عبور مقام پر بے شمار گڑھیاں اور فوجی بیرکس تھیں۔اس کے بعد امانوس کی اونچی ناقابل عبور پہاڑیاں تھیں۔پھر جنوب مغربی حصہ ثغور شامیہ کہلاتا تھا۔اس کے اہم قلعے تھے،عین زربہ، اذنہ، طرسوس اور ہرقل۔یہاں بھی ان قلعوں کے علاوہ ہر درے اور ناکے پر گڑھیاں تھیں جن میں مختصر تعداد میں رنگروٹ تعینات رہتے تھے۔(معاویہ:۵۲)۔

یہ ’’ثغور‘‘ رومیوں کو ایک واضح برتری دینے والا عامل تھا۔ پہاڑ کے پیچھے سے کدھر سے رومی آدھمکیں گے کچھ پتہ نہیں چلتا تھا۔رومیوں کی تیاریوں اور اقدامات پر نظر رکھنے کے لیے مسلمانوں کو بہت دراندازیاں کرنی

پڑتی تھیں، یہی مہمات صوائف کہلاتی تھیں، جن کا ایک مقصد اس پر نظر رکھنا تھا کہ رومی کدھر سے حملے کرنے والے ہیں۔ رومی انہی قلعوں اور فوجی مراکز سے آ آ کر حملے کرتے تھے۔ یہ بڑا مشکل محاذ تھا، یہاں تک کہ جب حضرت عمر شام آئے تھے اور صورت حال کی سنگینی ان کے علم میں لائی گئی تو فکر مندی میں ان کی زبان سے نکلا: میرا جی چاہتا ہے کی ان پہاڑی دروں میں آگ بھر جاتی، ہم ادھر رہتے اور رومی اُدھر (تاریخ یعقوبی: ۲/ ۱۳۳)۔

عموریہ کی کامیاب مہم:

سن ۲۵ ھ کی موسم گرما کے جہاد میں حضرت معاویہ عازم جہاد ہوئے۔ اور عموریہ پر حملہ کیا۔ اس مرتبہ رومیوں کے ساحلی اڈوں کی طرف سے گئے۔ اس مہم میں انہوں نے دیکھا کہ انطاکیہ (جو رومن نظام میں شام کا پایۂ تخت تھا اور اب موجودہ ترکی کے جنوب میں ہے) سے لے کر طرسوس تک ساحلی اڈوں پر موجود گڑھیاں اور قلعے خالی پڑے ہیں۔ امیر معاویہ نے ان سب پر قبضہ کیا۔ اور وہاں اپنے ساتھ کی افواج میں سے شمال عراق کے صوبہ الجزیرہ، قنسرین اور دیگر شامی افواج کی بٹالینیں تعیینات کیں۔ یہ ایک غیر معمولی کامیابی تھی۔ اس کے بعد خود دمشق واپسی فرمائی۔ (فتوح البلدان: ۱۶۵)

ہر سال ان علاقوں پر ان کی فوجیں حملے کرتیں اور رومیوں کو پسپا کرتیں۔ حضرت معاویہ جس قائد کو کسی جہاد کی مہم پر روانہ فرماتے اس کو پورا نقشہ سمجھاتے اور تفصیلی ہدایات دیتے۔ ۲۶ ھ یا ۲۷ ھ کی مہم یزید بن الحر عبسی کی امارت میں روانہ فرمائی۔ ان کو تفصیلی ہدایات دیں کہ کس علاقے میں کیا کرنا ہے۔ ان کے ساتھ ساحلی بحری اڈوں پر قبضے اور تعیینات کے لیے اضافی فوجیں روانہ فرمائیں۔ سن ۳۱ ھ میں حضرت معاویہ نے پھر خود جہاد فرمایا۔ اس مرتبہ مصیصہ سے ہوتے ہوئے درولیہ تک کا دورہ کیا۔ اور انطاکیہ سے درولیہ تک کے تمام رومی قلعے منہدم کروا دیے۔ (فتوح البلدان: ۱۶۵)۔

نئے اقدامات:

عہد عمری میں حضرت معاویہ نے اس سلسلے میں جو اقدامات کیے تھے ان کا تذکرہ آچکا ہے۔ اب تک مسلمان حملہ کرتے تو رومی بھاگ جاتے، مسلمان ان قلعوں کو کچھ نقصان پہنچا کے واپس آجاتے کہ رومی فوجوں کے لیے ان کو پھر استعمال کرنا مشکل ہو۔ پھر جب حضرت معاویہ کو مکمل شام کا امیر بنایا گیا تو انہوں نے ان قلعوں میں مسلمانوں کی فوجیں معین کرنے اور ان کے نزدیکی شہروں میں مسلمانوں کو آباد کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ ایک دوررس نتائج کا حامل اقدام تھا۔ انطاکیہ رومیوں کی حکومت میں اقلیم شام کا دارالحکومت اور فوجی مرکز تھا۔ اس کو واپس لینے کے لیے رومی مسلسل یورشیں کرتے تھے۔ دفاعی لحاظ سے اس شہر کا تحفظ بہت ضروری تھا۔ مسلمانوں کا

قبضہ مضبوط کرنے کے لیے حضرت معاویہ نے اندرونی علاقوں کے مسلمانوں کو وہاں جا کر آباد ہونے کی ترغیب دی۔ اوراس کے لیے معاشی ترغیبات (Incentives) کے طور پر جاگیریں تقسیم کیں۔ وہاں موجود قلعوں اور دفاعی بنیادی ڈھانچے (Infrastructure) کو مضبوط کیا۔ شام کے شمال مغرب میں اسکندرون سے لے کر شمال میں طرسوس تک کے طویل پہاڑی سلسلے پر مسلم آبادیاں بسانے کا سلسلہ جاری رکھا۔ یہاں تک کہ یہ سرحدیں کافی محفوظ ہوگئیں[۱]۔

حضرت معاویہؓ کا اہم کارنامہ، فتح آرمینیہ:

شام کے محاذ کے طرح آرمینیہ سے بھی رومیوں کو پسپا کرنے کا کارنامہ حضرت معاویہ ہی نے انجام دیا۔ رومیوں کو ایشیائی اقوام کے حملوں سے محفوظ رکھنے کے لیے قدرت نے پہاڑی سلسلوں کی شکل میں زبردست قدرتی قلعہ وفصیل بخشے تھے۔ شام کے شمال میں امانوس کا پہاڑی سلسلہ تھا۔ اور آرمینیہ کے پہاڑی سلسلے عراق ومشرق سے حفاظت کرتے تھے۔ اس دور میں آرمینیہ کا مشرقی حصہ فارس کی مقبوضات میں شامل اور مغربی حصہ روم کے تابع تھا۔ آرمینیہ الجزیرہ کے شمال میں واقع تھا، اس کی ایک خاص اہمیت یہ تھی کہ یہاں کے پہاڑی دروں اور راستوں سے بھی اناضول (ایشیائے کوچک) میں بیزنطینی مملکت پر حملے ہو سکتے تھے۔ شام کی فتح کے بعد رومیوں کے لیے عرب اور اسلامی ممالک پر حملوں کا یہ راستہ تو مسدود ہو گیا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے آرمینیہ کے راستے سے حملے شروع کیے تھے۔ حضرت عمرؓ نے آرمینیہ کے مشرق پر عراق کی فوجوں سے اور وسطی اور مغربی آرمینیہ پر شامی افواج سے حملہ کروانے شروع کیے تھے۔ آرمینیہ کے دارالسلطنت دبیل (ارمنی زبان میں اس کو دوین Duin کہا جاتا تھا) پر حملہ ہوا، مگر سخت مزاحمت کے بعد مسلمانوں کو پسپا ہونا پڑا۔ یہ مہمات جاری تھیں کہ حضرت عمر کی ۲۳ھ کے آخر میں شہادت کا حادثہ پیش آ گیا۔

رومیوں کے لیے آرمینیہ کی اہمیت اب اس لیے بہت بڑھ گئی تھی کہ شام اور الجزیرہ (شمال عراق) کی فتح کے بعد رومیوں کے پاس مشرقی دنیا سے تجارت کے وہی راستے بچے تھے جو آرمینیہ سے گزرتے تھے۔ اگر مسلمان اس پر بھی قبضہ کر لیتے تو یہ مملکت روم کے لئے رسد کا ایک بڑا بحران پیدا کر دیتا۔ ۲۴ھ کے شروع میں حضرت عثمان خلیفہ مقرر ہوئے۔ ابھی تک رومیوں سے مقابلہ کے دو بڑے محاذ تھے۔ شام اور عراق کا شمالی صوبہ الجزیرہ جو خطۂ شام سے متصل تھا۔ اور دونوں کے فوجی قائد الگ الگ تھے۔ شام میں حضرت معاویہ کی کامیاب پیش قدمیوں کی وجہ سے اور دونوں محاذ کو ایک قیادت کے تحت کرنے کے مقصد سے حضرت عثمان نے الجزیرۃ کو

---

[۱] فتوح البلدان: ۱۴۹، الامویون والبیزنطیون: ۱۰۲، ۱۰۳۔

بھی حضرت معاویہ کی عملداری میں شامل کر دیا، جس کے فوری کامیاب نتائج نکلے۔ سن ۲۴ ہجری میں رومیوں نے آرمینیہ کے قلعوں سے نکل کر الجزیرہ پر بہت بڑا حملہ کیا۔ حضرت معاویہ کی افواج نے اس موقعے پر ان کو شکست فاش دی۔ (الامویون والبیزنطیون: ۱۱۲۔۱۱۶)۔

حضرت حبیب بن مسلمہؓ کا تقرر:

حضرت عثمان نے حضرت معاویہؓ کو حکم دیا کہ آرمینیہ کے شہروں کی مہمات جاری رکھی جائیں۔ حضرت معاویہ نے آرمینیہ میں جہاد کا قائد حضرت حبیب بن مسلمہؓ کو قرار دیا۔ یہ پہلے سے اس محاذ پر مہمات انجام دیتے آرہے تھے۔ الجزیرہ اور شام کی افواج پر مشتمل آٹھ ہزار کا لشکر ساتھ کیا[۱]۔

اس لشکر نے رومیوں کے بڑے فوجی اڈے کا، جو قالیقلا (Theodosiopolis) نامی شہر میں واقع تھا، محاصرہ کر لیا۔ رومی جلد ہمت ہار گئے۔ صلح میں یہ طے ہوا کہ یہاں سے رومی حکومت ختم ہوگی، ملک کے باشندے جزیہ دے کر اسلامی حکومت کے تابع ہو جائیں گے۔ اور جو لوگ ہجرت کر کے رومی علاقوں کی طرف جانا چاہیں گے وہ جا سکیں گے۔ لہٰذا حکمراں طبقے اور افواج کی کثیر تعداد رومی علاقوں کی طرف ہجرت کر گئی۔ حضرت معاویہ نے شام سے دو ہزار فوجوں کو قالیقلا میں قیام کے لیے متعین کیا اور ان کو وہاں جاگیریں دیں تا کہ وہ وہیں مستقل سکونت اختیار کر لیں۔ (فتوح البلدان: ۱۹۷)

صدر مقام دبیل کی فتح:

آرمینیہ بیزنطی سلطنت کے لیے بہت اہم تھا، شام اور الجزیرہ کے ہاتھوں سے نکلنے کے بعد اب رومیوں کے لیے مشرق سے غذائی اشیاء اور دیگر سامان زندگی کی رسد اور تجارت کا یہی ایک راستہ باقی بچا تھا۔ اس لیے رومی بہت تیز حرکت میں آئے۔ حضرت حبیب بن مسلمہ کو خبر ملی کہ اس خطہ کا فوجی کمانڈر موریان (Moran Patriarch) ۸۰ ہزار رومی و ترک فوجوں کو دبیل کے مقام پر لے آیا ہے۔ دبیل بیزنطینی سلطنت کے قلب ایشیائے کوچک سے قریب اور ارضِ روم کے علاقے میں پڑتا ہے۔ یہی بیزنطینی آرمینیہ کا دار السلطنت تھا، جس میں یہود و نصاریٰ، مجوس اور مختلف مذاہب اور نسلوں کے لوگ آباد تھے۔ روم اور ترک پر حملہ کے لحاظ سے بہت اہم پہاڑی درے پر واقع تھا۔ فارسی فرماں روا نوشیروان نے آرمینیہ پر اپنے قبضہ کے دوران یہاں ایک بڑی فوجی

---

[۱] حبیب بن مسلمہ فہری صغار صحابہ میں سے تھے۔ حضرت ابوبکر کے عہد میں شام اور روم کے جہاد میں حصہ لینا شروع کیا۔ شام، آرمینیہ اور رومی علاقوں کی فتوحات میں شاندار کارناموں کے لیے جانے جاتے ہیں۔ حضرت معاویہؓ کے اہم جرنیلوں میں سے تھے۔

چھاؤنی بنائی تھی اور ایک بڑا اور مضبوط قلعہ بھی تعمیر کیا تھا[1]۔

رومیوں نے آرمینیہ کی حفاظت کے لیے الگ الگ محاذوں پر مسلم افواج کا دفاعی مقابلہ کرنے کے بجائے شمال کی طرف سے ایک بڑا اور فیصلہ کن حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ حضرت معاویہؓ کو حضرت حبیب بن مسلمہؓ نے مطلع کر کے کمک مانگی۔ انہوں نے دارالخلافہ اطلاع بھیجی۔ کوفہ کی افواج اس وقت مشرقی آرمینیہ کے اس علاقے میں مصروف تھیں، جو سلطنت فارس کی مقبوضات میں شامل تھا۔ حضرت عثمان نے فوراً کوفہ کے گورنر اور فوجی قائد حضرت ولید بن عقبہؓ کو خط لکھا کہ معاویہ کا مراسلہ آیا ہے کہ رومیوں نے حملہ کرنے کے لیے ایک بہت بڑا لشکر جمع کر لیا ہے۔ میں نے شامی لشکر کی مدد کے لیے کوفہ سے کمک بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے۔ جیسے ہی یہ خط تم کو پہنچے تو اپنے امراء میں سے ایک نہایت بہادر و جانباز اور صاحب ایمان شخص کو آٹھ دس ہزار کی نفری کے ساتھ معاویہؓ کے لشکر کی مدد کے لیے بھیجو۔

یہ خط ولید کو موصل میں اس وقت ملا جب وہ مشرقی آرمینیہ کی فتوحات سے واپسی کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنی فوج کو جمع کر کے نہایت ایمان افروز خطبہ دیا، جس میں اللہ کی مدد و نصرت کے وعدے ذکر کیے۔ شام کے حالات بتائے کہ مغربی آرمینیہ کے راستے سے رومی فوجوں کا سیلاب امڈا آ رہا ہے۔ اور یہ کہ امیر المومنین نے ان کی مدد کے لیے فوج بھیجنے کا حکم دیا ہے۔ پھر ان کو جہاد کے فضائل و اجر یاد دلا کر رضا کارانہ پیش کش کرنے کی اپیل کی، تین دن کے اندر ایک بزرگ عالم و مجاہد شخصیت سلمان بن ربیعہ باہلی کی قیادت میں ۸ ہزار کی فوج اس علاقے کے لیے روانہ ہو گئی۔

حضرت حبیب بن مسلمہؓ کی خطر پسند پیش قدمی:

یہ کمک پہنچ نہیں پائی تھی کہ رومی فوجیں اپنے قلعوں سے نکل کر آ گئیں، ساتھ میں مقامی ارمن سرداروں کی افواج بھی تھیں۔ حضرت حبیب بن مسلمہؓ کو لگا کہ اب کمک کے انتظار میں خطرہ ہے۔ انہوں نے فوراً رومیوں پر حملہ کرنے کا ارادہ کر لیا۔ رومیوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ ان کا مقابلہ غیر معمولی مردانگی، بلکہ کسی خطر پسند جرأت سے ہی کیا جا سکتا تھا۔ مسلمان جوش جہاد سے سرشار اور خدائی وعدوں پر یقین سے لبریز تھے۔ حضرت حبیب بن مسلمہؓ نے اللہ کے بھروسے پر فیصلہ کیا کہ؛ تعداد اور اسلحہ کے اس غیر معمولی فرق کو توکل علی اللہ اور ہمت و مردانگی سے شکست دی جائے گی۔ پہلے اللہ تعالیٰ کے سامنے خوب تضرع و زاری کی، دست دعا دراز کیے، فتح و نصرت کی

[1] فتوح البلدان صفحہ ۱۹۴۔ نیز ملاحظہ ہو: تعریف بالاماکن الواردۃ فی البدایۃ والنہایۃ: ۱/۱۶۸۔

درخواست کی اور کہا:

اے اللہ! آج رات چاندنی کھلی رہے۔ اندھیرا نہ ہو۔ بارش نہ فرما۔ میرے لشکر کی حفاظت فرما۔ جو مارا جائے اس کی شہادت قبول فرما۔

پھر اپنے فوجی سرداروں سے مشورہ کر کے یہ منصوبہ بنایا کہ راتوں رات حملہ کیا جائے۔ جس میں وہ خود ایک مختصر سی ٹکڑی کے ساتھ رومی فوج کے قلب میں گھس کر ان کے سردار ''موریان'' کو قتل کر دیں۔ خیمہ کے مردانہ حصے میں یہ مشورہ کر کے وہ جب اندر اپنی اہلیہ ام عبداللہ بنت یزید الکلبیۃ کے پاس پہنچے تو اس باہمت خاتون نے پوچھا: کل ہم کہاں ملیں گے؟ حضرت حبیب رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ موریان کے خیمہ میں یا پھر جنت میں ملاقات ہوگی۔ شب خون مارا گیا، جس میں موریان کام آیا۔ پھر کیا تھا؟ رومی لشکر میں زبردست بھگدڑ مچ گئی۔ فتح سے فارغ اور جنگ کا قصہ نپٹا کر جب حضرت حبیب بن مسلمہ رضی اللہ عنہ موریان کے خیمہ میں داخل ہوئے، تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بہادر خاتون، اپنی ہم جولیوں کے ساتھ، ہمت واعتماد کی تصویر بنی، ان کا انتظار کر رہی تھی۔ یہ ان کی اہلیہ ام عبداللہ تھیں جو وعدہ کے مطابق موریان کے خیمے میں پہنچ گئی تھیں [۱]۔

حبیب بن مسلمہ نے وہاں کے لوگوں کے ساتھ ایک تحریری معاہدہ کیا۔ جس میں لکھا تھا:

هذا كتاب من حبيب بن مسلمة الفهري لنصارى أهل دبيل ومجوسها ويهودها، شاهدهم وغائبهم. إني أمنتكم على أنفسكم وأموالكم وكنائسكم وبيعكم وسور مدينتكم فأنتم آمنون وعلينا الوفاء لكم بالعهد ما وفيتم وأديتم الجزية والخراج، شهد الله وَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا، وختم حبيب بن مسلمة. (فتوح البلدان: ۱۹۹)

یعنی دبیل کے یہود، عیسائی اور مجوسی تمام مذاہب کے لوگوں کے ساتھ حبیب بن مسلمہ فہری یہ معاہدہ کرتا ہے کہ ان کے جان و مال محفوظ رہیں گے۔ ان کی عبادت گاہوں اور خانقاہوں کی حفاظت کی جائے گی۔ ان کی شہر پناہ کو نہیں چھیڑا جائے گا۔ جب تک دبیل کے لوگ جزیہ وخراج ادا کرتے رہیں گے اور معاہدہ کا خیال رکھیں گے، ہم پر واجب ہے کہ ہم ان کے عہد کی پابندی کریں۔ اللہ اس معاہدے پر گواہ ہے، اور اس کی گواہی کافی ہے۔ مہر حبیب بن مسلمہ۔

آرمینیہ میں رومیوں کے حوصلے پست ہو گئے:

دبیل جیسے اہم شہر اور قلعہ کی فتح اور اتنی بڑی رومی فوج کی شکست کا نتیجہ یہ ہوا کہ اطراف کے علاقوں کے دیگر امراء کے بھی حوصلے پست ہو گئے۔ خلاط کا پیٹریارک بھی حضرت حبیب کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان کو اپنے علاقہ میں لے گیا، اس نے ایک بڑی رقم پیش کی جو انہوں نے قبول نہیں کی۔ پھر سیرجان، اردستان اور نشویٰ

[۱] طبری: ۴/ ۲۴۷۔ نیز فتوح البلدان: ۱۹۸۔ وتاریخ دمشق: ۱۲/ ۷۴۔

کے شہروں نے صلح کی۔ان شہروں کا فتح ہونا تھا کہ آرمینیہ کے بہت سے اہم شہروں کے حکام نے پرامن طور پر اطاعت قبول کی۔حضرت معاویہؓ کو حالات کی دم بدم خبریں موصول ہوتی تھیں اور وہ نقشۂ جنگ کے مطابق ہدایات دیتے رہتے تھے۔اب حبیب بن مسلمہؓ کو حکم بھیجا کہ شمشاط پر حملہ کریں۔انہوں نے رومی افواج کو شکست دے کر وہاں کے اہم قلعوں اور گڑھیوں پر قبضہ کیا۔پھر خزران کے حاکم نے آ کر خود صلح کی پیشکش کی۔

مسلمان جنگ سے پہلے دعوت اسلام دیتے تھے:

علاقائی حکام وامراء کو پہلے دعوت اسلام دی جاتی تھی۔حضرت حبیب بن مسلمہؓ دبیل سے فارغ ہوئے، اب علاقائی ریاستیں باقی تھیں۔انہوں نے ان کو اسلام کی دعوت دی۔دبیل سے تفلیس گئے، وہاں کے حکام نے مذاکرات کے لیے تفلیٰ نامی قاصد بھیجا۔حضرت حبیب نے اپنی طرف سے ایک عالم صحابی حضرت عبدالرحمان بن جزء کو دعوت اسلام کے لیے بھیجا۔تفلیٰ نامی قاصد کے ہاتھ جو مراسلہ گیا اس میں ان کو دعوت اسلام پیش کی گئی۔نیز اس میں لکھا گیا کہ میں تمہارے پاس اپنی جماعت کے ایک بڑے عالم عبدالرحمٰن بن جزء کو بھیج رہا ہوں جو تم کو اسلام کی دعوت دیں گے اور دین سمجھائیں گے۔اسلام قبول کرلو تو کیا کہنے؟ لیکن اگر تم اسلام قبول نہیں کرتے تو ان کے ساتھ تم کو امان وحفاظت دینے کا ایک حکومتی فرمان بھی ہے، تم اس کو قبول کر لینا۔اور اگر یہ بھی تسلیم نہیں تو ہم جنگ کے لیے بھی تیار ہیں۔آخر تفلیس والوں نے اطاعت قبول کر لی (طبری: ۴/ ۱۶۲)۔

ملطیہ کی فتح اور اس میں فوجوں کی تعینات:

ایسا ہی ایک اہم قلعہ اور فوجی اہمیت کا شہر ملطیہ تھا، یہ پہلے فتح ہو چکا تھا، مگر رومیوں نے اس کو پھر حاصل کرلیا تھا۔آرمینیہ کی فتح کے لیے یہاں سے رومیوں کو بے دخل کرنا ضروری تھا۔دبیل اور اس کے اطراف سے فوجیں فارغ ہوئیں تو حضرت معاویہ نے یہاں کے لیے بھی حضرت حبیب کو اپنی فوج کے ساتھ بھیجا۔یہ بھی فتح ہوا۔حضرت معاویہؓ نے، اپنی اس جنگی حکمت عملی کے تحت جس کا پیچھے تذکرہ ہو چکا ہے، اس اہم شہر کے استحکام کے مقصد سے مسلم افواج کو یہاں مقرر کیا۔بعد میں ایک صائفہ کے دوران جہاد کے لیے خود یہاں آئے۔یہاں کی افواج کو ساتھ لے کر رومیوں پر خود حملہ کیا۔واپسی میں اس قلعے میں مزید فوج مقرر کی۔وہاں الجزیرہ اور شام اور دیگر علاقوں سے لا کر لوگوں کو آباد کیا اور ان کا ایک حاکم مقرر کیا۔اس کے بعد سے یہاں سے اسلامی فوجوں کے لیے حملے کرنے کا راستہ کھل گیا۔

ملک آرمینیہ کی رومیوں سے آزادی:

ایسا ہی ایک اہم درہ مرعش تھا۔جس کی حفاظت کے لیے رومیوں نے یہاں ایک قلعہ بنایا تھا اور اپنے لوگوں کو لا کر شہر بھی بسا دیا تھا۔حضرت خالد بن الولید نے حملہ کر کے اس قلعے کو منہدم کر دیا تھا اور وہاں کے لوگوں کو

وہاں سے ہٹا دیا تھا تاکہ مسلم افواج کے لیے راستہ کھل جائے۔ حضرت معاویہؓ نے اس خیال سے یہ شہر دوبارہ آباد کیا اور یہاں افواج کو مقرر کیا کہ کہیں رومی اس پر دوبارہ قبضہ نہ کرلیں۔ سن تیس میں ان کے کمانڈر حضرت سفیان بن عوفؓ نے یہیں سے گھس کر حملہ کیا تھا۔

مرعش، ملطیہ، سیرجان، اردستان اور نشویٰ، خزران، تفلیس، یہ سب اہم فوجی مراکز تھے۔ ان کے علاوہ آرمینیہ کے بہت سے شہر اور قلعوں کو حضرت حبیب بن مسلمہؓ کی قیادت میں شامی لشکر نے رومیوں سے خالی کرایا۔ باقی پورا ملک بغیر جنگ کے اسلامی مملکت میں شامل ہوگیا[1]۔

ابراہیم عدوی اپنی فاضلانہ تحقیقی کتاب 'الامویون والبیزنطیون' میں آرمینیہ کی مہمات کی ضرورت واہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ حضرت معاویہؓ نے اپنی گورنرشپ کے بالکل آغاز میں آرمینیہ کی طرف توجہ کی۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ کس درجہ بیدار مغز قائد تھے اور مسلم مملکت کی حفاظت کے لیے ضروری جنگی حکمت عملی سے کس درجہ آگاہ تھے۔ اس لیے کہ آرمینیہ کا جغرافیائی جائے وقوع ایسا ہے کہ رومی اگر حملہ کرنا چاہیں تو شام، عراق اور دیگر مسلم علاقوں پر حملے کے لیے بہت سے راستے وہیں سے گزرتے تھے۔ (کتاب مذکور: ۱۱۲، ۱۱۳)۔

فتح طرابلس:

طرابلس شام کا ایک نسبتاً شمالی شہر تھا۔ اب یہ لبنان کے شمال میں واقع ہے۔ یہ بیزنطینی سلطنت کی بری وبحری فوج کا بڑا مرکز تھا۔ یہاں بیزنطینیوں کی کافی آبادی تھی، خصوصا دیگر ساحلی شہروں پر مسلمانوں کے قبضے کے بعد بیزنطینی حکومت اور افواج کی آبادیاں ہجرت کر کے یہاں آتی رہیں۔ شام کے مغربی ساحلی شہروں میں جو شورش وقتاً فوقتاً پیدا ہوتی رہتی تھی، اس کا طرابلس بھی بڑا سبب تھا۔ رومی حکومت اپنے اس فوجی مرکز کو کمک پہنچاتی رہتی اور رومیوں کے بحری بیڑوں کی یہاں مستقل نقل وحرکت رہتی تھی۔

شام کے پورے مغربی ساحل کا زیادہ تر حصہ حضرت یزیدؓ بن ابی سفیانؓ کے دور میں حضرت معاویہ کی سرکردگی میں فتح ہوا تھا۔ کچھ حصہ حضرت یزیدؓ نے براہ راست فتح کیا تھا۔ مگر طرابلس رومیوں کا ایسا مضبوط قلعہ تھا کہ اسلامی لشکروں نے ابھی تک اس کا رخ بھی نہیں کیا تھا۔ حالانکہ اس کے شمال میں عرقہ اور جنوب میں جبیل، بیروت، صیدا، صور اور حیفاء وغیرہ تمام شہر فتح ہوچکے تھے۔ طرابلس کے گردونواح میں ''أنفہ''، ''قالون'' اور ''ارطوسیۃ'' تین مضبوط فوجی قلعے اس کو مزید محفوظ بناتے تھے۔

۲۵ھ میں حضرت معاویہ نے شام کی سرزمین پر رومیوں کے اس آخری مرکز کو ختم کرنے کا منصوبہ بنایا۔

---

[1] تاریخ ابن خلدون: ۲/ ۵۷۲۔ فتوح البلدان: ۱۸۳۔ ۲۰۱۔

حضرت سفیان بن مجیب ثمالیؓ کی قیادت میں ایک بہت بڑے لشکر کو طرابلس کی مہم سونپی۔ حضرت سفیانؓ نے طرابلس کے قریب مرج السلسلۃ کے مقام پر لشکر کا پڑاؤ ڈالا۔ یہاں سے روزانہ شہر پر حملہ ہوتا۔ شہر کے لوگوں نے قلعے مستحکم اور فصیل کے دروازے بند کر لیے۔ مسلمانوں نے محاصرے کا ایسا گھیرا ڈالا کہ رومیوں پر خشکی اور تری سے کوئی رسد نہیں پہنچ پاتی تھی۔ کئی مہینے تک یہ محاصرہ جاری رہا۔ آخر رومی افواج ان تینوں مضبوط قلعوں میں سے ایک ایسے قلعہ میں سمٹ کر محصور ہو گئیں، جو ساحل سمندر پر تھا۔ ساحل کے قریب چھوٹے چھوٹے بحری جزیروں میں رومیوں کے اڈے تھے، وہاں سے اور براہ راست قسطنطنیہ سے بھی رسد آنے لگی، جس کی وجہ سے رومی افواج کسی طرح ہتھیار نہیں ڈالتی تھیں۔ سالار فوج امیر سفیانؓ نے حضرت معاویہ کو حالات کی اطلاع دی۔ انہوں نے خط لکھا کہ تم وہاں کسی مناسب مقام پر اپنی افواج کے لیے ایک قلعہ تعمیر کرو۔ رات میں افواج قلعہ میں قیام کریں اور دن میں محاصرہ کریں۔ سفیان نے اسی طرح کیا۔ اور ایک ساحلی ٹیلے پر نہایت وسیع مضبوط قلعہ بنایا، جس سے رومی افواج کی رسد و امداد روکی جا سکے، یہ قلعہ ''حصن سفیان'' کہلاتا تھا۔ یہ طویل جد و جہد اور پُر مشقت تدبیر کامیاب ہوئی۔ بحری رسد رکنے سے رومی افواج گھبرا گئیں۔ ایک صبح سفیان اپنی فوج لے کر جوان کے قلعہ پر جاتے ہیں، تو کیا دیکھتے ہیں کہ قلعہ خالی ہے۔ پتہ چلا کہ انہوں نے ہرقل کو خط لکھ کر کہا کہ یا تو مدد کرو کہ ہم مسلمانوں سے جنگ کریں، یا پھر بحری جہاز بھیجو کہ ہم طرابلس خالی کر کے تمہارے پاس آجائیں۔ راتوں رات رومی جہاز آئے اور ساری افواج بھاگ نکلیں۔

سفیان نے اس فتح اور اللہ کی مدد کی خبر اپنے امیر معاویہؓ کو دی۔ انہوں نے طرابلس کو آباد کرنے کا یہ نقشہ بنایا کہ یہودیوں کی ایک بڑی تعداد کو یہاں لا کر بسایا۔ موسم گرما میں ہر سال بڑی تعداد میں فوجیں طرابلس آتی تھیں، بلاذری کے مطابق جب (سخت سردی کی وجہ سے) سمندری راستے بند ہو جاتے اور رومیوں کے حملوں کا خدشہ نہیں رہتا تو فوجیں واپس چلی جاتیں۔ اور وہاں کا حاکم ایک مختصر بٹالین کے ساتھ رکا رہتا[۱]۔

اسلامی بحریہ کی تاسیس:

اسلامی بحریہ کی تاسیس حضرت معاویہؓ کے تاریخ ساز کارناموں میں سے ہے۔ عرب بحری جنگ سے بالکل نا آشنا تھے۔ اور بیزنطینی سلطنت کی بحریہ کی کوئی مثال اس وقت نہیں تھی۔ شام کے مغرب میں واقع بحر متوسط اس کی بلا شرکت جولان گاہ تھا۔ ان کے شام و مصر اور افریقی ممالک پر مضبوط قبضے کا راز یہ بحریہ ہی تھی۔ بحر متوسط کے شمال میں ایشیائے کوچک سے بلقان تک، مشرق میں شام و فلسطین اور جنوب میں مصر و شمال افریقہ

---

[۱] فتوح البلدان ص: ۱۲۹، و تاریخ دمشق ابن عساکر ۳۵۶/۲۱۔

کے ساحلوں پر اس کا اکیلا دبدبہ تھا۔ طرابلس، صور، عکا، اسکندریہ، قرطاجہ سرقوسہ، نیز اٹلی کے ساحل پر رافنا وغیرہ میں اور مغرب میں مراکش کے ساحلی مقامات پر اس کے بحری اڈے اور جنگی جہاز بنانے کے کارخانے پھیلے ہوئے تھے۔ بحر متوسط کے تمام اہم جزائر خصوصا منفذوں اور ناکوں (جبل الطارق کے پاس سبتہ (Ceute) کریٹ، قسطنطنیہ، روڈس اور اسکندریہ وغیرہ) پر ان کے اڈوں کی وجہ سے حالت یہ تھی کہ ان کی اجازت کے بغیر کوئی بحر متوسط میں داخل نہیں ہوسکتا تھا۔

بحر متوسط کی تزویراتی (Strategie) اہمیت تاریخ کے ہر دور میں مسلم رہی ہے۔ اس پر جس طاقت کا قبضہ ہو وہ ایشیا، افریقہ اور یورپ تینوں براعظموں میں فیصلہ کن برتری حاصل کرسکتی ہے۔ اس لیے ہر حکومت اس پر غلبہ کی کوشش ضرور کرتی تھی۔ اس پورے وسیع وعریض خطے میں ساری بحری تجارت بھی ان کے تابع فرمان تھی۔ بیزنطینی بحری تجارت ساری دنیا میں سب سے بڑا حجم رکھتی تھی [۱]۔

حضرت عمر کے آخری عہد اور حضرت عثمان کے ابتدائی عہد میں رومیوں نے بحری حملوں کے ذریعے شام ومصر کے کئی ساحلی شہروں پر، جن میں مصر کا اہم مرکز اسکندریہ بھی شامل تھا، دوبارہ قبضہ کرلیا تھا۔ ان وجوہات کی بنا پر حضرت معاویہؓ کا ایک عرصہ سے یہ احساس تھا کہ بیزنطینی سلطنت کے مقابلہ کے لیے اسلامی بحریہ کا قیام فوری ضرورت ہے۔

لیکن عرب بحریہ کے معاملہ میں بالکل ناتجربہ کار تھے اور رومی اس سلسلے میں بہت آگے۔ اس لئے مرکز خلافت سے اجازت نہیں ملتی تھی۔ حضرت امیر معاویہؓ نے حضرت عمر فاروقؓ سے بہت اصرار کیا، ضرورت اور زمینی ومیدانی صورت حال کا حوالہ دیا۔ خاص طور پر بتایا کہ شام کے ساحلوں پر رومیوں کا زبردست بحری اڈہ ہے، اس لیے ساحلی شہروں میں استحکام نہیں پیدا ہو پاتا۔ اس سے شام اور اگلے درجے میں پوری مملکت اسلام کو سخت خطرہ ہے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت عمرو بن العاص (حاکم مصر) سے مشورہ کیا، وہ اسلام سے پہلے سے ہی بحری سفر کا تجربہ رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ مصر میں تجارتی کشتیوں کا خوب رواج، جس کی وجہ سے اہل مصر سمندر کے خطرات سے آگاہ تھے۔ انہوں نے بھی خطرہ ظاہر کیا۔ غرض حضرت معاویہؓ کو اجازت نہیں ملی۔ حضرت عثمانؓ کا دور آیا تو حضرت معاویہؓ نے ان سے اصرار کے ساتھ درخواست کی۔ انہوں نے بڑی احتیاط کے ساتھ اجازت دی۔ لکھا کہ اس شرط پر اجازت ہے کہ فوج کے ساتھ معاویہؓ خود بھی سفر کریں اور خود ہی نہیں اپنے اہل خانہ کو بھی ساتھ رکھیں۔ اگر اس کی ہمت کرسکیں تو مسلمانوں کو سمندر میں اتاریں، ورنہ نہیں۔

---

[۱] اطلس الخلیفۃ عثمان، فن الحرب الاسلامی، مصنفہ بسام العلی: ۱/ ۱۹۳۔

حضرت معاویہؓ نے بحری بیڑا تیار کروایا۔ اور عبداللہ بن قیس الجاسی کو اپنا امیر البحر (Admiral) طے کیا۔ عبداللہ بن قیس نے اللہ سے بڑی عاجزی سے دعا کی کہ: اے اللہ! میرے لشکر میں سے کوئی ایک شخص بھی نہ ڈوبے۔ مردِ خدا کی یہ دعا ایسی قبول ہوئی کہ بے شمار بحری مہمات میں ان کا ایک فوجی بھی ڈوب کر نہیں مرا، جب کہ ان کی سرگرمی و جولانی کا یہ حال تھا کہ تھوڑی سی مدت میں انہوں نے پچاس جنگی مہمات سر کیں۔ (فتوح البلدان: ۱۵۳۔ طبری: ۲۶۰/۴)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی:

مسلمانوں کی تاریخ میں پہلی بحری جنگی مہم جزیرۂ قبرص کی طرف روانہ ہوئی۔ جہاد کی اس مہم کی پیشین گوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمائی تھی۔ ام حرامؓ بنت ملحان آپؐ کی رشتے کی خالہ تھیں۔ آپؐ ان کے پاس جایا کرتے تھے۔ ایک دن آپؐ ان کے گھر سو گئے، کچھ دیر بعد بیدار ہوئے تو چہرۂ مبارک پر تبسم تھا۔ حضرت ام حرام نے عرض کیا: کیا بات ہے؟ مسکرا رہے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: مجھے اپنی امت کی ایک جماعت دکھائی گئی ہے، جو اس سمندر، بحر اخضر[۱] میں اللہ کے راستے میں جہاد کریں گے۔ مجھے وہ ایسے دیدہ زیب حال میں دکھائے گئے جیسے شاہی تختوں پر بادشاہ جلوہ افروز ہوں۔ حضرت ام حرامؓ نے درخواست کی کہ حضرت دعا فرما دیں کہ میں بھی ان خوش نصیبوں کے ساتھ اس بحری جہاد میں شریک ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے لیے دعا فرمائی۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دوبارہ آنکھ لگ گئی، کچھ دیر کے بعد پھر مسکراتے ہوئے بیدار ہوئے۔ ام حرام نے پھر سوال کیا، تو آپ نے پھر بتایا کہ دوبارہ ایسی ہی حالت میں ایک اور جماعت دکھائی گئی ہے جو قسطنطنیہ پر حملہ کر رہی ہے، گویا شاہی تختوں پر بادشاہ جلوہ فرما ہوں۔ حضرت ام حرام نے دوبارہ درخواست کی کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میرے لیے اس سعادت میں بھی شرکت کی دعا فرما دیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تم پہلی جماعت میں شامل ہوگی، دوسری میں نہیں۔ اس موقعہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ام حرامؓ کو ان دونوں لشکروں کے بارے میں جو کچھ بتایا اس میں دونوں غزوات میں شریک لوگوں کی مغفرت اور جنت کی بشارت بھی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا: أول جیش من أمتي یغزون البحر قد أوجبوا، 'میری امت کا وہ پہلا لشکر جو بحری جہاد کرے گا اس میں شریک لوگ جنت کے مستحق ہیں۔

جب قبرص کے لیے اسلامی لشکر روانہ ہوا تو حضرت ام حرام اپنے شوہر حضرت عبادہ بن صامتؓ کے ساتھ اس میں شریک ہوئیں۔ اور واپسی میں سواری سے گر پڑنے سے وفات پا گئیں۔ یہ وہ جہاد تھا، جس میں شریک

---

۱ عرب بحر متوسط (Mediterranian) کو بحر شام اور بحر اخضر بھی کہتے تھے۔ معجم البلدان: ۳۴۴/۱۔

افراد کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی منامی وحی میں نہایت شاندار و پرشکوہ صورت میں (کالملوک علی الاسرۃ) دیکھا تھا اور جس کے لیے جنت کی بشارت دی تھی۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اس مہم کی خود قیادت فرما رہے تھے ۱۔

حضرت ام حرامؓ حمص میں یہ حدیث بیان کرتی تھیں، جس کی وجہ سے بڑے بڑے اہل فضل صحابہ اس غزوے کے انتظار میں تھے، اگرچہ حضرت عثمانؓ کی طرف سے سخت ہدایت دی گئی تھی کہ فوجیوں کو اختیار دے دیا جائے جو چاہے جائے اور جو نہ چاہے نہ جائے، اس کے باوجود اس بشارت وفضیلت کے شوق میں بہت بڑی تعداد نکلی، جن میں صحابہ کی ایک جماعت بھی تھی۔ ابو ذر غفاریؓ، ابو ایوب انصاریؓ، عبادہ بن الصامتؓ، مقداد بن الاسودؓ، شداد بن اوسؓ اور حضرت ابوالدرداءؓ جیسے کبار صحابہ اس لشکر میں شامل ہوئے۔

قبرص پر حملہ اور فتح:

قبرص (Cyprus) بحر متوسط کے تمام جزائر میں تیسرا سب سے بڑا جزیرہ ہے۔ دمشق کے ساحلی علاقوں سے کل ۹۰ کلومیٹر پر واقع یہ جزیرہ بحر ابیض میں ایک اہم تزویراتی (Strategic) اہمیت رکھتا ہے۔ ترکی اور مصری ساحل بھی یہاں سے قریب ہے۔ روم صدیوں سے اس کو اپنا بحری اڈہ بنائے ہوئے تھے۔ قبرص بحر ابیض میں ان کی فوجی اور اقتصادی مفادات کی نگرانی وحفاظت میں نہایت اہم کردار ادا کرتا تھا۔ مسلمانوں نے بری فوج کشیوں کے دم پر شام ومصر فتح تو کر لیے تھے، مگر بحری طاقت میں صفر ہونے کی وجہ سے حضرت معاویہؓ کو لگتا تھا کہ یہ فتح مستحکم نہیں ہے۔ رومیوں کی بحری طاقت سے مستقل اندیشہ رہتا تھا۔ شام کے مغربی ساحل، جنوب میں فلسطین واردن کے ساحلی شہروں اور مشرقی افریقہ میں اسکندریہ تک پر رومی قبرص سے نکل نکل کر حملے کرتے تھے۔ اسلامی مملکت کے تحفظ کے لیے اس بحری مرکز کی اہمیت کا احساس مجاہد اسلام امیر شام معاویہؓ کو خوب تھا۔

مرکز خلافت سے جیسے ہی بحری رزم آرائی کی اجازت ملی، حضرت معاویہؓ نے قبرص پر حملے کی تیاری شروع کی۔ یہ ۲۷۔۲۸ھ کا واقعہ ہے۔ حضرت معاویہ نے ساحلی شہر عکا کی بندرگاہ کو بحری بیڑے کے مرکز کے طور پر منتخب کیا، یہاں رومیوں کا قدیم بحری بیڑا ہوا کرتا تھا۔ جن کی چھوڑی ہوئی کشتیوں اور جنگی سامان کے علاوہ ساحلی قلعہ بھی موجود تھا۔ حضرت معاویہ نے قلعہ اور بندرگاہ کی مرمت کروائی، کشتیاں مرمت کروا کے سمندر میں ڈالی گئیں۔

مؤرخین نے لکھا ہے کہ اس مہم میں شرکت کے لیے مسلمانوں کے شوق کا یہ عالم تھا کہ ایک بہت بڑی

---

۱ صحیح بخاری: ۲۷۹۹، ۲۹۲۴، البدایۃ والنہایۃ: ۷/ ۱۶۲۔

تعداد اس غزوے میں گئی[۱]۔ شامی شہروں میں دین کی دعوت وتعلیم کے لئے جو علماء صحابہ مقیم تھے وہ بھی شریک غزوہ ہوئے۔ ایک عیسائی مؤرخ اغابیوس بن قسطنطین منبجی کی روایت ہے کہ اس حملہ میں حضرت معاویہؓ کے ساتھ سترہ سو کشتیوں کا لشکر تھا[۲]۔ بلاذری نے اس حملے میں شریک کشتیوں کی تعداد ایک سو بیس لکھی ہے۔ اور یہ زیادہ قرین قیاس ہے۔

حضرت معاویہؓ نے حملہ کا نظام یہ بنایا کہ عکا (فلسطین) سے ان کا لشکر روانہ ہوا اور دوسری طرف اسکندریہ سے مصر کے حاکم عبداللہ بن سعد بن ابی سرح ایک اور بحری فوج لے کر نکلے۔ اور حضرت معاویہ کے ساتھ شامل ہو گئے۔ اسکندریہ بھی ماضی میں بیزنطینی بحری اڈہ رہ چکا تھا۔ وہاں بھی ان کی چھوڑی ہوئی کشتیوں اور جنگی ساز وسامان کا ذخیرہ تھا۔ قبرص کی مقامی حکومت نے کچھ دیر تو مزاحمت کی پھر صلح پر راضی ہو گئے۔ معاہدہ طے ہوا، یہ معاہدہ قبرص کو خود مختار ریاست تسلیم کرتا تھا۔ صلح کے شرائط میں درج ذیل امور شامل تھے۔

۱۔ مسلمان قبرص پر حملہ نہیں کریں گے۔ لیکن اگر کوئی اور حملہ کرے گا تو قبرص کی حفاظت کی ذمہ داری بھی اسلامی حکومت کی نہیں ہوگی۔ (یعنی وہ ایک آزاد ریاست ہوگی)۔

۲۔ سب سے اہم شرط یہ تھی کہ جزیرۂ قبرص کو رومی مسلمانوں پر حملہ کے لیے استعمال نہیں کرسکیں گے۔

۳۔ اگر رومی شام ومصر پر حملہ کریں گے تو قبرص کی حکومت ان کی تیاریوں کی خبر مسلمانوں کو دیں گے۔ اور مسلمانوں کی جنگی تیاریوں کی خبر بیزنطینی حکومت کو نہیں دیں گے۔

۴۔ قبرص کی حکومت بیزنطینی سلطنت کو ۷۲۰۰ دینار سالانہ دیا کرتی تھی۔ مسلمانوں کو بھی اتنا ہی دیا کرے گی۔

۵۔ مسلمان ان کے مذہبی امور میں مداخلت نہیں کریں گے۔ ان کے انتظام کے لیے انہی میں سے حاکم (پیٹریارک) متعین کیا جایا کرے گا[۳]۔

۶۔ ابن خلدون (تاریخ: ۲/۶۷۵) نے اس پر ایک اہم شرط کا اضافہ کیا ہے کہ مسلمان رومیوں پر حملہ کے لیے قبرص کو اڈے کے طور پر استعمال کریں گے۔ **ویکون طریق الغزو للمسلمین علیہم۔**

صلح اور اس کی شرائط سے واضح ہے کہ قبرص پر فوج کشی کا مقصد اس جزیرہ پر قبضہ نہیں، بلکہ رومیوں کے

---

۱ **فی جیش کثیف من المسلمین**، البدایۃ والنہایۃ: ۷/۱۷۴۔

۲ **المنتخب من تاریخ المنبجی**: ۵۵۔ اس تعداد میں بہت مبالغہ ہے، خصوصاً اس لئے بھی کہ کئی سال بعد حضرت معاویہ نے جب ۳۳ھ میں دوبارہ قبرص پر حملہ کیا ہے تو اس حملہ میں پانچ سو کشتیاں شامل تھیں۔

۳ یہ پوری تفصیلات طبری: ۴/۲۶۰-۲۶۲، بلاذری: ۱۵۴، ۱۵۵، نیز البدایۃ والنہایۃ: ۷/۱۷۱-۱۷۳ سے ماخوذ ہیں۔

ان حملوں کا سد باب تھا، جو اس سرزمین سے کیے جاتے تھے۔ چند سال بعد قبرص والوں نے صلح شکنی کی۔ مسلمانوں پر حملے میں رومیوں کی مدد کی اور ان کو اپنے سمندری اڈے استعمال کرنے کی اجازت دی۔ حضرت معاویہؓ نے ۳۳ھ میں قبرص پر دوبارہ حملہ کیا۔ یہ حملہ زیادہ تیاری سے کیا گیا۔ اس مرتبہ ۵۰۰ کشتیوں میں فوج اور اسلحہ تھا۔ ساحل پر اتر کر جنگ ہوئی۔ جس میں قبرص کی فوج کا بڑا جانی نقصان ہوا۔ آخر کار وہ پھر صلح پر آمادہ ہوئے۔ انہی پچھلی شرائط پر صلح طے ہوئی۔

رومی قبرص کو شام و مصر کے ساحلی مراکز پر حملوں کے لیے بہت کامیابی سے استعمال کرتے تھے، نیز یہ پورے بحر ابیض کی تجارت کو بھی کنٹرول کرتا تھا، اس لیے قبرص کا ان کے تسلط و استعمال سے آزاد رہنا نہایت ضروری تھا۔ اس لیے اس مرتبہ حضرت معاویہؓ نے وہاں ایک اسلامی فوجی مرکز (Base) قائم کیا، جس میں بارہ ہزار باتنخواہ فوج متعین کی۔ مساجد کی تعمیر اور دیگر شہری سہولیات کا انتظام کیا۔ نیز اس شہر کو آباد کرنے کے لیے بعلبک سے مسلمانوں کو بھیجا اور حکومت کی طرف سے ان کے وظائف جاری کیے [۱]۔

یہ فتح اسلامی حکومت کے استحکام کے لیے ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس سے شام کا مغربی ساحل خصوصاً صور، عکا اور طرابلس جیسے اہم شہر ایک مدت تک کے لیے رومیوں کی ترکتازیوں سے محفوظ ہو گئے۔

معرکہ ذات الصواری،
مسلمانوں کی ایک تاریخ ساز فتح:

یہ ایک تاریخ ساز فتح تھی۔ جس نے مسلمانوں کو رومیوں پر فیصلہ کن برتری دلا دی۔ اس معرکے کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیجیے کہ رومیوں نے اس سے پہلے ایسی تیاریوں کے ساتھ حملہ نہیں کیا تھا۔ مسلمانوں نے بھی مقابلے کے ایسے انتظامات کیے تھے جن کی نظیر ان کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ شام اور مصر دونوں کی بحری افواج شریک ہوئیں، ساتھ ہی حضرت معاویہؓ منصوبہ کے تحت ایک بری فوج کے ساتھ ساحلی علاقوں سے شریک جنگ ہوئے۔

شام کے ساتھ ہی رومیوں کے ہاتھ سے مصر بھی نکلا تھا۔ اور اب مسلمان ان کو افریقی مقبوضات سے یکے بعد دیگرے بے دخل کر رہے تھے۔ اسی کے ساتھ اب سن ۲۸ ہجری میں قبرص کا سقوط ہوا۔ یہ بیزنطین کے لیے کوئی معمولی نقصان نہیں تھا۔ یہ جزیرہ بحر متوسط میں ان کا سب سے اہم بحری اڈہ تھا، جو گویا شام و مصر پر ان کی

---

[۱] فتوح البلدان ص: ۱۵۴۔ نیز ملاحظہ ہو: تاریخ الخلفاء الراشدین، الفتوحات والانجازات السیاسیۃ: ۳۸۱۔

بالادستی کی ضمانت تھا۔ اس پر مسلمانوں کے قبضے کے بعد ان کے لیے شام ہی نہیں مصر پر بھی حملے کرنا بہت مشکل تھا۔ مسلمانوں نے چند سالوں میں ایسی بحریہ تیار کرلی تھی کہ بحر متوسط کے مشرقی حوض (Basin) سے دنیا کی سب سے بڑی بحری قوت کا اقتدار لے لیا۔ روم کے لیے یہ ناقابل تلافی اقتصادی اور سیاسی نقصان تھا۔ یقیناً ان کو اب براہ راست قسطنطنیہ پر خطرہ محسوس ہوا ہوگا۔ جس پر حملے کا منصوبہ حضرت معاویہؓ دمشق میں تیار کر رہے تھے۔

ان حالات کے درمیان ۳۱ھ میں (روایت ۳۴ھ کی بھی ہے مگر بعض طاقت ور قرائن کی وجہ سے ہم اس کو صحیح نہیں سمجھتے۔ واللہ اعلم) خبر ملی کہ بیزنطینی فرماں روا قسطنطین (Constans II) نہایت زبردست بحری حملے کی تیاری کر رہا ہے۔ خبر تیزی سے حضرت عثمان کو بھیجی گئی۔ انہوں نے حضرت معاویہؓ اور افریقہ کے گورنر حضرت عبداللہ بن سعدؓ دونوں کو حکم دیا کہ اپنی اپنی بحریہ کو ساتھ لے کر مقابلہ کریں۔ طبری کی روایت کے مطابق رومیوں کی تعداد اتنی تھی کہ اس سے پہلے کبھی اتنی تعداد لے کر انہوں نے حملہ نہیں کیا تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ رومی لشکر ایک ہزار کشتیوں پر مشتمل تھا۔ اور مسلمانوں کے بیڑے کی تعداد دو ڈھائی سو کشتیوں پر مشتمل تھی۔

شام کے ساحل پر طرابلس بحریہ کا بڑا مرکز تھا۔ حضرت معاویہؓ نے یہاں بحری اسلحہ اور دیگر ساز و سامان کے بڑے ذخیرے تیار کر رکھے تھے۔ یہ طے ہوا کہ یہیں افریقی لشکر شامی بحریہ کے لشکر سے ملے گا، پھر دونوں یہیں سے آگے پیش قدمی کریں گے۔ تمام شامی شہروں میں رومیوں کے ایجنٹ سرگرم تھے اور حضرت معاویہؓ کو ان کی حرکتوں کا خدشہ لگا رہتا تھا[۱]۔ طرابلس کے دو لوگوں نے عین اس موقعے پر یہ حرکت کی کہ طرابلس کی فتح کے بعد جو بیزنطینی فوجی قید تھے، راتوں رات جیل کا دروازہ کھول کر انہیں نکال دیا۔ انہوں نے بحریہ کے ڈپو میں آگ لگا دی۔ اس کارروائی سے بہت نقصان پہنچا۔ بحری کشتیوں کے کل پرزوں، بادبان وغیرہ ساز و سامان اور غذائی ذخیرے جل کر خاک ہو گئے[۲]۔ حضرت معاویہؓ نے حیرت ناک برق رفتاری سے پھر سے سارا سامان تیار و درست کیا۔ اس حادثے سے مسلمانوں کے جوش میں مزید اضافہ ہو گیا، وہ مزید ہمت و تیزی سے حرکت میں آئے۔ حضرت معاویہ نے شامی افواج کا سربراہ اپنے ایک مشہور کمانڈر حضرت بسر بن ابی ارطاۃؓ کو مقرر کیا۔ جب کہ حضرت عبداللہ بن ابی سرح دونوں افواج کے مشترکہ کمانڈر طے ہوئے۔ ذات الصواری میں مسلمانوں نے ایک ہمہ جہتی منصوبہ بندی کی۔ رومی اناضول کے ساحل سے لگ کر آ رہے تھے، تاکہ بحریہ کو بری افواج کی کمک بھی پہنچائی جا سکے۔ مگر حضرت معاویہؓ نے اس کی پیش بندی یہ فرمائی کہ خود ایک بری فوج لے کر روانہ

۱۔ البدایۃ والنہایۃ: ۸/ ۱۳۳، تاریخ طبری: ۵/ ۳۳۱۔

۲۔ ملاحظہ ہو: The Chronicle of the Theophanes 45

ہوئے۔اور رومیوں کے علاقوں میں اندر تک گئے۔اور کبادوکیا کے شہر قیصریہ [۱] تک پہنچے۔غالباً اس مہم کا مقصد بری راستوں سے کمک پہنچنے کا امکان ختم کرنا تھا۔

طرابلس سے اسلامی فوجوں نے کوچ کیا۔ابھی مسلمان کچھ ہی چلے تھے کہ اناضول کے مشرقی ساحل کے علاقے قیلیقیا Cilicia کی فینیکس [۲] نامی بندرگاہ پر دونوں فوجوں کا سامنا ہوا۔رومیوں نے اپنے نزدیک ایک فیصلہ کن جنگ کا ارادہ کیا تھا۔فرماں روائے بیزنطین قسطنطین خود قیادت کرر ہا تھا۔رومیوں نے ارادہ کیا تھا کہ شام اور مصر کے ساحلوں پر جا کر اسلامی بحریہ کو نیست و نابود کر دیا جائے۔وہ مختلف سمندروں سے اپنے تمام جنگی جہاز نکال لائے تھے،رومیوں کے جہازوں کی تعداد اور اسلحہ مسلمانوں میں ہیبت پیدا کرر ہے تھے۔مالک بن اوس بن حدثان اس معرکہ میں شریک تھے۔کہتے ہیں کہ ہم نے ایسے دیوہیکل جنگی جہاز نہیں دیکھے تھے،ہم مرعوب ہور ہے تھے۔مسلمانوں نے پیغام بھیجا کہ ساحل پر اتر کر دودو ہاتھ کر لیے جائیں۔مگر رومیوں کو معلوم تھا کہ بحری جنگ میں مسلمانوں کا ان سے کوئی مقابلہ نہیں تھے،انہوں نے انکار کیا اور کہا کہ ہم تو بحری جنگ ہی لڑیں گے۔

اسی بیچ رات آ گئی،مسلمانوں نے ساری رات دعا و مناجات اور تضرع و ابتہال میں گزاری۔عیسائی بھی ناقوس بجاتے اور مذہبی رسمیں ادا کرتے رہے۔صبح ہوئی تو جنگ کا انتظام کیا گیا۔بادشاہ روم پچھلی صفوں سے خود احکام جاری کرر ہا تھا۔رومیوں کی چال تھی کہ وہ مسلمانوں کی کشتیوں سے دور دور رہتے تھے۔تاکہ پہلے مسلمان اپنے تیر چلالیں اور منجنیقوں سے جو پتھر پھینک سکیں پھینک لیں۔اس کے بعد جب ان کا ذخیرہ ختم ہو جائے تو رومی اپنے بحری ہتھیاروں کی مدد سے مسلمانوں کی کشتیاں ڈبودیں۔جب قسطانز کو خبر دی گئی کہ تیراندازی اور سنگ باری ہورہی ہے تو اس نے کہا کہ جیت رومیوں ہی کی ہوگی۔

مسلمان ہر جنگ میں اپنی دلیری و جاں بازی سے کچھ ایسا کر دیتے تھے کہ دشمن ششدر اور لاجواب رہ جاتا تھا۔ہوا تند تھی،جہاز ڈانواڈول،ایک جگہ نہ ٹھیرتے تھے،مسلمانوں نے یہ کیا کہ اپنی تمام کشتیوں کو ایک ساتھ

---

۱ یہ موجودہ ترکی میں Kayseri کہلاتا ہے۔

۲ اسلامی مآخذ میں اس جنگ کا مقام متعین طور پر معلوم نہیں ہوتا،اس لیے ماضی قریب اور معاصر مصنفین کو اس کی پہچان کرنے میں کافی دشواری پیش آئی ہے۔ لیکن مغربی مآخذ اس کو واضح کرتے ہیں۔یہ مقام موجودہ ترکی کے انطالیہ Antalia صوبے کا شہر Phoenix ہے۔اب اس کو Finike یا ترکی میں Fe'nice کہا جاتا ہے۔مغربی مآخذ میں اس جنگ کو Battle of Phoenix ہی کہا گیا ہے۔ملاحظہ ہو:

A HISTORY OF THE LATER ROMAN EMPIRE, Bury: 290

زنجیروں سے سخت باندھ لیا۔ پھر وہ رومیوں کی کشتیوں پر لوہے کے آنکڑے پھینکتے، ان کو گھسیٹ کر اپنے پاس لاتے اور کود کے ان پر جا دھمکتے تھے۔ پھر دوبدو شمشیر زنی اور خنجر چلتے تھے، جس میں عرب بہت ماہر تھے۔ اس طرح سمندر میں گویا بری جنگ کا نقشہ قائم ہو گیا، رومیوں میں بھگدڑ مچ گئی اور کشتوں کے پشتے لگ گئے [۱]۔ خود بادشاہ قسطنطین قتل ہوتے ہوتے بچا۔ رومیوں کی شکست ایسی ذلت آمیز تھی کہ وہ قسطنطنیہ نہیں گیا، سسلی کے شہر سرقوسہ Syracuse چلا گیا، جہاں موت اس کا انتظار کر رہی تھی۔

عربی میں بادبان کی لکڑیوں کو صواری کہتے ہیں، اسی مناسبت سے اس جنگ کو معرکۂ ذات الصواری کہا جاتا ہے۔ مورخین نے اس جنگ کو ان جنگوں میں شمار کیا ہے جنھوں نے تاریخ کا رخ موڑ دیا اور انسانیت کے مستقبل کو نئی سمت عطا کی۔ جس طرح جنگ یرموک میں بیزنطیوں کو فیصلہ کن شکست ہوئی تھی، جس کے بعد ان کے لیے سرزمین شام میں واپسی ممکن نہیں ہو سکی، اسی طرح ذات الصواری نے طے کر دیا کہ اب مسلمان بحر متوسط میں بالادست ہیں اور رومیوں کو اپنا یہ خواب ترک کرنا ہو گا کہ وہ شام یا مصر و افریقہ کو واپس لے سکتے ہیں۔ بحر متوسط جو بحر روم کہلاتا تھا، اور واقعی اس سمندر میں ان کا کوئی حریف و مقابل نہیں تھا، اس جنگ نے اس کو اسلامی بحر متوسط بنا دیا تھا۔ رومی سمجھ گئے کہ اب ان کو اپنے مرکز قسطنطنیہ کی خیر منانی چاہیے۔

حضرت ابوذرؓ کا اختلاف:

حضرت عثمانؓ کی خلافت کے آخری ۶ سالوں میں ایک عجیب خطرناک سازشی فتنے کا آغاز ہوتا ہے۔ تفصیل تو عنقریب آتی ہے، یہاں اتنا پڑھ لیجیے کہ مملکت کے طول و عرض میں حکومت کے بارے میں ایک زبردست جھوٹا پروپیگنڈہ کیا گیا کہ خلیفہ عثمان کے گورنروں نے ایسا برا طرز عمل اختیار کر لیا ہے کہ اسلام خطرے میں ہے۔ اس پروپیگنڈے کا اصل مقصد بغاوت کی آگ بھڑکانا تھا۔ اسی دوران سن ۳۰ ہجری میں حضرت ابوذر غفاریؓ کو حضرت معاویہؓ سے کچھ اختلاف ہوتا ہے، دراصل حضرت ابوذر نے فتویٰ دینا شروع کیا تھا کہ اپنی ضروری غذا وغیرہ کے علاوہ مال جمع کرنا حرام ہے۔ حضرت ابوذر زہد و تقشّف کے امام تھے، یہ ان کا ذاتی ذوق تھا، مگر وہ دمشق اور شام کے مال داروں پر تنقید کرتے ہوئے یہ اعلان کرتے تھے کہ یہ لوگ اس آیت کے مصداق ہیں:

وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ۔ يَوْمَ يُحْمَى عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوَى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ هَذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُونَ۔ [التوبة:- ۳۴-۳۶]

---

[۱] طبری: ۴/۲۹۰، نیز الامویون والبیزنطیون: ۹۶۔

یعنی جو لوگ سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور ان کو اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے، ان کو دردناک عذاب کی خوش خبری دے دو، یاد کرو جس دن اس سونے چاندی کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا اور اس سے ان کی پیشانی، پہلو اور کمر داغے جائیں گے۔ اور کہا جائے گا یہی وہ خزانہ ہے جو تم نے جمع کر کے رکھا تھا، آج اپنے خزانوں کا مزہ چکھو۔

حضرت ابوذر کی یہ وعید آمیز تنقید و نکیر کچھ ایسی شدید تھی کہ حضرت معاویہؓ نے حضرت عثمانؓ کو لکھا کہ یہاں مسائل پیدا ہو رہے ہیں آپ ان کو مدینہ بلا لیجیے۔ حضرت عثمانؓ نے ان کو مدینہ بلا لیا مگر یہاں بھی انہوں نے اپنی پرجوش تبلیغ جاری رکھی جس سے مدینہ کے لوگ بھی ان سے جھگڑنے لگے۔ آخر کار حضرت عثمانؓ نے ان سے فرمائش کی کہ وہ کہیں آس پاس میں جا بسیں، کہ حضرت عثمان ان کی خبر گیری بھی کر سکیں۔ وہ مقام ربذہ ہجرت کر گئے۔

شیعہ حضرات نے اس واقعہ کو سیدنا عثمانؓ اور حضرت معاویہؓ کو بدنام کرنے کے لیے استعمال کیا ہے، کہ دیکھیے، ان دونوں کے ظلم کا حال۔ انہوں نے حضرت ابوذرؓ جیسے عظیم صحابی کو بھی جلاوطن کر دیا۔ اور وہ صرف اس جرم میں کہ وہ حکومت اور حکمرانوں پر تنقیدیں کرتے تھے۔

حضرت معاویہؓ کی مشکل:

ہم اس واقعہ پر صحیح روایت کی روشنی میں نظر ڈالتے ہیں۔ حضرت ابوذرؓ کی اس وعید و تنبیہ کی زد براہ راست مسلمانوں کے سربرآوردہ اور حکمراں طبقے پر پڑتی تھی۔ ہر ایک حضرت ابوذر کے معیار کا زہد کہاں سے لاسکتا تھا! مگر ان کا جو دینی مقام تھا، اس کے پیش نظر اس فتوے سے دمشق و شام میں بے چینی پھیلنے لگی۔ وہ برملا لوگوں پر تنقیدیں کرتے تھے۔ اتفاق یہ کہ سن ۳۰ ہی وہ سال ہے جب ہم کو شام میں عبداللہ بن سبا کی ان سازشی سرگرمیوں اور بغاوت کی تحریک کا سراغ ملتا ہے، جس کی تفصیل آگے آئے گی۔ کوفہ و بصرہ میں وہ پہلے ہی اپنی ٹولیاں بنا چکا تھا۔ اب وہ اپنی پارٹی کے ساتھ شام میں موجود تھا۔ واضح قرائن ہیں کہ ان انتشار پسندوں نے حضرت ابوذر کے فتووں اور تنقیدوں کا حضرت معاویہ کے خلاف اپنی فتنہ انگیز تحریک کے لیے استعمال شروع کر دیا۔ مسئلہ صرف یہ نہیں تھا کہ حضرت ابوذر کوئی خاص رائے رکھتے تھے، بلکہ نہایت عیاری سے ایک باغی تحریک ان کے فتووں اور تنقیدوں کا استعمال فتنہ و شر پھیلنے کے لیے کر رہی تھی۔ طبری کی روایت میں یہ صاف بیان ہے کہ عبداللہ بن سبا شام میں تھا اور حضرت ابوذرؓ کے اس فتوے اور تنقیدات کو بغاوت و فتنہ کی تخم ریزی کے لیے استعمال کر رہا تھا[۱]۔

طبری کی یہ روایت اگرچہ سند کے اعتبار سے ضعیف ہے، لیکن آگے آنے والی صحیح بخاری اور طبقات بن سعد کی ان صحیح روایات سے اس کی تصدیق ہوتی ہے، جو اجمالاً اس بغاوت و فتنہ کی تحریک کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

۱۔ طبری: ۴/ ۲۸۳۔

فتنہ کا خطرہ کیوں تھا؟

حکومت کے لیے ان کے اس فتوے سے، جس میں کوئی صحابی ان کے ساتھ نہیں تھا (فتح الباری: ۳/ ۲۷۳) کیسے مسائل پیدا ہو رہے تھے، اس کا علم ابن سعد کی صحیح سند سے وارد روایت سے ہوتا ہے، جس میں مذکور ہے کہ حضرت ابوذر جب مدینے پہنچے اور حضرت عثمانؓ سے ملاقات کے لیے تشریف لائے تو سلام دعا کے بعد فوراً فرمایا: امیر المومنین! کیا آپ نے مجھے ''اُن لوگوں میں سے'' سمجھ لیا؟؟ خدا کی قسم میں ''اُن'' میں سے نہیں ہوں، نہ ان سے کوئی علاقہ ہے۔ میں بہر قیمت آپ کی اطاعت کا پابند ہوں'' [۱]۔ حضرت ابوذرؓ کے اس جملے سے واضح طور پر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کو کچھ لوگ ضرور شر انگیز سبائی تحریک کا حامی باور کرا رہے تھے۔ اس وقت تک سبائی سازشی ٹولہ اور اس کی شرارت انگیز تحریک خاصی معروف ہو چکی تھی۔ اور (جیسا کہ یہ روایات بتا رہی ہیں) خود حضرت ابوذرؓ کو اس کا علم تھا کہ ان فتووں اور تنقیدوں کا یہ تحریک استعمال کر رہی ہے۔ اور اتنا استعمال کر رہی ہے کہ لوگوں کو یہ گمان ہونے لگا ہے کہ حضرت ابوذرؓ بھی اس جماعت کے ساتھ ہیں۔ اور اسی لیے (بخاری کی روایت کے مطابق) انہوں نے حضرت عثمان کو یہ اطمینان دلانے کے لیے کہ، وہ ''ان'' سازشی باغیوں میں سے نہیں ہیں، مزید یہ بھی فرمایا کہ مجھ پر اگر کوئی حبشی غلام بھی امیر ہوگا تو میں اس کی اطاعت کروں گا۔ بہر حال مسئلہ حضرت ابوذر کے ان فتووں سے نہیں پیدا ہو رہا تھا، ان شر انگیزوں اور سازشی پروپیگنڈے بازوں سے پیدا ہو رہا تھا، جو ان فتووں کو استعمال کر رہے تھے۔

صحیح روایت ہے کہ جب زیادہ مسائل پیدا ہونے لگے تو براہ راست امیر المومنین حضرت عثمانؓ نے ان پر پابندی کا حکم صادر فرمایا کہ آپ یہ غلط فتویٰ نہ دیں۔ مگر اس مسئلے میں حضرت ابوذرؓ ایک سخت جذب و جوش کے عالم میں تھے۔ ایک مرتبہ کسی نے کہا کہ آپ پر تو امیر المومنین نے پابندی لگائی ہوئی ہے، مگر آپ فتویٰ دینے سے باز نہیں آرہے ہیں، کہنے لگے کہ تم گردن پر تلوار رکھ دو گے تو بھی نہ مانوں گا [۲]۔

جلاوطنی نہیں عزلت نشینی:

فتنہ اس قدر بڑھا دیا گیا کہ حضرت معاویہؓ نے حضرت عثمان کو خط لکھا اور کہا کہ حضرت ابوذرؓ کے اس موقف اور فتوے سے حالات بگڑ رہے ہیں، اگر آپ شام کی سلامتی چاہتے ہیں تو انہیں مدینے بلا لیں۔ حضرت عثمانؓ نے خط لکھ کر ان کو مدینہ بلا لیا۔ حضرت ابوذر نے مدینے میں بھی اپنی اسی رائے کے مطابق فتویٰ دینا اور اہل مال پر سخت

---

[۱] طبقات: ۴/ ۱۷۵، نیز الزہد لاحمد بن حنبل: ۷۹۸، بسند صحیح۔ البدایہ والنہایہ: ۷/ ۱۷۵۔

[۲] طبقات بن سعد: ۲/ ۲۷۰، صحیح بخاری تعلیقاً، فتح الباری: ۱/ ۱۶۱، ابن حجر نے اس کی سند کو صحیح ٹھہرایا ہے۔

تنقیدیں کرنا شروع کر دیا، تو یہاں بھی مسائل پیدا ہوئے۔ بخاری کی روایت میں ہے کہ خود حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ ''لوگ اس طرح مجھ پر ٹوٹتے تھے، جیسے میں کوئی عجب شے ہوں''۔ نسائی کی روایت میں ہے کہ ''لوگ میرے پیچھے پڑ گئے''۔ انہوں نے حضرت عثمان سے اہل مدینہ کی شکایت کی، تو حضرت عثمانؓ نے ان سے کہا کہ اگر آپ مناسب خیال کریں تو عزلت نشینی اختیار کر لیں، لیکن مدینے سے زیادہ دور نہ جائیں۔ لہٰذا وہ ربذہ نامی مقام میں مقیم ہو گئے۔ اور آخر ان کی وہیں وفات ہوئی (صحیح بخاری: ۱۴۰۶ سنن کبریٰ نسائی: ۱۱۱۵۴)۔ طبقات ابن سعد کی آگے مذکور صحیح روایت میں ہے کہ انہوں نے خود یہ فرمائش کی کہ ربذہ میں میری زمین ہے، میں وہاں چلا جاتا ہوں۔

حضرت ابوذر کا خاص مزاج:

حضرت ابوذر غفاری نہایت جلیل القدر صحابی تھے۔ جماعت صحابہ میں زہد و اخلاص اور صدق باطن میں ممتاز مقام کے حامل تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ لیکن مزاج میں ایک خاص طرح کی شدت تھی، یا شاید وہ جذب کی کوئی خاص کیفیت تھی، جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو متوجہ بھی فرمایا تھا۔

غالباً مزاج کی اسی خاص کیفیت و شدت کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو وصیت فرمائی تھی کہ:

يا أبا ذر! إني أراك ضعيفا، وإني أحب لك ما أحب لنفسي، لا تأمرن على اثنين۔

(صحیح مسلم: ۱۸۲۶)

ابوذر! تم کمزور آدمی ہو۔ میں تمہارے لیے وہی پسند کرتا ہوں جو اپنے لیے پسند کرتا ہوں۔ کبھی دو آدمیوں پر بھی امیر نہ بننا۔

حضور اکرمؐ نے حضرت ابوذرؓ کی جس 'کمزوری' کا ذکر فرمایا، وہ ظاہر ہے، کوئی جسمانی کمزوری تو نہیں تھی۔ بلکہ وہ یقیناً مزاج کی کوئی خاص کیفیت تھی جس کی وجہ سے آپؐ نے ان کو دو آدمیوں پر بھی حاکم نہ بننے کی وصیت فرمائی تھی۔

حضرت عثمانؓ نے مسئلے کا جو حل نکالا وہ اسی پہلو کے پیش نظر تھا۔ مگر ان کے مقام صدق و اخلاص اور اس قلبی محبت کی وجہ سے جو ان کو حضرت ابوذرؓ سے تھی، یہ بھی چاہا کہ وہ مدینے سے زیادہ دور نہ ہوں۔

حضرت عثمانؓ اور حضرت ابوذرؓ
وفا و اکرام کے نمونے:

ہماری تاریخ کس قدر مظلوم ہے، اس کا ایک نمونہ یہ واقعہ بھی ہے۔ پروپیگنڈے کا طوفان اٹھایا گیا کہ حضرت ابوذر جیسے صدیق پر عثمان و معاویہ نے ظلم کا پہاڑ توڑا۔ اس پروپیگنڈے کو کچھ مسالہ تو بے اصل تاریخی روایات نے فراہم کیا، باقی بغضِ تہمت تراش نے گھڑ لیا۔ صحیح روایات بتاتی ہیں کہ حضرت معاویہ اگرچہ مسائل کا

سامنا کرتے تھے، لیکن حضرت ابوذر کا اس درجہ اکرام کرتے تھے کہ ان سے خود عرض کرنے کے بجائے، حضرت عثمان کو لکھا کہ ان کو بلا لیجیے۔ اور حضرت عثمانؓ نے بھی ان کو اپنی رائے کے اظہار سے نہیں روکا۔ لیکن جب انہوں نے خود کہا کہ مدینے میں مجھے پریشانی ہورہی ہے، تو حضرت عثمان نے بڑی محبت سے فرمایا: إن شئت تنحيت، فكنت قريبا، "آپ مناسب سمجھیں تو ذرا کہیں ہٹ جائیں، لیکن کہیں دور نہ جایئے گا۔ حقیقت یہی ہے کہ حضرت ابوذرؓ خود اپنی پسند سے ربذہ گئے تھے، ان کو جلاوطن نہیں کیا گیا تھا۔ خود حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں کہ "میں اس لیے ربذہ آگیا ہوں"۔ نہ شکوہ نہ شکایت، نہ لعنت نہ ملامت۔ بلکہ اظہار اطاعت وفرماں برداری میں یوں مزید کہتے ہیں۔ ولو أمروا علیٰ حبشيا لسمعت وأطعت۔ یعنی اگر حکومت کسی حبشی غلام کو بھی میرا امیر مقرر کردے گی تو میں اس کی بھی اطاعت کروں گا (طبقات ابن سعد: ۴/۱۷۱ بسند صحیح)۔

امت مسلمہ میں صدق وزہد کا امام:

اللہ تعالیٰ حضرت ابوذر کے درجات بلند فرمائے، عجب صدّیق اور زاہد شخص تھے۔ اس شان سے دنیا کو خیر باد کہا کہ ان کے گھر والوں کے پاس ان کے کفن کے بھی کپڑے نہیں تھے۔ بیوی اس ناداری پر رو پڑیں، تو انہوں نے فرمایا: نیک بخت! پریشان مت ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس ہم چند لوگ بیٹھے تھے، آپ نے فرمایا: تم میں سے کوئی ایک کسی ویرانے میں وفات پائے گا، مسلمانوں کا ایک قافلہ آئے گا وہ اس کی تدفین انجام دے گا۔ ان سب نے آبادی میں وفات پائی، صرف میں بچا ہوں۔ اس لئے مجھے یقین ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد کے مطابق کوئی قافلہ آجائے گا اور میری تجہیز وتکفین انجام دے گا۔

غرض ویسا ہی ہوا جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خبر دی تھی۔ کچھ ہی دیر میں کوفے سے ایک قافلہ آگیا۔ ان میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بھی تھے۔ بیوی نے ان کو بتایا کہ حضرت ابوذرؓ کا آخری وقت ہے، وہ لوگ آئے تو حضرت ابوذرؓ نے وصیت کی کہ میرا کفن کسی ایسے شخص سے نہ لیا جائے جس نے کبھی بھی حکومت سے تنخواہ لی ہو۔ یہ سب لوگ حکومت کے کارندے اور وظیفہ یاب تھے۔ ایک انصاری نوجوان نے کہا: میں نے کبھی حکومت سے کچھ نہیں لیا ہے، اسی نے کفن کی چادریں دیں اور حضرت ابوذر کی تدفین کی۔ (طبقات ابن سعد: ۴/۱۷۵)

رضی اللہ عنہ وأرضاہ

چھٹا باب

''فتنۂ کبریٰ'' اور شہادت عثمانؓ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آگاہیاں و پیشین گوئیاں:

حضرت معاویہؓ کی زندگی کا ایک الم انگیز واقعہ سیدنا حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت کا سانحہ ہے۔ اس نامبارک واقعے کا سایہ آئندہ تاریخ پر بہت گہرا پڑا، اس لیے اس کا مطالعہ حضرت معاویہ کی شخصیت و حالات کے سلسلے میں ناگزیر ہے۔ اس دلخراش واقعے اور اس کے نتیجہ میں پیش آنے والے غم انگیز واقعات و اختلافات کو صحابۂ کرام ''فتنہ'' کا نام دیا کرتے تھے۔ اس نام کی وجہ دراصل یہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے متعدد مواقع پر صحابہ کو ''عنقریب'' اور اُنہی کی یعنی صحابہ کی ہی زندگی میں ایک خطرناک، پرجوش، اور سمندر کی طرح متلاطم ''فتنہ'' کے وقوع کی خبر دی تھی۔ اور یہ بتایا تھا کہ اس کو حضرت عمرؓ کا وجود مبارک روکے ہوئے ہے۔ ان کے ارتحال کے بعد یہ فتنہ ظاہر ہو کر رہے گا۔ یہ بات خود حضرت عمرؓ اور صحابہ میں فتنوں کے سب سے بڑے واقف و عالم حضرت حذیفہ دونوں یقین کے ساتھ جانتے تھے (صحیح بخاری: ۵۲۵)۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بھی خبر دی تھی کہ حضرت عثمان اس وقت حق پر ہوں گے اور ان کے مخالفین ظالم اور باطل پرست ہوں گے۔ حضرت عبداللہ بن حوالہؓ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے کہا کہ عن قریب ایک عظیم فتنہ رونما ہوگا۔ پھر آپؐ نے ایک صاحب کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ تم اُس وقت اِس شخص کی اتباع کرنا۔ حضرت عبداللہ فرماتے ہیں کہ وہ شخص حضرت عثمان تھے۔ نیز آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بھی فرمایا تھا کہ اس فتنہ کے وقت یہ اور ان کے ساتھی حق و ہدایت پر ہوں گے [۱]۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بھی پیشین گوئی فرمادی تھی کہ حضرت عثمان بھی اپنے عظیم پیش رو سیدنا عمر بن الخطابؓ کی طرح شہید ہوں گے۔ (بخاری: ۳۶۹۹)۔

جب حضرت عثمانؓ محصور تھے، ان کے ساتھ کچھ جانثار صحابہ و تابعین گھر میں ہی مقیم تھے۔ ان میں

---

[۱] مستدرک: ۴۵۲۹، ۴۵۵۲، حاکم اور ذہبی نے ان دونوں روایات کو صحیح قرار دیا ہے۔ نیز مسند احمد: ۱۷۰۰۴۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت حسنؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ بھی تھے۔ اس موقعہ پر حضرت ابو ہریرہؓ نے لوگوں کو سنایا کہ میں نے آں حضرتؐ سے سنا آپ نے فرمایا تھا کہ ایک عظیم فتنہ اور اختلاف رونما ہوگا۔ میں نے عرض کیا: حضور ارشاد فرمایئے کہ ہم اس سے کیسے بچیں؟ آپؐ نے عثمانؓ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: اس امین اور اس کی جماعت کے ساتھ رہنا (مسند احمد: ۸۵۴۱ بسند حسن)۔

غرض وہ فتنہ جو حضرت عثمانؓ کے الم ناک سانحۂ شہادت کا سبب بنا، پیش آیا۔ اور اس طرح پیش آیا کہ لوگوں کو نصف النہار میں بھی کچھ نظر نہیں آتا تھا کہ کیا کریں؟ امت کا مستقبل موہوم اور خطروں کے گرداب میں پھنس گیا تھا۔ اس فتنے کی پرتوں کو اٹھائے بغیر ان حالات ومشکلات کو سمجھنا ممکن نہیں جن سے حضرت معاویہؓ کو گذرنا پڑا۔ خصوصا ان کی زندگی کا وہ پر پیچ سفر جو سیدنا علیؓ کی خلافت کے دور میں حالات کی راہوں پر طے ہوا ہے، اس کو سمجھنا شہادت عثمانی اور اس کے اسباب ونتائج کی معرفت پر موقوف ہے اس لیے ضروری ہے کہ حالات کے ان اہم پہلوؤں پر گہری نظر ڈالی جائے جو بعد کی تاریخ کے تشکیلی عناصر کی حیثیت رکھتے ہیں اور جو اگلے چند سال نہیں، دہائیوں تک کے واقعات پر اثر انداز ہوتے رہے۔

فتنہ کی بنیادی حقیقت اور اس کے تاریخی ومعاشرتی اسباب:

فتنہ کیا تھا؟ ایک انتشار پسند سیاسی تحریک تھی۔ خلافت راشدہ کے اس نظام حکومت کے خلاف پروپیگنڈا تھا۔ بغاوت اور حکم راں بدلنے کے مطالبے تھے۔ اور ریاست کے مالی وسائل میں زیادہ حصوں کی خواہشات تھیں۔

حضرت عثمان کے دور میں خلافت فاروقی کی طرح فتوحات کا سیل رواں جاری تھا۔ مسلمان تیزی سے تمدنی ترقی کر رہے تھے۔ معاشی فراوانی اس تیزی سے آئی تھی کہ قوموں کی تاریخ میں فقر سے غنا کا سفر اس تیزی سے کم ہی طے ہوا ہوگا۔ عرب بدو قبائل جہاد کے قیام اور مفتوح علاقوں کے استحکام کے لیے اندرون عرب سے نکل کر عراق وفارس اور مصر وشام کے شہروں میں آباد کیے گئے تھے، اب وہ معاشی کشادگی کے ساتھ عجمی پر تکلف زندگی کے بھی مزے لینا جان رہے تھے۔ انسانی نفسیات ایک حرکت پذیر شے ہے، جو اپنے ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ اب جب کہ عرب کے صحرا نشین آرام وآسائش اور عیش وعشرت کے وسائل اپنا رہے تھے، ماحول کی یہ تبدیلی اور معیشت ومعاشرت کا یہ انقلاب رنگ لائے بغیر کہاں رہ سکتے تھے؟ ان کا مزاج واخلاق پر اثر انداز ہونا طے تھا۔

طالع آزما لوگوں کے لیے یہ صورت حال بڑا فتنہ ہوا کرتی ہے۔ وہ اخلاق واقتدار کے قابو میں نہیں رہتے۔ وسائل عیش کی فراوانی اور اطمینان وبے خوفی مزاجوں میں شورش پسندی پیدا کر دیتی ہے۔ جاہ وامارت کی

خواہش ان کوحکومت ومناصب کی ہوڑ میں لگا دیتی ہے۔ یہ مشکل مرحلہ مسلمانوں کواب درپیش تھا۔اس کے ابتدائی آثار حضرت عمرؓ کے مستحکم دور میں ہی نظر آنے لگے تھے۔اسی دور میں طالع آزما اور حسد کے شکار لوگ متحرک وسرگرم ہونے لگے تھے۔گورنروں کے خلاف بے اطمینانی پھیلانے کے لیے جھوٹی شکایات کا سلسلہ شروع کردیا گیا تھا۔ یہاں تک کہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ جیسے عظیم وجلیل القدر صحابی پر یہ اعتراض کیا گیا کہ یہ نماز صحیح نہیں پڑھتے، ریاستی مال میں خیانت کرتے ہیں، اور عدالتی فیصلوں میں بے ایمانی کرتے ہیں۔لا حول ولا قوۃ الا باللہ۔حضرت سعدؓ امت مسلمہ کے سرخیل اور جانشینان رسول کے امام تھے۔ان عشرۂ مبشرہ کے فرد تھے جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے خاص اعتماد کی سند سے نوازا تھا۔آخران کے خلاف اتنی بے اطمینانی پھیلائی گئی کہ حضرت عمر کوانہیں معزول کرنا پڑا (صحیح بخاری: ۷۵۵)۔اس واقعے سے کوفہ وبصرہ کے شریر عناصر کی سرگرمی اور قوت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔حضرت عمرؓ اس صورت حال سے مغموم وفکرمند رہنے لگے تھے اوران کا غم دعا کی صورت میں یوں جھلکتا تھا:

اللهم كبرت سني وضعفت قوتي وانتشرت رعيتي، فاقبضني اليك غير مضيع ولا مفرط (موطا، باب ما جاء في الرجم)

اے اللہ میں اب سن رسیدہ وکمزور ہوگیا ہوں اور حدود سلطنت بہت وسیع ہوگئی ہیں۔اب مجھے اس سے پہلے اٹھا لیجیے کہ مجھ سے یہ امانت ضائع ہو یا مجھ سے اس میں کوتاہی ہو۔

حضرت عثمان کی حکومت کے شروع کے ٦ سالوں میں کوئی خاص بڑا واقعہ نہیں ہوا۔لیکن آخری چند سالوں میں مصر وکوفہ اور بعض دیگر صوبوں میں وہی گورنروں کی شکایات کا بازار گرم ہونا شروع ہوگیا، جس کا عہد عمری میں بھی تجربہ ہو چکا تھا۔

عبداللہ بن سبا کا کردار:

یہاں سے اس فتنہ کا آغاز ہوتا ہے جسے اسلامی تاریخ میں بجا طور پر ''فتنۂ کبریٰ'' کہا جاتا ہے۔اور جس کے المناک نتائج سے آج تک ہم نجات نہیں حاصل کرسکے ہیں۔انتشار وبدگمانی کی مذکورہ فضا میں ایک خطرناک سازشی دماغ کو کام کرنے کا بے مثال موقعہ نظر آیا۔یمن میں ایک یہودی عالم عبداللہ بن سبا تھا۔یہ ابن السوداء کے نام سے بھی معروف تھا۔اس نے مسلمانوں کی عظیم خلافت کے شیرازہ کو منتشر کرنے کے لیے ایک بڑا منظم منصوبہ بنایا۔اس منصوبہ پر عمل درآمد کے لیے اس نے اسلام کا لبادہ اوڑھا۔تاریخی مآخذ میں ہم کو سن ۳۰ ہجری سے ابن سبا کی سرگرمیوں کا سراغ ملنے لگتا ہے (طبری: ۴/ ۲۸۳)۔سب سے پہلے وہ حجاز آیا۔ یہاں صحابۂ کرام کی کثرت اور مسلمانوں میں دینی شعور عام ہونے کی وجہ سے اس کو زمین سازگار نہیں نظر آئی۔ یہاں سے وہ

بصرے گیا، جہاں پہلے سے انتشار پسند لوگ موجود تھے۔اس کی مشتبہ حرکتوں اور انتشار پسندوں کے ساتھ ساز باز کی وجہ سے یہاں کے گورنر عبداللہ بن عامر نے اس کو شہر بدر کر دیا۔ یہاں سے وہ کوفہ آیا اور زیر زمین تحریک کے لیے کام کرتا رہا۔ بصرہ اور کوفہ میں اس کو سادہ لوحوں اور شر پسندوں کی ایسی تعداد مل گئی جن کو اس نے اپنے منصوبہ میں شامل کر لیا (طبری: ۴/ ۲۸۳)۔ وہ خود تو مستقل ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا رہتا تھا، مگر اپنی پارٹی کے ارکان سے اس کا لگاتار رابطہ خط و کتابت اور قاصدوں کے ذریعہ رہتا تھا۔ کوفے سے وہ شام گیا، یہ غالبا اس کی دوسری آمد تھی۔شام میں حضرت معاویہؓ کے تدبر اور چاق و چوبند اور بیدار حکومتی نظام میں اس کو کچھ کامیابی نہیں ملی۔ یہاں سے وہ آگے بڑھا اور سن ۳۴ھ میں مصر پہنچا۔

اس شخص کا فتنہ حضرت علی کے دور میں اپنے عروج کو پہنچتا ہے۔ یہ حضراتِ ابوبکر و عمر کو برا بھلا کہتا تھا اور فساد و فتنہ انگیزی کے لیے یہ جھوٹ بھی پھیلاتا پھرتا تھا کہ حضرت علی بھی اندر سے یہی خیالات رکھتے ہیں مگر سب کے سامنے اس کا اظہار نہیں کرتے۔ سیدنا علی کو خبر ملی تو انہوں نے اس کو قتل کروانا چاہا، مگر پھر فتنہ کے ڈر سے ارادہ ترک کر دیا۔ حافظ ابن عساکر نے متعدد صحیح اسانید سے روایت کیا ہے کہ سیدنا علی کہا کرتے تھے، میرا اس کلوٹے بھجنگ سے کیا تعلق؟ مراد ابن سبا تھا، جو حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی شان میں گستاخی کرتا تھا۔ وہ یہ بھی کہتا تھا کہ دین کی اہم تعلیمات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے خفیہ طور پر حضرت علی کو دی ہیں، وہ کسی اور کے پاس نہیں ہیں۔ حضرت علی کو اس کی صفائی دینی پڑتی تھی۔ آخر حضرت علیؓ نے اس کو شہر بدر کر دیا[۱]۔

ابن سبا نے منتشر چنگاریوں کو منظم کر کے ملک گیر آگ بنادی:

یہ کہنا تو صحیح نہیں ہوگا کہ خلافت اسلام کے خلاف بغاوت کی سازش اکیلے ابن سبا کی تھی۔ دراصل کوفہ و بصرہ میں حُکَیم بن جبلہ اور اشتر نخعی جیسے متعدد لیڈر ابھر کر سامنے آ چکے تھے۔ مصر میں بھی ایسے لوگ موجود تھے۔ جن کے پاس افراد و اسلحہ کی قوت تھی۔ لیکن تاریخی روایات شہادت دیتی ہیں کہ ان متفرق عناصر کو ایک بڑی منظم سازش کی شکل دینے اور اس آگ کو شعلۂ ملک سوز بنانے کا کام ابن سبا ہی کا تھا، جو کوفہ و بصرہ میں خفیہ طور پر سرگرم اور سرداران فتنہ کے یہاں مخفی طور پر قیام پذیر پایا گیا اور دونوں جگہ سے شہر بدر کیا گیا تھا۔ (فتنہ مقتل عثمان: ۱/ ۱۱۸)۔

---

[۱] تاریخ دمشق: ۲۹/ ۷۔۹۔ ابن سبا کی شخصیت اور کردار کے بارے میں تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: فتنہ مقتل عثمان: ۱۱۵ تا ۱۲۵، نیز شیخ سلیمان عودہ کی کتاب: عبداللہ بن سبا واثرہ فی احداث الفتنۃ فی صدر الاسلام۔

مصر کے حالات ابن سبا کو زیادہ سازگار لگے۔اس نے مصر کو مرکز بنا کے کام شروع کیا۔یہیں سے اس نے باقاعدہ کوفہ وبصرہ اور دیگر شہروں میں اپنی تحریک کے داعی پھیلا دیے۔جن سے اس کا مسلسل رابطہ اور مراسلت رہتی۔سبائی پارٹی کا طریقۂ کار عیاری ومکاری اور تخریبی تحریکوں کی پروپیگنڈا بازی کی اعلیٰ مثال تھا۔

عراق وفارس اور مصر وافریقہ میں عرب بدو قبائل کے لوگوں کو بڑی تعداد میں لے جا کر عہدِ عمری وعثمانی میں بسایا گیا تھا۔یہ اپنی سادگی،بدویانہ فطرت اور خشک مزاجی کی وجہ سے جلد کسی سازش کے شکار ہو سکتے تھے۔ان کے علاوہ وہاں مقامی نومسلم عربی النسل لوگوں کی بھی بڑی تعداد تھی۔ان دونوں طبقوں کے لوگ اسلام کے ساتھ سچی خیر خواہی رکھتے تھے،لیکن دین کی سمجھ میں وہ بہت ناقص تھے۔سبائی داعی ان سادہ اور جاہل عوام کے بارے میں جانتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے گھر والوں سے ان کو بڑی پرخلوص اور فدایانہ عقیدت ومحبت ہے۔ان کی جہالت کا فائدہ اٹھا کر حضرت علیؓ کے بارے میں اُسی طرح نہایت غلو آمیز عقائد پھیلائے جا سکتے ہیں،جس طرح عیسائی عوام میں یہودی پال نے حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں پیدا کر دیے تھے۔

ہر قسم کے لوگوں کے ساتھ ابن سبا کا اور اس کے داعیوں کا معاملہ جدا ہوتا تھا۔بالکل ہی جاہلوں کو اس نے حضرت علیؓ کی الوہیت تک کا قائل بنا دیا تھا[۱]۔ ایک طبقے کے درمیان اس نے اور اس کے لوگوں نے یہ پروپیگنڈا کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے بعد خلافت وامارت کے لیے حضرت علیؓ کو نامزد کر گئے تھے،مگر ابو بکر وعمر اور ان کے ساتھ دیگر بڑے بڑے صحابہ نے (معاذ اللہ) اس حق کو غصب کر لیا۔یہ افواہ بھی پھیلا دی گئی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اہل بیت کو دین کا کوئی خاص حصہ رازدارانہ طور پر دے گئے ہیں،جس کا علم سوائے ان کے کسی کو نہیں۔جب یہ افواہ گرم ہوئی تو حضرت علیؓ سے لوگوں نے دریافت کیا۔آپؓ نے پرزور حلفیہ بیان دیا کہ ایسا کچھ بھی نہیں۔مگر یہ جھوٹ اس قدر پھیل رہا تھا کہ حضرت علیؓ کو اپنے خطبوں میں بھی برملا اس جھوٹ کی تردید کرنی پڑی۔(صحیح بخاری:۷۳۰۴، ۲۱۷۲)۔

لیکن اس طرح کی افواہوں کے علاوہ اس کی تحریک کا اصل طریق کار یہ تھا کہ مملکت کے مختلف شہروں، خصوصاً عراق ومصر کے ان شہروں میں بے چینی پھیلائی جائے،جہاں فوجوں کا قیام تھا اور جو گویا قوت کے مراکز تھے۔اس کا یہ آسان طریقہ اختیار کیا گیا کہ گورنروں اور حکام کے بارے میں پروپیگنڈا کیا جائے کہ انھوں نے ظلم کا بازار گرم کر رکھا ہے اور دین وشریعت کو چھوڑ کر بے دینی کے راستے کو اختیار کر لیا ہے۔ابن سبا نے اپنے

---

[۱] المخلصیات: ۱/۳۳۵، مطبوعہ وزارۃ الاوقاف، قطر۔حافظ ابن حجر نے اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے۔(فتح الباری: ۱۲/۲۷۰) یہ بات مشہور ہے۔اس کو مختلف تاریخی مآخذ نے روایت کیا ہے،ہم نے مذکورہ ماخذ کا حوالہ اس کی قوتِ سند کی وجہ سے دیا ہے۔

لوگوں کو حکم دیا کہ وہ عوام کو اپنے بارے میں یہ باور کرائیں کہ وہ دین و شریعت کو بچانے اور امت اور حکومت کو راہ راست پر لانے کے لیے کھڑے ہوئے ہیں، جس کو حضرت عثمانؓ اور ان کے عمال و اعوان سے سخت خطرہ درپیش ہے۔ اس نے اپنی فسادی تحریک کے داعیوں کو حکم دیا کہ تم لوگ اصلاح امت کا دینی چولہ پہن کر اور ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' کے عنوان سے کام کرو۔

اس تحریک کے داعی مختلف صوبوں کے مراکز (فسطاط، بصرہ، کوفہ، موصل، وغیرہ) سے لوگوں کو بڑے ''دردمندانہ'' انداز میں جھوٹے خطوط لکھتے۔ وہ خطوط لوگوں، خصوصاً افواج میں پھیلائے جاتے، جن میں یہ مضمون ہوتا کہ ہمارے علاقوں میں عثمان کے گورنروں نے دین برباد اور مخلوق پر بڑا ظلم کر رکھا ہے۔ بدعنوانیاں عروج پر ہیں۔ اب کچھ کرنے کا وقت ہے۔ اس طرح کوفہ و بصرہ اور مصر میں خاصی بے چینی پیدا ہو گئی۔ اگرچہ اس فتنہ انگیز تحریک میں جماعت صحابہ سے کوئی بھی شریک نہیں ہوا[۱]۔ جو لوگ شریک بغاوت ہوئے ان کو صحابۂ کرام اور ائمۂ تابعین نے ''غوغاء'' (یعنی فسادی) اَعلاج (گنوار) اور فاسق جیسی صفات سے یاد کیا ہے[۲] (بلکہ صحیح حدیث کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہی ان باغیوں کو منافق فرمایا تھا) مگر چوں کہ اس فساد و بغاوت پر بظاہر اسلام کی حفاظت اور خلافت و حکومت کی اصلاح کا پردہ ڈالا گیا تھا، اس لیے اس کے پروپیگنڈے کا تیزی سے اثر ہو رہا تھا۔ صحابۂ کرام کو بھی اس کے فساد و شر اور خطرناکی کا اندازہ اس وقت ہوا جب بہت دیر ہو چکی تھی اور فتنہ کی فصل زہریلے برگ و بار لا چکی تھی۔

۳۳ھ میں سبائی پارٹی کی انتشار انگیزی کی وجہ سے کوفے کے امیر حضرت سعید بن العاصؓ نے اشتر نخعی اور سرغنہ قسم کے لیڈروں کو، جن میں بعض سزا یافتہ مجرم رہے تھے، حضرت عثمان کے ایماء پر، جلا وطن کر کے شام بھیج دیا۔ حضرت معاویہؓ نے ان کو حسن سلوک کے ذریعہ راہ راست پر لانے کی کوشش کی۔ مگر وہ تو سازش پر کمر کس چکے تھے۔ حضرت معاویہ کو ان کے شر سے شام کے حالات بگڑنے کا ڈر ہوا تو ان کو واپس کوفہ بھیج دیا گیا۔ اس مرتبہ وہ اور شیر ہو کر فساد پھیلانے لگے۔ لہٰذا ان کو پہلے الجزیرہ اور پھر حمص جلا وطن کیا گیا۔ اسی طرح بصرہ کی

---

[۱] بعض تاریخی مآخذ میں حضرت طلحہؓ کو حضرت عثمان کے خلاف اکسانے اور بدنیتی کے ساتھ فتنہ میں حصہ لینے والوں میں شمار کیا گیا ہے، بعض دیگر صحابۂ کرام کو بھی دائرۂ اتہام میں رکھا گیا ہے یا ان کی طرف منسوب کیا گیا ہے کہ وہ حضرت عثمان کو ان کی ''غلط کاریوں'' کی بنا پر معزول کرنے کے حامی تھے۔ لیکن یہ سب ضعیف و منقطع روایات ہیں۔ اور تقریباً سب شیعہ راویوں سے مروی ہیں۔ علاوہ ازیں یہ اُن سب صحیح روایات کے خلاف ہیں، جو بتاتی ہیں کہ صحابۂ کرام قاتلان عثمان سے سخت ناراض تھے۔ ملاحظہ ہو: تحقیق مواقف الصحابہ فی الفتنۃ، د/۱، محزون: ۳۶۳۔ ۳۸۳۔

[۲] حضرت عائشہ: طبری: ۲۵۱/۴، حسن بصری: تاریخ خلیفہ: ۱۷۶، الطبقات: ۶۱/۳ بسند صحیح۔

سبائی پارٹی کے کچھ لیڈروں کو شام جلاوطن کیا گیا (طبری: ۴/ ۳۲۲-۳۲۹)۔مگر یہ ساری تدبیریں اس سازش کو ختم کرنے میں اس لیے ناکام رہیں کہ کوفہ، بصرہ، شام اور مصر میں کسی حاکم کو اس کی وسعت و گہرائی کا علم واندازہ نہیں ہو سکا تھا۔ وکان امر اللہ قدرا مقدورا۔

غالباً سن ۳۴ھ کی بات ہے کہ سبائیوں کی پھیلائی افواہوں اور جھوٹے خطوط سے مدینہ کے صحابہ بھی بے چین ہوئے۔ ان کو تشویش ہوئی کہ گورنروں کی بدعنوانیوں اور لوگوں کے اختلاف کی جو خبریں مل رہی ہیں ان کی کیا حقیقت ہے۔ حضرت عثمان نے تمام مذکورہ علاقوں کی طرف تحقیقاتی کمیشن بھیجے۔ حضرت محمد بن مسلمہ (جو عہد عمری سے ہی مرکز خلافت میں گورنروں کے محتسب ونگراں کے عہدے پر فائز تھے) کوفہ بھیجے گئے۔ حضرت اسامہؓ کو بصرہ اور حضرت عمار بن یاسر کو مصر بھیجا گیا۔ اول الذکر دونوں نے واپس آکر رپورٹ دی کہ حکومت کے نمائندوں کے بارے میں یہ سب خبریں جھوٹی ہیں۔ ہر صوبہ میں عدل وانصاف اور نظم ونسق کا حال بہتر ہے۔ اور مسلمانوں کے اہل رائے نظام حکومت سے مطمئن ہیں۔ حضرت عمار کے بارے میں طبری کی یہ روایت کہتی ہے کہ وہ مصر کے اہل فتنہ کے کہنے میں آگئے اور ان کے ساتھ ہو گئے۔ مگر یہ عقل وقرائن کے بالکل خلاف ہے۔ دیگر تاریخی روایات بھی اس کی تردید کرتی ہیں۔ (ملاحظہ ہو: فتنۃ مقتل عثمان: ۱/ ۱۱۷)۔

مگر خطرہ بڑھتا جا تا تھا اور ذہین لوگوں کو بغاوت کی بو محسوس ہونے لگی تھی۔ ارکان حکومت میں کئی لوگوں نے حضرت عثمانؓ کو ان فسادیوں کے بعض لیڈروں کو قتل کرنے کا مشورہ دیا۔ مگر اپنی فطری نرمی کی وجہ سے، جو شاید ان کی سب سے بڑی صفت تھی، (یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کسی ہدایت یا پیشین گوئی یا کسی اور غیبی اشارہ کی بنا پر) وہ اس کے لیے تیار نہیں تھے۔ اس وقت تک مدینہ وحجاز، بلکہ اندرون عرب میں کہیں بھی افواج نہیں ہوا کرتی تھیں۔ حضرت معاویہ نے شام سے کچھ فوج مرکز اسلام کی حفاظت کے لیے بھیجنے کے لیے اجازت چاہی، مگر حضرت عثمان کہتے تھے کہ مدینہ حرمِ نبوی ہے میں اس میں جنگ وخونریزی نہیں کر سکتا (طبری: ۴/ ۳۴۱)۔

دھیرے دھیرے عاملوں اور صوبائی گورنروں کے بارے میں شکایات والزامات کے گرم بازار میں ایک نئی چیز کا اضافہ ہوتا گیا۔ یہ تھی خود حضرت عثمان کے بارے میں بے بنیاد اعتراضات واتہامات [1]۔ باغیوں نے کیا الزامات لگائے تھے، اس سلسلے میں اکثر روایات ضعیف ومنقطع یا بالکل موضوع ہیں، الزامات کی صحت تو کجا، ان روایات سے تو یہ بھی ثابت نہیں ہوتا کہ باغیوں نے یہ الزام لگائے تھے۔

اور صحیح روایات کے مطابق انہوں نے جو اعتراضات کئے تھے، ان میں حضرت عثمان کا موقف شریعت

---

[1] ان الزامات کی تحقیق پر مولانا محمد نافع صاحب نے اپنی نافع تصنیف رحماء بینہم حصۂ چہارم میں مفید علمی گفتگو فرمائی ہے۔

وحکمت کے بالکل موافق تھا۔حضرت عثمانؓ کے اقدامات کا مقصودِ اصلی دین وملت کا فروغ واستحکام ہی تھا۔ان میں سے کئی الزامات (جن کے بارے میں بخاری کی روایات بتاتی ہیں کہ باغی ٹولہ ان کو پھیلاتا پھرتا تھا) اتنے بے بنیاد اور مضحکہ خیز حد تک جاہلانہ تھے کہ اکیلے وہی یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ باغی کیسے جاہل سرپھرے تھے یا پھر یقینا بدنیت تھے [۱]۔ایک طرف ان الزامات کی معمولی حیثیت اور دوسری طرف فتنہ کے پرآشوب پھیلاؤ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پروپیگنڈے سے بے رائی کے پہاڑ کیسے بن سکتا ہے اور کسی بھی فتنہ انگیز تحریک میں جاہلوں اور جذباتی عوام کو کیسے بھڑکایا جاسکتا ہے۔

باغیوں کی خطرناک چالیں:

اس سلسلے میں ان کی ایک خطرناک تدبیر یہ تھی کہ مدینہ میں مقیم اکابر صحابہ،مثلا حضرت علی،حضرت عائشہ، حضرت طلحہ،حضرت زبیر رضی اللہ عنہم کے نام سے مختلف صوبوں کے اعیان کے نام خطوط لکھے جاتے تھے کہ عثمان نے بڑی بدعنوانیاں کر رکھی ہیں،ہم یہاں کمزور و بے بس ہیں۔لہٰذا تم لوگ بغاوت کے لیے مدینہ آؤ اور اسلام کو بچاؤ۔ان خطوط میں لوگوں سے کہا جاتا کہ یہ اس وقت کا سب سے بڑا جہاد ہے۔ان صحابہ کے علم میں جب ایسے خطوط آتے تھے تو وہ ان سے اپنی براءت ظاہر کرتے تھے۔ابن کثیر نے کئی روایات ذکر کی ہیں جو صحابہ کے نام سے جعلی خطوط کی سازش ذکر کرتی ہیں [۲]۔

حافظ ابوبکر آجری کہتے ہیں کہ باغیوں کی اس سازش کے دو مقاصد تھے۔ایک یہ کہ اس طرح وہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کے اکابر کو ہی خلیفہ اسلام سے جنگ میں لگا دیا جائے۔پھر کوئی ایسی برتر و بااثر شخصیت نہیں بچے گی جو مصالحت واتفاق قائم کر سکے گی۔دوسرے یہ کہ سبائی منافق عنصر صحابہ کی ان سب سے اہم و بزرگ تر ہستیوں کی عقیدت ومحبت کے نام پر سادہ لوح عوام کو اپنے ساتھ ملا سکتا تھا۔اور اس طرح ان کے حقیقی عزائم پر پردہ پڑ سکتا تھا (الشریعہ: ۱۹۸۹/۴)۔

حضرت علیؓ اور حضرت عائشہؓ کے نام سے جھوٹے خطوط:

صحیح سند سے ثابت ہے کہ حضرت علیؓ کے نام سے بھی ایسا خط لکھا گیا۔مصری باغیوں نے خود حضرت علیؓ سے کہا کہ آپ کے ایسے ایسے خطوط ہمارے یہاں پہنچتے تھے،تو انہوں نے حلفیہ ایسے خطوط سے براءت ظاہر

۱۔ ان الزامات کی تفصیل اور ان روایات کی سندی تحقیق کے لیے ملاحظہ ہو: فتنۂ مقتل عثمانؓ۔

۲۔ البدایہ والنہایہ: ۷/ ۱۹۴، ۱۹۶، ۲۱۸۔

کی ۱؎۔ اسی طرح صحیح سند سے ثابت ہے کہ حضرت عائشہؓ کے نام سے بھی خطوط لکھے گئے۔ اوران کا اتنا چرچا تھا کہ ام المؤمنین کے خاص شاگرد اور عظیم محدث وفقیہ حضرت مسروقؒ تک کو یہ خیال ہوگیا تھا کہ ام المومنین نے حضرت عثمان کے خلاف خطوط لکھے اور باغیوں کو اکسایا تھا۔ ایک مجلس میں ام المومنینؓ نے حضرت عثمانؓ کی مظلومانہ شہادت پر اپنے غم وغصے کا اظہار کیا تو حضرت مسروق نے عرض کیا کہ حضرت عثمان کے قتل میں آپ کے خطوط کا بھی تو کردار تھا؟ توانہوں نے بھی بڑی شدت سے قسم کھا کر کہا کہ یہ سب جھوٹ ہے، میں نے ایسا ایک بھی خط نہیں لکھا ۲؎۔

باغیوں کی مدینہ پر چڑھائی:

غرض خطرناک سازشوں اور پروپیگنڈے کے اس سیلاب کے نتیجہ میں، دھیرے دھیرے فتنہ وسرکشی میں اضافہ ہوتا رہا، یہاں تک کہ ان لوگوں نے ایک ایسے وقت میں جب کوفہ وبصرہ کے اکثر افسران، سربرآوردہ شخصیات اورافواج دور دراز علاقوں میں جہادی مہمات پر گئی ہوئی تھیں، فتنہ وبغاوت بپا کردی۔ حضرت عثمان نے ان کے نام ایک عام مراسلہ جاری فرمایا جس میں دین وامت کی خاطر پورے صبر وملاطفت کا اظہار کیا اوران کے سب مطالبات تسلیم کرکے آگ بجھا دی۔ مگر آگ ہی بجھی تھی، لگانے والے تو باقی تھے۔

آخر سن ۳۵ھ میں مصر، کوفہ اور بصرہ کے فسادیوں نے خفیہ مراسلت کے ذریعے حج کا موقعہ مدینہ پر یلغار کے لیے مقرر کیا۔ طے کیا گیا کہ وہ حجاج کے قافلوں کے ساتھ، انہی کے بھیس میں مدینہ پہنچیں گے۔ اوراس وقت تک انتظار کریں گے جب مدینہ سے بھی حج کرنے والے سب لوگ چلے جائیں، پھر حضرت عثمان کو یا تو قتل کردیا جائے گا یا کم ازکم خلافت سے دستبردار ہونے پر مجبور کردیا جائے گا۔ اس طرح ان کو کم سے کم مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا یا بلا کسی مزاحمت کے وہ اپنا مقصد حاصل کرسکیں گے۔

سازش بہت منظم اور وسیع تھی:

غرض مصر، کوفہ اور بصرہ سے ایک ایک ہزار باغیوں کی جماعت نکلی۔ سازش بڑی منظم تیار کی گئی تھی۔ ہر شہر کے باغیوں کو چار ٹولیوں میں بانٹا گیا تھا۔ اور ہر ٹولی کا ایک سردار اور چاروں سرداروں کا ایک امیر طے تھا۔ کوفہ کے باغیوں کا امیر عمرو بن الاصم، بصرہ کا امیر حرقوص بن زہیر سعدی اور مصر کا غافقی بن حرب تھا۔ مصر کے قافلہ میں اس فتنہ کا شاطر دماغ اور بانی مبانی عبداللہ بن سبا بھی تھا۔ اوراندازہ ہوتا ہے کہ سب سے شریر وسرکش گروہ

۱؎ تاریخ خلیفہ: ۱۶۸، بسند صحیح۔ مسند بزار: ۲/ ۴۴ بسند صحیح، ہیثمی: ۷/ ۲۲۹ نے بھی اس کی سند کی تصحیح کی ہے۔

۲؎ تاریخ خلیفہ: ۱۷۶، ابن کثیر کہتے ہیں کہ یہ بالکل صحیح سند ہے۔ البدایہ: ۷/ ۲۱۸۔

مصریوں ہی میں موجود تھا (طبری: ۳۴۹/۴)۔

سب سے پہلے ذی القعدہ کی پہلی شب کو مصری مدینہ پہنچے، اور دوسرے باغی بھی آگے پیچھے پہنچ گئے اور انہوں نے حضرت عثمان پر اپنے الزامات کا اعلان واظہار شروع کیا (تاریخ خلیفہ: ۱۶۸)۔ انہوں نے حضرت عثمانؓ سے بالمشافہہ گفتگو کی اور ایسے اعتراضات کیے جن کو سن کر معمولی سمجھ بوجھ رکھنے والا انسان بھی کہہ اٹھے گا کہ ایسے اعتراضات شر پسند اور احمقوں کے علاوہ کوئی نہیں کر سکتا۔ خلیفہ بن خیاط نے صحیح سند سے روایت کیا ہے کہ ان کا پہلا اعتراض یہ تھا کہ آپ نے سرکاری زمینوں میں سے کچھ زمینوں کو بیت المال کے (جہاد اور صدقے کے) اونٹوں کے چرنے کے لیے جو خاص کر دیا ہے اور پبلک کے اونٹوں کو ان میں چرنے سے روک دیا ہے، جب کہ قرآن میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے، یہ شریعت میں تحریف ہے۔

حضرت عثمان نے ان کو بتایا کہ یہ کیسی بے بنیاد بات اور ناسمجھی کا اعتراض ہے۔ انہوں نے وضاحت کی کہ حضرت عمرؓ نے بھی سرکاری اونٹوں کے لیے زمینیں خاص کی تھیں۔ میری حکومت میں بیت المال کے جانوروں کی تعداد فتوحات کی وسعت اور مالیہ کے فروغ کی وجہ سے مزید بڑھی، تو میں نے مزید زمینوں کو سرکاری جانوروں کے لیے گھروا دیا، تو اس میں کیا غلط ہے؟ ان ظالموں کی شر پسندی پر غور کیجیے؛ جزیرۃ العرب اور مصر وعراق کی لق ودق زمینوں اور چراگاہوں میں سے، جو بہر حال ریاست کی ملکیت تھیں، اگر کچھ سرکاری استعمال کے لیے مختص کر دی جائیں، تو یہ اس کو ظلم اور شریعت میں تحریف بتاتے تھے!!۔

باغی اسی طرح کے اعتراض کرتے رہے اور حضرت عثمان کے جواب ان کے لیے بالکل مُسکِت ثابت ہوتے رہے۔ آخر وہ بند ہو گئے، تو انہوں نے حضرت عثمان سے کچھ مطالبے کیے جو انہوں نے اپنی خاص شرافت وحلیم المزاجی کے مطابق مان لیے۔ اور یہ معاہدہ تحریر کروایا کہ جب ان کے مطالبے تسلیم کر لیے گئے ہیں تو پھر اب وہ کوئی فتنہ نہیں پیدا کریں گے اور اتفاق واتحاد قائم رکھیں گے۔ مصر کا باغی گروہ رضامندی کے ساتھ واپس ہو گیا[۱]۔

اسی طرح کوفہ اور بصرے کے وفد سے الگ الگ مذاکرات ہوئے اور حضرت عثمان نے ان کے اعتراضات کے جواب دے کر ان کو بھی خاموش کر دیا اور گورنروں کی تبدیلی کے ان کے مطالبے تسلیم کر لیے۔ آخر وہ دونوں گروہ بھی واپس ہوئے[۲]۔

مصری ٹولہ سب سے خطرناک تھا۔ صحیح سند سے روایت ہے کہ مصر کی جماعت مدینہ سے نکل کر ذوالمروۃ

۱۔ تاریخ خلیفہ: ۱۶۸۔۱۶۹، بسند صحیح۔

۲۔ تاریخ دمشق: ۳۲۴/۳۹ نیز مصنف ابن ابی شیبۃ: ۵۲۱/۷۔

کے مقام پر پہنچ کر رک گئی۔ حضرت عثمانؓ نے ان کی فہمائش کے لیے حضرت علی کو بھیجا، جن کے احترام و محبت کا وہ دم بھرتے تھے۔ حضرت علی نے حکومت کی طرف سے ان کے مطالبات تسلیم کیے۔ اور ان سے اللہ تعالیٰ کے نام پر عہد و پیمان لیا کہ تمہاری ساری شکایتیں دور ہو گئیں؟ انہوں نے حلفاً یقین دلایا۔ حضرت علی نے ان سے تین مرتبہ قسم لی۔ پھر انہوں نے مزید کہا کہ آپ رسول اللہ ﷺ کے چچا زاد بھائی اور امیر المومنین کے قاصد ہیں ہم کیسے آپ کی بات نہیں مانیں گے؟ [۱]۔

سازش اپنے عروج پر:

حضرت عثمان نے اس نرمی اور حلم کے ذریعہ سازشیوں کی سازش ناکام کر دی۔ مگر وہ کہاں ماننے والے تھے۔ ان کے منافق سرغنے [۲] تو کذب و افترا کی ہر ادا میں ماہر اور دجل و تلبیس کی ہر چال میں لاثانی تھے۔ انہوں نے ایک خطرناک سازش رچی۔ اس سازش کی تفصیل محدثین کی ایک صحیح روایت میں آئی ہے، صحت کی بنا پر اس کو مورخین کی روایات پر ترجیح حاصل ہے، نیز اس میں کچھ اہم انکشافات بھی ہیں جن سے اس عظیم سانحے، اس کے اسباب و عوامل اور نتائج و ثمرات کی تحقیق کے لیے رہنما خطوط بھی دریافت ہوتے ہیں۔

محدّث بزار، اسحاق ابن راہویہ اور ابن ابی شیبہ اپنی متصل صحیح سندوں سے بیان کرتے ہیں کہ بصرہ، کوفہ اور مصر کے باغی اپنے اپنے راستوں پر روانہ ہو گئے۔ ایک عجیب واقعہ یہ ہوتا ہے کہ مصری قافلہ کے سامنے ایک مشتبہ اونٹ سوار اس طرح آتا ہے کہ؛ بار بار سامنے قریب آتا ہے اور بار بار دور چلا جاتا ہے، پھر سامنے آتا ہے پھر دور بھاگ جاتا ہے، (گویا عملاً وہ ان سے کہتا ہے کہ مجھے پکڑو)۔ لوگوں نے پکڑ کر اس کی تلاشی لی تو پایا کہ اس کے پاس (حضرت عثمان کی طرف سے مصر کے گورنر کے نام) ایک خط ہے جس پر حضرت عثمانؓ کی مہر بھی ہے۔ اور اس میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ اس وفد کے فلاں فلاں سرداروں کو پہنچتے ہی قتل کر دیا جائے۔۔۔ بس پھر کیا تھا؟ مصری مشتعل ہو گئے اور خط لیے مدینہ میں آ دھمکے۔ اور ساتھ ہی بصرہ کی جماعت بھی آ گئی اور کوفہ والی بھی آ گئی۔ اور اب ان کے تیور نہایت خشم ناک تھے۔ اب وہ صاف کہتے تھے کہ عثمان نے ہمارے ساتھ غداری کی ہے اب ہم اس کو قتل کر کے ہی مانیں گے۔

سب سے پہلے یہ لوگ حضرت علی کے پاس گئے اور ان کو یہ خط دکھایا اور ان سے چاہا کہ وہ اب ان کا ساتھ دیں۔ انہوں نے انکار کیا تو انہوں نے حضرت علیؓ سے پوچھا کہ یہ بتائیے کہ پھر آپ نے ہمیں بغاوت کے

---

[۱] تاریخ خلیفہ: ۱۶۹ ا بسند صحیح، تاریخ دمشق: ۳۹/۳۲۴-۳۲۵۔

[۲] ان باغیوں کو شہادت عثمان کی پیشین گوئی سے متعلق حدیثِ صحیح میں منافق کہا گیا ہے۔

لیے خط کیوں لکھے تھے؟ حضرت علیؓ نے قسم کھائی کہ میں نے ایسا کوئی خط نہیں لکھا تو وہ لوگ آپس میں کہنے لگے کہ ''لو! یہ ہیں وہ، جن کو خلیفہ بنانے کے لیے تم لوگ لڑنے آئے ہو!!''۔ (اس جملے سے بھی پتہ چلتا ہے کہ لوگوں کو حضرت علیؓ کو خلیفہ بنانے کے نام پر بے وقوف بنایا جا رہا تھا)۔

باغی یہی خط لیے حضرت عثمان کے پاس پہنچے تو انہوں نے قسم کھا کے فرمایا: یہ صاف جھوٹا خط ہے۔ اور مہر نقلی بنائی جا سکتی ہے [۱]۔

یہ خط جعلی تھا:

باغیوں کے منافق سرداروں نے مصری گورنر کے نام حضرت عثمان کے خط کی جو کہانی تیار کی تھی، یہ مورخین کی کتابوں میں بھی آئی ہے۔ ان روایتوں میں ہے کہ یہ خط حضرت عثمان کے سکریٹری مروان نے (حضرت عثمان کو بغیر بتائے ان کی طرف سے) لکھا تھا۔ اس طرح سیدنا عثمانؓ کی شہادت کی ذمہ داری مروان پر ڈال دی گئی۔ مگر اس روایت میں کذب وافترا کی داخلی شہادتیں موجود ہیں۔ ایسا کوئی خط ہرگز نہیں لکھا گیا تھا، اور نہ ایسا کوئی قاصد بھیجا گیا تھا۔ بلکہ یہ خط سبائیوں ہی کی سازش تھی اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ ان کے کاروبار میں جعلی خطوط بکثرت لکھے اور بھیجے جاتے تھے۔ ابھی گذرا کہ مصر کے لوگوں تک حضرت علیؓ کے نام سے جعلی خطوط پہنچے تھے اور حضرت عائشہؓ کے نام سے بھی جعلی خطوط لکھے جاتے تھے۔

(۱) اگر حضرت عثمانؓ یا ان کے کسی مدار المہام (مروان) نے ایسا خط بھیجا ہوتا تو کیا وہ اس کے لیے کسی ایسے ابلہ واحمق قاصد کا انتخاب کرتے جو اسی راستہ سے مصر جاتا جو مصری باغیوں کا راستہ تھا؟ کیا وہ کسی دوسرے رستے سے نہیں جا سکتا تھا؟ اور کیا حضرت عثمان یا ان کے مدار المہام معتمد نے اس قاصد سے نہ کہا ہوگا کہ مصری باغیوں کی جماعت سے بچ کر جانا؟

(۲) پھر اگر وہ اسی راستے سے جا بھی رہا تھا تو، وہ (جیسا کہ روایت میں صراحت ہے) بار بار قریب آ آ کر اور پھر ہٹ ہٹ کر اپنی گرفتاری کی دعوت کیوں دے رہا تھا؟؟

(۳) پھر طرفہ یہ بھی ہے کہ باغی اس قاصد کو گرفتار کر کے مدینہ نہیں لاتے، کہ ان کے دعوے کی پختہ شہادت بنے!! کیا یہ فطری طور پر لازمی نہیں تھا کہ اگر ایسا کوئی قاصد پکڑا جاتا، تو وہ ثبوت کے طور پر مدینے لایا جاتا؟ آج تک کوئی نہیں بتا سکا کہ وہ قاصد کون تھا، اور اس کو زمین کھا گئی کہ آسمان نگل گیا؟

---

[۱] مسند بزار: ۲/۴۲، بسند صحیح، مصنف ابن ابی شیبہ: ۷/۵۲۰ بسند صحیح، نیز مسند اسحاق بن راہویہ بحوالہ المطالب العالیہ: ۴۳۷۲، ابن حجر کہتے ہیں: یہ ثقات کی متصل سند ہے۔

(۴) اور سب سے اہم بات یہ کہ مدینہ سے بصرے کا راستہ الگ تھا، کوفہ کا الگ سمت میں اور مصر کا بالکل ہی الگ جانب۔ کہا جاتا ہے کہ مصری جماعت کو مصر کے راستے میں یہ قاصد ملا۔ مگر "شان دار" بات یہ ہے کہ ان کے ساتھ ہی دونوں الگ الگ راستوں سے دور تک جا چکنے والے کوفہ کے لوگ بھی واپس آ گئے اور بصرے کے بھی!!! حضرت علی نے اسی بنیاد پر کہہ دیا تھا کہ "خط کی یہ پوری سازش مدینہ ہی میں تیار کر لی گئی تھی۔ اس لیے کہ تم لوگ اپنی الگ الگ راہوں پر کئی دن کا سفر کر چکے تھے۔ پھر بتاؤ اے بصرے والو! تم کو کیسے اس خط کا پتہ چلا؟ اور اے کوفہ والو تم کیسے ساتھ آ گئے؟" حضرت علی نے ان سے کہا کہ تم سب کے واپس آ جانے سے پتہ چلتا ہے کہ مدینہ ہی میں سازش رچ لی گئی تھی کہ اتنے وقت پر واپس آ کر فتنہ کرنا ہے (طبری: ۴/۳۵۱)۔

حافظ ابن کثیر اس خط کو باغیوں ہی کی سازش سمجھتے ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ کے نام سے یہ جعلی خط تیار کیا گیا تھا، نہ انہوں نے لکھوایا تھا نہ ان کو اس کا پتہ تھا، جس طرح اس سے پہلے حضرت علی، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر وغیرہ کے نام سے جھوٹے خطوط لکھے گئے اور باغیوں کے نام بھیجے گئے تھے۔

(البدایہ والنہایہ: ۷/۱۹۶)۔

خط کی کہانی صرف باغیوں کی سازش تھی:

مورخین کی وہ روایات جن میں اس حرکت کا ذمہ دار مروان کو قرار دیا گیا ہے، محدثین کی صحیح روایت کے مقابلہ میں ناقابل قبول ہیں۔ بے تحقیق نقل کے عادی مورخوں، مصنفوں نے اس کو قبول کر لیا ہے۔ اور اس بہانے حضرت عثمانؓ کے نظام حکومت کو بدنام کیا ہے۔ یہ قطعاً خلاف عقل ہے۔ مروان جو دنیا کے سب سے طاقت ور حکمراں کے سکریٹری، مدار المہام تھے، کیا ایسے کم عقل ہو سکتے تھے؟ وہ ایسی بر خود غلط حرکت کیسے کر سکتے تھے، جس کے نتیجہ میں حضرت عثمان شہید ہو گئے؟

مروان کا شمار (ابن حجر سمیت بہت سے علماء کے نزدیک) صحابہ میں ہے۔ اور اگر وہ صحابی نہیں بھی ہیں، تو بھی ان کی ثقاہت وامانت پر تمام سلف کا اتفاق ہے۔ محدثین ان کو صدق وامانت سے متصف کبار علماء میں بتاتے ہیں۔ عہد صحابہ ہی میں وہ صاحب علم شخصیت کے طور پر معروف تھے۔ اور اس درجہ کے اصحاب افتاء میں شمار ہوتے تھے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت عبداللہ بن عمروؓ کے ساتھ ان کی علمی آراء اور فتوے نقل کیے جاتے تھے [۱]۔ وہ حضرت ابو ہریرہؓ جیسے صاحب علم شخصیت کی آراء پر تنقید کرتے تھے اور تحقیق کے بعد حضرت

۱۔ مثلاً ملاحظہ ہو موطا، باب ما جاء فیمن احصر بغیر عدو۔

ابو ہریرہؓ اپنی رائے سے رجوع کرتے تھے[۱]۔ تمام تابعی علماء ان کی علمی شخصیت کے معترف تھے۔ بخاری اور دیگر ائمہ نے ان سے حدیثیں روایت کی ہیں۔ خصوصاً امام مالک تو ان کے فتووں اور عدالتی فیصلوں کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ اور ان کو شرعی استدلال میں پیش کرتے ہیں۔ تو ایک ثقہ شخص جو بالاتفاق قابل احترام واعتبار ہے، کس طرح اتنی بڑی افترا اور غدر کی کارروائی کیسے کرسکتا ہے؟ اس کو متہم گردانا حقائق سے ناواقفی کا نتیجہ ہے۔

غرض خط کی کہانی باغیوں کی تیار کردہ کہانی تھی، اس کی آڑ لے کر مروانؒ پر الزام دھرنا حقیقت میں منافق باغیوں کے لیے جواز پیدا کرنا اور ان کے کرتوت کی شناعت کو ہلکا کرنا ہے۔

سنگ دلانہ محاصرہ اور مظلومانہ شہادت:

غرض اس جھوٹے خط کو بہانہ بنا کر اس مرتبہ ان لوگوں نے حضرت عثمان کے گھر کا محاصرہ کرلیا اور ان کو مجبور کرنے لگے کہ یا تو خلافت سے دستبردار ہوجائیں یا قتل کے لیے تیار ہوجائیں۔ یہ محاصرہ قریبا چالیس دن چلا (البدایہ والنہایۃ: ۷/ ۱۸۴)۔ مدینہ پر باغیوں کا ایسا قبضہ تھا کہ مسجد نبوی میں نماز بھی ان کا کوئی لیڈر پڑھاتا تھا (بخاری: ۶۹۵)۔ خلیفۃ المسلمین وامیر المومنین ایسا مظلوم تھا کہ اس تک کھانا پانی بھی نہیں پہنچتا تھا۔ حضرت علیؓ اور بعض دیگر صحابہ کرام کھانا پہنچوانے کی کوشش کرتے، مگر وہ کبھی کامیاب ہوجاتی اور کبھی ناکام۔ حضرت عثمان کے دفاع کے لیے نوجوان صحابہ مثلاً حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن زبیر، حضرات حسنین، حضرت ابو ہریرہ اور ابوامامہ بن سہل رضی اللہ عنہم اور صحابہ کے نوجوان صاحب زادگان کی ایک ٹیم پہرے پر موجود رہتی تھی۔ ایک دن حضرت عثمان نے حضرت علی کو بلوایا، وہ آئے، مگر باغیوں نے جانے نہیں دیا[۲]۔

بغاوت کے شروع کی بات ہے، ایک دن مسجد میں حضرت عثمانؓ نے رسول اللہ ﷺ کی احادیث ذکر کر کے لوگوں کو یاد دلایا کہ جو مجھے شہید کرے گا حضور ﷺ نے اس پر لعنت کی ہے۔ باغیوں کی سرکشی میں اس سے بھی فرق نہیں پڑا۔ ان کے بعد حضرت محمد بن مسلمہؓ اور حضرت زید بن ثابتؓ نے بھی اپنی سنی کچھ حدیثیں سنانی چاہیں، مگر بدمعاشوں نے ان کو بھی پکڑ کر بٹھا دیا[۳]۔ چند دنوں ہی میں باغیوں نے حضرت عثمان کو اپنے گھر میں محصور کردیا۔

حضرت عثمان نے گھر کے باہر آ کر باغیوں پر حجت تمام کرنے کی آخری کوششیں بھی کیں۔ باغیوں کو اپنے وہ فضائل یاد دلائے جو لسان نبوت سے لوگوں نے سنے تھے اور صحابہ کرام اس کے گواہ تھے۔ نیز اپنے وہ

---

[۱] موطا باب صیام الذی یصبح جنبا۔
[۲] فتنۃ مقتل عثمان: ۱۹۱۔ ۲۰۳۔
[۳] طبری: ۴۰۰/ ۳۵۳۔

کارنامے بھی یاد دلائے جو انہوں نے اسلام اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نصرت و مدد کے سلسلے میں انجام دیے تھے۔ (سنن ترمذی ۳۶۹۹۔ ۳۷۰۰ بسند صحیح)۔ مگر:

بگڑتی ہے جس وقت ظالم کی نیت نہیں کام آتی دلیل اور حجت

لیکن حضرت عثمان نے طے کیا ہوا تھا کہ وہ صرف مذاکرات سے ہی مسئلہ حل کرنے کی کوشش کریں گے۔ شہادت قبول کرلیں گے، مگر طاقت کا استعمال نہیں کریں گے اور نہ محبت کرنے والے فدا کاروں کو اس کی اجازت دیں گے۔ انہوں نے حضرت عبداللہ بن زبیر کو اپنے گھر کے باہر پہرے داروں کا امیر بنایا تھا، اور کہا تھا جو میری اطاعت ضروری جانتا ہے وہ عبداللہ بن زبیر کی بات مانے۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے باصرار درخواست کی کہ ان باغیوں سے جنگ کی جائے۔ مگر حضرت عثمان نے کہا: اللہ کی قسم، میں ہرگز تلوار نہیں اٹھاؤں گا۔ میری سب سے بڑی مدد یہی ہے کہ تلوار نہ اٹھائی جائے۔ ابن سیرین سے صحیح سند سے روایت ہے کہ حضرت عثمانؓ کی مدد کے لیے مدینہ کے سات سو لوگوں کی ایک جماعت تیار تھی۔ مگر حضرت عثمانؓ نے ان کو اپنے امیر ہونے کی حیثیت سے منع فرما دیا[۱]۔ جتنا صحابہ ان سے اصرار کرتے تھے کہ وہ باغیوں سے مقابلہ کی اجازت دیں اتنا ہی ان کا شدت کے ساتھ حکم ہوتا کہ اگر تم امیر کے مطیع ہو تو خبردار تلوار نہ اٹھانا۔ انصار کی جماعت آئی اور اس نے بھی (دروازے کے باہر سے) کہلایا: ہم مقابلے کے لیے تیار ہیں، بس آپ کی اجازت کی دیر ہے۔ مگر حضرت عثمان نے ان کو واپس کر دیا[۲]۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے رہا نہیں گیا، وہ تلوار لے کر گھر کے اندر پہنچ گئے، کہ اب یہیں رہیں گے۔ مگر حضرت عثمان نے ان کو حکم دے کر واپس کر دیا (تاریخ خلیفہ: ۱۷۳)۔

اور پھر وہ ہوا جس سے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا محبوب، رفیق کار و مددگار، آپ کا عزیز وقریب، دو دو بیٹیوں کا شوہر اور خلیفۃ المسلمین و امیر المومنین بے دردی اور نہایت شقاوت سے شہید کر دیا جاتا ہے۔ یہ ایک دل دوز و الم انگیز حادثہ تھا، جس کے منحوس اثرات اور اجتماعی عقوبت سے امت بچ نہیں سکی۔

سازش اور بغاوت کے سرغنوں کو حدیث میں منافق کہا گیا ہے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحیح احادیث کی پیشین گوئی کے مطابق یہ سازش اصلاً منافقین کی تھی۔ حضرت عائشہؓ بیان کرتی تھیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عثمانؓ سے فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ تم کو خلافت کی قباء پہنائے گا۔ اگر

۱۔ فضائل الصحابۃ: ۲۷۷، الطبقات الکبریٰ، ط دار صادر: ۳/ ۷۰، بسند صحیح، نیز تاریخ دمشق: ۳۹/ ۳۹۵ بحوالہ ابن سعد۔
۲۔ حوالۂ بالا، نیز تاریخ خلیفہ: ۱۷۳۔ متعدد قوی روایات میں اس طرح کے واقعات آئے ہیں، ملاحظہ ہو فتنۃ مقتل عثمان ۱۹۱۔ ۲۰۵۔

منافقین تم کواس سے دستبردار ہونے پر مجبور کریں توتم دستبردار نہ ہونا، یہاں تک کہ مجھ سے آملنا (یعنی شہید ہوجانا)۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت عثمان سے یہ بات تین مرتبہ فرمائی ۱۔ (اور جیسا کہ روایت آتی ہے) محاصرے سے پہلے ہی حضرت حذیفہؓ نے شہادت عثمان کی پیشین گوئی کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ ان کے قاتل، واللہ، جہنمی ہوں گے۔

یہ یک طرفہ صبر وسپر اندازی کیوں:

اس سوال کے سامنے تاریخ نویسی حیران ہے کہ ان شری باغیوں کا تلوار سے مقابلہ کیوں نہیں کیا گیا۔اس کے برعکس جن لوگوں نے مقابلہ کا عزم بھی کیا، حضرت عثمان ان کو شدید اصرار اور قطعی حکم کے ذریعہ روکتے رہے۔ اس یک طرفہ صبر اور شہادت کے لیے آمادگی کا، سب سے قوی بلکہ اصل، سبب یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان سے عہد لیا تھا کہ وہ اس ''فتنے'' میں صبر کریں گے۔حضرت عثمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی واضح پیشین گوئیوں کی بنا پر یہ جانتے تھے کہ تکوینی طور پر یہ ان کی شہادت کا وقتِ مقرر ہے۔اس فتنہ کو کوئی روک نہیں سکتا۔جیسا کہ ابھی گزرا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت عثمانؓ سے فرمایا تھا کہ اگر منافقین تم کو خلافت سے دستبردار ہونے پر مجبور کریں تو تم دستبردار نہ ہونا، یہاں تک کہ مجھ سے آملنا (یعنی شہید ہوجانا)۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت عثمان سے یہ بات تین مرتبہ فرمائی تھی حضرت ابوسہلہؓ، جو حضرت عثمان کے مولیٰ تھے، بیان کرتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ کا جب باغیوں نے محاصرہ کرلیا اور لوگ ان سے اجازت چاہتے تھے کہ ہمیں مقابلے کی اجازت دی جائے تو وہ شدت سے منع کرتے تھے۔اور کہتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مجھ سے ایک عہد لیا تھا، میں اب صبر کروں گا اور اس عہد کی پاس داری کروں گا۔ فلما كان يوم الدار قلنا: ألا تقاتل؟ قال: لا، إن رسول الله ﷺ عهد الى أمرا، فأنا صابر نفسي عليه ۲۔ظاہر بات ہے کہ پھر اب مقابلہ آرائی کی کیا گنجائش تھی۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے پیشین گوئی فرمائی تھی کہ مسلمانوں کا ایک برحق وعادل خلیفہ اس حال میں شہید کیا جائے گا کہ وہ برحق ہوگا، ذمہ داری اور حق ادا کرنے والا ہوگا، لیکن وہ صبر کے ساتھ شہادت قبول کرلے گا ۳۔اس کی قوی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ ابھی مصری باغی فوج مدینہ پہنچی بھی نہیں تھی، کہ لوگوں نے فتنوں کے سب سے بڑے عالم اور اس سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے محرم راز اور آپ کی پیشین گوئیوں سے سب سے زیادہ واقف صحابی حضرت حذیفہؓ بن الیمانؓ سے دریافت کیا کہ آپ کا اس صورت حال کے بارے میں کیا کہنا ہے؟ تو انہوں

---

۱ مسند احمد: ۲۴۵۶۶ بسند صحیح۔

۲ مسند احمد: ۲۴۲۵۳، بسند صحیح، نیز مستدرک: ۳/۱۰۶، امام ذہبی نے بھی اس کو صحیح قرار دیا ہے۔

۳ مستدرک: ۸/۴۵۴۴، ذہبی نے بھی اس کی تصحیح کی ہے۔ نیز مسند احمد: ۱۶۹۷۳۔

نے بھی یہ نہیں فرمایا کہ ان باغیوں کے مقابلہ کے لیے تیاری کرنی چاہیے، بلکہ فرمایا:

یقتلونہ واللہ. فقالوا این ھو؟ قال فی الجنۃ. فقالوا فأین قتلتہ؟ قال: فی النار واللہ.

یعنی اللہ کی قسم، یہ باغی امیر المومنین عثمانؓ کو قتل کرڈالیں گے۔ اور یہ جنتی ہوں گے۔ اور قاتل خدا کی قسم جہنمی ہوں گے [1]۔

حضرت عثمان اس تکوینی فیصلے کو جانتے تھے اور مقابلے کو بے سود، نقصان دہ، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کے خلاف سمجھتے تھے۔

---

[1] مصنف ابن ابی شیبہ: ۵۱۶/۷، المعرفۃ والتاریخ: ۷۶۲/۲ مصنف حافظ یعقوب بن سفیان الفسوی نے اس کی تصحیح کی ہے ۲-۷۶۸، نیز ملاحظہ ہو فتنۃ مقتل عثمان: ۴۷۵/۱۔

ساتواں باب

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ
سیدنا حضرت علی مرتضیٰؓ کے دور خلافت میں

حضرت علیؓ کی خلافت:

حضرت عثمانؓ کے بعد امت میں حضرت علیؓ ہی منصب خلافت و امارت کے سب سے زیادہ مستحق تھے۔ مگر حضرت عثمانؓ کی شہادت کے ہوش ربا واقعہ سے اہل مدینہ دہل گئے تھے۔ پھر یہ واقعہ جس سنگ دل اور وحشیانہ شکل میں پیش آیا وہ بڑی روح فرسا صورت تھی۔ باغی ہفتوں تک مدینۃ الرسولؐ میں دندناتے پھرتے تھے۔ ظلم و شقاوت کے ان کے کرتوت روضۂ رسول کے عین قریب انجام پائے تھے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حادثہ وفات کے بعد سے مدینہ میں کبھی ایسی حواس باختہ کرنے والی حالت نہیں ہوئی تھی۔

ایسے وقت میں حضرت علی کی بیعت خلافت انجام پائی۔ مدینہ پانچ دنوں تک باغیوں کے زیر تسلط رہا۔ غافقی بن حرب ان کا حاکم بنا بیٹھا تھا۔ جہاں تک اکابر صحابہ کا تعلق تھا ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ اب ان باغیوں کو (غالبا) خوف ہوا کہ اگر انھوں نے ہی کسی کو امیر نہیں بنایا تو شام سے یا کہیں اور سے ان کے خلاف کوئی تحریک یا انتقامی کارروائی نہ ہوجائے [۱]۔ اس لیے اب باغیوں نے کبار صحابہ (حضرات علی، طلحہ، زبیر اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم وغیرہ) سے خلافت قبول کرنے پر شدید اصرار کیا۔ مگر سب انکار کرتے اور ان لوگوں سے چھپنے کی کوشش کرتے رہے۔ اور وہ بار بار ان کو ڈھونڈھ کر خلافت قبول کرنے کا زور ڈالتے رہے۔ یہ حضرات بھاگ بھاگ کر آبادی سے باہر باغوں میں چھپتے پھرتے تھے، اور ان سے اپنی براءت کا اظہار کرتے تھے [۲]۔

۱۔ ان کے لیے یہ اندیشہ محسوس کرنے کے حقیقی اسباب موجود تھے۔ حضرت معاویہؓ نے حالات کی خبر پاکر ایک فوج مدینے بھیجی تھی، وہ راستے ہی میں تھی کہ شہادت کی خبر پہنچی، سو وہ واپس ہولی۔ عین ممکن تھا کہ اگر نئے خلیفہ کے تقرر میں دیر ہوتی تو کوئی اور اقدام ہوتا۔

۲۔ ملاحظہ ہو۔ طبری: ۴/ ۴۳۲، البدایہ والنہایہ: ۷/ ۲۵۳۔

باغیوں کی حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کو دھمکی:

حضرت علی شروع میں ان حالات میں خلیفہ بننے پر راضی نہیں ہوئے۔ بلوائی کسی نہ کسی طرح، چاہے زبردستی سہی، کسی کو خلیفہ بنا کر اس کی آڑ میں اپنے کو محفوظ کرنا چاہتے تھے۔ وہ آپس میں کہتے تھے کہ اگر ہم (اپنے زیر قوّت ونگرانی) کسی کو خلیفہ بنائے بغیر یہاں سے چلے گئے تو پھر ہماری خیر نہیں ہے۔ نئی حکومت ضرور ہمارا تعاقب کرے گی (البدایۃ والنہایۃ: ۷/ ۲۵۳)۔ انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ پر زور ڈالا۔ صحیح سند سے روایت ہے کہ حضرت حسن بصریؒ (جو اس وقت مدینہ ہی میں تھے) بیان کرتے ہیں کہ پہلے باغیوں نے حضرت عبداللہ سے نرمی سے بات کی۔ انہوں نے انکار کیا۔ تو انہوں نے ان کو ترغیب اور لالچ کے ذریعے راضی کرنا چاہا۔ پھر دھمکیاں دیں۔ مگر وہ منع کرتے رہے۔ آخر باغیوں نے ان کو دھمکی دی کہ بیعت کرلو ورنہ ہم تم کو بھی قتل کر دیں گے۔ مگر وہ کسی طرح راضی نہیں ہوئے [۱]۔

حضرت علی کی بیعت کا واقعہ:

آخر انہوں نے حضرت علی پر سخت زور ڈالا۔ وہ حضرت علی کے کوئی پر خلوص عقیدت مند نہیں تھے۔ بلکہ اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتے تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ ان باغیوں کے اصل مقصد کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

قاتلان بجز آنکہ پناہے بحضرت مرتضیٰؓ برند وبا او بیعت کنند علاجے نیافتند، پس درباب عقد خلافت او از ہمہ بیشتر سعی کردند ودم موافقت اوزدند۔ (قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین ص: ۱۴۳ مطبوعہ مجتبائی پریس دہلی)

قاتلان عثمان کو اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں سمجھ میں آیا کہ وہ حضرت علی کو اپنی پناہ بنائیں اور ان کی بیعت کریں، اسی لیے انہوں نے ان کی خلافت قائم کرنے میں سب سے زیادہ سعی وکوشش کی۔ اور ان کی موافقت کا خوب دم بھرا۔

امام احمد فضائل الصحابہ میں ایک ایسی سند سے جس کے تمام راوی ثقہ اور قابل اعتماد ہیں، حضرت محمد بن الحنفیہ کا بیان نقل کرتے ہیں کہ میں اس وقت اپنے والد سیدنا حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس ہی تھا جب شہادت عثمان کی خبر موصول ہوئی، حضرت علیؓ اپنے گھر کے اندر تشریف لے گئے اور دروازہ بند فرما لیا۔ لوگ دروازے پر جمع ہو گئے۔ انہوں نے دروازہ پیٹ پیٹ کر بلوایا اور حضرت علیؓ سے کہا کہ: یہ صاحب قتل ہو گئے ہیں۔ کوئی خلیفہ ہونا ضروری ہے۔ اور آپ سے زیادہ اس کا مستحق ہم کسی کو نہیں سمجھتے۔ حضرت علیؓ نے کہا کہ بھائی مجھے معاف رکھو، میں امیر کے بجائے وزیر ومعاون کے طور پر بہتر رہوں گا۔ مگر ان لوگوں نے اصرار کیا تو حضرت علیؓ نے فرمایا کہ اگر ایسا ہی اصرار ہے، تو میں گھر میں بیعت نہیں کروں گا۔ میں مسجد جاتا ہوں، جو چاہے گا بیعت

[۱] فضائل الصحابہ: ۲/ ۸۹۵۔ کتاب کے محقق نے اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے۔ نیز السنۃ لابی بکر الخلال: ۲/ ۴۱۱ بسند صحیح۔

کرلے گا۔ فمن شاء ان یبایعنی بایعنی (یعنی بیعت میں کوئی جبروزبردستی نہیں ہوگی)۔آپ مسجد تشریف لے گئے وہاں لوگوں نے (اعلانیہ اور عمومی طور پر) ان سے بیعت خلافت کی ا۔

اس روایت کے بارے میں چند امور قابل لحاظ ہیں:

(۱) حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیعت کس طرح انجام پائی۔ یہ اس سلسلہ کی واحد صحیح روایت ہے۔ تمام راوی ثقہ اور سلسلۂ سند متصل ہے۔ اور واقعہ بیان کرنے والے حضرت علی کے صاحبزادۂ محترم حضرت محمد بن الحنفیہ ہیں۔ اور وہ کہہ رہے ہیں کہ اس وقت والد محترم کے ساتھ ہی تھا۔ امام احمد بن حنبل نے اسی خصوصیت وامتیاز کی وجہ سے اس روایت کو بہت اہمیت دی ہے۔ اور اس کی طرف علماء کو متوجہ فرمایا ہے۔ ان کے خاص شاگرد اور ان کے علوم کے ناقل وامین ابوبکر الاثرم بیان کرتے ہیں کہ مجھ سے امام احمد نے یہ روایت اپنی سند سے بیان کرتے ہوئے کہا کہ اس کو لکھ لو یہ حضرت علی کی خلافت کے سلسلے میں حسن (یعنی طاقتور اور صحیح) روایت ہے ۲۔

(۲) حضرت علی نے اس موقعہ پر جو معذرت فرمائی، وہ اسی بنا پر فرمائی کہ اکیلے ان لوگوں کے بنانے سے وہ خلیفہ بننے کو پسند نہیں فرماتے تھے۔ ورنہ اس ذمہ داری کو قبول کرنے کے لیے تو وہ سیدنا حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد بھی پورے طور پر آمادہ تھے۔ ان کا پوری دیانت وامانت داری کے ساتھ احساس تھا (اور صحیح احساس تھا) کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانشینی اور امت کی دینی ودنیاوی رہنمائی وسربراہی کی اہلیت رکھتے ہیں۔ وہ اس راستے سے خدمت اسلام اور مزید قرب الٰہی کے طالب تھے۔ ان کے فضائل ومناقب اور خصوصاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابت کا جو خصوصی رشتہ ان کو حاصل تھا، وہ اہل ایمان میں ان کی خاص محبوبیت ومقبولیت کا سبب تھا۔

(۳) سیدنا حضرت علیؓ نے ان لوگوں کے اصرار کا جو جواب دیا وہ بہت قابل لحاظ ہے۔ انہوں نے اس سے قطعی انکار کردیا کہ وہ صرف ان کے ساتھ امر خلافت طے فرمائیں۔ بلکہ کہا کہ بیعت مسجد میں ہوگی۔ اور اس میں کسی کو مجبور نہیں کیا جائے گا۔ پھر یہ روایت بتاتی ہے کہ ایسا ہی ہوا۔ حضرت علی مسجد تشریف لے گئے اور

ا فضائل الصحابہ: ۲/ ۵۷۳۔

۲ الشریعۃ للآجری: ۴/ ۱۷۶۰۔ آجری نے اس کو ابوبکر اثرم سے عبداللہ بن محمد الواسطی کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ یعنی امام احمد کا یہ قول صحیح ومتصل سند سے مروی ہے۔ واضح رہے کہ امام احمد کے دور میں حسن صحیح سے الگ ایک اصطلاح کے طور پر عام اور متداول نہیں ہوئی تھی۔ قوی، حسن، صحیح ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے تھے۔ ملاحظہ ہو سیر اعلام النبلاء: ۱۳/ ۲۱۴۔

لوگوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت وخلافت کی۔اور کسی کو مجبور نہیں کیا گیا۔

(۴) اس صحیح روایت سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ تاریخی مآخذ میں بھی یہ جو روایت مذکور ہے کہ حضرت زبیرؓ اور حضرت طلحہؓ کی گردنوں پر تلوار رکھ کر بیعت کروایا گیا۔وہ غلط ہے۔یہ روایات منقطع وضعیف ہیں،نیز دیگر تاریخی روایات کی اکثریت بھی اس کے خلاف ہے۔

لیکن یہ بھی ثابت ہے کہ انہوں نے بیعت مجبوراً کی تھی۔جن حالات میں یہ بیعت ہوئی اور جس طرح باغیوں کے سائے میں ہوئی،یہ حضرات اس کو ناپسند کرتے تھے۔ابن ابی شیبہ اور نُعیم بن حماد نے صحیح سند سے روایت کیا ہے کہ حضرت علیؓ کو یہ کہیں سے خبر ملی کہ حضرت طلحہ کہہ رہے ہیں کہ میں نے اس حال میں بیعت کی کہ تلوار گردن کے اوپر تھی۔انہوں نے حضرت ابن عباسؓ کو اہل مدینہ سے تحقیق کے لیے بھیجا۔ابن عباس حضرت اسامہؓ سے ملے۔انہوں نے بتلایا کہ تلوار والی بات تو میں نہیں جانتا،لیکن ہاں انہوں نے ناپسندیدگی کے ساتھ بیعت کی تھی ۱؎۔

خلافت قبول فرمانا حضرت علیؓ کا کارنامہ اور احسان:

حضرت علیؓ کی خلافت کی پیشین گوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہے۔لہٰذا ان کو یہ ذمہ داری سنبھالنی ہی تھی۔غور کیجیے تو سیدنا حضرت علیؓ نے اس پر آشوب وقت میں خلافت قبول فرما کر امت پر بڑا احسان فرمایا۔اگر وہ اس وقت خلافت قبول نہ فرماتے تو اور نہ جانے کتنا انتشار ہوتا۔اِن باغیوں کے قبائل بھی ان کے مددگار ہو سکتے تھے۔پھر شاید یہ شریر عناصر پورے عالم اسلام میں دندناتے پھرتے۔حضرت عثمانؓ کی مظلومانہ شہادت،دار الخلافت کی بے بسی اور حرمت مدینہ کی تاراجی سے مسلمانوں کا اعتماد بری طرح ہل گیا تھا۔یہ تاریخ اسلام کا ایک نازک موڑ تھا۔جہاں سے حالات کا سفر کسی تباہ کن انجام کی جانب بھی ہو سکتا تھا۔

سیدنا حضرت علیؓ کی خلافت پر اگرچہ امت کا اتفاق نہیں ہو سکا اور نہ اسلام کی وہ قوت واپس آسکی جو عہد عمری اور عہد عثمانی میں قائم ہوئی تھی،لیکن روحِ دین سلامت رہی اور اسلام کا بنیادی فکر وعقیدہ اور دین کا اخلاقی وشرعی نظام محفوظ رہا۔اور امت مسلمہ کا سواد اعظم صحیح اسلامی جذبہ سے معمور اور اسلامی اقدار کا معترف وحامل رہا۔اس طرح معاشرے کا خمیر فاسد ہونے سے بچ گیا اور اس کے قلب وضمیر دین وشریعت کے لیے سازگار رہے۔اگر حضرت علیؓ خلافت قبول نہ فرماتے تو خلافت کا جو ادارہ آئندہ سیکڑوں سال تک متحد رہا،اور امویوں اور عباسیوں کے دور میں دین وشریعت کی تدوین وتعلیم کا جو کارنامہ انجام پایا نیز اسلامی تہذیب کی جو

۱؎ مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۷۷۰۳،الفتن لنعیم بن حماد: ۱/۱۵۹ بسند صحیح۔

ترقیاں ہوئیں، کہا نہیں جا سکتا تھا کہ وہ پورا سلسلہ یوں ہی وجود میں آتا۔

قاتلوں کی دار و گیر کا مطالبہ:

حضرت عثمانؓ کا سفاکانہ قتل ایک سادہ قتل نہیں تھا۔ بلکہ بلا کسی جواز بغاوت کا اقدام تھا۔ یہ فساد فی الارض اور اسلامی ریاست کی بالادستی اور writ کے خاتمے کی کوشش تھی۔ اس لیے ملک میں ہر طرف بے چینی تھی۔ شام میں چوں کہ مفسدوں اور عبداللہ بن سبا کی جماعت کا کوئی اثر نہیں تھا اور حضرت معاویہ کی حکومت بڑی مستحکم تھی، ساتھ ہی یہاں کی افواج ان کے تابع اور پوری طرح مطیع و وفادار تھیں، اس لیے وہاں قیام پذیر صحابہ وارکان حکومت اور عوام کا سخت مطالبہ تھا کہ قاتلانِ خلیفۂ اسلام کو جلد کیفر کردار تک پہنچایا جائے۔ اسی طرح کوفہ، بصرہ اور مصر میں بھی بہت بے چینی پائی جاتی تھی اور انتشار کے حالات تھے [۱]۔

مطالبہ باغیوں اور مفسدین کو سزا دینے کا تھا:

مدینہ میں حضرت طلحہ و حضرت زبیر خلیفۂ اسلام کے بعد سب سے محترم اور اہم شخصیتیں تھیں۔ بیعت مکمل ہونے کے فوراً بعد یعنی ۳۶ھ کے بالکل ابتداء میں یہ دونوں حضرات اور دیگر بڑے صحابہ نے حضرت علی سے کہا کہ اب حکومت کے لیے ضروری ہے کہ وہ فوراً اس باغی جماعت کی سرکوبی اور قاتلوں کو سزا دینے کے اقدامات کرے۔ اس سلسلے میں ان حضرات (بلکہ باغیوں کی سرکوبی کا شدت سے مطالبہ کرنے والے تمام حضرات) کے نقطۂ نظر کی صحیح ترجمانی حضرت زبیرؓ نے یوں فرمائی کہ:

> یہ محض قتلِ خلیفہ نہیں ہے۔ اگر اس کے مجرموں کو سزا نہیں دی گئی تو اس سے خلافت کا ادارہ سخت کمزور ہو جائے گا (توھین سلطان اللہ بیننا ابدا)۔ اگر ان کی سرکوبی نہیں ہوئی تو ایسے بدمعاشوں کی جرأت اور بڑھے گی۔ (طبری ۴/۴۶۱۔)

جن لوگوں نے اس کو صرف قتل اور قصاص کا مسئلہ سمجھا ہے انہوں نے مسئلہ کو بڑی سادہ نظر سے دیکھا ہے۔ یہ قتل نہیں، قتلِ خلیفہ تھا، اور سادہ قتل نہیں بغاوت تھی۔ حضرات طلحہؓ و زبیرؓ نے اس کی خطرناکی کو ''توھین سلطان اللہ بیننا ابدا'' (ہمیشہ کے لئے اسلامی خلافت کا کمزور ہو جانا) کہہ کر بیان کیا ہے۔

یہ حضرات صرف ان چند لوگوں کے قتل کا مطالبہ نہیں کرتے تھے، جن کے ہاتھ براہ راست خون عثمان سے رنگین تھے، بلکہ وہ تمام باغیوں کی سرکوبی کا مطالبہ کرتے تھے۔ لہٰذا حضرات طلحہ و زبیر اور صحابہ کی ایک جماعت حضرت علی کے پاس گئی اور ان سے کہا:

---

[۱] ملاحظہ ہو: البدایۃ والنھایۃ: ۷/۲۵۵۔۲۵۶۔

يَاعلي، إناقَدِاشترطنا إقامة الحدود، وإن هَؤُلاءِ القوم قَدِاشتركوا فِي دم هَذَا الرجل وأحلوا بأنفسهم۔ (تاريخ طبري: ٤/٤٣٧)

یعنی ہماری بیعت میں یہ شرط تھی کہ مجرموں کو سزا دی جائے گی۔ اور تمام باغی خلیفہ کے قتل میں شریک ہیں۔ اور سزا کے مستحق ہیں۔

سیدنا علیؓ کی رائے:

مگر حضرت علیؓ کا موقف یہ تھا کہ موجودہ سیاسی حالات میں ایسا ممکن نہیں۔ حضرت علیؓ نے ان لوگوں سے صاف کہا کہ باغیوں کے پاس بڑی طاقت ہے۔

فَقَالَ لَهُمْ: يَا إخوتاه، إني لست أجهل مَا تعلمون، ولكني كيف اصنع بقوم يملكوننا وَلا نملكهم! ها هم هَؤُلاءِ قَدْ ثارت معهم عبدانكم، وثابت إِلَيْهِم أعرابكم، وهم خلالكم يسومونكم مَا شاءوا، فهل ترون موضعا لقدرة عَلَى شَيْء مما تريدون؟ قَالُوا: لا، قَالَ: فلا وَاللَّهِ لا أَرَى إلا رأيا ترونه إِنْ شَاءَ اللَّهُ، إن هَذَا الأمر أمر جاهلية، وإن لهؤلاء القوم مادة۔

بھائیو! میں بھی اس سے واقف ہوں۔ لیکن بتاؤ تو سہی، میں ان لوگوں کو کیسے سزا دوں جو ہم پر مسلط ہیں، ہم ان پر حاکم نہیں۔ عجمیوں اور بدو قبائل کے جتھے ان کے ساتھ ہیں اور دندناتے پھر رہے ہیں۔ مدینے میں وہی غالب ہیں جو چاہے کر رہے ہیں۔ اب بتاؤ جو تم چاہتے ہو اس کی میرے پاس طاقت ہے؟ ان لوگوں نے حضرت علیؓ کی اس بات سے اتفاق کیا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا: میری بھی رائے وہی ہے جو تمہاری ہے، مگر اب یہ جاہلیت اور عصبیت کا فتنہ ہے۔ یہ باغی اپنے پیچھے اپنے قبائل کی طاقت رکھتے ہیں۔

حضرت علیؓ کا موقف صاف اور حضرت عثمان کے موقف جیسا ہی تھا:

سیدنا علیؓ کے اس موقف کی بنیاد واضح ہے۔ وہ مزید خوں ریزی سے بچنا چاہتے تھے۔ افواہوں کا بازار گرم تھا، انتشار وابہام کی فضا قائم تھی، باغیوں کا دبدبہ تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر موقعہ ملا تو وہ اللہ کی توفیق اور اپنے ناخن تدبیر سے صورت حال کو قابو میں لے آئیں گے۔ کسی کو اگر ان کے موقف کی واقعیت وعملیت (Practicality) کو سمجھنے میں مشکل ہو تو اس کو خود حضرت عثمان کے موقف پر غور کرنا چاہیے۔ حضرت عثمان کا طرز عمل، جو انہوں نے بصد اصرار ویقین اختیار کیا تھا، بعینہ یہی تھا کہ باغیوں سے فی الوقت جنگ نہ کی جائے۔ بس وہی حضرت علی کا موقف تھا۔ اور یقیناً بے غبار تھا۔

حضرات طلحہؓ وزبیرؓ کی تجویز:

حضرت علی کی معذرت کے بعد حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ نے ایک عملی تجویز پیش کی۔ان کا کہنا تھا کہ اگر حضرت علیؓ ان دونوں کو بالترتیب بصرہ اور کوفہ کا امیر مقرر فرما دیں تو یہ وہاں سے بڑی فوج لا کر ان باغیوں اور جاہل بدوؤں کی وہ طاقت توڑ دیں جو ان کو حضرت علیؓ کے لشکر میں حاصل ہو چکی ہے۔اس تجویز کے پیچھے دراصل یہ حقیقت تھی کہ مدینہ میں پہلے سے فوجیں نہیں رہتی تھیں، اس لیے حضرت علی کے پاس براہ راست فوجوں کی بڑی کمی تھی۔اس کے برخلاف کوفہ اور بصرہ مسلمانوں کے سب سے بڑی فوجی یونٹیں تھیں، حضرات طلحہؓ وزبیرؓ کی بڑی مؤثر ومحترم شخصیتوں کے براہ راست وہاں کے حاکم بننے کے بعد وہاں کی افواج کا انتشار ختم ہونے کی توقع تھی۔پھر ان دونوں کے لیے اُسی طرح وہاں کی فوجوں کو منظم کرنے کے امکانات ہوں گے جس طرح حضرت معاویہؓ کے پاس شام میں تھے۔

سیدنا علیؓ کا جواب:

لیکن حضرت علیؓ نے اِن حالات میں اس کو مناسب نہیں سمجھا۔حضرت علیؓ کا خیال تھا کہ پہلے ہی بہت انتشار ہو چکا ہے۔اب اسلامی ریاست کو مزید داخلی جنگوں میں جھونکنا خطرناک ہو سکتا ہے۔انہوں نے کہا کہ میں بھی وہی چاہتا ہوں جو تم چاہتے ہو۔مگر ان کے نزدیک صورت حال اُس سے زیادہ پیچیدہ تھی جتنا حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کا خیال تھا۔حضرت علیؓ نے فرمایا کہ مفسد سازشی خود تعداد میں بہت نہ ہوں مگر ان کے ساتھ مفتوحہ علاقوں اور اعراب کے جاہلوں کی بڑی تعداد ہے [1]۔یعنی کہیں ان کے خلاف کارروائی سے اور بڑی خانہ جنگی نہ چھڑ جائے۔اور یہ واقعی بہت بڑے خطرے کی بات تھی۔

حضرات طلحہ وزبیر اور حضرت عائشہ کا اقدام:

حضرت علیؓ کو خلافت سنبھالے ہوئے تقریباً چار ماہ ہو چکے تھے۔قاتلوں اور باغیوں کے آزاد پھرنے کی صورتحال جوں کی توں تھی۔دارالخلافہ مدینہ طیبہ اور خلیفہؓ کی فوج میں انہی کا دبدبہ تھا۔یہ بڑی پیچیدہ صورت حال تھی۔ابن کثیر کہتے ہیں:

> حضرت علیؓ کی بیعت کے بعد ان کے سب سے قریب اور طاقت ور وہی باغیوں کے سردار اور قاتلان عثمان تھے، اگرچہ حضرت علیؓ ان کو ناپسند کرتے تھے، لیکن یہ واقعات وصورت حال کی حقیقت تھی۔۔۔۔ یہ مفسد حضرت علیؓ پر غالب اور کبار صحابہ اور حضرت علیؓ کے بیچ حائل

[1] البدایہ والنہایہ: ۷/۲۵۵۔نیز تاریخ طبری: ۴/۴۳۷، ۴۳۸۔

تھے۔ (البدایۃ والنہایۃ:۷/۲۵۷)۔

اس کیفیت کے پیش نظر حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ حضرت علیؓ سے اجازت لے کر مکہ تشریف لے گئے، کہ ان ظالموں کی دست رس سے دور رہیں۔ ان کے ساتھ مدینہ والوں کی ایک بڑی تعداد بھی مکہ روانہ ہوئی، حضرت عبداللہ بن عمرؓ بھی مکہ چلے گئے۔ مدینہ پر باغیوں کے تسلط ہی کی وجہ سے ام المومنین حضرت عائشہ اور دیگر امہات المؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہن حج کے بعد مکہ ہی میں رکی ہوئی اور تشویش میں مبتلا تھیں۔ ابن کثیر کا کہنا ہے کہ اس طرح مکہ میں کبار صحابہ اور امہات المومنین کی ایک تعداد جمع ہوگئی (البدایہ والنہایہ: ۷/۲۵۷)۔ حضرات طلحہ وزبیر اور حضرت عائشہ نے صورت حال پر مشورہ کیا۔

حضرت طلحہ اور حضرت زبیر اپنے آپ کو شرعی طور پر کچھ کرنے کا ذمہ دار اور مسئول سمجھتے تھے۔ یہ امت کے بڑے اور اہل حل وعقد کے اکابر تھے۔ لہٰذا دونوں عنداللہ اپنی براءت کی واحد شکل یہی سمجھتے تھے کہ باغیوں کو سزا دی جائے۔ حضرت عمرؓ نے اپنی وفات کے بعد خلافت کے لیے جن چھ لوگوں کی کمیٹی بنائی تھی اور گویا یہ طے تھا کہ یہی چھ امت کے سب سے بڑے قائد ہیں۔ حضرات طلحہ اور زبیر ان میں سے تھے۔ حضرت عائشہ ام المومنین ہونے اور اپنے غیر معمولی علم وذہانت کی وجہ سے مرجع بنی ہوئی تھیں۔ ان کے بھی وہی احساسات تھے جو ان دونوں کے تھے۔ تینوں کے درمیان مشورے ہوئے۔ حضرت زبیرؓ نے فرمایا یہ قتل صرف قتل نہیں ہے، بلکہ اسلامی خلافت کے خلاف بغاوت ہے اور اگر ان باغیوں کی کمر نہیں توڑی گئی تو کبھی خلافت کا ادارہ اور اسلامی ریاست مضبوط نہیں ہو سکے گی۔ یہ احساس کسی کو بھی بے چین ومتحرک ہوئے بغیر کہاں رہنے دے سکتا تھا۔

مکہ میں کئی ایسے اسباب جمع تھے جن کی وجہ سے ان حضرات کو باغیوں کی سرکوبی کے لیے کچھ عملی اقدام کے امکانات بہم ہوتے نظر آرہے تھے۔ مکہ میں بصرہ کے گورنر اور قائد افواج عبداللہ بن عامرؓ بھی لوگوں کو باغیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ابھار رہے تھے۔ اور بصرہ سے فوجی مدد دینے کا وعدہ کر رہے تھے۔ یمن کے گورنر حضرت یعلیٰ ابن امیہؓ بھی مال اور کچھ نفری کے ساتھ موجود تھے۔ خود اہل مکہ قصاص کے طلبگار اور تعاون کے لیے تیار تھے۔ آخر یہ قرار پایا کہ بصرہ چل کر وہاں سے کچھ اور فوج کو لیا جائے، سب سے پہلے وہاں (یعنی بصرہ میں) موجود باغیوں کو سزا دی جائے پھر کوفہ سے کچھ مزید طاقت جمع کر کے مدینہ آیا جائے۔ اس لیے کہ مدینہ میں باغیوں کی طاقت کا مقابلہ آسان نہیں ہے۔

غرض ان حضرات کا قافلہ بصرے کے لیے روانہ ہوا۔ حالات ایسے کرب انگیز تھے کہ مکہ سے روانہ ہوتے وقت سب کی آنکھیں نم اور دل گریاں تھے (طبری: ۴/۴۶۱)۔

اس تحریک کا مقصد:

(مکہ میں بھی اور بصرہ پہونچنے کے بعد بھی) ان کا مقصد قوت کے مرکزی شہروں یعنی کوفہ وبصرہ جا کر ان باغیوں کے خلاف رائے عامہ تیار کرنا اور ان کو سزا دلانا تھا، جو ایک بڑی طاقت بن گئے تھے۔ ان حضرات کے نزدیک باغیوں کو بے سزا چھوڑ دینے سے اسلامی حکومت کی قوت وسطوت ہمیشہ کے لیے کمزور ہو جاتی۔ مکہ سے نکلتے ہی ایک عرب سردار ملیح بن عوف حضرت زبیر سے ملے، ان سے حضرت زبیرؓ نے اپنی اس مہم کا مقصد بتاتے ہوئے فرمایا:

عدى على أمير المؤمنين رضي الله عنه فقتل بلا ترة ولا عذر، قال: ومن؟ قال: الغوغاء من الأمصار ونزاع القبائل، وظاهرهم الأعراب والعبيد، قال: فتريدون ماذا؟ قال: ننهض الناس فيدرك بهذا الدم لئلا يبطل، فإن في إبطاله توهين سلطان الله بيننا أبدا، إذا لم يفطم الناس عن أمثالها لم يبق إمام إلا قتله هذا الضرب (تاریخ طبری: ۴/۴۶۱)۔

یعنی امیر المومنین کو (کوفہ، بصرہ اور مصر) شہروں کے بدمعاشوں اور بدو قبائل کے گمراہ لوگوں نے بے گناہ وبے سبب شہید کر دیا۔ ملیح نے پوچھا: آپ لوگوں کا کیا مقصد ہے؟ حضرت زبیر نے فرمایا: ہم لوگوں کو متحرک کریں گے تاکہ اس خون کی سزا دی جائے۔ اگر سزا نہیں دی گئی تو ہمیشہ کے لیے اسلامی حکومت وخلافت بہت کمزور ہو جائے گی۔ اگر لوگوں کو اس طرح کی حرکتوں سے (عبرت ناک سزا دے کر) نہیں روکا گیا تو ہر خلیفہ کے خلاف اسی قماش کے لوگ کھڑے ہوں گے اور اس کو قتل کر دیں گے۔

راستے میں ''حوأب'' نامی ایک جگہ حضرت زبیر اور شریک مُہم دیگر حضرات نے حضرت عائشہ سے گفتگو کے دوران کہا: (عسى الله عز وجل أن يصلح بك بين الناس) امید ہے کہ اللہ آپ کے ذریعے مسلمانوں کے درمیان صلح واتفاق کی شکل پیدا فرمادے[1]۔ یہ اور دیگر صحیح روایات شہادت دیتی ہیں کہ ان حضرات کی مہم کا مقصد خلافت میں کوئی نزاع، حضرت علیؓ سے مقابلہ آرائی یا جنگ تو تھا ہی نہیں، صرف باغیوں کی سرکوبی اور انتشار وافتراق کے اسباب کا خاتمہ تھا۔

حضرت عائشہ بصرہ پہنچیں تو حضرت علیؓ کی طرف سے نامزد گورنر حضرت عثمان بن حنیفؓ نے قاصد بھیج کر پوچھا کہ کیا مقصد ہے؟ تو انہوں نے باغیوں کے جرائم کی تفصیل کے بعد کہا کہ ہمارا مقصد ہے کہ مسلمانوں کو یہ حالات بتا کر (باغیوں کے خلاف) اتحاد واتفاق پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ (طبری: ۴/۴۶۱، ۴۶۲)۔

---

[1] مسند احمد: ۲۴۲۵۴، مسند ابویعلی: ۴۸۶۸۔

'حوأب' کی روایت:

روایت ہے کہ راستے میں حوأب نامی مقام آیا۔حضرت عائشہؓ کو کتوں کی آواز سنائی دی۔ان کو واقعہ یاد آیا کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ازواج مطہرات سے کچھ یوں کہا تھا:تم میں سے کسی ایک پر حوأب نامی مقام کے کتے بھونکیں گے۔

غور کریں تو محض اس جملے سے نہ حضرت عائشہؓ کی اس مہم کی پسندیدگی معلوم ہوتی تھی نہ ناپسندیدگی۔مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد کو یاد کر کے وہ تردّد میں پڑ گئیں۔کہنے لگیں کہ واپسی کا خیال ہو رہا ہے۔لیکن حضرت زبیرؓ اور دیگر حضرات نے کہا کہ آپ کا واپس جانا کیسے مناسب ہوگا؟(عسى الله عز وجل أن يصلح بك بين الناس)امید ہے کہ اللہ آپ کے ذریعے مسلمانوں کے درمیان صلح واتفاق کی شکل پیدا فرمادے[1]۔ حافظ ابن حجر نے اس سند کو بخاری کے شرط پر قرار دیا ہے(فتح الباری:۱۳/۵۵)۔اپنے نزدیک دین کی مصلحت کے مطابق وہ حضرات ایک راہ پر چل رہے تھے۔اور اس ارشادِ رسولؐ میں کہیں ایسا ایماء نہیں ہے کہ عائشہ اب آگے نہ بڑھیں۔اس لیے تینوں بزرگوں کی رائے ہوئی کہ سفر جاری رکھا جائے۔

اس سلسلے میں طبری کی روایت سخت شیعی رنگ کی ہے۔یہ روایت حضرت عائشہ اور دیگر دونوں محترم واکابر صحابہ کو بے ایمان اور اپنی اپنی غرض کے لیے کام کرنے والا بتاتی ہے[2]۔

مگر یہ حوأب کی روایت منکر اور منقطع ہے:

چونکہ اس روایت کی بنیاد پر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ام المومنین سیدہ عائشہ اور حضرات طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہم کے اس سلسلے کے اقدامات کو ناپسند فرمایا تھا،اس لیے ہم اس کا تفصیلی نقد وتجزیہ پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔اس سلسلے میں پہلی بات تو وہی ہے جو ہم نے عرض کی کہ اگر آپ اس جملے میں غور کریں کہ

---

[1] مسند احمد:۲۴۲۵۴۔وصحیح ابن حبان:۶۷۳۲، مسند ابویعلی:۴۸۶۸۔

[2] تاریخ طبری:۴/۴۵۶،یہ روایت بظاہر راوی اسماعیل بن موسی فزاری کی کارستانی ہے۔محدثین اور رجال کے مصنفین نے ذکر کیا ہے کہ غالی شیعہ،فاسق اور سلف کو سب وشتم کرنے والا تھا۔ابن عدی کہتے ہیں کہ محدثین اس کو غالی شیعہ سمجھتے ہیں۔ابوبکر بن ابی شیبہ اور ہناد بن السری کہتے ہیں:فاسق تھا،صحابہ کو گالیاں دیتا تھا۔الکامل فی ضعفاء الرجال:۱/۵۲۸۔اس کے علاوہ بھی اس میں دیگر مجہول راوی ہیں۔یہ روایت شیعی مضامین سے بھرپور ہے۔عباس محمود العقاد اور طہ حسین جیسے غیر محتاط ادیب ودانشوروں نے،جن کا دینی علوم میں کوئی اختصاص نہیں،ایسی ہی روایات کی بنا پر اپنی کتابوں 'عبقریۃ علی' اور 'علی وبنوہ' میں صحابۂ کرام سے بدگمان کرنے کی نامحمود سعی کی ہے۔ملاحظہ ہو:اسمیٰ المطالب فی سیرۃ علی ابن ابی طالب:۱/۵۵۰۔

'تم میں سے کسی پر حوأب نامی جگہ کے کتے بھوں کیں گے' تو اس سے اس سفر کی یا اس تحریک کی کوئی ممانعت واضح طور پر معلوم نہیں ہوتی۔

دوسری بات یہ ہے کہ حوأب والی یہ روایت منقطع ہے، اس کو یحییٰ بن سعید القطان، یحییٰ بن معین، ابوزرعہ اور ابن ابی حاتم جیسے ائمہ نے ضعیف ومنکر قرار دیا ہے۔ آخری درجے کی بات یہ ہے کہ امام حاکم رحمہ اللہ نے (باوجود اس کے کہ ائمہ نے ان کے بارے میں تصریح کی ہے کہ ان اختلافات کے سلسلے میں ان کا حضرت علیؓ کی طرف غیر معتدل میلان تھا، اس کے باوجود انہوں نے) اس روایت کو مستدرک میں ذکر تو فرمایا، مگر اس کی تصحیح سے گریز فرماتے ہوئے سکوت اختیار کیا۔ حالانکہ ان کا عام طرز یہی ہے کہ وہ ہر ہر روایت کے بعد فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے یا شرط شیخین پر ہے۔ اور اس سلسلے میں وہ اتنے نرم ومتساہل ہیں کہ بہت سی ضعیف وکمزور روایات کو بھی صحیح بلکہ بخاری کے معیار کا قرار دے جاتے ہیں۔ اور یہاں یہ حال ہے کہ تمام راوی بخاری ومسلم کے رجال ہیں، لیکن اس کے باوجود انہوں نے اس کی معمولی تصحیح بھی نہیں فرمائی۔ پھر جب حافظ ذہبی نے مستدرک کی روایات پر اپنے احکام (تلخیص مستدرک میں) لکھے تو انہوں نے بھی اس روایت کی تصحیح نہیں کی اور خاموش رہے (المستدرک: ۳/۱۲۹)۔ اس کی اور کوئی وجہ سوائے اس کے نہیں ہوسکتی کہ، ان ائمہ کی اس روایت کی کمزوری پر نظر تھی۔ اور وہ جانتے تھے کہ متقدمین ائمہ اس کو منکر ومنقطع قرار دے چکے ہیں۔

اس روایت کے تین طریق (یعنی سندیں) محدثین کے یہاں ہیں۔

(۱) پہلا طریق قیس بن ابی حازم کا ہے (مسند احمد، مسند ابویعلی اور ابن حبان، حوالۂ مذکور) جو خود اس واقعہ کو بیان کرتے ہیں۔ قیس اعلیٰ درجہ کے ثقہ ہیں۔ بخاری ومسلم کے راوی ہیں۔ لیکن یہ روایت منقطع ہے۔ قیس بن ابی حازم اس موقعہ پر موجود نہیں تھے۔ امام یحییٰ بن معین صراحت کرتے ہیں کہ قیس جنگ جمل کے موقعہ پر ساتھ نہیں تھے (علل ابن المدینی: صفحہ: ۵۰)۔ لہٰذا یہ تو طے ہے کہ انہوں نے یہ روایت کسی اور سے سنی ہے۔ اور انہوں نے حضرت عائشہ سے ایک بھی حدیث نہیں سنی ہے۔ لہٰذا یہ بھی ممکن نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد انہوں نے ام المومنینؓ سے سنا ہو۔ امام ابن ابی حاتم فرماتے ہیں کہ قیس کی حضرت عائشہ سے روایات مرسل یعنی غیر متصل ہوتی ہیں (علل ابن ابی حاتم: ۴/۱۵۵)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ روایت منقطع ہے۔ اور بیچ کا راوی جس کا نام نہیں لیا گیا ہے، وہ غیر معتبر، بلکہ کوئی جھوٹا بھی ہوسکتا ہے۔ اس سلسلے میں شبہہ کا ایک قرینہ یہ بھی ہے کہ قیس ابن ابی حازم کا قیام اسی کوفے میں تھا جو سبائی پروپیگنڈے کی سب سے بڑی آماج گاہ تھا۔

اس کے علاوہ قیس کے بارے میں امام یحییٰ بن سعید القطان کا قول ہے کہ قیس کچھ منکر روایتیں بیان

کرتے ہیں۔ امام یحییٰ بن سعید القطان کہتے ہیں کہ ان میں سے حوأب کا قصہ بھی ہے [۱]۔

امام یحییٰ القطان جیسے امام کی بات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، خصوصا ایسے قصہ میں جس کا مشاجرات صحابہ سے تعلق ہو اور جس کا مضمون شیعی ذہنیت کے غمازی بھی کر رہا ہو۔ اور جس کی سند منقطع بھی ہو۔

(۲) محدثین کی کتابوں میں اس کی دوسری سند عصام بن قدامہ کے حوالہ سے ہے، جو اس کو عکرمہ عن ابن عباس کی سند سے روایت کرتے ہیں۔ اس روایت کو بھی ائمہ منکر کہتے ہیں۔ امام ابوزرعہ اور امام ابوحاتم دونوں نے اس کو منکر کہا ہے۔ اور اس کے منکر ہونے کا سبب عصام بن قدامہ ہی کو قرار دیا ہے۔ (علل ابن ابی حاتم: ۶/ ۵۹۰)۔ لہٰذا متقدم ائمۂ حدیث کے یہاں ان دونوں روایتوں کے منکر وضعیف ہونے پر اتفاق ہے۔ دراصل عصام اس درجہ کے راوی نہیں ہیں کہ ان کی اکیلی (متفرد) روایت پر اعتبار کر لیا جائے [۲]۔

(۳) اس کی تیسری سند طبرانی نے ذکر کی ہے۔ (یحییٰ بن زکریا بن ابی زائدة، عن مجالد عن الشعبی، عن مسروق، عن عائشة) خود حافظ طبرانی کہتے ہیں کہ مجالد کی سند سے اس روایت کو یحییٰ بن زکریا بن ابی زائدہ ہی روایت کرتے ہیں۔ گویا اس کا ایک عیب تو اتنے نازل درجہ میں تفرد ہے۔ دوسرے اس کے راوی مجالد بن سعید سخت ضعیف ہیں۔ ابن عدی مختلف ائمہ سے ان کی تضعیف نقل کر کے ان کی روایتوں کے بارے میں کہتے ہیں کہ ان کی اکثر روایتیں غلط ہیں۔ **عامة ما يرويه غير محفوظ** (الکامل: ۸/ ۱۶۹)۔

یہی وجوہات ہیں کہ متقدمین میں سے کسی امام نے (ہماری واقفیت کے مطابق) حوأب کی روایت کو (کسی بھی سند سے) صحیح نہیں قرار دیا ہے [۳]۔

---

[۱] سیر اعلام النبلاء: ۴/ ۲۰۰۔ تہذیب الکمال: ۲۴/ ۱۵۔

[۲] ملاحظہ ہو تقریب التہذیب اور سوالات البرقانی للدارقطنی صفحہ ۵۶۔

[۳] اس کے برخلاف متاخرین نے صرف اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے، حدیث کو نہیں۔ مثلاً ہیثمی (مجمع الزوائد: ۷/ ۲۳۴)، ذہبی (سیر اعلام النبلاء: ۲/ ۱۷۸)، ابن کثیر (البدایۃ والنہایۃ: ۶/ ۲۳۶) اور ابن حجر (فتح الباری: ۱۳/ ۵۵)۔ یہ حضرات صرف سند اور رجال کے صحیح وثقہ ہونے کا حکم لگاتے ہیں۔ اور اہل نظر جانتے ہیں کہ علم حدیث میں راویوں کے ثقہ ہونے کے بعد بھی کسی روایت کے ضعیف ونا قابل قبول ہونے کے بہت سے اسباب ہو سکتے ہیں۔ اور یہاں ایسا ہی معاملہ ہے۔ اسی لیے متقدمین میں سے جن ائمہ نے بھی حواب کی حدیث پر کلام کیا ہے سب نے روایت ہی کو سرے سے منکر وضعیف قرار دیا ہے۔
کسی روایت کی صحت کے لیے صرف راویوں کا ثقہ ہونا کافی نہیں اس کے علاوہ خفی قسم کے انقطاع، تفرد ونکارت اور علت کے ایسے دیگر دقیق معیار ہیں جن پر کسی روایت کو پرکھنا صرف ائمہ کا کام ہے۔ لہٰذا متاخرین کی رائے کے مقابلے میں ائمہ متقدمین کی متفقہ رائے ہی راجح قرار پاتی ہے۔ متاخرین کے کبار محدثین مثلاً ذہبی ابن کثیر ابن حجر وغیرہ (جن پر اپنے دور میں علم حدیث کا گویا مدار رہا ہے) عموماً صرف سند کی تصحیح اور رجال کی توثیق کرتے ہیں، حدیث کی تصحیح نہیں کرتے =

قاتلانِ عثمان کی بیخ کنی:

بہرحال یہ قافلہ بصرے پہنچا اور باہر پڑاوڈالا۔ یہاں سے انہوں نے شہر کے سرداروں کو پیام بھیجا کہ ہمارا مقصد باغیوں کو سزا دینا ہے، آپ لوگ ہمارا ساتھ دیجیے اور مدد کیجیے۔ کچھ سرداروں کا یہ خیال تھا کہ یہ تو حکومت کا اختیار اور اس کے دائرۂ کار کی چیز ہے۔ خلیفہ کے حکم واجازت کے بغیر اس طرح کا اقدام غیر شرعی ہے۔ لیکن بہت سے لوگ ان کے ساتھ ہو گئے، اس لیے کہ مقصد تو بالکل بے غبار تھا، اور اس سے تو کسی صحابی کو انکار نہیں تھا۔ اِدھر بصرے کے باغیوں کا ٹولہ بھی آمادۂ جنگ ہو گیا۔ ان کے سردار حُکیم بن جبلہ نے حملہ کر دیا (یہ معروف مجرم تھا)، اب حضرت عائشہ نے بار بار اعلان کرایا کہ جو قاتلانِ عثمان میں سے نہ ہو، ہٹ جائے، ہم کو صرف قاتلوں سے مطلب ہے۔ آخر باغیوں کو شکست ہوئی۔ حکیم بن جبلہ سمیت بصرے کے بلوائیوں کے تمام لیڈر، سوائے حرقوص بن زہیر کے، مارے گئے۔ حضرت طلحہ اور حضرت زبیر کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ تمہارے قبائل میں سے جو بھی باغی فسادی مدینہ گیا ہو، اس کو پکڑ کر حاضر کرو۔ طبری کی روایت کے الفاظ ہیں کہ ان کو پکڑ پکڑ کے لایا گیا اور سب قتل کیے گئے، بصرہ کے باغیوں میں سے سوائے حرقوص بن زہیر کے کوئی نہیں بچا[۱]۔

خدائی انتقام:

عمرۃ بنت قیس عدویہ، حضرت عائشہ کی شاگرد تھیں، بصرے ہی کی رہنے والی تھیں، کہتی ہیں کہ میں نے وہ مصحف دیکھا جس میں تلاوت کرتے ہوئے حضرت عثمان شہید ہوئے۔ میں نے دیکھا کہ ان کا خون اس آیت پر گرا تھا 'فسیکفیکھم اللہ وھو السمیع العلیم' (ترجمہ: تمہاری طرف سے اللہ ان (کو بدلہ دینے) کے لیے کافی ہے۔ اور وہ بہت سننے اور دیکھنے والا ہے)۔ یہ گویا غیبی اشارہ تھا کہ قاتلانِ عثمان کو سزا ضرور ملے گی۔ عمرہ کہتی ہیں: کہ ایسا ہی ہوا، ان میں سے کوئی ڈھنگ کی موت نہیں مرا۔ یعنی سب قتل کیے گئے[۲]۔ اللہ رحم فرمائے۔

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قاتلانِ عثمان کو چن چن کر قتل کروایا، وہ زمین کے جس کونے میں بھی تھے، آخر مارے گئے۔ امام ذہبی فرماتے ہیں کہ: جن لوگوں نے حضرت عثمان کی شہادت میں حصہ لیا تھا ان کی اکثریت قتل ہوئی۔ اور شاید ان کے لیے قتل ہونا ہی بہتر اور کفارہ کا ذریعہ تھا[۳]۔ اللہ رحم فرمائے۔

حضرت علیؓ کی بصرہ کو روانگی:

ان حضرات کے بصرہ جانے کی خبر حضرت علیؓ کو ملی۔ وہ خلیفۂ وقت تھے انہوں نے یہ سمجھا کہ اب

= اور حدیث پر حکم کے بارے میں صرف ائمہ کے اقوال پر ہی اعتماد کرتے ہیں۔

[۱] تاریخ طبری: ۴/۴۷۲۔ نیز ملاحظہ ہو: اسمیٰ المطالب فی سیرۃ علی ابن ابی طالب: ۱/۵۵۱-۵۵۵۔

[۲] فضائل الصحابۃ: ۱/۵۰۱، الزھد لابن حنبل: ۱۰۵، بسند حسن۔

[۳] تاریخ صغیر بخاری: ۱/۹۷۔ سیر اعلام النبلاء: ۳/۴۸۱۔

حالات بے قابو ہونے کے قریب ہیں۔ان کا موقف تھا کہ ایک شرعی حکومت کسی گروہ کو (قصاص اور باغیوں کی سرکوبی ہی کے نام پر کیوں نہ ہو) کسی مسلح اقدام کی اجازت نہیں دے سکتی۔صورتحال مبہم اور پیچیدہ تھی اور فیصلہ مشکل۔حضرت زبیر وغیرہ کے نزدیک فسادی باغیوں اور قاتلانِ خلیفہ کے گروہ کی یہ قوت کہ وہ ایسا غالب وزور آور ہے کہ موجودہ خلیفہ اُن کو سزا دینے کی قدرت نہیں رکھتا، کسی اقدام کو ضروری قرار دیتا تھا۔

الغرض حضرت علیؓ کو جب اس صورت حال کی خبر ملی وہ حضرت معاویہؓ پر حملہ کرنے کے لیے تیاریاں کر چکے تھے۔اس نئی صورت حال کو دیکھ کر انہوں نے بجائے شام کے پہلے عراق کا قصد کیا۔اور کوفہ سے اپنی حامی افواج کو لے کر بصرہ تشریف لائے۔مسلمان حالات سے سخت بے چین تھے۔ایک طرف سیدنا امیر المومنین علی بن ابی طالبؓ اور دوسری طرف ام المومنین اور حضرات زبیر وطلحہ رضی اللہ عنہم جیسے اعاظم صحابہ۔

دونوں جماعتیں ایک میدان میں آمنے سامنے تھیں کہ حضرت عائشہ کے گرد بزرگ علماء کا مجمع تھا۔ صحیح سند سے وارد ہے کہ انہوں نے زور سے دعا فرمانی شروع کی: اے اللہ! لعنت فرما قاتلان عثمان پر۔ایک عظیم مجمع آمین کہتا جاتا تھا۔حضرت علی کے جلیل القدر صاحب زادے محمد میدان میں اپنے والد گرامی کے ساتھ تھے۔وہ بیان کرتے ہیں کہ ابا جی کو آواز پہنچی، تو انہوں نے بھی ہاتھ اٹھا کر اس دعا میں شرکت کی اور باآواز بلند دعا فرمائی: اے اللہ قاتلان عثمان بحر وبر اور دشت وجبل میں جہاں ہوں، ان پر لعنت فرما[۱]۔

مصالحت کی کوششیں:

سچوں اور دردمندوں کی ایک تعداد نے معاملہ سلجھانے کی کوشش کی۔مگر کچھ کامیابی نہیں ملی۔بار بار کشیدگی بڑھ جاتی تھی۔حضرت علی پیچھے سے لوگوں کو روکتے تھے، مگر لوگ نہیں رکتے تھے۔بصرہ کے لوگ حضرت عائشہ کے گرد جمع تھے۔وہ لوگوں کو تھمے رہنے کی تاکید کرتی جاتی تھیں، کہ کسی طرح صلح کی بات بن جائے۔انہی میں قاضیِ بصرہ کعب بن سورؒ بھی تھے، جو کبار تابعین میں تھے۔حضرت عائشہ نے اُن کو حکم دیا کہ میرے اونٹ کی کہار کسی اور کے حوالے کرو۔اور قرآن اٹھا کر لوگوں کو صلح کی دہائی دو۔وہ گئے اور مصحف بلند کر کے کہا: لوگو! اللہ کی

---

۱ فضائل الصحابۃ: ۷۳۳، بسند صحیح۔نیز مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۷۷۹۳، بسند صحیح۔اس کے راوی سیدنا علی کے صاحب زادے اور حضرت ابن عباس ہیں۔مصنف ابن ابی شیبہ کی روایت میں حضرت محمدؒ یوں قصہ بیان کرتے ہیں کہ میں ایک مجلس میں حضرت عثمان پر کچھ تنقید کر رہا تھا، کچھ تجاوز ہو گیا تو حضرت ابن عباس نے توجہ دلانے کے لیے میری طرف دیکھا۔میں نے کہا۔جنگ جمل کا واقعہ یاد ہے، جب میں حضرت علی کی ایک جانب اور آپ دوسری جانب تھے کہ زور کی آوازیں آئیں اور پتہ چلا کہ حضرت عائشہ بددعا فرما رہی ہیں۔۔۔۔۔حضرت محمدؒ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ کی اس تنبیہ کے بعد میں نے حضرت عثمان پر کچھ نقد نہیں کیا۔

کتاب کا واسطہ! صلح کرو۔طبری کی روایت کہتی ہے کہ عبداللہ بن سبا کے گروہ نے ان کا راستہ روکنے کی بہت کوشش کی۔مگر وہ نہ مانے (طبری: ۴/ ۵۱۳)۔وہ دونوں فریقوں کے درمیان جا جا کے صدا لگاتے، عجیب اثر انگیز ندا تھی۔مگر سبائی منافقوں کا ٹولہ کہاں صلح ہونے دیتا؟ اچانک کسی ''نامعلوم'' شخص نے اس صلح کے داعی کو ایسا تیر مارا کہ وہ وہیں وفات پا گیا[1]۔ ظاہر ہے کہ یہ ''نامعلوم'' کوئی ایسا ہی بدخواہ ہوگا جو کسی بھی قیمت پر جنگ کرانا چاہتا تھا۔صلح کے داعیوں کا اِس طرح پر اسرار قتل بتاتا ہے کہ سبائی سازش کیسی طاقت ور اور خطرناک تھی اور مسلمان اس کے سامنے کیسے بے بس تھے۔

یہ بات بالکل ثابت ہے کہ نہ حضرت علیؓ جنگ چاہتے تھے اور نہ وہ تینوں حضرات۔حضرت علیؓ نے حضرت قعقاع بن عمرو تمیمیؓ کو سفیر بنا کر مصالحت و فہمائش کے لیے بھیجا۔انہوں نے تینوں کو سمجھایا کہ اس طرح باغیوں کی سرکوبی کے مطالبہ سے سوائے خلافت اور مملکت کے کمزور ہونے کے اور کیا نتیجہ نکل سکتا ہے؟ ذرا انتظار کیا جائے۔اُن تینوں نے بھی یقین دلایا کہ حضرت علی سے کہہ دیا جائے ہم صرف اصلاح احوال کے لیے نکلے ہیں۔سوائے باغیوں کے مسئلے کہ ہم حضرت علی کے ساتھ کسی طرح کا نزاع نہیں رکھتے۔اصلاح احوال کی ایسی شدید خواہش تھی کہ ان حضرات نے حضرت علی کی طرف قعقاع کے علاوہ بھی اپنی طرف سے دیگر قاصد بھیج کر یہی پیغام کہلایا۔افواہوں کے بعد اب اطمینان کی فضا قائم ہوئی، فریقین کو اب بھروسہ تھا اور دونوں طرف خوشی کا ماحول تھا۔سیدنا علیؓ نے فوراً صلح کا اعلان فرمایا اور خطبہ دیا۔جس میں اسلام کی نعمت پر اللہ کا شکر ادا کیا اور قتل عثمان کو حاسدوں اور باغیوں کا فعل قرار دیتے ہوئے اعلان فرمادیا کہ ہم کل واپس ہوں گے۔اور ہمارے ساتھ عثمانؓ کے قاتلوں اور اس میں کسی طرح کا بھی حصہ لینے والا کوئی ایک فرد بھی نہ جائے۔

فتنہ کبری یعنی خانہ جنگیوں کا آغاز:

بس کیا تھا؟ سبائیوں اور جاہل باغیوں میں سخت بے چینی پھیل گئی کہ اب ہماری خیر نہیں۔انہوں نے یہ سازش کی کہ صبح سے پہلے اندھیرے ہی میں بصرہ کے لوگوں پر حملہ کردیا۔وہ لوگ سمجھے کہ حضرت علیؓ کی طرف سے حملہ ہوا۔انہوں نے جواب دیا۔بس جنگ چھڑ گئی۔حضرت علی کا منادی چیختا رہا کہ لوگو! رک جاؤ! رک جاؤ!۔مگر ایسا انتشار اور چیخ پکار کا شور اٹھا کہ جنگ ہو کر رہی۔بہت بڑی تعداد میں لوگوں کی جان گئی۔یہ ۱۵ جمادی الاخری ۳۶ھ کا سانحہ ہے[2]۔

۱۔ طبقات ابن سعد: ۷/ ۶۴۔

۲۔ طبری: ۴/ ۴۸۸، البدایۃ والنہایۃ: ۷/ ۲۶۴۔ ۲۶۵۔ تاریخ خلیفہ: ۱۸۴۔ ۱۸۵۔

سارے منصوبوں اور ارادوں کے برخلاف، جب جنگ چھڑ گئی تو مقصد ہی فوت ہوگیا، بلکہ بات الٹی ہوگئی۔ جیسے ہی جنگ چھڑی حضرت زبیرؓ بیزار و پریشان ہوکر مدینہ واپس ہولیے ۱۔ وہ واپس ہوئے ہی تھے کہ راستہ میں ان کو بھی ایک شقی نے شہید کردیا۔ حضرت علیؓ کو اطلاع ملی تو فرمایا: زبیر کے قاتل کو جہنم کی خوشخبری دے دو، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے ہوئے سنا ہے ہر نبی کا کوئی خاص حواری ہوتا ہے اور میرا خاص حواری زبیر ہے ۲۔

اسی طرح جنگ کے دوران حضرت طلحہ کو کہیں سے آکر ایک تیر لگا اور وہ بھی شہید ہوگئے۔ معتبر روایات کے مطابق صرف بصرہ والوں کی طرف سے اس جنگ میں تقریبا ۳۰۰۰ لوگوں کی جان گئی ۳۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مؤرخین کے یہاں مشہور ہے کہ یہ تیر مروان رحمۃ اللہ علیہ نے مارا تھا۔ ابن کثیر اس کو صحیح نہیں مانتے (البدایۃ: ۷/۲۷۶)۔ اس سلسلے کی تمام روایات ضعیف ہیں ۴۔ پھر یہ بات قطعی قرائن کے یکسر خلاف ہونے کی وجہ سے یقینا غلط ہے۔ حضرت طلحہ اور مروان تو ایک ہی جانب تھے۔ پھر مروان کا اُن کو قتل کرنا کیسے ممکن ہے؟؟ یہ تمام روایات ہمیں یہ بھی بتلاتی ہیں کہ مروان نے حضرت طلحہ کو اس لیے شہید کیا کیوں کہ وہ (یعنی حضرت طلحہؓ) حضرت عثمان کے قاتلوں میں شامل تھے۔ یہ تو گویا صاف ثبوت ہے کہ ان روایات کا منبع کوئی سبائی ذہن ہی ہوسکتا ہے جو حضرت عثمان کے قتل میں حضرت طلحہ جیسی مقدس شخصیت کو شامل کرکے دونوں کے دامن عظمت پہ ہاتھ ڈالنا چاہتا ہے۔

کسی روایت میں اس کا اشارہ نہیں ملتا کہ حضرت طلحہ کا اس بغاوت میں کوئی حصہ ہو۔ انہوں نے تو اپنے بیٹے محمد کو اسی طرح مسلح حضرت عثمان کی حفاظت کے لیے بھیجا تھا، جس طرح حضرت علی نے حضرات حسنین کو

---

۱ روایت ہے کہ ان کو حضرت علی نے یاد دلایا کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے کہا تھا کہ تم ایک وقت علی سے ناحق جنگ کروگے۔ مگر ائمہ نے تصریح کی ہے ایسی کوئی روایت صحیح نہیں ہے۔ الضعفاء للعقیلی: ۳/۶۵۔

۲ مستدرک: ۳/۴۱۴ حاکم اور ذھبی دونوں نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔

۳ طبری: ۴/۵۴۵۔ بسند حسن، عصر الخلافۃ الراشدۃ، اکرم العمری: ۴۵۷۔

۴ ہاں ایک روایت مستدرک حاکم وغیرہ میں ہے کہ قیس بن ابی حازم کہتے ہیں کہ میں نے مروان کو خود حضرت طلحہ پر تیر چلاتے دیکھا، حاکم جو اپنے تساہل میں مشہور ہیں اور بے شمار سخت ضعیف و منکر روایات کو صحیح کہہ جاتے ہیں، اس روایت پر رک گئے اور اس کی تصحیح نہیں کی۔ نہ جانے کیوں حافظ ذہبی سے ذہول ہوگیا اور انہوں نے اس کی تصحیح کردی۔ یہ بیان ایک راوی یحییٰ بن سلیمان جعفی کا تفرد ہے، جن کی بہت سی منکر روایتیں ہیں۔ حافظہ کمزور تھا۔ (تہذیب التہذیب: ۱۱/۲۲۷) اسی لیے یہ بیان کرگئے کہ قیس نے خود دیکھا۔ جو کہ غلط ہے، ائمہ نے صراحت کی ہے کہ قیس جنگ جمل کے وقت موجود ہی نہیں تھے۔

حضرت عثمان کی حفاظت کے لیے بھیجا تھا (مروج الذہب: ۲/۲۷۰)۔

پھر یہ مروان کی سلف کے درمیان مسلم علمی و دینی شخصیت سے بے جوڑ ہے۔ مروان عہد صحابہ میں ایک معتبر عالم دین سمجھے جاتے تھے، بہت سے علماء مثلاً ابن حجر تو ان کو صحابی مانتے ہیں۔ وہ بخاری و مسلم کے راوی ہیں۔ اور کیا حضرت طلحہؓ کے قاتل سے تمام کے تمام اکابر محدثین حدیث روایت کر سکتے تھے؟؟ کیا ان کو تابعین کے دور کا اہم عالم و مفتی شمار کر سکتے تھے؟ نہ صرف مفتی، بلکہ ایسا مقتدیٰ جس کے فیصلوں اور فتووں کو امام مالک موطا میں بطور سند پیش کرتے ہوں؟ کیا تصور کیا جا سکتا ہے کہ اس دور میں لوگ جانتے ہوں کہ یہ شخص حضرت طلحہ جیسے بلند مقام صحابی کا قاتل ہے، اور وہ بھی کسی کھلی جنگ میں نہیں، غدر سے، ایسے حال میں کہ وہ خود حضرت طلحہ ہی کی جماعت میں تھا؟ کیوں بعد میں حضرت طلحہؓ کے وارثوں نے اس پر قتل کا مقدمہ نہیں کیا؟؟ بہر حال یہ ایک بے اصل تہمت ہے۔ قرون اولیٰ میں تمام اہل علم (بشمول حضرت حسینؓ کے صاحب زادے علی زین العابدینؒ) کے یہاں مروان کا اعتبار و اعتماد و احترام ہونا یقینی طور پر ثابت کرتا ہے کہ مروان پر اس الزام کا پہلی صدی اور دوسری کے تقریباً نصف تک وجود نہیں تھا[۱]۔

جنگ پر سب ہی کو افسوس تھا:

صحیح سند سے ثابت ہے کہ جنگ کے دوران حضرت علی پر ایسا غم تھا کہ حضرت حسن سے بڑے درد و سوز سے فرماتے: کاش تمہارا باپ آج سے بیس سال پہلے مر گیا ہوتا اور یہ دن نہ دیکھتا۔ حضرت حسن نے عرض کیا: میں تو پہلے ہی آپ کو روکتا تھا۔ حضرت علی نے فرمایا: مجھے اندازہ نہیں تھا کہ بات یہاں تک پہنچ جائے گی[۲]۔

ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ کا بعد میں خیال یہی تھا کہ وہ بصرہ نہ جاتیں تو اچھا ہوتا، اسی لیے جب بھی اس واقعے کا تذکرہ کرتیں تو رو دیتیں۔ یہاں تک کہ دوپٹا آنسو سے تر ہو جاتا۔ یہی حال تمام سابقینِ صحابہ کا تھا۔ حضرات زبیر و طلحہؓ کو اس واقعے کا غم و افسوس ہوا اور حضرت علیؓ نے بھی افسوس و ندامت کا اظہار کیا۔ ان لوگوں کا اس دن جنگ کا ارادہ نہیں تھا، جنگ ان کے اختیار اور فیصلے سے نہیں ہوئی تھی (منہاج السنۃ: ۴/۳۱۷)۔

حضرت علی کی انتہائی شرافت و عظمت:

جنگ جمل کا المیہ (صحیح و معتبر روایات کی روشنی میں) حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی بے پایاں شرافت، پاک نفسی و بلند ظرفی، خلوص و وفا اور عظمت کردار کا آئینہ دار ہے، وہ جنگ میں غالب آئے۔ (صحیح روایات میں ہے کہ) جیسے ہی

---

۱ اس بابت مزید تحقیق کے لیے ملاحظہ ہو: عبد الحمید الازہری کا مقالہ: هل صح رمي مروان لطلحة۔ ALUKAH.NET پر۔

۲ السنۃ لعبد اللہ بن احمد: ۲/۵۶۶، ۵۸۹۔ بسند صحیح۔ و مصنف ابن ابی شیبہ: ۷/۵۴۵۔

معرکہ ٹھنڈا پڑا، حضرت علیؓ نے اعلان کروایا کہ بس ہاتھ روک لیا جائے۔ کسی بھاگتے کا نہ پیچھا کیا جائے نہ کسی زخمی کو مارا جائے۔ جو بھی ہتھیار ڈال دے وہ محفوظ ہے۔ اس روایت کی خاص بات یہ ہے کہ اس کے راوی حضرت مروان ابن الحکمؒ ہیں، جو حضرت علیؓ کے مخالف لشکر کے اہم لوگوں میں تھے۔ وہ حضرت حسینؓ کے صاحبزادۂ عالی مقام حضرت علی زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ سے کہتے ہیں کہ میں نے آپ کے جد امجد یعنی حضرت علیؓ سے زیادہ غالب آنے کے بعد کریم النفسی کا معاملہ کرنے والا نہیں دیکھا۔ جنگ جمل میں جب وہ ہم پر غالب آ گئے، تو ان کی طرف سے یہ اعلان کیا گیا کہ کسی واپس جاتے کا پیچھا نہ کیا جائے، نہ کسی سے کوئی مواخذہ کیا جائے[۱]۔ مروان رحمۃ اللہ علیہ نے یہ شہادت اس وقت دی جب وہ مدینہ کے گورنر تھے اور (بقول زہری، بسند صحیح[۲]) زین العابدین علی بن حسینؒ کے ان سے بہت اچھے روابط تھے۔ وہ حضرت مروان کے شاگرد بھی تھے اور مطیع و فرماں بردار بھی۔

فریق مخالف سے محبت اور اس کے لیے دعا:

جنگ ختم ہوئی، سیدنا علیؓ میدان میں نکلے تو درد و غم کی تصویر تھے۔ حضرت طلحہ کی نعش پر پہنچے تو ان کو بٹھایا، خود ہاتھ سے مٹی صاف کرتے جاتے تھے اور روتے جاتے تھے، ان کے حق میں دعائے رحمت کی اور کہنے لگے: کاش آج سے بیس سال پہلے ہی مجھ کو موت آ گئی ہوتی[۳]۔ میدان میں حضرت طلحہ کے صاحبزادے محمد کی لاش دیکھ کر پاس بیٹھ گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا، اور کہا: اللہ اس پر رحم کرے۔ خدا کی قسم بڑا نیک جوان تھا[۴]۔

سیدنا علیؓ کے گھر میں بھی سخت رنج والم کا ماحول تھا، اہل خانہ اور صاحبزادیاں رو رہی تھیں کہ حضرت علیؓ آ گئے اور ان کو رونے سے منع کیا۔ نیز فرمایا کہ ہم لوگ اس آیت کے ان شاء اللہ مصداق ہوں گے:

ونزعنا ما فی صدورھم من غل إخوانا علی سرر متقابلین۔ (سورہ حجر: ۴۷)

ان کے دلوں میں جو کچھ رنجش ایک دوسرے سے ہوگی ہم جنت میں اسے نکال پھینکیں گے، وہ بھائی بھائی بن کر آمنے سامنے اونچی نشستوں پر بیٹھے ہوں گے۔

پھر کئی بار فرمایا: ہم نہ ہوں گے تو کون اس کا مصداق ہوگا؟ (مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۷۷۹۵۱ بسند حسن)

حضرت طلحہؓ کے ایک دوسرے بیٹے عمر کچھ عرصہ بعد ملنے آئے تو آپؓ نے ان کا بڑی گرم جوشی محبت سے استقبال کیا اور کہا میں اور تمہارے والد طلحہؓ ان شاء اللہ ان لوگوں میں سے ہوں گے جن کے بارے میں اللہ کا

---

[۱] مصنف ابن ابی شیبہ: ۷/ ۵۴۵ بسند صحیح، فتح الباری: ۱۳/ ۵۷۔ سنن سعید بن منصور: ۲/ ۳۸۹، ۳۹۰ بسند حسن۔

[۲] تاریخ ابی زرعۃ الدمشقی: ۴۱۳، ودلائل بیہقی: ۷/ ۲۴۸۔

[۳] طبرانی: ۱/ ۱۱۳، ہیثمی نے اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے، مجمع الزوائد: ۹/ ۱۵۰۔

[۴] المستدرک: ۳/ ۱۱۱، الفتن لنعیم بن حماد: ۱/ ۱۸۱، بسند صحیح۔

وعدہ ہے کہ ان کے دلوں کی رنجش وملال کو نکال کر جنت میں بھائی بھائی بنا کر رکھیں گے۔اس کے بعد وہی مذکورہ آیت پڑھی۔اس کے بعد حضرت طلحہ کے اہل خانہ کا حال پوچھتے رہے۔حضرت علیؓ کے ساتھ بیٹھے کسی جاہل نے کچھ بری بات کہی، تو سخت غصہ ہوئے فرمایا: نکل جا منحوس! اگر میں اور طلحہ اس آیت کے مصداق نہیں ہوں گے تو کون ہوگا؟ اس کے بعد عمر بن طلحہ سے باندازِ شفقت فرمایا: بھتیجے اگر کوئی کام ہو تو مجھ سے بتانا'' [۱]۔

حضرت علی کی شریف النفسی اور حق شناسی کا فوری مظاہرہ ام المومنین حضرت عائشہؓ کے بارے میں ہوا۔ اختلاف اور موقعے کی غمناکی کے باوجود ان کے اعزاز واکرام میں بہت اہتمام فرمایا۔ جنگ تھمتے ہی حضرت عمار بن یاسرؓ اور حضرت عبداللہ بن بدیلؓ حضرت عائشہ کی خدمت میں گئے۔ابھی وہ اونٹ پر ہی تھیں، خود اُن کے کجاوہ کو اونٹ سے اتار کر لائے۔حضرت علی نے ان کو عبداللہ بن بدیلؓ کے خیمے میں بھجوایا، یہ ایک بڑے باحیثیت شخص تھے، ان کے خیمہ میں خدمت کرنے والے اور سامان راحت موجود تھے۔ چنانچہ خواتین نے ان کی خدمت کی [۲]۔ اسی اثنا کسی نے آ کر حضرت علیؓ کو خبر دی کہ دو لوگ ام المومنین کی شان میں گستاخی کی باتیں کر رہے ہیں۔آپ نے قعقاع بن عمرو کو حکم دیا کہ دونوں کو سو سو کوڑے لگائیں [۳]۔

حضرت عائشہؓ نے مدینہ واپسی کا ارادہ فرمایا تو بصرہ کی چالیس معزز خواتین کا قافلہ ساتھ میں بھیجا۔راستہ کی سواریوں اور زادراہ کا انتظام فرمایا۔اور اپنے ربیب (پسرِ زن) محمد بن ابی بکر [۴] (جو حضرت عائشہ کے بھائی تھے) کو ساتھ بھیجا۔رخصت کرنے کے لیے خود ملنے آئے۔ بہت لوگ جمع تھے۔ایک عجیب غم انگیز لیکن پرسکون منظر تھا۔حضرت عائشہ نے نصیحت فرمائی کہ: میرے بیٹو! کوئی کسی سے دل میں شکایت نہ رکھے۔پھر حضرت علیؓ کی تعریف وستائش فرمائی۔حضرت علیؓ نے بھی لوگوں کو ام المومنین کی تعظیم واکرام کی تاکید فرماتے ہوئے کہا کہ یہ تمہارے نبی کی دنیا اور آخرت کی بیوی ہیں (طبری: ۴/ ۵۴۴)۔

یہ حضرات باغی نہیں تھے:

اللہ تعالی کے نزدیک (اہل جمل) حضرت عائشہ اور حضرات زبیر اور طلحہ کی جماعت کی حیثیت مسلمانوں

---

[۱] مستدرک: ۳/ ۴۲۴ حاکم اور ذھبی دونوں نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔کیا ہی اثر انگیز واقعہ ہے! راقم سطور جب یہ سطریں حوالۂ قرطاس کر رہا ہے، تو آنکھیں اشکبار ہیں۔

[۲] مصنف ابن ابی شیبہ: ۷/ ۵۴۵ بسند صحیح، فتح الباری: ۱۱/ ۵۷۔

[۳] البدایۃ والنھایۃ: ۷/ ۲۴۷۔

[۴] خوردسال محمد بن ابی بکر کو حضرت علی نے پالا تھا اور وہ حضرت علی کی جماعت کے اہم لوگوں میں تھے۔

کے خلیفہ (سیدنا علی) کے خلاف بغاوت و جنگ کرنے والوں کی نہیں تھی، اس لیے کہ یہ حضرات جنگ کی نیت سے نہیں نکلے تھے۔ جنگ تو اتفاقاً چھڑ گئی تھی۔ اس کی ایک بڑی واضح دلیل یہ ہے کہ حضرت طلحہؓ اس جنگ میں سب سے پہلے قتل ہوئے ہیں۔ اور ان کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے شہید ہونے کی پیشین گوئی فرمائی تھی (صحیح مسلم: ۲۴۱۷)۔ ظاہر بات ہے کہ باغی اگر قتل کیا جاتا ہے تو اس کی موت شہادت نہیں ہوتی۔

جنگ جمل کے اس سانحے میں اگرچہ براہ راست حضرت معاویہؓ کا کوئی حصہ نہیں تھا، لیکن تاریخ کی تشکیل اور مستقبل کے واقعات میں ان واقعات کا بہت بڑا کردار اور حصہ تھا۔ ہم نے سوانح معاویہؓ میں اس کی تحقیق اس لیے ضروری سمجھی کہ اس کی تفصیل کے بغیر اس فتنے کو سمجھنا ممکن نہیں تھا جس سے آئندہ دور میں حضرت معاویہؓ کو گزرنا پڑا۔

کئی عمال عثمانی کی معزولی کا فیصلہ:

اس صورتحال میں سیدنا حضرت علیؓ نے کئی عمال عثمانی کو معزول کر کے دوسرے عمال طے فرمائے۔ (غالباً یہ فیصلہ خلیفہ بننے کے فوراً بعد فرمایا تھا) ان میں حضرت معاویہؓ سرفہرست تھے۔ ابن کثیر کا بیان ہے کہ حضرت علی کے امراء میں جو قاتلین عثمان تھے، ان کا اصرار تھا کہ حضرت معاویہؓ کو ضرور معزول کیا جائے۔ ظاہر بات ہے کہ ان کو ضرور یہ خطرہ رہا ہوگا کہ معاویہ اگر نظام حکومت میں باقی رہیں گے تو حضرت علی ان باغیوں پر اتنے منحصر نہیں ہوں گے اور حضرت معاویہؓ ضرور ان کو سزا دلوا کے رہیں گے۔ جب کہ حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت حسن کی رائے تھی کہ ان کو معزول نہ کیا جائے، لیکن حضرت علیؓ نے ان کا مشورہ قبول نہیں کیا (تاریخ دمشق: ۵۹/ ۱۱۸)۔

بعض علماء کو تعجب ہے کہ معزولی کے اس فیصلہ کی کیا ضرورت تھی؟ لیکن اگر حالات اور ان کے پس منظر پر نظر ہو تو سیدنا حضرت علیؓ کا نقطہ نظر آسانی سے سمجھ میں آ سکتا ہے۔ پہلی بات تو ابن کثیر نے نقل کی ہے کہ حضرت علیؓ کے لشکر میں باغیوں کی موثر شرکت تھی۔ اور ان کا اصرار تھا کہ ان عمال کو ضرور معزول کیا جائے۔ پھر کئی سال سے حضرت عثمان اور ان کے کئی والیوں کے خلاف شکایات اور پروپیگنڈے کا جو سلسلہ جاری تھا، اسی کے ذریعے باغیوں اور فتنہ پروروں نے حالات کو اس انتشار و فساد تک پہنچایا تھا۔ اس بے اعتمادی کی فضا کے ساتھ سیدنا حضرت علیؓ کس طرح کام کر سکتے تھے؟ خصوصاً اس لیے بھی کہ نئے سیاسی حالات میں مدینہ مرکز ثقل نہیں تھا، بلکہ کوفہ و بصرہ اور مصر و یمن کے قبائل اور مہاجر افواج کی قوت ہی حضرت علی کی حکومت کی طاقت تھی۔ اور وہ خود کہتے تھے کہ باغی ان پر حاوی ہیں۔ لہٰذا اگر انہوں نے یہ چاہا ہو کہ اس مشکوک فضا کا یکسر خاتمہ کر کے ایک نئی انتظامیہ

سے کام لیا جائے تو کچھ عجب نہیں۔

حضرت علیؓ نے حضرت معاویہؓ کی جگہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو مقرر کرنا چاہا، مگر انہوں نے معذرت کر دی۔ پھر حضرت ابن عباس کو گورنر بنانا چاہا، وہ بھی راضی نہیں ہوئے۔ اس کے بعد حضرت سہل بن حنیف کو بھیجا، مگر حضرت معاویہؓ نے یہ کہہ کر تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ پہلے حضرت عثمان کے قاتلوں کو سزا دی جائے، ہم اس کے بعد حضرت علی کی بیعت کریں گے ۱۔

حضرت معاویہ اور اہل شام بھی باغیوں کی سرکوبی اور زور توڑنے کا مطالبہ کرتے ہیں:

دوسرے صحابہ کی طرح باغیوں کی دارو گیر اور ان کا زور توڑنے کا مطالبہ شامی محاذ سے بھی شدت سے سامنے آیا۔ جس کے قائد حضرت معاویہؓ تھے۔ حضرت نعمان بن بشیرؓ مدینے سے دمشق پہنچے اور شہادت کے اندوہ گیں مناظر و حالات کی خبریں سنائیں، تو حضرت معاویہؓ سمیت وہاں مقیم صحابہ کرام میں سخت غم وغصہ کے وہی احساسات پیدا ہوئے جو مدینہ کے صحابۂ کرام خصوصاً حضرت طلحہ و زبیر اور حضرت عائشہ وغیرہ کے تھے۔ حضرت معاویہ اور ان کے ساتھ صحابہ کی ایک جماعت نے قاتلوں کی سزا اور حکومت سے باغیوں کو الگ رکھنے کا پرزور مطالبہ کیا۔ اور شام کے لوگوں کو اس کے لیے ابھارنا شروع کیا ۲۔

حضرت معاویہؓ کی صلح پسند طبیعت:

حضرت معاویہ جنگ سے بچنا چاہتے تھے، جنگ جمل کے موقع پر ان کو معلوم تھا کہ حضرت علیؓ ان کے خلاف جنگ کا عزم کر چکے ہیں، اس لیے کہ اصلاتو وہ شام ہی کا قصد رکھتے تھے، مگر جب معلوم ہوا کہ مکہ سے حضرات طلحہ و زبیر اور ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہم بصرے کا قصد کر کے نکل چکے ہیں تو انہوں نے عنان سفر عراق کی طرف موڑ دی تھی۔ اس وقت اگر حضرت معاویہ حضرات طلحہ و زبیر اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم کا ساتھ دینے بصرہ آ جاتے، تو بظاہر اسباب یہ اتحاد بہت بھاری پڑتا، مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔

حضرت علیؓ کی خلافت اور حضرت معاویہؓ کا موقف:

حضرت علی کی خلافت کا آغاز ایسے پرآشوب حالات کے درمیان اور پرفتن واقعات کے بعد ہوا تھا کہ صحابۂ کرام باہم اختلاف سے نہیں بچ سکے۔ ان اختلافات میں سب سے زیادہ آزمائش سیدنا حضرت علی اور

۱۔ طبری: ۴/۴۴۲۔

۲۔ تاریخ دمشق: ۵۹/۱۲۲۔ نیز تاریخ الاسلام، ذھبی: ۳/۵۳۹۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کی تھی۔ اور جب یہ سامنے آیا کہ باغیوں کے مقابلے کے سلسلہ میں حضرت علیؓ اپنی بے بسی کا اظہار فرما رہے ہیں (جو بالکل حقیقت کے مطابق تھا) تو حضرت معاویہؓ نے اہل شام کو ابھارنا شروع کیا کہ ان مفسدوں کی طاقت کی توڑنے کے لیے کمر کسیں۔ اِن میں حضرت عبادہ بن الصامتؓ نیز حضرت ابوامامہ باہلیؓ، حضرت عمرو بن عنبسہؓ اور اکابر تابعین کی ایک جماعت حضرت معاویہؓ کے ساتھ تھی[۱]۔

یہ حضرات شام میں حالات پر لگاتار غور وخوض کر رہے تھے۔ اسی سلسلے میں حضرت معاویہ کو حضرت نعمان بن بشیرؓ نے ایک حدیث بھی سنائی، جو انھوں نے شہادت عثمانی کے بعد حضرت عائشہؓ سے سنی تھی، کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عثمانؓ سے فرمایا تھا کہ اللہ تم کو خلافت کی قباء پہنائے گا۔ اگر ''منافقین'' تم کو اس سے دستبردار ہونے پر مجبور کریں تو تم دستبردار نہ ہونا، یہاں تک کہ مجھ سے آملنا (یعنی شہید ہو جانا)۔ آپ ﷺ نے حضرت عثمان سے یہ بات تین مرتبہ فرمائی۔ لسان نبوت سے باغیوں کو منافق کہے جانے کی وجہ سے حضرت معاویہؓ کو اس حدیث میں اپنے موقف کی ایسی تائید نظر آئی کہ انہوں نے حضرت عائشہ سے درخواست کی کہ وہ یہ حدیث ان کو لکھ کر بھیج دیں۔ سو انہوں نے پورا واقعہ لکھ کر ان کو بھیجا۔ (مسند احمد: ۲۴۵٦٦، بسند صحیح)۔ اس سے شامی حضرات میں شدت سے احساس پیدا ہوا کہ باغیوں کی سرکوبی دین وشریعت اور مسلمانوں کے اقتدار کو صحیح ہاتھوں میں باقی رکھنے کے لیے سخت ضروری ہے۔

اسلام کی خلافت کو جس طرح تاراج اور بے عزت کیا گیا تھا؛ اس کے بعد یہ کیسے ممکن تھا کہ امت کی ایک بڑی تعداد باغیوں کی سرکوبی کے لیے متحرک و پرعزم نہ ہو اور مستقبل میں ایسے فتنوں کا سدباب کرنے کے لیے اپنے بس بھر سب کچھ کر گزرنے کے لیے میدان میں نہ آئے؟؟ پھر سیدنا عثمانؓ کا قتل ایسی بے رحم اور وحشیانہ شکل میں کیا گیا تھا، جس سے دینی غیرت وجذبات کا حرکت میں آنا یقینی تھا۔ سیدنا علیؓ اور ان کی ہم رائے جماعت اگرچہ حالات کے پیش نظر اپنے آپ کو مجبور پاتی تھی اور حکمت و مصلحت کا تقاضہ سمجھتی تھی کہ باغیوں کو فی الوقت سزا نہ دی جائے، لیکن فطری تھا کہ کوئی اور نقطۂ نظر ہو جو عین اسلام کی مصلحت اور اس کی سیاسی قوت کے لیے ضروری خیال کرتا ہو کہ سب سے پہلے اسی خطرہ سے نپٹا جائے۔ حضرت معاویہؓ کی رائے حضرات زبیر وطلحہ وعائشہ رضی اللہ عنہم کی طرح یہی تھی۔

صحابۂ کرام ہر چیز میں رسول اللہ ﷺ کی آگاہیوں اور ہدایات کی طرف نظر کرتے تھے۔ ایک اہم مجلس مشاورت کے دوران، شام میں، دو صحابیوں نے ایک حدیث سنائی۔ حضرت معاویہ کے یہاں کسی فوجی مرکز

---

[۱] البدایہ والنہایۃ: ۷/۲۵۵۔

میں اعیان حکومت کا اجلاس منعقد ہوا، بہت سے لوگوں نے گفتگو کی۔ سب سے اخیر میں حضرت مرہ بن کعبؓ کھڑے ہوئے اور کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک حدیث سنی ہے۔ لوگ اٹھ چکے تھے، لیکن حضرت معاویہ نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک سنا تو لوگوں کو بٹھایا۔ مرہ بن کعبؓ نے سنایا کہ ہم چند لوگ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مستقبل قریب میں آنے والے ایک فتنے کا ذکر فرمایا اور حضرت عثمانؓ کے بارے میں فرمایا کہ یہ اور ان کے ساتھی اس وقت حق پر ہوں گے۔ یہ سن کر مجلس میں موجود حضرت عبداللہ بن حوالہ ازدیؓ نے حضرت مرہؓ سے پوچھا: تم نے بھی یہ حدیث سنی ہے؟ پھر کھڑے ہو کر کہا: میں گواہی دیتا ہوں کہ میں بھی اس موقعہ پر موجود تھا[1]۔ اہل شام کو (ان کے خیال میں) اپنے برسر حق ہونے اور مطالبۂ قصاص کو اولیت دینے کی تائید اس حدیث سے بھی ملتی تھی۔

حضرت علیؓ کی بیعت سے انکار میں حضرت معاویہؓ کا نقطۂ نظر:

سیدنا علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے اختلاف کی بنیاد بس یہی تھی کہ سیدنا علیؓ حضرت معاویہؓ سے بیعت اور معزولی کا مطالبہ کرتے تھے اور حضرت معاویہؓ کہتے تھے کہ پہلے خلیفہ کے قاتلوں کو سزا دی جائے۔ حضرت علی کی حقانیت کے قائل ہونے کے باوجود، حضرت معاویہؓ یقیناً اس کے مستحق ہیں کہ ان کے نقطۂ نظر اور موقف کو سمجھا اور بیان کیا جائے۔ مگر بزم تاریخ میں غلو پسندوں کے پروپیگنڈے کا ایسا شور ہے، کہ سوائے علمائے راسخین کے کسی کو سوجھتا بھی نہیں کہ معاویہ جیسے صحابی کے پاس اپنے موقف کے لیے کوئی دلیل یا وجہ جواز (Justification) بھی ہوگا۔ ہم درج ذیل امور کے ذریعے ان کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

(۱) سب سے پہلی بات تو یہ کہ سیدنا عثمانؓ جیسی محبوب و عظیم ہستی کی شہادت اور سنگ دلانہ قتل خود مسلمانوں کو برانگیختہ کرنے کے لیے کافی تھا۔ (۲) مزید وہ احادیث بھی سامنے تھیں جو حضرت عثمان کے خلاف بغاوت کرنے والوں کو ''اصحاب فتنہ'' اور ''منافق'' تک بتاتی ہیں۔ (۳) تیسری چیز لوگوں کو یہ بھی دِکھتا تھا کہ یہ باغی اقتدار کے مرکز میں ہیں اور غالب و حاوی ہیں۔ اس بنا پر حضرت معاویہ (اور ان سے بھی پہلے حضرات طلحہؓ و زبیرؓ و عائشہؓ جیسے کچھ دیگر صحابہ کو) یہ لگتا تھا کہ وقت کی پہلی ضرورت یہ ہے کہ اس خطرناک باغی جماعت کی سرکوبی کی جائے۔ یہی سب سے قابلِ ترجیح کام ہے۔ اسلام کی حفاظت، اس سے وفاداری اور مسلمانوں کی خیرخواہی کا

---

[1] مسند احمد ۱۸۰۶۷۔۱۸۰۶۸،۱۸۰۶۸، مستدرک حاکم: ۱۰۹/۳ اور حاکم اور ذھبی نے اس کو بخاری و مسلم کی شرط پر قرار دیا ہے۔ نیز اس واقعہ کو ابن حوالہؓ کے حوالہ سے امام احمد نے بھی بسند صحیح روایت کیا ہے (مسند ۱۷۰۰۴)۔

یہی تقاضہ ہے، جس کو مؤخر کرنا ممکن نہیں۔ ورنہ اسلامی اقتدار کی ہیبت و رعب جاتا رہے گا اور جس فتنہ گر گروہ کا جی چاہے گا وہ خلیفہ کو قتل کر دے گا اور اپنے مطالبات مسلط کرے گا۔

یہ اختلاف حضرت علیؓ کی افضلیت یا خلافت کی اہلیت میں نہیں تھا۔ نہ مسئلہ یہ تھا کہ حضرت معاویہؓ خود خلافت کا مطالبہ کرتے تھے۔ بلکہ حضرت معاویہ اور شام کے حضرات حضرت علیؓ کے خلافت کے مستحق ہونے کے مسلسل اقراری تھے۔لیکن ان کا اصرار یہ تھا کہ ہم موجودہ صورتحال میں، کہ قاتلان عثمان دندناتے پھر رہے ہیں اور حضرت علی کی حکومت میں ان کو اہم مقام اور طاقت حاصل ہے، حضرت معاویہ کی معزولی کو قبول کر کے بیعت نہیں کر سکتے۔ بلکہ یقینی طور پر حضرت معاویہ کے دل میں یہ اندیشہ بھی ہوگا کہ باغی ٹولہ ان کو بھی قتل کر سکتا ہے۔ اور معزول ہو جانے کے بعد وہ بے بس اور بچانے والی کسی فوج یا لشکر کی طاقت سے محروم ہوں گے، پھر ان کو بچانے والا کوئی نہیں ہوگا[۱]۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ کہتے ہیں:

معاوية لم يدع الخلافة ولم يبايع لا حين قاتل عليا ولم يقاتل على انه خليفة ولا انه يستحق الخلافة، ويقرون له بذلك، وقد كان معاوية يقر له بذلك لمن سأله عنه "(مجموع الفتاوى: ۷۲/۳۵۔)

حضرت معاویہ نے اپنے خلیفہ ہونے کا دعویٰ کیا نہ جنگ کے وقت کسی نے ان کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کی۔ نہ ان کا یہ دعوی تھا کہ ان کو خلافت کا استحقاق ہے۔ شیعہ بھی اس کا اقرار کرتے ہیں۔ اور پوچھنے والوں کے جواب میں حضرت معاویہ بھی اس کو تسلیم کرتے تھے۔

یحیی بن سلیمان الجعفی نے جنگ صفین سے متعلق اپنی تصنیف میں قابل اعتماد سند سے بیان کیا ہے کہ مشہور عالم تابعی ابو مسلم خولانی (اور ان کے ساتھ علماء کی ایک جماعت) حضرت معاویہ کے پاس آئے اور ان سے دریافت کیا کہ حضرت آپ حضرت علی کے مقابل میں خلافت کے مدعی ہیں؟ یا اپنے کو ان کے مساوی درجہ کا خیال کرتے ہیں؟ حضرت معاویہ نے کہا کہ نہیں! نہیں! وہ مجھ سے افضل بھی ہیں اور خلافت و امامت بھی ان کا ہی حق ہے۔ لیکن یہ بتاؤ کہ عثمانؓ کا ظلماً قتل ہو؟ میں ان کا چچا زاد اور ان کے قصاص کے مطالبے کا ذمہ دار ہوں۔ تم بس اتنا کروا دو کہ حضرت علیؓ قاتلین عثمان کو ہمارے حوالہ کر دیں اور میں ان کو بیعت دے دوں گا[۲]۔ حضرت معاویہؓ کا یہ نظریہ اور موقف حضرت عثمان کی شہادت کے بعد سے آخر تک مسلسل قائم رہا۔

---

[۱] علی محمد الصلابی: علی بن ابی طالب: ۶۲۶/۲۔

[۲] تاریخ دمشق: ۱۳۲/۵۹، بسند یحیٰی بن سلیمان جعفی، حافظ ابن حجر نے اس کی سند کو جید قرار دیا ہے، فتح الباری: ۸۶/۱۳۔

حضرت علی اپنا یہ عذر ظاہر کرتے تھے کہ صورت حال ایسی ہے کہ ان قاتلوں اور باغیوں کو ایسی طاقت اور حمایت حاصل ہے کہ ان کے لیے فی الوقت سزا دینا ممکن نہیں ہے (طبری: ۴/ ۴۳۷)۔ ایسی صورت حال میں یہ بات بھی یقینی تھی کہ حضرت معاویہ کو یہ اندیشہ رہا ہوگا کہ وہ معزولی کو قبول کر کے کسی فوجی طاقت سے محروم ہو جاتے ہیں تو خود ان کو بھی خطرہ لاحق ہوگا (معاویہ للصلابی: ۱۰۴)۔

حضرت معاویہؓ اپنے لیے حضرت علیؓ کی بیعت کو شرعی طور پر ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ خلافت جن اہل حل وعقد سے متعلق ہوتی ہے، وہ پہلے مدینہ کے کبار صحابہ کی ذات میں منحصر تھے۔ مگر بعد کے دور میں سلطنت اسلامیہ کی جس طرح توسیع ہوئی، صوبائی قیادتوں نے عروج حاصل کیا اور فوجی امراء کی بڑی تعداد عراق وشام اور مصر وافریقہ میں پائی جاتی تھی، اس لیے شام کے امیر کی حیثیت سے حضرت معاویہؓ اپنے آپ کو اہل حل وعقد کا لازمی حصہ خیال کرتے تھے۔ اور نتیجتاً اپنے آپ کو شرعی طور پر اس کا پابند نہیں سمجھتے تھے کہ وہ حضرت علیؓ کی بیعت کریں[۱]۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ (جیسا کہ ابھی آتا ہے) خود مدینہ کے صحابہ میں سے بھی متعدد حضرات نے بیعت نہیں کی تھی۔ مختصر یہ کہ حضرت معاویہؓ اپنے آپ کو اور ملک کے دیگر بڑے گورنروں کو (جو بڑے سیاسی مرتبے اور عسکری قوت رکھتے تھے) ان اہل حل وعقد کے مرکز میں خیال کرتے تھے، جن کے بغیر کوئی امر اجتماعی نہیں قرار پا سکتا۔

ان حضرات کا خیال تھا کہ ان کا موقف حضرت عثمان کے ساتھ ہے اور حضرت علیؓ کے ساتھ باغیوں اور مفسدوں کی جماعت ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان کے خلاف بغاوت کرنے والوں کو منافق قرار دیا ہے (مسند احمد: ۲۴۵۶۶ بسند صحیح)۔ حضرت معاویہ کو اپنے موقف کی تایید دیگر احادیث سے بھی ملتی محسوس ہوتی تھی۔ ایک دن خطبے کے دوران انہوں نے (اپنی جماعت کے برحق ہونے کی دلیل کے طور پر) حدیث سنائی کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ ''میری امت میں قیامت تک ایک جماعت بہر حال حق پر قائم رہے گی۔ ان کے موقف میں مخالفین کی مخالفت سے کوئی کمزوری نہیں آئے گی''۔ اتنے میں (حضرت معاذ بن جبلؓ کے خاص شاگرد) حضرت مالک بن یخامر اٹھے اور انہوں نے کہا: میں نے حضرت معاذؓ سے سنا کہ وہ اس حدیث میں یہ اضافہ سناتے تھے کہ یہ جماعت شام میں ہوگی۔ حضرت معاویہؓ نے فرمایا: لوگو! سنو، یہ مالک بن یخامر اس حدیث کو معاذ بن جبل سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا تھا کہ 'یہ جماعت شام میں ہوگی' (صحیح بخاری: ۳۶۴۱)۔

---

۱ طبری نے ایک گفتگو نقل کی ہے، جس کے بموجب حضرت علی کے وفد کو حضرت معاویہؓ نے یہی جواب دیا تھا، تاریخ طبری: ۵/ ۶۔

حضرت معاویہؓ کا یہ مطالبہ (مطالبے کی حد تک) ایسا متفق علیہ طور پر حق تھا کہ حضرت عبداللہ بن عباس (جو کہ حضرت علی کے اہم ساتھی اور ان کے موقف کے داعی وحامی تھے) خطبے میں فرماتے تھے کہ اگر حضرت عثمان کے قاتلوں کو سزا دینے کا مطالبہ نہ کیا جاتا تو آسمان سے پتھر برس پڑتے (طبقات ابن سعد: ۳/ ۵۸، معجم کبیر طبرانی: ۱/ ۸۴، بسند حسن)۔ بلکہ خود حضرت علیؓ بھی اصولی طور پر اس سے اتفاق ہی فرماتے تھے۔

یہ حضرت معاویہؓ کے موقف کا بیان تھا۔ جب حالات کے افق سے غبار چھٹ گیا اور بہت سے نئے پہلو علماء امت کے سامنے آئے تو بعد کے لوگوں کے لیے رائے قائم کرنا آسان ہو گیا۔ خصوصاً حضرت عمار کی شہادت اور خوارج سے جنگ نے اس کو زیادہ واضح کر دیا کہ حضرت علیؓ حق کے زیادہ قریب اور حضرت معاویہ کی رائے اور موقف اجتہادی غلطی کے مصداق ہیں[۱]۔

بعض دیگر صحابہ نے بھی نے بیعت سے انکار کیا:

حضرت معاویہ کی مظلومیت کا ایک ادنیٰ نمونہ یہ بھی ہے کہ کسی کو اس کا خیال بھی نہیں ہوتا کہ صحابہ میں سے کئی مشہور ہستیوں کا موقف ان کے ساتھ تھا۔ اور انہوں نے بھی شروع میں ان ہی وجوہات سے بیعت نہیں کی تھی۔ مصنف ابن ابی شیبہ میں نہایت صحیح سند سے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا یہ بیان نقل کیا گیا ہے کہ: علیؓ جب بیعت سے فارغ ہوئے تو میرے گھر تشریف لائے۔ کہا کہ شام میں تم کو محبوبیت حاصل ہے، میں تم کو وہاں کا گورنر بناتا ہوں۔ حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں: میں نے پہلے تو اپنے اور ان کی گوناگوں رشتوں کا ذکر کیا۔ پھر عرض کیا کہ (گورنری تو بعد کی بات ہے، بحالت موجودہ تو) میں ہرگز آپ کی بیعت بھی نہیں کروں گا۔ علی نے مجھ سے کچھ نہیں کہا اور واپس تشریف لے گئے۔

اس کے بعد حضرت عبداللہ بن عمر خاموشی سے اپنی سوتیلی والدہ اور سیدنا علی کی صاحب زادی ام کلثومؓ کے پاس گئے اور ان کو بتایا کہ میں مکہ نکل جا رہا ہوں، اور چلے گئے[۲]۔

طبریؒ اور ابن کثیرؒ نے بیعت نہ کرنے والوں کے نام گنائے ہیں۔ ان میں حضرت عبادہ بن الصامت، نعمان بن بشیر، عبداللہ بن عمر، سعد بن ابی وقاص، صہیب بن سنان، زید بن ثابت، محمد بن مسلمہ، سلمہ بن سلامہ بن وقش، اسامہ بن زید، قدامہ بن مظعون، عبداللہ بن سلام، مغیرہ بن شعبہ، حسان بن ثابت، کعب بن مالک، مسلمہ بن مخلد، ابوسعید الخدری، رافع بن خدیج، فضالۃ بن عبید، اور حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہم شامل ہیں[۳]۔

ان حضرات کے انکار کی وجہ بھی یہی تھی کہ حضرت علیؓ کی جماعت میں باغیوں کا غلبہ تھا، جس کا سیدنا علیؓ

۱۔ حضرت عمار کی شہادت اور خوارج سے جنگ سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیاں آگے آ رہی ہیں۔

۲۔ مصنف: ۱۱/ ۳۰۶۷۱، ۳۲۵ ۷۳۔ واضح رہے کہ اس روایت کی سند (ایوب عن نافع عن ابن عمر) ان اسانید میں سے ہے جن کو دنیا کی سب سے طاقتور سند کہا گیا ہے۔ (النکت علیٰ کتاب ابن الصلاح: ۱/ ۲۵۳)۔

۳۔ البدایۃ والنہایۃ: ۷/ ۲۵۳، طبری: ۴/ ۴۲۹۔۴۳۱۔

بھی اعتراف فرماتے تھے۔ ہاں، ان حضرات اور حضرت معاویہؓ کی حیثیت میں ایک بڑا فرق تھا، وہ یہ کہ وہ ایک اقلیم کے حاکم تھے اور بڑی فوج رکھتے تھے۔ اسی لیے حضرت علیؓ نے اُن لوگوں سے تو کچھ اعتراض نہیں کیا، لیکن حضرت معاویہؓ کو اقتدار سے بے دخل کرنے کی انہوں نے پوری پوری کوشش فرمائی۔

حضرت جریر بن عبداللہ کی سفارت:

جنگ جمل کے بعد حضرت علیؓ نے اپنے ایک گورنر حضرت جریر بن عبداللہؓ کو حضرت معاویہؓ کے پاس اس مضمون کا خط لے کر بھیجا کہ میری بیعت پر مہاجرین و انصار متفق ہو چکے ہیں، لہٰذا آپ امت میں تفریق کا باعث نہ بنیں۔ حضرت جریرؓ نے خط پہنچایا تو حضرت معاویہؓ نے شامی اکابرین و عمائدین سے مشورہ کیا اور بالآخر اس خط کے جواب میں اپنا وہی مطالبہ دہرایا کہ آپ کے لشکر میں باغیوں اور قاتلان عثمان حاوی ہیں۔ پہلے ان کو سزا دیں اس کے بعد میں بیعت کرنے کو تیار ہوں۔ حضرت جریرؓ غالباً اس موقف کی معقولیت سے متاثر ہوئے، انہوں نے حضرت علیؓ کو شامی حضرات کا جواب پہنچایا اور ساتھ ہی گورنری سے اپنا استعفیٰ پیش کر کے قرقیسیا (شام) چلے گئے۔ اور بہت سے دیگر اکابر صحابہ کی طرح عزلت نشین اور یکسو ہو کر بیٹھ گئے [1]۔ اور پھر مدۃ العمر کسی فریق کا ساتھ نہیں دیا [2]۔

حضرت علیؓ جنگ کا ارادہ کرتے ہیں:

اس کے بعد حضرت علیؓ نے بصرہ اور (خاص طور پر) کوفہ سے اپنے موقف کے حامیوں کا لشکر جمع کیا۔ اور شام کے اقتدار کے خلاف جنگ کا وہ اقدام کیا جس کو ان کا دل کسی طرح پسند نہیں کرتا تھا۔ مگر ان کے نزدیک وہ ان کا فرض اور اسلام اور اسلامی ریاست کی خیر خواہی کا تقاضہ تھا۔ اصل میں حضرت علیؓ تو مدینہ ہی میں اس اقدام کا ادارہ کر چکے تھے۔ ساری تیاریاں تقریباً مکمل تھیں، کہ حضرت طلحہ و زبیر اور ام المومنین کے عازم بصرہ ہونے کی خبر ملی تو عنان سفر عراق کی طرف موڑ دی۔ اس وقت سیدنا حسنؓ نے ان کو حضرت معاویہؓ کے خلاف اقدام سے کو روکنا چاہا تھا، مگر انہوں نے اُس کو ترجیح دی جسے اپنا فرض و ذمہ داری سمجھا (البدایہ والنہایۃ: ۷/۲۵۷)۔ حضرت معاویہؓ کو جب حضرت علیؓ کی فوج کشی کی اطلاع ہوئی تو وہ بھی اپنے مرکز سے اپنی افواج لے کر عراق کی طرف چلے۔ روایات میں دونوں فوجوں کی تعداد ایک ایک لاکھ کے آس پاس بتائی گئی ہے۔ لیکن ڈاکٹر عبدالحمید فقیہی کے نزدیک وہ روایات قابل ترجیح ہیں جو حضرت علیؓ کے لشکر کی تعداد ۵۰ ہزار اور حضرت معاویہؓ کی فوج کی تعداد ۶۰ ہزار بتاتی ہیں [3]۔

---

[1] البدایۃ والنہایۃ: ۷/۲۸۲۔

[2] الاصابۃ۔ تذکرہ جریر بن عبداللہ بجلی۔

[3] خلافۃ علی ص: ۱۸۶، ۱۹۴۔ بحوالہ تاریخ خلیفہ: ۱۹۳۔

شیعی پروپیگنڈے کی ایک مثال:

مؤرخین نے ذکر کیا ہے کہ شامی افواج نے صفین کے پانی پر قبضہ کرلیا، اور کئی دن تک پانی پر جنگ چلتی رہی۔ آخر حضرت علی کے لشکر نے پانی چھین لیا۔ اب شامیوں کو پانی کی پریشانی ہونے لگی۔ بعض روایات بتاتی ہیں کہ آخر حضرت علیؓ نے حکم دیا کہ شام والوں کو بھی پانی پینے دیا جائے۔

ذرا سوچیے: صفین گاؤں نہر فرات کے کنارے ہے۔ آج شام کا شہر رقہ وہیں ہے۔ یہ کوئی پہاڑی علاقہ بھی نہیں۔ کسی پچاس ہزار کی فوج کو چشمہ یا کنویں سے تو روکا جاسکتا ہے، مگر کیا فرات جیسی طویل ندی سے بھی روکا جاسکتا ہے؟ یہاں تک کہ لوگوں کے پیاسے مرنے کا ڈر ہونے لگے؟ مگر حد ہے، کسی کو اتنی بدیہی بات بھی نہیں سوجھتی؟؟ کیسی مضحکہ خیز بات ہے؟ بس حضرت معاویہ اور ان کے ساتھ کے لوگوں کو ظالم و بے درد دکھانے کی کوشش ہے۔ ایسی ہے مضحکہ خیز کہانی کربلا کے قصے میں بھی تیار کی گئی ہے۔

صلح کی کوششیں:

حضرت علیؓ ذی الحجہ ۳۶ھ سے پہلے صفین پہونچ چکے تھے۔ تقریبا دو ماہ دونوں فوجیں آمنے سامنے رہیں، تاریخی روایات کے مطابق ذی الحجہ کے پورے ماہ مسلسل چھوٹی چھوٹی جھڑپوں کا سلسلہ چلتا رہا۔ لیکن ساتھ ہی دونوں طرف سے صلح کی کوششیں جاری رہیں۔ شامی صحابہ میں سے حضرت ابوامامہ باہلیؓ نے بھی مصالحت کی کوشش کی، مگر کامیاب نہیں ہوئی، پھر یہ چھوڑ کر چلے گئے اور کسی طرف سے جنگ میں حصہ نہیں لیا۔ بڑی تعداد میں علماء وصلحاء کی جماعت مصالحت کا راستہ ڈھونڈنے کے لئے سلسلہ جنبانی کرتی رہی۔ محرم کا پورا مہینہ مذاکرات ومراسلات میں گزرا، لیکن بات وہیں آکر اٹک جاتی تھی جہاں اب تک اٹکتی رہی تھی: یعنی حضرت علیؓ کا اصرار کہ معاویہ اطاعت قبول کریں، بیعت کریں اور اپنی حکومت وافواج سے دست بردار ہوں۔ اور حضرت معاویہؓ کا مطالبہ کہ پہلے حضرت علیؓ کی جماعت میں موجود قاتلوں سے قصاص لیا جائے۔ (البدایۃ والنھایۃ: ۷/ ۲۸۷، ۲۸۸)۔

آخر جنگ ہوتی ہے:

پہلی صفر بدھ کے دن سے باقاعدہ جنگ شروع ہوتی ہے، واقعات کی تفصیل سے کوئی فائدہ نہیں۔ یہ کوئی رزمیہ کا موضوع نہیں ہے۔ اسلام کا سب سے قیمتی سرمایہ کشت وخون کی نذر ہو رہا تھا۔ یہ وہ فتنہ تھا جس سے جہاد کی فتوحات یک سر رک گئی تھیں۔ اس المیہ سے ہر مومن کا دل رنجیدہ ہوتا ہے۔ ۹ دن تک جنگ ہوتی رہی، روایات ہیں کہ ساٹھ ستر ہزار مسلمان اس نامبارک جنگ کی نذر ہو گئے۔ اگرچہ محققین اس تعداد کو غیر معمولی مبالغہ سمجھتے ہیں، اتنی، بلکہ اس کی نصف تعداد قادسیہ جیسی بڑی جنگ میں بھی نہیں کام آئی تھی۔ لہذا یہ تو صحیح نہیں۔ لیکن بہر حال

جتنی بھی ہو، وہ تھی زیادہ ہی۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون۔

دونوں فریق اپنی شرطوں کو مؤخر کرکے صلح کو پسند کرتے ہیں:

آخر جب جنگ سے مزید تباہیوں کا خطرہ نظر آنے لگا۔ تو صحابۂ کرام نے صلح کی۔ اور وہ اس طرح کہ حضرت معاویہؓ کی طرف سے آواز لگائی گئی کہ او مسلمانو! اللہ کی کتاب پر صلح کرلو۔ حضرت علیؓ کی طرف سے فوراً مثبت جواب گیا۔ ایک گروہ نے اگرچہ مخالفت کی، یہ خوارج کا سخت گیر گروہ تھا، مگر سیدنا علیؓ نے صلح ہی پسند فرمائی۔ اوران کے ایماء پر حضرت سہل بن حنیف نے اس کے حق میں تقریر فرمائی اور لوگوں کو مطمئن کیا (مسند احمد : ۱۵۹۷۵، بسند صحیح علیٰ شرط الشیخین)۔ بہرحال یہ ثابت ہے کہ سیدنا حضرت علیؓ نے اول وہلہ میں ہی صلح کو پسند فرمایا اور یہ (مستقبل کے) خوارج تھے جنہوں نے اس کی مخالفت کی۔

حضرت علیؓ کی طرف سے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور حضرت معاویہؓ کی طرف سے حضرت عمرو ابن العاصؓ حکم ٹھیرے۔ اور یہ قرار پایا کہ مسئلۂ متنازعہ میں یہ دونوں جو فیصلہ کردیں گے، اس کو دونوں فریق مان لیں گے۔ اسی پر دونوں فریق اپنے اپنے مستقر پر واپس گئے اور جنگ تھم گئی۔ یہ صفر ۳۷ھ کا واقعہ ہے۔ اس واقعہ کو تحکیم کا واقعہ کہتے ہیں۔ معتبر روایات اتنا بتاتی ہیں کہ صلح کے بعد دونوں فوجیں اپنے اپنے علاقوں کو واپس چلی گئیں۔ کچھ عرصہ کے بعد دونوں حکم دومۃ الجندل کے مقام پر ملے۔ مگر کسی نتیجہ تک نہیں پہنچ سکے۔

صلح کی صحیح اور مستند روایت:

صلح کی جو صحیح اور قوی و مستند روایت بخاری اور مسند احمد وغیرہ کتب حدیث میں ہے، وہ بتاتی ہے کہ سیدنا علیؓ نے حضرت معاویہؓ کی پیشکش کو بخوشی قبول ہی نہیں کیا، بلکہ پسند فرمایا۔ تابعی بزرگ ابووائل شقیق بن سلمہؒ صفین میں حضرت علی کی جانب سے شریک تھے۔ بخاری کی روایت کے مطابق، وہ بیان کرتے ہیں کہ شامی گروہ نے تحکیم پر صلح کی اپیل کرتے ہوئے سورۂ آل عمران آیت: ۲۳ پڑھی: أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِنَ الْكِتَابِ يُدْعَوْنَ إِلَى كِتَابِ اللَّهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلَّى فَرِيقٌ مِنْهُمْ وَهُمْ مُعْرِضُونَ" (کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب (الٰہی) کا کچھ حصہ ملا تھا، اُن کو اللہ کی کتاب کی طرف بلایا جاتا ہے کہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے، اس کے باوجود ان میں سے ایک گروہ منہ موڑ کر چل دیتا ہے؟) سیدنا حضرت علیؓ نے جیسے ہی قرآن پر صلح کی یہ ندا سنی؛ فوراً کہا: ضرور، اور جنگ روک دی (صحیح بخاری: ۴۸۴۴)۔ یہ بخاری کی روایت ہے۔ کچھ تفصیل سے مسند احمد و سنن النسائی الکبریٰ، میں یہی روایت بخاری کی ہی سند سے آئی ہے، لہٰذا

اسی درجہ کی صحیح ہے۔اس میں ہے کہ جب شامی لشکر میں بہت لوگ مارے گئے تو انھوں نے ایک پہاڑی پر چڑھ کر پناہ لی۔عمرو بن العاص ؓ نے معاویہ ؓ سے کہا کہ علی ؓ کے پاس ایک قرآن مجید لے کر کسی کو بھیجو اور کہو اِس پر ہم صلح کر لیتے ہیں۔ مجھے یقین ہے علی ؓ تمہاری یہ بات رد نہیں کریں گے، "أَرْسِلْ إِلَى عَلِيٍّ بِمُصْحَفٍ، وَادْعُهُ إِلَى كِتَابِ اللّٰهِ، فَإِنَّهُ لَنْ يَأْبَى عَلَيْكَ" ایک قاصد حضرت علی ؓ کے پاس قرآن مجید کا نسخہ لے کر آیا اور قرآن کی آیات پڑھ کر تحکیم کی دعوت دی کہ: "بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ كِتَابُ اللّٰهِ"۔حضرت علی ؓ نے سنتے ہی فرمایا:

"نَعَمْ أَنَا أَوْلَى بِذٰلِكَ، بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ كِتَابُ اللّٰهِ"

ہاں! تم لوگوں سے زیادہ مجھ پر حق ہے کہ صلح قبول کروں۔ ہمارے درمیان قرآن فیصلہ کرے گا۔

اور تحکیم کی پیشکش قبول فرمالی۔ابووائل کہتے ہیں کہ خوارج نے (جن کو ہم اس وقت قرّاء کہتے تھے) اس پر اعتراض کیا، تو حضرت سہل بن حنیف ؓ نے ان کی فہمائش کے لیے ایک تقریر کی اور تحکیم کی تایید فرمائی ۱؎۔

جنگ کے الم ناک نتائج نے دونوں گروہوں کو اس نتیجہ تک پہنچا دیا تھا کہ وہ (خواہی نہ خواہی) اپنے اصل مطالبات کو مؤخر کر کے صلح قبول کرلیں۔اور اپنے مطالبات کا مسئلہ دو حکموں کے حوالے کر دیں۔ اپنے مطالبوں کو مؤخر کر کے صلح کرنا دونوں صحابیانِ والا مقام کی دردمندی اور مسلمانوں کی خیر خواہی کے واضح نشانوں میں سے ہے۔

غیر معتبر روایات اور شیعی افترا پردازیاں:

ایک طرف محدثین کی نقل کردہ یہ اعلیٰ درجہ کی صحیح روایت ہے جو بتاتی ہے کہ سیدنا حضرت علی ؓ نے کی صلح کی اس پیشکش کو بڑی خوشی خوشی اس اعتراف کے ساتھ قبول فرمایا کہ ان کے مقام کے لیے صلح دوسروں سے زیادہ مناسب ہے۔اور ان کے ایماء پر حضرت سہل بن حنیف نے صلح کے حق میں تقریر بھی فرمائی۔اور ایک طرف آگے آنے والا ابو مخنف کا بیان کردہ وہ شیعی افسانہ ہے کہ شامی لشکر نے نیزوں پر قرآن اٹھالیے۔اور پر فریب صلح کا حربہ اختیار کیا۔حضرت علی کسی طرح اس کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے، لیکن اپنے ان نافرمان اور اڑیل ساتھیوں (قراء، جو بعد میں خوارج بنے) کے ہاتھوں مجبور ہو کر سیدنا علی ؓ بادل ناخواستہ صلح قبول کرتے ہیں (تاریخ طبری: ۵/۴۸ ۴ وما بعد) لا حول ولا قوۃ الا باللہ۔

عجیب بات ہے؛ اسلامی تاریخ کا یہ نہایت نازک اور اہم واقعہ ہے مگر اس سے متعلق (مورخین کے یہاں) صحیح روایات بالکل نہیں ہیں۔سب نہایت ضعیف اور مخدوش روایات ہیں؛ جن میں شیعہ راوی اور ان کی

۱؎ صحیح بخاری: ۴۸۴۴۔مسند احمد: ۱۵۹۷۵، وسنن نسائی الکبریٰ: ۱۱۴۴۰، نیز مصنف ابن ابی شیبہ ۳۷۹۱۴، تینوں کتابوں کی سندیں صحیح بخاری کی روایت والی ہی ہیں۔

افتراپردازیاں بھری پڑی ہیں۔ان تاریخی روایات کا حاصل یہ ہے کہ: جنگ میں ایک وقت وہ آیا کہ حضرت علی کا لشکر بالکل فتح کے قریب تھا کہ عمرو بن العاص نے کہا کہ نیزوں پر قرآن اٹھا کر آواز لگائی جائے کہ آؤ، اس کو فیصل بنالیں۔اور ایسا ہی ہوا۔شامی لشکر نے نیزہ ہی پر قرآن رکھ کر اونچے کیئے اور کہا آؤ اللہ کی کتاب کو اپنا فیصل بنالیں۔ذرا سوچیے یہ نیزوں پر قرآن اٹھانے کی بات گھڑ کر جھوٹوں نے کیسی قبیح تصویر بنائی ہے۔آگے چلیئے: طبری وغیرہ مورخین کی روایت کے مطابق، حضرت علیؓ سمجھ گئے کہ یہ شکست سے بچنے کی ''چال'' ہے۔انہوں نے فرمایا کہ میں معاویہ، عمرو اور ضحاک وغیرہ کو خوب جانتا ہوں۔ان کو نہ دین سے کچھ سروکار ہے نہ قرآن سے۔بچپن سے اب تک یہ سدا کے مکار دھوکے باز لوگ ہیں۔لوگو! ان کے جھانسے میں مت آؤ۔مگر ان کے ساتھ جو ''قراء'' کی جماعت تھی (یہی جماعت تھی جو بعد میں'' خارجی'' بنی)، اس نے حضرت علی سے اصرار کیا کہ تحکیم کو ضرور قبول کیا جائے۔حضرت علی نہیں مانے تو انہوں نے دھمکی دی کہ ہم تم کو دشمنوں کے حوالے کر دیں گے یا تمہارا وہی کریں گے جو ہم نے عثمان کا کیا۔مجبور ہو کر حضرت علی نے یہ'' کڑوا گھونٹ'' پی لیا۔

یہ کیسی واضح طور پر غلط بات ہے کہ قراء کے اس گروہ نے صلح پر زور دیا۔معلوم ہے کہ یہ گروہ صلح کا اس درجے مخالف تھا کہ بعد میں انہوں نے اس صلح کو ہی بنیاد بنا کر دونوں گروہوں کی تکفیر تک کی۔

حضرت سہل بن حنیفؓ نے اس صلح کو صلح حدیبیہ سے تشبیہ دی:

اس کے عین برعکس اعلیٰ درجے کی صحیح سند سے مروی روایت بتاتی ہے کہ سیدنا علی نے صلح بڑی خوش دلی سے یہ کہہ کر قبول کی یہ میرے لیے زیادہ مناسب بات ہے۔اور حضرت علی کے حکم سے، حضرت سہلؓ بن حنیف نے خوارج کے اثر سے عام لشکر کو محفوظ رکھنے کے لیے صلح کی برکت وخوش انجامی پر تقریر فرمائی، جس میں انہوں نے اِس صلح کو صلح حدیبیہ جیسی عظیم و مبارک صلح نبوی سے تشبیہ دی۔صلح حدیبیہ کی برکتیں یاد دلائیں۔جب کہ ابومخنف اور نصر بن مزاحم کی روایات کہتی ہیں کہ حضرت علیؓ آخر تک تحکیم کی مصالحت قبول کرنے پر راضی نہیں تھے۔مگر اپنی جماعت کے ان'' قراء'' کے ہاتھوں مجبور تھے۔یہ قراء (ان روایات کے مطابق) حضرت عثمان کے اقراری قاتل تھے اور اس پر فخر کرتے تھے۔یہ روایات بہت سی ایسی تفصیلات ذکر کرتی ہیں جن کا حاصل یہ ہے کہ یہ گروہ حضرت علی پر حاوی ومسلط تھا اور ان کو (معاذ اللہ) سخت ذلیل کرتا تھا اور ان سے جبر یہ فیصلے کرواتا تھا۔

تحکیم کی بے اصل مگر مشہور روایت:

فریقین نے طے کیا کہ دونوں طرف سے ایک ایک نمائندہ حکم مقرر ہوگا اور دونوں جو فیصلہ کریں گے وہ

قابل قبول ہوگا۔ان روایات کے مطابق حضرت علیؓ نے اشترنخعی یا حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو اپنا نمائندہ بنانا چاہا،مگر کوفہ کے انہی ''قراء'' نے زبردستی کی کہ وہ سوائے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے کسی کو قبول نہیں کریں گے۔ حضرت ابوموسیٰ بڑے ذی علم اور محترم بزرگ صحابی تھے اور اس جنگ سے بیزار ہو کر عزلت نشیں ہو گئے تھے اور کسی فریق کے ساتھ نہیں تھے۔مجبوراً حضرت علی کو یہ بات بھی ماننی پڑی۔

ان روایات کا یہ پہلو بھی غلط ہے کہ خوارج نے حضرت ابوموسیٰ جیسے صلح پسند اور غیر جانب دار صحابی کو زبردستی حکم مقرر کروایا۔جب یہ ''قراء'' (جو بعد میں خوارج بنے) سرے سے صلح کے ہی مخالف اور اس درجے مخالف تھے کہ انہوں نے صلح اور تحکیم قبول کرنے پر سیدنا علیؓ اور ان کے سب ساتھیوں کی تکفیر تک کی،تو جب وہ اس صلح کو کفر کہتے تھے،تو کیسے کسی کو حَکَم بنانے کا دباؤ ڈالتے؟اور پھر حضرت ابوموسیٰ اشعری جیسے صلح پسند بزرگ کو؟ جو اس اختلاف و جنگ کو فتنہ سمجھ کر حضرت علی کی گورنری سے استعفیٰ دے کر غیر جانب دار ہو گئے تھے،کسی طرح حکم بنانا پسند نہیں کر سکتے تھے۔پھر یہ سوال اٹھتا ہے کہ:

ایسی ناممکن باتیں کیوں گڑھی گئیں؟؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حقیقت کہ حضرت علی حضرت معاویہؓ سے صلح کو دل سے پسند کرتے ہیں، پھر نہ صرف صلح کرتے ہیں، بلکہ ایک ایسے صحابی کو اپنا نمائندہ طے فرماتے ہیں جو اس جنگ کو صحیح نہیں سمجھتا تھا،خود بھی غیر جانب دار تھا اور دوسروں کو بھی غیر جانب دار رہنے کی تلقین کرتا تھا، یہ حقیقت اس ساری شیعی ذہنیت کی اساس ہی منہدم کر دیتی ہے کہ حضرت علیؓ کے مخالفین سراسر اسلام دشمن اور مکر و فریب کے پتلے تھے۔اس لیے یہ افسانہ گھڑنا سبائی دعوت و تحریک کی مجبوری تھی۔

مگر حیرت اور افسوس!

شدید حیرت ہوتی ہے،اور حیرت سے زیادہ افسوس، کہ واقعۂ تحکیم سے متعلق کتب حدیث میں نہایت صحیح اور عین موافق قیاس و قرائن روایت کی طرف اہل سنت کے مورخین اور سوانح نگاروں کی نظر بھی نہیں جاتی۔اور تقریباً سب ہی ایسی روایات پر اعتماد کر لیتے ہیں جو بدیہی طور ناممکن بھی ہیں اور جن کی سند کا بھی اتا پتا نہیں۔

حکم حضرات کی میٹنگ:

رمضان میں شام و عراق کے درمیان، دومۃ الجندل کے اذرح نامی مقام پر دونوں حکم اور بڑی تعداد میں نمائندگان کا اجتماع ہوا۔ساتھ میں سیکڑوں لوگ فریقین کی طرف سے آئے تھے۔طبری اور دیگر مورخین کی روایت بیان کرتی ہے کہ ابوموسیٰ تو بالکل بھولے،''مغفل'' اور ناسمجھ آدمی تھے۔اور حضرت علیؓ اسی لیے ان کو حکم بنانے پر

کسی طرح راضی نہیں تھے۔ جب کہ شامی فریق کا نمائندہ یعنی عمرو بن العاص ؓ ''مکار اور دھوکہ باز'' تھا۔ اس نے پہلے ہی ابوموسیٰ کو شیشہ میں اتارنے کے لیے ان کی خوب تعریفیں کیں۔ اور ہر موقعہ پر ان کو پہلے بولنے کا موقعہ دیا۔ مقصد یہ تھا کہ کسی طرح حضرت ابوموسیٰ اپنی طرف سے حضرت علی ؓ کو معزول کرنے کا اعلان کر دیں ''اعتزیٰ بِذَلِكَ كله أن يقدمه فيبدأ بخلع علي'' (تاریخ طبری: ۵/ ۷۰)۔ گفتگو کے دوران چند تجاویز زیرِ غور آئیں اور اتفاق نہیں ہو سکا تو حضرت عمروؓ نے کہا: آپ اپنی رائے بتائیں، حضرت ابوموسیٰ نے کہا کہ میری رائے یہ ہے کہ دونوں کو معزول کر دیا جائے، اور معاملہ مسلمانوں کی شوریٰ پر چھوڑ دیا جائے۔ مسلمان اپنے لیے جسے چاہیں گے خلیفہ چن لیں گے۔ عمرو بن العاص نے اس تجویز کو صحیح قرار دیا اور کہا: آپ کی بات بالکل صحیح ہے۔ اس تجویز پر اتفاق کر کے دونوں مجمع میں آئے، عمرو بن العاص نے ابوموسیٰ سے کہا: آپ بتا دیجیے کہ مسئلے کے ایک حل پر ہم دونوں نے اتفاق کر لیا ہے۔ ابوموسیٰ نے مجمع کو بتایا کہ ہم دونوں کا ایک رائے پر اتفاق ہو گیا ہے اور ہمیں امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ اس امت کا حال بہتر کر دے گا۔ اس پر بھی عمرو بن العاص نے ابوموسیٰ کی تائید و تصدیق کی، کہا: صدق وبرّ''۔

پھر روایت بتاتی ہے کہ عمرو بن العاص نے (اسی چال کے مطابق جس کا راوی شروع میں ذکر کر چکا ہے) حضرت ابوموسیٰ سے کہا پہلے آپ بات کیجیے۔ ابوموسیٰ بات کرنے کے لیے بڑھے۔ مگر عبداللہ ابن عباس ؓ اس چال کو سمجھ گئے۔ انہوں نے کہا: ارے، ارے! مجھے لگ رہا ہے کہ عمرو بن العاص نے آپ کو دھوکہ دے دیا ہے۔ اگر کسی بات پر اتفاق ہوا ہے، تو انہی کو پہلے بات کرنے دیجیے اور آپ اس کے بعد بات کیجیے گا۔ اس لیے کہ عمرو دھوکے باز آدمی ہیں، فإن عمرا رجل غادر، مجھے اندیشہ ہے کہ انہوں نے تنہائی میں آپ سے کچھ بات طے کر لی ہو گی اور یہاں مجمع میں اس سے اختلاف کر جائیں گے۔ مگر ابوموسیٰ ''مغفل'' قسم کے آدمی تھے، نہیں مانے۔

انہوں نے گفتگو کی اور لوگوں کو بتایا کہ ہم دونوں نے امت کی شیرازہ بندی اور اتحاد کے لیے علی اور معاویہ کو معزول کرنے پر اتفاق کر لیا ہے۔ اب امت جس کو چاہے اپنا خلیفہ منتخب کر لے۔ میں نے علی اور معاویہ دونوں کو معزول کر دیا۔ وہ پیچھے ہٹے اور عمرو بن العاص نے اعلان کیا کہ آپ لوگوں نے سنا کہ انہوں نے اپنے فریق کے قائد (علی) کو معزول کر دیا۔ میں بھی انہیں معزول کرتا ہوں، اور اپنے قائد معاویہ کو باقی رکھتا ہوں۔

حضرت ابوموسیٰ سخت غصہ ہوئے اور کہا: تم نے دھوکہ دیا اور فسق و فجور کا کام کیا۔ عمرو بن العاص نے بھی ترکی بترکی جواب دیے۔ اور دونوں نے ایک دوسرے کو خوب برا بھلا کہا۔ پھر ہنگامہ ہو گیا، تحکیم ناکام ہو گئی اور لوگ واپس ہوئے۔ یہ روایت آگے بیان کرتی ہے کہ حضرت ابوموسیٰ کہا کرتے تھے کہ ابن عباس نے پہلے ہی

مجھے ''اس فاسق کی دھوکہ بازی'' سے آگاہ کیا تھا۔مگر میں سوچتا تھا کہ یہ امت کی بہتری سوچے گا۔اس کے بعد حضرت علیؓ فجر کی نماز میں عمرو بن العاصؓ، معاویہؓ، ولید بن عقبہؓ، ابوالاعور سلمیؓ، حبیب بن مسلمہ فہریؓ، عبد الرحمٰن بن خالد بن الولید اور ضحاک بن قیسؓ پر لعنت کی دعا کرتے تھے۔اس کی خبر جب معاویہؓ کو ملی تو انہوں نے بھی فجر میں علیؓ، ابن عباسؓ، حسنؓ وحسینؓ اور اشتر نخعی پر لعنت بھیجنا شروع کر دی (طبری: ۵/ ۷۰، ۷۱۔)۔

اس روایت کا تنقیدی جائزہ:

یہ تحکیم کی وہ بنیادی روایت ہے جو تاریخ وتذکرہ کی کتابوں میں آئی ہے اور تحکیم کے بیانیہ (Narrative) کی اصل ہے۔اس کو طبری اور ابن اثیر نے من وعن نقل کیا ہے۔ابن کثیر نے اس کا خلاصہ پیش کیا ہے یعقوبی اور دینوری کی نے بھی اس کو ذکر کیا ہے (تاریخ یعقوبی: ۲/ ۱۸۸۔ ۱۹۰، الاخبار الطوال: ۱۹۰۔ ۲۰۰)۔اسی سے وہ مشہور عام تصویر بنی ہے، جس میں نظر آتا ہے کہ کیسے حضرت عمرو بن العاصؓ نے دھوکہ بازی اور مکرو دغل سے کام لیا (ظاہر ہے اس سب میں حضرت معاویہؓ بھی شریک تھے)۔یہ روایت دِکھاتی ہے کہ حضرت ابن عباسؓ اُن کو کس قدر مکار اور بے دین جانتے تھے۔اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ ان کو فاسق وفاجر کہتے تھے۔نیز حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ ایک دوسرے پر اور ایک دوسرے کے حامیوں پر جن میں اکثر صحابہ تھے نماز میں نام لے لے کر لعنت وبددعا کیا کرتے تھے۔

''سبحانك هٰذا بهتان عظيم''۔کسی متعین مسلمان پر لعنت کرنا بالاتفاق کبیرہ گناہ ہے۔صحیح بخاری کی حدیث ہے کہ کسی مسلمان پر لعنت کرنا کسی مسلمان کے ناحق قتل جیسا سخت گناہ ہے (۶۰۴۷)۔سیدنا علیؓ اور حضرت معاویہؓ کیا ایسا گناہ کرتے؟ اور وہ بھی نماز میں؟ لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔حیرت ہے کہ ایسی روایات پر لوگوں نے کیسے اعتماد کر لیا؟

تحکیم کی اس مشہور روایت کا راوی ابومخنف مشہور ''جلا بھنا شیعہ اور شیعوں کی روایات اور کہانیوں کا ناقل'' ہے۔(یہ رجال حدیث اور علل کے معروف امام حافظ ابن عدی کا ابومخنف پر تبصرہ ہے، وہ مزید کہتے ہیں:

حدث بأخبار من تقدم من السلف الصالحين، ولا يبعد منه أن يتناولهم، وهو شيعي محترق صاحب أخبارهم، ...له من الأخبار المكروه الذى لا أستحب ذكره"

(الکامل فی ضعفاء الرجال: ۷/ ۲۴۱)

اس شخص کا معمول سلف صالحین (صحابہؓ) کی شان میں بدزبانی والزام تراشی ہے، یہ جلا بھنا شیعہ اور شیعوں کی روایات اور کہانیوں کا ناقل ہے۔صحابہ کو برا بھلا کہنا اس کے لیے معمولی بات ہے۔ایسی ایسی مکروہ روایتیں بیان کرتا ہے کہ میں ذکر تک کرنا پسند نہیں کرتا۔

افسوس! ایسوں کی تہمت کی بنیاد پر کچھ بے بصیرت صحابۂ کرامؓ سے بدگمان ہوتے ہیں۔ ذہبی نے اس کو شیعہ کے علاوہ ھالک اور تالف (بکواس اور بے اصل روایات کا راوی) کہا ہے (میزان الاعتدال: ۳/۴۱۹، ۴/۱۷۵)۔ شیعوں کی کتب رجال میں اس کو شیعوں کا عظیم مورخ اور ثقہ شیعہ بتایا گیا ہے۔ (الکنیٰ والالقاب، عباس قمی: ۱/ ۱۹۸، ۱۹۹)۔ اس نے سقیفہ بنی ساعدہ، حضرت عمر کی بنائی شوریٰ اور حضرت عثمان کے انتخاب، جنگہائے جمل و صفین، حضرت حسن کو زہر دیے جانے کی شیعی روایت، حضرت حسینؓ کی شہادت، وغیرہ شیعوں کے ان تمام محبوب موضوعات پر کتابیں لکھی ہیں جن میں شیعی کذاب، داستان تراشوں نے خوب خوب گل کھلائے ہیں [۱]۔

اس روایت کا اصل عیب تو ابو مخنف ہے، مگر وہ نہ بھی ہوتا تو بھی اس روایت کا کچھ پتہ سرا نہیں، اس لیے کہ ابو مخنف کی روایت میں واقعہ کا ناقل ابو جناب کلبی ہے۔ یہ صاحب خود ضعیف بھی ہیں اور جنگ صفین کے وقت وہ پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ لہٰذا پتہ نہیں وہ اُن تک کن کن لوگوں کے واسطوں سے پہنچی؟ پتہ چاہے نہ ہو، لیکن مضمون خود پتہ دے رہا ہے کہ وہ کیسے متعصب افسانہ ساز لوگوں کا تراشیدہ ہے۔

اس روایت کو نصر ابن مزاحم منقری نے بھی صفین کے موضوع پر اپنی کتاب میں عمر بن سعد بن ابی الصید سے نقل کیا ہے (وقعۃ صفین: ۵۴۴)۔ عمر ابن سعد نے اِس کو انہی ابو جناب کلبی سے نقل کیا ہے جو اوپر کی روایت کے ناقل ہیں۔ مصنف نصر بن مزاحم خود سخت رافضی اور قطعاً غیر معتبر ہے۔ ذہبی کہتے ہیں: رافضی مسلت، ترکوہ (سخت رافضی ہے، محدثین کے نزدیک متروک ہے۔ (المغنی فی الضعفاء: ۲/ ۶۹۶)۔ یہی بات ابن حجر بھی کہتے ہیں: رافضی جلد ترکوہٗ' (لسان المیزان: ۸/ ۲۶۷)۔ عجلی کہتے ہیں غالی رافضی ہے، ابوخیثمہ کذاب کہتے ہیں (میزان الاعتدال: ۴/ ۲۵۴)۔ شیعہ علماء رجال اس کو بھی شیعہ مانتے اور صفین و جمل وغیرہ موضوعات پر اس کی کتابوں کو اپنی سندوں سے روایت کرتے ہیں (رجال النجاشی: ۴۲۸)۔ نصر اس کو جس عمر بن سعد بن ابی الصید سے نقل کرتا ہے، وہ بھی بغض سے بھرا شیعہ اور متروک ہے، نصر اس سے بہت کثرت سے روایت کرتا ہے۔ نصر بن مزاحم کی کتاب کے محقق عبد السلام ہارون نے شروع کتاب میں ہی اس کے بارے میں بتایا ہے کہ یہ نصر بن مزاحم کے اہم شیوخ میں ہے اور وہیں ذہبی کی میزان الاعتدال (۳/ ۱۹۹) سے یہ بھی نقل کیا ہے: شیعي بغیض. قال أبو حاتم: متروك الحدیث۔ یعنی بغض سے بھرا شیعہ اور متروک۔ عمر ابن سعد نے بھی اس کو انہی ابو جناب کلبی سے نقل کیا ہے جو اوپر کی روایت کے ناقل ہیں۔

دیگر روایات:

محقق ڈاکٹر شیخ یحییٰ الیحییٰ نے اپنے تحقیقی مقالے مرویات ابی مخنف (صفحہ ۳۸۷ تا ۴۱۴) میں قصۂ

---

[۱] ملاحظہ ہو شیعہ علماء رجال میں اہم شخصیت احمد بن علی النجاشی کی کتاب رجال النجاشی: ۳۲۰۔

تحکیم کی تمام روایات پر محدثانہ نقد کیا ہے اوران کے متن کا جائزہ لیا ہے۔ان کے تفصیلی جائزے سے ثابت ہوتا ہے کہ تحکیم کی اجمالی روایات اس قدر تو صحیح ہیں، کہ طرفین نے تحکیم پر صلح کی، اور دونوں حکم کسی نتیجہ پر متفق نہیں ہو سکے اوراختلاف برقرار رہا۔کم از کم اتنا ضرور ہوا کہ خانہ جنگی رک گئی اور مسلمانوں کا مزید خون نہیں بہا۔لیکن واقعہ کی تمام تفصیلی روایات جو صحابہؓ کی کردارکشی کرتی اوران کو مکار و چال باز، امارت وریاست کا حریص اور پست معیار پر دکھاتی ہیں، شیعہ اور کذاب راویوں کی بیان کردہ اور منقطع ہیں۔یعنی ایسے راویوں کے بیانات پر مشتمل ہیں جو واقعہ کے مدتوں بعد کے ہیں۔

افسوس کہ ابتدائی مورخین اور بعد کے تاریخ وتذکرہ نگار ایسی روایتوں کو بے تحقیق وتردیدیوں ہی نقل کرتے آئے۔طبری جیسے بعض نے تو، ان روایات کی ذمہ داری سے بچنے کے لیے، ابومخنف، نصر بن مزاحم اور عمر بن سعد وغیرہ شیعہ راویوں کا حوالہ دینا کافی سمجھا، کہ قاری جان ہی جائے گا کہ یہ غالی شیعوں کی روایتیں ہیں۔اور بعض (جیسے ابن کثیر) نے یہ کیا کہ زیادہ سخت دشنام اور بڑی افتراپردازیوں کو حذف کر کے باقی باتیں ذکر کر دیں۔اور بسا اوقات کہہ بھی دیا کہ ان روایات میں ناقابل ذکر جھوٹی باتیں بھی ہیں۔بعض سلیم القلب اور صحیح العقیدہ بزرگوں نے بھی سوانح وتاریخ کی اپنی تصنیفات میں، اپنے داخلی احساس کی بنا، پر ان ہفوات کو ذکر نہیں کیا۔لیکن تحقیق نہ ہو سکنے کی وجہ سے اپنے بیانیہ کی اساس اسی بے اساس روایت پر رکھی۔

ایک اور روایت ہے جس کو زہری بیان کرتے ہیں۔یہ روایت ابومخنف اور نصر کی روایت کی طرح مکاری وخداعی کی ذلیل داستان تو نہیں بیان کرتی، لیکن ناقابل قبول باتوں سے خالی نہیں ہے۔اس میں بس اتنا ہے کہ حضرت ابوموسیٰ نے خلافت کے لیے عبداللہ بن عمرؓ کا نام پیش کیا، مگر حضرت عمرو بن العاص نے قبول نہیں کیا اور حضرت معاویہؓ کا نام پیش کیا۔جس کو ابوموسیٰؓ نے قبول نہیں کیا۔روایت کے مطابق اس پر دونوں نے ایک دوسرے کو سخت برا بھلا کہا (مصنف عبدالرزاق: ۵/۴۵۲۔ وتاریخ طبری: ۵/۵۸)۔

لیکن یہ روایت بھی بے اصل ہے، امام زہری کی پیدائش بھی واقعہ کے سالوں بعد سن ۵۰ھ یا اس کے بھی بعد ہوئی ہے۔اوران کی غیر متصل روایات نہایت کمزور اور ہوائی قسم کی ہوتی ہیں۔امام یحییٰ القطان اور ابن معین نے ان کی مراسیل کو ہوائی قرار دیا ہے۔ذہبی کہتے ہیں محدثین کے نزدیک زہری کی مراسیل بہت کمزور اور لچر ''واہی'' ہیں[۱]۔اس کے علاوہ ابن عساکر کے یہاں، ابومخنف کی طرح، عمرو بن العاصؓ کے کید وسازش ''مکیدۃ من عمرو'' کی ایک روایت ہے، جو وہی ابومخنف والی کہانی بتاتی ہے۔(تاریخ دمشق: ۵۹/۱۱۸) اس روایت کا

---

۱ الجرح والتعدیل: ۱/۲۴۶، جامع التحصیل: ۷۳، الموقظۃ: ۴۰۔

راوی ابوبکر بن ابی سبرہ وضّاع (روایات گڑھنے والا) ہے (سیر الاعلام: ۷/ ۳۳۰)۔ لہٰذا روایت موضوع۔ دوسری بات یہ بھی کہ یہ روایت بھی زہری کی بلا سند روایت ہے۔

یہ مشہور روایت ایک باطل و منکر روایت ہے:

ایک طرف تو یہ حقیقت ہے کہ تحکیم کی یہ مشہور روایت ابومخنف، نصر بن مزاحم اور عمر بن سعد جیسے شیعوں کی ہرزہ سرائی ہے۔ دوسری طرف اس کے مندرجات بھی ایسے جو خود شہادت دیتے ہیں کہ اس کا سرچشمہ کسی شیعہ کا بغضِ تہمت تراش ہی ہے۔ نیز مندرجہ ذیل حقائق اس کی یقینی تکذیب کرتے ہیں:

(ا) حضرت ابوموسیٰ کی شخصیت: یہ روایت عظیم صحابی حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی ایک پست و دنی تصویر پیش کرتی ہے۔ جو ایک ابلہ و مغفل آدمی کی ہے، جس کو عمرو بن العاص نے دام فریب میں پھنسا لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابوموسیٰؓ ایک بڑے ذی علم اور عقل و دانائی سے آراستہ شخصیت تھے۔ ان کا شمار صحابہ کے اہل فتویٰ علماء میں تھا۔ ان کی عقل اور قائدانہ صلاحیت کی دلیل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو ملک یمن کا حاکم بنا کر بھیجا تھا (صحیح بخاری: ۳۰۳۸)۔ حضرت عمر نے ان کو اس وقت کوفہ اور بصرہ کا گورنر بنایا جب وہاں کے سیاسی حالات دوسروں کے لیے سنبھالنے مشکل ہو رہے تھے۔ اور یہ انتخاب درست ثابت ہوا۔ وہ حضرت عمر کی حکومت کے اہم ارکان اور کمانڈرس میں سے تھے۔ بصرہ کی اس فوج کے کمانڈر وہی تھے، جس نے کسریٰ کی حکومت کے خلاف اہواز وغیرہ کی کامیاب جنگیں لڑیں۔ اس دور میں انہوں نے کئی اہم فوجی مہمات کی خود قیادت کی اور قم، قاشان اور تستر وغیرہ علاقے فتح کیے۔ ان کے فضائل میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعدد اقوال ثابت ہیں (البدایہ والنہایہ: ۷/ ۱۰۲، ۱۲۷)۔ حضرت عمر جیسے غیر معمولی ذہین (Genius) شخص نے ان کی عقل مندی کی تعریف کی ہے۔ حضرت انسؓ کو حضرت ابوموسیٰؓ نے بصرہ سے حضرت عمر کے پاس قاصد بنا کر بھیجا۔ حضرت عمرؓ نے اس موقعے پر حضرت انس سے کہا: ابوموسیٰ بہت سمجھ دار شخص ہیں، مگر ان سے نہ کہنا کہ میں ان کی تعریف کر رہا تھا۔ (طبقات ابن سعد: ۲/ ۲۶۳، بسند صحیح)۔

بصرہ اسلامی تاریخ میں ایک اہم دینی و فقہی مرکز تھا، جس کے بانی اور استاذ اول وہی تھے۔ (سیر اعلام النبلاء: ۲/ ۳۸۰۔ ۳۹۲)۔ پھر عہد عثمانی میں بھی وہ بصرہ کے گورنر رہے۔ حضرت عثمان کی وفات کے وقت وہ کوفہ کے گورنر تھے۔ اور انہوں نے ہی کوفہ والوں سے حضرت علی کی بیعت لی تھی۔ (فتح الباری: ۱۳/ ۵۸)۔ ان حقائق سے واقف مورخ کے نزدیک حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو ابلہ و مغفل بتانے والی روایت قطعاً ناقابل التفات ہے۔ صحابۂ رسول کے مرتبہ شناس اہل ایمان اس قبیح و موضوع روایت اور جنگ صفین کی اس بدمذاق کہانی

سے کیسے آزردہ نہ ہوں؟

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ (دیگر بہت سے صحابہ کی طرح) اس جنگ کو ''فتنہ'' کہتے تھے، اور لوگوں کو اس میں شرکت سے روکتے تھے۔ اسی وجہ سے حضرت علی نے ان کو کوفہ کی امارت سے سبکدوش کر دیا تھا، جس کے بعد وہ غیر جانب دار ہو کر بیٹھ رہے تھے۔ یہ سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کے بلند درجۂ اخلاص و دردمندی، دین وملت کی کامل خیر خواہی اور ان کی فوقیت وفضیلت کا واضح ثبوت ہے کہ انہوں نے (اپنے کسی پرزور حامی کے بجائے) ایسے بزرگ غیر جانب دار شخص کو اپنا نمائندہ بنا کر مجلس تحکیم میں بھیجا۔

(۲) حضرت عمرو بن العاصؓ کو اس روایت میں ایک غدار ومکار، فریبی اور دولت دنیا کے حریص کے کردار میں پیش کر کے سخت ظلم وافترا پردازی کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ اسلام لانے سے پہلے حضرت عمرو بن العاصؓ بہت بڑے تاجر اور بادشاہوں کے دربار میں قریش کے سفیر تھے۔ اسی سلسلے میں بادشاہ حبشہ کے پاس گئے تھے، وہاں حضرت جعفرؓ کے ہاتھ پر اسلام لائے۔ یہ فتح مکہ سے کافی پہلے سن ۶ ہجری کا واقعہ ہے (الاصابہ: ۵۳۹/۴)۔

ایسی اونچی پوزیشن کو چھوڑ کر اسلام قبول کرنا کیسے صدق واخلاص کی دلیل ہے!!

صحیح مسلم میں ہے کہ حبشہ سے وہ سیدھے خدمت نبوی میں حاضر ہوئے، اسی وقت ان کے اخلاص کا یہ حال بیان ہوا ہے کہ انہوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنے جاہلیت کے گناہوں کی فکر ظاہر کی کہ وہ بھی تو معاف ہو جائیں گے؟۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اسلام لانے کے بعد پچھلے گناہ نہیں بچتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعظیم کا یہ حال تھا کہ اسلام لانے کے بعد کبھی نظر بھر کے چہرۂ انور نہیں دیکھ سکے (صحیح مسلم: ۱۲۱)۔ ابن حجر کہتے ہیں کہ اسلام لانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کی اعلیٰ صلاحیتوں کے پیش نظر ان کو قریب رکھتے تھے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نزدیک وہ ''رجل صالح'' تھے، آپؐ نے ان کو سریۂ ذات السلاسل میں ۳۰۰ مہاجرین وانصار کا امیر بنایا۔ اس لشکر میں حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ اور حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح جیسے اکابر بھی ان کے ماتحت تھے۔ اور جب بھیجتے وقت آں حضورؐ نے مال غنیمت کا وعدہ فرمایا تو انہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول میں مال کے لیے مسلمان نہیں ہوا، میں تو آپ کی اور اسلام کی محبت میں مسلمان ہوا ہوں۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا: **يَا عَمْرُو! نِعِمَّا بِالْمَالِ الصَّالِحِ لِلرَّجُلِ الصَّالِحِ** (اللہ اگر کسی نیک بندے کو حلال مال دے تو وہ بڑی نعمت ہے) [۱]۔

ان کے بارے میں ایک بڑی شہادت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا بعض لوگ تو صرف اسلام لائے ہیں، مگر عمرو بن العاص دل کے مومن ہیں (سنن ترمذی: ۳۸۴۴)۔ امام احمد نے کئی حسن اسانید سے حضور

---

[۱] مستدرک حاکم: ۲۱۳۰، بسند صحیح، حاکم اور ذہبی نے اس کو امام مسلم کی شرط پر قرار دیا ہے۔ الاصابۃ، تذکرہ عمرو۔

اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ بشارت نقل فرمائی ہے کہ عمرو بن العاص اور ان کے بھائی ہشام مومن بندے ہیں [۱]۔

بار بار اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان سے عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو "مردِ مومن" کی سند ملی ہے۔ ایک مرتبہ صحابہ کو مدینہ پر شب خون کا خطرہ محسوس ہوا۔ سب لوگ پریشان ہو گئے۔ سالم مولیٰ حذیفہ رضی اللہ عنہ اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے تلوار لی اور مسجد میں آ گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کو جمع کیا اور کہا: ایسے وقت تم کو ان دونوں مردانِ مومن کی طرح اللہ و رسول کی طرف رجوع کرنا (یعنی مسجد نبی میں آ کر دعا میں مشغول ہو جانا) چاہیے تھا [۲]۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی سب سے بڑی فضیلت یہ تھی کہ وہ غزوۂ تبوک میں شرکت فرمانے والے مہاجرین میں سے تھے۔ ان حضرات کے بارے میں سورۂ توبہ میں غیر معمولی عظمت و شرف کی حامل آیات نازل ہوئیں:

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۱۱۷

یقیناً اللہ تعالیٰ مہربان ہوا نبی پر اور ان مہاجرین وانصار پر جنہوں نے نبی کا ساتھ دیا ایسے تنگی کے وقت میں۔ بعد اس کے کہ قریب تھا کہ ان میں سے بعضوں کے دل پھر جائیں۔ پھر اللہ نے ان پر مزید عنایت ونوازش فرمائی۔ یقیناً وہ ان پر بڑا مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔

مستدرک حاکم میں صحیح سند سے مروی ہے کہ زہیر بن قیس بلوی کہتے ہیں کہ حضرت علقمہ بن رِمثہ رضی اللہ عنہ نے سنایا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو ایک مہم پر بحرین بھیجا۔ اور خود آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک سفر پر روانہ ہو گئے۔ ایک مقام پر جا کر آرام فرمایا، تھوڑی سی نیند کے بعد آپ بیدار ہوئے اور دعا فرمائی: اللہ عمرو پر رحم فرمائے۔ ہم لوگوں نے ایک دوسرے سے پوچھا کہ یہ خوش نصیب عمرو کون سے ہو سکتے ہیں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نیند آ گئی، آنکھ کھلی، تو پھر دعا فرمائی: اللہ عمرو پر رحم فرمائے۔ پھر آنکھ لگ گئی، کچھ دیر بعد آپ اٹھے اور پھر تیسری مرتبہ دعا فرمائی: اللہ عمرو پر رحم فرمائے۔ ہم نے دریافت کیا کہ حضور! کون سے عمرو؟ آپ نے فرمایا: عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ۔ ہم نے عرض کیا: اس خصوصی دعا کی وجہ؟ آپ نے فرمایا: میں نے لوگوں سے اللہ کے راستے میں مال دینے کو کہا تو عمرو بہت سا مال لائے، میں نے پوچھا: کہاں سے اتنا لائے؟ کہنے لگے: اللہ نے دیا ہے۔ حضور

---

[۱] مسند احمد حدیث نمبر: ۸۶۴۱، ۸۶۴۲، محقق شعیب ارناوط نے اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے۔ ہیثمی: ۹/ ۳۵۲ نے طبرانی کی معجم کبیر اور مسند احمد کی سند کو حسن قرار دیا ہے۔

[۲] مسند احمد حدیث: ۱۷۸۱۰، صحیح ابن حبان حدیث: ۷۰۹۲۔ حافظ ابن حجر نے اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے، الاصابۃ: ۴/ ۵۴۰۔

ﷺ نے فرمایا: عمرو نے سچ کہا۔ اور عمرو کے لیے اللہ کے پاس خیرِ کثیر ہے"۔

زہیر بن قیس (جو خود صحابی کہے جاتے ہیں) فرماتے ہیں: جب فتنہ ہوا (یعنی حضرت علی اور حضرت معاویہ کے درمیان جنگ) ہوئی تو میں نے سوچا کہ میں اِس شخص کے ساتھ رہوں گا جس کے بارے میں حضور ﷺ نے یہ تعریفی ارشادات اور دعائیہ کلمات فرمائے تھے۔ پس میں ان ہی کے ساتھ رہا[۱]۔

حضرت ابوبکر نے ان کو ملک شام کے جہاد میں ایک مستقل لشکر کا امیر بنایا جو ان کی پوری مدتِ خلافت رومی سلطنت سے جہاد میں مصروف رہا۔ عہد صدیقی اور عہد عمری میں فلسطین و شام کے متعدد معرکوں کے وہ امیر رہے۔ شام میں رومی مرکزِ حکومت انطاکیہ، حلب، قنسرین، منبج وغیرہ کی فتوحات کا سہرا ان ہی کے سر ہے اس کے بعد حضرت عمر نے ان کو مصر کے جہاد پر مامور کیا۔ انہوں نے مصر کے علاوہ شمالی افریقہ کے تمام اہم شہروں اور فوجی مراکز (جن میں موجودہ تیونس تک کے علاقے شامل ہیں) کو فتح کیا۔ اسلامی تاریخ میں فاتح مصر ہونے کا اعزاز انہی کو حاصل ہے[۲]۔ پھر وہ حضرت عمر کے نائب کے طور پر پورے مصر اور افریقی ممالک کے حاکم رہے۔ ارکان حکومت کے سلسلے میں حضرت عمر کا معیار کتنا بلند تھا اور اپنے گورنروں کا وہ کیسا سخت محاسبہ رکھتے تھے، اس کا ہم پیچھے ذکر کر آئے ہیں۔ اہل نظر کسی کی ستھری شخصیت کے لیے اس دلیل کو کافی سمجھتے ہیں کہ حضرت عمر نے اس کو کارپردازانِ سلطنت میں باقی رکھا (سیر الاعلام: ۳/ ۱۳۲)۔

حضرت عمرو بن العاص کا حسن خاتمہ بھی قابل رشک ہے۔ وفات کے وقت گریہ طاری ہوا، چہرہ دیوار کی طرف کر کے دیر تک روتے رہے۔ بیٹے نے تسلی کے لیے عرض کیا کہ آپ کو تو رسول اللہ ﷺ نے ایسی ایسی بشارتیں دی ہیں، تو کیوں پریشان ہوتے ہیں؟ کہنے لگے کہ میں اسلام لایا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اسلام لانے سے پچھلے سارے گناہ مٹ جاتے ہیں، رسول اللہ ﷺ دل کے سب سے بڑے محبوب اور محترم ہو گئے، اسی وقت مر جاتا تو مجھے ضرور جنت کی امید ہوتی، مگر آپؐ کے بعد میں حکومت میں رہا، پتہ نہیں جو کچھ پیش آیا اللہ کے یہاں اس کا کیا انجام ہوگا۔ میرے انتقال پر نہ کوئی روئے، نہ آگ جلائی جائے۔ دفن کے بعد کچھ دیر تم لوگ رکے رہنا تا کہ مجھے فرشتوں کو جواب دیتے وقت تم سے انسیت رہے۔ پھر دیر تک استغفار اور کلمۂ توحید پڑھتے رہے، یہاں تک کہ سانسوں نے ساتھ چھوڑ دیا۔ (صحیح مسلم: ۱۲۱، الزھد لابن المبارک: ۲/ ۳۹)

۱۔ مستدرک حاکم: ۵۹۱۶، حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے اور ذہبی نے بھی۔ نیز معجم کبیر طبرانی: ۱۸/ ۵، ہیثمی نے طبرانی کی سند کو حسن قرار دیا ہے، مجمع الزوائد: ۹/ ۳۵۲۔

۲۔ الاصابہ: تذکرۂ عمروؓ، سیر الاعلام: ۳/ ۷۰، نیز القیادة العسکریة فی عہد الرسول۔

کیسے بدنصیب تھے وہ لوگ جنھوں نے ایسے صاحب فضیلت مخلص ومومن صحابی اور اسلام کے ایسے بڑے ہیرو کو طعن وتہمت کا نشانہ بنایا۔ اور اللہ معاف فرمائے! کیسی بے احتیاطی کی ان لوگوں نے جنھوں نے ان جھوٹی تہمتوں کو قابل اعتنا سمجھا۔

تاریخی روایات کے داخلی تضاد:

تحکیم کی ان روایات میں ایسے داخلی تضاد بھی موجود ہیں جو ان کو بے اصل ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔

(۱) یہ سب کو معلوم ہے کے اختلاف کی بنیاد یہ نہیں تھی کہ حضرت معاویہ خلافت کے دعوے دار تھے۔ صحیح روایات کے حوالوں سے ہم یہ ذکر کر آئے ہیں کہ حضرت معاویہ کا مطالبہ پہلے باغی قاتلان عثمان کو سزا دینا تھا، جس کے بعد وہ بیعت واطاعت کے لیے راضی تھے۔ وہ صاف کہتے تھے کہ ان کا حضرت علی سے خلافت کے استحقاق میں کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ وہ مجھ سے افضل بھی ہیں اور خلافت کے حق دار بھی (فتح الباری: ۸۶/۱۳۔ ابن حجر نے کہا کہ اس کی سند جید ہے)۔ اور حضرت علی کا موقف یہ تھا کہ عملاً یہ اس وقت ممکن نہیں، معاویہ پہلے بیعت کریں اور شام کی حکومت سے معزول ہوں، پھر قانونی کارروائی کی جائے گی۔ تمام مورخین کا اتفاق ہے کہ اختلاف کی بنیاد یہی تھی۔ ان روایات نے ایسا ہیر پھیر کیا ہے کہ تحکیم میں اس اصل اختلافی نقطے کا تو کہیں ذکر ہی نہیں آتا۔ بلکہ نہایت بے تکی یہ بات بیان ہوتی ہے کہ مجلس تحکیم میں حضرت علی اور حضرت معاویہ کی معزولی پر اتفاق ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ مسئلہ زیر بحث تھا ہی کب؟ اگر بالفرض دونوں کی معزولی کا فیصلہ ہوا بھی ہوتا تو یہ بھی تو طے ہوا ہوتا کہ ان کے بجائے کون متفق علیہ خلیفہ بنے گا؟ یا وہ مجلس شوریٰ کون ہوگی جو نئے خلیفہ کا انتخاب کرے گی؟ اس کے بجائے روایت کہتی ہے کہ یہ دونوں معزول، مسلمان اپنے امیر کا انتخاب کرلیں گے۔ اس طرح تو پھر سے یہی سوال کھڑا ہو جاتا کہ پہلے قصاص یا امیر کی بیعت؟

(۲) ایسے پرآشوب وشورش دور میں جس میں انتشار وخانہ جنگی سے مملکت اسلام لالہ زار ہو چکی تھی، ہر طرف ایک بے یقینی کی فضا تھی، کیسے ممکن تھا کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ جیسے اسلام کے مدبر وتجربہ کار سیاسی قائد، جو عہد نبوی سے لے کر عہد علوی تک مختلف صوبہ جات کے کامیاب گورنر رہ چکے تھے، دونوں حکمرانوں کو معزول کر کے ملک کو مزید انارکی کے غار میں ڈھکیل دیں؟ اس کا نتیجہ سوائے انتشار واختلاف میں اضافے اور طوائف الملوکی کے علاوہ اور کچھ نہ ہوتا۔ ایسے نازک وقت میں حکومتوں کو تحلیل کرنے سے زیادہ غیر دانش مندانہ کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ یہ تو قومی خودکشی کا نسخہ تھا۔ کیا حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ جیسا صاحب فضائل، دین وامت کا خیر خواہ صحابی ایسا مہلک فیصلہ کر سکتا تھا؟ کیا وہ پختہ کار امیر وقائد جو عہد نبوی سے لے کر عہد علوی تک حکومت وامارت

کے فرائض کامیابی سے انجام دیتا اور اپنی مدبرانہ سیاسی شخصیت کا ثبوت دیتا آیا ہے، ایسا تباہ کن اقدام کرسکتا تھا؟ اس کی توقع نہ حضرت ابوموسیٰ سے کی جاسکتی تھی اور نہ حضرت عمرو بن العاص ؓ سے۔ اکیلی یہی بات ان روایات کو گھٹیا قسم کی افترا پردازی ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔

ایسی روایات کہاں سے آئیں؟

یہ روایات اس ذہنی کیفیت کی عکاس اور اسی کی پیداوار ہیں جو پہلی صدی ہجری کے آخر میں کوفہ و عراق میں جڑ پکڑ چکی تھی اور مدت تک موجود رہی۔ یہی علاقہ سبائی پروپیگنڈے کا مرکز تھا، یہاں حضرت علی کے اخلاف کرام کی محبت، نیز حکومت لے لینے کی ان کی پے در پے کوششوں کی حمایت و نصرت اور بنوامیہ سے بغاوتوں کا سلسلہ تھا۔ ان تحریکات میں غلط اطلاعات، پروپیگنڈے اور جھوٹی روایات کا استعمال خوب کیا جاتا تھا۔ بغاوتوں کو بنی امیہ کے (عبیداللہ بن زیاد اور پھر حجاج جیسے متشدد و سخت گیر) گورنروں نے سختی سے کچلنے کی پالیسی اختیار کی ہوئی تھی۔ اسی دور کے فوراً بعد ابومسلم خراسانی کی سرکردگی میں اہل بیت کی حکومت کے نام پر ایسی گمراہانہ خفیہ اور منظم تحریک چلائی گئی کہ دوبارہ عبداللہ بن سبا کی یاد تازہ ہوگئی۔ ایک باریک بیں مورخ اور تاریخی عوامل پر نظر رکھنے والا ان روایات کے پس منظر میں ابومسلم خراسانی کی منظم اور وسیع و عریض تحریک و دعوت کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔

اِس فضا میں شیعیت کے جو عقائد و افکار پیدا ہوئے اور جو ذہنیت تشکیل پائی اس کے لیے یہ تسلیم کرنا مشکل تھا کہ حضرت علیؓ حضرت معاویہؓ سے برضا و رغبت صلح کر سکتے ہیں اور ان کے یہاں اہل شام کے لیے کوئی نرم گوشہ بھی ہوسکتا ہے۔ اس لیے کہ ان باتوں سے تو شیعیت کی جڑ کٹتی تھی۔ اسی نفسانی رجحان اور صحابہ سے بدگمان گمراہ ذہنیت نے لوگوں کو مجبور کیا کہ وہ یہ جھوٹ گھڑیں کہ حضرت علی تو کسی قیمت پر صلح کے لیے تیار نہیں تھے۔ پھر حضرت ابوموسیٰ ؓ کو ابلہ و بے وقوف اور حضرت عمرو بن العاص ؓ اور حضرت معاویہ ؓ کو مکار اور دولت دنیا کا حریص دکھانے والے افسانے بیان کریں۔ (تحقیق مواقف الصحابۃ: ۵۱۱، ڈاکٹر محمد اُ۔ محزون۔) ان اہل تعصب جاہلوں اور حاسد و منافق سبائیوں کی وجہ سے ایسی تمام روایات میں راویوں کے حالات کی تفتیش اور یہ اطمینان کرنا نہایت ضروری ہے کہ سلسلۂ سند متصل ہو، کوئی سنی سنائی افواہ نہ نقل کررہا ہو۔ اب جب یہ عمل کیا جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ سب روایات شیعہ راویوں کی گھڑی ہوئی ہیں۔

تحکیم کسی اتفاقی فیصلے پر نہیں پہنچ سکی:

تحکیم پر صلح کیسے ہوئی اس کے متعلق تو اوپر مذکور وہ صحیح روایت ملتی ہے جو بخاری، مسند احمد اور سنن نسائی (کبریٰ) کے حوالے سے ہم نے ذکر کی اور جس میں صاف صراحت ہے کہ حضرت علی اور حضرت معاویہ دونوں کی رغبت سے صلح کی قرارداد طے پائی تھی۔ لیکن پھر حکم حضرات کے اجتماع کے موقع پر کیا ہوا؟ ابومخنف، نصر بن مزاحم

اور عمر بن سعد جیسے کذاب اور غالی شیعوں کی روایات میں اس کی جو گھناونی اور نفرت انگیز تصویر پیش کی گئی ہے، وہ ناظرین کرام نے دیکھ لی۔ ان موضوع روایات سے تو بس کسی شیعہ ہی کو دلچسپی ہو سکتی ہے۔

تاریخ کے دفاتر حیرت ناک عجائب سے بھرے ہیں۔ انہی میں سے ایک حیرت انگیز امر یہ ہے کہ تحکیم کے قصے کی کوئی ایسی قابل اعتماد روایت ہمارے سامنے نہیں ہے، جو یہ بتا سکے کہ حکم حضرات میں کیا گفتگو ہوئی اور اختلافی مسئلہ میں دونوں کی کیا رائے ہوئی۔ اس موقعہ کی تفصیل کسی ایسی روایت میں نہیں جس کی سند معتبر ہو۔ البتہ اتنا طے ہے کہ دونوں حکم کسی اتفاقی نتیجہ تک نہیں پہنچ سکے۔ اور مجلس بے نتیجہ ختم ہوگئی (ملاحظہ ہو: مرویات ابی مخنف فی تاریخ الطبری: ۵۷۳۔۴۱۸۔)

اس صورت حال کے اصل مجرم:

اس صورت حال تک مسلمانوں کو پہنچانے کا اصل مجرم وہ باغی گروہ اور سبائی سازشی عنصر تھا جس نے امت کو اس نرغے میں ڈال دیا تھا۔ یہ وہ مجرم ٹولہ تھا جس نے نہ صرف خلیفۂ اسلام کو قتل کیا، بلکہ اپنے پروپیگنڈوں سے ملک میں نہایت بے اطمینانی کی فضا بھی پیدا کر دی تھی، جس کی سازش سے جنگ جمل کا حادثہ پیش آیا تھا۔ اور جس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ (مسلمانوں کی اجتماعیت کی خاطر) ان فتنہ پرداز سبائیوں اور ان کے ورغلائے ہوئے جاہل باغیوں کے اپنے لشکر میں شامل رہنے کو قبول کریں۔ اور اسی حالت میں خلافت کو چلائیں۔ حضرت معاویہ کا بھی بہت بڑا امتحان تھا، وہ خلیفۂ اسلام کے قاتل ان باغیوں کی قوت وشوکت اور سیدنا علیؓ کی حکومت میں ان کی مضبوط حیثیت کے ساتھ اپنی معزولی کے فیصلے کو قبول کرتے تو کیسے؟ اس لیے سارے فساد کے اصل مجرم یہی باغی قرار پاتے ہیں۔

صحابۂ کرام پر رشوت ستانی کا الزام؟

اس موقعے پر تاریخ کی کتابوں میں جو قبیح روایات در آئی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ:

دسّ معاوية عمرو بن العاص وهو يريد أن يعلم ما في نفس ابن عمر، يريد القتال أم لا؟ فقال: يا أبا عبد الرحمن ما يمنعك أن تخرج فنبايعك، وأنت صاحب رسول الله صلى الله عليه وسلم، وابن أمير المؤمنين، وأنت أحق الناس بهذا الأمر؟ قال: لو لم يبق إلا ثلاثة أعلاج بهجر لم يكن لي فيها حاجة. قال: فعلم أنه لا يريد القتال، قال: هل لك أن تبايع لمن قد كاد الناس أن يجتمعوا عليه ويكتب لك من الأرضين ومن الأموال ما لا تحتاج أنت ولا ولدك إلى ما بعده. فقال: أف لك، اخرج من عندي، ثم لا تدخل علي، ويحك إن ديني ليس بدينار كم ولا درهمكم، وإني أرجو أن

أخرج من الدنیا ویدی بیضاء نقیة۔ (الطبقات الکبریٰ: ۴/۱۲۳۔ أنساب الاشراف للبلاذری: ۲/۳۴۵، حلیة الاولیاء: ۱/۲۹۳)

اس روایت کا حاصل یہ ہے کہ معاویہ نے عمرو بن العاص کو ابن عمر کے پاس چپکے سے بھیجا کہ اندازہ کریں کہ کیا وہ خلافت حاصل کرنے کے لیے جنگ کریں گے کہ نہیں؟ وہ گئے اور ان سے کہا: ابو عبدالرحمان! آپ کیوں نہیں آگے آتے کہ ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت کرلیں۔ آپ صحابی ہیں، امیر المومنین عمر بن الخطاب کے بیٹے ہیں، اور حکومت کے سب سے زیادہ مستحق ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر نے صاف انکار کر دیا، جس سے پتہ چل گیا کہ ان کی طرف سے مقابلے اور جنگ کا خطرہ نہیں ہے۔

اب عمرو بن العاص نے پوچھا: اچھا! کیا خیال ہے، آپ ایسے آدمی (یعنی معاویہؓ) کے ہاتھ پر بیعت کریں گے جس پر تقریبا سارے مسلمان متفق ہو چکے ہیں اور وہ آپ کو اتنا مال اور جاگیریں دینے کی پیش کش کرتا ہے کہ آپ کی نسلیں آرام سے خوش حال رہیں گی؟ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے کہا: تف ہے تم پر، نکل جاؤ یہاں سے، میرا دین کوئی بکاؤ مال نہیں ہے۔ میں دنیا سے اللہ تعالیٰ کے پاس پاک صاف جانا چاہتا ہوں۔

خود اس روایت میں جھوٹ ہونے کے دلائل اتنے واضح ہیں کہ اس بعد کسی ثبوت کی مزید ضرورت نہیں رہتی۔

پہلی بات تو یہ کہ کیا ایک صحابی ایسی کھلی ضمیر فروشی کی دعوت دے سکتا ہے؟ کیا وہ اتنا بڑا خائن ہوسکتا ہے؟ دین وامت کا ایسا بدخواہ ہوسکتا ہے؟ یہ وہ عمرو بن العاص ہیں جو فتح مکہ سے پہلے، جب اسلام غریب وکم زور تھا، مکہ میں اپنے اونچے منصب اور سیاسی مقام کو چھوڑ کر اسلام لائے اور ہجرت فرمائی۔ ان کے بلند سیاسی مقام کا اندازہ ایسے لگایا جا سکتا ہے کہ عجم کے بادشاہوں کے دربار میں بھی ان کی ایک حیثیت تھی۔ بادشاہ نجاشی ان کا خیال رکھتا تھا۔ اور ان کی مالی پوزیشن یہ تھی کہ افریقی ممالک میں ان کا تجارتی مال آتا جاتا تھا۔ وہ جس وقت اسلام لائے اور ہجرت کی اس وقت اسلام لانا سراسر نقصان کا سودا تھا۔ اپنے مال اور سیاسی مرتبہ کی قربانی دے کر اسلام لائے، ہجرت کی، پھر کیا ہوا کہ اب وہ اسلام کے ایسے بدخواہ ہو گئے؟ یہ وہ صحابی ہیں جن کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے سچے مومن ہونے کی بشارت دی ہے۔ (چند صفحات پہلے حضرت عمرو بن العاص کے فضائل کی یہ احادیث گذر چکی ہیں۔)

دوسری بات یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے بارے میں سارے لوگوں کو معلوم تھا کہ وہ حکومت میں کوئی دل چسپی نہیں رکھتے۔ اس سے پہلے بارہا ان کو خلافت یا سیاسی عہدوں کی پیشکش کی گئی مگر انہوں نے قبول نہیں کی۔ وہ نہایت زاہد و بلند کردار تھے۔ ان کے کردار کی پاکیزگی وعظمت مشہور تھی۔ کیا اس مقدس شخصیت کو کوئی ایسی کھلی رشوت، ضمیر فروشی اور اللہ ورسول سے خیانت کی دعوت دے سکتا تھا؟ اس روایت سے تو پتہ چلتا ہے کہ

عبداللہ بن عمرؓ کے بارے میں اس کا گمان کیا جاسکتا تھا کہ وہ رشوت پر (اگر بڑی ہوتو) غور کرسکتے ہیں۔ ایسی روایتیں کسی صحابی کو قابل اعتماد نہیں چھوڑتیں۔

اگر کوئی حضرت عمرو بن العاصؓ کو امین و مومن نہ بھی مانتا ہوتو، ان کو زیرک وذہین اور نہایت بڑا مدبر سیاست داں تو جانتا ہی ہے۔ کیا ایسا ذہین اور مردم شناس شخص حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو کھلی رشوت کی اور قبیح وظاہر ضمیر فروشی کی دعوت دے سکتا ہے؟ حضرت عمرو بن العاص کا تو زیرکی میں شہرہ تھا، اُس دور کا کوئی معمولی درجہ کا سمجھ دار انسان بھی جانتا تھا کہ حضرت ابن عمر کس پائے کے زاہد و بزرگ اور اقتدار کی چپقلش سے کس قدر گریزاں ہیں۔ پھر ان کو پیش کش کی ہی نہیں جاسکتی تھی۔ ان کا حال تو یہ تھا کہ باغیوں نے ان کو خلافت قبول کرنے کے لیے مجبور کرنا چاہا، قتل کی بھی دھمکی دی، مگر وہ نہیں مانے تھے۔ کون نادان ایسے مجسم زہد واستغنا صحابی کو رشوت کی پیش کش کرسکتا تھا!۔

کیا یہ واضح نہیں تھا کہ اس رشوت کی پیشکش کے ساتھ تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے بات بننے کا سوال ہی نہیں؟ رشوت کی پیشکش کا نتیجہ تو یہ پہلے سے معلوم تھا کہ ابن عمرؓ سیدھے دروازے سے نکال دیں گے۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ عمرو بن العاص کو اس کا پہلے سے اندازہ نہ ہو؟ یہ سب باتیں قطعی ثبوت ہیں کہ روایت ایسے لوگوں کی گھڑی ہوئی ہیں جو جھوٹے ہونے کے علاوہ کم سمجھ بھی تھے۔

تیسری بات یہ راوی کہتا ہے کہ عمروابن العاص نے کہا کہ معاویہ پر تقریباً اتفاق ہو چکا ہے۔ حالاں کہ اس وقت تک ایران وعراق سے حجاز ونجد اور یمن سے لے کر مصر تک ملک کا غالب تر حصہ حضرت علی کے تابع تھا۔ تو کہاں کا اتفاق؟ یعنی راوی کو اس کا بھی احساس نہیں کہ وہ عمرو بن العاص جیسے جہاں دیدہ مدبر وذہین شخص کے منھ میں کیسی بدیہی طور پر غلط بات ڈال رہا ہے۔ یہ کھلے نکارت و بطلان کے وہ داخلی ثبوت ہیں جو نقد متن کے اصولوں کے لحاظ سے روایت کو من گھڑت ثابت کرتے ہیں [۱]۔

---

۱ ایسی ہی ایک رشوت کی روایت یہ نقل کی جاتی ہے کہ حضرت معاویہ نے خط لکھ کر حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو بڑی سی رشوت کی پیشکش کی تھی۔ اول تو صرف شیعہ حضرات ہی کے نزدیک ممکن ہوسکتا ہے کہ حضرت معاویہ جیسا صاحب فضیلت صحابی کا کردار رشوت ستانیوں کا ہو۔ لیکن کوئی اگر حضرت معاویہ سے نہایت بدگمان بھی ہوتو وہ بھی یہ تسلیم نہیں کرسکتا کہ حضرت معاویہ جیسا ذہین شخص حضرت ابوموسیٰ جیسی پاک باز وامین شخص کو ایسی گندی پیشکش کرسکتا ہے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری اس درجہ مقدس وامین صحابی تھے ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یمن کے بعض صوبوں کا حاکم بنایا، ان کے بارے میں شہادت دی کہ وہ ریا سے پاک اور صاحب ایمان وانابت ہیں (مسند احمد حدیث: ۲۲۹۵۲: بسند صحیح علیٰ شرط الشیخین مجمع الزوائد: ۹/۳۵۹)۔ نیز فرمایا کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت داوود کے حسن تلاوت کا حصہ ملا ہے (صحیح مسلم حدیث: ۷۹۳)۔ پھر وہ حضرت عمر کے عہد میں گورنر اور فوجی قائد بھی رہے۔ پھر حضرت علی کے ابتدائی عہد تک وہ گورنر رہے۔ اس پوری مدت میں ان کا کردار نہایت پاک صاف رہا۔ کیا معاویہ ایسے ناسمجھ تھے کہ وہ حضرت ابوموسی کو ایسی پیش کش کریں جس کو سن کر ہی وہ آگ بگولہ ہوجائیں؟؟

ان حالات کا ایک نہایت اہم پہلو،
جنگ صفین میں اکثر صحابہ کا موقف:

حضرت علی اور حضرت معاویہ اور ان دونوں کے ساتھ شریکِ جنگ صحابہ کا موقف اور رائے تو معلوم ہے۔ صحابہ میں ایک اور تیسرا، اور بہت بڑا، گروہ تھا، اس کی رائے یہ تھی کہ یہ جنگ وہ ''فتنہ'' ہے جس کے واقع ہونے کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کو متعدد مواقع پر دی تھی اور وصیت کی تھی کہ وہ اس میں شامل نہ ہوں۔ چنانچہ صحابہ کی اکثریت نے اس جنگ سے کنارہ کشی اختیار کی اور کسی فریق کا ساتھ نہیں دیا۔ بسند صحیح ثابت ہے کہ حضرت محمد بن سیرین تابعی فرماتے تھے:

هَاجَتْ الْفِتْنَةَ وَأَصْحَابَ رَسُولِ اللهِ صلی الله عَلَيْهِ وَسلم عشرَةَ آلَاف فَمَا خَفَّ فِيهَا مِنْهُمْ مائَةٌ بل لم يبلغُوا ثَلَاثِين۔

(العلل ومعرفۃ الرجال لاحمد، روایۃ عبداللہ: ۳/ ۱۸۲، بسند صحیح نیز المصنف: حدیث نمبر: ۲۰۷۳۵، اس کی سند بھی صحیح ہے: عبدالرزاق عن معمر عن ایوب، تاریخ مدینہ: ۴/ ۱۲۷۱ بسند ین صحیحین)

فتنہ کی جنگ (یعنی صفین) بھڑکی۔ اس وقت تقریباً دس ہزار (بعض روایتوں میں ہے: دسیوں ہزار) صحابہ دنیا میں موجود تھے۔ مگر ان میں سے سو بھی، بلکہ تیس نے بھی اس میں حصہ نہیں لیا۔

ان جنگوں میں شریک صحابہ کی تعداد و تناسب کے سلسلے میں یہ صحیح ترین روایت ہے۔ امام احمد اس کے راوی ہیں۔ ان کی سند ہے: اسماعیل عن ایوب عن محمد بن سیرین۔ امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں یہ دنیا کی سب سے صحیح اسانید میں سے ہے۔ (منہاج السنۃ: ۶/ ۲۳۶) ابن سیرین حضرت عمر کی خلافت میں پیدا ہو چکے تھے اور جنگ صفین کے وقت عاقل بالغ تھے۔ اور عراق کے مرکز بصرہ میں رہ کر حالات کا مشاہدہ کر رہے تھے۔

مصنف عبدالرزاق میں ہے کہ معمر کہتے ہیں کہ کوئی کہتا ہے کہ حضرت علی کی طرف سے تقریباً ڈھائی سو بدری صحابی شریک تھے۔ یہ کون کہتا ہے؟ پتہ نہیں؟ (حوالۂ بالا) یہی روایت ضعیف سند سے مستدرک حاکم میں آئی ہے اور اس کی عبارت میں تصحیف ہونے کی وجہ سے بالکل متضاد بات بن گئی ہے۔ (مستدرک حاکم: ۴/ ۴۸۶)۔ اسی طرح یعقوبی اور مسعودی جیسے مورخین کی بے سند روایت کہتی ہے کہ اس جنگ میں تقریباً ڈھائی سو کی بڑی تعداد میں بدری صحابہ شہید ہوئے۔ بدر میں شریک صحابہ کل ۳۰۰ کے قریب تھے، ان میں سے ۱۴ شہید ہو گئے تھے، کتنے ۳۶ سال بعد بقید حیات ہوں گے کہ ڈھائی سو شریک ہو گئے؟ یہ وہ بے اصل کہانیاں ہیں جو اہل تعصب راویوں نے اپنے موقف کی قوت دکھانے کے لیے گھڑ رکھی ہیں۔ ایسی روایات جو بڑی تعداد میں صحابہ کو ان جنگوں میں شریک بتاتی ہیں، سب بغیر سند کے ہیں۔ جب کہ اس کے برعکس روایات صحیح سندوں سے آئی ہیں

(ملاحظہ ہو: الصحابۃ المعتزلون للفتنۃ الکبریٰ، از ڈاکٹر خالد علال: ۳۰،۳۱)۔

اس پر آشوب و پر فتن دور اور مبہم و پیچیدہ حالات میں صحابہ کے موقف پر ڈاکٹر محمد، اُمحزون نے بڑی تحقیقی کتاب ''تحقیق مواقف الصحابة فی الفتنة من روایات الامام الطبری والمحدثین'' کے نام سے لکھی ہے۔ ان کی تفصیلی تحقیق کے بعد اس اختلاف میں صحابہ کی رائیں اور مواقف بے غبار ہو گئے ہیں۔ صحابہ کی غالب اکثریت، خصوصا سابقین کی اکثریت نے اپنے لیے اس جنگ میں حصہ لینا جائز بھی نہیں سمجھا تھا۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ (منہاج السنہ: ۱/ ۵۴۲)۔ اور مورخ ابن کثیر اس کی تصریح کی ہے۔ ابن کثیر کہتے ہیں:

وكان ترك القتال أولى من فعله، كما هو مذهب جمهور الصحابة... ولكن كان عليؓ وأصحابه أدنى الطائفتين إلى الحق من أصحاب معاوية، وأصحاب معاوية كانوا باغين عليهم"۔

ترجمہ: جنگ سے بچنا جنگ کرنے سے بہتر تھا، جیسا کہ جمہور صحابہ کا موقف تھا۔۔۔ لیکن بہرحال حضرت علیؓ اور ان کے ساتھی دونوں جماعتوں میں حق کے زیادہ قریب تھے۔ اور حضرت معاویہ اور ان کے ساتھی باغی تھے (البدایۃ والنہایہ: ٦/ ۲۳۹)۔

اس جنگ سے کنارہ کشی کرنے والوں میں حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت سعید بن زید بھی تھے۔ اس وقت حضرت علی کے علاوہ یہی دونوں عشرۂ مبشرہ میں سے باقی تھے اور سیدنا علیؓ کے علاوہ باقی تمام صحابہ سے افضل تھے۔ ان کے علاوہ عبداللہ ابن عمر، عمران بن حصین، اسامہ بن زید، ابوموسیٰ اشعری، ابوایوب انصاری، محمد بن مسلمہ انصاری، سلمہ ابن اکوع، عبداللہ بن سلّام، ابوبکرۃ ثقفی [۱] صہیب رومی، مغیرہ بن شعبہ [۲]۔ اھبان بن صیفی [۳] عبداللہ بن مغفل [۴] کاتب رسول حنظلہ بن ربیع [۵] ابومسعود بدری [٦] اور حضرت جریر بن عبداللہ بجلی [۷] رضی اللہ عنہم وغیرہ جیسے دیگر بہت سے جلیل القدر حضرات صحابہ بھی شامل تھے۔

---

۱ منہاج السنہ: ۴/ ۴۴۸ وسیر الاعلام: ۳/ ۱۲۸، تاریخ طبری وغیرہ۔

۲ سیر اعلام النبلاء: ۲/ ۱۸، ۳/ ۲۳۔

۳ مسند احمد: ۲۰٦۷۰۔ وسنن ترمذی: ۲۲۰۳۔

۴ السنۃ للخلال: ۹۷۔

۵ تاریخ دمشق: ۱۵/ ۳۲۵۔

٦ صحیح بخاری: ۱۰۲۷۔

۷ الاصابۃ: ۱/ ۵۸۳۔

اس سلسلے میں ایک بہت قابل لحاظ بات یہ ہے کہ اس جنگ میں غیر جانب داری کو لازم وواجب سمجھنے والے صحابہ میں کئی خود حضرت علیؓ کی طرف سے عامل اور گورنر کے عہدوں پر فائز تھے۔ مثلاً حضرت ابوموسیٰ اشعری، جو کوفے کی امارت پر بھی رہے اور بعد میں انہی کو حضرت علیؓ نے اپنی طرف سے حکم طے فرمایا۔ اسی طرح حضرت ابومسعود بدریؓ بھی تھے۔ جن کو حضرت علیؓ نے صفین کو جاتے ہوئے کوفے کا گورنر مقرر فرمایا مگر وہ اس جنگ سے عدم اطمینان کا برملا اظہار کرتے رہتے تھے، چنانچہ حضرت علی کو ان دونوں کو معزول کرنا پڑا (الاصابۃ: ۴/ ۴۳۲، الولایۃ علیٰ البلدان: ۳۴۰)۔

ایک غلط فہمی کی تصحیح:

بعض راویات سے ایک غلط فہمی پیدا ہوئی ہے۔ امام حاکم مستدرک میں اپنی سند سے روایت کرتے ہیں، کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ بعد میں کہا کرتے تھے کہ مجھے بہت افسوس ہے کہ میں نے اس باغی گروہ سے جنگ نہیں کی (مستدرک: ۳/ ۱۲۵، بسند صحیح)۔ اس سے یوں سمجھا گیا کہ یہ حضرت معاویہؓ کی جماعت کے سلسلے میں ہے۔ در اصل یہ ایک نامکمل روایت کا تاثر ہے۔ ورنہ حضرت ابن عمر کی مراد کوئی اور جماعت تھی۔ قصہ کچھ یوں تھا کہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے بنوامیہ کے خلاف اقدام کر کے حجاز اور عراق میں اپنی حکومت قائم کر لی تھی۔ اسی دوران ایک شخص عراق سے آیا۔ اس نے اپنا حال یہ بتایا کہ جس طرح آپ خانہ جنگی میں غیر جانب دار رہے اور شریک نہیں ہوئے، میری خواہش بھی آپ کی نقش قدم کی پیروی کی تھی۔ مگر ذرا یہ بتایئے کہ اس آیت کا کیا کیا جائے: اگر مومنین کے دو گروہوں میں لڑائی ہو جائے تو ان میں صلح کرا دو۔ پھر اگر کوئی گروہ دوسرے پر ظلم و زیادتی کرے، تو اس ظلم کی مرتکب جماعت (التی تبغی) سے جنگ کرو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے (حجرات)۔ غالباً وہ شخص حضرت ابن زبیرؓ کے حامیوں میں سے تھا۔ حضرت ابن عمرؓ ناراض ہوئے اور اس شخص سے کہا: تمہارا اس آیت سے کیا لینا دینا؟ یہاں سے چلے جاؤ۔ اس کے جانے کے بعد اپنے شاگردوں سے حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا: مجھے اس کا بہت ہی افسوس ہے کہ میں نے ''اِس باغی جماعت'' سے جنگ نہیں کی۔ امام حاکم نے اپنی اسانید سے اتنی ہی روایت ذکر کی ہے۔ اس سے اُنہوں نے بھی یہی سمجھا اور ابن عبدالبر وغیرہ بعض اور علماء کا بھی یہی گمان ہے کہ حضرت ابن عمرؓ کو جنگ صفین وغیرہ میں اپنے غیر جانب دار رہنے پر افسوس تھا۔ اس غلط فہمی کا سبب یہ ہے کہ مکمل روایت کی طرف، جو دیگر مآخذ میں موجود ہے، نظر نہیں گئی۔ پھر یہ غلط فہمی متعدد مورخین اور مصنفین کے یہاں آ گئی۔

یہ امام زہری کی روایت ہے۔ متعدد اسانید سے اس کی تفصیل یوں وارد ہوئی ہے کہ، موقع پر موجود حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے صاحب زادے حمزہ نے دریافت کیا کہ وہ کون ''الفئۃ الباغیۃ'' ہے جس سے جنگ نہ

کرنے پر آپ کو افسوس ہے؟ تو حضرت ابن عمر نے فرمایا: عبداللہ بن زبیر، جنہوں نے حکومت کے خلاف عراق میں بغاوت کی اور حکم رانوں کو ان کے گھروں سے نکالا اور نقض عہد کیا[۱]۔ حافظ ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں اس روایت کی تفصیل اپنی متعدد اسانید سے ذکر کی ہے، جن میں سے بعض صحیح ہیں۔ اسی طرح بیہقی نے حافظ یعقوب فسوی کی سند سے مکمل تفصیل اپنی سنن میں صحیح سند سے نقل کی ہے[۲]۔

ہم نے حضرت ابن عمر کے موقف کی تحقیق اس لیے مفید سمجھی کہ یہ بات واضح رہے کہ کسی ایک بھی غیر جانب دار رہنے والے صحابی سے اپنے موقف میں تردد ثابت نہیں ہے۔

یہ صحابہؓ اس جنگ کو رسولؐ اللہ کا بتلایا فتنہ سمجھتے تھے اور اس سے کنارہ کشی کو ضروری کہتے تھے:

ان صحابۂ کرام کی کنارہ کشی کا سبب صرف یہ نہیں تھا کہ (ان کے نزدیک) کسی ایک طرف ایسا واضح حق نہیں تھا، جس کی حمایت وتائید ان کے لیے ضروری ہو۔ بلکہ یہ حضرات پورے شرح صدر کے ساتھ کنارہ کشی کو اس لیے ضروری اور حق سمجھتے تھے کہ یہ جنگ وہی ''فتنہ'' تھی، جس کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پیشین گوئی فرمائی تھی اور صحابہ سے اس سے کنارہ کش رہنے اور بچنے کی تاکید کی تھی۔ جب اِن صحابہ سے اس سلسلے میں دریافت کیا جاتا تھا تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وہ تاکیدی احکام سناتے تھے جو انہوں نے اس سلسلے میں سنے تھے۔

ان حضرات صحابہ کہتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی بہت سی احادیث میں ہمیں بارہا خبردار فرمایا تھا کہ عنقریب امت میں فتنوں کی بارش اور آپس میں جنگیں ہوں گی۔ اور اس میں سلامتی کا راستہ یہی ہوگا کہ آدمی ہر قیمت پر ان سے کنارہ کش رہے۔ یہ حضرات بتاتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہم کو اس کی شدت سے تاکید کی تھی۔ ان میں سے بعض حضرات کی روایات میں تھا کہ آپؐ نے فرمایا تھا کہ یہ جنگیں صحابہ ہی کے دور میں ہوں گی، بعض لوگوں سے آپ نے کہا تھا کہ یہ جنگیں قریبی دور میں ہوں گی۔ یہ احادیث صحیح بخاری وصحیح مسلم اور دیگر حدیث کی کتابوں میں فتن کے ابواب میں کثرت سے آئی ہیں۔ ان کنارہ کش صحابہ میں سے بعض تو (خود ہی کنارہ کش نہیں رہے، بلکہ) عوام کو ان سے روکنے کے لیے متحرک وسرگرم بھی رہے۔

۱۔ ظاہر بات ہے یہ حضرت ابن عمرؓ کی رائے ہے، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی رائے اور ان کا اجتہادی موقف وہی تھا، جس پر انہوں نے عمل کیا۔ اللہ دونوں سے راضی ہو۔

۲۔ تاریخ دمشق: ۳۱/۱، ۱۹۳، سنن کبریٰ: ۱۶۷۰۶، حافظ یعقوب فسوی ہی کے حوالے سے اس کو ابن حجر نے فتح الباری: ۱۳/۲۷ میں بھی نقل کیا ہے۔ حافظ ذہبی نے بھی اس کو متعدد مقامات پر نقل کیا ہے اور اسی کو صحیح ٹھیرایا ہے کہ حضرت ابن عمر کی مراد ابن زبیر ہی ہیں، ملاحظہ ہو تاریخ الاسلام: ۲/۸۴۳۔

(۱) حضرت ابو ہریرہؓ انہی غیر جانب دار رہنے والے لوگوں میں تھے۔ صحیح بخاری میں ان کی بیان کردہ یہ حدیث آئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہم سے فرمایا تھا: جلد ہی فتنے آئیں گے، جن میں بیٹھ رہنے والا کھڑے ہونے والے سے بہتر ہوگا..... جس کو کوئی چھپنے کی جگہ مل جائے وہ چھپ کے بیٹھ جائے[۱]۔

(۲) حضرت ابوبکرہ ثقفیؓ بھی انہی صحابہ میں تھے۔ صحیح مسلم میں انؓ کی روایت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ نے اسی موضوع پر ایک خطبہ ارشاد فرمایا: جس میں پیشین گوئی فرمائی کہ جلد فتنہ کی جنگیں آئیں گی اور تاکید فرمائی کہ ان میں شرکت مت کرنا۔

إنها ستكون فتن: ألا! ثم تكون فتنة القاعد فيها خير من الماشي فيها، والماشي فيها خير من الساعي إليها. ألا! فإذا نزلت أو وقعت، فمن كان له إبل فليلحق بإبله، ومن كانت له غنم فليلحق بغنمه، ومن كانت له أرض فليلحق بأرضه. قال فقال رجل: يا رسول الله أرأيت من لم يكن له إبل ولا غنم ولا أرض؟ قال: يعمد إلى سيفه فيدق على حده بحجر، ثم لينج إن استطاع النجاء (صحیح مسلم: ۲۸۸۷)۔

جلد فتنہ کی جنگیں آئیں گی۔ خبردار! ان میں بیٹھ رہنے والے کی آزمائش چلنے والے شخص سے کم ہوگی۔ ان میں سست روی سے چلنے والا دوڑنے والے اور سرگرم رہنے والے سے بہتر ہوگا۔ سن لو! جب یہ جنگیں ہوں تو جس کسی کے پاس بکری یا اونٹ ہوں، یا زمینیں ہوں تو شہر چھوڑ کر کسی گاؤں دیہات میں جا بسے تاکہ ان جنگوں میں نہ پڑے۔ کسی نے پوچھا کہ اگر کسی کے پاس اونٹ، بکری، زمین (یعنی گاؤں میں رہ کر گزر بسر کا کوئی انتظام) نہ ہو تو؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا وہ یہ کرے کہ اپنی تلوار توڑ ڈالے (یعنی جنگ میں حصہ نہ لے) اور اپنی جان بچا سکے تو ان فتنوں سے جان بچا کے بھاگ لے۔

(۳) حضرت سعد بن ابی وقاصؓ عشرۂ مبشرہ میں سے اور سیدنا حضرت علی کے بعد اس وقت سب سے افضل صحابی تھے۔ اور آدمی بھی سیاست وحکومت کے تھے۔ سپہ سالار بھی رہے تھے اور گورنری کا بھی طویل تجربہ تھا۔ لیکن اِس وقت کسی جنگ میں شریک نہیں ہوئے۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ فتنوں کی آگ سے بچنے کے لیے وہ مدینہ چھوڑ کر گاؤں میں رہنے لگے۔ لوگوں نے پوچھا کہ آپ اس مقام وحیثیت کے شخص ہیں، پھر امت کے اس معاملے میں کنارہ کش ہو کر کیوں بیٹھ رہے ہیں؟ کہنے لگے: میں اس وقت تک اس جنگ میں حصہ نہیں لوں گا جب تک مجھے کوئی ایسی تلوار نہیں لا دو گے جس کی دو آنکھیں اور زبان ہوں، جو مجھے بتا دے کہ یہ کافر ہے اور یہ مومن''[۲]۔

---

[۱] صحیح بخاری: ۳۶۰۱، مستدرک: ۸۳۳۱، ذہبی نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔

[۲] مصنف عبدالرزاق: ۲۰۷۳۶، بسند صحیح۔ معجم طبرانی بسند ثقات، مجمع الزوائد: ۷/ ۲۹۹

ابوموسیٰ اشعریؓ اور دیگر صحابہ لوگوں کو جنگ میں شرکت سے روکتے تھے:

(۴) ان میں سے بعض کبار صحابہ کو اس صورت حال کے 'فتنہ' ہونے پر ایسا اذعان ویقین تھا کہ وہ اپنی حد تک ساری کوششیں کرنا چاہتے تھے کہ لوگوں کو بھی شرکت سے روکیں۔ آپ کو شاید حیرت ہو، ان میں سب سے سرگرم حضرت علیؓ کے گورنر برائے کوفہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ تھے۔ جب حضرت علیؓ نے جنگ (جمل) کی تیاریاں کیں، تو انہوں نے اس میں خلیفہ کی اطاعت ضروری نہیں سمجھی۔ بلکہ حضرت ابوموسیٰ بڑی سرگرمی سے کوفہ کے لوگوں کو اس ''فتنہ'' کی جنگ میں شرکت سے روکتے تھے [۱]۔ اور لوگوں کو اس سلسلے کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات سناتے تھے۔ حضرت ابوموسیٰ بیان کرتے تھے کہ ''فتنہ'' کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اپنے اسلحے توڑ دینا۔ اور آدم علیہ السلام کے بیٹے کی طرح مقتول ہونا برداشت کر لینا مگر قتل وقتال نہ کرنا [۲]۔ اس کے بعد جب حضرت علی اور حضرت معاویہ کے درمیان کشمکش شروع ہوئی تو وہ اس میں بھی غیر جانب دار رہے۔

(۵) اسی طرح حضرت حضرت عمران بن حصینؓ لوگوں کو بتاتے کہ یہ وہی فتنہ کی جنگ ہے، جس سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آگاہ فرمایا اور جس میں شرکت سے منع فرمایا تھا۔ امام بخاریؒ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت عمرانؓ دور دراز قبائل میں اپنے قاصد بھیجا کرتے تھے کہ وہ لوگوں کو کسی بھی جانب سے جنگ میں شرکت سے روکیں۔ وہ اعلان کرواتے تھے کہ لوگو! میں اپنے لیے اس جنگ میں کسی طرف سے بھی حصہ لینے سے اس کو بہتر سمجھتا ہوں کہ ایک کالا حبشی غلام ہو جاوں جو پہاڑوں پر بکری چراتا پھرے۔ وہ یہ بھی فتویٰ دیتے تھے کہ فتنہ وخانہ جنگی کے اس دور میں اسلحہ تک بیچنا جائز نہیں ہے [۳]۔

(۶) یہی رویہ حضرت ابوبکرہؓ کا تھا، وہ بھی لوگوں کو اس جنگ میں شرکت سے روکتے تھے۔ احنف بن قیس بنو تمیم کے سردار اور صفین میں حضرت علیؓ کے سپہ سالاروں میں سے تھے۔ کہتے ہیں کہ مجھے کوفہ میں حضرت ابوبکرہؓ ملے۔ پوچھا: کدھر کا قصد ہے؟ میں نے کہا: حضرت علی کا ساتھ دینے جا رہا ہوں۔ انہوں نے کہا واپس جاؤ، پھر انہوں نے اس سلسلے میں ایک حدیث بھی سنائی۔ (صحیح بخاری: ۳۱)۔

۱۔ مصنف ابن ابی شیبہ حدیث: ۳۰۷۷۳، بسند صحیح، والفتن لنعیم بن حماد بسند صحیح صفحہ: ۶۶۔ نیز ملاحظہ ہو البدایہ والنہایہ: ۷/ ۲۶۳۔

۲۔ مسند احمد حدیث: ۱۹۶۶۳، سنن ابوداود حدیث: ۴۲۵۹ بسند حسن۔

۳۔ مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۷۱۱۷، بسند صحیح، معجم کبیر طبرانی، بروایت ثقات، مجمع الزوائد: ۷/ ۲۹۹۔ صحیح بخاری (معلقا) باب بیع السلاح فی الفتنۃ۔ فتح الباری: ۴/ ۳۲۳۔

حضرت ابو ہریرہ بھی لوگوں سے کہتے تھے: سنو! بڑا سیاہ 'فتنہ' آ گیا ہے۔ اس سے محفوظ وہ شخص رہے گا، جو بالکل کنارہ کش رہے گا[1]۔

(۷) حضرت ابو اسید مالک بن ربیعہ ساعدی انصار کے بڑے صحابہ میں سے تھے۔ بدر اور تمام غزوات میں شریک رہے۔ آخر عمر میں نابینا ہو گئے تھے۔ وہ ان جنگوں سے پہلے نابینا ہو جانے پر اللہ کا شکر ادا کیا کرتے تھے[2]۔

محمد بن مسلمہؓ بھی شریک نہیں ہوئے، رسول اللہؐ نے ان سے فرمایا تھا: تم کو فتنہ نقصان نہیں پہنچائے گا:

(۸) اس سلسلے کی ایک اہم شخصیت حضرت محمد بن مسلمہ انصاریؓ بھی تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ بدر و احد و تمام جہاد کے مواقع میں شرکت فرما چکے تھے۔ امانت و دیانت کا یہ مقام تھا کہ حضرت عمرؓ نے ان کو اپنے گورنروں کے محاسبہ و جائزہ کی ذمہ داری و منصب دیا تھا۔ وہ بھی ان جنگوں سے مکمل کنارہ کش رہے۔ لوگوں کے نزدیک ان کی علیٰحدگی و کنارہ کشی کی اہمیت اس لیے بہت زیادہ تھی، کہ ان کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے پیشین گوئی فرمائی تھی کہ محمد بن مسلمہ اُس ''فتنہ'' سے محفوظ رہیں گے (جس کے آنے کی خبر آپؐ نے دی تھی اور جو آ کر رہا)۔ ان کے یکسو رہنے سے بہت سے لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ ان حالات میں کنارہ کشی و یکسوئی ہی حکم نبوی ہے۔

جب یہ حالات آئے اور لوگوں نے ان کے غیر جانب دار رہنے اور کسی کا ساتھ نہ دینے کی وجہ پوچھی، تو انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے خود اپنے دست مبارک سے مجھے ایک نجرانی تلوار عنایت فرمائی۔ اور فرمایا اس سے اللہ کے راستہ میں جہاد کرنا، لیکن جب دیکھنا کہ خود مسلمانوں میں چھڑ گئی ہے، تو اس کو کسی پتھر پر دے مارنا اور گھر میں خاموش بیٹھ جانا۔ اس لیے میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حکم پر عمل پیرا ہوں[3]۔ (مسند احمد کی روایت کے مطابق) حضرت علیؓ نے ان سے اپنا ساتھ نہ دینے کا سبب پوچھا، تو انہوں نے کہا کہ آپ ہی کے چچا زاد بھائی (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) نے مجھے کنارہ کش رہنے کی وصیت فرمائی تھی۔ حضرت علیؓ نے یہ سن کر ان سے

۱؎ مستدرک: ۸۳۳۱، مصنف عبد الرزاق: ۲۰۷۶۲ بسند صحیح۔

۲؎ مستدرک: ۶۱۸۹، المعجم الکبیر: ۱۹/ ۲۶۰، نیز ہیثمی نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔ مجمع الزوائد: ۹/ ۳۶۳۔

۳؎ معجم کبیر: ۶/ ۲۳۲ بسند ثقات۔ معجم اوسط: ۲۳۷۵، بسند ثقات۔ حضرت محمد بن مسلمہ سے اس سلسلے میں متعدد روایات صحیح سند سے آئی ہیں۔ ملاحظہ ہو مجمع الزوائد ۷/ ۳۰۱۔ ۳۰۵۔

کچھ نہیں کہا۔ اور اپنے لوگوں سے بھی یہی فرمایا ان سے کچھ نہ کہو (مسند: ۱۷۶۹۷)۔

حضرت حذیفہ بن الیمانؓ فتن کے سب سے بڑے عالم تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کو فتنوں کی علامات، امت میں پیش آنے والے دینی انحرافات، سیاسی آویزشوں اور اجتماعی و اخلاقی فتنوں کی پیشین گوئیوں اور ان کے متعلق ہدایات پر مشتمل بہت سی باتیں بتلا رکھی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو حضرت عثمان کی شہادت کے چند دن بعد اور ان افسوس ناک واقعات سے پہلے ہی اس دنیائے فتن سے اپنے پاس بلا لیا۔ سنن ابوداود، مستدرک حاکم اور دیگر کتب حدیث میں وارد صحیح روایت کے مطابق حضرت حذیفہ فرماتے تھے کہ:

مَا أَحَدٌ مِنَ النَّاسِ تُدْرِكُهُ الْفِتْنَةُ، إِلَّا أَنَا أَخَافُهَا عَلَيْهِ، إِلَّا مُحَمَّدُ بْنُ مَسْلَمَةَ، فَإِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: لَا تَضُرُّكَ الْفِتْنَةُ ۔ [۱]

یعنی مجھے ہر شخص کے فتنوں سے متاثر و آلودہ ہونے کا خطرہ ہوسکتا ہے مگر محمد بن مسلمہ کے بارے میں نہیں۔ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ محمد بن مسلمہ ''فتنہ'' سے محفوظ رہیں گے۔

مذکورہ بالا حدیث کو حضرت حذیفہ سے سننے کے بعد کچھ علماء ایک قافلہ کے ساتھ مدینہ آرہے تھے۔ ربذہ کے مقام پر انہوں نے دیکھا کہ خیمہ لگائے کوئی بزرگ قیام پذیر ہیں۔ پتہ چلا یہ بزرگ صحابی رسول حضرت محمد بن مسلمہؓ ہیں۔ اس خانہ جنگی کے دوران وہ مقام ربذہ کی طرف ہجرت کر گئے تھے۔ ان لوگوں نے پوچھا اب کیا ہوگیا؟ آپ ان حالات میں امت کی اصلاح اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر تک کو ترک کر کے گوشہ نشین ہوگئے ہیں؟ کہنے لگے جب تک یہ انتشار و خانہ جنگی ختم نہیں ہوتی میں ایسے ہی، لوگوں سے دور، کسی گاؤں میں رہوں گا۔ [۲]

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی صراحت:

ان ہی دلائل کی بنا پر شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے فرمایا ہے کہ صحابہ کی اِس جماعت کی رائے صحیح احادیث کی پیشین گوئیوں اور نبوی ہدایات کے مطابق تھی اور زیادہ صحیح تھی:

والنصوص الثابتة عن النبي - صلى الله عليه وسلم - تقتضي أن ترك القتال كان خيرا للطائفتين، وأن القعود عن القتال كان خيرا من القيام فيه، وأن عليا، مع كونه أولى بالحق من معاوية وأقرب إلى الحق من معاوية، لو ترك القتال لكان أفضل

---

[۱] سنن ابی داوود: ۴۶۶۳، بسند صحیح۔ مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۷۲۳۸ بسند صحیح۔ نیز مستدرک حاکم: ۵۸۳۷ اور ذہبی نے اس کی سند کو صحیح ٹھیرایا ہے۔

[۲] مستدرک حاکم: ۵۸۳۷ اور ذہبی نے اس کی سند کو صحیح ٹھیرایا ہے۔

وأصلح وخيرا۔ (منہاج السنة: ۳۹۸/۴)۔
صحیح ومستند احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ دونوں جماعتوں کے لیے بہتر تھا کہ جنگ نہ کرتے۔ اور (جب جنگ ہو ہی گئی تو) جنگ سے کنارہ کش رہنا حصہ لینے سے افضل تھا۔ اگرچہ حضرت علیؓ حضرت معاویہؓ کے بنسبت حق کے زیادہ قریب تھے، پھر بھی اگر جنگ نہ کرتے تو زیادہ افضل اور امت کے لیے بہتر ومفید ہوتا۔

اس موقف کی ایک اور اہم دلیل:

مذکورہ دلائل کے علاوہ اس موقف کی ایک اہم دلیل یہ بھی ہے کہ بعد میں حضرت حسنؓ نے جو صلح فرمائی، اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پیشین گوئی فرمائی تھی اور اس مصالحت کی اعلیٰ درجہ کی تحسین فرمائی تھی۔ اگر فریق ثانی سے جنگ واجب اور حکم شرعی ہوتی، یا جنگ تنازل وصلح سے صرف بہتر بھی ہوتی، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صلح کرنے اور جنگ بند کرنے کی تحسین وستائش نہ فرماتے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ آپؐ کی یہ واضح تحسین اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت حسن کا فیصلہ برحق اور قابل ستائش تھا۔ اگر جنگ بہتر ہوتی یا واجب تو ایسا نہیں ہوسکتا تھا، بلکہ حضرت حسن تو ترک واجب کے مرتکب (قابل مذمت) ہوتے، یا کم از کم ایسے امر کے تارک ہوتے جو اللہ اور اس کے رسولؐ کے نزدیک زیادہ پسندیدہ تھا[۱]۔ (اور ایسی صورت میں ان کا یہ فیصلہ قابل مذمت چاہے نہ ہوتا، لیکن لائق تحسین وستائش بھی نہ ہوتا)۔ حافظ ابن حجرؒ نے بھی صلح حسن کی تحسین کو حضرت سعد بن ابی وقاص، ابن عمر، محمد ابن مسلمہ اور دیگر کنارہ کش لوگوں کے موقف کی صحت کے دلائل میں سے بتایا ہے (فتح الباری: ۶۷/۱۳)۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کی رائے:

ہمارے برصغیر کے امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کا بھی یہی موقف ہے۔ بلکہ انہوں نے اس کا ابن تیمیہؒ سے بھی زیادہ صراحت ووضاحت سے اظہار کیا ہے۔ اپنی شاہکار و نادرۂ روزگار کتاب ازالۃ الخفاء (فصل پنجم، مقصد اول) میں انہوں نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سیدنا حضرت عثمانؓ کی خلافت کے آخری دور میں فتنوں کے ظہور کی پیشین گوئی فرمائی تھی۔ ان فتنوں کا آغاز شہادت عثمانؓ سے ہوا۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ جنگ جمل وصفین انہی فتنوں کا مصداق تھیں۔

اس کے بعد شاہ صاحب نے بڑے اہتمام سے وہ احکام ذکر کیے ہیں جو ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خاص طور پر ان حالاتِ فتن اور اِن جنگوں کے سلسلے میں دیے تھے اور اپنی بہت سی احادیث میں بیان فرمائے تھے''۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ فتنے کے دور سے پہلے خلیفہ کے حکم پر جنگ کرنا واجب تھا۔ مگر فتنے کے دور میں جو احکام

---

[۱] منہاج السنة: ۵۳۹/۱۔ نیز ۴۵۰/۴، مجموع الفتاوی: ۷۰/۳۵۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیے تھے ان میں یہ بھی تھا کہ:

آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم منع نمودند از قتال، وامر مؤکد فرمودند بقعود۔ باید دید چہ قدر فرق است درآنکہ دعوتِ خلیفہ سبب وجوب امتثال امر گردد وتحریم تخلف، وآنکہ واجب باشد قعود، وحرام باشد خوض در نصرت۔(ازالۃ الخفاء:۱/ ۵۴۵ مع ترجمہ)

آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان جنگوں (یعنی جنگ جمل وصفین) میں حصہ لینے سے منع کیا تھا اور تاکید کے ساتھ حکم دیا تھا کہ گھر میں بیٹھ رہا جائے۔ غور کیجئے، کتنا بڑا فرق ہوگیا۔ پہلے خلیفہ کی دعوت پر جنگ کرنا واجب تھا۔ اور نہ کرنا حرام۔ اور اب (فتنہ کے دور میں) ان جنگوں میں لڑائی سے بیٹھ رہنا واجب ہوا۔ اور (خلیفہ کی) مدد کرنا حرام ہوا''۔

پھر کتاب کے آخری حصہ میں، جو حضرت علی مرتضیٰؓ کی خلافت وفضائل پر مشتمل ہے، یہ صورت حال دوبارہ زیر بحث آئی۔ حضرت شاہ صاحب نے اس موقعہ پر سیدنا علیؓ کی خلافت کی حقانیت بیان فرمائی۔ مزید یہ بھی واضح فرمایا کہ سیدنا علیؓ نے جو جنگیں فرمائیں ان کے نزدیک وہی عمل صحیح ومناسب اور افضل تھا۔ ساتھ ہی حضرت معاویہؓ کو (اہل سنت کے عمومی موقف کے مطابق) مجتہد مخطی (یعنی رائے کی غلطی میں مبتلا) بھی بتلایا۔ مگر ساتھ ہی حضرت شاہ صاحب نے یہ بھی بڑی تفصیل سے بیان کیا کہ ان دونوں حضرات کے درمیان جو جنگیں ہوئیں، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صاف اور واضح احادیث کے مطابق ''فتنہ'' تھیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کو ان میں شرکت سے منع فرمایا تھا۔

یہاں شاہ صاحب یہ بھی فرماتے ہیں کہ یہ احادیث اتنی کثرت سے مروی ہیں کہ مجموعی طور پر ان سے معنوی تواتر ثابت ہوتا ہے اور یہ یقینی وقطعی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان جنگوں کو فتنہ ہی قرار دیا تھا اور شریک جنگ ہونے سے منع فرمایا تھا۔ حضرت شاہ صاحب نے ان میں سے بہت سی احادیث نقل بھی کی ہیں۔(ازالۃ الخفا: ۴/ ۵۲۸ تا آخر کتاب)۔

راقم سطور عرض کرتا ہے کہ سیدنا علیؓ اور ان کی جماعت نے اور حضرت معاویہؓ اور ان کے گروہ نے جو کیا اُن کے نزدیک وہی صحیح تھا۔ حضرت علیؓ کے نزدیک بحیثیت خلیفہ تمام صوبوں میں اپنی بیعت لینا ان کی پہلی ذمے داری تھی۔ جب کہ حضرت معاویہ قاتلان عثمان کو سزا دلانا امت کی پہلی ضرورت سمجھتے تھے۔ اور یقینا حضرت علیؓ یہ خیال فرماتے ہوں گے کہ یہ حالات اس ''فتنہ'' کا مصداق نہیں ہیں جن کی حضور اکرم علیہ الصلاۃ والتسلیم نے خبر دی تھی۔۔۔۔ اور بہر حال ہونا تو وہی تھا جو مقدر تھا۔ سیدنا علی اگر جنگ نہ فرماتے تو وہ حالات کیسے وجود میں آتے

جن میں بیٹھ رہنے کی آپ ﷺ نے تاکید فرمائی تھی۔ وکان امر اللہ قدرا مقدورا۔

اس مسئلہ میں اختلاف رائے سیدنا علیؓ سمیت تمام صحابہ کے نزدیک جائز تھا:

صحابۂ کرام کے الگ الگ موقفوں کی تفصیل سے ہمارا مقصود صرف یہ دکھانا تھا کہ یہ معاملہ ایسا قطعاً نہیں ہے، جس میں ایک فریق واضح باطل پرست اور ظلم کا حامل وداعی تھا، جس کا حق سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ بلکہ معاملہ اس کے برعکس یہ تھا کہ خود کبار صحابہ کی اکثریت اس جنگ میں کسی کے ساتھ شریک نہ ہونے کو نصوص واحادیث رسول ﷺ کی روشنی میں ضروری سمجھتی تھی۔ اسی طرح معتبر روایات اس پر متفق ہیں کہ صحابۂ کرام اس مسئلہ میں اختلاف رائے کی پوری گنجائش سمجھتے تھے۔ سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان میں سے کسی شخص پر اپنے ساتھ شرکت کے لیے اصرار بھی نہیں کیا، نہ کسی کو ملامت فرمائی۔ ایک بھی معتبر روایت نہیں ملتی کہ حضرت علی نے صحابہ کی غیر جانب دار رہنے والی اِس اکثریت کی کوئی مذمت کی ہو۔ بلکہ اپنی طرف سے ان کو اپنے اجتہاد اور رائے پر عمل کرنے کی اجازت بھی دی۔ اس کے بعد کون سلیم العقل ہوگا جو حضرت معاویہ یا کنارہ کش لوگوں کو قابل ملامت قرار دے سکے؟؟۔

بغوی نے بسند حسن روایت کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلامؓ خود بھی نہیں نکلے اور حضرت علی کو بھی (جنگ کے ارادے سے) مدینہ سے نکلنے سے روکا تو حضرت علیؓ نے فرمایا: ان کو کوئی کچھ نہ کہے، 'إنه منا رجل صالح' یہ ہماری جماعت کے ایک نیک آدمی ہیں۔ حافظ ابن حجر نے اس کی سند کو جید قرار دیا ہے [۱]۔

حضرت محمد بن مسلمہ جب حضرت علی کے ساتھ جنگ میں شرکت پر آمادہ نہیں ہوئے تو حضرت علی نے ان سے بھی کچھ نہیں فرمایا بلکہ اپنے لوگوں سے بھی کہا: ان سے کچھ نہ کہو، ان کو چھوڑ دو۔ (مسند: ۱۷۹۷۹)۔

حضرت اُہبان ابن صیفی غفاریؓ سے بھی حضرت علی نے اپنا ساتھ دینے کی فرمائش کی۔ انہوں نے بھی یہی عذر کیا تو حضرت علیؓ نے ان کو کچھ ملامت نہیں کی۔ (مسند احمد: ۲۰۶۷۰۔ وسنن ترمذی: ۲۲۰۳)۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری بھی پورے طور پر الگ رہے، بلکہ دوسروں کو بھی روکتے تھے۔ حضرت علیؓ نے ان کو بھی کچھ نہیں کہا۔ بلکہ کمال اخلاص وصفائی قلب دیکھیے کہ (اپنی پسند سے) ان کو ہی تحکیم میں اپنا نمائندہ بنایا۔ سب سے بڑھ کر حقیقت پسندی اور بلند اخلاقی مقام وکشادہ دلی کا ثبوت یہ ہے کہ آپؓ نے حضرت معاویہؓ کے

---

۱ معجم الصحابہ للبغوی: ۴/۱۰۴، مکتبہ دار البیان، ۱۴۲۱ھ ۲۰۰۰ء۔ الاصابہ: ۴/۱۰۳۔ ۱۰۴۔ اتحاف الخیرۃ: ۸/۱۱، بحوالہ مسند اسحاق، اتحاف میں مسند اسحاق کی جو سند مذکور ہے وہ صحیح ہے۔ بوصیری نے بھی اس کے راویوں کو ثقہ قرار دیا ہے۔

لشکر کے لوگوں کے بارے میں محبت بھرے کلمات ارشاد فرمائے، ان کو مومن اور جنتی کہا۔

سیدنا علیؓ اس اختلاف کو رائے اور اجتہاد کا ہی اختلاف سمجھتے اور کہتے تھے۔ قیس بن عُباد بصری کبار تابعین میں سے ہیں۔ حضرت علیؓ کے حامیوں میں سے تھے۔ امام ابوداؤد نے بسند صحیح روایت کیا ہے کہ انہوں نے سیدنا علیؓ سے دریافت کیا کہ آپ کا یہ (جنگ کے لئے) جانا آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کوئی وصیت و ہدایت کی بنیاد پر ہے یا آپ نے ایسا صرف اپنی رائے اور (شرعی) اجتہاد کی بنیاد پر کیا ہے۔ حضرت علیؓ نے صاف ارشاد فرمایا کہ نہیں! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ کو اس سلسلے میں کوئی خاص ہدایت نہیں فرمائی تھی۔ یہ صرف میری رائے اور اجتہاد ہے (سنن ابوداؤد: ۴۶۶۶، مسند احمد: ۱۲۷۱)۔

دوسری طرف جنگ سے الگ رہنے والے یہ سب حضرات حضرت علی سے نہایت محبت رکھتے تھے اور ان کے مقام و مرتبے کے قائل تھے اور ناقدین کے سامنے ان کے فضائل بیان کرتے تھے، لیکن اس جنگ کو فتنہ کی ایسی جنگ سمجھتے تھے جس میں شرکت ان کے نزدیک صحیح نہیں تھی۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت اسامہ بن زیدؓ نے حضرت علی کے پاس اپنے خادم حرملہ کو بھیجا اور کہا کہ اگر پوچھیں کہ ہمارا ساتھ کیوں نہیں دیتے؟ تو کہہ دینا: لَو كُنْتَ فِي شِدْقِ الأَسَدِ لَأَحْبَبْتُ أَنْ أَكُونَ مَعَكَ فِيهِ، وَلَكِنَّ هَذَا أَمْرٌ لَمْ أَرَهُ۔ (صحیح بخاری: ۷۱۱۰)۔ کہ خدانخواستہ ان کو کچھ پیش آ جائے تو، ان کو بچانے کے لیے میں شیر کے منہ میں بھی جانے کو تیا ہوں۔ مگر اس جنگ میں حصہ لینا سمجھ میں نہیں آتا۔ ان سے بھی سیدنا علیؓ نے کچھ نہیں فرمایا۔

تیسری طرف حضرت معاویہؓ بھی اپنا ساتھ نہ دینے والوں کو پوری طرح اس کا حق دار سمجھتے تھے کہ وہ اپنی اجتہادی رائے پر عمل کریں۔ حضرت علیؓ کے اہل خانہ اور بے شمار ساتھیوں کے ساتھ انہوں نے اچھے تعلقات رکھے، حسن سلوک کیا، اپنی حکومت میں ذمہ داریاں سپرد کیں اور کسی ایک کو کبھی بھی غلط کار نہیں کہا۔ جو لوگ غیر جانب دار رہے ان کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے صاحب زادے ابو بردہ کہتے ہیں کہ میں حضرت معاویہؓ کے مرض وفات میں حاضر ہوا تو انہوں نے بیٹے یزید سے کہا:

> إِنْ وَلِيتَ مِنْ أَمْرِ النَّاسِ شَيْئًا فَاسْتَوْصِ بِهَذَا، فَإِنَّ أَبَاهُ كَانَ لِي خَلِيلا أَوْ نَحْوَ ذَلِكَ مِنَ الْقَوْلِ غَيْرَ أَنِّي رَأَيْتُ فِي الْقِتَالِ مَا لَمْ يَرَهُ. (تاریخ طبری: ۳۳۲/۵، طبقات ابن سعد: ۸۴/۴، بسند صحیح۔)
>
> یعنی اگر تم حکم راں ہو تو ان کا خیال رکھنا۔ ان کے والد میرے دوست تھے۔ بس جنگ کے سلسلے میں میری رائے ان کے خلاف تھی۔

حضرت ابومیسرة عمرو بن شرحبیلؒ تابعین کی نسل کے اولیاء کبار اور ائمۂ زہد و عبادت میں شمار ہوتے ہیں۔

علماء ان کو حضرت مسروق سے بھی بلند مقام دیتے ہیں (حلیۃ الاولیاء: ۱۴۱/۴)۔ انہوں نے خواب دیکھا کہ جنت کے باغات میں حسین سفید خیمے لگے ہیں۔ ایک میں حضرت عمارؓ ہیں، دوسرے میں ایک اور صحابی حضرت ذوالکلاع حمیریؓ۔ یہ حضرت معاویہ کے میمنہ کے کمانڈر تھے۔ ابومیسرۃ کہتے ہیں کہ میں نے کہا: یہ کیا؟ آپ دونوں میں تو جنگ تھی؟ ان دونوں نے کہا اللہ تعالیٰ بڑا غفار ہے [۱]۔

کسی عقل ودانش رکھنے والے کے لیے، ان مستند وصحیح روایات کے بعد، اس میں شبہہ نہیں رہتا کہ معاملہ یقیناً اجتہادی تھا، جس میں حق کسی ایک طرف اور باطل کسی دوسری طرف ہونا یقینی وقطعی نہیں تھا۔ ہر ایک موقف رکھنے والے کا اپنا نقطۂ نظر تھا اور وہ اسی کو "فیما بینہ وبین اللہ" صحیح اور دین وملت کے لیے مناسب اور خیر خواہی پر مبنی سمجھتا تھا اور اسی پر اللہ کی رضا کا امیدوار تھا، ساتھ ہی دوسرے فریق کو بھی مومن ومخلص ہی سمجھتا تھا۔ مگر بے دلیل عامیانہ خیالات پر اصرار کرنے والوں کو کوئی مطمئن نہیں کرسکتا۔ جتنی تحقیق کی جاتی ہے اہل سنت کے مسلک اور رویّے کی حقانیت وقوت آشکارا ہوتی جاتی ہے۔ یہی حضرت علیؓ کا موقف تھا اور یہی حضرت معاویہؓ کا۔ والحمدللہ۔

بہرحال حضرت علیؓ حق کے زیادہ قریب تھے:

شیخ الاسلام ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ اس وقت موجود صحابہ کی اکثریت کی رائے بھی یہی تھی کہ اچھا یہی تھا کہ یہ جنگیں نہ کی جاتیں۔ اور امام احمد اور اکثر ائمۂ سلف کی رائے بھی یہی تھی۔ شیخ الاسلام کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں مطلق باغی سے جنگ کا حکم نہیں دیا گیا تھا، بلکہ یہ حکم دیا گیا تھا کہ اگر مسلمانوں کی دو جماعتوں میں جنگ ہوجائے تو دونوں کے درمیان صلح کرواؤ۔ اور پھر جو صلح کو نہ مانے اور بغاوت کرے اس کے خلاف جنگ کرو۔ حضرت معاویہؓ اگرچہ بیعت سے مانع تھے، لیکن انہوں نے جنگ نہیں چھیڑی تھی۔ (اسی لیے) یہ حضرات صحابہ اس جنگ کو فتنہ کی جنگ ہی سمجھتے تھے۔ یہی رائے اسامہ بن زیدؓ، محمد بن مسلمہؓ، عبداللہ بن عمرؓ، سعد بن ابی وقاصؓ اور اکثر سابقین اولین اور مہاجرین وانصار کے موجود حضرات رضی اللہ عنہم کی تھی۔ ہاں! حضرت علی اپنے مقابل فریق کے بنسبت حق کے زیادہ قریب (اولیٰ بالحق) تھے۔ [۲]

حکومتوں کی تاریخ اور سیاسی اختلافات کی پیچیدگیوں سے واقفیت رکھنے والے جانتے ہیں کہ ایسے اختلافات کے موقع پر صورت حال کتنی پیچیدہ اور گنجلک ہوجاتی ہے۔ جب اختلافات کی شدت وحدت کم ہوگئی، جذبات سرد پڑے، وقت گزرنے کے ساتھ دلیلوں اور موقفوں کے الجھے پیچ کھلنے لگے اور حالات کے افق سے

---

[۱] الاصابہ: ۳۵۷/۲، حافظ ابن حجر کہتے ہیں اس کو یعقوب بن شیبہ نے صحیح سند سے روایت کیا ہے۔

[۲] منہاج السنۃ: ۳۹۲/۴، ۴۴۸۔ ملخصا

مباحثوں کا غبار چھٹا، تو فیصلہ کرنا ممکن ہوا۔ رسول اللہ ﷺ کی واضح پیشین گوئی کی روشنی میں ثابت ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ حق سے زیادہ قریب تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے خوارج کے ظہور کی پیشین گوئی فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا کہ اس وقت مسلمانوں میں افتراق ہوگا اور خوارج کو ''دو جماعتوں میں حق کے زیادہ قریب جماعت'' (اولیٰ الطائفتین بالحق) شکست دے گی (صحیح مسلم: ۱۰۶۴)۔ اور اختلاف کے دوران خوارج سے جنگ حضرت علیؓ نے ہی فرمائی تھی۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی یہ پیشین گوئی کہ عمارؓ کو باغی گروہ شہید کرے گا، ثابت کرتی ہے کہ حقیقت میں حضرت علیؓ اپنے مقابل کے سامنے برحق تھے۔ اہل سنت کے ائمہ ان حدیثوں کی بنیاد پر اسی کے قائل ہیں۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کہتے ہیں: ان دلائل سے حضرت علی کی امامت وخلافت کی صحت اوران کے مخالف کی غلطی واضح ہوتی ہے۔ نیز معلوم ہوتا ہے کہ ان جنگوں میں وہ برحق تھے اوران کے مخالف یا اجتہادی غلطی اور غلط تاویل پر تھے، یا بلا تاویل باغی تھے۔ ہمارے مذہب کے دو قولوں میں سے صحیح قول یہی ہے کہ حضرت علی کے مخالف غلطی پر تھے [۱]۔

حضرت عمار بن یاسر کی شہادت:

اس جنگ میں حضرت عمار بن یاسر کام آئے۔ رسول اللہ ﷺ نے جنگ خندق کے وقت، یا مسجد نبوی کی تعمیر کے وقت، پیشین گوئی فرمائی تھی کہ ''عمار! تم کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا'' (صحیح مسلم: ۲۹۱۶)۔ بقول ابن کثیرؒ ان کی شہادت سے رسول اللہ ﷺ کی پیشین گوئی بھی صحیح ثابت ہوئی اور یہ بھی طے ہوگیا کہ اس اختلاف وجنگ میں حضرت علیؓ حق پر ہیں اور حضرت معاویہؓ کا گروہ باغی۔ (البدایۃ والنہایۃ: ۷/۲۹۶۔) اس جنگ کے بارے میں یہی اہل سنت کی متفقہ رائے ہے۔

اس روایت میں ایک منکر اضافہ:

حضرت عمارؓ ایک باغی گروہ کے ہاتھوں مارے جائیں گے، اس کے بعد بعض حدیث کی کتابوں میں اس روایت پر ایک اضافہ آتا ہے کہ ''يدعوهم إلى الجنة، ويدعونه إلى النار'' (عمار ان کو جنت کی طرف بلاتے ہوں گے اور وہ ان کو جہنم کی طرف)۔ واقعہ ہے کہ یہ جملہ حضرت معاویہ اوران کے گروہ کے بارے میں بہت شدید، نہایت سخت ہے۔ لیکن امام بخاری کی تحقیق، جس کی کچھ تفصیل وتشریح حافظ ابن حجر نے کی ہے، یہ ہے کہ اصل میں دو الگ الگ حدیثیں تھیں، کسی راوی (خالد الحذاء) نے غلطی سے دونوں کو جوڑ دیا۔ ان کے علاوہ

---

[۱] مجموع الفتاوی: ۴/۴۳۷، نیز ملاحظہ ہو البدایہ والنہایۃ: ۷/۲۳۹

دسیوں راویوں نے اس اضافے کو "الفئۃ الباغیۃ" والی حدیث میں نقل نہیں کیا ہے۔ یہ ایک منکر اضافہ ہے۔ اس کا کوئی جوڑ حضرت عمار کی شہادت یا باغی گروہ سے نہیں تھا۔

''عمار! تم کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد کو روایت کرنے والے تقریبا ۲۵ صحابہ ہیں۔ اسی بنا پر علماء نے اس روایت کو متواتر قرار دیا ہے [۱]۔ ان میں سے اکثر صحابہ سے ان کے کئی کئی

---

[۱] قطف الازہار المتناثرۃ للسیوطی: ۲۸۳۔۔۔۔۔۔۔ان روایات کے حوالے درج ذیل ہیں:

۱۔ حضرت اُمِّ سَلمہ، صحیح مسلم: ۲۹۱۶۔
۲۔ حضرت عمرو بن العاص، مسند احمد: ۱۷۷۷۸۔
۳۔ حضرت ابوسعید خدری کی روایت، ابونَضرہ کے حوالے سے، مسند: ۱۱۰۱۱، اور ابوہشام کے حوالے سے ان کی روایت مسند: ۱۱۲۲۱۔
۴۔ حضرت عبداللہ بن عمرو، مسند احمد: ۱۴۹۹، اور مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۷۸۴۵۔
۵۔ حضرت خزیمہ بن ثابت، مسند احمد: ۲۱۸۷۲۔
۶۔ حضرت حذیفہ، مستدرک: ۲۶۵۲۔
۷۔ حضرت ابومسعود، مسند البزار: ۳۵۱/۷
۸۔ حضرت عمار بن یاسر، مسند ابی یعلیٰ: ۱۶۱۴، مسند ابی داود الطیالسی: ۶۸۴۔
۹۔ حضرت عمرو بن حزم، مسند احمد: ۱۷۷۷۸۔
۱۰۔ حضرت عثمان، المعجم الصغیر للطبرانی: ۵۱۶۔
۱۱۔ حضرت عمرو بن حزم، مسند: ۱۷۷۷۸۔
۱۲۔ حضرت انس، الاوسط للطبرانی: ۶۳۱۵۔
۱۳۔ حضرت ابوہریرہ، سنن ترمذی: ۳۸۰۰۔
۱۴۔ حضرت ابورافع، المعجم الکبیر: ۳۲۰/۱۔
۱۵۔ حضرت جابر بن عبداللہ، تاریخ دمشق: ۴۱۶/۴۳۔
۱۶۔ حضرت معاویہ، مسند ابی یعلیٰ: ۷۳۶۴۔
۱۷۔ حضرت ابن عباس، تاریخ دمشق: ۴۲۲/۴۳۔
۱۸۔ حضرت ابن مسعود، تاریخ دمشق: ۴۲۷/۴۳۔
۱۹۔ حضرت زید بن ابی اوفیٰ، المعجم الکبیر: ۲۲/۵۔
۲۰۔ حضرت جابر بن سمرہ، تاریخ دمشق: ۴۲۹/۴۳۔
۲۱۔ حضرت ابوالیسر کعب بن عمرو، المعجم الکبیر: ۱۷۰/۱۹۔
۲۲۔ حضرت زیاد بن القرد، تاریخ دمشق: ۴۳۲/۴۳۔
۲۳۔ حضرت کعب بن مالک، تاریخ دمشق: ۴۲۳/۴۳۔
۲۴۔ حضرت ابوامامہ، تاریخ دمشق: ۴۳۵/۴۳۔
۲۵۔ حضرت عائشہ: تاریخ دمشق: ۴۳۵/۴۳۔

شاگرداس کوروایت کرتے ہیں۔ان سب روایات میں کہیں یہ نہیں آتا کہ حضورﷺ نے مذکورہ پیشین گوئی کے بعد یہ جملہ کہا ہو کہ عمار ان کو جنت کی طرف دعوت دیتے ہوں گے اور وہ باغی ان کو جہنم کی طرف بلاتے ہوں گے۔ صحابہ میں سے اس کے راوی حضرت ابوسعید خدریؓ بھی ہیں۔ان کے بھی دوشاگرد، جوزیادہ ثقہ ہیں، ابونضرہ اور ابوہشام اس اضافے کو نقل نہیں کرتے۔صرف خالد حذاء عکرمہ کے واسطے سے حضرت ابوسعید کی طرف اس اضافے کو منسوب کرتے ہیں۔اب ذرا سوچیے! کیا یہ تصور کیا جاسکتا ہے کہ یہ نہایت چونکانے والی بات اس حدیث کا حصہ ہو، مگر ۲۵ کے ۲۵ صحابہ نے اس کو بیان نہ کیا ہو؟؟ پھر ان کے پچاسوں شاگردوں نے بھی اس کو بیان نہ کیا ہو۔

پھر حضرت ابوسعید خدری سے بھی اس حدیث کو ان کے دوشاگرد ابونضرۃ اور ابوہشام نقل کرتے ہیں اور یہ جملہ ساتھ میں نہیں ذکر کرتے ہیں[1]۔صرف خالد حذاء عکرمہ سے (اور وہ حضرت ابوسعید سے) یہ اضافہ نقل کرتے ہیں۔اور خالد کا حافظہ آخر عمر میں متأثر ہو گیا تھا[2]۔متقدمین محدثین کے اصول کے لحاظ سے ایسا تفرد منکر کہلاتا ہے۔لہٰذا باغی گروہ کے ہاتھوں حضرت عمارؓ کی شہادت کی روایت میں یہ اضافہ کہ وہ ان کو جنت کی طرف بلاتے ہیں اور باغی ان کو جہنم کی طرف قطعاً غیر محفوظ ومنکر ہے۔

صحیح بخاری کے موجودہ نسخوں میں یہ اضافہ مذکور ہے (حدیث: ۴۴۷)۔مگر حافظ ابن حجر اور دیگر محدثین نے صراحت کی ہے کہ بخاری کے قدیم نسخوں میں یہ اضافہ نہیں تھا۔یہ کسی کاتب کی غلطی سے لکھا گیا ہے۔روایت میں صرف یہ تھا کہ عمار لوگوں کو جنت کی طرف اور وہ ان کو جہنم کی طرف بلاتے ہیں۔ابن رجب نے جو بخاری کی شرح لکھی ہے اس میں بھی روایت کسی الفئة الباغية کے ذکر سے خالی ہے (شرح بخاری ابن رجب: ۲۹۹/۳)۔ابن حجرؒ نے اس کو امام بخاری کی علل احادیث پر گہری نظر کا ثبوت کہا ہے کہ انہوں نے اس جملے کو کسی باغی گروہ کے ذکر کے بغیر نقل کیا ہے۔گویا یہ دوالگ الگ حدیثیں تھیں۔ایک میں یہ تھا کہ حضرت عمار ایک باغی گروہ کے ہاتھوں قتل ہوں گے۔اور دوسری روایت میں یہ تھا کہ حضرت عمار لوگوں کو جنت کی طرف بلاتے ہیں اور وہ ان کو جہنم کی طرف۔خالد حذاء سے یہ وہم ہوا کہ انہوں نے دونوں کو جوڑ دیا۔

---

[1] صحیح مسلم: ۲۹۱۵، مسند احمد: ۱۱۲۲۱، ۲۲۶۰۹۔مسند ابوداود طیالسی: ۲۲۸۲، ۲۳۱۶۔

[2] خالد حذاء اگرچہ ثقہ راوی ہیں مگر ائمہ (حماد بن زید) نے تصریح کی ہے کہ حافظہ کچھ خراب ہو گیا تھا، اس لیے کبھی وہم ہو جاتا تھا۔امام شعبہ بن الحجاج کی رائے بھی خالد حذاء کے بارے میں تضعیف کی تھی۔مشہور محدث ابراہیم بن علیہ بھی ان میں ضعف بتاتے تھے۔حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ان ائمہ کی تضعیف کی وجہ خالد کے حافظے میں کمزوری آجانا ہی رہا ہوگا (تہذیب التہذیب: ۱۲۲/۳)۔

اگر یہاں کسی باغی گروہ کا ذکر تھا ہی نہیں تو پھر یہ جہنم کے داعی کون ہیں؟ ظاہر بات ہے کہ مکے کے مشرکین وکفار کے علاوہ کون ہوسکتا ہے، جو حضرت عمار پر ظلم کرتے تھے اوران کو کفر پر مجبور کرتے تھے۔اس طرح اس جملے کا کوئی تعلق پھر حضرت معاویہؓ اوران کے گروہ سے نہیں رہتا۔

حضرت معاویہ بھی معذور اور مخلص تھے:

صحابہ اپنے ان اختلافات میں کتنے مخلص تھے اس کی ناقابل تردید بلکہ ہر شُبہہ وریب سے پاک گواہ ہماری ذکر کردہ وہ کثیر صحیح روایات ہیں، جو مختلف پہلوؤں سے ان کے اخلاص و بے نفسی اور دین کی خیرخواہی کی تصویر پیش کررہی ہیں۔ان کے مخلص وخیرخواہ ہونے کی اس سے بڑی کیا دلیل ہوگی کہ حضرت علیؓ کے سگے بڑے بھائی حضرت عقیلؓ بن ابی طالب حضرت معاویہ کے ساتھ تھے۔بدخواہ راویوں کے لیے یہ ''سانحہ'' اتنا شدید تھا کہ یوں کہنا پڑا کہ پیسوں کے لیے عقیل نے اپنا دین بیچ دیا تھا(اسد الغابۃ: ۵۶۱/۳۔)۔کتنے ہی قریبی رشتہ دار اور دوست یار ایک دوسرے سے رائے میں مختلف تھے۔اہل سنت کا یہ واضح اور دوٹوک نظریہ کہ کسی بھی صحابی پر طعن حرام ہے،نری خوش گمانی نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی واضح پیشین گوئیوں اور صاف ہدایات کے ساتھ ساتھ حالات وواقعات کے گہرے اور غیر جانب دارانہ مطالعہ وجائزے پر قائم محکم نظریہ اور مضبوط موقف ہے۔اس لیے کہ انہوں نے جو بھی جنگ کی، اپنے اجتہاد ورائے کے مطابق صحیح سمجھ کرکی۔وہ جو کررہے تھے وہ اسی پر اللہ سے اجر کی امید رکھتے تھے۔

مصر وافریقہ کے گورنر حضرت مسلمہ بن مخلدؓ حضرت معاویہؓ کے حامی تھے،حضرت معاویہؓ سے کسی نے ان کی کچھ شکایت کی تو حضرت معاویہؓ نے ان کا دفاع کرتے ہوئے جو کلمات ارشاد فرمائے وہ اس مسئلے میں ان کے نقطۂ نظر کی بھی وضاحت کرتے ہیں اور یہ بھی بتاتے ہیں کہ اس سلسلہ میں ان کا اوران کے ساتھ دینے والے صحابہ ومخلص تابعین کا مطمح نظر رضائے الٰہی اور اجر اخرت تھا۔حضرت معاویہؓ نے حضرت مسلمہ کے بارے میں شکایت کنندہ سے فرمایا:تمہیں معلوم ہے کہ مسلمہ کا مظلوم امیر المومنین رحمہ اللہ کے سلسلے میں کیا موقف تھا۔انہوں نے ان کو سب سے مقدّم رکھا۔پھر ان کے قاتلوں کو سزا دینے کی کوشش میں بھی انہوں نے، پورے اخلاص اور صرف اجر وثواب کی خاطر، اپنے لوگوں کے ساتھ بہت قربانیاں دیں۔

قد عرفت مكان مسلمة بن مخلد من الإمام المظلوم رحمه الله وتقديمه إياه على من سواه، ثم قيامه بعد ذلك بدمه، وبذل مهجة نفسه محتسبا صابرا مع من أطاعه من قومه ومواليه۔ (تاریخ دمشق: ۵۳۲/۴۰)

یقین کیا جانا چاہئے کہ یہ الفاظ خود حضرت معاویہؓ کے جذبے اور نظریے کے بھی ترجمان تھے۔

حضرت علیؓ کی بے نفسی اور اعتدال:

حضرت علیؓ سے زیادہ ان واقعات سے کون متاثر ہوا ہوگا۔ گزر چکا ہے کہ وہ کس طرح دوسرے فریق کے لیے دردمندانہ دعائے مغفرت فرماتے تھے۔ تاریخ دمشق میں ابن عساکر نے بسند صحیح روایت کیا ہے کہ حضرت جعفر صادقؒ اپنے والد حضرت محمد باقرؒ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت علی نے ایک شخص کو اپنے مخالفین کے بارے میں حد سے تجاوز کرتے سنا تو کہا ایسا مت کہو۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ ہم نے ان پر ظلم کیا ہے اور ہمارا خیال ہے کہ انہوں نے ہمارے خلاف بغاوت کی ہے۔ (تاریخ دمشق: ۱/ ۳۴۳، بسند صحیح) محمد باقر نے اگرچہ حضرت علیؓ کو نہیں پایا مگر یہ اہل بیت کی سند ہے۔ کم از کم یہ تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت جعفر صادقؒ اور حضرت محمد باقر رحمہ اللہ نے یہ روایت نقل کی ہے۔ دیگر بے شمار روایات اور ناقابل انکار تاریخی حقائق کی طرح اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ حضرت معاویہ اور ان کی جماعت کے بارے میں حضرت علی کی اگلی نسلوں میں محبت و ہمدردی کے جذبات تھے اور ان کے سلسلے میں موقف عذر پذیری کا تھا۔

جنگ کے باوجود محبت و اعتماد:

موطا میں امام مالک نے روایت کیا ہے کہ حضرت معاویہؓ کی عدالت میں قتل کا ایک معاملہ پیش ہوا۔ معاملہ کچھ ایسا پیچیدہ تھا کہ حضرت معاویہؓ کو سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا فیصلہ کیا جائے۔ سوان کو کچھ باک نہیں ہوا کہ حضرت علیؓ سے رجوع کیا جائے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کوفہ میں مقیم تھے۔ ان کو خط لکھا کہ اس مسئلے کو حضرت علیؓ سے دریافت کریں اور مجھے ان کا جواب لکھیں۔ حضرت علی کو جب معلوم ہوا کہ مسئلہ معاویہ نے پوچھا ہے تو خوش ہوئے اور فرمایا: ہاں! میں ابوالحسن ہوں۔ اور جواب دلوایا (بسند صحیح، موطا، باب القضاء فی من وجد مع امراتہ رجلاً)۔

اسی طرح کا ایک واقعہ ابن عساکر نے اپنی سند سے ذکر کیا ہے۔ قیس ابن ابی حازم فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے کچھ سوال کیا، غالباً حضرت معاویہ کو اس بابت کوئی بات معلوم نہیں تھی۔ انہوں نے کہا اس کے سلسلے میں تم علی ابن ابی طالب سے دریافت کرو۔ اس شخص نے کہا مجھے تو آپ ہی پر زیادہ اعتماد ہے۔ حضرت معاویہ اس شخص پر خفا ہوئے۔ کہا: کیا بکواس کرتے ہو؟ جس شخص کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسی تعلیم دی کہ وہ علم کا مخزن بن گیا، تمہیں اس پر اعتماد نہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے سلسلے میں فرمایا تھا کہ تم (غزوۂ تبوک کے موقعے پر مدینے میں) میرے ایسے جانشین ہو جیسے ھارونؑ موسیٰؑ کے تھے، ہاں میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ حضرت عمر فاروق بھی، جب کوئی اشکال پیش آتا، تو علی سے دریافت کرتے تھے۔ میں نے ایک موقعے پر خود دیکھا کہ کچھ اشکال پیش آیا

تو پوچھا: کیا علی ہیں؟ (تاریخ دمشق: ۱۷۱/۴۲)۔

دینی حمیت اور اسلام کے مفاد کو ترجیح:

اس اختلاف کے باوجود حضرت معاویہؓ کو اس کا پورا خیال تھا کہ کہیں دشمن طاقتیں اس اختلاف کا فائدہ نہ اٹھالیں۔ اس سلسلے میں ایک ایسا واقعہ متعدد مورخین نے نقل کیا ہے جس سے ان کی بلندیِ کردار، دینی حمیت اور اسلام کی مصلحت کو ہر مصلحت پر ترجیح دینے کا پتہ چلتا ہے۔ حضرت معاویہؓ نے رومیوں کو ہر محاذ پر شکست دی تھی اور ان میں خوف پیدا کر رکھا تھا۔ اب شاہ روم نے جب دیکھا کہ مسلمان باہم مصروف پیکار ہیں، تو اس کو امید ہوئی کہ یہ وقت حملے کے لیے مناسب ہے۔ اسی خیال سے وہ ایک بڑی فوج لے کر نکلا اور شام کے کسی قریبی علاقہ تک پہنچ گیا۔ حضرت معاویہؓ کو خبر ملی تو انہوں نے اس کو لکھا کہ او ملعون! اگر تو واپس نہ ہوا تو میں اپنے چچازاد (علی) سے صلح کرلوں گا۔ اور دونوں کی افواج مل کر ایسا حملہ کریں گی، کہ تجھے چھپنے کی جگہ نہیں ملے گی۔ اس لہجے اور انداز سے رومی ڈر گئے اور واپس چلے گئے (البدایہ: ۱۲۷/۸)۔

لسان نبوت کی بشارت کہ صحابہ کے دین کو ان جنگوں سے کوئی نقصان نہیں پہنچا:

ان مشاجرات کے باوجود دونوں فریقوں کے احترام اور دینی عظمت کے قائل اہل سنت کا موقف محض خوش عقیدگی نہیں ہے[۱]۔ یہ قرآن وسنت کے طاقت ور دلائل اور حقائق کے وسیع مطالعے پر مبنی مضبوط علمی موقف ہے۔ ایک طرف تواتر سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان جنگوں کو 'فتنہ' کہا تھا اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی غالب اکثریت ایسا ہی سمجھتی تھی، لیکن صحابہ پر رحمت الٰہی کا مظہر ملاحظہ فرمائیے کہ (صحیح روایات کے مطابق) کہ آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ صحابہؓ کے دین کو ان فتنوں سے نقصان نہیں پہنچے گا۔

حضرت سعید بن زیدؓ اور حضرت طارق بن اشیمؓ کی روایتیں ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے شدید فتنوں کے آنے کی خبر دی، جن کے سیلاب میں کثرت سے لوگ بہہ جائیں گے۔ لوگوں نے پریشان ہو کے پوچھا کہ اگر ہم اس دور میں ہوئے تو کیا ہمارا دین تباہ ہو جائے گا؟؟؟ آپ ﷺ نے اطمینان دلاتے ہوئے فرمایا: (نہیں) میرے صحابہ کو بس یہی نقصان پہنچے گا کہ وہ مقتول ہوں گے "بِحَسْبِ أَصْحَابِي الْقَتْلُ"[۲]۔

---

[۱] اگرچہ صحابہ سے حسن ظن اور خوش عقیدگی بھی قرآن وسنت کے ایسے دلائل کا تقاضہ ہے جن کے مقابلہ میں تاریخی روایات کی کوئی حیثیت نہیں۔

[۲] مسند احمد: ۱۶۴۷، عن سعید بن زیدؓ، بسند حسن، نیز حدیث: ۱۵۸۷۶، عن طارق بن اشیمؓ، بسند صحیح، المعجم الکبیر: ۱۵۰/۱، =

اب ان لوگوں کی محرومی وکج فکری پر کیا عرض کیا جائے اور کیوں کر افسوس کیا جائے، جو ان مشاجرات کی بنا پر صحابۂ کرام کے کسی گروہ سے بدگمان ہوتے اور اپنے قلب و زبان کو پلید و آغشتہ کرتے ہیں؟؟

تاریخ کیوں مسخ ہوتی رہی:

ان معاملات میں "دواعی الوضع" یعنی قصے گڑھنے اور کذب بیانی کے بہت قوی محرکات موجود تھے، لہٰذا اس سلسلے میں تاریخی مآخذ کا مطالعہ راویوں کی جانچ پرکھ کے ساتھ ہی کیا جانا چاہیے۔ افسوس! اس پہلو کا لحاظ نہ رکھنے یا کم رکھنے کی وجہ سے ہماری تاریخ مسخ ہوتی رہی۔ اور اس کا سخت نقصان ہمارے دینی تصورات وخیالات کو پہنچا۔ اسی قصۂ صفین کو لے لیجیے۔ طبری ہی کی کتاب گویا ہمارے مورخین کا اصل مدار و ماخذ ہے۔ انہوں نے جنگ صفین کی جو تفصیلات ذکر کی ہیں سب ابو مخنف کی روایات ہیں سوائے سات روایتوں کے۔ اور وہ سب مل کر بھی ابو مخنف کی ایک طویل روایت کے حجم کے برابر نہیں۔ اور ابو مخنف کون اور کیسے ہیں، پیچھے گزر چکا ہے۔ (ملاحظہ ہو مرویات ابی مخنف: ۴۸۸)۔ بس جھوٹی روایتوں کے جنجال میں پھنسنے کا سبب یہی کذب بیانی کے تاریخی عوامل ومحرکات سے اغماض اور روایتوں کی جانچ پرکھ سے غفلت ہے۔

کیا بے نظیر جماعت تھی صحابہ کی!
حقیقت میں رحماء بینھم:

صحابۂ کرام، اپنے سیاسی اختلاف وآویزش کے باوجود، عدل واعتدال پر قائم تھے۔ دونوں فریق ایک دوسرے کو مومن ومسلم اور اپنا بھائی جانتے اور آپس میں دل سے محبت کرتے تھے۔ اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تاریخ عالم کی منفرد و بے نظیر جماعت تھی اور اس کے کام بھی بالکل منفرد تھے۔ مصنف ابن ابی شیبہؒ میں حسن سند سے روایت آتی ہے کہ یزید بن اصم کہتے ہیں:

> جنگ کے بعد حضرت علیؓ میدان جنگ میں مقتولین کو دیکھنے تشریف لے گئے۔ اپنی جماعت کے مقتولین کے درمیان پہنچے تو فرمایا: یہ جنتی لوگ ہیں۔ اس کے بعد حضرت معاویہؓ کی جماعت کے مقتولوں کے بیچ کھڑے ہو کر فرمایا: یہ بھی جنتی ہیں۔ پھر حسرت آمیز لہجے میں گویا ہوئے: ذمہ داری تو میری اور معاویہ کی ہے"[۱]۔

=بسند ثقات۔ حافظ ابن کثیر اس کی سند کی نہایت پرزور توثیق کرتے ہوئے کہتے ہیں: اس کی سند نہایت جید، صحیح، اچھی اور طاقتور ہے۔ وإسناده جيد قوي صحيح حسن۔ جامع المسانيد والسنن: ۴۴۸/۳۔

[۱] مصنف حدیث: ۳۷۸۸۰، بسند حسن۔ المعجم الکبیر: ۳۰۷/۱۹، تاریخ دمشق: ۱۳۹/۵۹۔

مکحول کہتے ہیں کہ حضرت علی کے لوگوں نے ان سے پوچھا کہ معاویہ کی جماعت میں جو لوگ جنگ میں کام آئے، ان کے بارے میں کیا خیال ہے؟ فرمایا: "هم المومنون" یعنی یہ تو مومن لوگ ہیں۔ اسی اثنا میں شامی لشکر کے کسی مقتول کے پاس سے گذر ہوا۔ کسی نے کہا: میں تو اس کو مومن سمجھتا تھا۔ حضرت علی نے فرمایا: وہ اب بھی مومن ہی ہے ا۔

حضرت عمار بن یاسر اپنے موقف کے بہت سرگرم داعی تھے۔ زیاد بن الحارث کہتے ہیں:

میں جنگ صفین میں حضرت عمار کے بالکل برابر میں تھا۔ کسی نے کہا: شامی محاذ کے لوگ کافر ہو گئے۔ حضرت عمار نے فوراً تردید کی اور کہا: غلط بات ہے۔ ہمارا اور ان کا نبی ایک، قبلہ ایک۔ ہاں وہ لوگ فتنے میں آ گئے، جادۂ حق سے ہٹ گئے۔ اس لیے ان سے قتال جائز ہو گیا ۲۔

دونوں فریق ایک دوسرے کو کیسا مومن و مخلص جانتے تھے، اور ایک دوسرے سے کیسے محبت و اخلاص سے پیش آتے تھے، پڑھیے! صحیح بخاری کی روایت ہے کہ بزرگ تابعی ابو وائل شقیق بن سلمہؒ، جو جنگ صفین میں حضرت علیؓ کی طرف سے شریک تھے، کہتے ہیں:

ایک دن میں حضرت عمارؓ کے ساتھ بیٹھا تھا کہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ اور حضرت ابو مسعودؓ ملاقات کے لیے تشریف لائے اور حضرت عمار سے کہا کہ آپ کی پوری زندگی عیب سے پاک رہی ہے، سوائے اس کے کہ آپ اس معاملے میں بہت متحرک ہیں۔ ہم لوگوں کو جو سب سے غلط و ناپسندیدہ چیز نظر آتی ہے وہ اس (جنگ کے) معاملے میں آپ کی سرگرمی ہے۔ حضرت عمارؓ نے جواب دیا کہ ہم کو آپ دونوں کی سب سے غلط بات یہ لگتی ہے کہ آپ ہمارا ساتھ نہیں دے رہے۔

اس گفتگو کے بعد جب وہ حضرات واپس ہوئے تو حضرت عمارؓ نے ان دونوں صحابیوں کی خدمت میں ازراہ محبت ایک ایک جوڑا تحفہ بھی پیش فرمایا۔ اس کے بعد تینوں ساتھ ہی جمعے کی نماز کے لیے تشریف لے گئے (صحیح بخاری: ۷۱۰۲، ۷۱۰۵)۔

صحابۂ کرام کے دل کیسے صاف تھے!

حضرت عائشہ کے بھائی محمد بن ابی بکر حضرت علیؓ کے اہم لوگوں میں تھے۔ حضرت عثمانؓ کے خلاف مصری باغیوں کے قائد تھے۔ ان کو مصر کا گورنر بنا کر بھیجا گیا۔ ایک اہم فوجی کمانڈر حضرت معاویہ بن حدیجؓ سے ان کا مقابلہ ہوا، جو مصر میں حضرت عثمان کے طاقت ور حامی تھے، افسوس، اس میں محمد بن ابی بکرؓ مقتول ہوئے۔ بعد کے دور کا ایک واقعہ بہت قابل ذکر، مؤثر اور عبرت خیز ہے، دل کے کانوں سے سنیے!!

ا۔ تاریخ دمشق: ۱/ ۳۴۴۔ ۳۴۵، مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۷۸۴۶۔

۲۔ مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۷۸۴۱، تعظیم قدر الصلاۃ، مطبوعہ مکتبۃ الدار، مدینہ طیبہ طبع اول ۱۴۰۶ھ حدیث: ۵۹۸ بسند حسن

حضرت معاویہ بن حدیجؓ حضرت معاویہؓ کے دور میں شمال افریقہ کے جہاد پر مامور کمانڈر تھے۔ صحیح مسلم میں ہے کہ ایک جہاد سے واپسی ہوئی تو ان کے لشکر کا ایک شخص مدینہ آیا۔ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ نے اس سے پوچھا: امیر جہاد معاویہ بن حدیجؓ کا معاملہ تم لوگوں کے ساتھ کیسا تھا؟ اس نے کہا بہت اچھا۔ انہوں نے ہر مجاہد کی بہت خبر گیری کی۔ جس کا اونٹ مر گیا اس کو اونٹ دیا، جس کو پیسوں کی ضرورت ہوتی تھی اس کو پیسے دیتے تھے۔ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کو اپنے بھائی کے قتل کا سخت غم بھی تھا، (اسد الغابہ: ۳۲۶/۴)۔ لیکن پھر بھی معاویہ بن حدیجؓ کے بارے میں فرمایا: انہوں نے میرے بھائی کے ساتھ جو کیا تھا، اس کے باوجود میں تم کو ایک حدیث سنانے سے نہیں رک سکتی۔ میں نے اپنے اسی گھر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ دعا فرماتے سنا کہ: اے اللہ میری امت کا کوئی حاکم اگر ان کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرے تو تو بھی اس کے ساتھ نرمی کا معاملہ فرما (صحیح مسلم: ۱۸۲۸، سنن بیہقی: ۱۷۹۱۳)۔

اللہ ام المؤمنین کے مرتبے بلند فرمائے، کیسی سراپا خلوص امت کی مادر مہربان تھیں! بھائی کے قاتل کے لیے خوش خبری سنانا کیسی پاک طینت کی بات ہے۔ جماعت صحابہ ایسی ہی صاف دل جماعت تھی۔

حضرت علی مرتضیٰؓ کو سبّ وشتم؟
جھوٹی روایات کی ایک اور مصیبت:

تاریخ کی مسلمہ حقیقت ہے کہ جنگ وکشمکش کا ماحول جھوٹی روایات کا جھاڑ جھنکاڑ کھڑا کر دیتا ہے۔ بعض تاریخی کتابوں میں روایات آئی ہیں کہ حضرت معاویہؓ حضرت علی کو برسر منبر سب وشتم کرتے تھے۔ اور ان کے گورنروں کا بھی یہی حال تھا۔ یہ سب بے اصل روایتیں ہیں، ان میں ایک بھی صحیح ومعتبر روایت نہیں ہے۔ ظلم کی حد تو جب ہوئی جب بغضِ معاویہ کے شکار مصنفوں نے ان روایات کو اپنی طرف سے خوب مرچ مسالہ لگا کر پیش کیا۔ ان دونوں میں جس طرح کا اختلاف تھا، اس میں ایک دوسرے پر تنقید اور ان کے موقف کی غلطی وبرائی کے تذکرے کی تو فطری طور پر توقع کی جا سکتی ہے۔ لیکن جسے سبّ وشتم کہیں، اس کا کوئی ثبوت کسی صحیح روایت میں نہیں ہے۔ اس سلسلے کی جو بھی روایات ہیں سب ان مورخین کی جمع کردہ ہیں جو ہر رطب ویابس جمع کر دیتے ہیں۔ یہ روایات انقطاع اور کذاب راویوں سے داغ دار ہیں۔

البتہ صحیح مسلم میں ایک روایت ایسی ہے جو یہ تاثر دیتی ہے کہ حضرت معاویہ حضرت علی کو سبّ کروانا چاہتے تھے۔ مگر اس کا وہ حصہ (اضافہ) جو یہ اشارہ کرتا ہے کہ حضرت معاویہؓ حضرت علیؓ کو سب وشتم کروانا چاہتے تھے، غیر محفوظ اور غلط ہے۔ اور امام مسلم نے اس کو دیگر صحیح روایات کے مقابلے میں اسی لیے روایت کیا ہے کہ اس کے راوی کی غلطی واضح کریں۔ امام مسلم کی کتاب کے طرز (ومنہج) میں داخل ہے کہ وہ کبھی کبھی راویوں کی غلطی واضح کرنے کے

لیے پہلے صحیح ومحفوظ روایت بیان کرتے ہیں، پھر کسی راوی کا وہم اور معلول روایت ذکر کرتے ہیں۔ روایت یوں ہے:

عن بكير بن مسمار، عن عامر بن سعد بن أبي وقاص، عن أبيه، قال: أمر معاوية بن أبي سفيان سعدا فقال: ما منعك أن تسب أبا التراب؟ فقال: أما ما ذكرتُ ثلاثا قالهن له رسول الله صلى الله عليه وسلم فلن أسبه، لأن تكون لي واحدة منهن أحب إلى من حمر النعم، سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول له، خلفه في بعض مغازيه، فقال له علي: يا رسول الله خلفتني مع النساء والصبيان؟ فقال له رسول الله صلى الله عليه وسلم: أما ترضى أن تكون مني بمنزلة هارون من موسى؟ إلا أنه لا نبوة بعدي....... (صحيح مسلم: ۲۴۰۴).

بکیر بن مسمار عامر بن سعد بن ابی وقاص سے اور وہ اپنے والد حضرت سعد بن ابی وقاص سے روایت کرتے ہیں کہ معاویہ نے سعد ابن ابی وقاص سے فرمائش کی اور کہا آپ ابوتراب (حضرت علی) کو کیوں برا نہیں کہتے؟ حضرت سعدؓ نے جواب دیا: مجھے علی کے سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تین باتیں ایسی یاد ہیں کہ اگر ان میں سے ایک بات بھی رسول اللہ میرے بارے میں کہتے تو مجھے سرخ اونٹوں سے زیادہ محبوب ہوتی۔ تو میں ان کو کیسے برا کہہ سکتا ہوں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک غزوے میں علی کو مدینے میں چھوڑ کر جانے لگے تو علی نے کہا: یارسول اللہ! مجھے عورتوں اور بچوں میں چھوڑ کر جارہے ہیں؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیا تمہیں نہیں پسند کہ جیسے موسیٰ ہارون کو (بنی اسرائیل پر نگراں بنا کے) چھوڑ کر گئے تھے، تم کو بھی مجھ سے وہی نسبت حاصل ہو؟ ؟ ہاں میرے بعد کوئی نبی نہیں......

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے اس حدیث کو عامر بن سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے علاوہ مندرجہ ذیل راوی نقل کرتے ہیں۔ (۱) الاشہل [۱]، (۲) ابن لسعد [۲] (۳) ابراھیم بن سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ [۳]، (۴) سعید بن مسیب [۴]، (۵) مصعب بن سعد [۵] (۶) عائشہ بنت سعد [۶]، (۷) حمزہ بن عبد اللہ عن ابیہ [۷]، (۸) ایمن بن عبد اللہ [۸]، (۹) عبد اللہ بن رقیم کنانی [۹]، (۱۰) خارجۃ بن سعد [۱۰]، (۱۱) عبد الرحمان بیلمانی [۱۱]۔ اور (۱۲) ابوعبد اللہ جدلی [۱۲]۔

---

۱ الشریعہ للآجری: ۴/۲۰۳۸۔
۲ مسند احمد: ۱۵۳۲، مصنف عبد الرزاق: ۲۰۳۹۰۔
۳ صحیح البخاری: ۳۷۰۶، مسند احمد: ۱۵۰۵
۴ مسند احمد: ۱۴۹۰، مصنف عبد الرزاق: ۹۷۴۵۔
۵ صحیح البخاری: ۴۴۱۶، صحیح مسلم: ۲۴۰۴
۶ مسند احمد: ۱۴۶۳۔
۷ مسند احمد: ۱۶۰۰۔
۸ السنن الکبری للنسائی: ۸۳۴۴۔
۹ السنن الکبری: ۸۳۹۱۔
۱۰ الشریعہ للآجری: ۴/۲۰۲۷۔
۱۱ الشریعہ للآجری: ۴/۲۰۳۶۔
۱۲ المعجم الکبیر للطبرانی: ۱/۱۴۸۔

اتنے بہت سے راویوں میں سے کوئی کسی سب وشتم وغیرہ کا قصہ نقل نہیں کرتا۔ یہ قصہ صرف بکیر بن مسمار عامر بن سعد سے نقل کرتے ہیں۔ اور عامر سے بھی اس حدیث کو متعدد راوی نقل کرتے ہیں، مثلاً سعید بن مسیب [۱]، منہال بن عمرو [۲]، ابن شہاب زہری [۳]، سعد بن ابراہیم بن سعد [۴]، اور مہاجر بن مسمار [۵]۔ ان سب حضرات کی روایات بھی ایسے کسی قصے سے خالی ہیں۔ گویا عامر بن سعد سے بھی سبّ وشتم کی بات پانچ ثقہ راوی نقل نہیں کرتے، اکیلے بکیر بن مسمار نقل کرتے ہیں اور کوئی نہیں۔

اسی مخالفت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امام بزار فرماتے ہیں:

وَهَذَا الْحَدِيثُ بِهَذَا اللَّفْظِ فَلَا نَعْلَمُ رَوَاهُ إِلَّا بُكَيْرُ بْنُ مِسْمَارٍ، عَنْ عَامِرِ بْنِ سَعْدٍ عَنْ أَبِيهِ۔

اس حدیث کو ان الفاظ میں سوائے بکیر (عن عامر بن سعد) کے کوئی نقل نہیں کرتا۔

(مسند البزار: ۳/ ۳۲۵)

حقیقت یہ ہے کہ یہ روایت فی نفسہ صحیح ہے، مگر اس کا (سب وشتم کے قصہ والا) یہ حصہ جس کو سوائے بکیر کے کوئی نقل نہیں کرتا (تفرد کی وجہ سے) غیر محفوظ اور منکر ہے۔ بکیر اگرچہ عموماً معتبر راوی مانے جاتے ہیں، لیکن ان میں کسی قدر کمزوری ہے۔ محدثین ایسے راویوں کی وہی روایت لیتے ہیں جو دوسرے ثقہ راویوں کے موافق ہوں۔ ان کے بارے میں امام بخاری کہتے ہیں: فیہ بعض النظر۔ اہل علم جانتے ہیں کہ امام بخاری کی اصطلاح میں کسی میں ''نظر'' کہنا سخت تضعیف ہوتی ہے۔ حافظ ذہبی الکاشف میں کہتے ہیں: فیہ شیءٌ (ان میں کچھ کمزوری ہے)۔ ابن حجر لسان المیزان میں کہتے ہیں: شیخ، جو ہلکی سی تضعیف کا جملہ ہے۔

محدثین کے نزدیک قاعدہ ہے کہ وہ راوی جو صدق وامانت سے موصوف ہو، لیکن حفظ واتقان میں کچھ کمزوری ہو اس کے اضافے (تفرد وزیادتی) قبول نہیں کیے جاتے۔ خود امام مسلم نے اس کی تصریح اپنی ایک اہم کتاب التمییز میں فرمائی ہے: لکھتے ہیں۔

والزيادة في الأخبار لا تلزم إلا عن الحفاظ الذين لم يعثر عليهم الوهم في حفظهم۔

(التمییز: ۱۸۹)

روایات میں صرف ایسے حفّاظ حدیث کا اضافہ قبول کیا جاتا ہے جن کی روایات میں وہم اور غلطیاں نہ پائی جاتی ہوں۔

---

[۱] صحیح مسلم: ۲۴۰۴۔
[۲] مسند ابی یعلی: ۶۸۸۳، السنۃ لابن ابی عاصم: ۲/ ۶۰۰۔
[۳] المعجم الکبیر: ۱/ ۱۴۶۔
[۴] حلیۃ الاولیاء: ۷/ ۱۹۵)۔
[۵] مسند الشاشی: ۱/ ۱۶۵۔

یعنی جوراوی کبھی غلطیاں کرتے ہوں ان کا اضافہ ضعیف وغیر مقبول قرار دیا جاتا ہے۔امام ترمذی نے بھی اپنی کتاب العلل میں اس کی تصریح فرمائی ہے۔(العلل مع شرح ابن رجب:۱/۱۹۴)۔

اس لیے یہ اضافہ جو بکیر بن مسمار کی راویت میں ہے، اور جس کو حضرت سعدؓ سے روایت کرنے والے بہت سے لوگوں میں سے کوئی ذکر نہیں کرتا، غلط ہے [۱]۔

---

[۱] **صحیح مسلم کے بارے میں ایک اہم نکتہ:**

صحیح مسلم میں ایسی روایات پائے جانے سے اس کی صحت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔امام مسلمؒ نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں ذکر فرمایا ہے کہ وہ پہلے کسی بھی حدیث کی وہ روایت ذکر کرتے ہیں جس کے راوی اعلیٰ درجے کے ثقہ اور حفظ واتقان کے حامل ہوں۔اس کے بعد اسی حدیث کی وہ روایات ذکر فرماتے ہیں جن کے راوی اگر چہ سچے اور دیانت دار ہوتے ہیں لیکن حافظے اور ضبط واتقان میں وہ کم درجے کے ہیں(صحیح مسلم:۱/۵)۔ایسی روایات کے بارے میں واقفین فن کہتے ہیں کہ امام مسلم نے ان کو اصلاً ذکر نہیں کیا ہے۔بلکہ تبعاً ذکر کیا ہے۔ایسی روایات چوں کہ صحیح روایات کے ذیل میں، ان کی تقویت کے لیے یا الفاظ یا سند کے اختلاف کو واضح کرنے کے لیے تبعاً،(محدثین کی اصطلاح میں متابعات کے طور پر) ذکر کی جاتی ہیں، اس لیے ان سے کتاب کی صحت کے معیار پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔امام نووی کہتے ہیں کہ یہ مصنفینِ حدیث کا عام اصول ہے کہ متابعات وشواہد میں وہ کم معیار کی روایتیں ذکر کردیتے ہیں۔وَلَا يَقْدَحُ هَذَا فِي مُسْلِمٍ فَإِنَّهُ لَمْ يَذْكُرْ هَذِهِ الرِّوَايَةَ مُتَاصِلَةً مُسْتَقِلَّةً، إِنَّمَا ذَكَرَهَا مُتَابَعَةً، وَالْمُتَابَعَاتُ يُحْتَمَلُ فِيهَا مَا لَا يُحْتَمَلُ فِي الْأُصُول(شرح النووی:۶/۵۱)

عاجز راقم سطور عرض کرتا ہے کہ محدثین کے اصول ومنہج سے اچھی واقفیت رکھنے والے حضرات اہل علم کتب حدیث کے ان دقیق رموز کو بخوبی جانتے ہیں۔یہ روایات اُس حد تک صحیح ضرور ہوتی ہیں جس حد تک وہ پہلے درجے کی روایات کے موافق ہوتی ہیں۔رہے وہ راوی جو سچے تو ضرور ہوں لیکن حفظ واتقان کے اعلیٰ درجے کے نہ ہوں، ان کے متعلق امام مسلم نے خود کہا ہے کہ "وہ اگر پہلے درجے کے راویوں کی روایت پر کوئی اضافہ کریں تو وہ اضافہ قبول نہیں کیا جائے گا۔(جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے)۔

پھر انہوں نے مزید یہ بھی فرمایا ہے کہ وہ اپنی کتاب میں بعض معلول روایات بھی ذکر کریں گے(صحیح مسلم:۱/۷)۔یہ روایات اپنی اصل میں صحیح ہوتی ہیں۔لیکن ان(کے کسی خاص طریق) میں کسی راوی کے وہم کی وجہ سے کوئی جزوی تغیر یا اضافہ ہوجاتا ہے۔امام مسلم ان کو اسی لیے ذکر فرماتے ہیں، کہ ان کی علت کی طرف قاری کو متوجہ کیا جائے۔ بکیر بن مسمار کی یہ روایت اسی قسم کی ہے۔ایسی روایتوں کی متعدد مثالیں صحیح مسلم میں موجود ہیں۔عظیم محدث اور صحیح مسلم کے مشہور شارح قاضی عیاض اپنی شرح میں تحریر فرماتے ہیں:

> وكذلك ايضاً علل الحديث التي ذكر ووَعَد انه ياتي بها، قد جاء بها في مواضعها من الابواب من اختلافهم في الاسانيد والإرسال والإسناد والزيادة والنقص، وذكر تصاحيف المصحفين، وهذا يدل على استيفاء غرضه في تاليفه وإدخاله في كتابه كلما وعدبه". (اكمال المعلم:۱/۸۷، طبعه دار الوفاء مصر ۱۹۹۸ء)

دوسری روایت سنن ابن ماجہ میں ہے۔اس میں یہ نہیں ہے کہ حضرت معاویہؓ نے حضرت سعد سے حضرت علیؓ کو برا کہنے کی فرمائش کی، بلکہ یہ ہے کہ حضرت سعد کی موجودگی میں حضرت معاویہ نے حضرت علیؓ کو برا بھلا کہا۔تو حضرت سعدؓ نے حضرت علی کے فضائل سنائے [۱]۔مگر یہ روایت منقطع ہے۔اس کو حضرت سعد سے عبدالرحمان بن سابط روایت کرتے ہیں اور محدثین کہتے ہیں کہ وہ ثقہ تو ہیں، مگر بہت سے صحابہ سے منقطع روایتیں بیان کرتے ہیں۔ابن حجر کہتے ہیں کہ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے کسی صحابی سے کچھ نہیں سنا۔پھر ابن حجر نے خود بھی یہ بیان کیا کہ حضرت سعد سے ان کی روایت منقطع ہے۔اور امام یحییٰ بن معین کا قول بھی نقل فرمایا کہ عبدالرحمان بن سابط نے حضرت سعد سے کوئی روایت نہیں سنی [۲]۔

کیا عقلاً بھی اس کا کوئی امکان ہے؟

یہ بات عقلاً بھی ممکن نہیں کہ حضرت معاویہؓ حضرت علیؓ کو برسرِ منبر سب وشتم کرتے ہوں یا ان کے گورنروں کا یہ مستقل معمول ہو۔حضرت معاویہؓ کو کوئی کتنا ہی برا جانتا ہو، مگر ان کی عقل مندی، سیاسی سمجھ اور ٹھنڈے مزاج کا ضرور معترف ہوگا۔اب بتایئے! جب حضرت معاویہؓ متفقہ خلیفہ بن گئے، حضرت حسنؓ کی صلح نے تمام مخالفتوں کو دبا دیا، تو ان جیسا حلیم الطبع، زیرک اور مدبر شخص کیوں برسرِ منبر حضرت علیؓ کو سبّ وشتم کرکے دلوں میں دبی چنگاری کو ہوا دے گا؟؟

امام مسلم نے (مقدمہ میں) وعدہ کیا تھا کہ وہ کتاب میں کچھ معلول روایات بھی ذکر کریں گے۔سو بعض ابواب میں ایسی روایتیں ہیں، جن میں کہیں سندی اختلافات ہیں، مثلاً ارسال یا انقطاع، کہیں متن میں (کسی راوی کی طرف سے) کچھ اضافہ یا کمی ہے، کہیں راویوں کی غلطیاں ہیں۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام مسلم نے مقدمے میں جن (معلول) روایات کے ذکر کا وعدہ کیا تھا وہ بھی کتاب میں (کہیں کہیں) ذکر کی ہیں۔

قاضی عیاض نے اپنی کتاب میں مختلف جگہوں پر ایسی احادیث کی مثالیں بھی دی ہیں۔(مثلا: ۵/۱۹۱، ۲۸۶/۶) صحیح مسلم کے دوسرے مشہور شارح امام نووی بھی ایک روایت کے بارے میں قاضی عیاض کی اس رائے کو نقل کرکے اس سے اتفاق کرتے ہیں۔

قَالَ الْقَاضِی: وَهَذَا وَشَبَهُهُ مِنَ الْعِلَلِ الَّتِی وَعَدَ مُسْلِمٌ فِی خُطْبَةِ كِتَابِهِ اَنَّهُ يَذْكُرُهَا فِی مَوَاضِعِهَا"(شرح النووی: ۸۱/۱۱)

قاضی عیاض کہتے ہیں یہ اور اس جیسی دیگر روایات ان معلول روایات میں سے، جن کے ذکر کا وعدہ امام مسلم نے مقدمہ میں کیا تھا۔

۱۔ سنن ابن ماجہ: ۱۴۱، السنن الکبری للنسائی: ۸۳۴۳۔

۲۔ الاصابہ: ۱۷۵/۵۔تہذیب التہذیب: ۱۸۰/۶۔

پھر ایک اور پہلو پر غور کیجیے۔بغض معاویہ میں ان جھوٹی روایات کے گڑھنے والوں کو یہ بھی ہوش نہیں رہا کہ وہ حضرات حسنین رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دیگر رشتے داروں کی کیا تصویر بنا رہے ہیں۔ان دروغ بافوں نے یہ تک گڑھ ڈالا کہ حضرت معاویہ اوران کے گورنر حضرت علی کو برسر عام ہی نہیں حضرات حسنین رضی اللہ عنہ کے منہ پر بھی سب وشتم کرتے تھے۔(الکامل: ۶/۳)۔اگر یہ روایات صحیح ہیں، تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ (معاذاللہ) حضرات حسنین رضی اللہ عنہ معمولی درجے کی عزت نفس اور غیرت سے بھی خالی تھے۔جو حکومت دن رات ان کے باپ کو برا بھلا کہلواتی تھی، وہ اسی حکومت سے گراں قدر ہدیے تحائف قبول کرتے تھے، بلکہ ہر سال دمشق جا کر حاضرِ دربار ہوتے تھے۔حضرات حسنین رضوان اللہ علیہما تو دور کی بات، کوئی معمولی شریف آدمی بھی کسی حال میں ایسی غیرت فروشی قبول نہیں کرسکتا۔

کیا بنوامیہ اور بنوہاشم میں کوئی پرانی دشمنی تھی؟

ایک پورا افسانہ یہ گھڑلیا گیا تھا کہ سیدنا علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے درمیان جو اختلاف ہوا، اس کی تہ میں بنوامیہ کا بنوہاشم سے پرانا بغض تھا، جس کی جڑیں ماقبل اسلام دونوں خاندانوں کی باہمی عداوت میں پیوست تھیں۔اسلام لے آنے کے بعد بھی بنوامیہ کے دل سے وہ غبار نہیں نکلا اور انہوں نے موقع ملتے ہی بنوہاشم کے خلاف پھر سے محاذ قائم کرلیا۔

یہ صرف شیعی افترا ہے۔اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔تاریخ کی واضح شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بنوہاشم اور بنوامیہ دونوں ایک بڑے خاندان بنوعبد مناف کی دو شاخیں تھیں۔جن کے درمیان اخوت وقرابت کے رشتے استوار تھے۔اور ہاں! فطری طور پر (محبت والفت کے پہلو بہ پہلو) کچھ منافست بھی، جیسی کہ بنو اعمام میں بسا اوقات ہوتی ہے۔

ایک اہم ناقابل انکار حقیقت جس سے اہل تشیع اغماض برتتے ہیں، یہ ہے کہ قبل اسلام تاریخ میں عبدمناف کا خاندان اپنی تمام شاخوں کے ساتھ ایک متحدہ خاندان کی طرح رہتا تھا۔اس اتحاد واجتماع کے ساتھ ساتھ بعض حالات واسباب کی بناء پر ان میں دو طبقے یا خاندانی گروہ تشکیل پا گئے تھے، جس کا تذکرہ تاریخ وانساب کی روایات میں ملتا ہے۔عبدمناف کی اولاد میں ہاشم اور مطلب کی اولاد میں خاص تعلق تھا۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے رشتہ داروں کو داد ودہش کے قرآنی حکم میں (سہم ذوی القربیٰ کی تخصیص کے وقت) اس کا خیال رکھا اور فرمایا:

انما بنو المطلب و بنو ھاشم شیءواحد۔ (صحیح بخاری: ۳۱۴۰)۔

بنوہاشم اور بنومطلب تو ایک ہی ہیں۔

بنو ہاشم اور بنو مطلب کے درمیان تعلق زیادہ مستحکم تھا۔ لیکن خاندان بنوعبدمناف بحیثیت ایک وسیع تر متحدہ خاندان کے موجود تھا۔ جن میں باہمی مدد، دوسروں کے مقابلے میں حمایت اور محبت و یگانگت کے ناقابل تردید شواہد ملتے ہیں۔ نبوت کے اعلان کے بعد تمام قریش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دشمن اور آمادۂ ایذا ہو گئے، تو مکی عرف کے مطابق یہی سمجھا جاتا تھا کہ آپ کا خاندان بنوعبدمناف (جن میں بنوامیہ شامل تھے) ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت و نصرت کے لیے کھڑا ہوگا۔ اور اسی کی وجہ سے لوگوں کو ڈر رہتا تھا کہ محمد کی مخالفت میں باقی قریش کی کہیں عبد مناف سے جنگ نہ ہو جائے۔ اس خاندانی حمایت میں بنوعبدمناف کی سب شاخیں شریک مانی جاتی تھی۔ جس کی سب سے واضح مثال یہ ہے کہ ہجرت سے پہلے جب قریش کو یہ خطرہ ستانے لگا تھا کہ محمد کا دین اب مکہ سے باہر کافی پھیل گیا ہے، کہیں وہ لوگ مکہ پر حملہ کر کے قریش پر غالب نہ آجائیں، تو ان کے تمام خاندانوں کے سردار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ''مسئلے'' پر غور کرنے کے لیے دارالندوہ میں جمع ہوئے۔ اس مجلس کے آخر میں ابوجہل نے تجویز پیش کی کہ مسئلے کا مکمل حل صرف یہ ہے کہ (معاذ اللہ) محمد کو قتل ہی کر دیا جائے۔ مگر اس میں مسئلہ یہ تھا کہ ''بنوعبدمناف اپنے آدمی کی حمایت کریں گے۔ اور قاتل کے خاندان سے جنگ کریں گے''۔ ابوجہل نے اس مشکل کا یہ حل نکالا کہ قریش کے ہر خاندان سے ایک نوجوان کا انتخاب کر کے ایک ٹیم تشکیل دی جائے اور سب مل کر یہ کام انجام دیں۔ ابوجہل کا کہنا تھا کہ ایسی صورت میں بنوعبدمناف اکیلے قریش کے تمام خاندانوں سے جنگ نہیں کر سکیں گے اور محض خون بہا پر راضی ہو جائیں گے۔ (فلم يقدر بنو عبد مناف على حرب قومهم جميعاً) (سیرت ابن ہشام: ۱/۴۸۱، ۴۸۲۔ تاریخ طبری: ۲/۳۷۲)۔

مسلمانوں اور قریش کے درمیان جنگوں کے سلسلے کے بعد بھی بنوامیہ کو اس رشتے داری کا اعتراف باقی تھا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ صلح حدیبیہ کے بعد جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دعوتی خط ہرقل قیصر کو پہنچا تو وہ اس وقت شام میں تھا۔ اس کو ضرورت محسوس ہوئی کہ اسلام اور رسول اسلام کے متعلق تحقیق کی جائے، اتفاقاً اس وقت ابوسفیان ایک تجارتی قافلے کے ہمراہ شام میں تھے کہ قیصر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے مکہ کے قافلے کو دربار میں طلب کیا۔ اس نے پوچھا ان میں اس ''مدعیِ رسالت'' کا قریب ترین رشتہ دار کون ہے؟ حضرت ابوسفیان کہتے ہیں:

وليس فى الركب يومئذ أحد من بنى عبد مناف غيرى... فقلت: أنا أقربهم إليه نسبا... هو ابن عمى، (صحیح بخاری: ۲۹۴۱)۔

قافلے میں میرے علاوہ خاندان بنوعبدمناف کا کوئی نہیں تھا، اس لیے میں نے کہا، میں ان کا سب سے قریبی رشتے دار ہوں۔ وہ میرے چچا زاد بھائی ہیں۔

فتح مکہ کے موقعہ پر ابوسفیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ سیدنا حضرت عمرؓ نے ان کو سخت طعنہ دیا، تو ابوسفیان نے حضرت عمرؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنے اسی رشتے کو یاد دلاتے ہوئے کہا: ابن خطاب میں تمہارے پاس نہیں۔ اپنے ابن عم کے پاس آیا ہوں۔ (مصنف عبدالرزاق: ۵/ ۳۷۴)۔ ابن اسحاق سیرت نگار رسول اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاندانی حالات وحقائق کے گہرے واقف کار ہیں۔ لکھتے ہیں:

وانما كان بنو عبد مناف أهل بيت واحد، شرف بعضهم لبعض شرف، وفضل بعضهم لبعض فضل۔ (سیرت ابن ھشام: ۱/ ۱۵۰)

بنوعبد مناف ایک متحدہ خاندان تھے۔ کسی شاخ کی عزت دوسرے کے لئے بھی باعثِ افتخار تھی اور کسی ایک کی فضیلت دوسرے کے لئے باعث فضیلت۔

بنوامیہ اور بنوہاشم کے ازدواجی رشتے:

بنوہاشم اور بنوامیہ کی قدیم دشمنی کا افسانہ بدنیتی کے علاوہ نری جہالت پر مبنی تھا۔ دونوں خاندانوں کے درمیان ازدواجی رشتوں کی تاریخ اس جہالت کے لیے کوئی گنجائش نہیں چھوڑتی۔

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دادا عبدالمطلب ہاشمی کی اولاد میں سے چار بیٹیاں بنوامیہ کے افراد سے منسوب تھیں۔ ایک بیٹی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سگی پھوپھی ام حکیم بنوامیہ میں کرز بن ربیعہ سے منسوب تھیں۔ (نسب قریش للزبیری: ۱۸)۔ عبدالمطلب نے اپنی ایک اور بیٹی صفیہ کا نکاح حضرت ابوسفیانؓ کے بھائی حارث بن حرب بن امیہ سے کیا تھا۔ (طبقات ابن سعد ۸/ ۴۵)۔ عبدالمطلب نے اپنی تیسری بیٹی امیمہ کا نکاح بھی بنوامیہ کے ایک حلیف جحش بن رئاب اسدی سے کیا تھا (نسب قریش: ۱۹، ۱۲۳)۔ عرب سماج میں حلیف قانونی طور پر اسی خاندان کا فرد شمار ہوتا تھا۔ عبدالمطلب کے ایک مشہور بیٹے ابولہب کی شادی بھی بنوامیہ کی بیٹی ام جمیل بنت حرب سے ہوا تھا (نسب قریش: ۸۹، ۹۱)۔

(۲) بنوہاشم اور بنوامیہ کی قدیم دشمنی کی داستان جتنی جھوٹی ہے اس سے بڑی جاہلانہ ہے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوسفیانؓ کی صاحبزادی حضرت ام حبیبہؓ سے نکاح فرمایا۔ قبل بعثت خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی عالی مرتبت صاحبزادی سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کا عقد ابوالعاص اموی سے فرمایا تھا۔ اور برسرعام ابوالعاص کی تعریف فرمائی تھی کہ انہوں نے بہت خوبی سے رشتہ نبھایا (صحیح بخاری: ۳۱۱۰)۔ دوسری بیٹی حضرت رقیہ کا عقد سیدنا عثمان بن عفان اموی کے ساتھ ہوا۔ حضرت رقیہ کے انتقال کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک اور بیٹی حضرت ام کلثوم بھی سیدنا عثمان بن عفان اموی کے حبالۂ نکاح میں آئیں۔

(۳) حضرت علیؓ کے بھائی عقیل بن ابی طالب ہاشمی کا ایک عقد فاطمہ بنت ولید بن عتبہ بن ربیعہ اموی سے ہوا۔ ان کے انتقال کے بعد انہی کی ہم نام پھوپھی فاطمہ بنت عتبہ اموی سے ہوا تھا (الطبقات: ۸/ ۱۸۹)۔

اسی طرح سیدنا علی اور حضرت معاویہؓ کے اختلاف کے بعد بھی دونوں خاندانوں میں ایسے ہی ازدواجی رشتوں اور تعلقات کا سلسلہ جاری رہا۔ جس کا تذکرہ ان شاء اللہ ابھی آتا ہے۔ یہ پروپیگنڈہ، کہ بنوامیہ بنوہاشم کے پرانے دشمن تھے، تنہا یہ پے بہ پے شادیاں اس کے تاروپود بکھیرنے کے لیے کافی ہیں۔

حضرت معاویہؓ اور خاندان علیؓ کے تعلقات:

حضرت معاویہؓ نے خلافت سنبھالنے کے بعد حضرات حسنینؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور دیگر خاندان بنی ہاشم کے بزرگوں کے ساتھ نہایت حسن سلوک اور تکریم کا تعلق رکھا تھا۔ یہی صحیح و معتبر روایات بتاتی ہیں۔

(۱) حضرت معاویہؓ حضرات حسنینؓ کی فضیلت و شرف اور احترام کے نہ صرف قائل، تھے بلکہ اس کو برسرعام بیان بھی کرتے تھے۔ صحیح سند سے وارد ہے کہ ایک مجلس میں فرمایا: میں نے خود دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حسن کے ہونٹ کو اس طرح بوسہ دے رہے تھے کہ گویا انہیں چوس رہے ہیں۔ جن ہونٹوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چوما اور چوسا ہو ان پر جہنم کی آگ حرام ہے[۱]۔

(۲) آجری نے بسند صحیح روایت کیا ہے کہ حضرت حسین کے پوتے محمد باقر فرماتے ہیں کہ حضرات حسنینؓ حضرت معاویہؓ کے وظائف قبول کرتے تھے (الشریعہ: ۵/ ۲۴۶۷)۔ ابن کثیر کہتے ہیں: حضرات حسنینؓ برابر دمشق حضرت معاویہؓ کے پاس جاتے رہتے تھے، وہ نہایت گرم جوشی سے ان کا استقبال کرتے، بہت ہی اکرام کرتے اور کہتے "فرزندان رسول! خوش آمدید" اور خوب نوازتے۔ حضرت حسنؓ کی وفات کے بعد حضرت حسینؓ نے یہ معمول جاری رکھا۔

(۳) سن ۵۱ ہجری میں یزید کی امارت میں قسطنطنیہ پر جو حملہ ہوا، اس میں یزید کے ساتھ حضرت حسینؓ بھی جہاد کے لیے تشریف لے گئے تھے (البدایہ والنہایہ: ۸/ ۱۴۶، ۱۶۱)۔

(۴) حضرت حسنؓ حضرت معاویہ کو مناسب امور کی سفارش لکھتے رہتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صاحب زادے ابراہیم کی والدہ مصر کے ایک گاؤں کی تھیں، جس کا نام حَفَن تھا، حضرت حسن نے سفارش کی تو حضرت معاویہ نے ان کے اکرام میں پورے گاؤں کا خراج معاف کر دیا۔ یہ پورا گاؤں ان کے ہی خاندان پر مشتمل تھا[۲]۔

۱۔ مسند احمد: ۸/ ۱۶۸۴۸، بسند صحیح، مجمع الزوائد: ۹/ ۱۷۷، ہیثمی نے بھی اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔

۲۔ الاموال للقاسم بن سلام: ۱۲۱، المواعظ والاعتبار بذکر الخطط والآثار: ۱/ ۵۷۔

(۵) حضرت عبداللہ ابن عباسؓ حضرت علیؓ کے چچازاد بھی تھے اور ان کی جماعت کے شاید سب سے بڑے آدمی بھی۔ ان کے حضرت معاویہؓ کے ساتھ نہایت خوش گوار اور باہمی اکرام پر مبنی تعلقات تھے۔ حضرت ابن عباس حضرت معاویہؓ کے پاس جایا کرتے تھے۔ تاریخ ابن کثیر میں ہے کہ:

حضرت ابن عباس حضرت معاویہ کے پاس آئے تو انہوں نے ان کا بہت احترام و اکرام کیا اور بڑے قرب و خصوصیت کا معاملہ کیا۔ معاویہؓ مشکل علمی و فقہی معاملات میں ابن عباسؓ سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ وہ فی البدیہ جواب دیتے تو حضرت معاویہ تعجب سے کہتے کہ میں نے ان جیسا حاضر الجواب شخص نہیں دیکھا۔ (البدایہ والنہایہ: ۸/ ۳۳۵)۔

حضرت ابن عباسؓ کے خاص شاگرد عکرمہ ایسے ہی ایک سفر میں ساتھ تھے۔ بیان کرتے ہیں کہ یہ دونوں حضرات عشاء بعد آدھی آدھی رات مسجد میں علمی مذاکرہ میں مشغول رہتے تھے (مصنف عبدالرزاق: ۴۶۴۱، بسند حسن)۔ اپنی خلافت کے عہد میں حج کے لیے مکہ تشریف لے گئے، تو عبداللہ بن الحارث بن نوفل کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ حضرت معاویہؓ سے ملاقات کے لیے تشریف لے گئے۔ میں ساتھ تھا۔ حضرت معاویہؓ نے حضرت ابن عباسؓ کا اکرام فرماتے ہوئے ان کو اپنے ساتھ تخت خاص پر بٹھایا[۱]۔ اسی سفر میں حضرت معاویہ نے طواف کیا تو حضرت ابن عباس نے بھی ساتھ طواف کیا[۲]۔

جس وقت حضرت حسن کی وفات کی اطلاع آئی حضرت ابن عباس حضرت معاویہ کے پاس ہی تھے۔ حضرت معاویہؓ نے ہی ان کو اطلاع دی۔ چوں کہ حضرت حسنؓ حضرت ابن عباسؓ کے بھتیجے ہوتے تھے اس لیے حضرت معاویہ نے تعزیت فرمائی اور کہا:

لا یسوؤك الله ولا یحزنك فی الحسن

اللہ تمہارے لیے حسن کی وفات کے غم و تکلیف کو آسان کرے۔

حضرت ابن عباس نے جو جواب دیا وہ ان کی محبت و اعتماد کا غماز ہے۔ فرمایا:

أما ما أبقى الله لی أمیر المؤمنین فلن یسوءنی الله ولن یحزننی[۳]۔

جب تک امیر المومنین حیات ہیں مجھے کوئی تکلیف اور غم نہیں ہوگا۔

حضرت ابن عباس حضرت معاویہ کے علم و فضل اور حسن سلوک کی بہت تعریفیں بھی کیا کرتے تھے، جس کا

۱۔ مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۴۶۲۷، یہ روایت کم از کم حسن درجے کی ہے، خصوصاً جب کہ اس کے متابع مسند احمد: ۲۵۵۰۶ کی روایت بھی موجود ہے۔

۲۔ مسند احمد: ۳۰۷۴، سنن ترمذی: ۸۵۸، بسند حسن۔

۳۔ الطبقات الکبری، متمم الصحابة، الطبقة الخامسة: ۱/ ۳۶۳۔

تذکرہ آگے آرہا ہے۔حضرت عبداللہ بن عباس کے خاندان والوں کے بھی حضرت معاویہؓ سے اچھے تعلقات تھے۔وہ اپنے کاموں کے لیے امیر المومنین سے رابطہ کرتے تھے اوران کے کام انجام دیے جاتے تھے۔صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس کی والدہ ام الفضل نے اپنے مولیٰ کریب کو کسی کام سے دربار خلافت بھیجا۔ کریب کہتے ہیں کہ حضرت معاویہؓ نے کام کردیا(صحیح مسلم:۱۰۸۷)۔

(۶) حضرت علیؓ کے صاحب زادے محمد بن الحنفیہ بھی حضرت معاویہ کی خدمت میں جاتے تھے اور ان سے حدیث بھی روایت کرتے تھے[۱]۔

(۷) حضرت حسینؓ کے عالی مقام صاحب زادے حضرت زین العابدین علی بن حسین کا مدینے کے گورنر اور عالم مروان اموی سے بہت گہرا تعلق تھا۔امام زہری ان دونوں کے معاصر و ہم وطن (مدنی) ہیں، نیز دونوں ہی کے شاگرد بھی ہیں، ان سے صحیح سند سے روایت ہے کہ:

كان علي بن الحسين من أفضل أهل بيته، وأفقههم، وأحسنهم طاعة، وأحبهم إلى مروان بن الحكم، وابنه عبد الملك بن مروان[۲]۔

حضرت علی بن حسین خاندان نبوت کے سب سے افضل اور سب سے ذی علم افراد میں سے تھے۔ مروانؒ کے ساتھ بہت اطاعت وفرماں برداری سے رہتے تھے۔اور وہ اوران کے بیٹے خلیفہ عبدالملک بھی ان سے بڑی محبت کرتے تھے۔

جنگوں کے باوجود دونوں خاندانوں کے ازدواجی رشتے:

افترا پردازوں نے پروپیگنڈے کا طوفان کھڑا کیا ہوا ہے کہ ان جنگوں میں ایک طرف سخت بدچلن اور ظالم گروہ تھا، جس کے شر وفساد سے اسلام اور ملت اسلام کی حفاظت کے لیے سیدنا حضرت علیؓ اوران کے صاحب زادگان والا تبار، جوانان جنت کے سردار حضرات حسنینؓ جدوجہد کررہے تھے۔یہ افترا پردازی کا پروردہ تصور تحقیق کی کسوٹی پر نہ کسے جانے کی وجہ سے خوب پھلا پھولا اور پھیلا۔

حق یہ ہے کہ دونوں فریق مسلم ومومن اور باہم ایمانی بھائی تھے۔اس کا یقینی، جی ہاں یقینی، ثبوت یہ حقیقت ہے کہ خاندان بنوعبد مناف کی ان دونوں شاخوں؛ بنو ہاشم اور بنو امیہ میں باہمی جنگوں کے باوجود مسلسل ازدواجی رشتے ہوتے رہے۔ہم پیچھے عہد جاہلیت، عہد رسول اور عہد خلافت راشدہ کے دوران دونوں خاندانوں

[۱] سیر: ۴/۱۱۱، ان کی حضرت معاویہؓ سے ایک روایت مسند احمد: ۱۶۸۸۳ پر موجود ہے۔
[۲] تاریخ ابی زرعۃ الدمشقی: ۴۱۳، ودلائل بیہقی: ۷/ ۲۴۸، بسند صحیح۔

میں بہت سے ازدواجی رشتوں کا ذکر کر چکے ہیں، جو یقیناً کل انجام پانے والی شادیوں سے کم ہوں گے۔مزید سنیے اور حیرت کیجیے کہ سیدنا علی و معاویہ رضی اللہ عنہما کے اختلاف اور صفین وغیرہ کی معرکہ آرائیوں کے بعد بھی ازدواجی و معاشرتی قربتوں اور صلہ رحمی کے تعلقات کا سلسلہ ایسا ہی چلتا رہا۔

(۱) حضرت علیؓ نے اپنی ایک صاحب زادی خدیجہ کو بنو امیہ کے ایک شخص عبدالرحمان بن عبداللہ بن عامر کے نکاح میں دیا (جمہرۃ انساب العرب:۷۵)۔

(۲) عبدالرحمان بن عباس بن ربیعہ بن حارث ہاشمی نے زیاد بن ابی سفیان اموی کی بیٹی جویریہ سے شادی کی (انساب الاشراف:۴/۷۵)۔

(۳) اسی خانوادے کی ایک دختر ام کلثوم بنت محمد بن ربیعہ بن حارث بن عبدالمطلب بنو امیہ کے یحییٰ بن حکم بن ابی العاص سے منسوب ہوئی تھیں (نسب قریش، زبیری:۱۷۱)۔

(۳) سیدنا علی کی ایک صاحبزادی رملہ بنت علی کی شادی گورنر مروان بن حکم کے بیٹے معاویہ بن مروان اموی سے ہوئی۔(نسب قریش:۴۵)۔

(۴) سیدنا علیؓ کی ایک اور صاحبزادی مشہور اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان سے منسوب ہوئی تھیں (طبری :۶/۴۲۰)۔جی! یہ دونوں اسی مروانؒ کے بیٹے ہیں جن کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ ان پر اور ان کی اولاد پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے لعنت فرمائی تھی، حضرت علی کی بیٹیاں ان کے نکاح میں دی گئی تھیں۔

(۵) سیدنا حسینؓ کی ایک شادی حضرت ابوسفیانؓ کی بیٹی میمونہ کی صاحبزادی اور حضرت معاویہؓ کی بھانجی آمنہ یا لیلیٰ بنت ابی مرۃ ثقفی سے ہوئی تھی (نسب قریش:۵۷)۔

(۶) سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی بڑی صاحبزادی سکینہ کا مروان کے پوتے اصبغ بن عبدالعزیز سے نکاح ہوا تھا۔

(۷) اصبغ اموی کے انتقال کے کچھ دنوں بعد سکینہ کی شادی سیدنا عثمانؓ کے پوتے زید بن عمرو اموی سے ہوئی تھی (نسب قریش:۵۹)۔

(۸) سیدنا حسین کی دوسری صاحبزادی فاطمہ بنت حسین کی شادی سیدنا عثمان کے پوتے عبداللہ بن عمرو اموی سے ہوئی تھی (نسب قریش:۵۱، ۵۲، ۵۹)۔

(۹) عباس بن عبداللہ بن عباسؓ نے اپنی بیٹی مروان اموی کی بھائی عبدالرحمان کے نکاح میں دی اور عبدالرحمان نے اپنی بیٹی عباس کے نکاح میں دی (سنن ابی داوود:۲۰۷۵)۔

اور سنیے! ہاشمی حضرات بنو امیہ کو اپنا کیسا رشتے دار مانتے تھے۔یزید کے دور میں حجاز میں حضرت عبداللہ

بن زبیرؓ کی حکومت قائم ہوگئی تھی۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو، جو مکہ ہی میں رہتے تھے، ان سے کچھ سخت شکایت ہوگئی تھی۔ اس موقعے پر صحیح بخاری کی روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس نے فرمایا کہ ''میں تو عبداللہ بن زبیر کا ساتھ دینا چاہتا تھا، مگر ان شکایات کے بعد میں نے سوچا کہ **عبداللہ بن زبیر غیر ہیں (بنو اسد سے تعلق رکھتے ہیں) اور بنو امیہ میرے بنو عم ہیں، وہی بہتر ہیں''** (صحیح بخاری: ۴۶۶۶)۔ واضح رہے کہ یہ عبداللہ بن زبیرؓ حضرت ابن عباسؓ کی پھوپھی (حضرت صفیہؓ) کے بیٹے ہیں، لیکن سیدنا حضرت علی کے پورے دور خلافت کی کشمکش کے باوجود اور خلافت معاویہؓ کے پورے دور کے بعد بھی، حضرت ابن عباس بنو امیہ کو اپنے خاندان کی شاخ خیال کرتے ہیں اور ان کے مقابلے میں پھوپھی زاد بھائی حضرت ابن زبیر کو غیر۔

چوں کہ ان اختلافات کے سلسلے میں غلط سلط روایات کا ایسا ہجوم ہوا کہ اسلامی تاریخ کی تصویر ہی مسخ ہوگئی، بلکہ اس نے ایک جماعت کے تصور دین تک کو مسخ کر ڈالا، اس لیے جنگ صفین کے بعد ہم کو اس قدر تفصیل سے صورت حال اور واقعات کا جائزہ لینا پڑا۔

اس تفصیل اور تحقیق وجستجو نے مصنف کا وقت تو بہت لیا، لیکن یہ عظیم حقیقت اچھی طرح بے نقاب وروشن ہوگئی کہ حضرت معاویہؓ اور تمام صحابہ کے سلسلے میں اہل سنت کا تصور وفکر صرف خوش عقیدگی اور محض صحابۂ کرام سے حسن ظن پر ہی مبنی نہیں ہے [۱]، بلکہ تحقیق ونقد کے مسلمہ اصول کسی اور موقف کی گنجائش نہیں چھوڑتے۔ الحمدللہ اس سلسلے میں ایسی مدلل بحث ہوگئی ہے کہ ان شاءاللہ اب کسی مزید کی ضرورت نہیں رہے گی۔

اب آیئے جنگ صفین سے آگے چلتے ہیں۔

---

[۱] حاشیہ: اگرچہ یہ حسن ظن بھی قرآن وسنت کا حکم ہونے کی وجہ سے ہر علمی رائے وتحقیق سے برتر ہے۔

تحکیم کے بعد

اللہ کی تقدیر کہ تحکیم کی ناکامی کے بعد، ایسے اسباب وحالات بنتے گئے کہ، بظاہر حضرت معاویہ کی طاقت کا پلڑا بھاری ہوتا چلا گیا۔ ان میں سب سے اہم سبب یہ تھا کہ سیدنا حضرت علیؓ کی جماعت سے خوارج کی ایک بڑی اور جنگجو جماعت الگ ہوگئی۔ چنانچہ ان کی طاقت کم ہوگئی۔ مزید برآں حضرت علیؓ کو ان خوارج سے جنگ کرنی پڑی، جس سے ایک اور محاذ کھل گیا۔ حضرت علیؓ کے ساتھیوں کو خوارج سے جنگ کے بارے میں مکمل شرح صدر تھا، جیسا شرح صدر اور اطمینان حضرت معاویہ کے خلاف ہتھیار اٹھانے میں نہیں تھا۔

دوسری طرف مصر حضرت معاویہ کے تابع ہوگیا۔ یہاں ایک عرصہ سے انتشار چلا آرہا تھا۔ عہد عثمانی کے آخر میں محمد بن ابی حذیفہ نے بغاوت کر کے خلافت کے گورنر کو نکال دیا تھا۔ اور خود گورنر بن بیٹھے تھے۔ چنانچہ سبائی سازش وبغاوت کا سب سے بڑا مرکز مصر تھا اور قاتلان عثمان میں مصر کا گروہ سب سے سرگرم تھا۔ باغیوں میں اسی جتھے کا کردار سب سے خراب تھا۔

باغیوں کے خلاف (شام کے بعد) سب سے سخت ناراضگی اور غصہ مصر میں تھا۔ یہاں مقیم سیاسی قیادت اور فوج میں سے ایک تعداد اِن باغیوں اور قاتلان عثمان سے برسرپیکار تھی، یہ لوگ مصر میں مقیم سیاسی قیادت اور فوج کا حصہ تھے اور، اہل شام کی طرح، باغیوں کی سرکوبی سے پہلے، حضرت علی کی بیعت سے منکر تھے۔ ان کی قیادت حضرت معاویہ بن حدیجؓ، خارجہ بن حذافہ سہمیؓ، بسر بن أبی أرطاۃؓ اور مسلمہ بن مخلّدؓ وغیرہ کر رہے تھے۔ دونوں گروہوں میں مسلسل جھڑپیں ہو رہی تھیں۔ مصر کے اِن پُر انتشار اور غیر یقینی حالات کے دوران ۳۶ ھ میں حضرت معاویہ اور حضرت عمرو بن العاصؓ ایک فوج لے کر مصر گئے۔ جس نے (باغیوں کو سزا دینے کا مطالبہ کرنے والوں کے تعاون سے) محمد بن ابی حذیفہ کو شکست دی۔ اس جنگ میں محمد بن ابی حذیفہ کام آئے [۱]۔ اللہ تعالیٰ کا نظام عجیب ہے، امام ذہبی کہتے ہیں:

---

[۱] النجوم الزاہرۃ: ۱/ ۹۴، طبری: ۵/ ۱۰۵۔

عَامَّةُ مَنْ سَعَىٰ فِي دَمِ عُثْمَانَ قُتِلُوا، وَعَسَى الْقَتْلُ خَيْرًا لَّهُمْ وَتَمْحِيصاً۔ (سیر اعلام النبلاء: ۴۸۱/۳)
حضرت عثمان کے قتل میں جو لوگ بھی متحرک رہے تھے، ان میں تقریباً تمام کا انجام یہی ہوا کہ قتل کیے گئے، شاید یہی ان کے لیے بھلا تھا کہ گناہ کا کفارہ ادا ہو جائے۔

ان کے بعد حضرت علی نے قیسؓ بن سعدؓ بن عبادہ کو مصر کا والی بنایا۔ انہوں نے وہاں بڑی حکمت و دانائی سے کام لیا اور ناراض طبقات کو بھی کسی طرح مشتعل نہیں ہونے دیا۔ اس طرح انتظام و امن کی صورت بنی، لیکن حضرت علیؓ نے ان کو معزول کر کے محمد بن ابی بکر کو گورنر بنا دیا۔ وہ پہلے بھی مصر میں رہ چکے تھے۔ اور بدقسمتی سے، اپنی قابل احترام عالی نسبتوں کے باوجود، حضرت عثمان کے خلاف بغاوت کرنے والی مصری جماعت کے قائدین میں تھے [۱]۔

باغیوں کی سرکوبی کا مطالبہ کرنے والی مصری جماعت میں ان کے تقرر سے فطری طور پر اشتعال پیدا ہوا۔ حضرت قیسؓ بن سعدؓ جب تک حضرت علی کی طرف سے گورنر رہے، مصر کے ان لوگوں کے ساتھ حکمت و سیاست سے پیش آتے رہے۔ مگر محمد بن ابی بکر نے ان کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ وہ لوگ بھاگ کے شام پہنچے۔ ان کی تعداد تقریباً دس ہزار بتائی جاتی ہے۔ انہوں نے حضرت معاویہ سے درخواست کی کہ قاتلان عثمان کی سرکوبی کے لیے فوج بھیجی جائے۔ ۳۸ھ میں حضرت معاویہ نے (اپنے نزدیک قاتلان عثمان کی سرکوبی کے لیے) حضرت عمرو بن العاص کی سرکردگی میں ایک فوج مصر بھیجی۔ عہد عمری میں مصر انہی کی قیادت و سپہ سالاری میں فتح ہوا تھا۔ پھر خاصے زمانے تک وہ گورنر رہے۔ اس لیے وہاں ان کا کافی رسوخ تھا۔ محمد بن ابی بکر کو شکست ہوئی اور وہ اس جنگ میں کام آئے (رحمہ اللہ وغفر لہ)۔

اب دوبارہ حضرت عمرو بن العاص یہاں کے والی یعنی گورنر طے پائے۔ مصر مملکتِ اسلام کا وسیع صوبہ اور شام و کوفہ کی طرح مملکت اسلام کی مالی و عسکری طاقت کا بہت بڑا مرکز تھا۔ جس کے حضرت معاویہ کے ساتھ جانے سے طاقت کے توازن میں بڑی تبدیلی آنا فطری بات تھی [۲]۔

ایک اور جھوٹی روایت:

مصر کے علاوہ بھی بعض اور علاقوں پر بھی حضرت معاویہؓ کے لشکر بھیجنے کی روایات تاریخی مآخذ میں ملتی

---

[۱] محمد بن ابی بکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات سے تین چار ماہ پہلے پیدا ہوئے۔ ان کے والد سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ اور والدہ حضرت اسماء بنت عمیسؓ ہیں، جن سے حضرت علیؓ نے حضرت ابوبکر کے بعد نکاح فرمایا۔ اور محمد کی پرورش حضرت علیؓ نے ہی فرمائی۔ فتنہ کا دور کیسا خطرناک ہوتا ہے کہ الامان، الحفیظ! ایسی فضیلتوں والا اور ایسے پس منظر کا شخص بھی مبتلا ہو جاتا ہے۔

[۲] عصر الخلافۃ الراشدہ، صفحہ: ۴۰۱، نیز الولایۃ فی عصر الخلفاء الراشدین، صفحہ: ۲۳۳ ط دار اشبیلی ۱۴۲۱ھ بحوالہ طبری و ابن اثیر، نیز معاویہ تصنیف علی الصلابی۔

ہیں، لیکن کسی نئے علاقے کے ان کے زیرنگیں آنے کی کوئی خبر تاریخ میں نہیں ملتی۔ طبری اور خلیفہ بن خیاط نے سن ۴۰ھ کا ایک واقعہ یہ لکھا ہے کہ حضرت معاویہ نے مدینہ پر لشکرکشی کے لیے حضرت بسر بن ابی ارطاۃؓ کو بھیجا جنھوں نے یہاں نہایت شدت پسندی سے کام لیا۔ ایسا ظلم ڈھایا کہ امیر مدینہ حضرت ابو ایوبؓ اور حضرت ابو ہریرۃؓ کو بھاگ کر جان بچانی پڑی۔ پھر یہ لشکر یمن گیا اور یہاں بسرؓ نے نہایت سنگ دلی وشقاوت سے سیدنا عبداللہ بن عباسؓ کے دو چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں کو قتل کر دیا۔ معاذ اللہ۔

یہ روایت ان دونوں مآخذ اور ان کے علاوہ جہاں بھی ہے منقطع ہے، جس کے راوی کا کچھ پتہ نہیں کہ کون ہے۔ مگر روایت کا مضمون تو بتا رہا ہے کہ راوی کس بلا کا جھوٹا ہے۔ اس عہد کی روایتوں میں جھوٹ کا جو کارخانہ کام کر رہا تھا اس سے ناظرین آگاہ ہیں، ابن حبان جیسے محدثین حضرت بسرؓ سے متعلق ان روایات کو کسی کذاب راوی کی کارستانی سمجھتے اور ناقابل التفات قرار دیتے ہیں۔ حافظ ابن حجر بھی یہی رائے رکھتے ہیں۔ اور اس کی صحت میں حافظ ابن کثیر کو بھی کلام ہے [۱]۔

تنقیدی شعور کا فقدان:

یقینی درجے کے قرائن بھی اس کی قطعا تکذیب کرتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس کو ہم حضرت معاویہ کے پاس (متعدد صحیح روایات کی روشنی میں) بار بار بڑے عزت واکرام کے ساتھ اور دوطرفہ محبت کے ساتھ دیکھتے ہیں۔ جس کی ان واقعات کے بعد کسی معمولی سی غیرت رکھنے والے یا شریف آدمی سے توقع نہیں کی جاسکتی۔ حضرت ابن عباس حضرت معاویہ کی سیادت وامارت اور کریمانہ اخلاق کے بارے میں رطب اللسان رہتے تھے۔ امام عبدالرزاق صنعانی اور ابوبکر الخلال وغیرہ نے صحیح سند سے روایت کیا ہے کہ وہ کہتے تھے کہ میں نے معاویہ سے زیادہ حکم رانی کے لائق کسی کو نہیں پایا۔ نہایت وسیع القلب اور کشادہ اخلاق کے حامل تھے۔ فلاں۔۔۔ کی طرح تنگ دل وسخت خو نہیں تھے [۲]۔ کیا، معاذ اللہ، حضرت ابن عباسؓ ایسے بے غیرت تھے؟؟

بعد میں ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ حضرت معاویہؓ کے ہی عہد میں اس روایت کے بقیہ ''دونوں مظلوم''، یعنی حضرت ابو ایوب اور حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہما بھی کاروبار حکومت میں تعاون کر رہے ہیں اور عہدے قبول کر رہے ہیں۔ حضرت ابو ہریرۃؓ قاضی مدینہ ہیں۔ اور کبھی قائم مقام گورنر کے طور پر بھی کام کرتے ہیں۔ اور حضرت ابو ایوب جہاد میں حصہ لیتے تھے۔ ہماری تاریخ میں بے اصل باتیں ہی نہیں ہیں، مضحکہ خیز حد تک جھوٹ بولا گیا

۱۔ الاصابہ: ۱/ ۴۲۲۔ البدایۃ: ۷/ ۳۵۷۔

۲۔ مصنف: ۱۱/ ۴۵۳، السنۃ للخلال: ۲/ ۴۴۰، بسند صحیح۔

ہے۔صحابہ کو بدنام کرنے والی ایسی روایتوں کو بلاتنقید بیان کرنا تنقیدی شعور کی کمی کا غماز نیز امانت کا خون ہے۔

سیدنا علیؓ کی آزمائش اور لقائے الٰہی کا اشتیاق:

البتہ اس دوران حضرت علیؓ کی افواج میں سخت انتشار و بے دلی کے بہت سے واقعات سامنے آئے، جس نے حضرت علیؓ کو بہت کبیدہ و غمناک کیا۔اصل میں خوارج کے الگ ہونے کا نقصان بہت بڑا تھا،جس سے لشکر کی نہ صرف عددی قوت میں کافی کمی ہوگئی تھی، بلکہ اس کا سب سے پر جوش و سرفروش عنصر علیحٰدہ ہو گیا تھا۔مزید برآں حضرت علیؓ کو اس عنصر سے اُس کے دینی انحراف کی بنا پر جنگ میں مشغول ہونا پڑا۔

بہر حال دھیرے دھیرے حضرت علی کی جماعت میں بے دلی اور انتشار پھیلتا گیا۔اھواز کے گورنر خریت بن راشد نے بغاوت کردی۔عراق میں اس کی قوم بنوناجیہ بھی باغی ہو گئے۔فارس والوں نے خراج دینا بند کردیا اور اپنے گورنر حضرت سہل بن حنیفؓ کو نکال دیا۔ان سب کا انتظام کرنے میں بڑی طاقت و توانائی خرچ کرنی پڑی۔یقیناً اس کا فوجی اور مالی طاقت پر سخت اثر پڑا ہوگا۔امیر المؤمنینؓ جتنا شامی محاذ کے خلاف جنگ کرنا چاہتے تھے، اتنا ہی فوج میں سرد مہری بڑھتی جاتی تھی[۱]۔اپنی فوج میں انتشار و سرد مہری کی کیفیت ان کے لیے سخت کبیدگی اور آزمائش کا باعث بن گئی تھی۔آخر وہ اپنے محاذ میں اصلاح حال سے مایوس ہو گئے۔درددل زبان پہ آیا۔اور دوران خطبہ یوں دعا فرمائی:

> اے اللہ! میں اِن سے اوب گیا اور یہ مجھ سے اکتا گئے۔میں اِن سے بیزار ہو گیا اور یہ مجھ سے بیزار ہو گئے۔پس اب مجھے ان سے نجات دے دے اور ان کو مجھ سے۔
>
> (مصنف عبدالرزاق:۷ ۲۰۶۳،بسند صحیح)

حضرت علیؓ کی کبیدگیِ خاطر کو تاریخ کی بہت سی روایات بیان کرتی ہیں۔مگر سند کی صحت کے علاوہ ہم اس لیے بھی اس ایک روایت کو ہی کافی سمجھتے ہیں، کہ دعاء کے ان الفاظ میں صورت حال اور سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کے احساسات کا نہایت بلیغ اظہار ہے۔ان مختصر سے الفاظ میں جہاں ان کے درد والم کی تصویر ہے، وہیں اس کی بھی پوری غمازی کہ اپنے محاذ سے ان کو مطلوب تائید و تقویت نہیں مل رہی تھی۔ **وکان امر الله قدراً مقدوراً**۔

ہمیں ایسا یقین ہے، جس کو شک چھو بھی نہیں سکتا، کہ ان آزمائشوں اور درد و سوزش کے بدلے اللہ تعالیٰ سیدنا علیؓ کو مقربین میں اعلیٰ ترین مقام عطا فرمائے گا، کہ اپنے بہت سے محبوب بندوں کو اسی راہ سے قرب کے اعلیٰ مقامات تک پہنچاتا ہے۔

---

[۱] تاریخ طبری: ۵/۱۲۰، ابن الاثیر نے عراق و فارس کے لوگوں کے انتشار و غدر کے واقعات کی کافی تفصیل دی ہے، الکامل: ۲/۱۰۷ تا ۲۰۷۔

اہل شام اور اہل عراق کے مزاج و اخلاق کا فرق:

حضرت علی کے لیے حالات کی ناسازگاری میں اہل عراق کے نفسیات و مزاج کو بڑا دخل تھا۔ عراق میں کوفہ خلافت راشدہ کے دور سے ہی پورے مشرقی عالم اسلام کا فوجی و سیاسی مرکز تھا، بلکہ افواج کی تعداد اور تابع علاقوں کی وسعت کے لحاظ سے خلافت اسلامیہ کا سب سے بڑا فوجی و سیاسی مرکزِ ثقل تھا۔ یہاں کے سرداروں میں بڑی تعداد حضرت علیؓ کی حمایت و تائید میں سرگرم تھی۔ کوفے کی مرکزیت، خصوصا یہاں مقیم افواج کی طاقت کو ساتھ لینے کے مقصد سے ہی انہوں نے اس کو دارالخلافہ بنایا تھا۔

پہلی صدی کی اسلامی تاریخ گواہ ہے کہ (اس دور میں) عراق خصوصا کوفہ کے لوگ انتشار پسند و شورش پذیر واقع ہوئے تھے۔ یہاں اکثر مشرقی جزیرۃ العرب کے قبائل آباد کیے گئے تھے۔ عراق و فارس انہی کی جہادی جولانیوں سے فتح ہوا تھا۔ مگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی ''مشرق'' کی طرف اشارہ کر کے فرمایا تھا کہ:

سن لو! یہی مشرق فتنوں کا مرکز بنے گا۔ خبردار! اسی مشرق سے فتنے کے حالات پیدا ہوں گے۔ ہوشیار! یہی مشرق فتنوں کا گڑھ بنے گا۱۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد میں مشرق کو جس فتنہ کا مرکز و منبع قرار دیا گیا ہے اس سے مراد بغاوت و شہادت عثمانی اور اس کے بعد کی خانہ جنگیاں ہیں۔ ناظرین کرام ہماری اسی کتاب میں جابجا پڑھ چکے ہیں کہ ان حالات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی بے شمار احادیث میں ''فتنہ'' کہا تھا اور صحابۂ کرام ان جنگوں کو ''فتنہ'' ہی کہتے تھے۔ جلیل القدر تابعی عالم اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے صاحب زادے و علمی وارث حضرت سالم اس حدیث کو اپنے والد گرامی سے روایت فرماتے ہوئے اس ''مشرق'' کا مصداق اہل عراق کو ہی بتاتے تھے۲۔

اسلامی ہی نہیں دنیا کی تاریخ میں، عہد عمری استقرار و استحکام اور عوام کے اطمینان و اعتماد کے اعتبار سے مثالی دور رہا ہے۔ مگر کوفہ کے لوگوں کی نفسیاتی حالت یہ تھی کہ انہوں نے حضرت عمرؓ کے لیے بھی مسائل پیدا کیے۔ ان کے لیے نہ حضرت فاروق کا دینی مقام و احترام مانع ہوا اور نہ ان کا رعب و دبدبہ۔ عراقیوں نے حضرت سعدؓ بن ابی وقاص جیسے بلند مقام و عالی مرتبت صحابی رسول کے خلاف ریشہ دوانیاں کی تھیں، بے شمار جھوٹے الزام لگائے اور بے اطمینانی پھیلائی تھی۔ یہاں تک کہ حضرت عمرؓ کو انہیں کوفہ سے ہٹانا پڑا تھا۔ سنیے! کچھ پتہ بھی ہے کہ یہاں کے مفسد فتنہ پردازوں نے حضرت سعد بن ابی وقاص پر کیا اعتراض کیے تھے؟؟ (۱) یہ نماز خراب

---

۱ صحیح بخاری: ۳۲۷۹، ۳۵۱۱، صحیح مسلم: ۲۹۰۵۔

۲ صحیح مسلم: ۲۹۰۵، نیز ملاحظہ ہو فتح الباری: ۴۷/۱۳، عمدۃ القاری: ۱۹۹/۲۴، ۲۰۰

پڑھتے ہیں۔ (۲) عدالتی فیصلوں میں ناانصافی کرتے ہیں۔ (۳) وظائف کی تقسیم میں جانب داری برتتے ہیں۔(صحیح بخاری: ۷۵۵، نیز ۷۷۰)

یہ حضرت سعد جماعت صحابہ میں سب سے افضل (دَس) عشرہ مبشرہ میں سے تھے۔ اگر اِن دس لوگوں کی نماز تک ناقص تھی اور یہ بے ایمان تھے تو پھر اسلام کا اللہ ہی حافظ! بہر حال کوفیوں کی ریشہ دوانیوں سے مجبور ہو کر حضرت عمر نے ان کی جگہ حضرت عمار بن یاسرؓ کو بھیجا۔ ان کو بھی زچ و پریشان کیا گیا تو حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو حاکم بنایا گیا، مگر کوفے والے تو کوفے والے تھے، ہر حاکم کے لیے مسائل اور انتشار انگیز صورت حال پیدا کر دیتے تھے۔ آخر حضرت فاروقؓ نے حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کو گورنر طے کیا، جو حسن تدبیر میں یکتا تھے، انہوں نے کوفے کو سنبھالا۔

حضرت علیؓ تو ان لوگوں سے نہایت کبیدہ وآزردہ تھے ہی، جب حضرت حسنؓ ان کے جانشین ہوئے تو ان کے ساتھ کیا کیا نہ پیش آیا! اس کی بھی بڑی افسوس ناک کہانی ہے۔ اپنے اس خطبے میں جو صلح کے موقعے پر دیا اور جس کو ابن سعد نے بسند صحیح روایت کیا ہے حضرت حسنؓ نے فرمایا:

> او اہل عراق! تم نے میرے والد ماجد کو شہید کیا، مجھے حملہ کر کے زخمی کیا اور میرا مال واسباب لوٹا۔ سنو! تم سے میں نے عہد لیا تھا کہ جس سے میں صلح کروں گا تم میری اتباع کرو گے۔ اب میں نے معاویہ سے بیعت کر لی ہے۔ سو تم ان کے ساتھ سمع وطاعت کا معاملہ کرو۔[1]

چنانچہ حضرت معاویہؓ کے حلم نے اگر کہیں جواب دیا تو یہ انہی کوفہ والوں کے ساتھ ہوا۔ تقدیر خداوندی کہ سیدنا حضرت علیؓ کو یہ علاقہ ملا تھا۔ اس پریشان کن گروہ کے علاوہ ایک اور نازک مسئلہ یہ تھا کہ حضرت معاویہؓ اور ان کے حامیوں کے پاس خون عثمانؓ کا بدلہ لینے جیسا جذبات کو حقیقی طور پر متأثر کرنے والا عنوان تھا۔ خصوصاً جب کہ حضرت علیؓ کی جماعت میں یہی باغی اونچے عہدوں اور فیصلہ کن قائدانہ مقام میں نظر آتے تھے۔ اس صورت حال میں جب عراق کے لوگوں سے جنگ کو کہا جاتا تھا تو وہ تذبذب کے شکار ہوتے تھے اور ان کو خود اپنے موقف میں شبہہ ہوتا تھا۔

اس کے بالمقابل اہل شام انتظام پسند اور اطاعت شعار تھے۔ وفا پیشہ اور بہادری میں معروف تھے۔ یہاں یمنی قبائل اور جزیرۃ العرب کے شمال مغرب سے جا جا کر وہ عرب آباد ہوئے تھے جو عموماً یمنی الاصل تھے۔ ان کی اکثریت نرم مزاجی، حلم واطاعت اور سادگی طبع کے اخلاق میں معروف تھے۔ خلافت راشدہ کے پورے

---

[1] الطبقات الکبریٰ۔ متمم الصحابۃ، الطبقۃ الخامسۃ: ۱/ ۳۲۵، طبری: ۵/ ۱۳۹۔

دور میں اہل شام نے ایک مرتبہ بھی اپنے حکام کے لیے مسائل نہیں پیدا کیے۔ نہ کبھی کسی بے اطمینانی کی بنا پر وہاں کے کسی گورنر یا شہری حاکم کو بدلنے کی ضرورت پڑی۔ حضرت ابوبکر کے دور سے وہاں حضرت معاویہ کے بڑے بھائی یزیدؓ حکومت میں تھے، اور حضرت معاویہ ان کے معاون کے طور پر ساتھ تھے۔ حضرت یزیدؓ بن ابی سفیانؓ کی وفات کے بعد حضرت معاویہؓ کو حضرت عمر نے ہی تقریباً پورے شام کا والی بنا دیا تھا۔ جب سے وہ اس مقام پر تھے۔ اس بیس تیس سالہ دور میں ایک مرتبہ بھی حضرت معاویہؓ کی کوئی شکایت دارالخلافہ نہیں آئی۔ شام میں مقیم عرب قبائل وافواج میں اُن کے لیے پہلے سے وفاداری اور ہر دل عزیزی کی کیفیت قائم تھی۔

ایک اور بڑا فرق یہ بھی تھا کہ حضرت معاویہؓ کی شام کے طاقت ور قبیلے بنوکلب میں رشتے داریاں تھیں۔ حضرت ابوسفیان کی بیوی اور حضرت یزید بن ابی سفیان کی ماں ان میں سے تھیں، حضرت معاویہ نے خود بھی ان میں نکاح کیا تھا، یزید بن معاویہ کی ماں ان میں سے تھیں۔ پھر وہ اِس وقت تک شام کی حکومت وانتظام میں چوبیس سال گزار چکے تھے۔ ان کو شامی سرداروں، مؤثر سیاسی شخصیات اور قبائل سے گہری واقفیت اور طویل انتظامی وسیاسی تجربہ تھا، جب کہ حضرت علیؓ کو اہل عراق کی عقیدت ومحبت تو بے شبہہ حاصل تھی، لیکن وہ ان کا گہرا تجربہ نہیں رکھتے تھے۔ وہ اپنی قرابت نبوی، اسلام میں سابقیت اور فضائل وکمالات کی بنا پر مرکز خلافت میں اہم ذمہ دار اور خلفاء ثلاثہ کے رفیق کار کی حیثیت سے رہے تھے۔ اب حالات ان کو ایک نئے علاقے اور لوگوں کے درمیان لے گئے تھے۔ سیدنا علی کی فضیلت وعلومرتبت اور کمالات کے باوجود حالات جس رخ پر چلتے رہے، اس میں ان زمینی حالات اور قبائل کی ان خصوصیات کا بڑا حصہ تھا۔

حضرت معاویہؓ کی پیشکش پر آخری صلح:

اہل عراق سے سیدنا علیؓ کے یاس وملال کی اس کیفیت کے دوران سن ۴۰ھ میں حضرت معاویہؓ نے ان کو ایک خط لکھ کر اس صلح کی پیشکش کی کہ حضرت علی اپنے علاقوں میں اور حضرت معاویہؓ اپنے علاقوں میں رہیں۔ اب مزید جنگ نہ کریں۔ اس سلسلے میں کافی خطوط کا تبادلہ ہوا اور آخر حضرت علیؓ نے صلح قبول فرمائی [۱]۔

حضرت علی کی شہادت اور حضرت معاویہ پر قاتلانہ حملہ:

پھر اسی سال سن چالیس میں ۱۷ رمضان کو ایک شقی خارجی کے ہاتھوں حضرت علی کی شہادت کا سانحہ پیش آیا۔ تین پر جوش شقی خارجیوں: ابن ملجم، بُرک تمیمی اور عمرو تمیمی نے سازش کی کہ اس وقت ''گمراہی کے تین امام'' ہیں (معاذ اللہ): علی، معاویہ اور عمرو بن العاص۔ اگر ہم ان تینوں کو قتل کر دیں تو مسلمان ان سے نجات

[۱] تاریخ طبری: ۱۴۰/۵، البدایہ والنہایہ: ۳۵۷/۷۔

پا جائیں گے۔ انہوں نے منصوبہ یہ بنایا کہ یہ تینوں ایک ہی وقت ۱۷ رمضان کو فجر کی نماز میں ان تینوں کا خاتمہ کریں گے۔ ابن ملجم حضرت علی کے لیے کوفہ گیا اور بُرک نے حضرت معاویہ کا قصد کیا اور عمرو نے حضرت عمرو ابن العاص کا۔ ابن ملجم کے ہاتھوں سیدنا علیؓ کی شہادت ہوگئی۔ رضی اللہ عنہ وکرم وجہہ۔

منصوبہ کے مطابق بُرک دمشق پہنچا۔ ۱۷ رمضان کی صبح وہ چھپ کے تاک میں بیٹھ گیا۔ حضرت معاویہؓ فجر کی نماز پڑھانے کے لیے اپنے گھر سے نکلے۔ اس نے زہریلی تلوار سے حملہ کیا، نشانہ چوک گیا لیکن حضرت معاویہ کو کولھے میں گہرا زخم آیا۔ علاج سے جلد ہی شفا ہوگئی۔ حضرت عمرو بن العاص اس دن اتفاقاً اسہال کی وجہ سے مسجد نہیں آئے اور اپنے افسر پولیس حضرت خارجہ بن حذافہؓ کو نماز پڑھانے کا حکم دیا، وہ نکلے اور اس شقی خارجی نے ان کو حضرت ابن العاصؓ سمجھ کر شہید کر دیا[۱]۔

خبرِ شہادت کا حضرت معاویہ پر اثر:

اختلاف وجنگ کے باوجود حضرت معاویہ حضرت علی کی فضیلت کے دل سے اقراری تھے۔ زنان خانے میں قیلولہ کر رہے تھے، جگا کر شہادت کی خبر دی گئی۔ اٹھ بیٹھے اور آب دیدہ ہو کر انا للہ...... پڑھی۔ اہلیہ نے کہا: کل تک جنگ تھی، آج رو رہے ہیں؟ کہنے لگے تمہیں کیا پتہ، خیر کا اور علم وفقہ کا کون سا باب بند ہوگیا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نصرت ومعاونت میں علی جیسا کردار رکھنے والا اب کوئی نہیں بچا[۲]۔

ایک سخت نامبارک آزمائشی دور:

یہ دورِ اختلاف امت کے لیے ایک سخت آزمائش کا دور تھا۔ فتنہ کے اس عظیم دروازے کو کھولنے کی ذمہ داری سب سے پہلے سبائی سازش پر ہے جس نے کوفہ سے لے کر مصر تک افواہوں اور اتہامات سے بے چینی پھیلائی اور بغاوت کا میدان تیار کیا۔ پھر ان باغیوں پر آتی ہے جن کے ہاتھوں اسلام کا خلیفۂ راشد، سیدنا عثمانؓ جیسا عظیم صحابی رسول اور امت کی محسن ومحترم وبافیض شخصیت شہید ہوئی۔

یہ کیسے ممکن تھا کہ اسلام کی خلافت کو اس طرح تاراج کیا جاتا اور باغیوں کی سرکوبی اور مستقبل میں ایسے فتنوں کا سدباب کرنے کے لیے ایک بڑی تعداد اپنے بس بھر سب کچھ کر گزرنے کے لیے میدان میں نہ آتی؟؟ اس خطرناک جرم کی نحوست نے امت کو گھیر لیا تھا۔ ذہن انتشار کے شکار تھے۔ سبائیوں کی پھیلائی افواہوں اور پروپیگنڈوں نے قیامت ڈھا رکھی تھی۔ صحابۂ کرام کی جماعت اس صدمہ سے سخت مضطرب وبے

۱۔ طبری: ۵/ ۱۴۹۔ البدایہ والنہایہ ۷/ ۳۶۴، ۳۶۵۔

۲۔ تاریخ دمشق: ۴۲/ ۵۸۳، البدایہ والنہایہ: ۸/ ۱۳۹۔

چین تھی۔ مسلمانوں کو پہلی مرتبہ ایسے ہوش ربا حادثہ سے واسطہ پڑا تھا، لہٰذا فطری بات تھی کہ راویوں میں اختلاف پیدا ہوتا۔ جو ہو کے رہا، کہ صورت حال سخت مبہم و ژولیدہ نظر آتی تھی۔ ان انتشار انگیز حالات اور شبہات نے جو آپسی خوں ریزی کرائی اس سے سب ہی نہایت غمناک تھے۔ سیدنا علیؓ ان جنگوں کو کیسا المناک سمجھتے تھے، گزر چکا۔ ان کے ایک اہم شاگرد و حامی حضرت ابو وائل کہتے ہیں: میں صفین میں شریک رہا۔ بڑی بری جنگ تھی۔

"شهدت صفين وبئست صفون"۔ (صحیح بخاری: ۷۳۰۸)

سبائی انتشار انگیزیاں جب سے شروع ہوئی تھیں امت خدائی مدد سے محروم تھی اور جہاد وفتوحات کا سلسلہ گویا بالکل ہی بند ہو گیا تھا[۱]۔ حضرت معاویہؓ کے لیے الم انگیز بات صرف یہ نہیں تھی کہ وہ ان فتنوں میں الجھ گئے تھے، بلکہ سب سے نامبارک بات یہ تھی کہ اسلام کے اس فاتح کے لیے تقریباً پانچ سال تک یہ فتنہ پاؤں کی زنجیر بنا رہا۔ وہ تلوار جو کفر وظلم کی مقابل رہی تھی، اپنے ہی گریبان میں الجھ گئی تھی۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون۔

---

[۱] عالم شام سعید بن عبدالعزیز کہتے ہیں: حضرت عثمان کی شہادت کے بعد سے جہادی مہمات بند تھیں۔ (چند معمولی مہمات کے استثناء کے ساتھ یہ بات بالکل صحیح تھی) حضرت حسن کی صلح وتنازل کے بعد یہ سلسلہ دوبارہ شروع ہوا۔ تاریخ ابی زرعہ دمشقی: ۱/ ۱۸۸ بسند صحیح، البدایہ والنہایہ: ۸/ ۱۴۲۔

آٹھواں باب

رسول اللہ ﷺ کی ایک مبارک پیشین گوئی اور صلح حسنؓ ومعاویہؓ

حضرت حسنؓ کے ہاتھ پر اہل عراق کی بیعت:

امیر المومنین سیدنا علی رضی اللہ تعالی عنہ سے لوگوں نے خواہش ظاہر کی تھی کہ اپنے بعد کے لیے کسی کو ولی عہد نامزد کر دیں۔ مگر انہوں نے اس کو پسند نہیں فرمایا۔ اور فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی کو نامزد نہیں فرمایا تھا[۱]۔ حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد اہل عراق نے حضرت حسنؓ کے ہاتھ پر امارت کی بیعت کر لی۔ ان کے تحت حجاز ویمن اور عراق، فارس اور ماوراء النہر کے وسیع ممالک تھے۔ جب کہ مصر مع دیگر افریقی ممالک اور شام حضرت معاویہؓ کے زیر انتظام تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک مبارک پیشین گوئی:

حضرت حسنؓ پر یہ ذمہ داری بڑے پر آشوب وافسوسناک حالات میں آئی تھی۔ لیکن ان کے لئے ازل سے یہ سعادت مقدر تھی کہ وہ امت مسلمہ کو انتشار وکشمکش کے اس گرداب سے نکالیں اور ایک مرتبہ پھر اتحاد واتفاق قائم کریں۔ اور خلافت اسلامیہ کو اُس بارعب وپرشکوہ حال میں واپس کرنے کا سبب بنیں، جس میں وہ خلافت فاروقی کے اختتام کے وقت اور خلافت عثمانی کے نصف اول میں تھی۔

دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پیشین گوئی فرمائی تھی کہ اس طویل نامبارک فتنہ واختلاف کا خاتمہ سیدنا حسنؓ ہی کے ذریعہ ہوگا۔ مسلمانوں کی دو عظیم جماعتوں میں اختلاف کو ختم کر کے وہ امت کو پھر متحد کر دیں گے۔ حضرت ابوبکرہؓ فرماتے ہیں:

---

[۱] مسند ابویعلی حدیث: ۵۹۰، ہیثمی نے مجمع الزوائد: ۵/ ۱۹۷ میں اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔ نیز مسند احمد: ۱۰۷۸، شیخ احمد شاکر نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔

میں نے دیکھا تھا کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ حسن کو لیے ہوئے تھے۔ کبھی لوگوں کی طرف دیکھتے، کبھی حسن کی طرف۔ اور پھر فرمانے لگے؛ میرا یہ بیٹا سردار ہے۔ امید ہے اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے مسلمانوں کی دو عظیم جماعتوں کے درمیان صلح کروائے گا[۱]۔

حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے بقول یہ محض ایک اطلاع اور پیشین گوئی نہیں تھی، جس کی حضرت حسنؓ تصدیق کرتے۔

بلکہ حضرت حسنؓ کے لئے ایک رہنما اشارہ اور تلقین کی نوعیت رکھنے والا مقولہ بھی تھا۔۔۔ یہ ضروری ہے کہ جب انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ بات سنی ہوگی۔۔۔ (اور جانا ہوگا) کہ یہ بات آپ ﷺ کی شفقت و محبت کا سبب ہے تو حضور انور ﷺ کے چہرۂ مبارک پر مسرت کی لہر اور آنکھوں میں امید کی چمک بھی دیکھی ہوگی۔ اور اس کو (یعنی مصالحت کو) اپنی زندگی کے مقاصد میں بڑا مقصد، اعلیٰ ترین اسوہ اور نمونہ اور اپنے مستقبل کے لیے رہنما اصول قرار دیا ہوگا'' (المرتضیٰ: ۳۴۹)۔

یہ حضرت حسنؓ کا سب سے بڑا وصف اور ان کی سیادت و فضیلت کا سب سے جلی عنوان تھا۔ ان کی سیرت پر نظر ڈالتے جایئے! آپ پائیں گے کہ ان کی افتاد طبع ہی کچھ یوں تھی کہ:

ماقصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم   از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس

جب حضرت علیؓ نے حضرت معاویہؓ سے جنگ کا ارادہ فرمایا تھا، اس وقت بھی انہوں نے بڑے ادب و احترام کے ساتھ ان کو روکنے کی کوشش کی اور عرض کیا تھا کہ ''اباجی! یہ نہ کریں۔ اس میں مسلمانوں کا خون بہے گا اور امت میں اختلاف پیدا ہو جائے گا''۔ (البدایہ والنہایہ: ۲۵۷/۷)۔

حضرت حسنؓ صلح کے لیے زمین ساز گار فرماتے ہیں:

مذکورہ نبوی پیشین گوئی کی بنا پر حضرت حسنؓ اللہ تعالیٰ کے اس تکوینی و تقدیری فیصلے کے منتظر تھے کہ ان کے ذریعے صلح قائم ہو اور مسلمان مجتمع ہوں۔ مگر مدتوں کی آویزش کے بعد صلح کے لیے زمین ساز گار کرنا کچھ آسان عمل نہ تھا، مگر سیدنا حسنؓ نے کر دکھایا۔ واقعات و حوادثات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اس صلح کے لیے لمبی مدت

---

[۱] صحیح بخاری: ۱۰۹۷۔ بعض لوگوں نے اس صحیح حدیث کو مشتبہ قرار دینے کے لیے صحابی رسول حضرت ابو بکرہؓ پر کچھ طعن کر کے اس محترم صحابی رسول کو ناقابل اعتماد قرار دینے کی مذموم کوشش کی ہے۔ ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ حضرت ابو بکرہؓ تمام اہل علم کے نزدیک قابل احترام و تکریم و اعتماد صحابی اور ائمۂ علم میں ہیں۔ نیز ان کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ ان کے علاوہ یہ حدیث حضرت ابو سعید خدریؓ نے بھی نقل کی ہے (مسند بزار: ۳۶۵۷)۔ نیز حضرت جابرؓ سے بھی مروی ہے (مسند بزار: ۳۶۵۶، المعجم الاوسط: ۱۸۱۰۔ ۷۰۱۷ اور بیہقی کی دلائل النبوۃ: ۴۴۳/۶)۔ حافظ ابن حجر نے حدیث جابرؓ کو معجم اور دلائل کے حوالے سے ذکر کیا ہے۔ اور سند کو صحیح قرار دیا ہے (فتح الباری: ۶۳/۱۳)۔

تک تدریجی طریقۂ کار اختیار کرنا پڑا۔ حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد انہوں نے اپنے اعوان وانصار کو جمع کر کے خطبہ دیا، اس میں انہوں نے صاف ارشاد فرمایا:

اللہ کی تقدیر میں جو لکھا ہوتا ہے، وہ لامحالہ پیش آکر رہتا ہے۔ کسی کے پسند نہ کرنے سے اللہ کا تکوینی فیصلہ رکتا نہیں ہے۔ میں خدا کی قسم کسی معمولی منصب یا عہدے کی خاطر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت میں خوں ریزی نہیں کر سکتا[۱]۔

اسی سے ان کے محاذ میں پیغام پہنچ گیا ہوگا۔ قوی اسانید سے ثابت ہے کہ انہوں نے اپنے حامیوں اور اہم شخصیتوں سے بیعت کے وقت ہی یہ شرط لگائی کہ میں جس سے جنگ کروں، جنگ کروگے اور جس سے صلح کروں گا تو اس سے تم بھی صلح کروگے۔ خالد بن مضرب کہتے ہیں کہ میں نے حضرت حسنؓ کو کہتے سنا ہے کہ:

واللہ لا أبايعكم الا على ما أقول لكم۔ قالوا: ما هو؟ قال: تسالمون من سالمت وتحاربون من حاربت"[۲]۔

اللہ کی قسم میں تم کو ایک شرط پر ہی بیعت کروں گا۔ لوگوں نے دریافت کیا وہ کیا ہے؟ فرمایا: میں جس سے صلح کروں گا تم بھی کروگے اور جس سے جنگ کروں گا تم بھی کروگے۔

مؤرخ طبری اور ابن عساکر (۱۳/ ۲۶۳) کے یہاں اسی کی مؤید دوسری متعدد روایات بھی ہیں۔ اس وقت کی فضا میں ظاہر تھا کہ ان جملوں کے ذریعے حضرت حسن حضرت معاویہؓ سے صلح قبول کرنے کے لیے لوگوں کو پابند فرما رہے تھے۔ بیعت کی یہ دفعہ ان کی رائے اور نقطۂ نظر کا پوار پتہ دیتی ہے۔

اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ بھی:

اس وقت حضرت علی کی جماعت میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ نہایت اہم مقام رکھتے تھے۔ لیکن سیدنا علیؓ کی وفات کے بعد وہ ہمیں کہیں بھی سیاسی طور پر متحرک نظر نہیں آتے، نہ جنگ کی تیاری میں ان کا کوئی کردار ملتا ہے۔ بظاہر وہ حضرت حسنؓ سے بھی پہلے سے مائل بہ صلح، یا کم از کم یکسو ہو گئے تھے۔ دراصل وہ سیدنا علیؓ کی حیات میں ہی ۴۰ھ میں اپنے عہدے سے استعفاء دے کر مکہ تشریف لے گئے تھے (تاریخ طبری: ۵/ ۱۴۱)۔

شیعیت سے تأثر اور ایک بالکل الٹی تصویر:

ان حالات ومعاملات میں تاریخی روایات اس قدر خس وخاشاک سے بھری ہیں کہ بس خدا کی پناہ۔ صحابہ کو دشمن دین وایمان بتانے والوں کے لیے حضرت حسن کی صلح بڑی مشکل چیز ہے۔ اس سے ان کے سارے فکر ومذہب کی بیخ کنی ہوئی جاتی ہے۔ لہٰذا انہوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ حضرت حسن تو سرتاپا جنگ کے لیے پرجوش تھے، مگر

[۱] فضائل الصحابہ: ۲/ ۷۷۳، نیز الشریعۃ للآجری: ۵/ ۲۱۶۹، بسند صحیح۔

[۲] طبقات بن سعد: القسم المتمم للصحابة، الطبقة الخامسة: ۱/ ۲۸۷، بسند حسن، و: ۱/ ۳۲۵ بسند حسن۔

ساتھیوں نے غداری کی، اس لیے مجبوراً صلح کرنی پڑی۔ یہ بالکل غلط اور بے شمار تاریخی شواہد کے خلاف بات ہے۔

افسوس! تحقیق نہ کرنے اور شیعیت سے کسی قدر تاثر کی وجہ سے، یہ بیانیہ اہل سنت کی تصنیفات میں بھی خوب چلا۔ ان لوگوں نے اپنے اس تاثر کی وجہ سے، یہی نہیں کہ کثیر تعداد میں موجود صحیح روایات کو نظرانداز کیا، بلکہ حیرت ناک حد تک متضاد باتیں کہیں۔ اس کتاب کی پروف ریڈنگ کے دوران ایک معروف و مشہور تحقیقی و تصنیفی ادارے سے شائع شدہ ایک تاریخی کتاب کی طرف رجوع کیا۔ پڑھ کر حیرت و افسوس ہوا، مناسب معلوم ہوا کہ اسکو یہاں درج کر دیا جائے، تاکہ اندازہ ہو سکے کہ بلاتحقیق و تنقید حضرت معاویہؓ سے بدگمانیوں کا کیا حال ہے۔ ایسا حال کہ ژرف نگاہ اہل علم و قلم کو بھی محسوس نہیں ہوتا کہ وہ کیسی متضاد باتیں کر رہے ہیں۔ مذکورہ کتاب میں صلح حسن کا بیان پہلے تو حضرت معاویہؓ پر اس (بے ثبوت) الزام سے شروع ہوا:

> حضرت عثمان کی شہادت کے بعد سے ہی حضرت امیر معاویہؓ والی شام کے دل میں عالم اسلام پر حکومت کرنے کی خواہش تھی۔ اس کے لیے انہوں نے جنگ بھی کی۔ لیکن حضرت علی کی زندگی میں ان کی یہ تمنا پوری نہ ہوئی،۔۔۔ اس لیے حضرت علی کی شہادت کے بعد ان کو اپنی دیرینہ تمنا پوری کرنے کا موقع ملا، چنانچہ انہوں نے فوراً عراق پر فوج کشی شروع کر دی (۱/ ۳۱۲)۔

اس طرح اس سنّی مورخ نے حضرت معاویہ کے اختلاف کی اصل بنیاد (یعنی قاتلان عثمانؓ باغیوں کو سزا دینے کے مطالبے) کو صاف غائب کرکے، ان کی نیت پر حملہ کرکے ان پر حکومت حاصل کرنے کے لیے جنگ و تفرقہ کا الزام لگا دیا۔ پھر ایک بات تو بڑی ہی مزیدار ارشاد فرمائی:

> گو تاریخوں میں اس کی صراحت نہیں ہے لیکن واقعات و قرائن اسے معلوم ہوتا ہے کہ عراقی فوج میں امیر معاویہؓ کا مخفی اثر کام کر رہا تھا۔ اور اس کا ایک حصہ ان کے افسوں کا شکار ہو چکا تھا۔ (۱/ ۳۱۴)

ان تحریروں میں حضرت معاویہ کے ساتھ جو بے ادبی کی گئی ہے اور ان پر جو الزام لگائے گئے ہیں، ان کے سلسلے میں کچھ عرض نہیں کرنا۔ لیکن یہ ضرور کہنا ہے کہ (جیسا کہ گزر چکا) محدثین کی روایات اور تاریخ کے بیانات واضح ہیں کہ حضرت معاویہؓ صرف قاتلان عثمان کو سزا دینے کا مطالبہ کرتے تھے، اور کہتے تھے کہ میرا خلافت پر کوئی دعویٰ نہیں ہے۔ مصنف نے اس واضح حقیقت کو ذکر نہ کرکے اپنی طرف سے الزام لگا دیا کہ ''حضرت عثمان کی شہادت کے بعد سے ہی حضرت امیر معاویہؓ والی شام کے دل میں عالم اسلام پر حکومت کرنے کی خواہش تھی''۔ ہمیں باوجود تلاش بسیار کے اس کا سراغ نہیں مل سکا کہ حضرت معاویہؓ کا وہ کون سا مخفی اثر تھا جو عراقی فوج میں کام کر رہا تھا۔ نہ یہ معلوم ہے کہ وہ کون سے واقعات و قرائن ہیں ''جن سے معلوم ہوتا ہے کہ عراقی فوج میں امیر معاویہؓ کا مخفی اثر کام کر رہا تھا۔ اور اس کا ایک حصہ ان کے افسوں کا شکار ہو چکا تھا''۔

یہ ہیں ہمارے وہ کج میلانات، جن کی وجہ سے لوگ ضروری جانتے ہیں کہ اینچ پینچ کر کے حضرت معاویہؓ

پر کسی نہ کسی طرح دنیا طلبی کا الزام لگایا جائے۔ ہمارا مقصد کسی خاص مصنف پر تنقید نہیں ہے، اسی لیے ہم نہ مصنف کا نام لے رہے ہیں نہ کتاب کا۔ ہمارا مطمح نظر صرف اہل سنت میں پائے جانے والے کج میلانات اور شیعی روایات سے تأثر کا نمونہ دکھانا تھا۔

مذکورہ مصنف کو اپنے اسی میلان کے مطابق تصویر کشی میں دو کھلے تضادوں کی طرف بھی توجہ نہیں ہوئی۔ پہلا یہ کہ اسی موقعے پر وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ''حضرت حسنؓ بڑے نرم خو، متحمل مزاج، صلح جو اور امن پسند تھے۔ جنگ وجدال سے آپ کو طبعی نفرت تھی۔۔۔۔ آپ مسلمانوں کے خون کی قیمت پر خلافت خریدنا نہیں چاہتے تھے''۔ یعنی امکان وقدرت ہونے کے باوجود صلح کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود کہا یہ جاتا ہے کہ حضرت حسن تو جنگ کرنا چاہتے تھے، مگر جب اپنی فوج کی بے وفائی اور جنگ سے پہلو تہی دیکھی تو بادل ناخواستہ صلح فرمائی۔ مذکورہ مصنف کو یہ بھی احساس نہیں ہوا کہ اس طرح وہ یہ بھی کہے دے رہے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جس مبارک صلح کی تحسین فرمائی تھی، حضرت حسن نے وہ صلح صرف حالات سے مجبور ہو کر اور بادل ناخواستہ کی تھی۔

ان کی تحریر میں دوسرا کھلا تضاد یہ ہے کہ ایک طرف تو وہ یہ کہتے ہیں کہ حضرت حسن کے لیے ان کی فوج سر کٹانے کے لیے تیار تھی۔ مگر دوسری طرف یہ بھی کہتے ہیں کہ فوج غدار تھی۔ معاویہ کے افسوں کا شکار تھی۔ اس نے عین موقعے پر جنگ سے پہلو تہی کی۔ پڑھیے، ایک طرف لکھتے ہیں کہ:

> ہمراہی فوج کے علاوہ چالیس ہزار کوفی آپ کے ایک اشارے پر سر کٹانے کے لیے تیار تھے۔ خود حضرت حسن نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا تھا کہ عرب کے سر میرے قبضے میں تھے، جس سے میں صلح کرتا اس سے وہ صلح کرتے اور جس سے میں جنگ کرتا اس سے وہ جنگ کرتے۔

مگر دوسری طرف یہ بھی لکھتے ہیں کہ:

> ''جب شامیوں سے مقابلے کا موقعہ آیا عراقیوں نے غداری کا ثبوت دیا۔ (یہاں تک کہ انھوں نے) حضرت حسن کے خیمے پر حملہ کر کے اسے لوٹ لیا اور جس فرش پر آپ بیٹھے تھے اسے چھین لیا۔ فوج کا یہ رنگ دیکھ کر آپ مصالحت کے لیے آمادہ ہو گئے۔ ساباط پہنچ کر آپ کو اپنی فوج کی کمزوری اور جنگ سے پہلو تہی کا اندازہ ہوا۔ اس لیے آپ وہیں رک گئے اور فوج کو مخاطب کر کے تقریر فرمائی۔ (اس میں آپ نے فرمایا) میں دیکھ رہا ہوں کہ تم میں سے اکثر لوگ جنگ سے پہلو تہی کر رہے ہیں اور کمزوری دکھا رہے ہیں۔ اس لیے میں تم لوگوں کو تمہاری مرضی کے خلاف مجبور نہیں کرنا چاہتا۔

یہ ان محترم مصنف کا نہیں، تاریخی کتابوں کا تضاد ہے۔ شیعی میلان رکھنے والے راویوں کے گلے سے یہ حقیقت اترتی ہی نہ تھی، کہ حضرت حسن حضرت معاویہؓ سے بطیب خاطر و باطمینان قلب صلح کر سکتے ہیں، اس لیے ان کو متضاد قسم کے بہانوں کا سہارا لینا پڑا۔ جب کہ حقیقت یہی تھی کہ حضرت حسن مدت سے صلح کے خواہش مند

تھے اوراس کے لیے زمین تیار کررہے تھے۔

مگر کچھ لوگوں نے پھر بھی جنگ پر اصرار کیا:

لیکن ان کی جماعت میں ایک عنصر شدت کے ساتھ چاہتا تھا کہ جنگ جاری رکھی جائے ا، ان میں حضرت قیس بن سعدؓ جیسے مخلصین بھی تھے۔ حضرت قیسؓ صحابی تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے افسر پولیس تھے۔ اور اِس وقت آذربیجان کے حاکم تھے۔ ان کے ماتحت ۴۰ ہزار فوج تھی، جو ایک بڑی طاقت تھی۔ حضرت حسن نے جب ان کا جنگ پر اصرار دیکھا تو ان کو آذربیجان کی ولایت سے معزول کردیا، اوران کی جگہ عبیداللہ بن عباس کو گورنر طے کیا۔ (طبری: ۱۵۸/۵) اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت حسن کو اس صلح پر کس قدر اعتماد و اصرار تھا۔ نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بنو ہاشم کی اہم شخصیات میں سے عبیداللہ بن عباس بھی عبداللہ بن جعفر کی طرح صلح کی طرف مائل اور حضرت حسنؓ کے ہم خیال رہے ہوں گے۔

ان کے علاوہ جنگ پر اصرار کرنے والوں میں سبائی اور حضرت عثمان کے خلاف باغی گروہ کے ارکان پیش پیش تھے۔ وہ حضرت حسن کے اس خیال کے سخت مخالف تھے۔ (:البدایہ والنہایہ:۱۶/۸)۔ یہ جنگ پسند حضرت حسنؓ کی حمایت وعقیدت کے دعوؤں کے ساتھ ہی ان کی بے حرمتی سے بھی باز نہیں رہتے تھے۔ انہوں نے حضرت قیس بن سعدؓ کے حامیوں کو مشتعل کرنے کے لیے یہ افواہ اڑادی کہ حضرت قیس کو قتل کردیا گیا۔ حتیٰ کہ نوبت یہاں تک پہنچی حضرت حسن کو کچھ بدبختوں نے حملہ کرکے زخمی کردیا اوران کے گھر کا اسباب لوٹ لیا ا۔

حضرت حسن جنگ کے لیے نکلتے ہیں:

بہرحال آخر اسی عنصر کی رائے غالب آئی اور حضرت حسنؓ نے (اپنے رجحان طبع اور رائے کے خلاف) ایک بڑی فوج کے ساتھ صفر سن ۴۱ ہجری میں حضرت معاویہؓ کے خلاف جنگ کے ارادے سے شام کی طرف کوچ کیا۔ حضرت معاویہؓ کو خبر ملی تو وہ بھی مقابلہ کے ارادے سے نکلے ۲ اور مسکن نامی مقام پر پڑاؤ ڈالا۔

صلح کی طرف پیش قدمی:

اللہ کا فضل کہ دونوں طرف صلح کی خواہش موجود تھی۔ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی شدت سے حالات کی بہتری کے خواہاں اور صلح کے آرزومند تھے۔ امام بخاری حضرت حسن بصریؒ سے روایت کرتے ہیں کہ:

ا البدایہ والنہایہ:۱۶/۸، نیز طبقات ابن سعد: القسم المتمم للصحابۃ، الطبقۃ الخامسۃ:۳۲۵/۱۔ حضرت حسن پر حملہ کی روایت متعدد اسانید سے مروی ہے۔ مذکورہ کتاب کے محقق نے اس کو حسن قرار دیا ہے۔

۲ البدایہ والنہایہ:۱۶/۸۔ نیز تاریخ کی تحقیق کے لئے دیکھیں مرویات خلافۃ معاویہ صفحہ:۱۰۸۔

حضرت حسنؓ حضرت معاویہؓ سے جنگ کے لئے زبردست لشکر لے کر نکلے۔ حضرت عمرو بن العاصؓ نے حضرت معاویہؓ سے کہا: یہ لشکر خون ریزی کیے بغیر واپس جاتا نہیں لگتا۔ حضرت معاویہ نے کہا: اگر ایسا ہی ہوتا رہا، مسلمان ایک دوسرے کو قتل کرتے رہے، تو ہوگا کیا؟ لوگوں کے مسائل حل کرنے میں میری کون مدد کرے گا؟ میں کیسے اپنی بیواؤں اور یتیموں کی خبر گیری کروں گا؟

آخر حضرت معاویہؓ نے (اپنی طرف سے پہل کرتے ہوئے) حضرت حسنؓ کو صلح پر آمادہ کرنے کے لیے اپنے خاندان بنی عبد شمس کے دو صحابی حضرت عبدالرحمان بن سمرہ بن حبیبؓ اور حضرت عبداللہ بن عامرؓ کو بھیجا اور کہا کہ حسنؓ کے پاس جاؤ اور ان کو (صلح کی) پیشکش کرو، بات چیت کرو اور شرائط و مطالبات کا معاملہ انہی پر چھوڑ دو۔ یعنی صلح کے لیے وہ جو شرائط رکھیں قبول کر لینا[۱]۔ دونوں نے حضرت حسن سے مل کر گفتگو کی۔

اپنے خواص سے مشورہ اور ان کی ذہن سازی:

حضرت حسنؓ نے اپنے خواص سے خصوصاً اپنے قریبی رشتہ داروں سے مشورہ کیا۔ ان کے چچازاد بھائی یعنی حضرت عبداللہ بن جعفر (بن ابی طالب) نے مصالحت کی تجویز کا استقبال کیا اور کہا: اللہ آپ کو امت مسلمہ کی اس خیر خواہی کا بدلہ دے۔ میں اس خیال میں آپ کے ساتھ ہوں۔ عبداللہ بن جعفر بیان کرتے ہیں کہ ایک دن میں حضرت حسنؓ کے پاس تھا، اٹھنے لگا تو انہوں نے میرے کپڑے پکڑ کر مجھے اصرار کے ساتھ بٹھایا۔ اور کہا: سنو! میری اب ایک خاص رائے ہوگئی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ تم میرا اس میں ساتھ دو۔ میں نے کہا: فرمایئے۔ کہا:

قد رأيت أن أعمد إلى المدينة، فأنزلها وأخلى بين معاوية وبين هذا الحديث. فقد طالت الفتنة وسقطت فيها الدماء وقطعت فيها الأرحام وقطعت السبل وعطلت الفروج-يعني الثغور-. فقال ابن جعفر: جزاك الله عن أمة محمد خيرا، فأنا معك على هذا الحديث. فقال الحسن: ادع لي الحسين. فبعث إلى حسين، فأتاه، فقال: أي أُخَيَّ! إني قد رأيت رأيا وإني أحب أن تتابعني عليه. قال: ما هو؟ قال: فقص عليه الذي قال لابن جعفر. قال الحسين: أعيذك بالله أن تكذّب عليا في قبره وتصدق معاوية. فقال الحسن: والله ما أردت أمرا قط إلا خالفتني إلى غيره. والله لقد هممت أن أقذفك في بيت، فأطينه عليك حتى أقضي أمري، قال: فلما رأى الحسين غضبه قال: أنت أكبر ولد علي وأنت خليفته وأمرنا لأمرك تبع فافعل ما بدا لك.

---

[۱] صحیح بخاری کی روایت کے الفاظ ہیں: فاعرضا عليه، وقولا له، واطلبا إليه' اس جملے کی لغوی توجیہ کرتے ہوئے علامہ عینی فرماتے ہیں: واطلبا إِلَيْهِ، ، کے معنیٰ ہیں کہ ان کے تمام مطالبات مان لینا۔ أي: يكون مطلوبكما مفوّضاً إِلَيْهِ وطلبكما منتهياً إِلَيْهِ، أي: التزما مطالبه، ، عمدۃ القاری: ۱۳/ ۲۸۴۔

میری رائے ہے کہ اب بہت ہو گیا۔ اختلاف و جنگ کا سلسلہ دراز ہو گیا، جن میں بڑی خوں ریزی ہوئی اور رشتہ داروں نے ایک دوسرے کو قتل کیا۔ ملک میں داخلی بدامنی بھی پیدا ہو گئی اور سرحدیں بھی غیر محفوظ ہو گئیں۔ میں سوچتا ہوں کہ اب میں کاروبار خلافت معاویہ کے حوالے کر دوں اور مدینہ جا کر یکسو ہو جاؤں۔ میں نے عرض کیا: جزاك الله عن أمة محمد خيرا فأنا معك على هذا الحديث، اللہ آپ کو امت مسلمہ کی اس خیر خواہی کا بدلہ دے۔ میں خود اس خیال میں آپ کے ساتھ ہوں۔ حضرت حسنؓ نے فرمایا: حسین کو بلاؤ۔ ان سے حضرت حسن نے وہی بات تفصیل سے کہی جو مجھ سے فرمائی تھی۔ انہوں نے اس رائے کی مخالفت کی اور کہا: آپ اباجی کو قبر میں جھٹلاتے اور معاویہ کی تصدیق کرنا چاہتے ہیں۔ حضرت حسن نے کہا: تم میری ہمیشہ مخالفت کرتے آئے ہو۔ میرا جی چاہتا ہے کہ تم کو کسی گھر میں قید کر کے یہ صلح کی بات طے کر دوں۔ حضرت حسینؓ نے جب اُن کی یہ ناراضگی دیکھی تو عرض کیا کہ آپ ہی علیؓ کے جانشین اور بڑے صاحب زادے ہیں، میں آپ کے تابع ہوں۔

آگے روایت میں ہے کہ اس کے بعد حضرت حسنؓ نے مجمع عام میں صلح کا اعلان فرما دیا[1]۔

حضرت حسنؓ حکومت نہیں چاہتے تھے:

حضرت حسنؓ تو بہت پہلے سے صلح و تنازل کا خیال رکھتے تھے۔ وہ سیدنا علیؓ کے دور سے ہی بہت اصرار سے جنگ نہ چھیڑنے کا مشورہ دیتے تھے۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ ان کے بارے میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیشن گوئی تھی کہ ان کے ذریعہ ہی مسلمانوں کی خانہ جنگی ختم ہو گی۔ انہوں نے حضرت معاویہؓ کی جانب سے صلح کی اس پیشکش کا استقبال کیا۔ حضرت حسن اگر چاہتے اور معاملہ طے کرنے میں اپنی طرف سے کچھ بھی مضبوطی دکھاتے تو شاید کم از کم اپنے زیر انتظام علاقوں پر حاکم باقی رہ سکتے تھے یا کوئی اور بیچ کی راہ نکل سکتی تھی۔

یہاں یہ بات بہت لائق توجہ ہے کہ کسی بیچ کی بات کا مطالبہ بھی نہیں فرمایا۔ بلکہ یکدم اس معاملے سے خود ہی کنارہ کش ہونے کا فیصلہ کیا۔ بلکہ جیسا کہ صحیح روایات گزر چکیں، یہ فیصلہ اپنے طور پر تو وہ خود ہی پہلے ہی کر چکے تھے۔ اب جب کہ حضرت معاویہؓ کی طرف سے صلح کی پیشکش آئی، اور (جیسا کہ بخاری کی روایت بتاتی ہے) اس طور پر آئی کہ قاصدوں سے حضرت معاویہؓ نے کہہ دیا کہ حسن جو بھی مطالبہ کریں مان لینا، تو انہوں نے اپنے لیے حکومت بچانے کی کوئی گفتگو ہی نہیں کی۔ دوسری روایات میں بھی ایسی کسی گفتگو کا اشارہ نہیں ملتا۔ اور یہ بالکل واقعے کے مطابق اور قرین قیاس اس لیے بھی ہے کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ وہ تو خود ہی تنازل اختیار کرنے کا فیصلہ ہی نہیں کر چکے تھے، اس کے لیے اپنی جماعت کے لوگوں کو بھی تیار کرتے آ رہے تھے۔ ان کا رویہ، نبوی

---

[1] طبقات ابن سعد، القسم المتمم للصحابة: ۱/۱/۳۳۱، بسند صحيح۔ نیز ابن سعد ہی کے حوالے سے تاریخ دمشق: ۱۳/۲۶۷

پیشین گوئی کے عین مطابق تھا۔اس معاملے میں وہ یقیناً صاحب فضیلت وسیادت ثابت ہوئے۔

معاہدۂ صلح:

صحیح بخاری کی روایت ہے کہ انہوں نے مذاکرات کاروں سے کہا:

انا بنو عبد المطلب قد أصبنا من هذا المال،وإن هذه الأمة قد عاثت فی دمائها۔

ہم،یعنی اولاد عبد المطلب،کو مال حاصل ہے۔اور امت میں بڑا خون بہہ چکا ہے''۔

یعنی اب بس بہت ہوگیا۔اللہ کا دیا بہت مال ہمارے خاندان کے پاس ہے،اب ہم حکومت سے تنازل اختیار کرتے ہیں۔

یہ جملہ ''قد أصبنا من هذا المال''اس کا سیدھا سا ترجمہ یہی ہے کہ''ہم کو مال حاصل ہے''۔سیدنا حسنؓ کے اس جملے سے فطری طور پر یہ ہی سمجھ میں آتا ہے کہ امت کا اتنا خون بہہ گیا،ہمارے پاس اسباب دنیا کی کوئی کمی نہیں،اللہ نے خوب دے دیا ہے۔سو ہم کیوں نہ صلح قبول کر کے فتنہ وجنگ کا یہ دروازہ بند کر دیں[۱]۔ ہمارے نزدیک اس جملے میں مال کے مطالبہ کا کوئی مفہوم،براہ راست کیا،اشارۃً بھی نہیں ہے۔

صحیح بخاری کی اس روایت کے مطابق حضرت حسنؓ نے اپنے کچھ مطالبات اور شرطیں رکھیں (بخاری کی اس روایت میں اور دیگر کسی مستند روایت میں ان شرطوں کی تفصیل نہیں ہے) حضرت معاویہؓ کے نمائندہ مذاکرات کاروں نے نہ صرف تمام مطالبات تسلیم کیے،بلکہ حضرت حسن کے مطالبے پر اپنی طرف سے ان کی تکمیل کی ضمانت بھی لی۔(صحیح بخاری: ۲۷۰۴۔ نیز:۷۱۰۹۔) مورخین کی روایت میں آیا ہے کہ حضرت حسن نے صلح کی شرط کے طور پر کافی مقدار میں مال کا مطالبہ بطور شرط کے رکھا۔روایات میں مال کی مقدار اور دیگر تفصیلات آئی ہیں،کہ کوفہ کے بیت المال کا کل مال اور دارابگرد کا خراج ہر سال میرے حوالے کر دیا جائے[۲]۔ واللہ اعلم۔ان میں کوئی روایت طاقت ور درجے کی نہیں ہے۔

۱۔ لیکن چوں کہ تاریخی مآخذ میں آیا ہے کہ اس صلح میں طے پایا کہ حضرت حسن کو تنازل وصلح کے عوض میں کافی بڑی مقدار میں مال دیا جائے گا،اور سالانہ حضرات حسنین کے لیے لاکھوں کے عطایا طے کیے گئے،اس لیے شارحین نے حضرت حسنؓ کے اس ارشاد کا مفہوم یہ ذکر کیا ہے کہ ہم خلافت کے دور میں اپنے اعوان وانصار میں مال کی تقسیم کرتے رہے ہیں۔ہماری افواج میں کچھ عناصر ایسے ہیں جن کو مال دے کر ہی خاموش کیا جاسکتا ہے،ورنہ وہ دوبارہ فتنے کی آگ لگائیں گے اور انتشار وبدامنی پھیلائیں گے۔اس لیے اس کا کچھ انتظام کیا جائے۔(ملاحظہ ہو: فتح الباری: ۱۳/ ۶۴۔ ۶۵،عمدۃ القاری: ۱۳/ ۳۸۴)۔اگرچہ کافی تلاش کے باوجود ہم کو کوئی ایسی مستند روایت نہیں مل سکی،جو ثابت کرتی ہو کہ حضرت حسن نے صلح کے لیے مال کی شرط لگائی ہو۔واللہ اعلم۔

۲۔ البدایۃ والنہایۃ:۸/ ۱۷،الطبقات الکبری،متمم الصحابہ،الطبقۃ الخامسۃ:۱/ ۳۲۲۔

حضرت معاویہؓ کے بعد حضرت حسنؓ خلیفہ ہوں گے، ایسی کوئی شرط طے نہیں ہوئی تھی:

ابن سعد کی ایک روایت میں ایک شرط یہ بھی ہے، جو دیگر تاریخی مآخذ میں بھی مذکور ہے، کہ؛ اگر حضرت حسنؓ حیات رہے تو حضرت معاویہؓ اپنے بعد کے لیے ان کو خلیفہ نامزد کریں گے[۱]۔ روایت کے ضعف کے علاوہ یہ صحیح روایات اور قرائن کے بالکل خلاف بھی معلوم ہوتا ہے۔ اس صلح کے بعد حضرت حسن کافی مدت حیات رہے۔ اور انہوں نے یہ مدت مکمل طور پر سیاسی دلچسپیوں سے یکسورہ کر گزاری۔ کسی نے پوچھا کہ آپ کیا پھر خلافت کے بارے میں سوچتے ہیں؟ تو انہوں نے بڑی شدت سے منع کیا اور کہا کہ میں اس کو آخرت کے اجر کی نیت سے چھوڑ چکا ہوں[۲]۔

ایک اور قرینہ یہ بھی ہے کہ ایک موقعے پر حضرت معاویہؓ سے ان کے رضاعی بھائی حضرت قبیصہ بن جابر نے، جو عراق کی ایک اہم شخصیت اور حضرت علیؓ کی جماعت کے اہم لوگوں میں شامل تھے، پوچھا کہ آپ کے بعد کون ہوسکتا ہے؟ تو انہوں نے چار بڑی شخصیتوں کے نام لیے جن میں ایک حضرت حسن کا نام بھی تھا۔ یہ صحیح سند کی راویت ہے[۳]۔ سو اگر حضرت حسن سے معاہدہ ہو چکا ہوتا تو عراقی محاذ کے لیڈر قبیصہ بن جابرؒ پر مخفی نہ ہوتا۔ نیز اگر حضرت حسنؓ کا نام طے تھا، تو اوروں کے نام لینے کی کیا گنجائش تھی؟ اور وہ بھی حضرت علی کے کسی حامی کے سامنے؟

خلافت اسلامیہ کے استحکام میں حضرت حسنؓ کا کردار:

صلح میں مال تو غالباً طے نہیں ہوا تھا، لیکن بہر حال (کثیر روایات کے مطابق) حضرت معاویہؓ بیت المال سے حضرت حسن کو پابندی سے سالانہ عطایا دیتے رہتے تھے۔ اور حضرت حسنؓ اس کو اپنے لوگوں میں تقسیم فرماتے رہتے تھے۔ یہ مال کس لیے دیا جاتا تھا؟ علماء نے لکھا ہے کہ حضرت حسنؓ اپنے حامیوں میں یہ مال تقسیم فرمایا کرتے تھے تاکہ فتنوں کو دبایا جاسکے۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

وأراد الحسن بذلك كله تسكين الفتنة وتفرقة المال على من لا يرضيه إلا المال" (فتح الباری: ۱۳/ ۶۵)۔

---

[۱] طبقات ابن سعد، القسم المتمم للصحابة: ۱/ ۳۳۱، اس کی سند منقطع ہے۔ راوی عمرو بن دینار کی پیدائش ہی واقعے کے سالوں بعد یعنی سن ۴۵ یا ۴۶ کی ہے۔ سیر: ۵/ ۳۰۰۔

[۲] مستدرک: ۴۷۹۵، حاکم اور ذہبی نے اس کو صحیح قرار دیا ہے، نیز طبقات، متمم الصحابة، طبقۂ خامسہ: ۱/ ۳۱۹، بسند حسن۔

[۳] تاریخ ابی زرعة الدمشقی: ص: 592، بسند صحیح۔

ترجمہ: حضرت حسن کا مقصود صرف فتنہ واختلاف کی آگ کو سرد کرنا اور ان لوگوں کو خاموش کرنا تھا جو صرف مال سے ہی راضی رہ سکتے تھے۔

اور علامہ عینی رقم طراز ہیں:

فأراد أن يسكن الفتنة ويفرق المال فيما لا يرضيه غير المال۔ (عمدة: ۱۳/ ۲۸۴)۔

ترجمہ: حضرت حسن کا مقصد ایسے لوگوں کو، جو صرف مال سے ہی راضی ہو سکتے تھے، دے دلا کر راضی کرنا اور فتنہ کی آگ سرد کرنا تھا۔

(دو بڑے شارحین بخاری کے ذریعے کیے گئے اس تجزیہ وتوضیح کے مطابق) سیدنا حسن خلافت اسلامیہ کی سلامتی واستحکام میں لگاتار ایک خاص کردار ادا فرماتے رہے تھے۔ واللہ اعلم۔

اس صلح کی صحیح تصویر:

یہ بالکل اسی طرح کا طرز عمل تھا جیسا کہ رسول اللہؐ نے نئے اسلام لانے والوں کی مالی خدمت کے ذریعہ تالیف قلب کرتے وقت اختیار فرمایا تھا۔ سیدنا حسن کو سالانہ بیت المال سے جو مال آتا تھا وہ ان کی اپنی ضروریات کی تکمیل اور دوسروں میں تقسیم کے لیے آتا تھا۔ جس کو وہ امت میں اتحاد وسلامتی کی خاطر تقسیم کیا کرتے تھے۔

صلح کا اصل مقصد صرف رضائے الٰہی کا حصول اور خانہ جنگی کا خاتمہ تھا:

غرض یہ صلح نہ مجبوراً کی گئی تھی نہ بادل نخواستہ اور نہ مال کے عوض۔ صحیح روایات سے بھی ثابت ہے کہ سیدنا حسنؓ نے یہ صلح خالص رضائے الٰہی کی خاطر اور دین وملت کی خیر خواہی کے جذبہ سے اور آخرت کے اجر کی خاطر فرمائی تھی۔ امام احمد فضائل الصحابہ میں، ابن ابی شیبہ مصنف میں اور ابن سعد طبقات میں صحیح اسانید سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت حسن نے مدائن [1] میں (صلح کا معاہدہ طے ہونے کے بعد) ایک خطبہ دیا اور اس میں فرمایا:

''چاہے لوگوں کو ناپسند ہو، اللہ کی تقدیر کا حکم ضرور پیش آتا ہے۔ اللہ کی قسم میں حکومت کا کوئی معمولی سا حصہ بھی خون بہا کر نہیں حاصل کرنا چاہتا۔ مجھے اپنے (اخروی) نفع نقصان کا خوب علم ہے۔ پس تم لوگ اپنے اپنے ٹھکانوں پر جاؤ'' [2]۔

---

[1] موجودہ بغداد کے قریب ایک قدیم شہر، بلکہ شہروں کا مجموعہ تھا۔ معجم البلدان۔

[2] فضائل الصحابہ: ۲/ ۷۷۳، مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۷۳۵۸۔ طبقات: القسم المتمم للصحابة، الطبقة الخامسة: ۱/ ۳۱۷، تینوں کی سندیں صحیح ہیں۔

ابو غریف عبید اللہ کہتے ہیں کہ:

میں حضرت حسن کے مقدمۃ الجیش میں تھا، ہم بارہ ہزار کی تعداد میں جان دینے کے لیے تیار تھے۔ ہماری تلواریں خون کی پیاسی ہو رہی تھیں۔ جب صلح کی خبر ہم کو ملی تو ہم پر پہاڑ ٹوٹ گیا۔ ایسا لگا جیسے کمر ہی ٹوٹ گئی۔ صلح کا معاملہ طے کر کے حضرت حسن جب کوفہ پہنچے ایک شخص سفیان بن لیل آیا اور ان سے یوں مخاطب ہوا: او مومنوں کو ذلیل کرنے والے! حضرت حسن نے کہا: ایسا نہ کہو، میں نے اہل ایمان کو ذلیل نہیں کیا۔ میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ حکومت کی خاطر اہل ایمان کا خون بہاؤں۔ (مستدرک: ۳/ ۱۹۲، مصنف ابن ابی شیبہ: بسند حسن)۔

اس سلسلے کی سب سے قوی بات یہ ہے کہ اگر یہ صلح مال کی خاطر ہوتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی تعریف وستائش نہ فرمائی ہوتی اور اس کو امت کے لیے باعث صلاح وبرکت نہ قرار دیا ہوتا۔

حضرت حسنؓ اور حضرت معاویہؓ کی ملاقات اور بیعت:

صلح کا معاملہ طے ہو جانے کے بعد حضرت معاویہؓ کوفہ کی طرف تشریف لائے۔ ۵/ ربیع الاول ۴۱ھ کو مقام نخیلہ [1] میں دونوں بزرگوں کی ملاقات ہوئی۔ دونوں کے ساتھ اپنے اپنے وفود تھے۔ اس موقع پر حضرت حسنؓ نے وفد کے ساتھ حضرت معاویہؓ کے ہاتھ پر خلافت وامارت کی بیعت بھی فرمائی (البدایۃ والنہایۃ: ۸/ ۱۷)۔

اپنے حامیوں کو تاکید کہ حضرت معاویہؓ کے ہاتھ پر بیعت اور سمع وطاعت کریں:

حضرت معاویہؓ نے فرمائش کی کہ آپ ذرا اس مصالحت کا عوامی اعلان بھی کر دیں۔ حضرت حسنؓ نے خطبہ دیا۔ اس خطبے کی روایات صحیح سند سے آئی ہیں۔ حضرت انس بن سیرین نے نقل کیا ہے کہ حضرت حسن نے (لوگوں کو اس صلح پر مطمئن کرنے اور اتفاق پیدا کرنے کے لیے) اپنی عالی نسبی کا بھی حوالہ دیتے ہوئے فرمایا:

لوگو! تم کو اس سرزمین پر میرے اور حسین کے علاوہ نبی کا نواسہ نہیں ملے گا۔ میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت میں اتحاد قائم کرنا چاہتا ہوں، اور یہی میرے لیے زیبا ہے۔ میں نے معاویہ کی بیعت کر لی ہے۔ لہذا (میری سنو!)۔ میں کہتا ہوں کہ معاویہ کی امارت پر متفق ہو جاؤ [2]۔

---

[1] کوفہ کے قریب شام کی سمت ایک مقام۔ معجم البلدان: ۵/ ۲۷۸۔

[2] مصنف عبدالرزاق: ۱۱/ ۴۵۲، بسند صحیح، فضائل الصحابہ: ۲/ ۷۶۹ بسند صحیح۔

شعبی کہتے ہیں کہ میں موجود تھا۔ حضرت حسن خطبہ کیلئے کھڑے ہوئے اور اللہ تعالی کی حمد وثنا کے بعد یوں فرمایا:

اما بعد! سب سے عقلمندی کی بات تقویٰ اور خوف خدا ہے، اور سب سے بڑی حماقت خدا تعالی کی نافرمانی ہے۔ لوگو! سنو، یہ امر خلافت جس میں میرا اور معاویہ کا اختلاف تھا اس میں دو ہی باتیں ممکن ہیں: یا تو یہ میرا حق تھا، تو خونریزی سے بچنے کے لیے اور امت کے مفاد میں اس سے میں دستبردار ہو گیا۔ یا وہ کسی اور کا (یعنی معاویہؓ کا) حق تھا جو میں نے ان کو دے دیا[۱]۔

نیز فرمایا: او اہل عراق تم نے میرے والد ماجد کو شہید کیا، مجھ پر حملہ کیا اور میرا مال واسباب لوٹا۔ سنو! تم سے میں نے عہد لیا تھا کہ جس سے میں صلح کروں گا تم میری اتباع کرو گے۔ اب میں نے معاویہ سے بیعت کر لی ہے۔ سو تم ان کے ساتھ سمع وطاعت کا معاملہ کرو[۲]۔

سیدنا حسن کے اخلاص، امت کی خیر خواہی اور بے نفسی و پاکیزگی کی کیسی گواہیاں ہیں ان واقعات میں۔ رضی اللہ عنہ وارضاہ ورفع درجاتہ۔

حضرت معاویہؓ کا صلح جو موقف:

یہ صلح عین قرین قیاس تھی، دونوں صحابیان والا تبار کی شخصیتیں اور مزاج اسی کا تقاضہ کرتے تھے۔ حضرت معاویہ کی پوری زندگی کا مطالعہ بتاتا ہے کہ وہ نہایت حلیم الطبع، نرم مزاج اور صلح جو طبیعت کے مالک تھے۔ ہمیشہ انہوں نے صلح ہی کو پسند کیا اور کبھی از خود جنگ کی ابتدا نہیں کی۔ شیعیت زدہ لوگوں نے چاہے کچھ سمجھا ہو اور کذاب راویوں نے چاہے جو بھی نقل کیا ہو، مگر صحیح روایت یہی کہتی ہے کہ سب سے پہلے صفین کی خونریزی کے بیچ میں انہوں نے ہی صلح کی پیش کش کی، جسے سیدنا علی کرم اللہ وجہہ نے یہ کہتے ہوئے قبول فرمایا کہ اس کا تو میں پہلے حق دار ہوں (مسند احمد: ۱۵۹۷۵، بسند صحیح)۔ پھر بخاری وغیرہ کی صحیح روایات بتاتی ہیں کہ انہوں نے ہی حضرت حسنؓ کے ساتھ بھی صلح میں پیش قدمی کی، رضی اللہ عنہ وارضاہ۔

حضرت حسنؓ کا اخلاص و دردمندی:

دوسری طرف حضرت حسنؓ کی طبیعت تو گویا تھی ہی سراپا صلح وصفا۔ ان کے پاس فوجی طاقت بھی کافی تھی، اور اہل عراق و مشرق میں ان کے لیے لڑنے والوں کی بھی کمی نہیں تھی، عمومی طور پر امت میں قرابت نبوی کی بنا پر ان کو عظیم محبوبیت کا مقام حاصل تھا۔ وہ چاہتے تو عراق و فارس اور حجاز و یمن کے وسیع ممالک ان کی قلمرو میں باقی

۱۔ معجم کبیر: ۲۶/۳۔

۲۔ الطبقات الکبری، متمم الصحابۃ، الطبقۃ الخامسۃ: ۳۲۵/۱، بسند حسن۔

رہتے اور وہ ان پر حکومت کرتے رہتے۔ اور یہ کوئی چھوٹی حکومت نہیں ہوتی۔ مگر انہوں نے کلام نبوی میں بیان کردہ فضیلت پسند فرمائی اور رضائے خداوندی اور اسلام کی مصلحت میں تنازل اختیار کر کے برتری اور سیادت کا مقام پالیا۔ رضی اللہ عنہ وارضاہ۔

مگر فتنہ انگیزوں کی حرکتیں:

حضرت حسنؓ رخنہ اندازیوں اور فتنہ انگیزیوں سے اس صلح کی تاعمر حفاظت کرتے رہے۔ ان کا وجود سبائیوں اور فتنہ انگیزوں کی آنکھ کا کانٹا تھا۔ عراق میں موجود اہل فتنہ کے خطوط کا مستقل تانتا بندھا رہتا تھا، وہ حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کو لگاتار آمادۂ جنگ کرنا چاہتے تھے۔ حضرت حسنؓ ان کی ان باتوں کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ یزید ابن الاصم کہتے ہیں کہ:

> حضرت حسن کے پاس ایک پوری گڈّی خطوط کی آئی۔ میں موجود تھا، انہوں نے اپنی خادمہ سے کہا کہ ذرا پانی کا ٹب لاؤ، اس میں پانی ڈالا اور پوری گڈّی اس میں ڈال دی۔ میں نے دریافت کیا کہ کس کے خط ہیں؟ کہنے لگے: وہی عراق والے ہیں، نہ حق مانتے ہیں، نہ باطل سے رکتے ہیں۔ پھر کہنے لگے: مجھے اپنے بارے میں ڈر نہیں کہ وہ مجھے پھانس سکیں گے۔ (حضرت حسینؓ کی طرف اشارہ کر کے کہا) لیکن اس کے بارے میں ڈر رہے [۱]۔

حضرت حسن نے پھر کبھی خلافت کو نہیں سوچا:

حضرت حسن اس فیصلے کو رضائے الٰہی کا سبب اور امت میں اتحاد کا ذریعہ جانتے تھے۔ یہ فیصلہ انہوں نے کسی وقتی مصلحت یا تاثر کے تحت نہیں کیا تھا، بلکہ یہ ان کے فطری مزاج ومذاق اور قدیم رجحان ورائے کے عین مطابق تھا۔ کبھی ان کے خیال میں بھی نہیں آیا کہ کوئی دوسری صورت زیادہ بہتر ہوتی۔ مستدرک حاکم میں بسند صحیح آیا ہے کہ کسی نے سوال کیا کہ لوگوں میں مشہور ہے کہ آپ اب پھر خلافت کی فکر میں ہیں؟ آپ نے صاف انکار کرتے ہوئے کہا کہ میرے پاس (عراق میں) عربوں کی بہت بڑی تعداد جنگ کے لیے تیار تھی، مگر میں نے اللہ کی رضا کی خاطر اور امت کے اتحاد کے لیے اس کو چھوڑ دیا۔ تو کیا اب حجاز کے لوگوں کے سہارے پھر اس کے لیے جنگ کروں گا؟ [۲]۔ مطلب یہ ہے کہ جب میں کوفہ میں تھا تو اسلامی افواج کا بڑا حصہ میرے تابع تھا، حجاز

۱۔ المعرفۃ والتاریخ: ۲/۷۵۶ بسند حسن، المعجم الکبیر: ۳/۷۰، حافظ ابن حجر ہیثمی نے اس کی سند کی توثیق کی ہے۔ مجمع الزوائد: ۶/۲۴۳۔

۲۔ مستدرک: ۴/۷۹۵، حاکم اور ذہبی نے اس کو صحیح قرار دیا ہے، نیز طبقات، متمم الصحابۃ، طبقۂ خامسہ: ۱/۱۹/۳بسند حسن۔

میں تو کوئی فوج بھی نہیں، تو اب کیوں کر خلافت کی فکر میں پڑوں گا؟

دراصل حضرت حسن کی رائے شروع سے ہی کچھ اور تھی، وہ تو بس اپنے عالی مرتبت والد گرامی کی رائے کے اتباع میں اپنی طبیعت ورائے کے خلاف چلنے پر مجبور تھے۔ رہ رہ کر بار بار وہ حضرت علیؓ کو جنگ سے روکتے اور اپنی بات عرض کرتے تھے، مگر سیدنا علی کو اپنے موقف پر اس درجہ وثوق واعتماد تھا کہ وہ ہر موقعے پر ان کو خاموش فرما دیتے تھے۔ صلح کا اعلان فرماتے ہوئے حضرت حسنؓ نے ارشاد فرمایا: میں اس (لڑائی) کو شروع سے ہی سب سے زیادہ ناپسند کرنے والوں میں سے تھا''[1]۔

یقیناً یہ پاک اور بابرکت صلح تھی:

اس صلح کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے جس تحسین سے نوازا گیا ہے اور اس میں شریک دونوں فریقوں کا ''مسلمانوں کی دو عظیم جماعتیں'' کہہ کر جس پسندیدگی کے انداز میں تذکرہ کیا گیا ہے، وہ اس کی کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑتا کہ اس صلح کا مقصد سوائے اسلام اور مسلمانوں کی خیر خواہی وخلوص کے کچھ اور ہو۔ جو لوگ اس صلح سے کبیدہ ہیں، وہ ایک ایسی صلح سے کبیدہ ورنجیدہ ہیں جس کو رسول اللہ ﷺ نے پسند فرمایا اور اس کو فئتین عظیمتین من المسلمین (مسلمانوں کے دو عظیم گروہوں) کے درمیان آشتی وصلح قرار دیا۔ اور جس پر سیدنا حسن کی سیادت کا مژدہ سنایا۔

مصالحت سے مسلمانوں کی خوشی:

اس مصالحت سے اہل ایمان بہت خوش تھے اور اس کو عام الجماعت یعنی اتحاد واجتماعیت کا سال کہتے تھے۔ حضرت حسن کی جماعت میں بھی اکثریت کو حضرت معاویہ کی بیعت کے علاوہ کوئی راستہ صحیح نہیں لگا۔ حضرت قیسؓ بن سعدؓ بن عبادۃ صحابی ابن صحابی تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کو فتح مکہ میں خزرج کا علم بردار طے فرمایا تھا۔ سیدنا علیؓ کے اہم افسران میں سے تھے اور ان کی حمایت میں بہت طاقت ورموقف رکھتے تھے۔ حضرت حسن جب شام پر چڑھائی کے لیے نکلے تھے تو وہی مقدمہ کے افسر تھے۔ پھر جب صلح کی بات چیت ہوئی تو شروع میں وہ اس پر بالکل راضی نہیں تھے۔ مگر جب ان کو اطلاع دی گئی کہ حضرت حسن نے تنازل اختیار فرمالیا اور حضرت معاویہؓ کی بیعت کرلی ہے تو انھوں نے بھی اپنے لوگوں کو بیعت پر یہ کہہ کر راضی ومطمئن کیا کہ اب بیعت نہ کرنا ''فتنہ پیدا کرنا ہے، اور بلا امام برحق کے جنگ کرنا ہے'' (دخول فی فتنۃ أَوْ قِتَالٌ مَعَ غَيْرِ

---

[1] طبقات ابن سعد، القسم المتمم للصحابۃ: ۱/۳۳۱ بسند صحیح۔ نیز ابن سعد ہی کے حوالے سے تاریخ دمشق: ۱۳/۲۶۷۔

إِمَامٍ)۔ پھرانھوں نے اوران کے ماتحت افواج نے حضرت معاویہؓ سے آکر بیعت کی[1]۔ اور حضرت حسن کی طرح یکسو ہوکر مدینہ تشریف لے گئے۔

اس طرح وہ فتنہ، جو سیدنا عثمانؓ کی شہادت سے شروع ہوا تھا اور طویل مدت تک مسلمانوں کو اپنے گرداب میں لیے رہا، ختم ہوا۔ ایک مرتبہ پھر مسلمان ایک خلیفہ وامیر کے تحت متحد ہو گئے، انھوں نے اطمینان کا سانس لیا اور اس سال ۴۰ھ کو اتفاق واتحاد کا سال ''عام الجماعة'' قرار دیا۔

---

[1] مسند اسحاق بن راھویہ، بحوالہ المطالب العالیہ: ۲۱۶/۱۸۔ ابن حجر عسقلانی نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔

نواں باب

امیر المؤمنین معاویہؓ اپنے دور خلافت میں

حضرت معاویہؓ کی خلافت اور رسول اللہؐ کی کچھ پیشین گوئیاں:

امام بیہقی اور محدث ابن کثیر نے دلائل نبوت اور رسول اللہ ﷺ کی پیشین گوئیوں کے سلسلے میں (اور البدایہ والنہایہ میں حضرت معاویہؓ کی خلافت کے آغاز میں بھی) کچھ ایسی احادیث ذکر کی ہیں، جن میں خلافت معاویہؓ کی پیشین گوئی اور اس کا اشارہ ملتا ہے۔ ائمہ محدثین نے احادیث سے یہی سمجھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان احادیث میں حضرت معاویہؓ کے ذریعے علاقۂ شام میں مسلمانوں کے ایک ایسے نئے اور قابل ستائش نظام حکومت کی داغ بیل ڈالے جانے کی خبر دی ہے، جس سے دین کو استحکام حاصل ہوگا۔

(۱) اس سلسلے میں ایک حدیث وہ ہے جو امام احمد اور دیگر محدثین نے حضرت ابوالدرداءؓ سے بسند صحیح نقل کی ہے، کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"بینا أنا نائم اذ رأیت عمود الکتاب احتمل من تحت رأسی فظننت أنه مذهوب به، فأتبعته بصری، فعمد به الی الشام، ألا وإن الایمان حین تقع الفتن بالشام"۔

مجھے ایک خواب میں دکھایا گیا کہ قرآن کا "عمود"[۱] میرے سر کے نیچے سے نکال لیا گیا۔ مجھے لگا کہ یہ اب کہیں لے جایا جائے گا، تو میں اس کو دیکھتا رہا۔ آخر وہ شام لے جایا گیا۔ سن لو! فتنوں کے وقت ایمان کا مرکز شام ہوگا[۲]۔

اس حدیث کی طرف امام بخاری نے بھی کتاب التعبیر باب عمود الفسطاط میں اشارہ فرمایا ہے۔ حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ علماء تعبیر کے نزدیک اگر کوئی شخص خواب میں خیمہ کا عمود دیکھے تو اس سے مراد دین اور ایسا شخص

۱۔ عمود ستون یا ایسی شے کو کہتے ہیں جس کے سہارے پر کوئی دوسری چیز قائم ہوتی ہے۔

۲۔ مسند احمد: ۲۱۷۳۳، امام بیہقی نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے، دلائل: ۶/۴۴۷۔ اور ابن حجر نے اس کو شرط بخاری کے معیار کا بتایا ہے۔ فتح: ۱۲/۴۰۳

ہے، جس پر دین کے سلسلے میں اعتماد کیا جائے۔ (فتح الباری: ۱۲/ ۴۰۳)۔ اس سے مراد واضح ہوگئی کہ خلافت اسلامیہ اور قوت اسلام کا مرکز اب شام میں ہوگا۔

(۲) حضرت ابوالدرداء کے علاوہ یہ حدیث تقریباً ان ہی الفاظ میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کی روایت سے بھی بسند صحیح نقل کی گئی ہے[۱]۔

(۳) طبرانی نے بھی اس مضمون کی ایک روایت صحیح سند سے حضرت ابوامامہؓ سے نقل کی ہے[۲]۔

(۴) امام بیہقی نے ایک اور روایت نقل کی ہے کہ حضرت معاویہ کہا کرتے تھے کہ مجھے اسی وقت سے حاکم بننے کی توقع تھی جب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے فرمایا تھا: معاویہ! حاکم بننا تو اچھا طریقہ اپنانا''۔ بیہقی کہتے ہیں کہ اگرچہ اس کی سند ضعیف ہے مگر اور روایات سے اس کی تقویت ہوتی ہے۔ جن میں ایک مسند احمد کی وہ روایت بھی ہے کہ ایک مرتبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وضو کرا رہا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے نظر اٹھا کر دیکھا اور فرمایا: معاویہ! اگر تم کو حکومت کی ذمہ داری ملے تو اللہ سے ڈرنا اور عدل کرنا''۔ حضرت معاویہؓ کہتے ہیں کہ مجھے اسی وقت سے خیال تھا کہ مجھ پر یہ ذمہ داری آئے گی''[۳]۔

اس دور کی پیچیدگیاں اور دشواریاں:

امیر المومنین حضرت معاویہؓ ایک نہایت نازک اور پرفتن دور میں پورے عالم اسلام کے حاکم وسربراہ بنے تھے۔ سبائی پروپیگنڈے نے ملک کے طول وعرض میں بدگمانی و بے اعتمادی اور انتشار کا جو فتنہ پیدا کیا تھا، وہ شہادت عثمانی پر رکا نہیں تھا۔ اِس سازش کی آگ لگاتار جل رہی تھی۔ شام بڑی حد تک اس کی فتنہ سامانیوں سے محفوظ تھا، لیکن باقی تمام ممالک اس کی آماجگاہ تھے۔ ہر طرف افواہوں کی گردش اور بدگمانیوں کا زور تھا۔ جھوٹی تہمت تراشیوں اور خانہ جنگیوں کی وجہ سے خراسان سے لے کر مصر و لیبیا تک اور یمن سے لے کر عراق تک تمام اقوام اسلامیہ میں عام بے اعتمادی اور ذہنی انتشار کی فضا پیدا ہوگئی تھی۔ شمال میں آرمینیہ میں شوریدگی سر پکڑ چکی تھی اور مغرب میں افریقہ انتشار کا شکار تھا۔ غرض طوائف الملوکی کا سایہ منڈلا رہا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وہ جوان سال امت جو احتساب کائنات اور خلافت ارضی کے قیام میں مصروف تھی، اچانک بے سمتی کی شکار ہوگئی

---

[۱] مستدرک حاکم: ۸۵۵۴، ذھبی نے اسے بخاری اور مسلم کی شرط یعنی معیار کے مطابق صحیح قرار دیا ہے، نیز مسند شامیین: ۱/ ۱۷۹۔ ۱۸۱، صحیح اسانید سے۔

[۲] المعجم الکبیر: ۸/ ۱۷۰، بسند صحیح، مجمع الزوائد ۱۰/ ۵۸۔

[۳] مسند احمد: ۱۶۹۳۳، المعجم الکبیر: ۱۹/ ۳۶۱۔ دلائل النبوۃ بیہقی: ۶/ ۴۴۶۔

تھی۔افسردگی عام تھی۔ہمتوں میں اضمحلال تھا۔کسی قوم کے لیے سب سے مشکل مرحلہ یہی ہوتا ہے، جب اس کا کوئی اجتماعی مقصد نہیں رہ جاتا۔اس زائد از دس سالہ فتنہ نے امت کو منجدھار میں لا چھوڑا تھا۔

اس نازک وقت میں مسلمانوں کو ایک ایسے مستحکم سیاسی نظام اور قابلِ اعتماد حکومت کی ضرورت تھی، جو از سرِ نو امیدوں کو زندہ کر دے۔کوفہ و بصرہ سے لے کر فارس و خراسان تک کے تمام مشرقی علاقے شوریدگی کی آماجگاہ تھے۔پھر ایک طویل عرصے تک وہاں حضرت معاویہؓ کے خلاف جنگ و جدال کا جذبہ رہا تھا۔سیدنا حضرت حسنؓ کی مصالحت و تنازل کے باوجود بہت سے قبائل اور طبقات غیظ سے خالی نہیں تھے۔اسلام کی ضرورت صرف یہ نہیں تھی کہ مسلمانوں میں امن اور ان کی حکومت کو استحکام حاصل ہو، بلکہ دین کے فروغ و قیام کے لیے اولین ضرورت تھی کہ مسلمانوں میں اعتماد و خوش دلی کی ایک مثبت فضا قائم ہو جس کے آغوش میں حفاظت دین کا کام انجام پائے اور شریعت کی تدوین و عملی نفاذ ہو سکے۔نئی حکومت کے لیے سب سے مشکل کام یہی تھا۔

اس نازک اجتماعی و سیاسی صورت حال سے بھی خطرناک چیز ایک اور تھی۔سبائیت نے صرف افواہیں اور انتشار و بے اطمینانی ہی نہیں پھیلائی تھی، بلکہ اس نے اسلام میں تحریف و فساد اور بدعقیدگیوں و گمراہیوں کا ایک عظیم باب بھی کھول رکھا تھا۔سیدنا علی نے بھی اس خطرے کو خوب محسوس کیا تھا اور اس کے انسداد کے اقدامات فرمائے تھے۔تیسری طرف خوارج کی جنگجو جماعت تھی، جو جنگجوئیت کے ساتھ نہایت انتہا پسندانہ نظریات رکھتی تھی اور جس کے انحراف سے دین کو خطرہ لاحق تھا۔حضرت معاویہؓ پر یہ بھی ذمہ داری آئی تھی کہ وہ اسلام کے عقائد و افکار کی نگہبانی و حراست کریں اور ملت کے دینی رخ کی صحت و سلامتی بھی یقینی بنائیں۔

تاریخ شاہد ہے کہ انہوں نے یہ سب فرائض پوری کامیابی سے انجام دیے۔

حضرت معاویہؓ کا عظیم الشان کارنامہ:

حضرت معاویہ کی زندگی کا سب سے اہم کارنامہ یہی ہے کہ انہوں نے فتنوں کے اس ہیبت ناک طوفان میں امت کی کشتی سنبھالی، جس کے مہیب گرداب میں وہ دس سال سے ہچکولے کھا رہی تھی۔اور توفیق خداوندی، پھر اپنی محیر العقول صلاحیت، خداداد حکمت اور حلم و دانائی کی بدولت اُس منجدھار سے اُسے نکالنے میں کامیابی حاصل کی۔ان کے دور میں اسلام کی سیاسی قوت میں بڑا اضافہ ہوا۔مملکت کی معاشی حالت نئے عروج سے آشنا ہوئی۔نظمِ حکومت میں ترقی و وسعت پیدا ہوئی۔جہاد قائم اور فتوحات کا سلسلہ جاری ہوا۔یہاں تک کہ بلاشبہہ عہدِ فاروقی کی یاد تازہ ہوگئی۔اخلاقی و دینی نظام مصروف کار رہا،علم دین کی نشر و اشاعت ہوئی۔دین کی فکری و ایمانی اساسات کی حفاظت کی گئی، جس میں امیر المومنین حضرت معاویہؓ کا ذاتی طور پر اہم عملی کردار تھا۔

اُن کے علاوہ خلافت کے زیر انتظام صحابہ کے ائمہ اور پھر تابعین کے جلیل القدر علماء اجتماعی طور پر اس کارنامے کو انجام دیتے رہے۔ اور اس طرح دین وشریعت کی حفاظت اور اقامت کا اہم تاریخی کارنامہ جاری رہا۔ اگلے ابواب میں ان کارناموں کی تفصیل حدیث کے دفاتر اور تاریخی مآخذ سے جمع کی جائے گی، ان شاء اللہ۔ مگر پہلے کچھ سیاسی واقعات پڑھیے۔

داخلی بغاوتوں کی سرکوبی اور خوارج کے سلسلے میں ایک بڑی کامیابی:

تحکیم پر صلح کے بعد خوارج کا خطرناک گمراہ فرقہ وجود میں آیا تھا۔ یہ نہایت سر پھرے اور متشدد قسم کے لوگ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کبیرہ گناہ کرنے سے آدمی کافر ہو جاتا ہے، خصوصاً ظلم اگر حکومت کی طرف سے ہو تو حاکم اور حکومت کے کارندے ایسے کافر ہو جاتے ہیں کہ ان سے جنگ فرض ہے۔ یہ حضرت عثمانؓ کی خلافت کے دوسرے نصف دور کو ظالمانہ دور کہتے اور ان کی تکفیر کرتے تھے۔ ان کے خلاف بغاوت کو جہاد اور ان کے قتل کو جائز کہتے تھے۔ قاتلانِ عثمان کے ٹولے اسی قسم کے نظریات اور رجحانات کے حامل تھے۔ یہ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ، حضرت طلحہؓ حضرت زبیرؓ اور ان کے ساتھ دینے والوں، اسی طرح حضرت معاویہؓ اور ان کے سارے حامیوں کو کافر جانتے تھے۔ سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کے یہ ساتھ تھے۔ جب انہوں نے تحکیم پر حضرت معاویہ سے صلح کر لی تو انہوں نے اُن کو بھی کافر قرار دیا اور ان کے خلاف بغاوت کی۔ اور اپنی ایک الگ جماعت بنالی۔ بہت سی احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پیشین گوئی فرمائی تھی کہ ایسا ایک سر پھرا گروہ مسلمانوں میں پیدا ہوگا۔ اپنی سخت گیر طبیعت، جنونی باغیانہ مزاج اور غیر معمولی شجاعت کی وجہ سے خوارج سخت خطرہ تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی شدید مذمت کی تھی اور ان سے جنگ کرنے والوں کی فضیلت بیان کی تھی۔ اگرچہ نہروان کے تاریخی معرکہ میں سیدنا علیؓ نے ان کی قوت ایک حد تک توڑ دی تھی۔ لیکن یہ مدت تک ایک مسئلہ بنے رہے۔

خلیفہ بنتے ہی حضرت معاویہؓ کو اپنی حکمت وتدبیر سے خوارج کے سلسلے میں ایک بڑی کامیابی ملی۔ انہوں نے اُن کے سب سے بڑے مرکز نہروان کی قیادت سے مذاکرات کیے۔ افہام وتفہیم سے ان کو حق کا راستہ دکھایا اور نصیحت کی۔ نتیجہ مثبت رہا۔ نہروان کے خوارج نے جوق در جوق ان کے ہاتھ پر اپنے گمراہانہ نظریات سے توبہ اور بیعت کی [۱]۔ یہ بہت بڑی کامیابی تھی، اس سے خوارج کا خطرہ کمزور پڑ گیا۔ لیکن ابھی بھی مختلف قبائل

[۱] المطالب العالیہ: ۱۸/۲۱۶، اِتحاف الخیرۃ المہرۃ: ۸/۴۸، بحوالہ مسند اسحاق، ابن حجر اور بوصیری دونوں نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔

اور علاقوں میں ان کے گروہ اور ان کے نظریہ کی دعوت باقی تھی۔ ان کے ''علماء'' مختلف گروہوں میں بٹ کر زیر زمین تحریک چلا رہے تھے۔ خصوصا کوفہ و بصرہ کے نواحی علاقوں میں یہ کافی متحرک تھے۔

فروہ بن نُفیل کی بغاوت اور بالآخر شکست:

حضرت معاویہ ابھی کوفہ کے پاس نخیلہ کے مقام پر ہی تھے کہ اطلاع ملی کہ شہر زور سے فروہ بن نفیل کی قیادت میں خوارج کی ایک تعداد حملہ کے لیے نکلی ہے، اس کے ساتھ عبداللہ بن ابی الحوساء طائی کی جماعت بھی آ جڑی ہے۔ اور اب یہ لوگ کوفہ پہنچ چکے ہیں۔ یہاں ایک قابل لحاظ بات یہ نظر آتی ہے کہ حضرت معاویہ نے خود پہل کر کے ان سے جنگ کرنے کا ارادہ کیا، جب کہ اب تک ان کی پالیسی یہی رہی تھی کہ وہ امت میں صلح و اتفاق کی ہی کوشش کرتے تھے اور اپنی طرف سے کہیں پہل نہیں کرتے تھے۔ مگر خوارج کے ساتھ ان کی پالیسی دوسری تھی۔

انہوں نے اپنی فوج میں سے ایک ٹکڑی بھیجی مگر وہ ناکام لوٹی۔ پھر حضرت معاویہؓ نے کوفہ کی اُن افواج کو اِس کی ذمہ داری سونپی، جو کچھ وقت پہلے تک خود اُن سے (یعنی حضرت معاویہ سے) برسرپیکار تھیں۔ یہ حضرت علیؓ کے حامی لوگ تھے۔ خوارج نے اُن سے کہا کہ معاویہ تو ہمارے تمہارے مشترک دشمن ہیں۔ لیکن اہل کوفہ جانتے تھے کہ حضرت معاویہ سے اختلاف صرف سیاسی تھا، وہ اب ختم ہو گیا ہے۔ اور خوارج سے اختلاف دینی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اُن سے جنگ کی فضیلت بیان کی ہے۔ اس لیے ان کی وفاداری میں فرق نہیں آیا۔ انہوں نے صاف کہہ دیا کہ اب تو تم سے جنگ ہونی ہے الا یہ کہ تم حکومت کی اطاعت میں آ جاؤ۔ آخر مقام نخیلہ میں ایک فیصلہ کن جنگ میں خوارج کو شکست ہوئی۔ یہ شکست حضرت علیؓ کے ہاتھوں خوارج کی نہروان میں شکست کے بعد خوارج پر وہ سب سے بڑی چوٹ تھی جس نے ان کے فتنہ کو بہت کمزور کر دیا اور مسلمانوں کو ان سے راحت دلانے میں اہم کردار ادا کیا۔ حضرت معاویہؓ نے مختلف قبائل کے سرداروں سے فرمائش کی کہ وہ اپنے اپنے لوگوں کو اس گمراہ تحریک سے الگ کرنے کی کوششیں کریں، اس حکمت عملی سے خوارج کی تحریک سخت کمزور پڑ گئی[۱]۔

حمران بن ابان کی بغاوت:

کچھ ہی عرصے میں حمران بن ابان نے بغاوت کر کے بصرہ پر قبضہ کر لیا۔ حضرت معاویہؓ نے ایک لشکر بھیجا جس نے حمران کو شکست دی اور ان کو اور ان کے ساتھیوں کو گرفتار کر لیا۔ غالباً یہ اس ہنگام کا واقعہ ہے جب حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور صورتحال میں ابھی استحکام پیدا نہیں ہوا تھا۔ اسی دوران حمران بغاوت کر بیٹھے۔ حضرت معاویہ اس وقت بصرہ کے پاس ہی اپنی مختصر سی فوج کے ساتھ موجود تھے۔

۱۔ طبری: ۴/۱۶۵، حرکۃ الخوارج ڈاکٹر لطیفہ بکّای صفحہ: ۵۹ ط دار الطلیعۃ بیروت ۲۰۰۱ء۔

حمران کی سفارش کے لیے حضرت ابوبکرہ ثقفیؓ آئے۔ حضرت معاویہ ان کی بڑی قدر کرتے تھے۔ انہوں نے حضرت ابوبکرہ کی سفارش قبول کی اور حمران اور ان کے تمام ساتھی رہا کر دیے گئے [۱]۔

مستورد بن علفہ تیمی کی بڑی بغاوت:

نہروان میں شکست کے بعد خوارج منتشر ہو گئے تھے۔ ان کا ایک بڑا عالم اور لیڈر حیان بن ظبیان سلمی تھا۔ نہروان کے بعد اس نے طاقت جمع کرنا شروع کی تھی اور مقام رَی [۲] کو اپنی تحریک کا مرکز بنایا تھا۔ یہ لوگ بھی حضرت علی و حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما اور ان دونوں کے ساتھ شامل مسلمانوں کو کافر کہتے اور ان سے جنگ کو فرض اور جہاد قرار دیتے تھے۔

۴۱ھ کے اواخر میں حیان بن ظبیان کوفہ آیا۔ یہاں اس نے اپنی تحریک کے لیے خوب سرگرمی سے، لیکن خفیہ طور پر، کام شروع کیا۔ کوفہ کے والی اس وقت حضرت مغیرہ بن شعبہؓ تھے۔ انہوں نے خوارج کے ساتھ نرمی کی پالیسی اختیار کی ہوئی تھی۔ جمادی الاخری ۴۳ھ تک اس خفیہ تحریک کی وجہ سے کوفہ میں خوارج کے مختلف گروہ جمع ہو گئے اور انہوں نے مستورد بن علفہ تیمی کو اپنا کمانڈر قرار دے کر اس کے ہاتھ پر قتال کی بیعت کی اور بغاوت کی تیاری شروع کر دی۔ حضرت مغیرہؓ کے پولیس افسر قبیصہ بن الدمونؓ نے خوارج کی قیادت کو گرفتار کرنا چاہا۔ حیان بن ظبیان ۲۰/افراد کے ساتھ گرفتار ہوا، مگر ان کا جنگی قائد مستورد اپنے لوگوں کے ساتھ حیرہ بھاگ گیا اور ایک وسیع بغاوت کے لیے مختلف شہروں میں قاصد بھیجنے شروع کیے۔

حکومت کے خفیہ محکمہ نے اطلاع دی کہ شعبان میں خوارج بڑا حملہ کرنے والے ہیں۔ کوفہ کے بڑے لوگوں سے مشورہ کیا گیا، تو جماعتِ علیؓ کے ایک اہم سردار معقل بن قیس ریاحی نے کہا کہ ہم سے زیادہ خوارج کا دشمن کوئی نہ ہوگا۔ یہ مہم ہم لوگوں کے حوالے کی جائے۔ یہ حضرت علیؓ کے افسر پولیس تھے۔ حضرت مغیرہ نے اپنے پولیس افسر قبیصہ سے کہا کہ تم معقل بن قیس کے ساتھ جاؤ اور حضرت علیؓ کے حامیوں کو خوارج کے مقابلے کے لیے آمادہ کرو۔ نتیجۃً حضرت علی کے نہایت معتقد لوگوں میں سے تین ہزار اس لشکر میں شامل ہوئے۔ خوارج کے مقابلے میں کوفہ کے ان لوگوں کی قیادت محکمۂ پولیس کر رہا تھا۔ نہر دجلہ کے کنارے مقابلہ ہوا، مستورد مارا گیا اور خوارج کو شکست ہوئی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت معاویہؓ کی خلافت کو حضرت حسنؓ کی طرح ان کی جماعتِ علیؓ میں سے اہل خیر و صلاح کی ایک بڑی تعداد نے دل سے قبول کیا تھا۔ طبری نے اس بغاوت کے حالات بڑی

۱۔ البدایہ والنہایہ: ۸/۲۶۔

۲۔ یہ فارس کا ایک قدیم شہر تھا۔ موجودہ طہران اس کے پاس ہی واقع ہے، معجم اماکن الفتوح: ۲۸۷۔

تفصیل سے لکھے ہیں (۵/۱۸۱۔۲۰۹) اورابومخنف نے اس پر پوری ایک کتاب ''المستورد بن علفہ'' کے نام سے لکھی ہے (الفہرست: ۱۲۲) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک بہت بڑی بغاوت تھی۔

اس جماعت کا دوسرا قائد حیان بن ظبیان جیل میں تھا۔ سن ۵۰ میں حضرت مغیرہ کی وفات کے بعد وہ رہا ہوا۔ اس نے پھر سے اپنی تحریک جاری کی۔ یہاں تک کہ سن ۵۸ھ میں ان لوگوں نے خروج کیا اور شکست کھائی۔ حیان اور اس کی جماعت کے بہت سے لوگ مارے گئے (طبری: ۵/۳۰۹۔۳۱۱)۔

خطیم اور سہم ھجیمی کی بغاوت:

۴۱ھ میں بصرہ میں یزید باہلی معروف بہ خطیم اور سہم ھجیمی نامی خارجیوں نے صحابہ اور ساری امت کی تکفیر اور بغاوت کا علم بلند کیا اور قتل وقتال کی دعوت دی۔ شہر کے باہر ان کے گروہ کا پڑاؤ تھا، اتفاقاً وہیں سے صحابیِ رسول حضرت عبادہ بن قرص ؓ کا گزر ہوا۔ وہ اذان کی آواز سن کر ان لوگوں کے پاس آ گئے۔ ان فسادیوں نے ان کا تعارف حاصل کیا اور یہ سن کر کہ وہ صحابہ میں سے ہیں، قتل کر دیا۔ خطیم اور سہم نے بعد میں توبہ کا اظہار کر کے والیِ بصرہ عبداللہ بن عامر سے امان حاصل کر لی ۱۔ لیکن ان کی توبہ بس ایک حیلہ تھی۔ یہ خاموشی سے بغاوت کی تیاریاں کرتے رہے۔ بصرہ اور فارس کے شہروں میں خارجیوں کی تحریک بڑھتی جاتی تھی۔ وہ تھوڑی تھوڑی ٹکڑیوں میں مسلمانوں کی آبادیوں پر حملہ آور ہوتے تھے اور خونریزی کرتے تھے۔ سن ۴۵ھ میں حضرت معاویہ نے سخت گیر ونہایت باصلاحیت شخص زیاد کو بصرہ کا گورنر بنا دیا تھا۔ انہوں نے خوارج کا اچھی طرح استیصال کیا۔ ۲

سن ۴۶ھ میں ان میں سے سہم بن غالب اہواز چلا گیا اور اپنے گمراہ مذہب اور بغاوت کی دعوت دینے لگا، آخر زیاد نے پکڑ کر قتل کر دیا۔ اور خطیم کو زیاد نے بحرین جلاوطن کر دیا، لیکن وہ فتنہ سے باز نہیں آیا آخر قتل کیا گیا۔ حضرت معاویہ کے گورنروں میں زیاد اور ان کے نائب حضرت سمرہ بن جندب ؓ خوارج کے استیصال میں بڑے سرگرم رہے۔ حضرت سمرہ ؓ خوارج کے سلسلے میں رسول اللہ ﷺ کی پیشین گوئیاں اور ان سے جنگ کی فضیلت بیان کرتے تھے۔ (البدایہ والنہایہ: ۶/۲۵۴) اس طرح حضرت معاویہ ؓ کی خلافت کے شروع ہی میں خوارج کی تحریک کافی کمزور کر دی گئی اور مملکت کو استقرار حاصل ہوا۔

حجر بن عدیؒ کی بغاوت:

بغاوتوں کے سلسلے کا ایک واقعہ حجر بن عدیؒ اور ان کے کچھ ساتھیوں کے قتل کا بھی ہے۔ حضرت معاویہ ؓ کے دشمنوں نے اس واقعہ کو بھی بہت رنگ ملا ملا کر بیان کیا ہے۔ اس میں سب سے نفرت انگیز روایات ابومخنف کی

---

۱ طبری: ۵/۱۸۱۔۲۰۹۔ التاریخ الکبیر للبخاری: ۶/۹۳۔

۲ معاویہ للصلابی: ۳/۲۷۴۔۲۷۵۔

ہیں۔افسوس کہ طبری نے یہاں بھی اس کی روایات کو درج کر دیا ہے۔پھر رہی سہی کسر نقل کرنے والوں نے اس طرح پوری فرمائی کہ اس کی روایت میں جو اجزاء ایسے تھے کہ حضرت معاویہؓ کے اقدام کی توجیہ اور اسباب بیان کرتے تھے، وہ سب حذف کر کے، ایک سخت استبدادی قتل کی تصویر بنا ڈالی۔اس عمداً تحریف کو شیعیت سے تاثر اور تعصب کے علاوہ کیا نام دیا جا سکتا ہے؟

حُجر بن عدی ایک بڑے صالح بزرگ اور کوفہ کی ایک موقر شخصیت تھے۔ائمہ محدثین امام بخاری، ابو حاتم، ابن حبان اور خلیفہ بن خیاط وغیرہ نے حجر بن عدیؓ کو تابعی قرار دیا ہے (الاصابہ: ۲/ ۳۳)۔روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرت معاویہؓ اور ان کے حکام پر زبانی تنقیدیں کرتے رہتے تھے۔بلکہ حضرت حسن کی صلح کو بھی ناپسند کرتے تھے اور ان کو بھی مصالحت پر برا بھلا کہا کرتے تھے۔حضرت معاویہؓ کی حکومت اس حد تک ان کی باتیں برداشت کرتی تھی۔بلکہ طبری کی روایات بیان کرتی ہیں کہ حکومت طعن وملامت کے باوجود ان کے دینی امتیاز کی وجہ سے ان کا اکرام کرتی تھی۔

لیکن ۵۱ھ میں حضرت حسن کی وفات کے بعد ان کا معاملہ زبانی تنقید سے آگے بڑھ کر عملی اقدامات تک پہنچنے لگا۔یہ زیاد کا دور تھا۔آخر گورنر نے ان کو بلا کر فہمائش ونصیحت کی۔اور کہا کہ میں بھی معاویہ کے مقابلے میں علیؓ کے ساتھ تھا، مگر جب معاویہ کی حکومت قائم ہوگئی تو اب بغاوت جائز نہیں۔میں تمہاری عزت کرنا چاہتا ہوں۔دیکھو! کہیں نادان لوگ تم کو ورغلا کر میدان میں نہ لا کھڑا کریں۔اس کے بعد بھی ان کے طرز میں تبدیلی نہیں آئی، تو زیاد نے ان کو صاف آگاہی دی کہ بغاوت کا انجام خطرناک ہوگا۔مگر زیاد کا اندیشہ درست نکلا، لوگوں نے ان کو میدان میں کھڑا کر کے ہی چھوڑا۔

زیاد کوفے کے ساتھ بصرے کے بھی گورنر تھے۔آدھا آدھا سال دونوں جگہ رہتے تھے۔۵۱ھ میں جب وہ بصرے جانے لگے تو حضرت عمرو بن حریثؓ کو کوفے میں اپنا نائب مقرر کر گئے۔زیاد کے پیچھے حجر بن عدیؒ نے بغاوت کر دی اور کوفے کے بڑے حصے پر قبضہ کر لیا۔حضرت عمرو بن حریثؓ نے زیاد کو فوراً لکھ بھیجا کہ اگر کوفہ کی حکومت بچانا چاہتے ہو تو فوراً آؤ، میرے ہاتھ سے شہر نکل گیا ہے، بس گورنر ہاؤس بچا ہے۔زیاد فوراً گھوڑ سواروں کی ایک فوج کے ساتھ آئے۔حجر بن عدیؒ کو طلب کیا۔تو ان کے ساتھیوں نے پولیس سے مسلح جنگ کی۔آخر ان کی گرفتاری عمل میں آئی۔(غالباً اُن کے دینی مقام ومقبولیت کے پیش نظر) زیاد نے ان کے بارے میں کوئی فیصلہ خود نہیں کیا، بلکہ کوفہ کے ستّر (۷۰) اہم اشخاص سے تحریری گواہیاں لیں، اور حجر اور ان کے ۱۲ ساتھیوں کو بہت سے گواہوں کے ساتھ حضرت معاویہ کے پاس بھیج دیا۔جہاں ان کے خلاف گواہوں نے

گواہیاں دیں کہ انہوں نے حکومت کے خلاف مسلح بغاوت کی ہے۔ یہ طبری کا بیان ہے۔

امام احمد نے حسن سند سے شرحبیل بن مسلم خولانی سے روایت کیا ہے کہ ان کا ایک خط مشہور خارجی لیڈر ابو بلال مرداس ابن ادیہ کے نام حکومت کے ہاتھ لگا تھا، جس میں مسلح بغاوت کے منصوبے تھے۔ ان گواہیوں کے سامنے آنے کے بعد حضرت معاویہ نے حجرؓ کے سلسلے میں مجلس شوریٰ سے رائے لی۔ پھر دمشق کے کچھ مشہور صالح بزرگوں ابو مسلم خولانی وغیرہ سے مشورہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ ان لوگوں کو قتل کیا جائے تو ان کی غلطی ایسی ہی ہے۔ اور معاف کر دیا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ اب جیسا امیر المومنین کی رائے ہو۔ آخر حجر بن عدیؓ اور ان کے ۶ ساتھی قتل کیے گئے اور باقی چھوڑ دیے گئے[۱]۔

اس روایت کے علاوہ حجرؓ کے قتل کی کچھ بھی تفصیلات صحیح سند سے نہیں ملتیں۔ اکیلے طبری نے اس سلسلے میں ابو مخنف سے ۱۶ روایات نقل کی ہیں، اس نے تو اپنی خاص ذہنیت کے خوب گل کھلائے ہیں۔ لیکن اس کی روایات اور دیگر تاریخی روایات سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ایک 'بغاوت' کا واقعہ تھا۔ (تاریخ طبری: ۵/ ۲۵۳۔ ۲۸۵، طبقات بن سعد: ۶/ ۲۴۱۔ ۲۴۴، انساب الاشراف: ۵/ ۲۴۵۔ ۲۴۶۔ نیز ملاحظہ ہو علی الصلابی کی کتاب: معاویۃ۔)۔

حجر بن عدیؓ کے نیک شہرت کی وجہ سے ہی غالباً حضرت عائشہؓ کو بھی ان کے قتل پر سخت تشویش تھی۔ انہوں نے باقاعدہ حضرت معاویہؓ سے محاسبہ کیا۔ حضرت معاویہؓ نے کہا: مجھے ان سے سخت فساد اور خوں ریزی پھیلنے کا ڈر تھا۔ میرا خیال تھا کہ خانہ جنگی یا بغاوت میں بہت سے مارے جائیں اس کے مقابلے میں ایک جان جانا سہل ہے۔ حضرت عائشہ نے حضرت معاویہؓ کے اس اندیشے کا انکار نہیں فرمایا، لیکن غالباً وہ مطمئن نہیں ہوئیں اور ان کا خیال تھا کہ عفو و درگزر سے کام لیا جا سکتا تھا۔ تو حضرت معاویہؓ نے کہا کہ میں نے جو کیا حق سمجھ کے کیا، میرا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیجیے۔ تو حضرت عائشہ نے فرمایا: چھوڑ دیا، چھوڑ دیا، چھوڑ دیا۔ (تاریخ دمشق: ۱۲/ ۲۲۹، ۲۳۰ بسند حسن)۔

---

[۱] احمد بن حنبل: المسائل روایۃ ابنہ صالح: ۲/ ۳۲۸۔ ۳۳۱، تاریخ دمشق: ۱۲/ ۲۲۰۔ ۲۲۳ بسند حسن۔

دسواں باب

رومن امپائر سے جہاد اور فتوحات

حضرت عثمانؓ کے آخری عہد سے نہ صرف یہ کہ فتوحات رک گئیں تھیں بلکہ اس دوران بہت سے سرحدی علاقے اور نومفتوح ممالک دوبارہ ہاتھ سے نکل گئے تھے۔ مشرقی علاقوں سے حضرت علیؓ نے اور مغربی علاقوں سے حضرت معاویہ نے اپنی افواج داخلی محاذ کے لیے واپس بلالی تھیں۔ مشرق میں فارس اور خراسان کے بیشتر علاقے باغی وسرکش ہو گئے تھے۔ شمال میں آرمینیہ اور شمال مغرب میں جبال امانوس وغیرہ کے مفتوحہ علاقوں میں شورش پیدا ہوگئی تھی۔ فریقین کے لیے صلح کو سوچنے پر مجبور کرنے والا یہ بھی ایک عامل تھا۔ سیدنا حسنؓ نے اسی صورت حال پر افسوس ظاہر فرماتے ہوئے کہا تھا کہ سرحدیں فوجوں سے خالی ہوگئیں [۱]۔ حضرت معاویہ نے صلح واطمینان ہوتے ہی ازسرنو جہادی سرگرمیوں کا انتظام کرنا شروع کیا، اور چند سالوں میں ماضی کی تابناک فتوحات کا پرشوکت منظر پھر قائم کر دیا۔

اسلام کے لیے سب سے بڑا خطرہ
رومن امپائر کی عظیم طاقت:

طلوع اسلام کے وقت دنیا کی دو عظیم طاقتوں میں سے فارسی سلطنت تو حضرت عثمانؓ کے عہد میں ہی دم توڑ چکی تھی۔ لیکن رومن بیزنطینی سلطنت نہایت منظم، متمدن، معاشی طور پر مضبوط اور عظیم الشان بحری وبری افواج سے مسلح تھی۔ دنیا میں اسلام کے سامنے سب سے بڑی حریف طاقت، جس سے ابھی بھی اسلام کو خطرہ تھا یہی رومی بیزنطینی سلطنت تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آخری دور سے یہی محاذ دفاع اسلام کا سب سے اہم محاذ قرار پا چکا تھا۔ یہی طاقت تھی، جو شمالِ عرب اور شام وفلسطین سے لے کر یورپ کے مشرقی علاقوں اور تقریبا پورے شمالی ووسطی افریقہ نیز بحر متوسط کے تمام ساحلوں پر حکمراں تھی۔

---

[۱] طبقات: قسم متمم الصحابۃ ۱/۳۳۱ بسند حسن۔

بحر متوسط پر اس کے قبضے سے دنیا کی بیشتر بحری تجارت پر اس کی اجارہ داری قائم تھی۔ (واضح رہے کہ ایشیا اور یورپ کے درمیان قرن امید (Corn of Hope) والا بحری راستہ اس وقت تک دریافت نہیں ہوا تھا، نہ نہر سویز کا وجود تھا، اس لیے مشرق سے مغرب کی تجارت کا واحد بحری راستہ بحر متوسط ہی سے ہو کر گزرتا تھا)۔ اس کے علاوہ مشرق و مغرب کو جوڑنے والا وہ راستہ، جو شاہراہ ریشم کہلاتا اور صدیوں سے دنیا کی معاشی شہ رگ تھا، رومیوں کی سرزمین سے ہی گزرتا، تمدنی ترقیوں کی تخم ریزی کرتا اور حکومت کو مالا مال کرتا تھا۔ شام اور افریقہ کا زرعی لگان اور عالمی بری و بحری تجارت سے ہونے والے عظیم محصولات اس کی معاشی شہ رگ اور دراصل اس کے قصر شوکت کے پشتیبان تھے۔

حضرت معاویہ ؓ کا تاریخ ساز عظیم کارنامہ:

مسلمانوں نے شمال عراق و آرمینیہ اور شام فتح کر کے بیزنطینی سلطنت کو سخت آزمائش اور خطرے میں ڈال دیا تھا۔ رومن امپائر کی اس شہ رگ کو کاٹنے میں سب سے بڑا کردار بلاشبہ حضرت امیر معاویہ ؓ ہی کا تھا، جو خلافت راشدہ کے عہد سے اپنی امارت اور پھر اپنی خلافت کے زمانے میں چالیس سال تک لگاتار اس سلطنت سے برسر پیکار رہے اور اس کو پے بہ پے شکست و پسپائی سے دوچار کرتے رہے۔ اس محاذ پر حضرت معاویہ ؓ کی خدمات جماعت صحابہ میں سب سے شاندار اور طویل المدت ہیں۔ اس دور میں اسلام کی حفاظت و ترقی کے لیے یہ سب سے ضروری کام اور دفاع اسلام کا سب سے اہم محاذ تھا۔ اسلامی تاریخ میں حضرت معاویہ ؓ کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ وہ رومن امپائر کے مقابلے میں نہ صرف سدآہنی بن کر اسلام کی حفاظت کرتے رہے، بلکہ شام سے لے کر آرمینیہ و آذربائیجان تک کے ممالک کو فتح کرنے میں بھی کامیاب رہے۔ افسوس! ان کے اس عظیم کارنامے کو، جس کا اسلام کی حفاظت میں سب سے بڑا کردار تھا، ہماری علمی تاریخ میں کم یاد کیا گیا۔

عہد عمری و عثمانی میں مصر اور شمالی افریقہ میں جو وسیع فتوحات ہوئیں ان میں بھی حضرت معاویہ کا مرکزی اور اہم کردار تھا۔ شام اور آرمینیہ سے لے کر جبال امانوس و طوروس تک حضرت معاویہ نے اپنی افواج کی ایسی فولادی دیوار کھڑی کر دی تھی، جس نے سلطنت روما کو نہ صرف شام سے دور کر رکھا تھا بلکہ براعظم افریقہ میں پھیلی اس کی مقبوضات تک پہنچنے کا بری راستہ بھی بند کر دیا تھا۔

انھی کے دور خلافت میں اس کارنامے کا دوسرا مرحلہ مکمل ہوا۔ مسلمانوں نے بحر متوسط کے ساحلوں اور اس کے جزائر میں قائم بحری اڈوں پر قبضے کر کے بحر متوسط سے رومیوں کو تقریباً بے دخل کر دیا۔ یہ امیر المؤمنین حضرت معاویہ ؓ کا وہ عظیم الشان کارنامہ ہے جس نے انسانی تاریخ کا رخ موڑ دیا۔ مصر و افریقہ میں مسلمانوں کو جو

استحکام حاصل ہوا، اس میں حضرت معاویہؓ کے محیر العقول حد تک منصوبہ بند جہاد و رباط کا اصل کردار تھا۔ جس کے بغیر رومیوں سے مصر و افریقہ میں لڑنا بہت مشکل تھا۔ حضرت معاویہؓ نے اپنی اولوالعزمی اور اقدامی کارروائیوں سے میدان جنگ شام و مصر کے بجائے ایشیائے کوچک اور قسطنطنیہ کے سمندر میں منتقل کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رومیوں کو بس اس پر قناعت اختیار کرنی پڑی کہ اپنے دار السلطنت قسطنطنیہ کی خیر منائیں۔

ایک مظلوم ہیرو، جس کے کارناموں کو بھلا دیا گیا:

حضرت معاویہ کے ان کارناموں کی بدولت ہی مسلمان دنیا کی سُپر پاور کا درجہ حاصل کر سکے، جس کے سائے میں قافلۂ اسلام صدیوں رواں دواں رہا۔ اصل کارفرما تو صرف اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے، لیکن بظاہر اسباب کوئی مورخ اس کے علاوہ کچھ کہہ نہیں سکتا کہ؛ اگر شام و روم کے محاذ پر اس مجاہد اعظم کی خدمات نہ ہوتیں، تو آج اسلام کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔

مگر افسوس! تاریخ اسلام کی بزم میں معاویہ وہ مظلوم ہیرو ہے، جس کے کارناموں اور احسانات کو بڑی حد تک بھلا دیا گیا ہے۔ اسلام کے اس عظیم خادم اور مسلمانوں کے اس بڑے محسن کو صرف فتنہ و اختلاف کی جنگوں کے حوالے سے یاد کیا جاتا ہے۔ پھر ایسے جھوٹے اور بغض کے مارے راویوں کو ان کی کردار کشی کی اجازت دے دی جاتی ہے، جن کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ جھوٹی روایتوں کے کارخانے چلاتے تھے۔

رومیوں سے مجبوراً کی گئی صلح کا خاتمہ:

فتنے کے دور نے مسلمانوں کی قوت منتشر کر دی تھی، طبیعتیں رنجور تھیں اور ہمتیں مضمحل۔ رومیوں نے اس موقع کا فائدہ اٹھایا اور اناضول میں اپنے فوجی وجود کو کافی مضبوط کر لیا، یہاں تک کہ خطرہ تھا کہ شام کا آخری باندھ نہ ٹوٹ جائے، جو رومیوں سے عرب اور مسلم ممالک کو بچاتا تھا۔ خلیفہ بننے کے بعد ۴۱ھ میں حضرت معاویہ نے رومیوں سے کچھ مدت کے لیے سالانہ ایک لاکھ دینار پر صلح کر لی، تاکہ امور مملکت کو پھر سے منظم کر سکیں۔ معاہدے کے مطابق رومیوں کے پاس کچھ مسلم قیدی رہن رکھے گئے اور مسلمانوں کے پاس کچھ رومی قیدی رکھے گئے۔ رومیوں نے مسلم قیدیوں کو مار ڈالا، مگر حضرت معاویہؓ کے دل نے برداشت نہ کیا کہ اس کے بدلے میں رومیوں کو قتل کیا جائے۔ انہوں نے ان سب کو رہا کر دیا، البتہ اب معاہدہ باقی نہیں رہا تھا۔ اس مدت میں حضرت معاویہ اپنی افواج کو ازسرنو منظم کر چکے تھے اور پھر جہاد جاری ہوا۔[1]

---

[1] فتوح البلدان: ۱۵۹، تاریخ یعقوبی: ۲/ ۲۱۷۔

جراجمہ کی بغاوتیں:

شام کے شمال میں جزیرہ نما اناضول (Anatolia) جس کو ایشیائے کوچک بھی کہتے ہیں اور جو موجودہ ترکی کا بڑا حصہ ہے، یہاں یورپ اور ایشیا ملتے ہیں۔ یہ علاقہ بیزنطینی رومن سلطنت کا اہم علاقہ تھا۔ اس کے اور شام کے درمیان جبال امانوس [۱] اور مغرب میں جبال طوروس (Taurus) کا سلسلہ حدفاصل اور روم کی طرف جہادی پیش قدمیوں میں بڑی رکاوٹ تھا۔ امانوس کے پہاڑی سلسلوں پر ایک قوم آباد تھی جس کو ان کے شہر جرجومہ کی طرف منسوب کر کے جراجمہ کہا جاتا تھا [۲]۔

اس قوم کی اصل نامعلوم ہے، ان میں قبطیوں کی بھی ایک بڑی تعداد شامل ہوگئی تھی، وہ رواد یف کہلاتے تھے۔ جرجومی اور ان کے قبطی ساتھی مذہبی طور پر عیسائی تھے اور شام میں رومیوں کے سیاسی و فوجی مرکز انطاکیہ کے تحت رومیوں کے لیے جنگوؤں کے طور پر کام کرتے تھے [۳]۔ ان کی آبادیاں امانوس کے پہاڑی دروں اور ناکوں پر رومیوں کے لیے دفاع کی اہم خدمت انجام دیتی تھیں۔ رومی ان کو ''فولادی دیوار'' کہا کرتے تھے [۴]۔ شام کی فتح کے وقت انھوں نے مسلمانوں سے صلح کی تھی اور معاہدہ میں طے ہوا تھا کہ ان کی آزادی برقرار رہے گی، لیکن وہ مسلمانوں کے حلیف بنیں گے اور ان کا ساتھ دیں گے۔ خلافت اسلامیہ کے انتشار کے دور میں رومیوں نے ان کو مالی رشوت دے کر پھر سے اپنے ساتھ کر لیا۔ پھر انھوں نے شورش پیدا کرنی شروع کی اور حملے کرنے لگے۔ شام کے شمال مشرق سے جنوب مغرب تک لبنان کا پہاڑی سلسلہ ہے، جو شام کے مغربی ساحل اور اندرونی علاقوں کے درمیان واقع ہے۔ جرجومی اپنے پہاڑی علاقوں سے اس پر آ کر اس کے ناکوں اور راستوں پر مورچے بٹھا لیتے تھے۔ شام کے مغربی ساحل پر رومیوں کے بحری حملے ہوتے تو اسلامی افواج کے لیے ساحل تک پہونچنا مشکل ہوتا تھا۔

۴۱ھ میں حضرت معاویہ نے روم پر حملہ کے لیے ایک فوج ارسال کی تھی۔ اس نے پایا کہ امانوس پر جراجمہ نے پہاڑی درون اور ناکوں کو بند کر رکھا ہے۔ مسلمان وہاں پہونچے تو جراجمہ نے ان پر حملے کیے، غرض یہ مہم واپسی پر مجبور ہوگئی۔ اس کے بعد جراجمہ پر حملوں کے لیے متعدد مہمات گئیں، وہ بار بار معاہدہ کرتے اور توڑتے رہتے تھے۔ بلاذری کہتے ہیں: جرجومی اسلامی حکومت کے کبھی تابع ہو جاتے، کبھی بغاوت کرتے اور

۱۔ عرب اس کو جبل اللکام کہتے ہیں۔ اس وقت یہ ترکی کے ''ہاتای'' صوبے کے جنوب میں واقع ہے۔

۲۔ مغربی مآخذ میں ان کو Mardite کہتے ہیں۔ ملاحظہ ہو: برٹانیکا، مقالہ Mardite۔ غالباً اسی نام کی وجہ سے عرب ان کو مَرَدَۃ بھی کہتے تھے۔

۳۔ فتوح البلدان: ۱۶۰۔

۴۔ Bury: A History of the later Roman Empire:317.

رومیوں سے سلسلہ جنبانی رکھتے''۔ آخر ۴۹ھ میں حضرت معاویہ نے ان کو قابو میں کرنے کے لیے اور اس پریشان کن مسئلے کے مستقل حل کے لیے ایک نئی حکمت عملی بنائی۔ کسروی دور میں پنجاب وسندھ کے جاٹوں کو فوجی خدمات کے لیے بصرہ اور مشرقی عراق وفارس میں لاکر بسایا گیا تھا۔ ان کی آبادیاں ایران وعراق میں قدیم دور سے آباد رہی ہیں۔ حضرت ابوموسی اشعری نے بھی ان کی ایک تعداد کو لاکر بصرہ میں آباد کیا اور ان کے ذمہ کچھ دفاعی خدمات کی تھیں۔ یہ جسمانی طور پر تنومند اور باہمت وجاں باز مشہور تھے۔ ان کے علاوہ سیابجہ نامی ایک اور قوم انہی صفات کی وہاں پائی جاتی تھی ا۔ حضرت معاویہؓ نے ان دونوں قوموں کی کثیر تعداد کو ان علاقوں خصوصا اس کے فوجی صدر مقام انطاکیہ میں لے جاکر آباد کیا۔ اس کے بعد مسلم فوجوں کے لیے جبال امانوس کے دروں سے گذر کر رومیوں پر حملوں کی راہ کھل گئی ۲۔

آرمینیہ کی دوبارہ فتح:

شہادت عثمانی کے بعد انتشار وخانہ جنگی کے دور میں حضرت معاویہ کو اپنی تمام افواج کو شام بلانا پڑا تھا۔ اس سلسلے میں آرمینیہ بھی خالی ہو گیا اور رومیوں نے دوبارہ اس پر قبضہ کرلیا۔ مگر ان کے آتے ہی آرمینیہ میں اسی بدنظمی اور ظلم کا دور دورہ ہو گیا، جو ان کے پہلے دور میں تھا۔ عوام عاجز آگئے۔ خود رومی فوج میں اختلافات تھے۔ ۴۸ھ میں آرمینیہ میں رومی فوج کا قائد اعظم ساپور (SAPOR) باغی ہو گیا، اس نے حضرت معاویہ کے پاس اپنا نمائندہ بھیجا کہ آپ ہماری مدد کریں، ہم رومیوں کے خلاف آپ کا ساتھ دیں گے۔ بادشاہ روم کو اپنے جنرل کی اس سازش کا علم ہوا تو اس نے بھی ایک قاصد دمشق بھیج کر حضرت معاویہ کو اس سے روکنے کی کوشش کی۔ حضرت معاویہ نے دونوں قاصدوں کو کوئی مثبت جواب نہیں دیا۔ اور ارمن عوام کی مقامی قیادت سے رابطہ کرنے کے لیے مسلمانوں کے نمائندے بھیجے کہ ان کو اسلامی حکومت کو تسلیم کرنے کی دعوت دیں۔ اور وعدہ کریں کہ ہم تم کو رومیوں کے ظلم سے نجات دلائیں گے۔ ان لوگوں نے اس پیشکش کا استقبال کیا۔ اب حضرت معاویہ نے شام سے فوجیں روانہ کیں، جنہوں نے سہولت سے رومیوں کو پسپا کر دیا۔

حضرت معاویہ نے آرمینیہ کو نیم خودمختار ریاست کا درجہ اور Self Rule کا اختیار دے دیا۔ آرمینیہ میں دو قبیلوں ما میلونین (Mamiloniuns) اور باگراٹونین (Bagratoniuns) کو قدیم دور سے سیاسی

ا۔ یہ بھی کسری کے لیے فوجی خدمات انجام دیتے تھے۔ حضرت ابوموسی نے ان کو بھی بصرہ میں بسایا تھا۔ البحرین فی صدر الاسلام ص: ۶۲۔

۲۔ فتوح البلدان: ۱۵۹۔ ۱۶۲۔ نیز الامویون والبیزنطیون صفحہ ۱۰۹۔ ۱۱۲۔

قوت اور دبدبہ حاصل تھا۔حضرت معاویہ نے انہی کے سرداروں کو حاکم طے کر دیا اور ان کے اوپر اپنا ایک نگراں گورنر مقرر کر دیا۔اس حکمت عملی سے آرمینیہ پورے اموی دور حکومت میں پرسکون رہا۔اور بیزنطنیوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کو ایک اہم ملک کا تعاون حاصل رہا[۱]۔

صوائف وشواتی کا نظام

اور اس کے اہداف:

رومیوں کا سرحدی دفاع کا نظام نہایت ترقی یافتہ تھا۔انہوں نے امانوس اور ٹارس کے پہاڑی سلسلوں پر بے شمار قلعے اور فوجی تنصیبات قائم کر رکھی تھیں۔ اسلامی ممالک کے دفاع اور رومی مملکت میں اقدامی کارروائیوں کے لیے ان پہاڑی سلسلوں پر غلبہ قائم کرنا ضروری تھا۔جس کے لیے حضرت معاویہ نے اپنی گورنر شپ کے دور میں صوائف وشوانی کا نظام قائم کیا تھا۔بحیثیت خلیفہ ذمہ داریاں سنبھالنے کے بعد اس نظام کو پھر سے جاری فرمایا۔ ہر سال کی گرمیوں اور سردیوں میں ان علاقوں میں مہمات روانہ کی جاتیں۔جن میں حضرت معاویہ اپنے بہترین جرنیلوں کو بھیجا کرتے تھے[۲]۔

یہ فوجیں رومیوں کے قلعوں اور فوجی تنصیبات پر حملے کرتیں اور تزویراتی (Strategic) طور سے اہم مقامات پر اپنی ٹکڑیاں متعین کرتی تھیں۔ان مہمات کا مقصد یہ بھی ہوتا تھا کہ رومی افواج کی نقل وحرکت پر نظر رکھی جائے اور ان کی تیاریوں کا اندازہ کیا جاتا رہے۔ نیز سرحدی قبائل اور آبادیوں پر حکومت کے رعب وقبضہ کا اظہار بھی مقصود تھا، جو ان کو تابع اور وفادار رکھنے کے لیے ضروری تھا۔ساتھ ہی ان فوجی دستوں کی آمد ورفت سے ایک نئے اور اجنبی ملک کے جغرافیائی اور Demographic حالات سے آگاہی ملتی تھی، یہ مہمات رومی علاقوں کے اندر کافی آگے تک جایا کرتی تھیں اور دارالحکومت قسطنطنیہ پر حملے کی منصوبہ بندی کے لیے ضروری معلومات بھی حاصل کرتی تھیں[۳]۔

صوائف کے سلسلے میں حضرت خالد سیف اللہؓ کے صاحبزادے عبدالرحمن حضرت معاویہؓ کے اہم سپہ سالار تھے اور اپنے والد کے نقش قدم پر تھے۔ ۴۴ھ میں انہوں نے رومیوں کے علاقوں (اناضول) پر ایک زبردست حملہ کیا، یہاں تک کہ عموریہ اور انقرہ تک پہنچے اور مغرب میں مسلم لشکر ازمیر تک کو، جو بحرایجہ کے ساحل پر

---

[۱] الامویون والبیزنطیون:۱۱۸۔۱۱۹۔

[۲] طبری کے یہاں تقریباً ہر سال ایک یا ایک سے زائد صافیہ اور شاتیہ کا تذکرہ ملتا ہے۔

[۳] الامویون والبیزنطیون:۱۰۵۔۱۰۸۔

ہے، روند کر آیا[1]۔ عبدالرحمان رومیوں کے لڑاکوں میں سے ایک بڑی تعداد کو قید کر کے لائے اور ان کے کئی قلعے اور تنصیبات برباد کر دیں۔ اگلے سال ۴۵ھ میں حضرت عبدالرحمن پھر ایک لشکر کے ساتھ تشریف لے گئے اور پورا سردیوں کا موسم وہیں گزارا۔ اس حملے میں ایک بہت اہم کامیابی حاصل ہوئی۔ پانچ ہزار کی تعداد میں سلاف[2] نے رومیوں کو چھوڑ کر مسلمانوں کا ساتھ دیا اور مسلم لشکر کے ساتھ آ گئے۔ حضرت معاویہؓ نے ان کو شمالی شام (غالباً انطاکیہ) کے اطراف میں بسایا[3]۔ ان سے باقاعدہ فوجی خدمات لی گئیں تھیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بظاہر انہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔

قلعوں اور تنصیبات کا قیام:

حضرت معاویہؓ اپنی عبقری ذہانت اور حکومت وانتظام کی صلاحیت سے خلافت اسلامیہ کو نہایت ترقی دیے جاتے تھے۔ رومیوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کے دینی جذبہ اور شوق جہاد کے بعد جو دوسری چیز وسیلۂ ظفر بن رہی تھی، وہ حضرت معاویہ کی ترقی یافتہ تدبیریں تھیں۔ شمالی علاقوں میں سب سے اہم مرکز انطاکیہ تھا، جو پہلے شام میں رومیوں کا مرکز تھا۔ حضرت معاویہ نے وہاں مسلمانوں کو لے جا کر بسایا اور ان کو جاگیریں دیں، اور فوجی چھاؤنی قائم کی۔ اسکندرون اور طرسوس کے درمیان کئی نئے شہر بسائے۔ شمال مشرق میں ملطیہ، شمشاط، مصیصیہ سے لے کر مرعش اور حدث میں نئے قلعے تعمیر کرائے۔ یہ تمام علاقے آرمینیہ میں فوجی اعتبار سے اہم اسٹریٹجک مقامات تھے۔ اسی طرح وہاں زبطرہ بھی رومیوں کا اہم قلعہ تھا۔ حضرت معاویہ نے خود فوج کشی کر کے فتح فرمایا اور اس کی مرمت کروائی۔ اور وہاں فوجیں متعین کیں۔ یہ سب علاقے فوجی راستوں اور پہاڑی دروں پر آباد اور دفاعی نقطہ نظر سے اہم مقامات تھے۔

ایشیائے کوچک میں ایک اہم پہاڑی مقام کمخ[4] بار بار حملوں کے بعد بھی فتح نہیں ہوتا تھا۔ آخر کار ۵۹ھ میں حضرت معاویہ نے صحابی رسول اور اپنے اہم کمانڈر حضرت حبیب بن مسلمہؓ کی قیادت میں ایک فوج بھیجی۔ مسلمان نہایت بے جگری سے لڑے۔ مگر قلعہ فتح نہ ہوتا تھا، آخر عمیر بن الحباب سلمی اپنے دستہ کے ساتھ

---

[1] الحدود الاسلامیۃ البیزنطیۃ: ۲/ ۴۲۔

[2] یہ یورپ کی ایک نسل ہے، جس کو عرب صقالبہ بھی کہتے ہیں۔ یورپ سے مشرقی ایشیا تک پھیلے ہوئے قبائل تھے، عموماً عیسائی مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ ملاحظہ ہو برٹانیکا، مقالہ: Slav۔

[3] طبری: ۵/ ۲۱۲۔ نیز الامویون، ص ۱۰۶۔

[4] یا کیماخ، موجودہ ترکی میں ارزینجان صوبہ کا شہر ہے۔ یہ رومیوں کا اہم فوجی مرکز اور قلعہ تھا۔ اس کو فتح کرنا آرمینیہ کی حفاظت کے لیے بہت ضروری تھا۔

جان بکف ہو کر شہر پناہ پر چڑھ گئے۔ان کی شمشیر زنی سے رومیوں کے ہوش اڑ گئے اور قلعہ فتح ہو گیا[1]۔

بحری جہاد اور اس کے انتظامات:

خلیفہ بننے کے بعد حضرت معاویہؓ کی عبقری صلاحیتوں کا اور زیادہ اظہار ہوا۔قدرت نے انہیں گویا حکومت و جہاد کیلئے ہی بنایا تھا۔ایک طرف تو ان کا وہ شہرۂ آفاق حلم ورفق اور مثل حریر نرم مزاجی تھی، جس سے اپنے پرائے سب مسحور ہوتے تھے، دوسری طرف ان کی اولوالعزمی اور فولادی ارادے ایک نوخیز اسلامی خلافت کو قدیم وعظیم رومی سلطنت پر غالب کیے دے رہی تھی۔ بری حملوں سے اگرچہ رومی درماندہ وخستہ ہو گئے تھے، لیکن مسلمان قسطنطنیہ کے سقوط کو اپنا ہدف بنا چکے تھے۔جس میں سب سے بڑی رکاوٹ رومیوں کی عظیم بحری افواج تھیں۔یہی بحریہ اُس بحر متوسط پر ان کو متصرف بناتی تھی جو اس وقت مشرق ومغرب کی بحری تجارت کا واحد راستہ اور رومیوں کی اقتصادی طاقت کا سب سے بڑا سرچشمہ تھا۔اس کے علاوہ رومی اپنی بحریہ سے مصر اور شام کے مغربی شہروں پر حملہ کرتے رہتے تھے اور نقصان پہنچاتے رہتے تھے۔اپنی مقبوضات کو دوبارہ واپس لینے کی امنگوں کو ان کی بحری افواج سرد نہیں ہونے دیتی تھیں۔

بلاذری کی بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ ۴۹ھ میں رومیوں نے بحری بیڑے سے شام پر ایک بڑا حملہ کیا۔اس حملے نے اسلامی خلافت کو سنگین بحری خطرے سے آگاہ کیا۔جس کے بعد حضرت معاویہ نے بحریہ کی تقویت وتوسیع پر از سر نو توجہ کی۔

بحری ترکتازیاں:

حضرت معاویہ نے صوائف وشواتی کے طرز پر بحری ترکتازیوں کا سلسلہ بھی مسلسل جاری کیا۔بحری غزوات کے امراء میں حضرت عقبہ بن عامر جہنیؓ، حضرت فضالہ بن عبید ازدیؓ جیسے صحابہ کمانڈر ہوتے تھے۔ان کے علاوہ حضرت بسر بن ارطاۃؓ، حضرت جنادہ بن امیہ ازدیؓ، مالک بن ھبیرہ سکونیؓ وغیرہ قائد ہوا کرتے تھے۔

قسطنطنیہ پر پہلا حملہ:

قسطنطنیہ کے جہاد سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بشارتوں کی وجہ سے، صحابۂ کرام کو قسطنطنیہ کی فتح کا غیر معمولی انتظار اور اس کی طرف جہاد کا بہت شوق تھا۔اس سے متعلق احادیث مسلمانوں کے درمیان شوق وجذبہ کے ساتھ سنائی جاتی تھیں۔حضرت ام حرام بنت ملحانؓ شام میں مقیم تھیں اور یہ حدیث سنایا کرتی تھیں کہ رسول

---

[1] الامویون والبیزنطنیون: ۱۱۰۔فتوح البلدان: ۱۸۴۔

اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے فرمایا تھا کہ قسطنطنیہ پر مسلمانوں کی جو پہلی جماعت حملہ کرے گی، ان کی مغفرت کا وعدہ ہے (بخاری: ۲۴۲۹)۔ حضرت معاویہ کی عقابی نگاہ فتح قسطنطنیہ پر مرکوز تھی۔ ۴۷ھ کی سردیوں میں حضرت مالک بن ھبیرہ سکونی ؓ کی قیادت میں ایک فوج روانہ کی۔ جو رومیوں کی سرزمین میں دشمن ملک کے حالات اور فوجی انتظامات کا جائزہ لے کر آئی (طبری: ۲۲۹/۵)۔ ۴۷ھ ہی میں ایک دوسری مہم روانہ ہوئی۔ امیر البحر عبداللہ بن قیس فزاری خود تو بری راستے سے اور مالک بن ھبیرہ اپنی افواج کے ساتھ بحری مہم لے کے گئے۔ اس بحری فوج نے پورا سردیوں کا موسم جزائر ایجہ میں گذارا۔ اس طرح حضرت معاویہ ؓ قسطنطنیہ کی اسٹریٹجک حالات کی گہری اور تفصیلی معلومات جمع کر رہے تھے۔ جن میں اس کے قلعوں اور تنصیبات کی پوری تفصیلات تھیں، شہر پناہ میں کہاں کہاں کمزوریاں اور رخنے ہیں اس کو مسلمان جانتے تھے۔ ڈاکٹر ابراہیم عدوی لکھتے ہیں: صوائف وشواتی کے مسلسل حملوں کی اس حکمت عملی سے مسلمانوں کو قسطنطنیہ کے حالات، اس کی شہر پناہ اور قلعوں اور ناکوں کی دقیق تفصیلات کا پورا پورا علم تھا۔ قدیم اسلامی مآخذ میں اس شہر کی جو اسٹریٹجک معلومات ملتی ہیں وہ بالکل صحیح اور دقیق تفصیلات پر مشتمل ہیں (الامویون: ۱۵۲)۔

بالآخر ۴۹ھ میں قسطنطنیہ پر حملے کا فیصلہ کیا گیا۔ حضرت معاویہ نے اس حملے کی ایسی زبردست تیاری کی تھی کہ اس سے پہلے اس کی مثال نہیں ملتی۔ مختلف علاقوں سے مسلم افواج کو بری و بحری راستوں سے عظیم دارالحکومت کی طرف بھیجا گیا۔ سب سے پہلے حضرت فضالہ بن عبید شام کی فوج لے کر بحری راستے سے روانہ ہوئے۔ اسلامی افواج نے قسطنطنیہ کے قریب خلقدونیہ (Chalcedon) میں پڑاؤ ڈالا۔ یہ ایشیائے کوچک میں رومیوں کا ایک اڈا تھا۔ اسی جگہ استانبول کا ایشیائی حصہ آباد ہے؟ اب قسطنطنیہ اور مسلمانوں کے درمیان بس آبنائے باسفورس تھی۔ باسفورس کی شدید سردی میں مسلمان فوجیں جمی رہیں اور حضرت معاویہ کی کمک کا انتظار کرتی رہیں۔

حضرت معاویہ نے خشکی کے راستے سے کئی فوجیں روانہ کی تھیں۔ ایک اہم سپہ سالار حضرت سفیان بن عوف ؓ ازدی تھے۔ عہد عمری سے رومیوں کے خلاف جہاد میں اہم خدمات انجام دیتے آرہے تھے۔ ان کے تحت گھوڑ سواروں کی ایک نہایت منتخب فوج تھی، جس میں شام کی تمام فوجی یونٹوں سے نہایت ممتاز سورما لئے گئے تھے، وہ اپنی فوج کے ساتھ بری راستوں سے (رومیوں کے مشرقی علاقوں سے) گزرتے ہوئے گئے۔

ادھر حضرت معاویہ ؓ دارالحکومت دمشق (جو شمال مغرب کی افواج کا صدر مقام تھا) میں ایک زبردست بحری لشکر ترتیب دے رہے تھے۔ چہار سو سے شوق جہاد میں لوگ آآ کر اس لشکر میں شریک ہوئے۔ خلیفہ اسلام نے خود اپنے بیٹے یزید کو اس کا امیر مقرر کیا۔ ایک فوج مدینہ سے بھی روانہ ہوئی جس کے امیر حضرت عبدالرحمن بن

خالد بن الولید تھے۔ یہ دمشق میں یزید کے لشکر کا حصہ بن گئے۔ (مستدرک حاکم: ۳۰۸۸)۔ قسطنطنیہ کی اہمیت کے پیش نظر اور اصلا رسول اللہ ﷺ کی بیان کردہ فضیلت وخوشخبری کی امید میں بہت سے صحابہ اور اولاد صحابہ بھی اس لشکر میں شامل ہوئے۔ جن میں حضرت عبداللہ بن قیس الفزاریؓ (تاریخ دمشق: ۱۱۹/۳۲) حضرت ابو ایوب انصاریؓ، عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن عباس، ریحانۂ رسول حضرت حسین بن علیؓ (تاریخ دمشق: ۱۱۱/۱۴) عبداللہ بن الزبیرؓ (طبری: ۲۳۲/۵) عوف بن مالک اشجعی (تاریخ دمشق: ۴۲/۴۷) محمود بن الربیعؓ (تاریخ دمشق: ۱۱۲/۵۷) اور منذر بن زبیرؓ (تاریخ الاسلام: ۲۵۶/۵) شامل تھے۔

حضرت معاویہ نے مصر کی بحریہ کو بھی متحرک کیا۔ صحابی رسول عقبہ بن عامر جہنیؓ کی امارت میں مصری بیڑہ روانہ ہوا (مستدرک حاکم: ۳۰۸۸ وطبری: ۲۳۱/۵)۔

عبداللہ بن قیس الفزاری اسلامی بحریہ کے کمانڈر جنرل تھے، اسی مناسبت سے ان کو ''غازیۃ السفن'' کا لقب ملا تھا۔ مسلمانوں نے رومیوں کی سرزمین میں جو کثیر تعداد میں مہمات بھیجی تھیں انہوں نے رومیوں کے فن جنگ اور اسلحہ سے متعلق اہم معلومات حاصل کر لی تھیں۔ ان میں ایک خاص چیز یہ تھی کہ رومی بحری کشتیوں پر کچھ تیز جلنے والا کیمیکل پھینکتے تھے جس سے کشتیوں میں آگ لگ جاتی تھی۔ حضرت معاویہ کے عہد میں مسلمانوں نے بھی ایسی آتش بار کشتیاں تیار کر لی تھیں جو جلتا ہوا مادہ دشمن کی کشتیوں اور ساحلی مقامات پر پھینکتی تھیں۔ ان کو حرقات یا محرقات کہتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن قیس کی جماعت یہ آتش بار کشتیاں لے کر روانہ ہوئی۔ رومی کشتیوں سے شعلہ زن مقابلہ ہو۔ اسلامی کشتیوں نے رومیوں کو شررفشانی میں شکست دے دی اور آخر یزید کے لشکر سے جا کر مل گئیں (تاریخ دمشق: ۱۱۹/۳۲)۔

یہ تمام بری و بحری افواج خلقدونیہ کے مقام پر جمع ہوئیں تمام افواج کا سپہ سالار عام یزید کو قرار دیا گیا تھا۔ بری افواج بھی کشتیوں پر سوار ہو گئیں۔ یہاں سے باسفورس پار کر کے افواج نے قسطنطنیہ کے شہر پناہ کے باہر محاصرہ شروع کیا۔ چھ مہینوں تک محاصرہ جاری رہا۔ کچھ جھڑپیں بھی ہوئیں۔ آخر باسفورس کو کشتیوں سے پار کیا۔ اور دارالسلطنت کے سب سے مرکزی دروازے باب الذہب پر حملہ آور ہوئے۔ رومی ڈر گئے۔ کہنے لگے، ہماری کتابوں کی رو سے ایک دن یہ شہر تم فتح کر ہی لوگے، مگر ابھی وہ وقت آیا نہیں ہے (تاریخ دمشق: ۳۵۰/۲۱)۔ قسطنطنیہ میں عیسائی عربوں کی ایک خاص تعداد تھی۔ یزید نے ان سے سلسلہ جنبانی کر کے ان کو اپنی طرف ملانے کی بھی کوشش کی (الامویون: ۱۵۷)۔

حضرت ابو ایوب انصاریؓ اس وقت بہت بوڑھے ہو چکے تھے، مگر شوق جہاد شباب پہ تھا۔ راستے میں

بیمار ہوئے، امیر لشکر یزید بن معاویہ عیادت کے لیے حاضر ہوا۔ تو انہوں نے وصیت کی کہ میرا جنازہ دشمن کی زمین میں جتنے اندر لے سکو لے جا کر دفن کرنا۔ نیز یہ بھی وصیت کی کہ نماز جنازہ یزید پڑھائے۔ وفات کے بعد ان کا جنازہ قسطنطنیہ تک لے جایا گیا۔ یزید نے وصیت کے مطابق نماز جنازہ پڑھائی اور شہر پناہ کے پاس قبر بنی۔ (البدایہ والنہایہ: ۸/ ۶۴)۔

اس دوران رومیوں نے شام پر بحری حملہ کر دیا۔ یہ قسطنطنیہ پر حملے کا جواب تھا۔ رومی کوئی علاقہ فتح نہیں کر سکے اور نہ مسلمانوں کی کسی بحری اڈے کو نقصان پہنچا سکے۔ لیکن حضرت معاویہ کو احساس ہوا کہ مسلمانوں کو مزید جہازوں اور بحری آلات جنگ کی ضرورت ہے۔ اب تک بحریہ کا تمام ساز و سامان اسکندریہ کے کارخانے میں بنتا تھا۔ حضرت معاویہؓ نے اردن کے ساحل پر عکا نامی مقام میں جنگی کشتیاں بنانے کا ایک بڑا کارخانہ بنایا (بلاذری: ۱۲۰)۔

افواج کی واپسی:

آثار تھے کہ مسلمان قسطنطنیہ فتح کر کے قیصر کا تاج گرا دیں گے۔ مگر موسم کی سختیوں اور تیز رفتار شمالی ہواؤں نے محاصرہ مشکل کر دیا۔ پھر قسطنطنیہ کی قلعہ بندی تاریخ کی نادر مثال تھی۔ رومیوں نے اسے صدیوں کی کوششوں سے ایک نہایت محفوظ شہر بنایا تھا۔ شہر پناہ کے طور پر دو دیواریں تھیں۔ اندرونی دیوار ۱۴ فٹ موٹی پتھر کی مضبوط بنی، بلند و بالا، گویا ایک پہاڑ کی مانند کھڑی تھی۔ اس کے تقریباً ۵۰ فٹ بعد باہری دیوار بھی کہیں سے دو فٹ اور کہیں سے ۶ فٹ موٹی تھی۔ دونوں دیواروں پر پچاس پچاس میٹر کی دوری پر بہت اونچے برج تھے، جن میں اسلحہ کا ذخیرہ اور تیر انداز رہا کرتے تھے۔ اس کے باہر ۱۶ فٹ چوڑی گہری نہر کھودی گئی تھی جس میں دریا کا پانی آتا تھا۔ یہی نہیں شہر کے اُس جانب جو بحر مرمرہ اور (Golden Horn) کی جانب ہے، سمندر کے اندر کی طرف بھی پتھر کی دیوار بنا کر شہر کو محفوظ کیا گیا تھا۔ (الامیون والبیزنطیون: ۱۴۶۔ ۱۴۷)

بہر حال ایک سال کے طویل محاصرے کے بعد مسلمانوں نے محاصرہ اٹھا لیا۔ اس محاصرے کے ذریعے حضرت معاویہ نے اپنی اولوالعزمی سے سپر پاور کو اقدام سے دفاع کے موقف میں دھکیل دیا۔ اب وہ شام اور مصر وافریقہ کے اپنے مقبوضات کو مسلمانوں سے واپس لینے کے بجائے ایشیائے کوچک اور قسطنطنیہ کی حفاظت میں لگے رہنے کو ہی قرین حکمت سمجھنے لگے آگے (الامویون: ۱۵۷)۔

فتح قسطنطنیہ کا دوسرا منصوبہ:

نو خیز اسلامی مملکت اور سلطنت بیزنطہ کا بقائے باہم مشکل تھا۔ مسلمانوں نے ان کے قبضہ سے مصر سے

تیونس تک افریقہ کے وسیع وعریض ممالک کے علاوہ شام اور آرمینیہ جیسے اہم علاقے آزاد کرا لیے تھے۔ ان ممالک کے دہقان ہی، اپنے کھیت کھلیانوں سے، وہ اقتصادی خون فراہم کرتے تھے، جو رومن امپائر کے رخسار کو سرخی بخشتا تھا۔ مسلمانوں کی ترکتازیوں سے عظیم بیزنطینی سلطنت سکڑ کر اب نصف سے بھی کم رہ گئی تھی۔ اگر قیصر سمجھتا تھا کہ اپنی عظمت رفتہ کی بازیابی کے لیے شام ومصر پر دوبارہ قبضہ ضروری ہے، تو حضرت معاویہؓ بھی جانتے تھے کہ ان ممالک میں اسلام کی بقاو زندگی کے لیے رومیوں سے لگا تار نبرد آزمائی لازمی ہے۔ ان کو اس کا یقینی علم تھا کہ اِس مقصد کے لیے رومیوں کو اقدامی کارروائیوں کے ذریعہ اپنی زمینوں میں ہی محصور رکھنا لازم ہے۔ اس پالیسی کا اظہار ان کی وصیت سے ہوتا ہے کہ رومیوں کا قافیہ تنگ کیے رہنا۔

قسطنطنیہ سے اسلامی لشکر واپس آئے، تو خلیفۂ اسلام اگلے حملے کی تیاریاں شروع کر چکا تھا۔ اس مرتبہ ایک بڑے اور لمبے محاصرے کا منصوبہ بنایا گیا۔

بحر متوسط کے اہم جزائر کی فتح:

اس کے لیے ایک لمبی منصوبہ بندی کی گئی۔ جس کا اہم حصہ یہ تھا کہ بحر متوسط کے اہم جزائر پر قبضہ کر کے وہاں اپنے فوجی مراکز قائم کیے جائیں۔ ساحل شام واردن کے قریبی جزائر حضرت معاویہ عہد عمری وعثمانی میں فتح کر چکے تھے۔ قبرص وغیرہ میں اسلامی افواج کے قیام کے ذریعے شام کی بحری قلعہ بندی کر لی گئی تھی۔ معرکہ ذات الصواری کی فتح کے ذریعہ حضرت معاویہؓ اور عبداللہ بن ابی السرحؓ کی افواج نے رومیوں کو اندازہ کرا دیا تھا کہ شام ومصر پر حملہ ان کے بحری بیڑوں کے لیے آسان نہیں۔

اب حضرت معاویہ نے بحر متوسط کے ان چند جزیروں (روڈس، اروداد، کریت اور سسلی) کو فتح کرنے کا منصوبہ بنایا جو ساحل شام سے دور، بحر ایجہ کے دہانے پر واقع اور رومی سلطنت کے بحری دفاع کے اہم مراکز تھے۔ یہ جزائر قسطنطنیہ کی فتح کے لیے تزویراتی (Strategic) اہمیت رکھتے تھے۔ پہلے عرب بحری جنگ اور اس کے تزویراتی پہلوؤں سے تو کجا آشنا ہوتے، وہ تو بحری سفر کو بھی زیادہ نہیں جانتے تھے۔ اس منصوبہ بندی سے حضرت معاویہ کی غیر معمولی مدبرانہ جنگی حکمت عملی اور فوجی مہارت وزیرکی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اور اس نتیجہ تک پہنچنے میں دیر نہیں لگتی کہ عظیم رومی سلطنت کے مقابلے میں اسلام کے دفاع کے لیے حضرت معاویہؓ کی شخصیت اللہ تعالی کا ایک انتخاب تھی۔

ان میں اہم ترین مقام جزیرۂ روڈس (Rhodes) تھا۔ یہ بحر ایجہ (Aegean Sea) کے دہانے

پر واقع ترکی کے جنوب مغربی ساحل سے صرف ۸۱ کلومیٹر دور ایک بڑا جزیرہ ہے۔ روڈس رومیوں کی بحریہ کا ایک اہم مرکز تھا۔ انھوں نے یہاں بہت بڑا بحری اڈہ بنایا تھا، جس میں کثیر تعداد میں جنگی جہاز، اسلحہ اور افواج رہتی تھیں۔ اس کا جائے وقوع ایسا ہے کہ رومیوں کا ہر بحری بیڑہ شام ومصر ہی نہیں، کہیں بھی جانے کے لیے اس کے سامنے سے گزر کر ہی جاسکتا تھا۔ جنگی اہمیت یہ تھی کہ روڈس پر قبضہ بحر متوسط میں رومیوں کی ناکہ بندی کر سکتا تھا۔

مسلمان اس پر سالوں سے حملہ کر رہے تھے، ان میں ایک بڑا حملہ حضرت معاویہؓ نے سن ۴۷ھ میں حضرت عقبہ بن عامرؓ والی مصر سے کروایا تھا (الاصابہ: ۴/۴۲۹۔ ۴۳۰)۔ آخر ۵۲ھ یا ۵۳ھ میں حضرت جنادہ بن ابی امیہ الازدیؓ کی قیادت میں فتح ہوا۔ اور اسلامی افواج نے وہاں قیام کیا۔ حضرت معاویہ نے وہاں ایک نیا بڑا قلعہ بنوا کر بحری اڈہ ''رباط'' کا درجہ دیا۔ حضرت معاویہؓ ہر کچھ مدت بعد وہاں نئی فوجیں بھیجتے اور پرانی فوج واپس آتی۔ طبری لکھتے ہیں:

> روڈس پر مسلمانوں کے قبضے سے رومی سلطنت کے لیے صورت حال سخت مشکل ہوگئی تھی۔ وہ اب خوف میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اس طرح رومی سلطنت کے بالکل قریب مسلمانوں کا ایک اہم فوجی اڈہ بن گیا، جہاں سے مسلسل حملے جاری رہتے اور رومیوں کے فوجی اور تجارتی جہازوں کے لیے ناکہ بندی ہوتی (تاریخ: ۵/ ۲۸۸)۔

حضرت معاویہ صرف ایک حکمران یا فاتح ہی نہیں تھے، عام مسلمانوں اور افواج کی دینی تعلیم وتربیت ان کے نظام حکومت کا اہم پہلو تھا۔ یہ نو آباد جزیرہ اسلام کی دعوت وتعلیم کے مرکز سے بہت دور سمندر میں واقع تھا۔ اب یہاں فوجوں کا قیام ہوا، لہٰذا حضرت معاویہؓ نے عظیم تابعی عالم اور دینی شخصیت حضرت مجاہدؒ بن جبر کو بھیجا کہ ان کا وہاں قیام فضا کو اسلامی تعلیم وتربیت سے آباد کرے۔ سات سال تک یہاں مسلم افواج مقیم رہیں۔ حضرت معاویہؓ کی وفات کے بعد یزید نے ان کو واپس بلایا (فتوح البلدان: ۲۳۳)۔

جزیرۂ ارواد:

حضرت جنادہ نے، روڈس کے بعد، ۵۴ھ میں ایک اور اہم جزیرہ فتح کیا۔ مسلم تاریخی مآخذ اس کو ارواد کہتے ہیں، اور اس کے بارے میں بتاتے ہیں کہ یہ جزیرہ قسطنطنیہ کے قریب ہی (یعنی بحر مرمرہ میں) واقع ہے[۱]۔ جدید محققین کا خیال ہے کہ یہ وہی جزیرہ ہے جس کو رومی Cyzicus کہتے تھے، جو قسطنطنیہ کے قریب

۱۔ معجم البلدان: ۱/ ۱۶۲، فتوح البلدان: ۲۳۳۔

بحر مرمرہ میں واقع جزیرہ نما ہے ۱؎۔ اس پر مسلمانوں کے قبضہ اور وہاں رہ کر قسطنطنیہ پر حملوں کا تذکرہ بیزنطینی مؤرخ Theophanes نے کیا ہے ۲؎۔ موجودہ نقشہ میں یہ ترکی کے صوبہ Balikesir کا شہر Erdek کہلاتا ہے۔ حضرت معاویہؓ کی جنگی بالادستی اور بحر متوسط میں ان کے غلبہ کا اندازہ کیجئے کہ ان کی افواج بحر متوسط سے اس ایجہ (Agean Sea) میں داخل ہوتی ہیں، جس کے دونوں کناروں پر بیزنطینی سرزمین اور بحری اڈے تھے، وہ ان کے ساحلی مقامات کو فتح کرتی اور تنصیبات کو مسمار کرتی گھستی چلی جاتی ہیں۔ ایجہ کو پار کر کے وہ بحر مرمرہ میں قسطنطنیہ کے بالکل سامنے ارواد کو فتح کر کے اس کو اپنی بحریہ کا اڈہ بنا لیتی ہیں۔ جبکہ اس کے چاروں طرف صرف بیزنطینی علاقے ہیں، جہاں ان کی بری افواج اور بحری بیڑے بے شمار و انداز موجود ہیں۔

صقلیہ Sicily:

حضرت معاویہ کی اولوالعزمی بیزنطینی کی حکومت کے خاتمہ سے کم کسی چیز پر قانع نہیں تھی۔ ان کی بحریہ کی جولانیاں بحر متوسط پر مسلمانوں کا دبدبہ بڑھاتی جارہی تھیں۔ جس سے رومیوں کی فوجی طاقت میں کمزوری آتی جاتی تھی اور ان کی تجارتی سرگرمیاں محدود ہوتی جارہی تھیں۔ اسی سلسلے میں حضرت معاویہ نے یا سسلی پر، جس کو عرب صقلیہ کہتے ہیں، حملے کروائے۔ سسلی اٹلی کے بالکل دامن پر واقع ہے اور قسطنطنیہ کے بعد بیزنطینی سلطنت کا دوسرا سب سے بڑا فوجی و سیاسی مرکز تھا، سسلی کے لوگ باقاعدہ مسلمانوں سے فریاد بھی کر رہے تھے کہ بیزنطینیوں کے ظلم سے ان کی گلو خلاصی کرائیں ۳؎۔

سسلی کی اہمیت یہ تھی کہ یہ مرکز افریقی ممالک پر رومیوں کے قبضے کا ضامن تھا۔ یہاں سے شمال مغربی افریقہ کے ساحل قریب تھے۔ حضرت معاویہؓ کے دور میں مسلمانوں کے حملوں سے جب افریقی ممالک کو خطرہ پیدا ہوا، تو ۶۶۲ء (۴۲ھ) میں بادشاہ روم نے اپنا دارالحکومت سسلی منتقل کرنے کا فیصلہ کیا، تاکہ افریقہ کے شمال مغربی علاقوں پر قبضہ مستحکم کیا جاسکے۔ یہاں رہ کر اس نے براہ راست اپنی نگرانی میں فوجیں منظم کرنی شروع کیں ۴؎۔ اب سسلی پر حملہ کرنا ضروری ہوا۔ حضرت معاویہؓ نے سب سے پہلے افریقہ میں تعینات مشہور کمانڈر

۱؎ Cyzicus, ancient Greek town, located on the southern coast of the Sea of Marmara in what is now Balikesir. Brittanica.

۲؎ الحدود الاسلامیہ البیزنطیہ: ۲/۷۴۔ بحوث فی تاریخ الشام، محمد عدنان بخیت، محمد یونس العبادی: ۴۵۔ ط مکتبۃ المھتدین، عمان۔

۳؎ Les Premieres Invasions Arabes Dans L'Afrique Du Nord بحوالہ فتح العرب للمغرب۔

۴؎ Buri, History of The Later Roman Empire: 297.

حضرت معاویہ بن حدیج کندیؓ کو مامور کیا۔انہوں نے ۴۶ ہجری میں ۲۰۰ کشتیوں کی فوج سسلی کے لیے بھیجی ۱؎۔اس کے اگلے سال اس پر حملے کے لیے ایک شامی بیڑا روانہ کیا گیا جو سردی بھر سسلی کے ساحلوں پر ہی مقیم رہا۔پھر کچھ مدت بعد حضرت فضالہ بن عبیدؓ نے سسلی پر حملہ کیا۔ہمیں ان حملوں کے نتائج کا تو کوئی ریکارڈ تاریخی مآخذ میں نہیں مل سکا۔لیکن بظاہر اس میں مسلمانوں کو بڑی کامیابی ضرور ملی، اس لیے کہ فرماں روائے روم، اپنے منصوبے کے مطابق، سسلی سے افریقی ممالک پر کوئی بڑا حملہ نہیں کر سکا۔اس کے اس منصوبے کا ناکام ہونا یقیناً مسلمانوں کی بحری جولانیوں کا ہی اثر تھا۔

جزیرۂ کریٹ Crete:

بحر ایجہ کے سامنے بحر متوسط میں ایک اور اہم جزیرہ Crete ہے، جس کو عرب اقراطیۃ یا اقریطش کہتے تھے، حضرت معاویہ اس کی فتح کی تدبیریں کرتے رہے۔کریٹ یورپ کا ایک بڑا فوجی وسیاسی مرکز اور بیزنطینی سلطنت کا اہم بحری اڈہ تھا۔ ۵۴ھ میں روڈس کی فتح کے بعد اس پر حضرت جنادہ بن امیہؓ نے حملہ کیا (فتوح البلدان: ۲۳۳)۔اس کے ساحل پر اسلامی حکومت کا بڑا فوجی مرکز بنایا گیا۔جہاں مسلم افواج بحر متوسط میں گشت کے دوران قیام کرتی تھیں۔یہ بہت بڑی فتح تھی، کیونکہ کریٹ روڈس سے مغرب میں بحیرۂ ایجہ کے دہانے پر واقع ایک مستطیل جزیرہ تھا۔اس پر مسلمانوں کے قبضہ سے قسطنطنیہ کے محاصرہ میں بڑی مدد ملی۔ ۵۶ھ میں حضرت مالک بن عبداللہ خثعمیؓ نے (جو حضرت معاویہ کے اہم کمانڈروں میں سے ایک تھے) اپنے بحری لشکر کے ساتھ سردی کا موسم جزیرہ کریٹ پر گزارا، جس میں مصری اور شامی بحریہ کے ڈویژن شامل تھے۔

ارواد، روڈس، اور پھر سسلی اور کریٹ پر مسلم فوجوں کے قبضہ نے بیزنطینی حکومت کی بحری طاقت کی کمر توڑ دی۔ان جزیروں پر مسلم بحریہ کے مراکز کا مقصد رومیوں کی بحری طاقت کی حد بندی تھی۔اب یہ عظیم طاقت مسلمانوں کے ممالک پر ترچھی نگاہ ڈالنے کو بھی نہیں سوچ سکتی تھی۔

۵۴ھ تا ۶۰ھ، قسطنطنیہ کا سات سالہ محاصرہ:

حضرت معاویہؓ کے پے در پے بری و بحری حملوں نے رومیوں کی نینداڑا دی تھی۔گبن اور بیوری نے بتایا ہے کہ مسلمانوں کے حملوں سے بیزنطینی سلطنت اندرونی مسائل میں گرفتار ہوگئی تھی۔پے بہ پے تاختوں نے رومی افواج اور مقتدرہ میں انتشار پیدا کر دیا تھا ۲؎۔حضرت معاویہ کی سرگرم مجاہدانہ قیادت نے رومیوں کو اب اس سے

۱؎ البیان المغرب: ۱۸، فتوح البلدان: ۲۳۳۔

۲؎ A History of The Later Roman Empir 2/29.

تو مایوس کر ہی دیا تھا کہ وہ مسلمانوں سے آرمینیہ سے لے کر شام تک اور پھر سینا و مصر سے لے کر مراکش تک ممالک دوبارہ حاصل کر سکیں گے۔ بلکہ خود ان کے علاقۂ اناضول (ایشیاء کوچک) میں بھی مسلم بری افواج کا ایسا رعب قائم ہو گیا تھا کہ مسلمان جب چاہتے اس کو روندتے جاتے اور اپنے دفاعی اہداف حاصل کرتے تھے۔ رومی اتنے کمزور ہو گئے تھے کہ سال کے بڑے حصے میں مسلمان وہاں کارروائیاں کرتے رہتے تھے۔ سلطنت کو احساس ہو گیا تھا کہ فوج کی ازسرنو ترتیب و تنظیم کے بغیر جذبۂ جہاد سے سرشار اور نوخیز و جواں حوصلہ اسلامی افواج کا مقابلہ ممکن نہیں ہے۔ اس لیے قیصر نے اپنی افواج کی ازسرنو تقسیم و تنظیم کا کام شروع کیا ہوا تھا، جو (بقول ابراہیم عدوی کے) اس بدلتی ہوئی صورت حال کو مدنظر رکھتے ہوئے کیا جا رہا تھا کہ سلطنت عظمیٰ اپنے توسیع و عظمت کے دور سے گزر کر سمٹنے سکڑنے کے دور میں داخل ہو چکی ہے[۱]۔

مسلم بحری فوج کی حالیہ کامیابیوں خصوصا بحر ایجہ و مرمرہ کے جزائر پر اسلامی قبضے نے رومیوں کو اور پیچھے دھکیلا ہوا تھا۔ حضرت معاویہ کو اطلاع مل رہی تھی کہ رومی سیاسی گروہوں اور افواج کے کمانڈرس میں سخت اختلافات ہیں۔ اب انہوں نے قسطنطنیہ پر ایک زبردست حملے کا حکم دیا۔ تاریخ میں یہ سات سالہ جنگ یا (قسطنطنیہ کا) سات سالہ محاصرہ کہلاتا ہے۔ جس میں بحر متوسط اور مرمرہ کے جزائر خصوصا جزیرۂ کزیکوس (ارواد) اور روڈس کو مرکز بنا کر قسطنطنیہ کا محاصرہ کیا گیا۔

حیرت ناک بات یہ ہے کہ اس سات سالہ حملے کا تذکرہ اسلامی تاریخ کے مقابلہ قدیم بیزنطی تاریخوں نے زیادہ تفصیل سے کیا ہے۔ مغربی مآخذ میں اس کو ایک طویل مسلسل سات سالہ محاصرہ و جنگ کے طور پر ذکر کیا گیا ہے، جب کہ مسلم مورخین نے عموما اس کا ہر سال الگ شاتیہ یا صائفہ کے حملوں کے طور پر ذکر کیا ہے۔ ساتھ ہی اسلامی مآخذ اور مغربی مورخین اس پر متفق ہیں کہ ارواد (Cyzicus) اور روڈس میں مقیم اسلامی بری و بحری افواج لگاتار متحرک رہتیں اور محاصرے کے طور پر مستقل وہیں قیام پذیر رہتی تھیں۔

اس مسلسل جنگ کا آغاز سن ۵۳ ہجری سے ہوا۔ اوپر مذکور روڈس، سسلی اور کریٹ پر اسلامی افواج کا قبضہ اور سمندری ناکہ بندی دراصل ایک وسیع اسٹریٹجی کا حصہ تھے، جس کے ذریعہ یہ حصار قائم کیا گیا۔ سب سے پہلے حضرت معاویہؓ نے ۵۳ھ/ ۶۷۳ء میں اپنے مشہور کمانڈر عبدالرحمان بن خالد بن الولید کو اناضول (موجودہ ترکی) کے بری راستے سے روانہ کیا۔ ساتھ ہی ساڑھے تین لاکھ فوجیوں پر مشتمل ایک عظیم الشان بحری بیڑہ بھی روانہ ہوا۔ اس میں ۳۰۰ بڑے جنگی جہاز تھے۔ جن میں سے ہر ایک میں سنگ باری کرنے والی بڑی منجنیقوں،

---

[۱] الامویون والبیزنطیون: ۱۶۴۔

آتش بار ہتھیاروں اور بحری جنگ کے ساز وسامان کے علاوہ ایک ہزار فوجی ہوتے تھے۔ان کے علاوہ ۵۰۰ چھوٹی کشتیاں تھیں، جن میں ۱۰۰ فوجی ہوا کرتے تھے۔ بری فوجوں نے ساحلی راستہ اختیار کیا۔ایشیاء کوچک کے جنوب میں Lycia (موجودہ صوبہ انٹالیا) سے لے کر مغرب میں ارواد (Cyzicus) تک کے ساحلی مقامات کے لوگ اطاعت قبول کرتے گئے۔

موسم سرما آگا اور برفانی ہواؤں سے سمندری راستے مسدود ہونے لگے تو اسلامی لشکر (خطۂ اناطولیہ کے جنوب مشرق میں) قیلیقیہ Cilicia کے ساحل پر ۵۴ھ/ ۶۷۴ء کے اپریل تک لنگرانداز رہا۔اسی اثنا میں حضرت معاویہؓ نے ایک مزید بیڑہ تیار کر کے بھیجا جو یہیں ساتھ مل گیا۔اپریل میں موسم سازگار ہوتے ہی اسلامی بیڑہ بحرایجہ (Agean Sea) سے گزرتے ہوئے آبنائے دردنیل میں داخل ہوا۔رومی مقبوضات اس عظیم الشان فوج سے دہل گئیں۔ان کے سروں پر عبدالرحمان بن خالد کی بری فوج تھی، جو خلقدونیہ (Chalcidone) یعنی موجودہ استانبول پہنچ چکی تھی اور سمندر میں بحریہ کا لشکر جرار۔(الحدود الاسلامیۃ والبیز نطیۃ: ۲/۴۹)

ایک دور تھا کہ بحر متوسط کی مچھلیاں بھی رومیوں کی اجازت سے حرکت کرتی تھیں، مگر اب جب اسلامی افواج موجوں کو کوچیرتے ہوئے ان کے پایۂ تخت کے دہانے پر پہنچ رہی تھیں تو رومی کسی مزاحمت کی ہمت نہیں پاتے تھے۔حضرت معاویہؓ کی عسکری حکمت عملی ایسی پختہ تھی کہ بری فوج ایشیاء کوچک کے رومی علاقوں کو روندتے ہوئے بحر مرمرہ کے ساحل پر جزیرہ نمائے ارواد (Cyzicus) عین اسی وقت پہنچی، جب وہاں بحری افواج لنگرانداز ہورہی تھیں۔ لیجیے! بس ۸۰ میل کے فاصلے پر سامنے قسطنطنیہ ہے۔حضرت معاویہ نے جزیرۂ روڈس اور ارواد (Cyzicus) میں افواج کا پڑاؤ کروایا اور اسلامی بحریہ نے رومیوں کی مکمل ناکہ بندی کردی۔

اب بیزنطینی سلطنت مشرق سے مکمل طور سے منقطع ہوگئی، بری افواج اناضول کے مغربی ساحلوں پر نگرانی کررہی تھیں اور بحر مرمرہ اور بحرایجہ میں مسلمانوں کے بحری بیڑے تعینات تھے، چھوٹی اور تیز رفتار کشتیاں شمال سے جنوب تک مرمرہ اور ایجہ کے سمندروں میں متحرک اور قسطنطنیہ کو مشرق سے منقطع رکھنے کو یقینی بنا رہی تھیں۔اس ناکہ بندی کی وجہ سے غذائی رسد یا افواج کی آمد و رفت ممکن نہیں رہی اور رومی سلطنت کی اقتصادی کمر ٹوٹ گئی تھی۔

ارواد (Cyzicus) کو مسلم افواج کا ہیڈ کوارٹر بنایا گیا۔اسلامی افواج یہیں سے جہازوں کے ذریعے جا جا کر شہر قسطنطنیہ کا محاصرہ کیے رہتیں۔قسطنطنیہ (موجودہ یورپی استنبول) ساحل پر واقع ہے۔ (Hebdomon) سے لے کر کیکلو بیوس (Kyclobios) تک بحری جہاز اور مسلمانوں کی جنگی کشتیاں

گشت کرتی رہتی اورسمندری راستوں کا انسداد یقینی بناتی رہتی تھیں۔شہر پناہ کے دامن میں ہبدومون (موجودہ Bakirkoy) سمیت کئی ساحلی مقامات پر اسلامی افواج کا قبضہ تھا اور مسلمانوں کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے رومیوں کے دل دہلتے تھے۔ بیزنطین کے انگریز مورخ J.B. Bury نے لکھا ہے (اورابراہیم عدوی نے فرانسیسی مورخ Brehier کے حوالے سے بھی نقل کیا ہے) کہ رومی ان سالوں میں سخت بے چین ودہشت زدہ رہے۔ان کی صدیوں پرانی عظمت کا تاج اسلامی افواج کے پاؤں تلے روندا جارہا تھا۔اوران کوکسی وقت بھی سلطنت کے خاتمے کا ڈر تھا[1]۔

ان سات سالوں میں عبدالرحمان بن خالد بن الولید کے علاوہ حضرت معن بن یزید سلمیؓ ،حضرت فضالہ بن عبیدؓ ،حضرت سفیان بن عوفؓ ،حضرت جنادہ بن امیہؓ ،حضرت مالک بن عبداللہ خشعمیؓ ،حضرت عبداللہ بن قیس فزاریؒ اور دیگر اہم اموی کمانڈرس کو حضرت معاویہؓ یکے بعد دیگرے فوجیں لے کر اناضول کے بری راستوں سے بھیجتے رہے۔ان مہمات کا مقصد یہ تھا کہ قسطنطنیہ کو مشرق سے کوئی کمک نہ مل سکے اور اروادکی مسلم افواج اپنے پیچھے سے محفوظ رہیں۔(طبری:۵/ ۲۹۳۔ ۳۱۵)۔

قسطنطنیہ تو فتح نہیں ہوا،مگر اس طویل حملے سے ایک اور بہت بڑی کامیابی ملی:

مگر قسطنطنیہ کی شہر پناہ کسی طرح نہ ٹوٹتی تھی۔ہم پیچھے اس کی ناقابل تسخیر مضبوطی وبلندی کا تذکرہ کرآئے ہیں۔رومی اس کے اوپر سے آگ برساتے تھے۔اس کے علاوہ رومیوں کے پاس سمندر میں شرربار کشتیاں تھیں، مورخین نے لکھا ہے کہ رومیوں کے پاس ایک خاص آتش گیر مادہ ہوتا تھا،جس کو یونانی آگ (Greece Fire) کہتے تھے۔اس کی آگ پانی سے بھی نہیں بجھتی تھی۔مسلمانوں کو اس سے بڑی مشکل پیش آتی تھی۔غرض مرکز روم قسطنطنیہ فتح نہیں ہوسکا۔لیکن اس سات سالہ محاصرے کی ایک اہم حصولیابی اور تھی۔اسی محاصرے کے دوران افریقہ میں حضرت معاویہ کی افواج نے بڑی فتوحات مکمل کیں اوران ممالک میں اسلام پھیلا۔رومی محصوراوران کی افواج اپنا دارالسلطنت بچانے میں مشغول تھے،لہٰذاوہ افریقہ میں افواج نہیں بھیج سکتے تھے۔

آخر مغربی مآخذ کے مطابق رومیوں نے اسلامی دربار میں یوحنا نامی ایک نہایت ذہین تجربہ کار سفیر کو بھیجا۔یوحنا کے پہلے سے دمشق کے حکومتی حلقوں سے تعلقات تھے۔مذاکرات کی کئی نشستیں ہوئیں اور آخر دونوں

---

[1] A History of The Later Roman Empir 2/310 ،الامویون:۱۶۷۔

حکومتوں میں (مغربی مورخین کے بیانات کے مطابق) تیس سال کے لیے صلح کا معاہدہ طے پا گیا۔

جہاں تک اسلامی مآخذ کا تعلق ہے، تو وہ سن ۵۹/۶۰ میں کسی بھی صلح کے تذکرے سے خالی ہیں۔ اور یہی واقعے کے مطابق ہے۔ قرائن اور حالات اسی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ہاں مسلم مورخین یہ ضرور ذکر کرتے ہیں کہ حضرت معاویہ نے اپنی افواج کو محاذ جنگ سے بلا لیا اور روڈس اور ارواد کے اپنے فوجی اڈے خالی کر دیے۔ بعض دیگر روایات میں یہ ذکر ہے کہ فوجوں کو حضرت معاویہؓ نے نہیں یزید نے بلایا۔ ہمارے نزدیک یہی زیادہ قرین قیاس ہے [1]۔

---

[1] تھیوفانس آٹھویں صدی عیسوی کا ایک رومن مورخ تھا، اس کی کتاب انگلش میں The Chronicle of Theophanes کے نام سے شائع ہے، اس نے اپنی کتاب (Page: 47) میں نقل کیا ہے، اور اسی کے حوالہ سے Bury اور Gibon نے بھی لکھا ہے کہ یہ صلح اصلا مسلمانوں کی ابتدا اور فرمائش پر ہوئی تھی، جس کے لیے انہوں نے دربار قیصری میں اپنا نمائندہ بھیجا تھا۔ اس کے جواب میں قیصر نے شرائط صلح طے کرنے کے لیے یوحنا کو بھیجا تھا۔ دمشق میں اس کے اعلیٰ حکام کے ساتھ مذاکرات میں طے ہوا کہ ''مسلمان ہر سال رومیوں کو تین ہزار دینار، پچاس غلام اور پچاس گھوڑے خراج کے طور پر دیں گے۔ (The Chronicle of Theophanes: 47)

بیزنطینی سلطنت کے ساتھ خراج پر مبنی کسی صلح کا کوئی تذکرہ اسلامی مآخذ میں نہیں ملتا۔ تھیوفانس کی یہ روایت غیر معمولی طور پر قومی عصبیت پر مبنی لگتی ہے۔ غالبا بادشاہ قسطنطین چہارم کے لیے یورپ میں اپنی دھاک اور ساکھ بچانے کا یہ آسان ذریعہ ہوگا کہ جنگ بندی کی تصویر میں وہ اپنے غلبہ و برتری کا رنگ بھر کر دکھائے۔ ورنہ اس کی کیا تک بیٹھتی ہے کہ کوئی حملہ آور فوج اُس طاقت سے صلح کی درخواست کرے جو شہر پناہ میں محصور دبی سمٹی اپنے بقا کے لیے کوشاں تھی؟ مسلمان اپنے ملک و علاقے سے اس قدر دور خشکی و تری میں پیش قدمی کرتے اور جولانیاں دکھاتے ہوئے یلغار کر رہے تھے۔ اِس کا کیا امکان کہ وہ صلح کی مانگ کریں؟ اور پھر خراج تک دینے پر راضی ہو جائیں، جو کسی حکومت کے لیے ذلت و پسپائی کی واضح علامت ہوتی ہے؟؟ اس کی کیا تک بیٹھتی ہے؟؟ اگر مسلمانوں کی مصلحت ہوتی تو وہ بس واپس آ جاتے۔ یا بلا کسی خراج کے صلح کر لیتے! جب مسلمانوں کا ملک رومیوں کے کسی حملے کا سامنا ہی نہیں کر رہا تھا تو دبنے اور خراج دے کر صلح کی درخواست کرنے کی کیا ضرورت ان کو پیش آ رہی تھی؟؟ لہٰذا یہ قطعی طور پر غلط ہے۔

اس روایت میں ایک ناقابل یقین چیز اور ہے۔ وہ ہے خراج کی نہایت قلیل مقدار۔ کیا دنیا کی سب سے بڑی حکومت ایک عظیم سلطنت کو خراج دے کر صلح کرے گی تو اس کی مقدار بس تین ہزار دینار اور پچاس گھوڑے ہو سکتی ہے؟ تین ہزار دینار تو بعض مرتبہ ایک جنگ میں صرف ایک مسلم فوجی کو مال غنیمت میں مل جاتے تھے [تاریخ دمشق: ۲۹/۳۶]۔ اور سن ۲۷ ھجری میں حضرت عثمان کے عہد میں صرف شمال افریقہ کے علاقوں پر رومیوں کے گورنر جرجیر (Gragory) نے ۲۵ لاکھ دینار سالانہ دینے پر صلح طے کی تھی (الکامل: ۲/۴۶۳)۔

غالبا اسی لیے ابراہیم عدوی نے اپنی تحقیقی کتاب میں، جس کا اصل مدار مغربی مآخذ پر ہے، اس روایت کو قبول نہیں کیا ہے۔ (صفحہ: ۱۶۷)۔ تھیوفانس پر بریٹانیکا کے مقالے کا یہ تبصرہ بھی قابل لحاظ ہے کہ ''اگرچہ بیزنطینی عہد پر قدیم ماخذ کے =

بیزنطینی امپائر کے خلاف
جہاد عظیم تاریخ ساز کارنامہ:

یہ رومیوں کے خلاف حضرت معاویہ کے اُس طویل جہاد کی کہانی تھی، جس کا آغاز انہوں نے غزوۂ تبوک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ شرکت سے کیا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے ان کو رومیوں کے خلاف محاذ پر بھیج دیا تھا۔ پھر پورے عہد عمری اور عہد عثمانی کے دوران جہاد و رباط کی قیادت فرمائی۔ صحابہ و تابعین کے مجاہدین ان کے پشتیبان تھے۔ تازندگی وہ اسی محاذ پر ثابت و قائم رہے۔ فتح مکہ کے بعد سے اسلام اور مسلمانوں کے لیے سب سے بڑا خطرہ بیزنطی رومن سلطنت تھی، جو بلاشبہہ اس وقت دنیا کی سپر پاور اور سب سے بڑی توسیع پسند طاقت تھی۔ اور جس کے حملوں اور تاختوں سے (بظاہر حالات) اسلام اور مسلمانوں کا مستقبل خطرے میں اور ان کی بقا موہوم و غیر یقینی تھی۔

حضرت معاویہ کی کل سیاسی و جہادی زندگی شام کے محاذ پر گذری۔ جہاں انہوں نے سمندر کی طرح موجیں مارتی رومی طاقت کے سامنے ایک ایسا باندھ بنائے رکھا، جس نے نہ صرف اندرون عرب کے اسلامی قلعہ کو ہمیشہ کے لیے محفوظ بنا دیا، بلکہ رومیوں کو براعظم افریقہ کے عظیم ممالک سے لے کر فلسطین و شام اور آرمینیہ و شمال عراق میں لاکھوں میل مربع پر محیط اپنے مقبوضات میں دوبارہ واپس نہیں آنے دیا۔ سن ساٹھ آتے آتے وہ رومیوں کو اس حد تک پسپا کر چکے تھے کہ وہ کسی طرح باسفورس کے پار اپنے دارالسلطنت کی خیر منائیں۔ جزاہ اللہ عن الاسلام والمسلمین خیرا۔

= طور پر اکیلی کتاب تھیوفانس ہی کی ہے، مگر وہ تاریخی شعور اور انصاف دونوں سے خالی مصنف ہے''۔ ملاحظہ ہو بریٹانیکا مقالہ: Theophanes the Confessor۔ مسلم افواج واپس ہوگئیں، غالباً بس اتنے واقعے کو رومی سرکار دربار کے راویوں نے بادشاہ کی فتح کے طور پر مشہور کر دیا۔

گیارھواں باب

بیزنطینی افریقہ کی فتوحات

رومن امپائر نے بحرابیض متوسط کے چاروں طرف، تین براعظموں پر پھیلی ہوئی، جو عظیم سلطنت قائم کی تھی، اس میں وہ اقلیم بھی شامل تھا جس کو رومی 'افریکا' کہتے تھے۔ یہ مصر کے مغرب میں براعظم افریقہ کا وہ پورا شمالی وسطی علاقہ تھا جس میں اِس وقت لیبیا، تیونس،، مراکش، اور الجزائر کے وہ مما لک ہیں جو بحرمتوسط کے ساحل پر آباد ہیں۔ برقہ وقرطاج اس کے صدر مقام تھے۔ رومن امپائر کی تقسیم کے بعد یہ خطہ مشرقی رومن (بیزنطینی) سلطنت کے زیرنگیں تھا[۱]۔ بحرمتوسط کا پورا افریقی ساحل، مشرقی لیبیا کے ساحل پر برقہ (Cyrinaica) سے لے کر افریقہ کے آخری شمال مغربی کنارے پر طنجہ (Tangier) تک[۲] انہی کے قبضے میں تھا۔ اس ساحل پر ان کے بڑے اور اہم فوجی اڈے اور تنصیبات تھیں۔ یہاں سے بھی رومی مسلمانوں پر حملوں کے لیے فوجیں بھیجا کرتے تھے جو مصر پر حملہ آور ہوتیں اور مملکت اسلام میں گھسنے کی کوشش کرتی تھیں۔ (الامویون والبیزنطیون: ۱۹۳، ۱۹۶) بیزنطینی بادشاہوں اور اشرافیہ کی عیاشیوں نیز جنگوں کے بے پناہ اخراجات کا پیٹ بھرنے میں مصر وشام کے زرخیز صوبوں کے بعد صوبہ ''افریکا'' کا سب سے بڑا حصہ تھا (الامبراطوریۃ البیزنطیہ: ۱۲۸۔ ۱۳۷)۔

رومیوں کے تحت افریقی مما لک کے حالات:

رومی شمال مغربی افریقہ کے لوگوں کو بربر کہتے تھے۔ ادھر کافی عرصے سے بربر افریکا میں بیزنطیوں کے خلاف بغاوتیں کررہے تھے۔ جن کا خاص سبب حکومت کے مظالم، خصوصاً مذہبی تشدد و جبر اور بے رحم ٹیکسوں کا نظام تھے۔ بیزنطی حکومت اصلاً ایک خالص مذہبی حکومت تھی، جس میں بادشاہ خود چرچ کا سربراہ اور خداوندی اختیارات کا مالک تھا۔ ان صدیوں میں عیسائی دنیا زبردست پُرپیچ کلامی مسائل کا میدان جنگ بنی ہوئی تھی، ہر فریق دوسرے کو زندیق وکافر (Heretic) قرار دیتا تھا۔ حکومت کے اور شام، مصر اور افریقہ کے عیسائیوں کے

---

[۱] انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا، مقالہ: Exarchate of Carthage۔

[۲] جو مراکش کا آخری شمال مغربی کنارہ اور آبنائے جبل الطارق کے دہانے پر واقع ہے۔

درمیان کلامی اختلافات تھے۔حکومت اپنے عقائد مصر وافریقہ کے عیسائیوں پر بالجبر تھوپنا چاہتی تھی، جس پر وہاں کے پادری اور علماء بغاوت کرتے تھے۔افریکا کا رومی حاکم جرجیر (Gregory) ایک عرصے سے رومی حکومت سے علیٰحدگی کے اقدامات کررہا تھا۔ان مذہبی اختلافات میں اس نے مغربی چرچ روم (Rome) کی حمایت کرنا شروع کی اور مغربی رومن سلطنت نے اُس کی۔اِس طرح خانہ جنگی کی جڑیں اور گہری ہوگئیں۔

اِس بے چینی کا دوسرا بڑا سبب وہ ظالمانہ ٹیکس تھے جن کے بوجھ تلے اس خطے کے انسان عرصے سے دبے کراہ رہے تھے۔زمینیں زیادہ تر یوروپین اشرافیہ کی ملکیت تھیں، جن میں سخت زمیندارانہ نظام کے تحت بندھوا مزدور کام کرتے تھے۔بر بر کسان چھوٹی موٹی زمینوں کے مالک تھے اور بہت زیادہ لگان دیتے تھے۔کوئی فردِ بشر لگان میں کمی نہ کرسکے اس کے لیے سرکاری تحصیل داروں کا زبردست عملہ تھا، جو ایک ایک گاوں اور شہر میں پھیلا ہوا تھا۔ہر زمیں دار کو رومی امراء کو ہدیے اور تحفے پیش کرنے ہوتے تھے۔ٹیکسوں کی مقدار اتنی زیادہ طے کی گئی تھی، کہ مقامی حکمرانوں کا کل وقت اور توجہ صرف انہی کو جمع کرنے میں صرف ہوجاتے تھے۔ان کو عوامی بہبود جیسی حکومت کی دوسری ذمہ داریوں کی طرف نظر کرنے کی فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔(فتح العرب للمغرب:۱۶، ۱۷)۔ایک فرنچ مورخ چارلس جولین کہتا ہے کہ بیزنطیوں کا بس ایک ہی مقصد تھا، وہ یہ کہ ان ممالک کو آخری حد تک کیسے نچوڑا جائے [۱]۔ایک اور فرنچ مورخ M. Caudel کہتا ہے: حکومت کا اکیلا مطمح نظر بس ٹیکس وصول کرنا تھا۔بلکہ بس یہی اس کا مقصد وجود اور زندگی کا سہارا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ اپنی زمینیں اور کاروبار چھوڑ کر بھاگ گئے، چوری اور لوٹ مار کا بازار گرم اور بدامنی عام ہوگئی [۲]۔

افریقہ اسلام کے استقبال کے لیے تیار تھا:

اس ظلم واستحصال اور لوٹ سے افریقہ کے لوگ عاجز آگئے۔ان کے قائدین نے حضرت معاویہؓ کے دربار میں قاصد بھیج کر درخواست کی کہ ہمیں بیزنطینی سلطنت کے جبر سے نکالیے۔بے چینی اور بغاوتوں کا یہ حال تھا کہ، بقول ابن اثیر کے، افریقہ میں آگ لگی ہوئی تھی ''وھی نار تضطرم'' [۳]۔سسلی کے لوگ بھی باقاعدہ مسلمانوں سے فریاد کررہے تھے کہ بیزنطین کے ظلم سے ان کی گلوخلاصی کرائیں [۴]۔اِدھر بادشاہ قسطانز کو فکر تھی کہ سلطنت کے دو اہم ممالک شام ومصر کے بعد اگر افریقہ بھی ہاتھ سے گیا تو بیزنطینی سلطنت کی ساری شوکت

---

۱ Histoire de l'Afrique du Nord، بحوالہ الاوضاع الاقتصادیۃ فی مصر والمغرب، از حمید مرعی ص ۴۲۔

۲ Les Premieres Invasions Arabes Dans L'Afrique Du Nord، فتح العرب للمغرب:۱۶

۳ الکامل فی التاریخ:۲/۴۶۵، نہایۃ الارب للنویری: ۲۴/۱۹

۴ Les Premieres Invasions Arabes Dans L'Afrique Du Nord:، فتح العرب للمغرب:۱۶

خاک میں مل جائے گی۔ اُدھر سسلی اور اٹلی بھی مسلمانوں کے حملوں کی زد میں تھے، جو شمال افریقی ساحل سے قریب پڑتے تھے۔ قسطانز یہ بھی چاہتا تھا کہ بحر متوسط میں مسلمانوں کی قوت کو کسی طرح روکے، جو رومی قوت و مالیہ کے لیے سخت زوال کا باعث تھی۔ لہٰذا اس نے ۶۶۲ء (۴۲ ھجری) میں اپنا دارالسلطنت یورپ اور افریقہ کے بیچ جزیرۂ سسلی میں منتقل کرنے کا بہت بڑا اور مشکل فیصلہ کیا تھا[۱]۔

افریقہ میں رومیوں نے ہر علاقے میں چھوٹے بڑے قلعے بنا رکھے تھے جن میں ان کی فوجی بٹالینیں رہتی تھیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ یہ فوجیں نیم خودمختار اور آزاد ہوتی گئیں۔ ان کے فوجی فصلیں لوٹ لیتے، گھروں میں لوٹ مار کرتے، عوام کو دھمکاتے اور تاجروں سے تاوان وصول کرتے۔ یہاں تک ان کا کردار منظم ڈاکوؤں کے جتھوں کا سا ہو گیا۔ رومیوں کو بس اپنے ٹیکس سے غرض تھی، اس سے کچھ سروکار نہ تھا کہ عوام پر کیا بیت رہی ہے (فن الحرب الاسلامی، بسام العلی: ۲/ ۱۳۳)۔ افریقہ کے شمالی ساحل پر جو لوگ بستے تھے وہ نسبۃً متمدن تھے اور رومیوں کے حامی تھے۔ باقی اندرونی خطوں کے قبائل عام کسان مظلوم تھے۔ اور مسلمانوں کا ساتھ دیتے تھے۔ (فتح العرب للمغرب: ۲۱۔ ۲۲) ان حالات نے گویا اسلام کے استقبال کے لیے افریقہ کی زمین تیار کر دی تھی۔

افریقہ کی پہلی فتح اور پھر بغاوت:

شمال مغربی افریقہ کے ساحل اور ان سے متصل جزائر بحر متوسط میں بیزنطینی طاقت کی خاص بنیاد تھے۔ حضرت عثمانؓ نے سن ۲۷ ھ میں حاکم مصر عبداللہ بن ابی السرحؓ کو جہاد کے لیے بھیجا۔ یہاں کے رومی حاکم سے سبیطلہ میں سخت معرکہ ہوا، مسلمانوں کو فتح ہوئی اور یہاں کی حکومت نے مسلمانوں سے ۲۵ لاکھ سالانہ پر صلح کی۔ (الکامل: ۲/ ۴۶۴)۔ لیکن مسلمانوں کی فوج جیسے ہی واپس آئی، پیچھے سے رومن افواج آدھمکیں اور افریقی حکومت کو بغاوت پر ابھارا۔ آخرکار شہادت عثمانی کے بعد یہ علاقہ (دیگر بہت سے ممالک کی طرح) پورے طور پر ہاتھ سے نکل گیا۔

حضرت معاویہؓ کے عہد میں معاویہ بن حدیجؓ کی مہمات:

خلافت سنبھالنے کے فوراً بعد حضرت معاویہ نے افریقہ کی طرف توجہ کی، سن ۴۱ ھجری میں اس محاذ پر جہاد کا امیر صحابی رسول حضرت معاویہ بن حدیجؓ کو مقرر فرمایا۔ یہ قبیلہ کندہ کے سردار اور بڑی ہیبت و شوکت کے آدمی تھے۔ ایک عرصے سے مہمات جہاد میں کارنامے انجام دیتے آرہے تھے۔ انہوں نے متعدد مہمات انجام دیں، مگر

---

۱ Buri, History of The Later Roman Empire: 298.

خاص پیش رفت نہیں ہوتی تھی۔ سن ۴۵ ہجری میں حضرت معاویہؓ نے بڑے اہتمام سے ان کے لیے دس ہزار کا لشکر کمک کے طور پر ترتیب دیا، جس میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ جیسے صحابہ اور اشراف قریش کی ایک تعداد شریک تھی۔ ابن حدیج اسکندریہ سے نکل کر افریقہ کے ساحلی علاقوں سے ہوتے ہوئے تونس تک پہنچے، افریقی عوام نے کہیں کوئی مزاحمت نہیں کی۔ بلکہ جا بجا مسلمانوں کا استقبال ہوا۔ ابن حدیجؓ نے قمونیہ نامی مقام میں پڑاؤ کیا۔ اُدھر رومی بادشاہ نے بحری جہازوں سے تیس ہزار کا ایک زبردست لشکر اپنے سپہ سالار نقفور کی قیادت میں بھیجا۔ مگر وہ جلد ہی شکست کھا کے بھاگ گئے۔ اب بیزنطینی حکومت کا افریقہ سے خاتمہ ہو گیا تھا۔

حضرت معاویہ بن حدیج پیش قدمی کرتے ہوئے افریقہ کے بالکل شمال میں بنزرت تک پہنچ گئے۔ بربر عوام کی طرف سے کوئی مزاحمت سامنے نہیں آئی۔ مسلمانوں کے امیر حضرت ابن حدیج نے بنزرت کو مرکز بنایا اور علاقہ کے مختلف اضلاع میں فوجیں روانہ کیں۔ سوسہ ایک ساحلی مقام اور رومیوں کا فوجی اڈا تھا۔ ابن حدیجؓ نے حضرت عبداللہ بن زبیر کو اسے فتح کرنے کے لیے بھیجا۔ رومی اڈا چھوڑ کر کشتیوں میں بیٹھ کر چلے گئے۔ عبدالملک بن مروان کو جنوب میں جلولاء کی فتح کے لیے بھیجا۔ یہ مقام بھی فتح ہوا۔ اسی سلسلے میں حضرت ابن حدیجؓ نے اپنے لشکر کے ایک کمانڈر حضرت رویفع بن ثابت انصاریؓ کو جزیرہ جربہ کی مہم سپرد کی۔ یہ شمال افریقہ کا سب سے بڑا جزیرہ اور رومیوں کی اہم بندرگاہ تھی۔ یہ مقام بسہولت فتح ہوا۔ (مسند احمد: ۱۶۹۹۷) حضرت معاویہ نے ان افواج کو لمبی مدت تک افریقہ میں دعوت اسلام کی غرض سے مقیم رکھا اور کافی تعداد میں لوگوں نے اسلام قبول کیا۔
(تاریخ المغرب الکبیر: ۲/ ۴۵-۴۷)

سن ۴۷ ہجری کے اوائل میں حضرت معاویہ بن حدیج ان مہمات کی تکمیل کر کے مصر واپس آئے اور گورنر بنائے گئے۔ اگرچہ ان کے آنے کے بعد افریقی علاقوں میں پھر انتشار بپا ہو گیا، لیکن یہی مہمات دراصل بعد کی پائیدار فتوحات کی بنیاد ثابت ہوئیں۔ اسلامی فتوحات سے پہلے سے ہی شمال افریقہ میں سیاسی عدم استحکام، انتشار اور غیر یقینی فضا چلی آ رہی تھی۔ ان میں دو قسم کے قبائل تھے، شمالی علاقوں کے بربر متمول، رومیوں کے زیادہ زیر اثر اور ان کی تہذیب سے متاثر تھے۔ اور اندرون افریقہ کے لوگ بدو اور کسان تھے۔ یہ مسلمانوں کو زیادہ پسند کرتے تھے اور ان میں اسلام بھی پھیل رہا تھا۔ شمالی بربر اقوام نے بظاہر مسلمانوں کی حکومت قبول کر لی تھی، لیکن جوں ہی مسلمان افواج واپس آتیں، رومی آ جاتے، اور بغاوت ہو جاتی۔ یہ سلسلہ عہد عثمانی کے بعد ہی سے چلا آتا تھا۔

سسلی کے بحری اڈے پر قبضہ:

حضرت معاویہ کی بحریہ کے کمانڈر جنرل عبداللہ بن قیس فزاری تھے۔ ان کو افریقہ کے ساحلی مقامات پر

رومیوں کی بحریہ سے مستقل مقابلہ کے لیے اپنے بیڑے کے ساتھ بھیج دیا گیا تھا۔ ۴۹ھ میں انہوں نے رومیوں کو پے بہ پے شکستیں دیں اور ان کے بیڑوں کو پیچھے کھدیڑ کر اٹلی کے جزیرہ صقلیہ (Sicily) کے اہم بحری اڈے پر قبضہ کرلیا۔ (البیان المغرب: ۱۸) صقلیہ افریقی ممالک کی حفاظت کے لیے بہت اہم تھا۔ قسطنطنیہ کے بعد بیزنطینی سلطنت کا سسلی ہی سب سے بڑا مرکز تھا۔ اس حملے سے رومیوں کو جتنا نقصان پہنچا ہوگا اس سے کہیں زیادہ وہ خوف ورعب تھا جس نے مسلمانوں سے اپنے ممالک کو واپس لینے کا خیال ان کے دل سے نکلوا دیا۔

حضرت معاویہؓ کا فیصلہ کن اقدام، عقبہ بن نافع کا جہاد اور اسلامی افریقہ کی تاسیس:

فطری طور پر حضرت معاویہ افریقہ کی غیر مستحکم صورت حال سے متفکر تھے۔ ابھی تک حاکم مصر ہی افریقہ کے معاملات کا ذمہ دار ہوتا تھا، ان کامیابیوں کے بعد ۵۰ھ میں حضرت معاویہؓ نے اس نظام میں تبدیلی کی۔ اور افریقہ کے لیے مستقل طور پر عقبہ بن نافع کو سپہ سالار مقرر کیا، جو براہ راست حضرت معاویہ کو جواب دہ تھے۔ عقبہ بن نافع اسلامی حکومت کے ایک نہایت اولوالعزم مجاہد اور فوجی افسر تھے۔ ساتھ ہی عبادت وتعلق مع اللہ میں بھی بہت ممتاز مقام رکھتے تھے۔ وہ عہد عثمانی ہی میں اس خطہ کی ابتدائی فتوحات کے مرد میدان رہ چکے تھے، اور قریباً ۶ سال سے برقہ وزویلہ (موجودہ لیبیا) میں مقیم اسلامی افواج کے امیر تھے۔ اس مدت میں انہوں نے ان ممالک کے جغرافیائی حالات، دفاعی تنصیبات اور بربر قبائل کے بارے میں اچھی واقفیت حاصل کرلی تھی۔ حضرت معاویہ کا یہ انتخاب نہایت صحیح ثابت ہوا اور ان کے عہد میں اسلامی افریقہ کی گویا تاسیس عمل میں آئی۔

حضرت معاویہ نے ان کی کمک کے لیے (افریقہ میں مصروف کار افواج کے علاوہ) دمشق سے دس ہزار فوج بھیجی۔ وہ اپنی افواج اور اس تازہ کمک کے ساتھ روانہ ہوئے، مورخین نے بیان کیا ہے کہ اس جہاد میں ۱۸ صحابہ بھی شریک تھے۔ بربر مسلمانوں کی ایک تعداد بھی ساتھ تھی۔ عقبہ نے اپنی افواج کے ساتھ سفر شروع کیا، پہلے سِرت[۱] وہاں سے وڈّان کے علاقے میں گئے، جہاں کے لوگ پہلے اسلامی حکومت کی اطاعت قبول کرچکے تھے۔ اس کو پھر سے فتح کیا۔ اس کے بعد لشکر اسلام نے مزید اندرونی علاقوں کا قصد کیا۔ فزان (Phasania) کے صوبے کے صدر مقام شہرِ جرمہ پر پہنچ کر یہاں کے لوگوں کو اسلام کی دعوت دی۔ علاقۂ فزان کے لوگوں نے اجتماعی طور پر اسلام قبول کیا۔ فزان ایک عظیم الشان ریاست تھی۔ اس کا مرکز یہی جرمہ تھا۔ لہٰذا جابجا قلعوں اور چھاونیوں میں افواج اور اسلحہ کے مراکز موجود تھے، مگر قافلۂ اسلام کا افریقہ میں ایسا عوامی

---

۱ موجودہ لیبیا کے شمال میں طرابلس کے مشرق میں واقع ایک ساحلی شہر ہے۔

استقبال ہورہا تھا کہ کوئی جنرل یا گورنر مزاحمت میں ٹِک نہیں پاتا تھا۔مختلف علاقوں میں فوجیں بھیجی گئیں، ہر جگہ کے لوگوں نے اطاعت قبول کی۔ یہاں تک کہ موجودہ لیبیا کا پورا علاقہ اور قسطیلیہ کا صوبہ بھی فتح ہوا، جو موجودہ تونس کے جنوب مغرب میں اب علاقۂ جرید کہلاتا ہے [1]۔

قیروان کی آباد کاری:

اب مسلم افواج پیش قدمی کرتے ہوئے (تونس میں) قمونیہ کے اس مقام تک پہنچیں جہاں پہلے اسلامی افواج کا قیام رہ چکا تھا۔ یہاں عقبہ نے اپنی فوج کے عمائدین کے ساتھ ایک مشاورتی مجلس میں افریقہ کی غیر مستحکم صورت حال پر گفتگو کی۔اس میں انہوں نے کہا کہ اس علاقے کا مسئلہ یہ ہے کہ جب اسلامی افواج یہاں آتی ہیں تو بہت سے لوگ اسلام قبول کر لیتے ہیں۔اور جب اسلامی افواج یہاں سے چلی جاتی ہیں تو بہت سے لوگ مرتد ہوجاتے ہیں اور بغاوتیں ہونے لگتی ہیں۔اس لیے یہاں مستقل اسلامی افواج اور براہ راست حکومت کا قیام ضروری ہے۔جس کے لیے رائے ہوئی کہ یہاں اسی طرز پر اسلامی حکومت کا ایک سیاسی و دفاعی مرکز قائم کیا جائے؛جس طرح مصر میں فسطاط اور فارس وعراق کے لیے کوفہ و بصرہ قائم کیے گئے ہیں۔لوگوں نے اس رائے سے اتفاق کیا۔مرکز سے استصواب کیا گیا تو حضرت معاویہؓ کی طرف سے بھی اس رائے کی تائید کی گئی۔ایک رائے یہ آئی کہ یہ مرکز بحر متوسط کے ساحلی مقام پر قائم کیا جائے، تاکہ وہ بری و بحری دونوں افواج کی دست رس میں ہو۔لیکن عقبہ کی رائے ہوئی کہ ساحلی مقام پر رومیوں کے اچانک حملے کا ڈر رہے گا۔آخر انہوں نے اسی مقام قمونیہ کے قریب ایک جنگلی علاقہ کو نیا شہر بسانے کے لیے منتخب کیا۔

کھلی کرامت:

اب جو صفائی شروع کی گئی تو پتہ چلا کہ جنگل بڑا خطرناک اور طرح طرح کے درندوں کی آماج گاہ ہے۔ ہر طرف سانپ، بچھو اور زہریلے کیڑے مکوڑے پھیلے پڑے ہیں۔لوگوں نے آکر اپنے امیر سے شکایت کی۔مگر یہ دور صحابۂ رسول کا دور تھا۔امت کے ساتھ اللہ کی غیبی نصرت چلتی تھی۔خود عقبہ بن نافع بڑے عبادت گزار اور مستجاب الدعاء بزرگ تھے۔انہوں نے لشکر کے صحابہ کو جمع کیا اور دعا کی اور پھر جنگل کی طرف آگے بڑھے اور آواز لگائی:

اودرندو! اور سانپو اور بچھوو! ہم اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ ہیں، تم جنگل خالی کر دو۔

(فتوح مصر والمغرب: ۲۲۴، البیان المغرب: ۱/۲۰)

پھر کیا تھا، لوگوں نے دیکھا، شیر اپنے بچوں کو منہ میں دبائے بھاگے جا رہے ہیں، بھیڑیے اپنے پلوں کو

---

[1] فتوح مصر والمغرب: ۲۲۰۔۲۲۷۔

اٹھائے چلے جارہے ہیں، سانپ اور بچھو بھی بھاگ رہے ہیں۔ حضرت حاطب بن ابی بلتعہؓ کے پوتے یحییٰ بن عبد الرحمان اس موقعے پر موجود تھے۔ خلیفہ بن خیاط نے ان سے حسن سند سے روایت کی ہے کہ:

لما افتتح عقبة بن نافع أفريقية وقف على القيروان فقال يا أهل الوادي إنا حالون إن شاء الله فاظعنوا، ثلاث مرات، قال فما رأينا حجرا ولا شجرا إلا يخرج من تحته دابة حتى يهبط بطن الوادي، ثم قال انزلوا بسم الله [1]۔

جب عقبہ بن نافع نے افریقہ فتح کیا، تو قیروان کی جگہ پر کھڑے ہوکر تین مرتبہ آواز لگائی: او وادی کے جانورو! ہم ان شاء اللہ یہاں قیام کریں گے۔ تم یہاں سے چلے جاؤ۔ یحییٰ کہتے ہیں: اس کے بعد ہم نے دیکھا کہ ہر پیڑ اور پتھر کے نیچے سے کوئی جانور اتر کر نیچے وادی کی طرف چلا جارہا ہے۔ اس کے بعد عقبہ نے لوگوں سے کہا: بسم اللہ، اب اترو۔

اس واقعے سے بربروں کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں اور ان کی بڑی تعداد داخل اسلام ہوئی۔ جب جنگل صاف ہوگیا تو عقبہ نے صالحین کی ایک تعداد کو ساتھ لیا۔ نیچے وادی کی طرف جا کے اللہ سے دعا کی:

اللهم املأها علما وفقها، واعمرها بالمطيعين والعابدين، وامنعها من جبابرة الأرض۔

اے اللہ! اس کو علم وفقہ کا مرکز بنادے۔ یہاں اپنے فرماں بردار اور عبادت گزار بندے آباد فرما۔ اور ظالموں سے اس شہر کی حفاظت فرما (نہایۃ الارب: ۲۴/ ۲۳)۔

اس نئے شہر کا نام قیروان رکھا گیا، یہ وہی فارسی کا کاروان ہے۔ نام کی مناسبت غالباً یہ تھی کہ یہاں کاروانِ دعوت وجہاد آباد ہوا تھا۔ شہر بڑا منظم بسایا گیا تھا۔ جو اس عہد کے مسلمانوں کی تمدنی ترقیوں کا عکاس تھا۔ عین درمیان میں ایک جامع مسجد جو عبادت کے ساتھ علم کے حلقوں کا مرکز بھی ہوا کرتی تھی، قائم تھی۔ اس کے سامنے گورنر ہاؤس اور سکریٹریٹ کا آفس تھا۔ درمیان سے شہر کی مرکزی شاہراہ گزرتی تھی، قبائل کی منظم کالونیاں بسائی گئیں۔ شہر میں تمام تمدنی ضروریات کا بندوبست کیا گیا اور تعلیمی ورفاہی انتظامات کیے گئے۔ صدیوں قیروان افریقہ میں اسلام اور دعوت وعلم کا مرکز بنا ضیاپاشی کرتا رہا۔

خلافت معاویہ کا اہم کارنامہ:

شہر قیروان کی تاسیس حضرت معاویہ کے مبارک عہد کا اہم کارنامہ تھا۔ یہاں مسلمانوں کے بسنے سے، جن میں صحابہ وتابعین کے علماء وصلحاء اور کبار مجاہدین کی ایک تعداد تھی، جس کے نتیجے میں بربر قوموں کی اکثریت

---

[1] تاریخ خلیفہ بن خیاط: ۲۱۰۔ حافظ ابن حجر نے اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے۔ الاصابۃ: ۵/ ۱۵۱۔

داخلِ حظیرۂ اسلام ہوئی[1]۔ یہی پورے شمالی افریقہ میں اسلام کے پھیلنے کا ذریعہ بنا۔ آج براعظم افریقہ کا اکثر حصہ مسلمان ہے، اس کو آپ اسلامی برّاعظم کہہ سکتے ہیں۔ شمالی افریقہ میں لیبیا، تونس، الجزائر اور مراکش جیسے وسیع وعریض مسلم ممالک آباد ہیں، جن میں دین ودعوت کے ساتھ اسلامی علم وتہذیب کے تاریخی مراکز قائم ہوئے، یہ سب قیروان کے مرکز سے پھیلی شعاعوں کا نور ہے۔ جس کی بنا امیر المومنین حضرت معاویہؓ نے رکھوائی۔

مصر میں گورنر کی تبدیلی اور افریقہ میں ابوالمہاجر دینار کا تقرر:

سن ۵۵ھ میں حضرت معاویہ بن حدیجؓ کی جگہ حضرت مسلمہ بن مخلّد انصاریؓ کو امیر المومنین حضرت معاویہ نے مصر کا گورنر مقرر کیا۔ انہوں نے افریقہ سے عقبہ بن نافع کو واپس بلایا اور ابوالمہاجر دینار کو نیا حاکم اور امیر الجہاد مقرر کیا۔ افریقہ انتظامی طور پر مصر کے گورنر کے تابع تھا۔ لیکن عقبہ بن نافع کی اس منصب پر تعیین، براہ راست امیر المؤمنین کے یہاں سے ہوئی تھی۔ اس لیے بظاہر اس تبدیلی میں بھی حضرت معاویہؓ کا ایماء شامل ہوگا۔ بعض مورخین نے اس کا ایک اہم سبب بھی بیان کیا ہے۔ عقبہ نہایت کروفر کے امیر الجہاد اور بڑے دبدبے کے حاکم تھے۔ وہ بربروں کے باغی اور انتشار پسند عناصر سے سختی سے نمٹتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ اقلیم جو گزشتہ سالوں میں بارہا انتشار وشورش کا شکار ہوتا رہا تھا، عقبہ کے رعب ودبدبے نے اس کو پرسکون کر دیا۔ لیکن اب وہاں بربروں میں اسلام کی دعوت کو ایک ایسے امیر کی ضرورت تھی جو ان کی تالیف قلب کرے اور دلوں کو فتح کرے[2]۔ ابوالمہاجر اسی وصف ومزاج کے آدمی تھے۔

مورخین شمالی اسلامی افریقہ کو تین حصوں میں منقسم مانتے ہیں۔ مغرب ادنیٰ، وسطیٰ اور قصویٰ۔ مغربی لیبیا اور تونس کا کچھ حصہ ادنیٰ میں، موجودہ تونس کا بڑا حصہ اور مشرقی الجزائر وسطیٰ میں، اور مغربی الجزائر وموجودہ مراکش قصویٰ میں آتا تھا[3]۔ ابوالمہاجر وُسطیٰ کے اکثر حصوں کے فاتح ہیں۔ نئے امیر کی پالیسی میں ایک بڑا فرق تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ بربروں کی بغاوتوں اور بار بار ارتداد کا اصل سبب رومیوں کی ریشہ دوانیاں ہیں، جو ابھی تک افریقہ کے شمال میں متعدد مقامات پر اپنی فوجوں کے ساتھ قابض تھے۔ الجزائری مورخ محمد علی دبوز نے بارہا بربر قبائل کی بغاوت اور جنگ آرائی کے لیے رومیوں کی ریشہ دوانیوں اور سازشوں کو ذمے دار قرار دیا ہے۔ ابوالمہاجر

---

[1] تاریخ ابن خلدون: ۳/ ۱۳، الکامل: ۳/ ۶۳۔

[2] تاریخ المغرب الکبیر، محمد علی دبوز: ۲/ ۵۳۔ ۵۷۔

[3] تعریف بالاماکن الواردۃ فی البدایۃ والنہایۃ: ۵۴۔

دینار نے رومیوں اوران کے حمایت یافتہ بربر سرداروں کے خلاف کامیاب مہمات انجام دیں۔

افریقہ سے رومی اقتدار کا خاتمہ:

مسلمان مصر کے راستے افریقہ کے اندرون میں گھستے چلے گئے تھے، لیکن اندرون افریقہ کی بڑی فتوحات کے باوجود ابھی تک بنزرت سے طنجہ تک افریقہ کے شمالی ساحلوں اور قریبی جزیروں میں جابجا بحری اڈوں پر رومی قابض چلے آرہے تھے۔ ان کا افریکا کا دارالسلطنت قرطاج (Carthage) یہیں واقع تھا اور ابھی محفوظ تھا۔ اگرچہ رومی اب خوف زدہ تھے اور مسلمانوں کی اندرون افریقہ فتوحات کے خلاف کچھ متحرک ہونے سے گھبراتے تھے۔ لیکن بربر قبائل کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے اور شورش پیدا کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے بھی نہیں جانے دیتے تھے۔ حضرت معاویہؓ نے ابوالمہاجر کو حکم دیا کہ افریقہ میں رومیوں کے صدر مقام قرطاج کے خاتمے کی کارروائی کی جائے۔ چنانچہ انہوں نے قرطاج پر حملہ کیا اور اس کا محاصرہ کرلیا۔ آخر اس پر صلح ہوئی کہ رومی قرطاج اور جزیرہ نمائے شریک [1] خالی کردیں۔ جزیرہ نمائے شریک بھی رومیوں کا بحری اڈا تھا۔ مسلمانوں کے ان پر قبضے کا مطلب یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کو اب برّی افواج کے ساتھ مسلم بحریہ سے بھی مدد ملنے لگے گی۔ ابوالمہاجر نے اپنے ایک اہم افسر اور مسلمانوں کے ایک بڑے عالم اور دینی شخصیت حنش صنعانی کو قرطاج کا امیر بنایا اور ان کے ساتھ کچھ فوج چھوڑی۔ اس کے بعد ابوالمہاجر مغرب کی جانب روانہ ہوئے اور ان ساحلی علاقوں کو فتح کرتے چلے گئے، جو ابھی تک رومیوں کے زیراثر تھے اور ان کی بربر آبادی ابھی تک اُن کے تابع تھی۔ مگر اب سب نے مسلمانوں کی تابع داری قبول کی۔ خلیج بجایہ کے جنوب مشرق میں میلہ ایک اہم مقام تھا۔ ابوالمہاجر نے اسے فتح کیا اور اسی جگہ کو اپنا مستقر بنا کر بربروں میں اسلام کی دعوت دینی شروع کی اور دو سال تک یہاں قیام کیا۔

بربر سردار کسیلہ کا اسلام اور اطاعت پذیری:

ایک طرف قرطاج اور جزیرہ شریک میں مسلم افواج کا قیام اور دوسری طرف ساحلی مقامات کی فتح سے رومیوں کے لیے افریقہ میں ریشہ دوانیوں کا راستہ بند ہوگیا۔ بربروں کا ایک بہت بڑا قبیلہ 'اوربہ' تھا۔ اس کے سردار کسیلہ نے پورے مغرب اوسط و اقصیٰ (تونس والجزائر) میں گھوم کر اپنے قبیلہ کے لوگوں میں مسلمانوں سے لڑنے کے لیے جوش پیدا کرنا شروع کیا۔ کسیلہ عیسائی تھا اور اپنی قوم کا بہت بڑا لیڈر تھا۔ کسیلہ کا مرکز (موجودہ الجزائر کے شمال مغرب میں) تلمسان تھا۔ ابوالمہاجر نے تلمسان پر حملہ کیا، سخت رن پڑا۔ مگر مسلمانوں نے شجاعت کے عالی

[1] یہ قرطاج کے جنوب مشرق میں واقع ہے۔ اِس وقت تونس میں قلیبیہ اور نابل کا علاقہ کہلاتا ہے، تاریخ المغرب الکبیر: ۲/۵۸۔

جوہر دکھائے اور اپنے جذبۂ جہاد سے بڑی تعداد کو شکست دے دی۔کسیلہ قید ہوا، وہ نہایت ذکی اور قائدانہ صلاحیتوں کا آدمی تھا۔اس کی قوم اس سے بہت محبت کرتی تھی۔ابوالمہاجر جانتے تھے کہ کسیلہ اگر اسلام لے آیا تو یہ اسلام کی افریقہ میں سب سے بڑی فتح ہوگی۔انہوں نے اس کو ساتھ رکھا۔حسن سلوک واکرام کیا۔تالیف قلب کے نتیجہ میں اس نے اور اس کی قوم نے بھی اسلام قبول کیا۔اس طرح افریقہ کے طول وعرض میں اسلام پھیل گیا اور بربر قبائل کی بڑی تعداد حلقہ بگوش اسلام ہوتی چلی گئی۔آخر افریقہ سے رومی اقتدار کا مکمل خاتمہ ہوگیا[۱]۔

افریقی محاذ پر فتوحات کا سب سے بڑا سبب اور حضرت معاویہؓ کی جنگی منصوبہ بندی کا کمال:

ان کامیابیوں کا ایک اہم سبب عموماً اسلامی افریقہ کے مورخین نے نظرانداز کردیا ہے۔نہ جانے کیوں اس طرف توجہ نہیں دی گئی کہ ان فتوحات (۵۳ ھجری اور اس کے بعد) کا زمانہ وہ ہے جب حضرت معاویہؓ کی افواج ایک طرف رومیوں کے صدر مقام قسطنطنیہ کا محاصرہ کیے ہوئے تھیں۔انہوں نے خلقدونیہ، روڈس، ارواد (Cyzicus) اور کریٹ کے جزائر پر اپنی افواج کو متعین کر کے رومیوں کے لیے بحری گزرگاہوں کو بند کر رکھا تھا۔یہ مقامات بحر ایجہ ومرمر کے منہ پر کچھ اس طرح واقع ہیں کہ ان پر قبضے کے بعد رومیوں کے لیے بحر متوسط میں آنا ممکن نہیں تھا۔دوسری طرف سسلی کے گرد اسلامی بحریہ نے ناکہ بندی کر رکھی تھی۔اور تیسری طرف ان کے اصل مرکز ایشیائے کوچک کو برّی افواج روندرہی تھیں۔اب کہیں سے افریقہ کو بچانے کے لیے رومی کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے۔افریقہ کی فتح دراصل ایک ہمہ گیر منصوبے کا نتیجہ تھی، جو نہایت ذہانت سے تیار کیا گیا تھا۔

سچ ہے، اللہ نے امیر المومنین حضرت معاویہؓ کو اس کام کے لیے معیّن وموفق کردیا تھا کہ وہ دنیا کے بڑے حصے کو تثلیث کے قبضے سے آزاد کرائیں۔آج شمال افریقی براعظم میں متعدد مسلم ممالک میں پھیلی جو مسلمانوں کی تعداد نظر آتی ہے، اس میں فاتح اسلام حضرت معاویہؓ کے کردار کو کون فراموش کرسکتا ہے؟ ان کی نسلیں اپنے اسلام وایمان کے لیے اسی مجاہد بادشاہ صحابی کی مرہون منت ہیں۔رضی اللہ عنہ وارضاہ۔کیسے بے توفیق ہیں اللہ کے وہ بندے اور کیسے حق شناسی سے محروم، جو اسلام کے اس عظیم ہیرو کو مطعون کرتے ہیں۔

---

[۱] تاریخ ابن خلدون: ۴/۲۳۷ تاریخ المغرب الکبیر: ۲/۵۶۔۶۳، الامویون والبیزنطیون: ۲۹۰۔۲۱۱۔

بارھواں باب:

مشرقی محاذ کی فتوحات

حضرت عثمان کے دور میں ہی مسلمان عراق سے لے کر دریائے آمو (جیحون) تک کے ممالک فتح کر چکے تھے۔ اس میں کسروی عہد کے طبرستان، خراسان، جرجان، فارس، سجستان اور کرمان کے صوبے شامل تھے۔ آج کے دور میں اس میں شمال ایران وافغانستان نیز پاکستان کا شمالی علاقہ اور جنوب میں سندھ وبلوچستان تک کا علاقہ بنتا ہے۔ لیکن حضرت عثمان کی شہادت کے بعد تقریباً یہ تمام علاقے ہاتھ سے نکل گئے۔ حضرت معاویہؓ جب خلیفہ بنے تو اس طرف بھی توجہ فرمائی۔

فتح سجستان وکابل:

ان مشرقی علاقوں میں جہاد کی ذمے داری بصرہ کے فوجی ڈویژن کی تھی۔ حضرت عثمان کے عہد میں حضرت عبداللہ بن عامرؓ نے سجستان وخراسان فتح کیے تھے (طبری: ۴/ ۳۱۴)۔ حضرت علیؓ کے دور میں ان کو ہٹا دیا گیا تھا۔ حضرت معاویہؓ کی پالیسی تھی کہ خلافت راشدہ کے امراء کو اپنے اپنے علاقوں میں دوبارہ ذمہ داری دی جائے۔ چنانچہ ۴۱ھ میں حضرت معاویہؓ نے حضرت عبداللہ بن عامرؓ کو دوبارہ بصرہ کا والی مقرر کیا اور حکم دیا کہ سجستان میں جہاد کا انتظام کرو۔ عہد عثمانی میں حضرت عبدالرحمان بن سمرہ بن حبیبؓ اس علاقے کے امیر جہاد رہ چکے تھے اور بڑے علاقے ان کے ہاتھوں فتح ہوئے تھے۔ لہٰذا ۴۲ھ میں حضرت معاویہؓ نے ان کو امیر لشکر بنا کر سجستان وکابل کی طرف بھیجا۔ انھوں نے مہم شروع فرمائی، ساتھ میں حضرت حسن بصری جیسے صلحاء وعلماء اور عباد بن الحصین، قطری بن الفجاءۃ، مہلب بن ابی صفرۃ اور عبداللہ بن خازم جیسے اہم سپہ سالار واشراف عرب تھے۔ سجستان کے صدر مقام زرنج پہنچے، وہاں کے حاکم نے ہتھیار ڈال دیے اور بیس لاکھ سالانہ جزیہ دینے کا وعدہ کیا۔ مسلم افواج یہاں سے خواش، بست اور خشک نامی شہروں کو فتح کرتے ہوئے آگے بڑھیں۔ سن ۴۳ ھجری میں انہوں نے رُخّج اور زابلستان بھی فتح کیے۔

آخر کار عبدالرحمانؓ کابل پہنچے۔ یہاں کی شہر پناہ نہایت مضبوط تھی۔ مسلمانوں نے محاصرہ ڈالا، کابل کی فوج بھی ڈٹ گئی، کئی ماہ محاصرہ چلا۔ مسلم افواج جذبۂ دینی سے سرشار مجاہدانہ شجاعت کے جوہر دکھارہی تھیں۔ منجنیق کے حملوں سے شہر پناہ کا ایک حصہ ٹوٹ گیا۔ رات کا وقت تھا، کابلی فوج اس کو دوبارہ بنانے میں جُٹ گئی۔ دو بڑے جنرل عباد بن الحصین اور عبداللہ بن خازم اپنی بٹالینوں کے ساتھ رات بھر وہاں برسرِ پیکار رہے اور دیوار بنانے نہیں دی۔ حضرت حسن بصری کہتے ہیں کہ ''عباد بن الحصین بجلیوں کی طرح حملے کررہے تھے۔ لگتا تھا آدمی نہیں، ہزار سواروں کی پلٹن ہے''۔ آخر عبداللہ بن خازم نے کابلی سپہ سالار کے ہاتھی پر تلوار سے حملہ کردیا۔ ہاتھی چنگھاڑ کے پلٹا۔ عبداللہ نے پے در پے اس پر وار کیے اور وہ ڈھیر ہوگیا۔ اس مردانگی سے دشمن کی ہمت پست ہوگئی اور کابل فتح ہوگیا۔

بصرہ کی قلم رو بہت وسیع علاقوں پر مشتمل تھی، فتح کے بعد انتظامات کی سہولت کے لیے رائے ہوئی کہ سجستان کو ایک مستقل عملداری قرار دے دیا جائے۔ حضرت عبدالرحمان بن سمرہ بن حبیبؓ صحابی تھے، ان کی کامیاب مہمات کو دیکھتے ہوئے، حضرت معاویہ نے انہیں کو یہاں کا حاکم طے فرمایا۔ (بلاذری: ۳۸۳، ۳۸۴)۔

فتح خراسان:

خراسان کا علاقہ مزید شمال میں تھا[۱]۔ یہ علاقے پہلے فتح ہوچکے تھے۔ مگر وہاں بھی سرکشیوں نے سر ابھار رکھا تھا، بادغیس، ہرات، بوشنج اور بلخ سب باغیوں کے ہاتھ میں تھے۔ حضرت معاویہ نے پہلے حضرت قیس بن الہیثمؓ کو متعین کیا، ان کو کچھ خاص کامیابی نہیں ملی تو والی بصرہ عبداللہ بن عامرؓ کو توجہ کرنے کا حکم فرمایا۔ انہوں نے سن ۴۴ ہجری میں عبداللہ بن خازم کو، جو خراسان میں پہلے بھی کامیاب مہمات انجام دے چکے تھے، مقرر کیا۔ نئے امیر کا پہنچنا تھا کہ سارے باغیوں کے حوصلے سرد پڑ گئے اور انہوں نے صلح وامان کی درخواست کی (فتوح البلدان: ۹۶، وطبری: ۵/۲۲۶)۔

مرو میں فوجی مرکز کا قیام:

بصرہ کے گورنر حضرت عبداللہ بن عامرؓ بڑے نرم دل آدمی تھے۔ ان کی نرمی سے خوارج اور دیگر سرکش عناصر نڈر ہوگئے۔ سن ۴۴ کے آخر یا ۴۵ کے شروع میں حضرت معاویہ نے وہاں زیاد کو گورنر بنایا، جو ذہانت وتدبیر میں یکتا شمار ہوتے تھے اور غیر معمولی انتظامی صلاحیتوں کی شخصیت تھے۔ عبداللہ بن خازم خراسان میں

۱۔ موجودہ تقسیم کے مطابق اس میں افغانستان کے بلخ وہرات، ایران کے مشہد ونیسا پور، ترکمانستان کے مرو اور ازبکستان کے بخاریٰ وسمرقند کے اضلاع آتے تھے۔

جہاد وامارت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ مگر وہاں بار بار سرکشی پھیل جاتی تھی۔ امیر المومنین حضرت معاویہؓ کو اطلاع ملتی رہتی اور وہ اس سلسلے میں فکر مند رہتے تھے۔ سن ۴۷ھ میں، ان بار بار کی شورشوں کے سد باب کے لیے، انہوں نے حکم دیا کہ خراسان میں بڑی تعداد میں افواج کے قیام کا انتظام کیا جائے اور وہاں کے مرکزی شہر مرو میں ایک بڑی چھاونی تعمیر کی جائے۔

مشرق میں اسلامی دعوت کا مرکز:

حضرت معاویہؓ نے مرو کو صرف ایک فوجی مرکز نہیں، بلکہ مشرق میں اسلامی دعوت کی آبیاری وتوسیع کے لیے ایک اسلامی شہر (مصر المسلمین) بنایا۔ یہ مسلمانوں کی اسی حکمت عملی کا حصہ تھا کہ نئے مفتوحہ علاقوں میں نئے اسلامی شہر بسائے جائیں، جو دفاعی مرکز کے ساتھ اسلامی دعوت وتعلیم کے سرچشمے کی حیثیت رکھتے ہوں۔ بصرہ، کوفہ، فسطاط اور قیروان وغیرہ کی طرح اب مرو میں ایسا ہی مرکز بن گیا تھا۔ ساتھ ہی زیاد نے عبداللہ بن خازم کی جگہ حضرت حکم بن عمرو غفاریؓ کو وہاں کا حاکم مقرر کیا۔ یہ صحابی اور بڑے نیک آدمی تھے۔ نہایت جری و بے باک۔ حُکمِ خدا کے آگے کسی کی پروا نہ کرتے تھے۔ حضرت حکم روانہ ہوئے اور سب سے پہلے طخارستان[۱] کی افواج کو شکست دی۔ پھر غُور[۲] کی ریاست پر حملہ کیا جو باغی ہوگئی تھی، یہاں بھی فتح حاصل ہوئی۔ پہاڑی مقام اسل اور چغانیان وترمذ بھی فتح کیے۔ حضرت حکم غفاریؓ جذبۂ جہاد سے سرشار تھے، جیسے جیسے علاقے اللہ کے دین کے سامنے جھکتے جاتے تھے، ان میں اللہ کی زمین اور اللہ کے بندوں کو اس کے باغیوں سے آزاد کرانے کا جذبہ تیز ہوتا جاتا تھا۔ فتوحات کرتے کرتے شمال مشرق میں بڑھتے گئے۔ اب ان کے سامنے دریائے آمو تھا۔ عبور کیا، پار اتر کر اس کے پانی سے وضو کیا اور دو رکعتیں پڑھیں۔ اس زمین نے غالباً پہلی مرتبہ اللہ کے لیے کسی کی جبینِ سجدہ کو مس کیا تھا[۳]۔

جبل اسل کی فتح میں حکومت کے خزانے سے کافی سیم وزر اور نقدی غنیمت کے طور پر ملی تھی۔ حضرت معاویہؓ کو ہر طرف افواج کی پیش قدمیوں اور فتوحات کی خبریں دی جاتی تھیں۔ انہوں نے مرکز بصرہ کے گورنر جنرل زیاد (جن کی کمانڈ میں مرو کا فوجی مرکز تھا) کے ذریعے حکم بھیجا کہ نقدی اور سونا چاندی مرکزی بیت المال کے لیے لے لیے جائیں، مجاہدین میں تقسیم نہ کیے جائیں۔ مگر حضرت حکم غفاریؓ کے نزدیک یہ شرعی قانون کے خلاف تھا۔ انہوں نے زیاد کو پوری آزادی سے جواب لکھا کہ قرآن نے حکم دیا ہے کہ مال غنیمت کے پانچ میں

۱۔ طالقان وبلخ کے اطراف میں ایک ریاست، معجم البلدان: ۴/ ۲۳۔

۲۔ غزنی وہرات کے علاقہ کی ایک ریاست تھی: حوالۂ بالا ۴/ ۲۱۸۔

۳۔ فتوح البلدان: ۳۹۶، الکامل ۳/ ۵۳ ومعاویہ بن ابی سفیان: ۴۳۴۔

سے چار حصے مجاہدین میں تقسیم کردیے جائیں (الانفال:۴۱)۔قرآن کا حکم امیرالمومنین کے کہنے سے نہیں توڑا جاسکتا۔اور مال غنیمت اپنی رائے کے مطابق تقسیم کردیا۱؎۔

آگے ہم جہاں اس عہد کے مالیاتی نظام سے متعلق گفتگو کریں گے، یہ واقعہ پھر آئے گا۔ہم وہاں حضرت معاویہؓ کے نقطۂ نظر کی شرعی بنیاد پر روشنی ڈالیں گے۔

مرو کی آبادکاری کا منصوبہ:

سن ۴۷ ھجری میں حضرت معاویہ نے مرو میں جس چھاونی اور اسلامی شہر (مصرالمسلمین) بنانے کا حکم دیا تھا، اب یہ بن کر تیار تھا۔سن ۵۱ میں حضرت ربیع بن زیاد حارثیؓ کو حضرت حکم غفاریؓ کی جگہ پورے خراسان کا حاکم طے کیا گیا۔ان کے ساتھ بصرہ اور کوفہ سے ۲۵-۲۵ ہزار فوجیوں کو اپنے اہل وعیال کے ساتھ مرو میں قیام کے لیے بھیجا گیا۔ان میں اہم علماء اور صحابہ (مثلاً حضرت ابوبرزہ اسلمیؓ اور حضرت بریدہ بن الحصیبؓ) کو خصوصی طور پر رکھا گیا، جو مرو میں دینی تعلیم ودعوت کا کام انجام دیتے تھے۔حضرت ربیع بن زیادؓ نے بلخ وکوہستان کے علاقے فتح کیے۲؎۔

مزید فتوحات:

سن ۵۴ میں حضرت معاویہ نے عبیداللہ بن زیاد کو خراسان کا گورنر بنا کر بھیجا۔یہ ابھی صرف ۲۵ سال کا تھا، اس نے ۲۴ ہزار کی تعداد لے کر کوچ کیا۔دریائے آمو کو عبور کر کے بخاریٰ کے اطراف میں لشکرکشی کرتا پہنچ گیا۔نسف (موجودہ قرشی) کو زیر کیا۔بیکند اور رامثین مملکتِ بخاریٰ کے فوجی مراکز تھے، فتح کیے۔اب بخاریٰ کی مملکت مسلمانوں کے سامنے تھی۔یہاں کی ملکہ نے، جس کا نام ''خاتون'' تھا، ترکستان سے مدد مانگی، وہاں سے بڑی تعداد میں فوج آئی۔بخاریٰ کے باہر گھمسان کا رن پڑا۔اس لڑائی میں عبیداللہ اس بے جگری سے لڑا کہ لوگوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔اپنی منتخب سپاہ کے ساتھ شمشیر زنی کرتا دشمن کی صفوں میں گھس جاتا، واپس آتا تو جھنڈا خون سے تر ہوتا۔آخر مسلمانوں کی دلاوری کے سامنے دشمن پست ہوگیا۔خاتون نے دس لاکھ درہم سالانہ جزیہ پر صلح کی۔اس دوران مسلمانوں نے وہاں جو قیام کیا تو ایک بڑی تعداد نے اسلام قبول کیا۔عبیداللہ اپنے ساتھ بخاریٰ کی فوج کے دو ہزار منتخب تیرانداز لے کر بصرہ آیا اور ان کو باقاعدہ فوج میں ملازمت دی۔(اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان فتوحات کے ساتھ ان اقوام نے عموماً اسلام قبول کرلیا تھا)۳؎۔

۱؎ تاریخ طبری:۵/۲۵۱،البدایہ والنہایۃ:۸/۳۲،۳۳،المعرفۃ والتاریخ:۳/۲۵۔

۲؎ فتوح البلدان:۳۹۶۔سیر اعلام النبلاء:۲/۴۶۹۔

۳؎ تاریخ طبری:۵/۲۹۸،فتوح البلدان ۳۹۷۔

حضرت معاویہ نے عبیداللہ کو (غالباً اس کی شجاعت اور انتظامی سختی کے پیش نظر) سن ۵۵ھ میں ترقی دے کر مرکز بصرہ اور اس کے ماتحت ممالک کا گورنر جنرل طے فرمایا۔[1] (واضح رہے کہ تمام مشرقی ممالک بصرہ ڈویژن کے تابع تصور کیے جاتے تھے۔ اگرچہ تمام اہم امور حضرت معاویہ کی طرف سے براہ راست طے ہوا کرتے تھے۔) خراسان میں اپنی جگہ اسلم ابن زرارہ کو فوجی جنرل اور شہری منتظم کے طور پر مقرر کر کے عبیداللہ بصرہ آ گیا۔ مگر سن ۵٦ ہجری میں حضرت معاویہ نے خراسان میں جہاد کا امیر سیدنا عثمان بن عفانؓ کے صاحب زادے سعید کو مقرر کیا۔ ان کے ساتھ بصرہ سے حضرت قثم بن عباسؓ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عم زاد اور صحابی) اور مہلب بن ابی صفرہ اور طلحۃ بن عبداللہ الخزاعی (معروف بہ طلحۃ الطلحات) جیسے عرب سرداروں اور جنگی قائدین کی ایک جماعت ساتھ گئی۔

اخلاقی اصلاح کا ایک نمونہ:

ان کے تقرر کے ساتھ ہی ایک ایسا واقعہ ہوا جس سے معاشرے کی اخلاقی اصلاح کے سلسلے میں حضرت معاویہؓ کی حکومت کی پالیسی اور فکر مندی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ عراق میں ڈاکوؤں اور چوروں (صعالیک) کا ایک جتھہ تھا، جن کے سردار مالک بن الریب المازنی اور شظاظ الضبی تھے۔ یہ بڑے نڈر اور جری لوگ تھے اور جیل میں قید تھے۔ بصرہ کے ارکان حکومت نے سعید بن عثمان سے کہا کہ ان لوگوں کو اگر نصیحت کی جائے اور ان کی بہادری کو میدان جہاد میں استعمال کیا جائے تو بہت اچھا ہو۔ سعید نے ان لوگوں کو درد بھری نصیحت کی، آخرت کے عذاب سے ڈرایا۔ انہوں نے توبہ کی اور جہاد میں شرکت کے لیے خراسان روانہ ہو گئے (فتوح ابن اعثم: ۲/۳۱۱)۔ مالک بن الریب نے اپنی توبہ و جہاد پر ایک شاندار قصیدہ کہا، جو عربی ادب میں ایک کلاسک شاہکار مانا جاتا ہے، اس میں ایک شعر کچھ یوں ہے:

ألم ترني بعت الضلالة بالهدیٰ　　　وأصبحت في جيش ابن عفان غازيا

دیکھو! میں نے گمراہی کا راستہ ترک کر دیا۔ اب ہدایت کا جویا ہوں۔ اور (سعید بن عثمان) بن عفان کے لشکر میں جہاد کے لیے شامل ہو گیا ہوں (الشعر والشعراء لابن قتیبۃ: ۱/۳۴۱)۔

یہ لشکر خراسان کے علاقے میں پہنچا اور دریائے آمو کا باندھ کاٹ ڈالا۔ اور سمرقند پر پڑاؤ ڈالا۔ یہ مملکت بخاریٰ کا حصہ تھا۔ ملکۂ بخاریٰ خاتون حاضر ہوئی اور عبیداللہ بن زیاد کے ساتھ اپنی پچھلی صلح کی دستاویز دکھائی۔

---

[1] یہ عبیداللہ وہی بدنصیب شخص ہے جس نے سیدنا حسینؓ کے ساتھ ضد اور ہٹ دھرمی دکھائی، جس کے نتیجے میں اسی کی فوج کے ہاتھوں ریحانۂ رسول سیدنا حسینؓ شہید ہوئے۔

اس کی درخواست تسلیم کر لی گئی۔ لیکن صُغد ۱ے، کُش اور نَسَف کے لوگ ایک لاکھ بیس ہزار کی فوج لے کر مقابلہ کو آئے۔ خاتون نے یہ دیکھا تو اس کی نیت بھی بگڑ گئی۔ وہ بھی بغاوت کر کے ان کے ساتھ شامل ہو گئی۔ لیکن پھر خراسانیوں میں اختلاف ہو گیا اور ایک بڑی تعداد میدان جنگ سے واپس چلی گئی۔ دوسروں کے حوصلے بھی ٹوٹ گئے۔ خاتون نے پھر صلح کی پیش کش کی۔ سعید بخاریٰ میں فاتحانہ داخل ہوئے۔

یہاں سے فارغ ہو کر مسلمانوں نے سمرقند کا عزم کیا۔ شہر کے دروازہ پر سب نے قسم کھائی کہ اسے فتح کر کے ہی دم لیں گے۔ وہاں کی حکومت نے سخت مزاحمت کی، قلعہ کے باہر تین دن تک جنگ ہوتی رہی، تیسرے دن زور کا معرکہ ہوا۔ مسلمان جوش سے بھرپور، راہ خدا میں اپنی جانوں کی سوغات پیش کرتے جاتے تھے۔ حضرت قثم بن العباس ؓ نے بھی یہاں جامِ شہادت نوش کیا۔ امیر لشکر سعید بن عثمان نے خوب جانبازی کے جوہر دکھائے، یہاں تک کہ ان کی ایک آنکھ شہید ہو گئی۔ مشہور فوجی جنرل مہلب بن ابی صفرہ بھی اس جہاد میں شریک تھے، انہوں نے بھی راہ خدا میں ایک آنکھ کا نذرانہ پیش کیا۔ سمرقند کی صف میں زخمیوں اور مقتولین کی کثرت تھی۔ ان میں سے ایک آدمی نے امیر لشکر سعید کو بتایا کہ فلاں محل میں شاہزادوں اور حکام کی ایک جماعت محفوظ ہے۔ سعید نے اس محل کا محاصرہ کر لیا۔ اب سمرقندیوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ سعید نے شرط لگائی کہ صلح جب ہی قبول ہو گی جب مسلم فوج کو شہر میں گشت کی اجازت دی جائے۔ غرض فتح کی تکمیل ہوئی۔ اس کے بعد سعید نے ترمذ کا رخ کیا۔ یہاں کی حکومت نے بآسانی اطاعت قبول کر لی ۲ے۔

بلاد سندھ کی مہمات:

قدیم دور میں سندھ اس پورے علاقے کو کہتے تھے جو فارس کے جنوب میں کرمان سے ہندوستان تک بحر عرب کے ساحل پر آباد تھا۔ اس میں موجودہ ایران کا جنوبی علاقہ، پاکستان کا صوبہ سندھ، پنجاب اور شمال مغرب کا خطہ آتا تھا، مسلمان مورخین نے اس میں قندھار تک کو شامل کیا ہے ۳ے۔ خراسان فتح ہوا تو اب اس کے جنوب میں اور طبرستان و کرمان کے مشرق میں سندھ ہی تھا، سوان کی فتح کے بعد فطری طور پر یہ خطہ زد پر آتا تھا۔ لہٰذا حضرت معاویہ کے عہد میں ان علاقوں پر مہمات بھیجی جاتی تھیں، جن کا عموماً مقصد علاقہ کی جغرافیائی نوعیت و انسانی و اجتماعی حالات کا جائزہ لینا تھا۔ اس لیے افواج آتیں اور کچھ مدت قیام کر کے چلی جاتیں۔ سن ۴۴ھ میں مہلب بن ابی صفرہ

۱ے یہ فی الوقت طاجیکستان کا ایک صوبہ ہے اور اسی نام ''سوغد'' سے معروف ہے۔

۲ے فتوح البلدان: ۳۹۷، ۳۹۸، البدایۃ والنہایۃ: ۸/۸۵۔

۳ے مسالک الممالک، اصطخری: ۱۷۰، معجم البلدان: ۴/۴۰۳۔

اس علاقے کی مہمات کے لیے گئے۔ وہ خراسان سے درۂ خیبر ہوتے ہوئے بنّہ [1] پھر لاہور تک پہنچ گئے۔

حضرت معاویہ سیکڑوں میل دور، لیکن مہمات جہاد پر گہری نظر:

شمال سے جانے والا یہ راستہ ہندوکش پہاڑیوں کا دشوار ترین راستہ ہے۔ حضرت معاویہؓ سیکڑوں میل دور دمشق میں بیٹھ کر ہر فوجی نقل وحرکت کی منصوبہ بندی کرتے تھے۔ انہوں نے راستے کی دشواری کے پیش نظر آئندہ کے لیے حکم دیا کہ سندو ہند کی مہمات جنوب میں مکران کے مرکز سے روانہ ہوں۔ یہ راستہ نسبۃً آسان تھا۔ مکران میں عبداللہ بن سوار کو حضرت معاویہ نے امیر الجہاد مقرر کر رکھا تھا۔ سن ۴۵ھ میں ان کو پیش قدمی کا حکم دیا۔ انہوں نے قیقان [2] فتح کیا۔ چار ماہ یہاں قیام کیا، پھر واپس گئے۔ پھر سن ۴۷ھ میں دوبارہ یہاں آئے، اس مرتبہ ایک لڑائی میں شہید ہوگئے۔

مکران کا اسلامی مرکز:

عبداللہ کی شہادت کے بعد حضرت معاویہ نے عامل بصرہ زیاد کو لکھا کہ عبداللہ بن سوار کی جگہ کسی مناسب آدمی کو معین کیا جائے۔ انہوں نے سنان بن سلمہ بن المحبق کو متعین کیا، سنان بڑے ذی علم، عبادت گذار مردِ صالح اور شجاعت و دلیری میں نامور امیر تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کی قدیم اسٹریٹجی کے مطابق مکران [3] میں فوجی چھاونی اور مکمل اسلامی شہر بسایا۔ (فتوح البلدان: ۴۱۷) یہ گویا اس سمت کی فتح کی طرف ایک بڑا اور ٹھوس قدم تھا۔

غیبی مدد اور ایک کھلی کرامت:

حافظ ابن کثیرؒ نے اس دور کے بارے میں لکھا ہے کہ ہر لشکر میں ایسے (صحابۂ کرام) اولیاء اللہ، صالحین، علماء اور کبار تابعین کی بڑی تعداد ہوتی، جن کی برکت سے اللہ کی مدد اترتی تھی (البدایۃ والنہایۃ: ۹/ ۱۰۴)۔ ایک مجاہد نے حضرت معاویہؓ کے عہد میں اللہ کی ایک عظیم غیبی نصرت کا واقعہ بیان کیا ہے۔ سندھ میں ایک مضبوط فوجی قلعہ میں دشمن کی افواج محصور ہوگئی تھیں، اُن سے خطرہ تھا۔ سنان کے مولیٰ ابوالیمان کہتے ہیں کہ میں اس جہاد میں ساتھ تھا۔ سنانؒ نے اس پر حملہ کا منصوبہ بنایا۔ قلعہ سے ایک بڑی فوج نے نکل کر مسلمانوں پر حملہ کیا۔ حضرت سنانؒ نے ہمارے درمیان وعظ کہا، اور یاد دلایا کہ: تم یا تو فتح یاب اور یغما و غنیمت سے بہرہ ور ہوگے، یا شہادت

---

[1] بنہ کابل کے پاس کوئی علاقہ تھا، معجم البلدان: ۱/ ۵۰۱۔ غالباً یہ وہی بنّو ہے جو اب پاکستان کے خیبر پختونخواہ کا ایک شہر ہے۔

[2] یہ طبرستان کے قریب اور خراسان سے ذرا جنوب میں ایک شہر تھا۔ (معجم البلدان: ۴/ ۴۲۳)

[3] موجودہ بلوچستان کا ساحلی خطہ (جو ایران اور پاکستان دونوں میں واقع ہے) مکران کہلاتا تھا۔ اور کسروی زمانے سے ایک مستقل صوبہ تھا (Encyclopedia Brittannica)۔

کے راستے جنت کی نعمتِ عظمٰی پا جاؤ گے۔ پھر کیا پریشانی؟ یہ کہہ کر سات پتھر ہاتھ میں لیے اور کہا کہ جب میں حملہ شروع کروں تو سب یکبارگی ٹوٹ پڑنا۔اس کے بعد صف بندی کی اور عین زوال کے وقت ایک ایک کر کے چھ پتھر دشمن کی طرف پھینکے، کچھ وقفے کے بعد ساتواں بھی پھینکا۔اس کے بعد بآواز بلند کہا: حٰمٓ، لایُنصَرونَ۔ پھر کیا تھا! معلوم ہوتا تھا دشمن خود زیرِ تیغ آیا جاتا ہے۔جلد قلعہ فتح ہو گیا۔اُن لوگوں نے کہا: تم لوگوں نے ہمیں نہیں مارا۔ہم نے دیکھا کہ تمہارے ساتھ ایک سفید پوش جماعت تھی جو سفید عماموں میں ملبوس ابلق گھوڑوں پر سوار تھی۔اب وہ نہیں دِکھ رہے۔ہم لوگوں نے ان سے کہا یہ اللہ کی طرف سے آنے والی فرشتوں کی کمک تھی۔ہم میں سے بس ایک شخص شہید ہوا (تاریخ خلیفہ: ۲۱۳)۔

سن ۵۳ ہجری میں حضرت معاویہ نے عباد بن زیاد کو سجستان کا حاکم بنایا، وہ پیش قدمی کرتے قندھار تک پہنچے اور اسے فتح کیا (تاریخ خلیفہ: ۲۱۶، فتوح البلدان: ۴۱۸)۔

ان مہمات کا مقصد:

ان ممالک میں اتنے اندرون تک جانے والی ان مہمات میں سے کچھ کا مقصد تو باقاعدہ فتح حاصل کرنا ہوا کرتا تھا۔لیکن اس دور میں تاریخی مآخذ ہمیں کثیر تعداد میں ایسی مہمات کی بھی خبر دیتے ہیں جن میں اسلامی لشکر اندرونی علاقوں میں دور تک جاتے اور کچھ دن قیام کر کے واپس آجاتے تھے۔ایسی مہمات کا مقصد ان نئے علاقوں کے متعلق عسکری معلومات جمع کرنا، نیز مقامی گروہوں اور طاقتوں میں اپنے حلیفوں کی تلاش اور اگلی بڑی مہمات کی تیاری ہوا کرتا تھا۔یہ ایک کامیاب حکمت عملی تھی، جو ایشیائے کوچک میں رومیوں کے مقابلہ میں اور افریقہ کی جہادی مہمات میں بھی کامیابی کے ساتھ اختیار کی گئی تھی۔اور یہاں بھی کامیاب ثابت ہوئی [1]۔

حضرت معاویہ کے دور میں جہاد و فتوحات پر ایک نظر:

حضرت معاویہؓ کے دورِ خلافت میں سب سے اہم اور نمایاں عنوان مہمات جہاد و فتوحات ہیں۔اس دور میں دنیا کی سب سے بڑی طاقت بیزنطینی مملکت (روم) تھی۔جس کی حکومت ایشیا، افریقہ اور یورپ کے وسیع اقلیموں پر قائم تھی۔مسلمانوں کی اس سے دورِ نبوی سے ہی لگاتار جنگ چلی آ رہی تھی۔حضرت معاویہؓ نے، پہلے اپنی امارت کے دور میں، اس محاذ پر اسلامی ریاست کا کامیاب دفاع ہی نہیں کیا، بلکہ شام اور الجزیرہ (عراق) کے صوبے فتح بھی کیے۔اپنی خلافت کے دور میں تو انھوں نے رومی سلطنت عظمٰی کو گھٹنوں پر لا دیا۔ان کا سب سے بڑا کارنامہ اس عظیم طاقت سے اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت اور اس کے مقبوضات میں وسیع فتوحات ہیں۔

---

[1] قادة فتح السند و افغانستان، محمود شیت خطاب: ۱۵۴۔

حضرت عثمان کی شہادت کے فتنے نے ایسا انتشار واختلاف پیدا کر دیا تھا کہ، ایران کے جنوب سے لے کر شمال میں خراسان وآرمینیہ کے ممالک، اسی طرح مصر کے علاوہ سارے افریقہ میں بغاوتیں پھیل گئی تھیں۔ مفتوح ممالک کی بڑی تعداد ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ حضرت معاویہؓ نے پھر سے نظام حکومت مجتمع کیا۔ یہ سارے علاقے واپس لیے اور شاندار فتوحات انجام دیں۔

مسلمان دنیا کی سب سے بڑی طاقت:

حقیقت یہ ہے کہ حضرت معاویہ ہی کے دور میں مسلمان دنیا کی سب سے بڑی غیر متنازعہ طاقت بنے تھے، جس مقام پر پھر وہ صدیوں رہے۔ خلافت راشدہ کے دور میں ان کے مخالف روم کی طاقت اچھی طرح کمزور نہیں ہوئی تھی۔ یہ کارنامہ حضرت معاویہؓ کے دور میں ہی انجام پایا۔ بیزنطینی کا خاتمہ تو نہیں ہوا، مگر اب وہ مسلمانوں کے مقابلہ کی نہیں رہی تھی۔ یہ ان کا تاریخ ساز اور عظیم کارنامہ ہے کہ انہوں نے بیزنطی سلطنت کو اس حد تک کمزور کر دیا کہ وہ اپنے مقبوضات کو واپس لینے کو نہیں سوچ سکتی تھی۔ ان کارناموں سے ملکوں نہیں بلکہ بر اعظموں میں اسلام کی نشر واشاعت کے لیے اب میدان ہموار ہو گیا تھا، اور اسی کے نتیجہ میں بے شمار قومیں اسلام کی دولت سے سرفراز ہوئیں۔

اسلام کے اس عظیم مجاہد کی فتوحات ہمہ جہت تھیں۔ چہار جانب اس کے جہاد کا غلغلہ بلند تھا۔ ایک طرف ان کے گھوڑوں کی ٹاپیں، مصر، لیبیا، تونس اور الجزائر کے ممالک پار کر کے، افریقہ کے مغرب میں مراکش کی سرحدوں پر دستک دے رہی تھیں، دوسری طرف ان کے شہ سوار (فارس وخراسان میں اسلامی اقتدار ایک مرتبہ پھر مستحکم کر کے) چین کے کوہساروں پر شمشیر زنی کر رہے تھے۔ تیسری جانب وہ آرمینیہ اور آذر بائیجان میں مسلمانوں کی مستحکم حکومت قائم کر چکے تھے۔ چوتھی طرف ان کی فوجیں قسطنطنیہ کی دیواروں کو دو مرتبہ دہلا چکی تھیں۔ اور ایک مرتبہ تو سات سال تک اس کا محاصرہ کر کے رومیوں کو لرزہ براندام کیے رہی تھیں۔ ایشیائے کوچک میں مسلمانوں نے ملک روم کو اپنی ترکتازیوں سے پامال کر رکھا تھا۔ روم کی ناقابل تسخیر طاقت کو انہوں نے اس درجہ کمزور کر دیا تھا کہ بیزنطی بادشاہ ان کے خوف سے اپنی راجدھانی سے بھاگنے پر مجبور ہو رہا تھا۔ پانچویں سمت بحر روم (جو بین الاقوامی تجارت کی سب سے اہم گزرگاہ اور عالمی سطوت کا نشان تھا) مسلمانوں کی بازی گاہ بن چکا تھا۔ شام ولبنان کے ساحل ان کے زیر تصرف تھے۔ قبرص کا اہم جزیرہ انہوں نے فتح کر لیا تھا اور ان کی فوجیں رومیوں سے اس کی حفاظت کے لیے وہاں مقیم رہتی تھیں۔ بحر متوسط کے شمال میں روڈس اور کریٹ کے جزیرے ان کے زیر تصرف اور وہاں ان کے فوجی اڈے قائم تھے۔ سسلی پر وہ اپنے جہاز لنگر انداز

کر چکے تھے۔ بحر متوسط میں مغربی افریقہ کے ساحلی مقامات، خلیج بجایہ سے لے کر بنزرت وقرطاج اور طرابلس سے لے کر اسکندریہ تک، رومیوں کے سارے بحری اڈوں پر مسلمان قابض ہو چکے تھے اور بحر متوسط میں کوئی ان کی مرضی کے بغیر پر نہیں مار سکتا تھا۔

امام ذہبی لکھتے ہیں: وصار ملك الدنيا تحت حكمه، یعنی فتوحات کی وسعت کا یہ حال تھا کہ گویا ساری دنیا ان کے ماتحت آگئی۔ (ذہبی: دول الاسلام: ۱/ ۵۳۔ ط دار صادر ۱۹۹۹ء)۔ اسلامی ریاست (مشرق میں) بخارا سے مغرب میں قیروان (تیونس) تک پھیل گئی تھی۔ دوسری طرف جنوب میں یمن سے آرمینیہ تک کے ممالک اس کی قلم رو میں داخل تھے۔ اس عظیم سلطنت میں یمن، حجاز، شام، مصر، مراکش، عراق، الجزیرہ، آرمینیہ، ایشیائے کوچک کے کچھ علاقے، ایران، خراسان، ہندوکش کی پہاڑیوں سے لے کر دریائے آمو کے پار کے ممالک شامل تھے۔

اس کارنامہ کی اصل اہمیت کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت معاویہ کے ہاتھوں کاروبار خلافت اس وقت آتا ہے جب مسلمان ایک افسردگی و بے یقینی کے شکار ہو چکے تھے۔ ان کی قومی زندگی کا مقصد موہوم اور مستقبل مبہم تھا۔ مدت سے جہاد موقوف اور سرحدیں خالی تھیں۔ یہاں تک کہ عہد عمری اور عہد عثمانی کے اکثر مفتوح علاقوں میں بغاوتیں پھیل گئی تھیں۔ مسلمانوں کو صرف عراق وشام اور اندرون عرب میں استحکام حاصل تھا۔

حضرت معاویہ نے شعبۂ جہاد کی تنظیم نو اس خوبی سے کی کہ مدت دراز تک خلافت اسلامیہ انہی کے بنائے نظام کے ذریعہ کامیابیاں حاصل کرتی رہی۔ انہوں نے اپنے دور میں امت کو ایک مجاہد امت اور اسلامی خلافت کو تسخیر کائنات پر مامور نظام بنانے میں کامیابی حاصل کی۔ اس سلسلے میں ان کے اہتمام وشغف کا اثر ان کی پوری حکومتی مشنری پر ایسا پڑا کہ یہی اس کا ہمہ وقتی فکر ومشغلہ بن گیا۔ کتب تاریخ کے جھروکے سے آپ اس عہد کے ماحول میں جھانکنے کی کوشش کریں تو ہر طرف جہاد کا غلغلہ بلند سنائی دے گا اور مسلمانوں کے سر برآوردہ طبقے پر خدا کی مخلوق کو طاغوتوں اور ظالموں سے آزاد کرنے کی ایک دُھن سوار نظر آئے گی۔

مورخ ابن کثیر نے ان کے عہد پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

والجهاد في بلاد العدو قائم، وكلمة الله عالية. والغنائم ترد إليه من أطراف الأرض، والمسلمون معه في راحة وعدل، وصفح وعفو.

یعنی ان کے عہد میں ''اللہ کا کلمہ بلند اور جہاد مسلسل جاری رہا، مال غنیمت کی بہتات تھی۔ مسلمان ان کی خلافت میں راحت، اور انصاف کے زیر سایہ رہتے تھے۔ اور ان کے عفو وکرم سے لطف اندوز

تھے‘‘ (البدایۃ والنہایۃ:۸/ ۱۲۷)۔

ایک مقام پر حافظ ابن کثیر نے عموما خلافت بنوامیہ پر جو تبصرہ کیا ہے وہ سب سے زیادہ اس کے بانی پر صادق آتا ہے: وہ لکھتے ہیں:

> اس دورِ خلافت میں جہاد کا غلغلہ بلند تھا۔ خلفاء کو اسی سے سب سے زیادہ سروکار تھا۔ لہٰذا مشرق ومغرب اور بر و بحر میں اسلام کا بول بالا ہو گیا۔ کفار کمزور و مطیع اور اہل شرک کے دل ہیبت زدہ ہو گئے۔ مسلمان جدھر رخ کرتے فتوحات ان کے قدم چومتیں۔ ان کے ہر لشکر میں ایسے (صحابۂ کرام) اولیاء اللہ، صالحین، علماء اور کبار تابعین کی بڑی تعداد ہوتی جن کی برکت سے اللہ کی مدد اترتی تھی۔
>
> (البدایۃ والنہایۃ:۹/ ۱۰۴)

(غالبا) حضرت معاویہ کے نزدیک ان کی سب سے بڑی ذمہ داری جہاد فی سبیل اللہ کا قیام وتوسیع تھا۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ مملکت کے مالی وسائل کا بڑا حصہ جہاد پر صرف ہوتا تھا۔ فوجیوں کی تنخواہوں، انعامات، ہتھیاروں کی فراہمی، ہر سمت سرحدوں اور نئے مفتوح علاقوں میں فوجی اڈوں اور چھاونیوں کی تعمیر کے علاوہ، ان کے دور میں اعلیٰ درجے کے متمدن اسلامی شہروں کی آبادکاری کی جاتی۔ وہاں اسلحہ کے ڈپو بنائے جاتے، قلعے اور شہر پناہوں کی تعمیر ہوتی، خندقیں کھودی جاتیں۔ ان شہروں میں مسلم عرب قبائل کو لے جا کر بسایا جاتا اور ساتھ ہی اس کا بھی انتظام کیا جاتا کہ وہاں ان کا قیام خالص اسلامی ماحول ومزاج کے سائے میں ہو۔ ساحلوں پر نگرانی کے لیے اونچے منارے اور برج تعمیر کیے جاتے۔ سرحدوں پر نگرانی کے لیے قلعے اور فوجی تنصیبات قائم کی جاتیں، اور پہاڑی دروں اور راستوں میں رات میں روشنی کے لیے بڑے بڑے مشعل روشن کیے جاتے تاکہ دشمن اندھیرے کا فائدہ نہ اٹھا سکے۔

اسلامی بحریہ کے تو وہ مؤسّس تھے۔ اور دراصل اسلامی مملکت کا بیزنطیوں سے دفاع اور افریقہ میں اسلامی نشر واشاعت اسی بحریہ کی مرہون منت تھی۔ انہوں نے بحری کشتیوں اور اسلحہ کی صنعت کے لیے شام سے مصر تک کے ساحلی مقامات پر کارخانے اور اڈے تعمیر کیے۔ (تاریخ یعقوبی: ۲/ ۲۴۳، فتوح البلدان: ۱۰۴)۔ اس سب میں کتنے مالی وسائل درکار ہوتے ہوں گے اس کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔

تیرہواں باب

امیر المؤمنین حضرت معاویہؓ کا نظام حکومت

خلافت معاویہؓ کی دینی واخلاقی حیثیت:

حضرت معاویہؓ کی حکومت کی دینی وشرعی حیثیت کیا تھی؟ اور اس کا اخلاقی معیار کیسا تھا؟ اس کے تعین کے لیے اس حکومت کے مقاصد، پالیسیوں، قوانین، طرزِ عمل، ارکان حکومت کے کردار اور حالات وواقعات یقینی پیمانہ ہیں، جن کے جائزے سے کسی حکومت کے دینی اور اخلاقی مقام ومعیار کا یقینی علم ہو جاتا ہے۔ لیکن ان پیمانوں سے بھی پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کی گئی بعض ایسی روایات کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے، جو اس دورِ حکومت کے معیار و کردار اور اسلامی تاریخ میں اس کے دینی مقام اور اخلاقی حیثیت کو متعین کرتی ہیں۔

نبوی پیشین گوئی کہ اس دور خلافت میں دین قائم اور احکام قرآن نافذ ہوں گے:

اس سلسلے میں سب سے پہلے حضرت ابوالدرداء، حضرت عمرو بن العاص، حضرت ابوامامہ وغیرہ کی وہ احادیث ہیں، جو ہم خلافت معاویہ کے باب میں ذکر کر آئے ہیں، جن کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا کہ:

> مجھے ایک خواب میں دکھایا گیا کہ قرآن کا ''عمود''[1] میرے سر کے نیچے سے نکال لیا گیا۔ مجھے لگا کہ یہ اب کہیں لے جایا جائے گا، تو میں اس کو دیکھتا رہا۔ آخر وہ شام لے جایا گیا۔ سن لو! فتنوں کے وقت ایمان کا مرکز شام ہوگا۔

حافظ ابن حجر نے ذکر کیا ہے کہ حضرت ابوالدرداءؓ کی روایت امام بخاری کی شرط ومعیار کی ہے اور امام بخاریؒ نے کتاب التعبیر میں اس روایت کی طرف اشارہ بھی فرمایا ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ علماءِ تعبیر کے نزدیک

---

[1] عمود اس شے کو کہتے ہیں جس کے سہارے پر کوئی دوسری چیز قائم ہوتی ہے۔

اگر کوئی شخص خواب میں خیمہ کا عمود دیکھے تو اس سے مراد دین اور ایسا شخص ہے جس پر دین کے سلسلے میں اعتماد کیا جائے (فتح الباری: ۱۲/ ۴۰۳)۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ فتنوں کی جنگوں کے بعد خلافت اسلامیہ اور قوت اسلام کا مرکز شام میں ہوگا۔

یہ دور بادشاہت اور رحمت کا دور تھا:

طبرانی نے بسند حسن حضرت ابن عباسؓ کے حوالے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد روایت کیا ہے کہ:

> اِس دین کا شروع کا زمانہ نبوت ورحمت کا دور ہوگا، پھر خلافت ورحمت کا، اس کے بعد بادشاہت ورحمت کا دور ہوگا، پھر امارت اور رحمت کا زمانہ آئے گا۔ اس کے بعد تو (لوگ) حکومت پر قبضہ کرنے کے لیے گدھوں کی طرح (لڑیں گے اور) ایک دوسرے کو کاٹیں گے[۱]۔

ظاہر ہے کہ نبوت ورحمت کا دور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تھا۔ اور خلافت ورحمت کا دور خلافت راشدہ کا۔ اس کے بعد بادشاہت اور رحمت کے جس زمانے کا ذکر ہے، اس کا پہلا مصداق حضرت معاویہؓ کا دور ہی ہے۔

ملک عضوض کی روایت اور اس کا مصداق؟

اس روایت کے علاوہ حضرت حذیفہ بن الیمانؓ کی ایک اور روایت میں مسلمانوں کی حکومت کے حالات کے متعلق یہی پیشین گوئی آئی ہے، اس میں مسلمانوں کی حکومت کے ادوار اس ترتیب سے بیان کیے گئے ہیں:

> تكون النبوة فيكم ما شاء الله أن تكون، ثم يرفعها إذا شاء أن يرفعها، ثم تكون خلافة على منهاج النبوة، فتكون ما شاء الله أن تكون، ثم يرفعها إذا شاء الله أن يرفعها، ثم تكون ملكا عاضا...(مسند احمد: ۱۸۴۰۶)
>
> یعنی تمہارے درمیان پہلے نبوت کا دور رہے گا، پھر جب اللہ چاہے گا اسے اٹھالے گا۔ پھر خلافت علیٰ منہاج النبوۃ (جس کو خلافت راشدہ کہا جاتا ہے) کا دور رہے گا، پھر جب اللہ چاہے گا اسے اٹھالے گا۔ پھر ایک دانت کاٹنے والی بادشاہت کا دور ہوگا۔

جیسا کہ ناظرین کرام نے دیکھا اس روایت میں خلافت ورحمت کے دور کے بعد ''بادشاہت ورحمت'' کا دور مذکور نہیں ہے، بلکہ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے بعد ''ملک عاض'' (یعنی کاٹنے والی بادشاہت) کے دور کا تذکرہ ہے۔ دونوں روایات محدثین کے نزدیک معتبر ومستند ہیں۔ امت کے علماء دونوں کے مجموعے سے اس نتیجے تک پہنچے ہیں کہ مسلمانوں کی حکومت کی ترتیب یوں ہوگی کہ نبوت کا دور تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات پر ختم ہوا۔

---

[۱] معجم کبیر: ۱۱/ ۸۸، مجمع الزوائد: ۵/ ۱۹۰، ہیثمی نے اس کے تمام راویوں کو ثقہ قرار دیا ہے۔

اور خلافت نبوت کا دور خلفاء راشدین کے ساتھ رخصت ہوا۔ پھر اس کے بعد حضرت ابن عباس کی روایت کے مطابق بادشاہت اور رحمت کا دور ہے، جو حضرت معاویہؓ سے شروع ہوا۔

اس روایت کی اہمیت اس وجہ سے بھی بہت بڑھ جاتی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس اس کو روایت کرتے ہیں، انہوں نے حضرت معاویہؓ کا پورا دور پایا ہے۔ وہ خوب سمجھتے تھے کہ خلافت و نبوت کا دور رخصت ہونے کے بعد اب یہ دور اُن کے سامنے ہے اور وہی اس کا مصداق ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

> حضرت معاویہ کا دور ''بادشاہت اور رحمت'' کا دور تھا، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے۔ علماء کا اتفاق ہے کہ حضرت معاویہؓ امت کے بادشاہوں میں سب سے بہتر بادشاہ تھے۔ (مجموع الفتاویٰ: ۴/۴۷۸)۔

حضرت حذیفہؓ کی روایت میں بھی ''ملک ورحمۃ'' کا ذکر تھا:

راقم سطور عرض کرتا ہے کہ مسند احمد وغیرہ میں حضرت حذیفہؓ کی بیان کردہ اس روایت میں ''ملک ورحمۃ'' یعنی بادشاہت اور رحمۃ کے دور کا تذکرہ راوی سے چھوٹ گیا ہے۔ معجم اوسط طبرانی، مسند ابوبکر ابن ابی شیبہ اور مسند ابوداؤد طیالسی کی روایت میں حضرت حذیفہؓ کی یہی روایت حسن سند سے آئی ہے اور تینوں کتابوں میں خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے مرحلے اور ایک دوسرے کو کاٹنے والے ''ملک عضوض'' کے دور کے درمیان ایک اور دور کا تذکرہ ہے۔ جس کو راوی نے (غالباً یاد نہ رہنے کی وجہ سے) ''ثم یکون کذا و کذا'' (ایسا اور ایسا دور) کے لفظ سے بیان کیا ہے۔ اس روایت کی سند بھی قوی ہے۔ (معجم اوسط: ۶/ ۳۴۵ بسند حسن)۔

حافظ بوصیری نے اس کو حافظ ابوبکر ابن ابی شیبہ اور ابوداود طیالسی کے مسند کی حوالے سے بھی نقل کیا ہے اور اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔ اسی طرح حافظ ابن حجر نے اس کو مسند ابن ابی شیبہ کے حوالے سے نقل کیا ہے، اور جو سند ذکر کی ہے وہ صحیح ہے[۱]۔ ''ایسا اور ایسا دور'' یہ وہی دور ہے جس کو حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں بادشاہت ورحمت کا دور کہا گیا ہے۔ بہر حال اس روایت نے یہ حقیقت واضح کردی کی کہ خلافت نبوت کے بعد رحمت والی بادشاہت کے دور کا ذکر حضرت حذیفہ اور حضرت ابن عباس دونوں ہی کی روایات میں تھا۔

حضرت معاویہ کا دور ملک عضوض کا مصداق قطعی نہیں:

اب حضرت حذیفہؓ کی ملک عضوض والی حدیث کی بھی مکمل روایت ہمارے سامنے آگئی، اور ہمارے سامنے وہ صحیح روایت بھی ہے، جو خلافت راشدہ کے بعد ملک ورحمۃ کا دور ذکر کرتی ہے۔ پھر اس کا کوئی جواز باقی

---

۱ اتحاف الخیرۃ المہرۃ: ۴۱۶۴، ۷۵۵۲، المطالب العالیہ: ۷/ ۴۳۳۔

نہیں رہتا کہ حضرت معاویہؓ کی خلافت کو ملک عضوض کا مصداق قرار دیا جائے۔مگر اہل تشیع کے یہاں حقائق نہیں تعصب کی بنا پر فیصلے ہوتے ہیں۔اور جب تعصب قلب وذہن کو اسیر بنا چکا ہو تو دلائل بے اثر ہو جاتے ہیں۔

حضرت معاویہؓ کی سیرت اور حکومت وامارت میں ان کا طرز عمل کسی پردۂ خفا میں نہیں تھا۔وہ بیس سال سے شام اور الجزیرہ میں حکومت کر رہے تھے۔اگر وہ سخت ظالم ہوتے اور ان کی حکومت 'ملک عضوض' ہوتی تو کیا حضرت حسن کے لیے ان سے صلح جائز ہوتی؟؟اور اگر اس کے نتیجے میں شدید ظلم وجور واستبداد کی یا فسق وفجور کی حکومت قائم ہوتی تو کیا رسول اللہ ﷺ نے اس صلح کی تعریف وستائش فرمائی ہوتی اور اس کو امت کے لیے باعث صلاح وبرکت قرار دیا ہوتا؟؟

ابھی ہمارے سامنے حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت ابو درداءؓ، حضرت ابن عمرؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ وغیرہ صحابہ وتابعین کی حضرت معاویہؓ کی حکومت کے بارے میں صحیح اسانید سے وارد شہادتیں آئیں گی، جن میں وہ ان کو ایک عادل وکرم گستر اور بہترین حاکم قرار دیتے ہیں۔کیا یہ جلیل القدر صحابہ کسی ظالم بادشاہت اور 'ملک عضوض' کی ایسی ستائش کر سکتے تھے؟افسوس تشیع زدہ لوگوں پر بھی ہے، ساتھ ہی ان لوگوں پر بھی جو حضرت معاویہ کے دور حکومت کی کچھ ستائش بھی کرتے ہیں تو، حقائق سے ناواقف ہونے کے نتیجہ میں، لہجہ کمزور ولرزیدہ اور انداز اعتماد سے خالی ہوتا ہے۔

اس دور کی ایک اور توصیف:

اس دور کی ثنا وتوصیف صحیح مسلم وغیرہ کی اس حدیث میں بھی آئی ہے، جس میں آں حضرت ﷺ کا یہ ارشاد نقل ہوا ہے کہ: لا یزال ھذا الدین عزیزا منیعا إلی اثنی عشر خلیفة،یعنی اسلام کی شوکت وعزت کا زمانہ لگاتار جاری رہے گا، جس میں دین محفوظ وقوی رہے گا، یہاں تک کہ ۱۲ حکمراں نہ گزر جائیں۔، یہ سب قریش میں سے ہوں گے(صحیح مسلم :۱۸۲۱)۔ ۱۲ویں خلیفہ ہشام بن عبدالملک کی وفات ۱۲۵ھ میں ہوئی۔یہ اسلامی حکومت وریاست کا تاسیسی سنہرا دور تھا۔جس کو مشہور احادیث میں خیر القرون یعنی بہترین زمانہ کہا گیا ہے۔

ملوکیت اور اسلام:

بہر حال حضرت معاویہؓ کا دور اسلام کی تاریخ میں خلافت کے بعد بادشاہت (ملوکیت) کے دور کا آغاز تھا۔بعض جدید مفکرین (مثلا مولانا مودودیؒ) نے ملوکیت کو ایک قطعا ناقابل قبول شے اور روح اسلام کی عین ضد باور کرایا ہے۔اور خلافت سے ملوکیت کے سفر کو گویا روح اسلام سے رجعت قہقریٰ قرار دیا ہے۔یوروپ میں بادشاہانہ نظام سے بغاوت اور جمہوریت کی بین الاقوامی دعوت وتشہیر نے عوامی ذہن میں ملوکیت سے نفرت کا مزاج

پیدا کر دیا ہے، یہ اِس فضا سے تاثر کا نتیجہ ہے۔حال آں کہ قرآن وسنت کے صحیح نقطۂ نظر سے بادشاہت اسلامی نظام کی کوئی ضد شے نہیں ہے۔وہ اگر شریعت وعدل کی محافظ ہواور اسلام کے مقاصد کو قائم کرنے والی ہو تو وہ ایک قابل قبول نظام ہے، اس کے تحت جس قدر عبادت خداوندی کی ترویج اور عدل اجتماعی کا قیام ہو وہ اتنی ہی لائق ستائش ہوگی۔اسی لیے اللہ تعالیٰ کے بعض جلیل القدر نبی جیسے حضرت داوود اور حضرت سلیمان علیہما السلام بادشاہ اور ملوکیت کے نظام کے مطابق حکم راں ہوئے ہیں۔قرآن نے ان کو بادشاہ ہی کہا ہے۔ان کی بادشاہت نبوت کے تقدس وپاکیزگی کے ہم رنگ اور دین کے اعلیٰ اہداف ومقاصد سے ہم آہنگ تھی۔اور قرآن نے بطور تعریف ہی ذکر کیا ہے کہ اللہ نے طالوت کو خود بادشاہ مقرر فرمایا اور وقت کے نبی کے ذریعے بنی اسرائیل کو انہیں بادشاہ تسلیم کرنے کا حکم فرمایا، ان اللہ قد بعث لکم طالوت ملکا۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعض احادیث میں ملوکیت کے بعض نظاموں (خلافت معاویہ) کی تعریف فرماتے ہوئے ان کو ’’ملک ورحمۃ‘‘ کے الفاظ سے یاد کیا گیا ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے اس کی تصریح کی ہے کہ ملوکیت ایک جائز نظام ہے اور فرمایا ہے کہ:

> حضرت معاویہ کی خلافت میں اگرچہ ملوکیت کی آمیزش تھی، لیکن اس سے ان کی خلافت کی نفی نہیں ہوتی۔یہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح قرآن کی تصریح کے مطابق حضرت سلیمان علیہ السلام بادشاہ تھے (مجموع الفتاویٰ: ۳۵/۲۷)۔

عہد معاویہ کی غلط تصویر کشی:

ملوکیت کے بارے میں صحیح شرعی تصور سے تجاوز کے علاوہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور کتاب خلافت وملوکیت میں حضرت معاویہ اور ان کے عہد کی جو تصویر پیش کی گئی تھی، وہ ایک طرف تو خالص غیر مستند اور جھوٹی روایات پر قائم تھی، جب تحقیق کے ہاتھوں نے انہیں پرکھا تو وہ افترا پردازوں اور بے سند باتیں نقل کرنے والوں کی کرشمہ سازیاں نکلیں۔پھر ان روایات کی سیاہی لے کر مصنف نے اپنے سحر انگیز قلم سے اُس عہد کی جو تصویر بنائی، وہ سراسر غلط اور بالکل جانب دارانہ تھی، بلکہ اس میں کچھ ایسے طبع زاد اضافے اور مبالغے بھی تھے، جن کی اصل ان موضوع وجھوٹی روایات میں بھی نہیں تھی۔شیخ الاسلام حضرت مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ نے اپنی مایہ ناز تحقیقی تصنیف امیر معاویہ اور تاریخی حقائق میں اس کی کمزوریوں کو بالکل واضح فرما دیا ہے۔

مولانا مرحوم نے عہد معاویہ کو خلافت راشدہ کے بالکل مختلف سمت میں سفر کرنے والے دور کے طور پر پیش کیا ہے۔انہوں نے تعصب زدہ جھوٹے راویوں کے بیانات پر شاعری کی عمارت قائم کی ہے۔اگر وہ ذرا گہری تحقیق اور محدثین کے طرز پر روایات کو جانچنے کی زحمت کرتے اور محدثین کی صحیح ومتصل روایات کو کسوٹی بنا کر

تاریخی روایات کو پرکھتے تو رنگ غزل کچھ اور ہی ہوتا۔ مگر شاعری تو عموماً، حقائق کی زمین پر نہیں، تخیل کی فضا میں عمارت بناتی ہے۔

خلافت راشدہ اور حضرت معاویہؓ کے دور حکومت میں فرق کی نوعیت:

حضرت مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ حضرت امیر معاویہ کے نظام حکومت کے بارے میں اہل سنت کے تحقیقی اور منصفانہ موقف کے ترجمانی کرتے ہوئے بڑے جنچے تلے الفاظ میں فرماتے ہیں:

..... اہل سنت کے نزدیک بلاشبہ انکی خلافت اور خلفائے راشدین کی خلافت دونوں ایک معیار کی نہیں تھیں، بلکہ دونوں میں فرق تھا۔ لیکن اس فرق کی جو تشریح مولانا مودودی صاحب نے فرمائی ہے۔ وہ نہ معقول ہے، نہ مستند طریقے سے ثابت ہے۔ اور نہ اہل سنت کے عقائد سے میل کھاتی ہے۔ مولانا مودودی صاحب نے حالات کے اس تغیر کی جو تشریح کی ہے، اس سے ذہن میں نقشہ کچھ اس طرح بنتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے بعد یک بیک حالات بالکل پلٹ گئے، خلافت راشدہ تمام مثالی خوبیوں کا مجموعہ تھی، مگر حضرت معاویہؓ کے خلافت سنبھالتے ہی اس میں ملوکیت کی تمام خرابیاں پیدا ہوگئیں، تقویٰ کے فوراً بعد فسق حکمراں ہوگیا، اور جو معاشرہ خلافت راشدہ کے عہد میں تاریخ کا پاکیزہ ترین معاشرہ تھا، اسی معاشرہ میں حضرت معاویہؓ کے عہد میں نفسانیت کی تمام پستیاں جمع ہوگئیں۔ ۴۰ھ تک خلافت کی طرف سے علانیہ قانون شکنی کا تصور نہ ہوسکتا تھا۔ اور ۴۱ھ میں قانون شکنی بدعت اور تحریف دین کی حد تک پہنچ گئی۔ ۴۰ھ میں رشوت ستانی کا خیال کسی کو نہ آتا تھا، ۴۱ھ میں اسے شیر مادر سمجھ لیا گیا۔ ۴۰ھ تک کافروں کو بھی سب وشتم نہ کیا جاتا تھا، اور یہاں جلیل القدر صحابہ پر سب وشتم کی بوچھاڑ ہونے لگی، پہلے مال غنیمت میں خورد برد کا شبہہ بھی نہیں کیا جاسکتا تھا اور ایک ہی دو سال میں اب باقاعدہ اس میں خیانت کے لئے احکام جاری ہونے لگے، پہلے کسی کی مجال نہ تھی کہ وہ اپنے اقتدار کے سہارے لوگوں پر ظلم وستم کرسکے، اور اب یہ ظلم وستم مرکز کی پالیسی قرار پا گئی، پہلے عوام کی غیرت اور حکام کی خدا ترسی کا عالم یہ تھا کہ معمولی سے معمولی آدمی خلیفہ کا گریبان تھام سکتا تھا، اور اب یک ہی سال کے فرق سے لوگوں کی بے غیرتی اور حاکم کے جبر وتشدد کا یہ حال ہوگیا کہ ضمیروں پر قفل چڑھ گیا اور کوڑے حق گوئی کا انعام بن گئے۔ غرض یہ کہ ۴۰ھ کے ختم ہوتے ہی شخصی مفادات پر مبنی سیاست کا وہ بازار گرم ہوگیا جو آج بیسویں صدی میں ہمیں نظر آتا ہے۔ (حضرت معاویہؓ اور تاریخی حقائق: ۱۴۱۔ ۱۴۴)

خلافت راشدہ کے قریب ومشابہ نظام حکومت:

جب کہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ کی خلافت نہ کسی عدم سے وجود میں آنے والی نئی سلطنت کا ڈھانچہ تھی اور نہ کسی انقلاب کے نتیجہ میں قائم ہونے والا ایسا نیا نظام حکومت، جو پچھلے نظام اور اس کے طریق ومنہاج کے عین ضد ہو۔ مورخ ابن خلدون لکھتے ہیں کہ حضرت معاویہ کی حکومت کو خلفاء راشدین کی حکومت کے ساتھ مربوط سمجھنا چاہیے۔ فضیلت وعدالت اور شرفِ صحبتِ نبوی میں وہ خلفاء راشدین کے بعد کے درجے پر فائز ہیں۔ (تاریخ ابن خلدون: ۲/ ۶۵۰)۔ یہ خیال صرف خوش عقیدگی پر قائم نہیں ہے، اگر چہ ایسی خوش عقیدگی کی بھی شرعی بنیادیں موجود ہیں۔ حضرت معاویہؓ کی صحابیت اور ان کے دور کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کی پیشین گوئیاں ایسی خوش عقیدگی کی طاقت ور شرعی بنیاد فراہم کرتی ہیں۔

لیکن اس کے علاوہ اس تقارب ومماثلت کی ایک بڑی دلیل یہ بھی ہے کہ مملکت کا نظام چلانے والوں کی بڑی تعداد انہی لوگوں پر مشتمل تھی جو خلافت راشدہ کی مشین کے کل پرزے تھے۔ خود سربراہ مملکت حضرت معاویہ حضور رسول کریم ﷺ کے سکریٹری تھے۔ عہد عمری وعثمانی کے وہ سب سے اہم گورنر اور معتمد کارپرداز تھے۔ حضرت عمرؓ نے ان کی تربیت فرمائی تھی۔ اور خوب نظر رکھی اور تعریف فرمائی تھی۔ ان کے خلاف اس طویل مدت میں (کسی صحیح روایت کے مطابق) کبھی ظلم وبدعنوانی یا مقاصدِ دین یا خلافت علی منہاج النبوت کے معیار کی خلاف ورزی کا کوئی الزام مرکز کو نہیں ملا۔ کیا یہ کوئی معمولی درجے کی بات ہے؟

اب جب وہ خلیفہ بنے تو اس کا خاص اہتمام کیا کہ خلافت راشدہ کے، خصوصا حضرت عمر وعثمان کے دور کے باقی ماندہ لوگوں کو اپنی سابقہ ذمہ داریوں پر بحال کیا جائے۔ ان کے تقریبا تمام اہم گورنر اور عامل وہ حضرات تھے جن پر عہد نبوی یا خلافت راشدہ کے دوران اعتماد کیا گیا تھا۔ فوج ہو کہ علماء، اعیان ہوں یا اساطینِ حکومت، سب کی اکثریت عہد خلافت راشدہ کی مجرب اور دیدہ وآزمودہ تھی۔ تو ذرا خیال فرمایئے! اگر بڑی تعداد میں ارکان حکومت وہی تھے جو خلافت راشدہ میں رہے تھے، کارپردازان حکومت وہی تھے جو خلافت راشدہ کے معیار پر پرکھے جاچکے تھے، تو نظام پہلے کی ضد کیسے ہوسکتا ہے؟ مگر شیعیت زدہ ذہن کہتا ہے کہ مشین کے سب کل پرزے وہی تھے، مگر اب وہ پہلے سے عین ضد نتائج پیدا کر رہی تھی۔ اس غیر معقول رویہ کو علم وتحقیق اور عدل واعتدال سے کیا واسطہ؟

یہ دور اگر چہ موعود نبوی کے مطابق، خلافت راشدہ کا دور نہیں تھا، مگر اس میں اور خلافت راشدہ میں تسلسل کا رشتہ یقینا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے وعدے کے مطابق خیر القرون میں سے یہ اولین دور تھا۔ حضرت معاویہ کے دور میں یقیناً، زمانے اور نسل کی تبدیلی کے زیر اثر، تنزّل اور تدریجی تبدیلیاں تو فطری طور پر آرہی تھی۔ لیکن فکر

ونظر اور منہاج و کردار کا کوئی ''انقلاب'' قطعاً نظر نہیں آتا تھا۔ مستند و معتبر تاریخی ثبوتوں کی روشنی میں یہی حقیقت نظر آتی ہے کہ خلافت راشدہ اور عہد معاویہ کے درمیان کوئی ٹھوس بنیادی اختلاف نہیں تھا، سوائے دو چیزوں کے: (۱) پہلا حضرت معاویہؓ کے بطور خلیفہ تقرر وانتخاب کا طریقہ وانداز۔ (۲) اور دوسرا بیٹے کو ولی عہد بنانا۔

خلافت راشدہ کی طرح دینی حدود کی محافظ حکومت:

بہر حال مذکورہ دو پہلوؤں کے علاوہ، انحطاط وزوال کے فطری قانون کے ساتھ، پچھلے نظام کا تسلسل حکومت اور زندگی کے ہر گوشہ میں نظر آتا تھا۔ اس عہد میں پوری وضاحت وصراحت کے ساتھ ریاست کا دستوری تصور اور قانون مملکت وہی رہا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوی حکومت اور خلافت راشدہ کے دور میں تھا۔ اسلامی خلافت اسی تصور حیات اور عقیدے پر قائم تھی جس پر عہد رسول میں ریاست قائم ہوئی تھی۔ عدلیہ میں یہی قانون رائج تھا۔ زمانے کے بہترین اہل علم اور اصحاب دیانت اشخاص منصب قضاء پر فائز تھے۔ قانون کی حکم رانی ایسی تھی کہ بسا اوقات یہ قاضی خلیفہ اور دیگر حکمرانوں کے خلاف فیصلے کرتے تھے اور وہ فیصلے نافذ ہوتے تھے۔ اس دور میں کسی چیز کے جاری ونافذ ہونے کے لیے بس یہ کافی تھا کہ وہ اسلامی شریعت کا حکم ہے۔

زندگی کا اسلامی رنگ محفوظ رکھنے، معاشرے میں دینی روح وجذبے کی تقویت اور تقویٰ واخلاقی پاکیزگی پیدا کرنے کی کوشش ریاست کی اولین ترجیح تھی۔ معروف ومنکر کے پیمانے وہی اور اصلی تھے۔ خود خلیفہ اور گورنر امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو اپنا فرض منصبی سمجھتے تھے اور اس فریضہ کو ادا کرتے تھے۔ ہر سو علماءِ صحابہؓ کرام دین کی تعلیم واشاعت میں مصروف تھے۔ مفتوح علاقوں میں مساجد اور نمازوں کا قیام، قرآن وحدیث کے معلمین کا تقرر حکومت کا معمول تھا۔ صوبہ جات کے گورنروں میں حاکم اعلیٰ کو امیر علی الصلاۃ اور مالی امور کے منتظم کو امیر علی الخراج کہا جاتا تھا۔ حاکم اعلیٰ کا امیر علی الصلاۃ کہلانا خود بتاتا ہے کہ ریاست کا دستوری تصور بعینہ وہی تھا جو قرآن اور رسول نے طے کیا تھا۔ قرآن نے اسلامی ریاست کا اولین کام اقامت صلات طے کیا تھا اور پیشین گوئی کی تھی کہ صحابہؓ رسول کو اللہ تعالیٰ جب حکومت دے گا تو ان کا خاص مشن نماز کا قیام ہوگا۔ الَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۔(الحج:۴۱)۔

ریاست کے مالی وسائل میں اضافے کے ساتھ عوام کی بہبود اور معاشی آسودگی میں ترقی ہوتی جاتی تھی۔ جہاد کا شعبہ تو اس دور میں پھر اس شان کے ساتھ جاری ہوا کہ عہد عمری کی یاد تازہ ہوگئی۔ اگر چہ خلافت فاروقی کی برکات اور خوبیاں بے نظیر ہیں، مگر ظاہری وسعت میں یہ دور اس سے آگے بڑھ گیا۔ وہ سلطنت روما اب زد پر تھی

اور لگا تار پسپا کی جا رہی تھی، جو صدیوں سے نا قابل تسخیر سمجھی جاتی تھی۔ برو بحر میں مجاہدین کی اذانیں گونج رہی تھیں۔ اور اس کے نتیجے میں مشرق میں چین سے لے کر مغرب میں الجزائر و مراکش تک اور شمال میں آرمینیہ و آزربائیجان تک اسلام پھیلتا جا رہا تھا۔

اہم گورنر اور افسران حکومت:

کسی حکومت کی تاریخ کے سب سے اہم سوالات یہ ہوتے ہیں کہ اس کی وہ روح کیا تھی جو پورے نظام میں جاری تھی اور مشینری کے تمام کَل پرزوں کو متحرک رکھتی تھی؟ حکومت کے مقاصد کیا تھے جن کو وہ حاصل کرنا چاہتی تھی؟ وہ کون سے اور کس قسم کے اہداف تھے جن کے لیے وہ مصروف عمل رہتی تھی؟ اس کی پالیسیاں کیسی تھیں؟ طرز حکومت اور نظام حکومت کیسا تھا؟ اور وہ اپنے عہد کی زندگی، اس کے افکار، نظام اخلاق و معاشرت اور تہذیب و تمدن پر کس طرح اثر انداز ہو رہی تھی...... ان پہلوؤں کا جائزہ لینے کے لیے سب سے پہلی نظر اس پر ڈالنی چاہیے کہ اس حکومت کے اہم سربرآوردہ قائدین اور کارپردازان مملکت کس سیرت و کردار کے آدمی تھے اور ان کا ماضی کیا رہا تھا؟

گورنروں اور کارپردازان حکومت کے سلسلے میں حضرت معاویہ کی ایک اہم پالیسی:

حضرت معاویہؓ کی پالیسی تھی کہ خلافت راشدہ کے تجربہ والے لوگوں کو ان کے قدیم علاقوں میں مقرر کیا جاتا۔ خصوصاً جن حضرات نے عہد عمری میں خدمات انجام دی تھیں، ان کو حضرت معاویہ بہت اہمیت دیتے تھے۔ بعض اسکالرس نے جائزہ لے کر فہرست مرتب کی ہے کہ حکومتی ارکان کی بڑی تعداد خلافت راشدہ کے حکام کی تھی [۱]۔ ذیل میں ہم اہم گورنروں اور اعیان سلطنت کا تذکرہ کرتے ہیں۔ آگے خلافت راشدہ خصوصاً خلافت فاروقی کے کچھ اور کارپردازوں کے نام ذکر کریں گے جو عہد معاویہؓ میں مختلف عہدوں پر معین تھے۔ ہم نے اپنے جائزے میں پایا کہ عہد صدیقی و فاروقی کے چند ہی وہ افراد تھے، جو حضرت معاویہؓ کے دور میں حیات تھے اور نظام حکومت میں شامل نہیں تھے، ایسے حضرات میں اکثریت حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت ابوموسیٰ اشعری جیسی کچھ بزرگ ہستیوں کی تھی، جنہوں نے ایک عرصے سے یکسوئی اختیار کی ہوئی تھی۔

حضرت عمرو بن العاصؓ:

حضرت معاویہ کے گورنروں اور سلطنت کے اعیان میں پہلا نام حضرت عمرو بن العاصؓ کا آتا ہے۔ قریش کے اہم قائدین میں سے تھے۔ ہم تحکیم کے واقعے کے تحت ان کے فضائل و مناقب میں کتب حدیث کی

---

۱ ملاحظہ ہو: ڈاکٹر یسین مظہر صدیقی، خلافت اموی خلافت راشدہ کے پس منظر میں۔

قوی روایات ذکر کر آئے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مہاجرین صحابہ میں سے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو ''صاحب ایمان'' اور ''صالح شخص'' قرار دیا تھا۔ وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس درجے معتمد تھے کہ آپ نے غزوۂ ذات السلاسل میں ان کو ۳۰۰ مہاجرین وانصار کا امیر بنایا تھا، جن میں حضرت ابوبکر وعمر اور ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہم جیسے عظیم صحابہ شامل تھے۔ کسی صاحب فہم کے لیے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ یہ کس درجے اعتماد واعزاز کی سند ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو عُمان کے صوبہ کا گورنر بھی مقرر کیا تھا۔ خلافت فاروقی کی تاریخ پر نظر رکھنے والے لوگ جانتے ہیں کہ حضرت عمر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کار پرداز ان حکومت پر بہت اعتماد کرتے تھے۔ حضرت عمر فرمایا کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کار پرداز ان حکومت کو مسلمانوں کا امیر ہی ہونا چاہیے۔ عہد فاروقی میں وہ شام میں اسلامی افواج کے ایک جنرل کے طور پر خدمات انجام دیتے رہے۔ شام کے مراکز میں قنسرین، حلب، انطاکیہ، منبج اور فلسطین کے متعدد علاقے فتح کیے۔ پھر انہوں نے ہی مصر فتح کیا۔ حضرت عمرؓ نے ان کو پہلے فلسطین پھر مصر جیسی وسیع ریاست کا حاکم بنایا۔ ان کی حیثیت گورنر جنرل کی تھی، جو متعدد صوبوں پر اپنے تابع حکام مقرر کرتا تھا (ملاحظہ ہو الاصابۃ: ۵۳۹/۴)۔

لہٰذا تاریخ کی کتابوں میں ان کے سلسلے میں جو فضول روایات بے سند یا شیعی سندوں سے وارد ہوئی ہیں، ان کی طرف توجہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہم پیچھے ذکر کر آئے ہیں کہ حضرت عمرو بن العاص حضرت معاویہ کے خاص الخاص مشیر اور اہم ترین گورنر تھے۔ حضرت معاویہؓ حضرت عمر فاروقؓ کی پیروی واتباع کی خاص کوشش کرتے تھے۔ اور حضرت عمر کے جو عُمّال باقی رہ گئے تھے ان کو انہی علاقوں میں دوبارہ متعین کرتے تھے جہاں ان کو حضرت عمر نے مقرر کیا تھا۔ لہٰذا حضرت عمرو بن العاص کو تازندگی مصر کی امارت پر قائم رکھا۔

اب دیکھیے! تاریخی کتابوں کو ہاتھ لگاتے وقت کس قدر احتیاط کی ضرورت ہے؟۔ جن عمرو بن العاص کو بارگاہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایسے اعتماد واعزاز کی سندیں ملی ہیں، مگر طبری کی روایت کہتی ہے کہ جب علی ومعاویہ کی جنگ ہوئی تو اس شخص نے معاویہ کا ساتھ دینے کے لیے موٹی رشوت کا وعدہ لیا، پھر ساتھ دیا۔ اس نے دیکھا کہ مصر بہت مال دار صوبہ ہے، سو حضرت علیؓ کے خلاف جنگ میں ساتھ دینے کے لیے شرط رکھی کہ تم مجھے ''کھانے کو مصر دوگے، وہی صوبہ جس کی آمدنی بہت ہے۔ اور تازندگی میں ہی وہاں کا امیر رہوں گا''۔

لأن عمرو بن العاص كان صالح معاوية حين بايعه على قتال علي بن أبي طالب، على أن له مصر طعمة ما بقي.... هذه البلاد الكثير خراجها۔

یہ خبر ہمیں کون دے رہا ہے؟ وہی ابومخنف (جھوٹا شیعی)۔ اے کاش ابن جریر طبریؒ اپنی کتاب کو ایسی

روایتوں سے داغ دار نہ کرتے۔

حضرت مغیرہ بن شعبہؓ:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نہایت وفادار صحابی تھے۔ سن ۵ ہجری میں مشرف باسلام ہوئے اور مہاجرین کی عظیم المرتبت جماعت میں شامل ہوئے۔ متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اُن خدام ذاتی میں تھے جو استنجے کا انتظام اور وضو کرانے کی خدمت انجام دیا کرتے تھے [1]۔ حدیبیہ میں بیعت الرضوان کرنے والے خوش نصیبوں میں سے تھے، جن کے بارے میں قرآن نے کہا تھا کہ اللہ ان کے دلوں کے حال کو جانتا ہے کہ اچھا ہے۔ اور یہ بھی کہا تھا کہ وہ ان سب سے راضی ہو گیا۔

اس موقعہ پر ان کے ایمان اور خدا اور رسول کے سامنے سارے تعلقات کے ہیچ ہونے کا ایک عجب منظر سامنے آیا۔ ان کے سگے اور بڑے محسن چچا عروہ بن مسعود ثقفی اہل مکہ کے سفیر کے طور پر آئے۔ حضرت مغیرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حفاظت کے لیے آہنی خود پہنے تلوار لیے عین پیچھے کھڑے تھے۔ عروہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے گفتگو کرتے جاتے تھے اور بار بار ان کا ہاتھ (ملاطفت میں) رسول اللہؐ کی ریش مبارک تک پہنچتا تھا۔ حضرت مغیرہ کو ان کا حضور کے ساتھ یہ انداز بے تکلفی ذرا نہ بھایا، تڑک کر بولے: ہاتھ پیچھے رکھو، ورنہ تلوار سے الگ کر دوں گا۔ عروہ طائف و مکہ کے ایک نہایت موقر لیڈر تھے۔ اس جملے پر سناٹے میں آ گئے۔ کہنے لگے یہ وہی بھتیجا ہے، جس نے کئی لوگوں کو قتل کر دیا تھا اور میں نے ہی سب کی دیت ادا کر کے اس کی جان بچائی تھی؟؟ (بخاری: ۲۷۳۱)۔

حضرت مغیرہ نے مدینے ہجرت فرمائی، فتح مکہ، حنین و طائف اور پھر غزوۂ تبوک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ جہاد فرمایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو طائف کی ایک مہم میں بطور قائد حضرت ابوسفیانؓ کے ساتھ بھیجا تھا۔ خلافت راشدہ کے دور میں حضرت مغیرہ ایک مدبر قائد، نہایت شجاع و جری جنرل اور زیرک حکم راں کے طور پر ابھرے۔ حضرت ابوبکرؓ نے ان کو یمن کے مرتدین کی سرکوبی کے لیے جانے والے ایک لشکر کا امیر بنا کر بھیجا۔ یہ مہم انھوں نے کامیابی سے سر کی۔ حضرت عمرؓ نے ان پر بہت اعتماد کیا اور اس عہد میں انھوں نے بڑے کارنامے انجام دیے۔ قادسیہ کی مشہور جنگ میں شریک رہے۔ اس موقع پر سپہ سالار حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے ایران کے سپہ سالار اعظم رستم کے دربار میں سفارت کے لیے انہی کو بھیجا۔ جہاں ان کی ہمت اور حکمت وزیرکی نے ایرانیوں کو مرعوب کر دیا۔ ان کی مجاہدانہ ترک تازیاں مشرق سے مغرب تک پھیلی ہوئی تھیں۔

---

[1] بخاری: ۳۶۳، مسند احمد: ۱۸۲۱۹، بسند حسن۔ مجمع الزوائد ۱/ ۲۵۱۔

حضرت عمر نے ان کو بصرہ کے فوجی اور شہری مرکز اور اس کے تابع اقلیم کا قائد و منتظم عام بنایا۔ اس دور میں میسان اور ابر قباز کے ایرانی علاقے فتح کیے۔ بصرہ کی امارت کے دور میں انہوں نے وہاں کے انتظامی معاملات میں بڑی کامیابیاں حاصل کیں۔ وہاں کا دیوان (سکریٹریٹ) انہوں نے ہی منظم کیا۔ پھر جب کوفہ میں انتشار پیدا ہوا اور مجبوراً حضرت عمار بن یاسرؓ اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ جیسے اکابر کو سبک دوش کرنا پڑا، تو حضرت عمر نے ان کو کوفہ کے اہم صوبہ کا گورنر بنایا، جس کے تحت مشرقی محاذ کی اہم افواج بھی آتی تھیں اور عراق سے لے کر فارس و ہند تک کے علاقے بھی تھے۔ انہوں نے یہاں انتشار کی فضا کو ختم کرنے میں کامیابی حاصل کرلی۔ جو ایک بڑا مشکل کام نظر آتا تھا۔ اس دور میں انہوں نے بہت سی فتوحات انجام دیں۔ علماء کے نزدیک کسی شخص پر حضرت عمر کا اعتماد اس کے کردار و عمل کے لیے بہت بڑی شہادت ہے۔ حضرت عثمانؓ نے ان کو آرمینیہ اور آذربیجان کا گورنر اور امیر الجہاد متعین کیا تھا، حضرت عثمان کی وفات تک وہ اس منصب پر قائم رہے۔

خاص بات یہ ہے کہ سیدنا علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے اختلافات میں وہ غیر جانب دار رہنے والے صحابہ میں تھے۔ حضرت معاویہؓ عہد عمری کے حکام کو ان کی سابقہ ذمہ داریاں تفویض کرتے تھے، ان کے کمال اخلاص وحکمت کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ انہوں نے جب حکومت سنبھالی تو سابقہ دور کی رنجشوں اور فاصلوں کو کچھ ملحوظ نہیں رکھا۔ جو باصلاحیت فرد اسلامی حکومت کے لیے کار آمد ہوسکتا تھا، اس کو (بشرطے کہ اختلاف نہ پیدا کرے) انہوں نے نظام مملکت میں شامل کیا، چاہے اس نے اختلاف کے دور میں ان کا ساتھ نہ دیا ہو، یا سیدنا علیؓ کے کیمپ ہی کا کیوں نہ رہا ہو۔ انہوں نے حضرت عمرؓ کے اتباع میں اور حضرت مغیرہ کے سابقہ تجربے کی بنیاد پر خلافت سنبھالتے ہی ان کو دوبارہ کوفہ کا والی مقرر کیا۔

کوفے والے پہلے سے ہی سراپا مسئلہ تھے۔ حضرت عمر بھی ان سے پریشان رہتے تھے۔ یہاں حضرت معاویہ کی کافی مخالفت تھی۔ بہت سے لوگ حضرت حسنؓ کی صلح سے بھی ناراض تھے۔ خوارج کا بھی زور تھا اور یہ سبائیوں کا بھی گڑھ بن گیا تھا، جو لگاتار فتنے بھڑکاتے رہتے تھے اور بغاوت کی آگ لگانا چاہتے تھے۔ یہاں حضرت مغیرہ جیسے زیرک و مدبر حاکم ہی کی ضرورت تھی۔ انہوں نے کوفہ والوں کے ساتھ بڑی نرمی اور بردباری کا معاملہ رکھا۔ حضرت مغیرہؓ کی وفات ہوئی تو حضرت جریر بن عبداللہؓ نے عوام میں تقریر فرمائی اور حضرت مغیرہ کی بردباری اور درگزر پسندی کی تعریف فرمائی (بخاری: ۵۸)۔ تقریباً دس سال (یعنی ۵۰ھ میں اپنی وفات تک) وہ کوفہ میں امن واستحکام قائم رکھنے میں کامیاب رہے۔ انہوں نے حضرت علیؓ کے حامیوں اور ان کے محاذ کے قائدین سے ایسا اچھا رابطہ و معاملہ رکھا کہ معقل بن قیس الریاحی وغیرہ جیسے اہم افسران وقائدین بھی حکومت کا

تعاون کرتے تھے۔(طبری:۵/ ۱۸۵)۔

حضرت مغیرہ عرب کے نہایت مدبر قائدین میں شمار ہوتے اور ''مغیرۃ الرأی'' کہلاتے تھے۔حضرت معاویہ کی خلافت میں انہوں نے وسیع تمدنی ترقیات بھی انجام دیں، لگا تار جہاد جاری رکھا اور فارس و کرمان وسجستان کے متعدد علاقے فتح کیے۔

عہد صحابہ کے بارے میں تاریخی روایات کا حال:

جھوٹی روایات کی جوفیکٹری سبائیوں اور فتنہ انگیز عناصر نے کوفہ میں خصوصا اور عراق میں عموما لگا رکھی تھی، اور جن کا بدنما ڈھیر ہماری تاریخ کی کتابوں میں بھرا ہوا ہے، اس میں حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کے بارے میں بڑی خراب باتیں مذکور ہیں۔ جو ان پر ذلیل قسم کی چال بازیوں اور مکروفریب کے ایسے الزام لگاتی ہیں، جن کا مرتکب کوئی ایسا شخص ہی ہوسکتا ہے، جس کا دل خوف خدا اور اسلام کے لیے خلوص کے ہر ذرے سے خالی ہو۔

ابن اثیر نے (الکامل: ۳/ ۹۸) میں روایت کیا ہے کہ یہ حضرت مغیرہ بن شعبہ ہی تھے جنہوں نے حضرت معاویہ کے سامنے یزید کی ولی عہدی کی تجویز پیش کی اور اس کے لیے کوفہ میں زمین ہموار کی۔ اور وہ اِس حقیر غرض سے کہ حضرت معاویہ نے ان کو کوفہ کی گورنری سے سبک دوش کر دیا تھا، انہوں نے اِس ولی عہدی کی تجویز کے ذریعے اپنی گورنری بچائی اور اپنے دوستوں سے کہا کہ **''میں نے معاویہ کا پاؤں ایسی رکاب میں پھنسایا ہے کہ اب نکلنے والا نہیں۔ اس سے امت محمد میں لمبا سلسلہ گمراہی کا پھیلے گا۔ میں نے محمد کی امت میں اختلاف کا وہ سامان کر دیا ہے کہ اب قیامت تک اس میں اتفاق نہ ہوسکے گا۔** یہ روایت الفاظ کے فرق کے ساتھ طبری کے یہاں بھی ہے۔ اور ذہبی نے بھی بلا نقد نقل کر دی ہے [۱]۔

کوئی عقل سمجھ رکھنے والا انسان یا تو صحابہ کو معمولی درجہ کا شریف اور اصول پسند، بلکہ مخلص مسلمان بھی نہ مانے گا، یا پھر چیخ پڑے گا کہ یہ صحابہ کا کردار ہرگز نہیں ہوسکتا۔ یہ تو صرف کسی منافق و ذلیل انسان کا ہی کردار ہو سکتا ہے۔ حضرت مغیرہ صحابی تھے، مہاجر تھے۔ اور بیعت الرضوان میں صرف شامل ہی نہیں تھے، کس وفاداری وخلوص اور جاں نثاری کی شان سے شامل تھے، اُس کا ذکر صحیح بخاری کی روایت کے حوالے سے آچکا ہے۔ بیعت الرضوان میں شریک صحابہؓ کی قرآن نے نہایت عظیم الشان فضیلتیں بیان کی ہیں اور ان کے ساتھ ہدایت وتوفیق اور عنایات ونوازشات کا جو خصوصی معاملہ ہے اس کا بھی تفصیلی تذکرہ فرمایا ہے۔ جن حضرت مغیرہؓ کے بارے میں یہ روایت ایسی دین فروشی بلکہ دین دشمنی کی بات کہتی ہے، ذرا پڑھیے، قرآن ان کے متعلق کیا شہادت دیتا ہے:

---

[۱] تاریخ طبری: ۵/ ۳۰۱، ۳۰۲) سیر: ۴/ ۳۹ اور تاریخ الاسلام: ۵/ ۲/ ۲۷۔

لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَنزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ وَأَثَابَهُمْ فَتْحاً قَرِيباً ....إِذْ جَعَلَ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَأَنزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَى رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوَى وَكَانُوا أَحَقَّ بِهَا وَأَهْلَهَا وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيماً ... مُّحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكَّعاً سُجَّداً يَبْتَغُونَ فَضْلاً مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَاناً سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ ذَلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنجِيلِ كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْأَهُ فَآزَرَهُ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوَى عَلَى سُوقِهِ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْهُم مَّغْفِرَةً وَأَجْراً عَظِيماً۔

یقیناً اللہ ایمان والوں سے بڑا خوش ہوا جب وہ درخت کے نیچے تم سے بیعت کر رہے تھے، اور ان کے دلوں میں جو (خدا کی محبت اور ایمان وخلوص، سب) کچھ ہے وہ بھی اللہ کو معلوم ہے، اس لیے اس نے ان پر سکینت (کی روحانی نعمت) اتار دی اور ان کو انعام میں ایک قریبی فتح دی۔......جب ان کافروں نے اپنے دل میں جاہلی حمیت وجوش بھر لیے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اور مومنوں پر اپنی خاص سکینت نازل فرمائی۔ اور ان کو تقوے کی بات پر جما دیا۔ اور وہ اسی کے زیادہ حق دار اور اہل تھے۔ اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔ (پھر آگے ان حضرات کی مزید توصیف وتعریف بیان ہوتی ہے کہ) محمد رسول اللہ اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں کافروں کے مقابلے میں سخت جان اور آپس میں رحم دل ہیں۔ تم انہیں دیکھو گے؛ کبھی رکوع میں تو کبھی سجدے میں پڑے اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی طلب کر رہے ہیں۔ ان کی علامتیں سجدے کے نشان ہیں ان کے چہروں پر۔ ان (صحابہ) کی یہ شان تورات میں مذکور ہے۔ اور انجیل میں ان کی مثال یہ ہے کہ جیسے ایک کھیتی ہو جس نے کونپل نکالی، پھر اس کو مضبوط کیا، پھر وہ موٹی ہوگئی، پھر اپنے تنے پر سیدھی کھڑی ہوگئی۔ کسان اس (کے منظر) سے خوش ہوتے ہیں، (یہی حال اہل ایمان کی ترقی کا ہے) تا کہ اللہ ان (کی اس ترقی) سے کافروں کے دل جلائے۔ یہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے، اللہ نے ان سے مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ کر رکھا ہے (سورہ فتح: ۱۸، ۲۶، ۲۹)۔

ان آیات کا لفظ لفظ اصحاب بیعت الرضوان کی فضیلت وعظمت اور علو مرتبت کا شاہد ہے۔ ان میں:

۱) یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان پر روحانی نعمتیں نازل فرماتا ہے۔ وہ ایسے پاکیزہ وچنیدہ لوگ ہیں جن پر تورات وانجیل میں بھی ثنا خوانی کی گئی ہے۔

۲) اور ان میں یہ بھی ہے کہ ان سے نفرت وبغض کفار کے دلوں میں ہوتا ہے۔

۳) اللہ تعالیٰ اُن کے طرز عمل ہی نہیں، قلب وباطن کی پاکیزگی وخلوص کی بھی شہادت دیتا ہے۔

یہ سب جس جماعت کی تعریف وتوصیف قرآن بیان کر رہا ہے، حضرت مغیرہ اُس میں اِس درجہ کے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حفاظت پر متعین ہوں۔

حضرت مغیرہؓ ان مہاجرین میں سے بھی تھے جو غزوۂ تبوک میں شرکت کا شرف رکھتے تھے۔ اور غزوۂ تبوک میں شرکت کرنے والے مہاجرین وانصار کے بارے میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ:

لَقَد تَّابَ اللّٰہُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهَاجِرِينَ وَالأَنصَارِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ فِي سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِن بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيغُ قُلُوبُ فَرِيقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ إِنَّهُ بِهِمْ رَؤُوفٌ رَّحِيمٌ (التوبة: 117)

اللہ تعالیٰ نے عنایت ورحمت فرمائی نبی پر اوران مہاجرین وانصار پر جنھوں نے اس کی اتباع کی مشکل گھڑی میں (جہاد کرکے)، حالاں کہ قریب تھا کہ ان میں سے ایک جماعت کے دل کج ہوجاتے۔ پھر اللہ نے ان پر مزید نظر کرم فرمائی۔ یقیناً اللہ تعالیٰ ان پر بڑا مہربان ورحیم ہے۔

خاک برسرِ دروغ گو، خاک:

کیا جس کی پاکیزگیِ باطن کی شہادت قرآن میں خود اللہ تعالیٰ دیں، وہ منافق ہوسکتا ہے؟ اب یا تو (معاذ اللہ) قرآن کی یہ شہادتیں جھوٹی مانی جائیں، یا پھر تاریخی کتابوں کی اس قسم کی تمام روایات کو جھوٹا تسلیم کیا جائے۔ کیا کوئی گنجائش اس بات کی ہے کہ ہم اصحابِ بیعتِ رضوان اور مجاہدینِ غزوۂ تبوک کے لیے خدائے ذوالجلال کی وہ خوش نودی اور کرم فرمائی بھی مانیں، جس کا نہایت بلند آہنگ اعلان قرآن مجید میں ہوا ہے اور جس میں ان کے باطن کے بھی پاک صاف ہونے کی شہادت ہے؛ اور اس کے ساتھ یہ ماننے کو بھی تیار ہوجائیں کہ وہ دنیا کی ایک حقیر غرض کے لیے دیدہ ودانستہ اسلام دشمنی کا کام کرتے تھے!!! بلکہ (یہ روایت تو یہ بھی کہتی ہے کہ ''معاذ اللہ'' مغیرہؓ ایسے ڈھیٹ قسم کے بے حیا تھے کہ) اپنی اسلام دشمنی کا فخر سے اظہار بھی کرتے تھے اور خوش ہوتے تھے کہ ''محمد کی امت'' کو میں نے ایسا پھانسا ہے کہ اب اس کی خیر نہیں!!!۔ خدا کی پناہ!! ہزار بار پناہ!! ہم ان روایتوں کو تسلیم کرکے قرآن کو کیسے جھٹلا سکتے ہیں؟

ایک اور روایت سنیے:

طبری نے اپنی سند سے روایت کیا ہے کہ:

جب سن چالیس کا حج آیا تو مغیرہ نے معاویہ کی طرف سے جعلی خط بنایا۔ اور اس کی بنیاد پر لوگوں کو اپنی امارت میں حج کرایا۔ اور کہا جاتا ہے کہ انہوں نے (ایک دن پہلے حج کرادیا، یعنی) یوم ترویہ (۸ ذی الحجۃ) کے دن یوم عرفہ کرایا اور عرفہ کے دن یوم نحر کرادیا۔ اور ایسا اس جلدی میں کہ کہیں معاویہ کا بنایا ہوا امیر مکہ نہ پہنچ جائے۔ (طبری: ۵/۱۶۰۔ الکامل: ۲،۵۱؍۷)۔

آپ غور کیجیے! صحابہ دشمنی میں کیسے خطرناک الزامات ہی نہیں، بدعقلی کی بھی باتیں راویوں نے تیار کیں اور ہماری تاریخ کی کتابوں میں ان کو جگہ دے دی گئی۔ مان لیجیے، حضرت مغیرہؓ ان فضائل سے آراستہ ہونے کے باوجود، جن کا قرآن شاہد ہے، اس حد تک (معاذ اللہ) گر گئے تھے کہ جعلی تقرر نامہ بنا کے حج کی امیری ہی نہ کریں، بلکہ اس امیری کی خاطر سارے حجاج کا حج برباد کردیں، لیکن کیا اس وقت کے سارے مسلمان بھی اندھے یا مجنون ہو گئے تھے؟ جو حج کرنے آئے تھے ان میں سے کسی کو خبر بھی نہیں ہوئی کہ مغیرہ کیا غضب کر رہے ہیں، کہ ایک دن پہلے ہی حج کرائے دے رہے ہیں؟ کسی کے منھ میں زبان نہیں تھی جو انہیں ٹوکتا؟ اور نہ اس پر کہیں کوئی اعتراض ہوا نہ چرچا۔

طبری کے علاوہ ذہبی نے بھی تاریخ اسلام اور سیر اعلام النبلاء میں ان روایات کو ذکر کیا ہے۔ اور اسی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ذہبی جیسا محدث تاریخ کے میدان میں آکر کیسا بے احتیاط ہوجاتا ہے۔ اس طرح کی روایات کے سلسلے میں راقم سطور نے ابن کثیر کی کتاب کو نسبتاً بہتر پایا، وہ یہاں لکھتے ہیں:

وهذا الذي نقله ابن جرير لا يقبل، ولا يظن بالمغيرة رضي الله عنه ذلك، وإنما نبهنا على ذلك ليعلم أنه باطل، فإن الصحابة أجل قدرا من هذا، ولكن هذه نزعة شيعية۔

طبری کی یہ روایات نری باطل باتیں ہیں، ہم نے اس روایت کا ذکر اسی لیے کیا ہے کہ لوگ جان جائیں کہ یہ باطل ہے۔ یہ سب شیعی میلانات کے شاخسانے ہیں (البدایہ والنہایہ: ۸/۱۷)۔

لیکن افسوس، ذہبی نے ایسا کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

بصیرت کا حق اور امانت کا فرض:

ہم قطعاً سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ہمارے ان عظیم مورخین نے (رافضیت سے یقینا اور مکمل طور پر بری ہونے اور) اپنی جلالت شان کے باوجود کیوں کر ایسی روایت کو بے چوں و چرا ذکر کردیا۔ بہرحال ہم اِن تاریخی روایات کو صرف جانچ پرکھ کر ہی لے سکتے ہیں۔ ایک مورخ پر بصیرت کا حق اور امانت کا فرض ہے کہ وہ قرآن مجید اور صحیح و مستند روایات کو میزان بنائے، ہر ایسی ویسی روایت کو اس میزان میں تولے پرکھے، اور صرف انہی روایاتِ تاریخ کو قبول کرے جو قرآن مجید کے اور صحیح سند سے آئی احادیث و روایات کے خلاف نہ ہوں۔

حضرت بسر بن ارطاۃ:

حضرت حسن سے صلح کے بعد سن ۴۱ھ میں حضرت معاویہ نے حضرت بسر بن ارطاۃ کو بصرہ کا حاکم مقرر کیا۔ یہ صحابی تھے۔ کچھ لوگوں کا خیال اس کے خلاف ہے، مگر ابن معین، دارقطنی اور ابن حبان وغیرہ عام محدثین

ان کوصحابی کہتے ہیں۔ابن حجر نے اصابہ میں لکھا ہے کہ ان کا صحابی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے براہ راست روایت کرنا قوی سندوں سے ثابت ہے۔خلافت راشدہ کے امراء جہاد میں سے تھے۔عہد صدیقی میں وہ حضرت خالد بن ولید کے لشکر میں شامل تھے، جو عراق میں مصروف جہاد تھا۔پھر جب مرکز خلافت سے اس فوج کو شام بھیجا گیا تو بسر بن ارطاۃ اس کے امراء میں نظر آتے ہیں (فتوح البلدان: ۱۱۵)۔حافظ ابن حجرؒ نے امام ابن حبانؒ کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

بُسر حضرت معاویہؓ کے افسران حکومت میں سے تھے۔مستجاب الدعوات شخص تھے۔

پھر حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: فتنہ کی جنگوں (یعنی سیدنا علی ومعاویہ رضی اللہ عنہما کی جنگوں) کے دوران ان کے بارے میں نامناسب باتیں مشہور کردی گئی ہیں، ان کی طرف توجہ نہیں دینی چاہیے۔حضرت بسرؓ رومیوں کے خلاف بری حملوں (شواتی) اور بحری جہاد میں امیر کے طور پر مقرر اور مسلسل مصروف رہے۔افریقہ کی سرزمین بھی ان کے جہاد کی گواہ بنی۔(ملاحظہ ہو الاصابہ: ۱/ ۴۲۲، فتوح البلدان: ۲۲۵)۔

عبداللہ بن عامرؓ:

ان کا شمار بھی صغار صحابہ میں ہے۔ان کے والد عامر ابن کریز حضرت عثمان کے ماموں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سگے پھوپھی زاد بھائی تھے۔فتح مکہ کے وقت وہ اپنے تین سال کے اس بیٹے کو لے کر خدمت میں حاضر ہوئے۔آپ نے عامر سے ارشاد فرمایا کہ یہ بچہ تو ہمارے خاندان سے ملتا ہوا ہے۔پھر بطور تبرک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بچے کے منہ میں اپنا لعاب مبارک ڈالا۔بچہ جلدی جلدی پی گیا۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پیشین گوئی فرمائی اللہ اس کو سیراب رکھے گا۔سو ان کا یہ حال تھا کہ جس زمین میں ہاتھ ڈالتے پانی نکل آتا (دلائل النبوۃ: ۶/ ۲۲۵)۔

حضرت عثمانؓ نے سن ۲۹ھ میں ان کو حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی جگہ بصرہ کا گورنر جنرل مقرر کیا، مملکت فارس کے وسیع علاقے بھی بصرہ کے تحت تھے۔حضرت ابوموسیٰؓ نے نئے جواں سال امیر کا نہایت گرم جوشی سے استقبال کیا۔اور بصرہ کے اعیان سے ان کا شاندار تعارف کرایا۔بصرے میں عرصے سے ایک فتنہ انگیز جماعت مسائل پیدا کررہی تھی۔عبداللہ بن عامر اگرچہ ابھی صرف پچیس سالہ نوجوان تھے، مگر حسن تدبیر سے بصرہ کو قابو میں کرلیا۔

فارسی سلطنت کا خاتمہ اور کسریٰ کا قتل

ابن عامرؓ کا تاریخ ساز کارنامہ:

حضرت عبداللہ بن عامرؓ کا ایک بہت بڑا تاریخی کارنامہ یہ ہے کہ انہی کے ہاتھوں فارس کی کسروی سلطنت کا خاتمہ ہوا۔ایک مجوسی ایرانی کے ہاتھوں (غالبا کسروی خاندان کی سازش سے) سیدنا فاروق کی شہادت

نے ایرانیوں کو پھر سے شیر کر دیا تھا۔ سجستان اور وسطی و جنوبی فارس کے علاقوں میں بغاوت پھیل گئی تھی۔ خود کسریٰ مختلف شہروں میں گھوم گھوم کر فوجیں جمع اور منظم کرتا پھر رہا تھا۔ خطرے کو محسوس کر کے حضرت عثمان نے جہاد کا منصوبہ بنایا۔ اس منصوبے کی قیادت عبداللہ بن عامرؓ کو دی گئی۔ بصرہ کے جنوب میں بحرین [۱] کے گورنر حضرت عثمان بن ابی العاصؓ چلے آرہے تھے۔ یہاں ایک بڑا فوجی مرکز تھا جو جنوب فارس سے لے کر سندھ تک کی جہادی مہمات پر مامور تھا، حضرت عثمانؓ نے بحرین کو بھی ان کی امارت میں شامل کر دیا۔ اس نوجوان نے اس انتخاب کو صحیح ثابت کر دیا، خود اگلے محاذوں پر جا کر جہاد کی کمان سنبھالی اور اہم فتوحات حاصل کیں۔

مدائن کی فتح کے بعد، اصطخر میں کسریٰ نے اپنی حکومت کا نیا مرکز بنالیا تھا۔ عبداللہ نے ایک فیصلہ کن معرکے میں اصطخر فتح کر کے ساسانی سلطنت کی کمر توڑ دی۔ کسریٰ فرار ہوا، عبداللہ نے مہمات کا سلسلہ جاری رکھا۔ حتیٰ کہ صرف چھ سالہ مدت میں سجستان و کرمان سے لے کر شمال میں خراسان و غزنی تک فتوحات کا دائرہ پھیل گیا۔ ابھی تک کسریٰ یزدگرد اپنی فوج کے ساتھ بھاگا پھر رہا تھا اور لگاتار تدبیروں میں جٹا تھا۔ آخر مرو پہنچا اور مقابلہ کے لیے تیاریاں شروع کیں۔ عبداللہ بن عامرؓ نے تعاقب جاری رکھا، مرو میں فیصلہ کن جنگ ہوئی اور اس معرکے میں کسریٰ یزدگرد کام آیا۔ اس طرح ان کے ہاتھوں کسروی سلطنت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہوا۔ اس عظیم و تاریخ ساز کارنامے پر شکر خداوندی واجب تھا۔ سو عبداللہ بن عامرؓ نے نیساپور سے عمرے کا سفر کیا، احرام باندھا اور بیت اللہ آکر شکرانہ کی عبادات ادا کیں۔

حضرت عبداللہ اونچے کمالات کے حامل اور سخی و کریم النفس حاکم تھے، نہایت ستودہ صفات و خوش خصال شخصیت اور بڑی بابرکت ذات تھی۔ مورخین کہتے ہیں:

کان کریما ممدّحا میمون النقیبة......سخی، ستودہ صفات، محبوب عام اور بابرکت شخص تھے۔
جس طرف رخ کرتے کامیابی قدم چومتی۔ حجاج کے لیے عرفہ میں صاف پانی کے حوض بنائے، جن میں دور دراز سے میٹھے چشموں سے نالیاں بنا کر پانی لایا گیا [۲]۔

عبداللہ بن عامرؓ کو دوبارہ بصرے کی امارت:

فتنہ و خانہ جنگی کے دور میں فارس و خراسان میں بڑی طوائف الملوکی اور بغاوتیں پھیل گئی تھیں۔ خلیفہ بنتے ہی حضرت معاویہؓ نے (اپنی اس پالیسی کے تحت کہ خلافت راشدہ کے کارندوں کو اپنی سابقہ خدمات پر بحال کیا

---

۱ جزیرۂ عرب کا پورا مشرقی ساحلی علاقہ شمال میں بصرہ سے جنوب میں عمان تک بحرین کہلاتا تھا۔
۲ البدایہ والنہایہ: ۸/۹۵، تاریخ دمشق: ۲۹/۲۶۱

جائے) عبداللہ بن عامرؓ کو دوبارہ بصرے کی کمان دی۔ انہوں نے پھر سے اپنے کمالات کے جوہر دکھائے اور فارس وخراسان میں اسلامی حکومت کی رٹ قائم کی۔

زیاد بن ابی سفیان:

زیاد عہد معاویہ کی اہم سیاسی وانتظامی شخصیت ہیں۔ حضرت معاویہؓ کے 'مہربانوں' نے ان کے حوالے سے حضرت معاویہؓ کو بدنام کرنے کی بھی خوب کوشش کی ہے۔ ان کے مظالم کی داستانیں بھی گڑھی گئی ہیں اوران کے نسب کا مسئلہ بھی ایک وجہ طعن ہے۔

زیاد کے نسب کا مسئلہ:

صحیح مسلم اور مسند احمد وغیرہ کی صحیح روایت کے مطابق حضرت معاویہؓ کے دور میں زیاد نے خود یہ دعویٰ کیا کہ حضرت ابوسفیانؓ نے میری ماں سمیہ سے ایک خاص طریقہ کا نکاح کیا تھا اور میں اسی نکاح سے پیدا ہوا ہوں[۱]۔ اس کی تفصیل تاریخی روایات سے معلوم ہوتی ہے، کہ طائف میں سمیہ نامی ایک باندی تھی، جس سے حضرت ابوسفیانؓ نے ایک ایسے طریقے سے نکاح اور تعلق قائم کیا تھا، جو جاہلی معاشرے میں جائز اور اس سے پیدا ہونے والی اولاد کا نسب بھی صحیح مانا جاتا تھا۔ فتح مکہ میں رسول اللہ ﷺ نے اس طریقۂ نکاح کو تو حرام قرار دیا (صحیح بخاری: ۵۱۲۷) لیکن جاہلی دور میں اس سے جو بچے پیدا ہو چکے تھے اور ثابت النسب مانے جاتے تھے، اسلام نے ان کے نسب کو صحیح تسلیم کیا[۲]۔

زیاد اسی سمیہ کے بیٹے تھے۔ زیاد کا کہنا تھا کہ ابوسفیان نے مجھے اپنا بیٹا مانا تھا اور اس دعوے پر کئی لوگوں نے گواہی بھی دی۔ لہٰذا ان گواہیوں کی بنیاد پر حضرت معاویہؓ نے زیاد کو ابوسفیان کا بیٹا تسلیم کرلیا۔ یہی واقعہ کی بنیادی حقیقت ہے۔ خلافت وملوکیت کے مرحوم مصنف نے اس واقعے کو مکروہ شکل میں پیش کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> زیاد بن سمیہ کا استلحاق (یعنی اس کو ابوسفیان کا بیٹا قرار دینا) بھی حضرت معاویہؓ کے ان افعال میں سے ہے، جن میں انہوں نے سیاسی اغراض کے لیے شریعت کے مسلم قاعدے کی خلاف ورزی کی تھی۔

مصنف مرحوم کو حضرت معاویہؓ سے جو ''حسن ظن'' ہے وہ تو معلوم ہے، حضرت معاویہؓ کے سلسلے میں ان کی اس بدگمانی کے سلسلے میں ہم دو باتیں ذکر کرنا ضروری سمجھتے ہیں:

۱۔ پہلی بات یہ کہ کسی صحیح روایت میں یہ نہیں آیا ہے کہ اس نسب کا دعویٰ حضرت معاویہ نے کیا۔ بلکہ صحیح مسلم وغیرہ کی روایت میں صاف مذکور ہے کہ یہ دعویٰ اصلا زیاد نے کیا تھا۔

---

۱ صحیح مسلم: ۱۱۴، مسند احمد: ۱۴۵۴۔

۲ شرح معانی الآثار: ۱۶۱/۴، الکامل فی التاریخ: ۴۲/۳۔

۲۔ دوسری بات یہ کہ مورخین کی روایات اس سلسلے میں کافی متضاد ہیں۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ نے اپنی تحقیقی تصنیف 'حضرت معاویہ اور تاریخی حقائق' میں انہی مآخذ سے جن کا حوالہ مولانا مودودیؒ نے دیا ہے، واقعے کی یہ شکل ذکر کی ہے کہ جب اس بات پر کئی لوگوں نے گواہی دی کہ حضرت ابوسفیان نے زیاد کو اپنا بیٹا مانا تھا، تو حضرت معاویہ نے شرعی اصول وقوانین کی بنا پر اس کو تسلیم کیا تھا۔ اور قانوناً ان کے لیے اس کے علاوہ اور کوئی راہ بھی نہیں تھی۔ مولانا مدظلہ لکھتے ہیں:

مشہور محدث حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ اس واقعے کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں ''حضرت معاویہ نے ۴۴ھ میں ان (زیاد) کا استلحاق کیا۔ اور اس بات پر زیاد بن اسماء الحرمازی، مالک بن ربیعہ سلولی اور منذر بن زبیر نے شہادت دی تھی۔ یہ بات مدائنی نے اپنی مختلف سندوں سے روایت کی ہے اور گواہوں میں مندرجہ ذیل ناموں کا اضافہ کیا ہے۔ جویریہ بنت ابی سفیان، مسور بن قدامہ الباہلی، ابن ابی نصر ثقفی، زید بن نفیل الازدی، شعبہ بن العلقم المازنی، بنو عمرو بن شیبان کا ایک شخص، اور بنو مصطلق کا ایک شخص۔ ان سب نے ابوسفیان کے بارے میں گواہی دی (کہ انہوں نے یہ دعویٰ کیا تھا) کہ زیاد ان کا بیٹا ہے۔ البتہ منذر نے گواہی یہ دی تھی کہ میں نے حضرت علی کو یہ کہتے سنا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ ابوسفیان نے یہ بات کہی تھی۔ پھر حضرت معاویہ نے خطبہ دیا اور زیاد کا استحاق کر لیا، پھر زیاد بولے، کہ جو کچھ ان گواہوں نے کہا ہے اگر وہ حق ہے تو الحمد للہ۔ اور اگر یہ غلط ہے تو میں نے اپنے اور اللہ کے درمیان ان لوگوں کو ذمہ دار بنا دیا ہے'' (الاصابہ: ۲ / ۵۲۸)۔

جن گواہوں کے نام حافظ ابن حجر نے مدائنی کے حوالے سے لکھے ہیں ان میں حضرت مالک بن ربیعہ سلولی صحابہ میں سے ہیں اور بیعت رضوان میں شریک رہے ہیں۔ ان حالات میں ہماری سمجھ سے باہر ہے کہ حضرت معاویہ نے زیاد کا جو استلحاق دس گواہوں کی گواہی پر مجمع عام میں کیا، اس میں شریعت کے کون سے مسلمہ قاعدے کی خلاف ورزی ہوئی؟ جبکہ ابن اثیر جزری کی تصریح کے مطابق جاہلی نکاح سے جاہلیت میں پیدا ہونے والی اولاد کو اسلام میں غیر ثابت النسب قرار نہیں دیا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ قسم کھا کر فرماتے ہیں کہ:

أما والله لقد علمت العرب أني كنت أعزها في الجاهلية وأن الإسلام لم يزدني إلا عزا، وأني لم أتكثر بزياد من قلة ولم أتعزز به من ذلة، ولكن عرفت حقا له فوضعته موضعه [۱]۔

یعنی خدا کی قسم تمام عرب جانتے ہیں کہ جاہلیت میں مجھے تمام عربوں سے زیادہ عزت حاصل تھی اور ظاہر ہے کہ اسلام نے بھی میری عزت میں ہی اضافہ کیا ہے، لہٰذا نہ تو ایسا ہے کہ میری نفری قلیل ہو اور

[۱] الکامل فی التاریخ: ۳/ ۴۰۰، تاریخ الطبری: ۵/ ۲۱۵ و تاریخ ابن خلدون: ۲/ ۱۰، تینوں نے یہ مقولہ نقل کیا ہے۔ البتہ ابن خلدون نے صرف خط کشیدہ جملہ لکھا ہے اور اس میں 'حقا له' کی جگہ ''حق الله'' کے الفاظ ہیں۔

میں نے زیاد کے ذریعہ اس میں اضافہ کرلیا ہو، اور نہ کبھی میں ذلیل تھا کہ زیاد کی وجہ سے مجھے عزت مل گئی ہو، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ میں نے اس کا حق سمجھا ہے اور اسے اس کے حقدار تک پہنچا دیا ہے‘‘۔

کیا مذکورہ بالا واقعات کی روشنی میں (اور) حضرت معاویہ کے اس حلفیہ بیان کے بعد (جسے مولانا مودودی نے یقیناً ابن اثیر اور ابن خلدون کی تواریخ میں دیکھا ہوگا) یہ کہنے کی کوئی گنجائش باقی رہتی ہے کہ ’’زیاد بن سمیہ کا استلحاق بھی حضرت معاویہ کے ان افعال میں سے ہے جن میں انہوں نے سیاسی اغراض کے لیے شریعت کے ایک مسلم قاعدے کی خلاف ورزی کی تھی‘‘؟۔(خلافت وملوکیت: ۱۷۵)

یہی وجہ ہے کہ اس وقت بھی جو حضرات حضرت معاویہ کے اس فعل پر اعتراض کر رہے تھے، ان میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ زیاد تو زنا سے پیدا ہوا تھا، اس لیے اس کا نسب حضرت ابوسفیانؓ سے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے بجائے ان کا اعتراض یہ تھا کہ حضرت ابوسفیانؓ نے سمیہ سے مباشرت ہی نہیں کی۔ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ تعالی عنہ کی مخالفت کا بڑا شہرہ ہے، لیکن کسی بندۂ خدا نے یہ دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ ان کی وجہ اعتراض کیا تھی؟ حافظ ابن عبدالبر نے ان کا یہ قول نقل کیا ہے: لا واللہ ما علمت سمیۃ رأت ابا سفیان قط‘‘۔ نہیں، خدا کی قسم مجھے نہیں معلوم کہ سمیہ نے کبھی ابوسفیان کو دیکھا بھی تھا (الاستیعاب: ۲/ ۵۲۷)۔

سوال یہ ہے کہ تمام معترضین اس بات کو ثابت کرنے پر کیوں زور لگا رہے تھے کہ حضرت ابوسفیان کبھی سمیہ کے قریب نہیں گئے، انہوں نے سیدھی بات یہ کیوں نہیں کہی کہ ابوسفیان اگر سمیہ کے قریب گئے بھی ہوں تو یہ سراسر زنا تھا۔ اور زنا سے کوئی نسب ثابت نہیں ہوتا۔ یہ اس بات کی کھلی علامت ہے کہ ان حضرات کے نزدیک بھی اگر یہ ثابت ہو جائے کہ ابوسفیان نے سمیہ سے جاہلیت میں مبینہ مباشرت کی تھی، تو پھر ان کو بھی زیاد کے استلحاق میں کوئی اعتراض نہیں تھا، ان کو اعتراض صرف یہ تھا کہ ان کے علم کے مطابق ابوسفیان سمیہ تک نہیں گئے، اس لیے زیاد کا استلحاق درست نہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ ان کا یہ علم حضرت معاویہ پر حجت نہیں ہو سکتا۔ حضرت معاویہ کے پاس ۱۰ قابل اعتماد شہادت اِثبات پر گزر چکی تھیں۔ ان کے مقابلے میں یہ حضرات ہزار بار نفی پر شہادت دیں تو شرعاً اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

ہم پر تو اس واقعے کی تمام تفصیلات پڑھنے کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ تعالی عنہ کے جذبۂ احترامِ شریعت کا غیر معمولی تاثر قائم ہوا ہے۔ غور فرمائیے کہ حضرت معاویہ کی شرافت اور فضیلت کا معاملہ تو بہت بلند ہے، ایک معمولی آدمی کے نفس کے لیے بھی یہ بات کس قدر ناگوار ہوتی ہے کہ جس شخص کو کل تک ساری دنیا ولد الحرام اور غیر ثابت النسب کہتی اور سمجھتی آئی تھی آج اسے اپنا بھائی بنا لیا جائے۔ ظاہر ہے کہ حضرت معاویہ جیسے جلیل القدر صحابی، سردار اور سردار زادے (بلکہ امیر المومنین) کے لیے یہ بات کس قدر شاق ہوگی؟؟؟ (اللہ اکبر)۔ لیکن جب ۱۰ گواہوں کے بعد ایسے شخص کو اپنا بھائی قرار دینا ’’حق اللہ‘‘ بن جاتا ہے تو وہ اپنے تمام جذبات کو ختم کر کے اور مخالفین کی کھڑی ہوئی صعوبتوں کو

جھیل کر پکار اٹھتے ہیں کہ "عرفت حق الله فوضعته موضعه"، میں نے اللہ کے حق کو پہچان لیا اس لیے اسے اس کے حقدار تک پہنچا دیا۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت معاویہ کے جن معترضین کو اصل واقعے کا علم ہوتا گیا انہوں نے اپنے اعتراضات سے رجوع کر لیا۔ حافظ ابن عبدالبر ہی نے نقل کیا ہے کہ عبدالرحمن بن الحکم اور ابن مفرغ جنہوں نے اس واقعے پر حضرت معاویہ کے حق میں ہجویہ اشعار کہے تھے، حضرت معاویہ کے مذکورہ بالا ارشاد کے بعد انہوں نے بھی اپنے سابقہ رویے پر شرمندگی ظاہر کی (الاستیعاب: ۵۲۷/۲)۔ نیز وہ ابن عامر جن کے بارے میں حافظ ابن جریر نے یہ نقل کیا ہے کہ انہوں نے اس استلحاق کی مخالفت کرنے کے لیے نفی پر گواہیاں جمع کرنے کا ارادہ کیا تھا، طبری ہی کی تصریح کے مطابق وہ بھی بعد میں حضرت معاویہ سے معافی مانگنے آئے تھے اور حضرت معاویہ نے انہیں معاف کر دیا تھا۔ (طبری: ۲۱۵/۵) [۱]۔

لہٰذا پہلی بات تو یہ ثابت ہے کہ اس نسب کا دعویٰ زیاد نے کیا تھا، نہ کہ حضرت معاویہؓ نے، جیسا کہ صحیح مسلم اور مسند احمد کی صحیح روایت میں آیا ہے۔ دوسری بات یہ کہ حضرت معاویہؓ نے شرعی گواہیاں قائم ہونے کے بعد اس نسب کو تسلیم کیا تھا۔ اور انہوں نے شرعی طور پر اپنے لیے یہی حکم سمجھا تھا، جس کی انہوں نے اتباع کی۔

حضرت معاویہؓ اس رائے میں تنہا نہیں تھے:

زیاد کے نسب کے سلسلے میں یہی رائے متعدد ائمۂ اسلام کی ہے۔ امام بخاریؒ نے ان کا نام اپنی تاریخ میں زیاد بن ابی سفیان ہی لکھا ہے۔ بلکہ محدثین کی کثیر تعداد میں روایات بتاتی ہیں کہ بہت سے ائمۂ اہل علم اس نسب کو صحیح سمجھتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ بھی ان کا نام زیاد بن ابی سفیان لیتے تھے۔ (المعجم الکبیر: ۲۸۲/۱۲) امام بخاری، امام مالک، عبداللہ بن ابی بکر بن حزم، اور عمرۃ بنت عبدالرحمان جیسے ائمۂ علم ان کا تذکرہ زیاد بن ابی سفیان کے نام سے کرتے ہیں۔

مالك، عن عبد الله بن أبي بكر بن محمد، عن عمرة بنت عبد الرحمن، أنها أخبرته: أن زياد بن أبي سفيان كتب إلى عائشة زوج النبي صلى الله عليه وسلم... [۲]۔

امام ابوبکر ابن ابی شیبہ صحیح سند سے نقل کرتے ہیں کہ مشہور تابعی عالم امام عامر شعبی بھی ان کا نام زیاد بن ابی سفیان لیتے تھے۔ امام ابن ابی شیبہ اور ان کی سند کے دیگر محدثین نے اس نام کو اسی طرح نقل بھی کیا (مصنف: ۲۹۱۷۸)۔ اسی طرح طبرانی نے بھی حضرت معقل بن یسارؓ کی بیٹی ھند کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے، دوران گفتگو، زیاد کا نام ابن ابی سفیان کہہ کر لیا (معجم کبیر: ۲۲۲/۲۰)۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان ائمہ کے

---

[۱] ملاحظہ ہو حضرت معاویہ اور تاریخی حقائق، از حضرت مولانا محمد تقی عثمانی۔

[۲] موطا مالك: ۳۴۰/۱۔ صحيح البخاري: ۱۷۰۰۔

نزدیک زیاد کو ابوسفیان کا بیٹا کہنا اور ماننا شرعی اصولوں کے خلاف نہیں تھا۔ (اگرچہ متعدد اہل علم ان کو زیاد بن سمیہ یا زیاد بن ابیہ بھی کہتے آئے ہیں)۔

بے بنیاد بدگمانی:

رہی یہ بات کہ زیاد کو بھائی مان لینے کا مقصد ان کی سیاسی شخصیت سے فائدہ اٹھانا تھا، اس کی بھی تاریخی نظر کے سامنے کوئی حیثیت نہیں۔ زیاد ایک اعلیٰ درجے کے منتظم و باصلاحیت شخص تو ضرور تھے، مگر ان کا کوئی مستقل سیاسی وزن نہیں تھا۔ نہ ان کا کوئی حامی گروہ یا جماعت تھی۔ وہ حضرت علی کی انتظامیہ کے صف دوم کے لوگوں میں تھے، سن ۴۰ھ کی بات ہے، یعنی خلافت معاویہ کے آغاز میں، ان کے سابقہ علاقے کی، جہاں وہ حضرت علی کی طرف سے متعین تھے، مالیات کا کچھ معاملہ ایسا پیش آ گیا تھا کہ وہ حضرت معاویہ سے ڈر کر اپنے قلعے میں بند ہو گئے تھے اور فارس سے عراق نہ آتے تھے۔ ان کے ماں جائے بھائی حضرت ابوبکرہ ثقفیؓ کی وساطت سے حساب کتاب صاف ہوا، اور اس طرح زیاد محفوظ ہو سکے (طبری: ۵/ ۱۶۸)۔ اب بتائیے کہ کیا زیاد کی شخصیت ایسی تھی کہ حضرت معاویہ اپنے ''سیاسی اغراض کے لیے شریعت کے ایک مسلم قاعدے کی خلاف ورزی'' کرتے اور کسی نامعلوم النسب شخص کو اپنا بھائی بنا کر اپنی عزت نفس کو سر بازار رسوا کرتے؟

مزید سنیے! سن ۴۲ھ میں زیاد حضرت معاویہؓ کے پاس حاضر ہو کر اپنا معاملہ صاف کر لیتے ہیں، اور عہدے سے معزول ہو کر بلا کسی سیاسی حیثیت کے مطیعانہ رہتے ہیں۔ راویت بتاتی ہے کہ سن ۴۴ھ میں یعنی اس کے دو سال بعد یہ استلحاق کا قصہ ہوتا ہے۔ پھر کون سی سیاسی مصلحت زیاد کو خوش کر کے حاصل کی جا سکتی تھی؟؟ دوسری بات یہ کہ خلافت معاویہؓ کے ان چار سالوں میں (سن چالیس سے چوالیس تک) زیاد کی طرف سے کسی قسم کی محاذ آرائی، جتھہ بندی یا کسی مخالف طاقت کی حمایت کا کوئی اشارہ یا نشان نہیں ملتا۔ وہ تو بظاہر بالکل پرسکون تھے۔ پھر حضرت معاویہ کو یہ بدنامی مول لینے کی کیا ضرورت تھی؟ بہر حال تمام قرائن بھی شہادت دیتے ہیں کہ حضرت معاویہؓ نے اپنے لیے یہ عار صرف اسی لیے برداشت کی کہ گواہوں کے آنے کے بعد وہ شرعی طور پر مجبور تھے۔ اور یہ حضرت معاویہ کے اتباع شریعت میں کمال اور قانون کے سامنے اُن کی سرنگونی کی واضح مثال ہے۔ یہ یقیناً ان کی ان کے نظام حکومت کی فضیلت کی بات ہے۔ یہ واقعہ شہادت ہے اس بات کی کہ امیر المومنین اپنی عزت کی قربانی دے کر بھی قانون شریعت کو سر بلند رکھتے تھے۔ حیرت کہ خوبی کو بدی بنایا جاتا ہے!!۔

زیاد کی شخصیت و کردار:

یہ تو زیاد کے نسب کے مسئلے کا تذکرہ ہوا، جس کی تفصیل اس لیے ضروری تھی کہ یہ حضرت معاویہ پر شیعیت زدگان کی طرف سے کیا جانے والا ایک اہم اعتراض تھا۔ البتہ یہاں زیاد کے کچھ حالات ذکر کرنے ضروری

ہیں۔ یہ سن ایک ہجری میں طائف پیدا ہوئے۔ وہیں تعلیم حاصل کی۔ نہایت ذہین وعقل مند، اعلیٰ درجہ کی ادبی ولسانی صلاحیت اور بلا کی خطابت کے مالک تھے۔ ذہبی لکھتے ہیں:

کان من نبلاء الرجال رأیا وعقلا وحزما ودھاءً وفطنۃً، کان یضرب بہ المثل فی النبل والسؤدد، وکان کاتبا بلیغاً۔

عقل وفراست، ذہانت وتدبیر میں طاق، قوت فیصلہ اور قائدانہ صلاحیت میں ممتاز تھے۔ سرداری ونجابت میں ان کی مثال دی جاتی تھی۔ ساتھ ہی بلیغ اللسان صاحب قلم بھی تھے۔ (سیر: ۳/ ۴۹۵)

ان کی غیر معمولی صلاحیت اور فصاحت دیکھ کر حضرت عمر نے خود ان کو اپنی مملکت کے سب سے اہم مرکز کوفہ کے امیر حضرت ابوموسیٰ اشعری کا چیف سکریٹری متعین فرمایا تھا (طبری: ۳/ ۴۸۹)۔ پھر وہ اس عہدے پر عہد عثمانی کے دوران حضرت مغیرہ کی گورنرشپ میں بھی مامور رہے۔ یہاں تک کہ حضرت علیؓ کا دور آیا، تو انہوں نے جنگ جمل کے بعد فورا بصرہ کا والی زیاد کو ہی بنانا چاہا۔ زیاد بڑے ذہین ومعاملہ فہم آدمی تھے، جانتے تھے کہ عہد عثمانی کے عمال کے خلاف بہت پروپیگنڈا ہو چکا ہے۔ کہا کہ امیر المومنین موجودہ حالات میں مناسب یہ ہے کہ یہاں کوئی آپ کا عزیز قریب گورنر بنے، میں ہر طرح معاونت کروں گا۔ حضرت علی نے رائے سے اتفاق کیا اور حضرت عبداللہ بن عباس کو بصرے کا گورنر جنرل مقرر کیا۔ مگر زیاد کو وزیر مالیات اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا مشیر عام طے فرمایا (طبری ۴/ ۵۴۳)۔

یہ بات قابل لحاظ ہے کہ اختلاف کے دور میں زیاد حضرت علیؓ کے معتمد اور حامی رہے۔ جب ایران میں بغاوت پھیلنے لگی، کرمان اور جنوب فارس کے علاقوں نے مسلم حکام کو اپنے یہاں سے نکال دیا اور خراج دینا بند کر دیا تو حضرت علیؓ نے مشورہ کیا کہ کس کو اس علاقے کی کمان دی جائے۔ یہ علاقے انتظامی طور پر بصرہ کے تابع تھے۔ لہٰذا بصرے کے گورنر حضرت ابن عباسؓ نے رائے دی کہ میں بصرے سے اپنے نائب زیاد کو بھیجتا ہوں۔ انہوں نے اور حضرت جاریہ بن قدامہؓ نے (جو حضرت علی کے ایک اہم کمانڈر تھے) زیاد کے بارے میں کہا: إنه صليب الرأي، عالم بالسياسة۔ زیاد پختہ عقل اور حکومت کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ (البدایہ والنہایہ: ۷/ ۳۵۵)۔ غرض بصرے سے کثیر افواج کے ساتھ زیاد کو بھیجا گیا اور ان کو (بصرے کے گورنر جنرل حضرت ابن عباس کے تحت) مملکت فارس کا ڈپٹی گورنر مقرر کیا گیا۔ زیاد کے حسن تدبیر سے وہاں کے لوگ پھر مطیع ہو گئے۔ (تاریخ طبری: ۵/ ۱۳۷)۔

بصرہ کی گورنری: حضرت معاویہؓ کے دور میں حضرت عبد اللہ بن عامر سن ۴۴ھ تک بصرے کے والی رہے۔ مگر وہ نہایت کریم الخلق آدمی تھے۔ جس کا بصرہ کے خوارج اور انتشار پسند عناصر ناجائز

فائدہ اٹھاتے تھے۔ بصرے کے ایک اہم سردار عبداللہ بن الکواء حضرت علیؓ کے بہت قریبی لوگوں میں تھے۔ عبد اللہ بن عامر کے دور امارت میں وہ ایک سرکاری وفد کے ساتھ دربار خلافت میں آئے۔ اس موقعہ پر انہوں نے حضرت معاویہؓ کو گورنر کی تبدیلی کا مشورہ دیا اور کہا کہ بصرہ کو ایک سخت منتظم کی ضرورت ہے۔ زیاد حضرت عمرؓ کے دور سے بصرے کا انتظامی اور سیاسی تجربہ رکھتے تھے۔ جنوب فارس کی شورش کو کنٹرول کر کے انھوں نے اپنی ذہانت وصلاحیت کا ثبوت دیا تھا۔ لہٰذا حضرت معاویہؓ نے ان کو سن ۴۵ھ میں بصرے کا گورنر مقرر کیا (طبری: ۵/ ۲۱۲)۔

تاریخ کی کتابوں میں ہے کہ زیاد نے بصرہ آنے پر ایک نہایت پر جلال وغضب اور طویل خطبہ دیا، جس کے لفظ لفظ سے ناروا سختی وشدت پسندی ظاہر ہے۔ مگر وہ بالکل بے سند ہے۔ معمولی سا تاریخی شعور رکھنے والا اندازہ لگا سکتا ہے کہ وہ نری داستان اور کسی بلیغ کاتب کا زورِ قلم ہے۔ (اس کے مطابق) زیاد نے کہا کہ میں مجرم ہی نہیں مُشتبہ شخص کو بھی قتل کر دوں گا۔ اور بھائی کے بدلے بھائی کو پکڑوں گا۔ داستان کہتی ہے کہ زیاد نے اس طرح دہشت پھیلا کے بصرے کو قابو میں کیا۔ بظاہر یہ صرف داستان ہے۔ بصرہ میں صحابہ کی ایک جماعت موجود تھی، تابعین اور علماء کی کثرت تھی، امر بالمعروف نہی عن المنکر عام تھا، گورنر ہی نہیں خلیفہ کو بھی لوگ سرِ عام ٹوک دیا کرتے تھے۔ اور معاشرہ ''خیر القرون'' کا تھا۔ ایسا ظلم اور اندھیر اس معاشرے میں کہاں ممکن تھا؟ ہم نے نہیں سنا کہ کسی صحابی نے ایسے مظالم پر تنقید کی ہو۔ ایسے قصے ادیبوں اور قصہ گویوں کے خانہ ساز ہوا کرتے ہیں [۱]۔

مورخِ بصرہ علی ظریف الاعظمی لکھتے ہیں: زیاد کے دور میں بصرہ نے بہت ترقی کی۔ انہوں نے بصرہ میں پولیس کے عملے کی تعداد میں اضافہ کیا، یہاں تک کہ ان کی تعداد چار ہزار ہوگئی، فوج میں بھی نئی بھرتیاں کیں اور اس کی تعداد بڑھا کر ۸۰ ہزار کر دی۔ ان اقدامات کا اثر پڑا کہ حالات پرسکون و مامون ہو گئے۔ بصرہ میں خوش حالی کا دور آیا اور باہر سے بڑی تعداد میں لوگ آ آ کر آباد ہوئے [۲]۔

ممتاز صحابی حضرت عمران بن حصینؓ کو حضرت عمرؓ نے بصرے میں تعلیم دین کے لیے بھیجا تھا۔ زیاد نے ان کو بصرہ کا قاضی مقرر کیا۔ ایک شخص نے کہہ دیا کہ آپ نے میرے خلاف ناحق فیصلہ دیا ہے، بس انہوں نے استعفیٰ دے دیا۔ ان کے بعد زیاد نے حضرت فضالہ بن عبیدؓ کو قاضی مقرر کیا ان کے بعد عاصم بن فضالہ، پھر زیاد کی وفات تک حضرت زرارہ بن اوفی عامری بصرے کے قاضی رہے (اخبار القضاۃ: ۱/ ۲۹۶)۔ یہ بڑے

۱۔ سند کی چھان بین کرنے پر بعض مولفین کو ان باتوں کی کوئی بھی قابل لحاظ سند نہیں ملی (مرویات خلافۃ معاویہ: ۲۱۰)۔

۲۔ مختصر تاریخ البصرہ: ۴۵، نیز فتوح البلدان: ۳۴۰، طبری: ۵/ ۵۰۴۔

صاحب دل اور جلیل القدر عالم تھے۔ ذہبی نے ان کا تذکرہ الامام الکبیر کہہ کر کیا ہے۔ ان کے بارے میں ثابت ہے کہ ایک دن فجر کی نماز پڑھائی، جب اس آیت پر پہنچے "فاذا نقر فی الناقور، فذلك یومئذ یوم عسیر" (جب صور میں پھونک ماری جائے گی، تو وہ دن بڑا مشکل دن ہوگا۔) تو خوف کی شدت سے جان نکل گئی۔ (سنن ترمذی: ۴۴۵، حلیۃ الاولیاء: ۲/ ۲۵۸ بسند صحیح)۔

کوفہ کی ذمہ داری: کوفہ کے گورنر حضرت مغیرہ بن شعبہؓ تھے۔ مورخین نے بیان کیا ہے کہ حضرت مغیرہ کی شرافت ونرمی سے کوفہ میں بھی خوارج کی سازش نے پاؤں پسار لیے تھے۔ سن ۵۰ھ میں ان کی وفات ہوئی تو حضرت معاویہ نے کوفہ کے مرکز کو بھی زیاد کے تابع کر دیا۔ زیاد نے حضرت سمرہ بن جندبؓ کو اپنا نائب مقرر کیا۔ ۶ ماہ بصرے قیام کرتے اور ۶ ماہ کوفہ رہتے۔ اور دونوں مراکز میں حضرت سمرہ ان کے نائب کے طور پر ذمے داریاں ادا کرتے۔ یہ دونوں حضرات خوارج کی سرکوبی میں (حضرت علیؓ ہی کی طرح) سرگرم و پختہ عزم واقع ہوئے۔ یہ ان کا بڑا کارنامہ تھا[۱]۔

---

۱ طبری نے ایک روایت ذکر کی ہے کہ زیاد کوفہ آئے تو مسجد میں لوگوں نے ان پر کنکریاں ماریں، انہوں نے مسجد کے دروازے بند کرا دیے اور لوگوں سے قسم لی کہ نہ ہم نے ماری نہ ہم جانتے ہیں کہ کس نے کنکریاں ماریں۔ تیس لوگوں نے قسم نہیں کھائی تو ان کے ہاتھ کٹوا دیے۔ اس واقعے کے راوی مسلمہ بن محارب زیادی اُس زمانے کے آدمی نہیں ہیں (تاریخ کبیر بخاری: ۷/ ۳۸۷)۔ وہ یہ نہیں بتاتے کہ اس "بڑے حادثے اور روح فرسا ظلم" کی خبر اُن کو کس نے دی ہے؟ اب یہ ایک منقطع روایت ہے۔ ایسی روایات کسی شیعہ کی کارستانیاں ہوتی ہیں۔

اتنا بڑا واقعہ ہوتا تو ایک نامعلوم راوی کے علاوہ کسی نے اس کو کیوں نقل نہیں کیا؟۔ طبری کے علاوہ کسی قدیم مورخ مثلاً خلیفہ بن خیاط، بلاذری اور ابن سعد وغیرہ نے اس "شدید ظلم" کا تذکرہ تک نہیں کیا۔ اس روایت کے ناقابل اعتبار ہونے ہی کا نتیجہ ہے کہ ذہبیؒ اور ابن کثیرؒ نے اس روایت کو اپنی کتابوں میں جگہ نہیں دی۔ (حال آں کہ ان دونوں نے تاریخ طبری سے بہت سی بے اصل اور قابل اعتراض روایات بھی ذکر کر دی ہیں۔

اس کہانی کے بے بنیاد ہونے کا ایک یقینی قرینہ یہ ہے کہ کہیں یہ معلوم نہیں ہوتا ہے کہ اس ظلم پر کسی مسلمان نے نکیر کی ہو۔ صحابہ موجود تھے، حضرت سمرہ بن جندبؓ جیسے صاحب فضیلت صحابی تو زیاد کے نائب ہی تھے۔ حضرت عمران بن حصینؓ بھی وہیں موجود اور زیاد کے کارپردازان میں تھے۔ اس وقت کوفہ کے قاضی شریح بن حارث تھے (جن کا عدل اور جن کی حق گوئی آج ہی نہیں، خلافت راشدہ کے دور میں بھی مثالی سمجھے جاتے تھے) انہوں نے اس پر کچھ بھی نہ کہا اور بدستور ایسے "ظالم" کی حکومت میں قاضی بنے رہے؟؟۔ ایک دوسرے قاضی مسروقؒ نے بھی کچھ نکیر نہیں کی، وہ بدستور زیاد کے ماتحت قاضی بنے رہے اور پھر واسط میں اس کے کلکٹر (تحصیل کے افسر) کے طور پر بھی کام کیا۔ صحابہ کا تو مرتبہ ہی بے نظیر تھا، قاضیان شریح ومسروق جیسے حضرات بھی زمین میں خدا کی رحمت ہوتے ہیں۔ کیا معاذ اللہ ان سب کے دلوں پر مہر لگ گئی تھی؟ مگر جس ذہنیت نے ابوبکر وعمر کو (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) زندیق ومنافق اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دشمن بتانے والے قصے گھڑے ہیں، اس کے لیے یہ سب عین قرین قیاس ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جو صحابہ کے اخلاص وصدق پر ایمان رکھتے ہیں، ان کی سمجھ کو کیا ہو گیا؟۔

زیاد کی وسیع قلم رو: زیاد کے ماتحت عالم اسلام کا گویا پورا مشرقی بازو تھا، آج اس زمین پر عراق، ایران افغانستان، پاکستان اور ماوراء النہر کے متعدد ممالک آباد ہیں، زیاد کے تحت متعدد حکام ہوا کرتے تھے۔ان میں کئی صحابۂ کرام بھی تھے۔جن میں حضرت حکم بن عمرو غفاریؓ خراسان کے امیر تھے۔حضرت سمرہ بن جندبؓ جیسے صاحب فضیلت انصاری صحابی زیاد کے نائب اول تھے۔حضرت عمرو بن حریثؓ بھی کوفہ میں نائب کے طور پر کئی بار رہے۔حضرت عمران بن حصینؓ قاضیِ بصرہ تھے۔حضرت انس بن مالکؓ جیسا عالم اور حضرت عبدالرحمان بن سمرہؓ جیسے لوگ زیاد کے ساتھ کاروبار حکومت میں شریک بلکہ ماتحت کے طور پر کام کرتے تھے[۱]۔اسی طرح ممتاز اور کبار تابعین زیاد کے تحت عشار (ٹیکس کی تحصیل) کا کام کرتے تھے۔جن میں حضرت مسروق، ابووائل شقیق بن سلمہ، زیاد بن حدیر اور عبداللہ بن حسنین جیسے ائمۂ علم شامل تھے (تاریخ واسط از بحشل :۳۸) یہ سب حدیث وفقہ کے اہم ائمہ اور اپنے دور کے کبارِ مشائخ علم میں شامل ہیں۔اب کیا سوال کہ زیاد کے وہ کرتوت ہوں جو بے اصل روایتوں میں مشہور کردیے گئے ہیں؟

حضرت قبیصہ ابن جابرؒ اور ابواسحاق سبیعیؒ کی شہادت:

یہی سبب ہے کہ ابن کثیر اور ذہبی نے زیاد کے تذکرے میں ایسے مظالم کا کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے۔ (مشہور تابعی عالم وفقیہ، نیز حضرت علیؓ کے ایک سپہ سالار) حضرت قبیصہ بن جابر سے معتبر اسانید سے وارد ہوا ہے کہ انہوں نے گنایا کہ وہ حضرت عمرؓ، حضرت طلحہ بن عبیداللہؓ، حضرت عمرو بن العاص، حضرت معاویہؓ اور حضرت مغیرہ بن شعبہ جیسے امراء مملکت کی صحبت میں رہے۔قبیصہ ان سب شخصیات کی خصوصیات واوصاف گناتے جاتے تھے۔پھر فرمایا اور میں زیاد کے بھی ساتھ رہا:

فما رأيت أحدا أحلم ولا أكرم جليسا منه، ولا أخصب رفيقاً منه

میں نے زیاد جیسا حلم وبرداشت والا، کریم الطبع، اور پرلطف مجلس والا نہیں دیکھا۔

امام بخاری نے التاریخ الکبیر میں حسن سند سے اس کو روایت فرمایا ہے[۲]۔اسی طرح مسند علی بن الجعد میں بسند صحیح روایت ہے کہ مشہور تابعی بزرگ اور محدث ابواسحاق سبیعیؒ کہتے ہیں کہ میں نے زیاد کے دور میں چھ

---

[۱] البدایہ والنہایہ:۸/۳۲ نیز الاصابہ میں ان اصحاب کے تراجم۔

[۲] تاریخ کبیر: ۷/۱۷۵،۱۷۶، اس کی تائید میں ایک روایت المعرفۃ والتاریخ میں بھی مروی ہے جس کی سند میں ہلکا سا ضعف ہے، لیکن اس سے امام بخاری کی روایت کی مزید تائید ہوتی ہے اور وہ صحیح لغیرہ کا درجہ پالیتی ہے۔ المعرفۃ والتاریخ للفسوی:۱/۴۵۷،۴۵۸۔

سات جہاد کیے ہیں۔ان کے دور سے بہتر زمانہ میں نے نہیں پایا (مسند علی بن الجعد: ۷۲)۔

ہمارا مدعا زیاد کی تعریف وتوصیف یا ان کو اعلیٰ اسلامی معیار کا حکم راں ثابت کرنا نہیں، کہ اس کے لیے زیاد کی شخصیت وحکم رانی کے مستقل تحقیقی مطالعے کی ضرورت ہے۔لیکن حضرت عمر فاروقؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابن عباسؓ اور حضرت معاویہؓ کا زیاد پر اعتماد کرنا، پھر متعدد قابل احترام صحابہ کا زیاد کی ماتحتی میں کام کرنا اور اِن ائمۂ تابعین کے مذکورہ بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ زیاد کے بارے میں تاریخی روایات میں جس دہشت انگیز ظالمانہ سختی کے قصے آتے ہیں وہ قابل اعتبار نہیں ہیں۔

حضرت سمرہ بن جندبؓ:

بصرہ میں زیاد کے نائب کے طور پر لمبی مدت تک مقرر رہے۔بڑے جلیل القدر صحابی تھے۔مدینہ طیبہ میں پرورش پائی،غزوۂ احد کے موقع پر کم عمر تھے،شوقِ جہاد میں پہنچ گئے۔حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے واپس کرنا چاہا،مگر سمرہ مچل گئے اور کہا کہ آپ نے فلاں کو اجازت دے دی ہے، جو مجھ سے کمزور ہے، میں اس کو کشتی میں ہرا دوں گا۔آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کشتی کرائی،جس میں انہوں نے دوسرے نوجوان کو پچھاڑ دیا اور غزوے میں شرکت فرمائی (مستدرک: ۹۶/۲)۔اس کے بعد کے تمام غزوات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ شریک رہے۔

حضرت سمرہؓ ان نوجوان صحابہ میں سے تھے جنہوں نے خصوصیت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت اٹھا کے علم حاصل کیا تھا۔وہ اہم محدثین اور فقہاء صحابہ میں شمار ہوتے ہیں۔ان کو یہ بھی شرف حاصل ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث،فرامین اور عدالتی فیصلوں پر مشتمل ایک کتاب تیار کی تھی جوان کے شاگردوں کے بقول ''علم کثیر'' پر مشتمل تھی۔خلافت راشدہ کے دور میں اہل علم وفضل صحابہ مفتوح علاقوں میں تعلیم وارشاد کے لیے پھیلا دیے گئے،ان میں حضرت سمرہ بن جندب بھی تھے،جن کو حضرت عمرؓ کے دور میں بصرہ کے اہم فوجی اور سیاسی مرکز میں بھیجا گیا تھا۔وہ وہاں لگا تار تعلیم دین میں مشغول رہے۔صحابہ کے دور میں بصرہ سیاسی وعسکری اعتبار سے اہم مقام تو رکھتا ہی تھا،علم ودین کا ایک اہم مرکز بھی تھا،حضرت سمرہ اس اسکول کے اہم اساتذہ میں سے تھے،جس میں ائمۂ تابعین کی ایک بڑی تعداد تیار ہوئی۔حضرت حسن بصری،محمد بن سیرین اور عامر شعبی جیسے ائمہ حضرت سمرہ کے اہم شاگرد تھے۔اور یہ حضرات علم وامانت اور اسلام اور مسلمانوں کی خیر خواہی جیسی صفات میں اُن کے امتیازی مقام کا تذکرہ کیا کرتے تھے (تہذیب الکمال: ۱۳۱/۱۲)۔حضرت علیؓ نے ان کو بصرہ کا گورنر بھی متعین کیا تھا (البدایہ والنہایۃ: ۲۵۶/۷)۔

حضرت عمرؓ کے اہم کار پردازوں میں سے ہونے کی بنا پر نیز اپنے فضائل،محترم مقام اور اعلیٰ انتظامی

صلاحیتوں کے پیش نظر حضرت معاویہؓ نے اُن کو اپنے گورنر جنرل زیاد کے نائب کے طور پر کوفہ و بصرہ میں مقرر کیا۔ زیاد ۶ ماہ بصرہ میں قیام کرتے اور حضرت سمرہ بن جندب کوفہ میں۔ اور ۶ ماہ اس کے برعکس ہوتا۔ کوفہ و بصرہ خوارج کی بغاوتوں اور سبائیوں کی سازشوں کے اہم مراکز بھی تھے۔ مشرقی ممالک میں ان دونوں فتنہ پرور عناصر سے اسلام اور حکومت کو خطرہ لاحق تھا۔ حضرت معاویہؓ نے مسلسل اس تشویش ناک صورت حال کی فکر رکھی۔ اور ان کے اہم ترین کارناموں میں سے ایک کارنامہ یہ ہے کہ وہ ایسے فتنوں کو دبانے میں کامیاب رہے جنہوں نے حضرت عثمان کے عہد سے اسلامی خلافت کو کمزور کر رکھا تھا۔ حضرت سمرہ خصوصاً خوارج کی بیخ کنی میں بہت سرگرم تھے۔ وہ رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث کثرت سے سنایا کرتے تھے کہ آپ ﷺ نے پیشین گوئی کی تھی کہ ایسی گمراہ جماعت پیدا ہوگی، پھر اُن کو مسلمان قتل کریں گے۔ اور وہ زمین کے سب سے بدترین مقتول ہوں گے [۱]۔ ابن عبد البرؒ کہتے ہیں کہ باغیوں اور فتنہ پروروں پر سختی کی وجہ سے خوارج اور دیگر گمراہ فرقے حضرت سمرہ بن جندب پر طعن وافترا پردازی کرتے ہیں۔ زیاد کی وفات کے بعد کچھ مدت تک حضرت سمرہ گورنر جنرل کے طور پر کام کرتے رہے، بعد میں ان کو سبک دوش کر دیا گیا (ملاحظہ ہو تہذیب الکمال اور الاصابہ میں حضرت سمرہ کا تذکرہ)۔

حضرت عقبہ بن عامر جہنیؓ:

حضرت عقبہ بن عامرؓ بافضیلت صحابی بھی حضرت معاویہ کے ارکان حکومت میں سے تھے۔ امام مسلم نے اپنی صحیح میں ان کے بارے میں مشہور تابعی عالم و بزرگ قیسؒ ابن ابی حازم کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ''کان من رفعاء اصحاب محمد ﷺ'' یعنی بلند مرتبہ صحابہ میں سے تھے (صحیح مسلم: ۸۱۴)۔ ابن حجر کہتے ہیں: عالم وقاری تھے، نہایت فصیح البیان اور فقہ و علم فرائض کے بڑے عالم تھے، شعر کا ملکہ بھی تھا۔ غرض اونچی شان کے آدمی تھے۔ تلاوت قرآن کا انداز بڑا دلکش تھا۔ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے فرمائش کی کہ کچھ سنائیں۔ حضرت عقبہ نے پڑھا تو حضرت فاروقؓ پر گریہ طاری ہوگیا۔ علم و فضل کا یہ مقام تھا کہ حضرت ابن عباس اور دیگر صحابہ ان سے روایت کرتے ہیں۔ لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ عہد نبوی ہی میں اپنے ہاتھ سے پورا قرآن لکھا تھا۔

مدینہ کے پڑوس میں آباد قبیلۂ جہینہ سے تعلق تھا، رسول اللہؐ نے ان قبائل پر ہجرت ضروری قرار نہیں دی تھی، سو وہ اپنے دیار ہی میں رہتے رہے۔ مگر عقبہ بن عامرؓ نے محبت نبوی میں مدینہ ہجرت کی اور اصحاب صفہ کے ساتھ قیام کیا، مستقل صحبت نبوی سے فائدہ اٹھایا اور علماء صحابہ میں شمار ہوئے۔ ان خوش بخت صحابہ میں سے تھے جو سفر و حضر میں آں حضرت ﷺ کی ذاتی خدمت کی سعادت پاتے تھے۔ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کی سواری

---

[۱] المستدرک: ۲/۱۶۳، امام حاکم اور ذہبی نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔

کی نکیل تھامے پیادہ چل رہے تھے، کچھ دیر ہوگئی تو آپ ﷺ نے کہا اب تم سوار ہو جاؤ۔ ان کو خلاف ادب محسوس ہوا، مگر رسول اللہ ﷺ نے پھر حکم دیا، ان کو ڈر لگا کہ حکم عدولی نہ ہو جائے تو کچھ دیر کے لیے بیٹھ گئے اور جلد اتر پڑے ۱؎۔

خلافت صدیقی میں لشکر شام کے ساتھ جہاد پر گئے۔ دمشق فتح ہوا تو امیر شام حضرت ابو عبیدہؓ نے ان کو ہی مدینہ خوش خبری دینے کے لیے بھیجا۔ شام کی مہمات میں جہاد فرماتے رہے اور مسلمان ان کے علم وفقہ سے بھی مستفید ہوتے۔ شام کی فتوحات کی تکمیل کے بعد حضرت عمر نے حضرت عمرو بن العاص کو مصر کے محاذ پر جہاد کے لیے بھیجا، تو حضرت عقبہ ان کی معاونت کے لیے مصر بھیجے گئے۔ اور پھر یہیں مستقل قیام اختیار کرلیا۔ اور اپنے علم وفیض سے اہل مصر کو سیراب فرماتے رہے۔

حضرت معاویہ کی پالیسی خلافت راشدہ کے کامیاب ارکان حکومت سے تعاون لینے اور ان کو اہم عہدوں پر مقرر کرنے کی تھی۔ لہٰذا سن ۴۴ھ میں حضرت معاویہ نے حضرت عقبہ بن عامرؓ کو مصر کی عظیم ووسیع مملکت کا حاکم مقرر کیا۔ عہد فاروقی سے یہ معمول تھا کہ بصرہ کوفہ اور مصر وغیرہ جیسے بڑے مراکز میں (جن کے تحت بڑی قلمرو ہوتی تھی) عموماً ایک حاکم برائے افواج وشہری امور ہوتا تھا، اور ایک نیم خودمختار حاکم مالیات (Revenue) کا ذمے دار ہوتا تھا۔ پہلے کو امیر علی الصلاۃ اور دوسرے کو امیر الخراج کہتے تھے۔ حضرت عقبہؓ مصر کے پہلے گورنر جنرل تھے جن کو دونوں ذمے داریاں تفویض کی گئیں۔

حضرت معاویہ کے عہد میں بحر متوسط کے مغربی حصے کی مہمات میں مصر کی بحری ڈویژن سرگرم رہتی تھی۔ سن ۴۷ھ میں حضرت معاویہ نے حضرت عقبہؓ کو جزیرہ روڈس پر حملے کے لیے بھیجا، جو رومیوں کا ایک اہم بحری اڈہ ہونے کے علاوہ جنگی نقطۂ نظر سے بحر ایجہ کے نہایت اہم تزویراتی (Strategic) مقام پر واقع تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد ان کو مصر کی گورنرشپ سے سبک دوش کر دیا گیا، وہ مدت تک بحری محاذوں پر جہاد میں مصروف رہے۔ اس کے ساتھ ہی مصر میں ایک دینی مرشد عام ومعلم کی ذمہ داری بھی ادا کرتے رہے ۲؎۔

مروان بن الحکمؒ:

حضرت معاویہ کے اہم گورنروں میں مروان بن الحکم کا شمار ہوتا ہے۔ وہ حضرت معاویہ کے خاص معتمد اور خلافت کی اہم علمی شخصیت تھے۔ سن دو ہجری میں ولادت ہوئی۔ کبار تابعین اور اپنی نسل کے ائمۂ علم میں ہیں۔ عمر

۱؎ مسند احمد: ۲۹۶/۱۷، شرح زرقانی: ۵۱۰/۴۔
۲؎ ملاحظہ ہو الاصابہ اور الاستیعاب میں حضرت عقبہ بن عامرؓ کا تذکرہ۔

کا بڑا حصہ مدینہ میں گزارا۔امام مالک، امام بخاری وغیرہ تمام ائمہ نے ان کی سند سے احادیث روایت کی ہیں۔ اور سب کا ان کی ثقاہت وعدالت پر اعتماد ہے۔ یہاں تک کہ صحابی رسول حضرت سہل بن سعد ساعدیؓ بھی ان سے روایت بیان کرتے ہیں۔ان کے علمی وفقہی مقام پر محکمۂ عدل کے تحت کچھ مزید گفتگو کی جائے گی۔امام احمد کہتے تھے کہ وہ قضاء اور فتوے میں حضرت عمر کی اتباع کرتے تھے (البدایہ والنہایہ: ۸/ ۲۸۳)۔

مراون پر جھوٹی تہمتیں:

حضرت عثمان نے اپنی خلافت کے دور میں ان کو اپنا سکریٹری مقرر کیا تھا۔باغیوں کے فتنہ میں جب خود حضرت عثمان ذوالنورینؓ پر اتہام وافترا کی یورش کی گئی، تو بے چارے مروان کیا بچتے؟ ایک تہمت یہ لگائی گئی کہ یہ مروان ہی تھے جنہوں نے مصر کے حاکم کے نام حضرت عثمانؓ کی طرف سے جھوٹا خط لکھا؛ کہ مصری باغی، حضرت عثمان سے معاہدے کے بعد، جب واپس مصر پہنچیں تو ان کو قتل کر دیا جائے۔ یہ خط پکڑا گیا۔اور مروان کی اس شاطرانہ چال کا انجام یہ ہوا کہ حضرت عثمان شہید کیے گئے۔ یہ کتنی بے سر پیر کی داستان اور کس قدر واضح عقلی دلائل کے خلاف کہانی ہے، اس کو ہم شہادت عثمانی کے موقع پر بیان کر چکے ہیں۔اسی طرح اس بے بنیاد اور خلاف عقل تہمت کا تذکرہ بھی آچکا ہے کہ انہوں نے ہی معاذ اللہ حضرت طلحہ کو، یہ کہہ کر شہید کیا تھا کہ یہ ہی حضرت عثمان کے قاتل ہیں، نعوذ باللہ۔

اسی طرح تاریخی روایات میں ایک یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مروان کے والد حکم بن ابی لعاصؓ کو مدینہ سے جلاوطن کر دیا تھا، وہ طائف چلے گئے تھے۔حضرت عثمانؓ نے اپنی رشتے داری کی وجہ سے ان کو (حکم رسول کو قطعا نظر انداز کرتے ہوئے) مدینے بلا لیا اور ان کے بیٹے مروان کو اتنا اونچا مقام دے دیا۔امام ابن تیمیہؒ نے اس روایت کی غلطی واضح کی ہے۔ کہتے ہیں کہ حَکَم فتح مکہ میں اسلام لائے اور فتح مکہ میں اسلام قبول کرنے والے مدینہ میں رہتے ہی نہیں تھے۔تو ان کی مدینہ سے جلاوطنی کیسے ہوتی؟ ابن تیمیہ مزید کہتے ہیں کہ جلاوطنی کی بات جن روایات میں آئی ہیں سب بے سند ہیں۔اسی لیے بہت سے اہل علم اس قصے کا انکار کرتے اور اس کو باطل قرار دیتے ہیں (منہاج السنۃ: ۶/ ۲۶۵، ۳۵۳)۔اسی طرح کی روایت یہ بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مروان کے خاندان (بنوابی العاص) کے بارے میں فرمایا تھا کہ یہ بڑا افساد پھیلائیں گے۔ ابن کثیر نے ان روایات کو ذکر کیا اور کہا سب ضعیف یا موضوع ہیں (۸/ ۲۸۴)۔اسی طرح یہ بھی مشہور کیا گیا کہ حضرت حکم پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لعنت فرمائی تھی۔مگر سب منکر ومنقطع روایات ہیں۔حافظ ذہبی، ابن کثیر، ابن حجر

اور سخاوی وغیرہ ائمہ نے ان کو ضعیف ومنکر قرار دیا ہے اور تصریح کی ہے کہ ان کا اعتبار کرنا جائز نہیں ہے [۱]۔

یہ سب بعد کے دور میں گھڑی گئی روایتیں ہیں:

تاریخی صورت حال کا جائزہ اس میں شبہہ نہیں چھوڑتا کہ مروانؒ کی مذمت کے یہ سارے قصے بعد کے زمانے کی پیداوار ہیں۔ جب حضرت عثمانؓ نے مروان کو اپنا سکریٹری بنایا تھا، اس وقت سیدنا علیؓ، سیدنا زبیرؓ، سیدنا طلحہؓ، سیدنا سعد بن ابی وقاصؓ، سیدنا عبدالرحمن بن عوفؓ شوریٰ کے ارکان تھے، ان کے علاوہ بے شمار کبار صحابہ موجود تھے۔ ان سب نے کیوں نہیں کہا کہ آپ اسلامی خلافت کے دروبست پر ایک ملعون شخص کو مقرر کررہے ہیں؟ کیا ان کا احساس فرض مر گیا تھا؟ کہاں چلی گئی تھی ان سب کی غیرت؟ کہاں رہ گئی تھی ان کی دین سے محبت؟؟؟

پھر سوچیے کہ تابعین کے دور میں اگر یہ روایات موجود ومعلوم ہوتیں، بلکہ اگر ان کا کوئی احتمال بھی ہوتا، تو مروانؒ کو جو مقام اپنے معاصر علمی ودینی حلقوں میں حاصل تھا، وہ حاصل ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ امام مالک وامام شافعی اور دیگر ائمہ ان کے فتاویٰ اس طرح نقل کرتے ہیں جیسے سلف کے دیگر ائمہ کے نقل کیے جاتے ہیں۔ اور تمام محدثین کے یہاں ان سے حدیثیں روایت کی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ صحابی رسول حضرت سہل بن سعد الساعدیؓ نے بھی ان سے حدیث روایت کی ہے، جو امام بخاری نے نقل کی ہے (صحیح بخاری: ۲۸۳۲)۔ ابن حجر کہتے ہیں: امام مالک اور تمام ائمہ ان کی حدیث کو صحیح ٹھیراتے ہیں اور ان کے فتاویٰ اور اجتہادات کا اتباع واعتبار کرتے ہیں (ھدی الساری: ۴۴۳)۔ موطا دیکھ لیجیے، امام مالکؒ حضرت مروانؒ کے کتنے فتاویٰ بطور سند وحجت نقل کرتے ہیں اور ان کی اتباع کرتے ہیں۔ موطا سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عوام بھی ان سے فتوے پوچھتے تھے، جب کہ اس وقت مدینہ میں حضرت زید بن ثابت اور حضرت ابو ہریرہ جیسے فقہاء اور ائمۂ صحابہ موجود تھے۔ اگر یہ قصے اس دور میں موجود ہوتے، تو کیا ممکن تھا کہ صحابہ وتابعین کے دور میں امت کے علماء واخیار مروان کو علم دین کا مرجع بناتے؟؟ ابن العربی کہتے ہیں:

> وأما فقهاء الأمصار فكلهم على تعظيمه، واعتبار خلافه والتَّلفُّت إلى فتواه، والانقياد إلى روايته، وأما السفهاء من المؤرخين والأدباء فيقولون على أقدارهم.
>
> جہاں تک فقہاء الامصار (یعنی مسلمانوں کے علمی مراکز کے ائمۂ فقہ) کا تعلق ہے وہ سب ان کا احترام کرتے ہیں، ان کے اجتہادات کو معتبر مانتے ہیں، ان کے فتووں کو اہمیت دیتے ہیں اور ان کی روایاتِ حدیث تسلیم کرتے ہیں۔ ہاں کچھ بے وقوف قسم کے مورخین اور ادباء اپنی سمجھ کے مطابق

---

[۱] ذہبی: سیر النبلاء: ۲/۱۰۸، تاریخ الاسلام: ۳/۳۶۶، ابن کثیر: جامع المسانید والسنن: ۲/۵۱۲۔ ابن حجر: الاصابۃ فی تمییز الصحابہ: ۲/۹۱، سخاوی: التحفۃ اللطیفۃ فی تاریخ المدینۃ الشریفۃ: ۱/۳۰۱۔

باتیں لکھتے رہتے ہیں (العواصم من القواصم :۱۰۱)۔

سلف کے دور میں تو مروانؒ کی شخصیت ایسی مسلّم تھی کہ ہم دیکھتے ہیں کہ خاندان علوی وفاطمی کے گل سرسبد، حضرت حسین کے صاحب زادے، حضرت علی بن حسین زین العابدین حضرت مروانؒ سے علم حاصل کرتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو صحیح بخاری: ۱۵۶۳، منہاج السنۃ: ۴/۴۸)۔ مروان ان پر بڑے شفیق ومہربان ہیں اور حضرت زین العابدین ان سے بڑی محبت کرتے ہیں اور اطاعت وفرماں برداری کا رویہ رکھتے ہیں۔ صحیح سند سے وارد ہے کہ امام زہری جوان دونوں کے معاصر وہم وطن (مدنی) ہیں، نیز دونوں ہی کے شاگرد بھی ہیں، کہتے ہیں کہ:

كان علي بن الحسين من أفضل أهل بيته، وأفقههم، وأحسنهم طاعة، وأحبهم إلى مروان بن الحكم، وابنه عبد الملك بن مروان.

حضرت علی بن حسین خاندان نبوت کے سب سے افضل اور سب سے ذی علم افراد میں سے تھے۔ مروانؒ کے ساتھ بہت اطاعت وفرماں برداری سے رہتے تھے۔ مروان اور ان کے بیٹے خلیفہ عبد الملک بھی ان سے بڑی محبت کرتے تھے۔ (تاریخ ابی زرعۃ دمشقی: ۴۱۳، ودلائل بیہقی: ۷/۲۴۸ بسند صحیح)

یہ ایک معاصر امام وقت کی شہادت ہے۔ اور مذکورہ دونوں کتابوں میں صحیح اور متصل سند سے وارد ہوئی ہے۔ اس سے خلافت اموی اور حضرت معاویہ کی حکومت سے اہل بیت کے تعلق وموانست کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور مروانؒ کے طرز حکومت کا بھی۔ ان واقعات سے یقینی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ مروانؒ کی شخصیت اس وقت کی ایک محترم ومقبول شخصیت تھی۔

اس طرح کی صحیح ومعتبر شہادتوں کے ذریعے ہی اُس طومار سے نجات پائی جاسکتی ہے، جو افواہوں سے بننے والی روایات اور شیعی داستانوں سے تیار ہوا ہے اور اسلامی تاریخ کے حسن وخوبی کو داغ دار کر رہا ہے۔ ہم اپنی اس کاوش کے ذریعہ تاریخ اسلام کے دفاع وتطہیر کے سلسلے میں ایک خدمت انجام دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ قبول وکامیاب فرمائے۔

جھوٹ کا طوفان اور اسلامی تاریخ نویسی کا معیار ومنہاج:

اس پر کیسے اور کتنی حیرت کی جائے کہ جن مروانؒ کو تمام محدثین ثقہ راوی اور فقہ کا امام قرار دیتے ہیں، موطا اور بخاری ان کے علم وفتویٰ کو بارہا نقل کرتے ہیں، انہی کے بارے میں غیر محتاط کتابیں نقل کرتی ہیں کہ وہ حضرت طلحہؓ جیسے عظیم صحابی کے قاتل بھی ہیں، (ہم جنگ جمل کے سلسلے میں ان روایات کا بے اصل ہونا اور ان کا یقینی

قرائن کے خلاف ہونا واضح کر چکے ہیں)۔ وہ کتابیں یہ بھی نقل کرتی ہیں کہ مروان حضرت علیؓ پر ہر خطبۂ جمعہ میں لعنت بھیجتے تھے، وغیرہ وغیرہ۔ صرف حضرت مروانؒ کے مسئلے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ تاریخ کی روایات کس قدر نقد و تمحیص، خصوصاً سند کی جانچ پڑتال کی محتاج ہیں۔ اور صحیح و مستند روایات کو معیار بنائے بغیر ان کا بے اصول مطالعہ صرف افتراء و دجل کی وادیوں ہی میں بھٹکائے گا۔ جیسا کہ بہت سے مصنفین کے ساتھ ہوا ہے۔ اسلام کی اولین تاریخ پر سبائی پروپیگنڈے کا جو شب خون مارا گیا، اس کے پیش نظر سند و راوی کی پرکھ کا یہ عمل ناگزیر ہے۔ اس نقد و تمحیص کے بغیر ہم صرف افترا و تلبیس کی اینٹوں سے ہی اپنی تاریخ کی فرضی عمارت بناتے رہیں گے۔

قرون اولیٰ کے مطالعۂ تاریخ کا یہ بنیادی اصول ہونا چاہیے کہ پہلے صحیح و قوی روایات کو جمع کر کے اس عہد کی تاریخ کا ایک بنیادی تصور اور خاکہ تیار کر لیا جائے، جو افراد و شخصیات کے مزاج و اخلاق اور اداروں کے کردار کے خاکے طے کر دے، پھر جو روایاتِ تاریخ اس بنیادی تصور اور خاکے کے خلاف ہوں ان کو قطعاً ناقابل قبول قرار دے دیا جائے۔ ہم اپنی اس کتاب میں اسی منہاج و طرزِ تحقیق و تنقید کو معیار بنایا ہے۔

مدینہ کی گورنرشپ: حضرت معاویہؓ کا دور آیا تو (اپنی اسی پالیسی کے تحت کہ جہاں تک ہو سکے خلافت راشدہ کے آزمودہ کارکنان کو ان کی سابقہ ذمے داریوں پر فائز کیا جائے) انہوں نے مروانؒ کو سن ۴۱ یا ۴۲ ھجری میں مدینہ کا گورنر مقرر کیا۔ کیوں کہ وہ عہد عثمانی میں طویل مدت تک مدینہ اور اس کے تابع علاقوں میں فرائض ادا کرتے رہے تھے اور وہاں کے حالات سے واقف تھے۔ سن ۴۹ میں ان کی جگہ سعید بن العاص مقرر کیے گئے اور سن ۵۴ سے ۵۸ تک پھر مروان ہی مدینہ کے حاکم رہے۔

مدینہ حجاز کا مرکز اور اہم سیاسی و دینی مقام کے ساتھ علم کا مرکز اور صحابہ رسول کی علمی و دینی میراث کا امین تھا۔ اس لحاظ سے مروان کی ممتاز علمی شخصیت کا انتخاب بہت مناسب تھا۔ حضرت معاویہ نے ایک مرتبہ ان کی توصیف کرتے ہوئے کہا تھا کہ مروان کتاب اللہ کے قاری، دین کے بڑے عالم، اور شریعت کی اتباع میں بڑے ثابت قدم شخص ہیں (تاریخ ابوزرعہ: ۵۹۳ بسند صحیح)۔ یہ مروان کے لیے بڑی شہادت ہے جو صحیح سند سے مروی ہے۔ عموماً مروان ہی کو حضرت معاویہ ہر سال حج کا امیر بناتے تھے۔ ان کے دور میں حرمین اور بلاد حرمین میں متعدد تمدنی ترقیاں ہوئیں، جن کو ہم کسی اور مقام پر ذکر کریں گے۔ مروان کے ساتھ حضرت زید بن ثابتؓ حضرت رافع بن خدیجؓ جیسے متعدد صحابہ کاروبار و انتظام حکومت میں شریک رہتے تھے (مسند احمد: ۱۱۱۶۷)۔ جب بھی ان کو مدینہ سے کہیں باہر جانا ہوتا تو حضرت ابوہریرہ ان کے مستقل قائم مقام ہوتے تھے۔ (طبقات ابن سعد: ۴/۲۵۰)۔ اس زمانے کے دستور کے مطابق گورنر ہی پانچوں نمازیں، جمعہ اور نماز جنازہ پڑھاتا تھا۔

چنانچہ وہی مسجد نبوی کے مستقل امام تھے۔

عہد معاویہ میں اقالیم وصوبہ جات کی تقسیم:

صوبہ جات کی جو تقسیم حضرت عمرؓ کے دور سے چلی آتی تھی، بحیثیت مجموعی وہ باقی رکھی گئی۔ چنانچہ مملکت کو چند بڑے اقالیم پر تقسیم کیا گیا۔ ہر اقلیم کا ایک گورنر جنرل ہوتا تھا۔ اس کے تحت متعدد ماتحت صوبے یا ڈویژن ہوتے تھے، اور پھر اضلاع۔ ان میں ہر اکائی (Unit) کا ایک حاکم ہوتا تھا۔ حضرت معاویہؓ کے زمانے میں اہم اقالیم یہ تھے۔ کوفہ، بصرہ، مدینہ، مکہ، یمن، شام، آرمینیہ، مصر اور شمال افریقہ۔

بصرے کے تابع ممالک میں بحرین، خراسان وسجستان وغیرہ تھے۔ اسی طرح کوفہ کے تابع طبرستان، کرمان وفارس کے دیگر علاقے تھے۔ مدینہ کے تحت پورا حجاز اور نجد ویمامہ کے اضلاع تھے۔ اور شام کا صوبہ براہ راست امیر المومنین کے زیر نگرانی تھا، جس میں فلسطین واردن کے علاقے شامل تھے، پھر 'الجزیرہ' کا صوبہ بھی اسی کے تابع کر دیا گیا تھا۔ شروع میں حاکم مصر ہی شمال افریقہ کی مہمات کا افسر اعلیٰ اور مفتوح علاقوں کا حاکم ہوتا تھا، پھر حضرت عقبہ بن عامر افریقہ کے مستقل گورنر بنائے گئے۔

نظامِ حکومت کے سلسلے میں حضرت معاویہ کا معیار اور خواہش:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں اسلام کی مملکت ایک منظم ریاست کے مقام تک نہیں پہنچی تھی۔ یہ حضرت عمر فاروقؓ کی ذات ہے جس نے اسلام کے نظام حکمرانی وجہانبانی کو مکمل طور پر قائم وجاری فرمایا تھا۔ حضرت معاویہؓ فاروقی دورِ حکومت کے سب سے اہم اور طاقت ور گورنروں میں تھے، اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ ان کو حضرت عمرؓ کی خاص تربیت ونگرانی حاصل تھی۔ وہ ان کے دست وبازو اور نظام حکومت چلانے میں شریک کار تھے۔ حضرت عمرؓ کے دور میں ہر سال حج کے موقعے پر گورنروں کو بلایا جاتا تھا ہر علاقے کے لوگوں سے ان کے گورنروں اور حکام کے طرز عمل کے بارے میں رائے لی جاتی تھے۔ مرکز سے مشاہد اور انسپکٹر بھیج کر حالات بھی معلوم کیے جاتے تھے۔ حضرت عمرؓ حضرت معاویہؓ کو خطوط لکھ کر نہ صرف شرعی واخلاقی امور کی ہدایات دیتے تھے، بلکہ حکمت عملی کے سلسلے کی ہدایات بھی دیتے تھے۔ ایک خط میں لکھا کہ شروع میں تو سختی کر کے لوگوں پر حکومت کا رعب قائم کرو۔ پھر لوگوں کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرو، جس سے تمہاری محبت دلوں میں بیٹھے۔ کسی قدر سختی کے بعد جو نرمی ہوتی ہے اس کی بہت قدر کی جاتی ہے (تاریخ مدینہ: ۲/ ۷۷۴)۔

اب جب خلافت کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں آئی تو ظاہر بات تھی کہ ان کے سامنے آئیڈیل نمونہ وہی دور فاروقی تھا۔ امام ابن شہاب زہریؒ نے حضرت معاویہؓ کی حکومت کے کم وبیش نو دس سال پائے تھے۔ جوانی

اور ساری عمر دمشق میں گذری۔ جہاں ان کے مشائخ شام کے وہ ائمہ تھے، جنہوں نے عہد معاویہ اچھی طرح پایا تھا۔ حضرت معاویہؓ کے دور کی تفصیلات وحالات انہوں نے شام کے انہی علماء ومشائخ سے سنے تھے، جو چشم دید گواہ اور براہ راست واقفیت رکھتے تھے۔ امام زہریؒ گواہی دیتے تھے کہ حضرت معاویہؓ کا طرز حکومت خلافت فاروقی کے مشابہ تھا۔ خلال اور ابن سعد نے صحیح اسانید سے روایات کیا ہے کہ امام زہری کہا کرتے تھے کہ:

عمل معاوية بسيرة عمر بن الخطاب سنين لا يخرم منها شيئاً [1]۔

حضرت معاویہؓ نے بالکل خلافت فاروقی کے نقش قدم پر چل کر سالوں حکومت کی، کچھ بھی کمی نہیں کی۔

شوریٰ واہل حل وعقد:

زمانے اور نسل کی تبدیلی کے اثرات: اسلامی نظام حکومت کی بنیاد شوریٰ اور اہل حل وعقد کی اجتماعیت پر رکھی گئی ہے۔ خلافت راشدہ کے ابتدائی عہد میں مملکت کے دروبست کی ذمہ دار جماعت ان کبار صحابہ پر مشتمل تھی جو تربیت نبوی کے شاہ کار اور انسانیت کے گل سرسبد تھے۔ اہل حل وعقد کی یہ جماعت مدینہ میں مقیم مہاجرین وانصار کے اکابر کی تھی۔ امت میں ان کے احترام اور ان کی مقتدر حیثیت کی بنیاد ان کی دیانت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اسلام کے لیے ان کی قربانیاں تھیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ وہ عظیم لوگ رخصت ہوتے گئے۔ حضرت عمر کے آخری دور کے آتے آتے صورت حال ان کے لیے فکر انگیز وپریشان کن ہونے لگی تھی۔ مملکت کے حدود بہت پھیل گئے تھے۔ آخر انہوں نے اپنے حین وفات اپنے بعد خلیفہ مقرر کرنے کے لیے ٦ یا سات افراد پر مشتمل ایک مجلس شوریٰ متعین کر دی تھی۔

وقت گزرنے کے ساتھ اسلامی معاشرے میں نئے لوگوں کا دور آیا۔ جن کے سیاسی مزاج اور مطمح نظر میں پچھلوں کی سی بات نہیں تھی۔ شہادت عثمانی کے سانحے اور اس کے بعد کی صورت حال نے اب یہ صاف کر دیا تھا کہ اہل شوریٰ صرف دیانت وتقدس کے معیار سے نہیں طے ہو سکتے۔ اب جو طاقت ور ہے اور جس کے پیچھے جتھے ہیں، وہ ضرور فیصلوں پر اثر انداز ہوگا۔ شہادت عثمانی کے سانحہ نے اس حقیقت کو بھی بے نقاب کر دیا تھا کہ طاقت کا مرکز مدینہ سے کوفہ وبصرہ اور مصر وغیرہ کی افواج میں منتقل ہو چکا ہے۔ یہاں عرب بدو قبائل جہاد وقتال کے لیے منتقل کیے گئے تھے۔ ان میں بڑی تعداد ناتربیت یافتہ مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ اور اب (صحیح یا غلط) وہ اپنے مطالبات تلوار کے زور پر مسلط کر رہے ہیں۔ یہ امت میں آنے والا ایک بڑا انقلاب تھا۔ زمانے کا رنگ بدل رہا تھا۔

اسی صورت حال کا اندازہ کر کے سیدنا علیؓ نے مرکزِ خلافت مدینہ سے کوفہ منتقل کیا، کہ وہ طاقت کے کسی

---

[1] السنة للخلال: ۲/ ۴۴۴، والطبقات، متمم الصحابة الطبقة الرابعة: ۱۴۴۔

مرکز میں رہ کر ہی ملک پر خلافت کا اقتدار قائم رکھ سکتے تھے۔اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ شوریٰ و اہل حل وعقد کے نظام میں بڑی گہری تبدیلی آ گئی۔اب یہ شوریٰ عموماً اہل کوفہ کے سرداروں پر مشتمل تھی۔روایت ہے کہ عَبیدہ سلمانی نے حضرت علیؓ سے عرض کیا کہ امیر المومنین ابوبکرؓ و عمرؓ کے دور میں رعیت بڑی اطاعت و فرماں بردار تھی، مملکت طاقتور ہوتی چلا جا رہی تھی۔پھر عثمانؓ اور آپ کے دور میں صورت حال بدل گئی؟ تو حضرت علی نے بڑا حکیمانہ جواب ارشاد فرمایا: وہ ہم جیسوں پر حکومت کرتے تھے۔اور عثمانؓ اور مجھ کو تم اور تمہارے جیسے لوگ ملے۔ (سراج الملوک للطرطوشی:۱۱۶)۔کیا حکیمانہ بات ہے!

حضرت معاویہ کی شوریٰ میں حضرت عمرو بن العاصؓ اور حضرت مغیرہ بن شعبہؓ اہم مقام رکھتے تھے۔ان کے علاوہ گورنروں اور افسران فوج سے بھی حضرت معاویہ مشورہ کرتے تھے۔بعض تجزیہ نگار مورخین کی رائے ہے کہ حضرت معاویہ کے دور میں سیاسی فیصلوں میں صوبائی گورنروں، طاقتور سرداروں اور امراء فوج کا کردار بڑھ گیا تھا۔ خصوصاً شامی قبائل بنوامیہ کے خاص حلیف اور ان کی طاقت کی بنیاد تھے۔اس لیے وہ اہل حل وعقد کا اہم حصہ تھے۔(معاویہ للصلابی: ۲۱۳، ۲۱۵)۔ان میں زیاد اور حضرت ضحاک بن قیس فہریؓ بھی شامل تھے۔اول الذکر نے عراق اور مشرقی محاذ میں حکومت کو مستحکم کرنے میں وہ کردار ادا کیا جس میں کوئی ان کا ہم سر نہیں۔اور مؤخر الذکر حضرت معاویہؓ کے خاص معتمد، دمشق میں نائبِ حاکم اور محکمۂ پولیس کے افسر تھے (انساب الاشراف: ۱۱/۴۶)۔

مورخ مسعودی نے لکھا ہے کہ روزانہ حضرت معاویہؓ اپنی صبح کی دفتری مصروفیات کا آغاز شوریٰ کی مجلس سے کرتے تھے، جس میں خواص مملکت اور وزراء ہوتے تھے۔ان سے شام تک کے کاموں کا مشورہ ہوتا۔ظہر بعد پھر شوریٰ کی میٹنگ ہوتی۔اور عشاء کے بعد اگر وزرا کو ضرورت ہوتی تو پھر مجلس شوریٰ منعقد ہوتی (مروج الذہب: ۳/ ۳۲، ۳۳)۔

تمام اقالیم سے اہم شخصیات، خصوصاً صحابہ دربار خلافت تشریف لاتے رہتے اور اپنے یہاں کی صورت حال اور مسائل پیش کرتے۔حضرت معاویہؓ ان سے ان کے صوبوں کے دینی، سیاسی، معاشی اور دیگر حالات پوچھتے اور مشورے طلب کرتے۔ان میں حضرت معاویہؓ کے ناقدین بھی شامل ہوتے، وہ حضرات بھی شامل ہوتے جو حضرت علیؓ کے ساتھ تھے اور صفین وغیرہ میں ان کے حامی تھے۔حضرت معاویہ سیاسی حالات کے بارے میں ان سے مشورہ کرتے اور ان کی رائے پر عمل کرتے۔عبداللہ بن الکواء حضرت علی کے قریبی لوگوں میں تھے، صفین کی جنگ میں شریک تھے۔یہ حضرت معاویہؓ کے پاس اہل کوفہ کے وفد کے ساتھ آئے۔حضرت معاویہؓ نے ان سے عراق کے عموماً اور خصوصاً بصرے کے حالات پوچھے۔انہوں نے بتایا کہ انتشار ہے، باغی سر

چڑھ رہے ہیں اور گورنر عبداللہ بن عامر بہت نرم آدمی ہیں، کسی سخت منتظم کی ضرورت ہے۔ حضرت معاویہؓ نے مشورہ قبول کیا اور عبداللہ بن عامر کو سبک دوش کر دیا (طبری: ۵/ ۲۱۳، ۲۱۴)۔

حضرت معاویہؓ نے اپنے گورنروں اور نائبین حکومت کو بھی مشورہ سے حکومت کرنے کی ہدایات دیں تھیں۔ یزید کے نام اپنی وصیت میں انہوں نے لکھوایا تھا: اہم معاملات میں معمر اہل تجربہ اور اہل خیر وصلاح سے مشورہ کیا کرنا۔ خود رائی سے پرہیز کرنا، اکیلا شخص ہمیشہ صحیح رائے نہیں قائم کر پاتا۔ لیکن ساتھ ہی نائبین حکومت کو یہ بھی ہدایت تھی کہ جب مشورے کے بعد ایک بات طے کر لو تو پھر لوگوں کے اعتراضات کی پروانہ کی جائے اور پورے عزم و پختگی کے ساتھ کام کیا جائے۔ اور یہی خود ان کا طرز بھی تھا[۱]۔

اہل شوریٰ کی تنخواہ:

حضرت معاویہؓ کے عہد میں ہر شعبے کی طرح شوریٰ کی بھی مزید ترقی اور تنظیم ہوئی۔ چنانچہ صوبائی گورنروں کی بھی مجلس شوریٰ ہوتی تھی۔ اور ارکان شوریٰ کی باقاعدہ تنخواہ مقرر ہوتی تھی۔ بصرے میں زیاد نے پانچ سو افراد کو اپنے خاص مشیر کے طور پر طے کیا تھا۔ اور ان کی ۳۰۰ سے لے کر ۵۰۰ تک تنخواہ طے کی تھی (طبری: ۵/ ۲۲۳)۔ کوفے میں بھی مجلس شوریٰ اعیان اور باحیثیت لوگوں پر مشتمل تھی۔ جب کوفہ میں خوارج نے سر اٹھایا تو حضرت مغیرہ بن شعبہ نے خوارج کے مقابلہ کے لیے اہل کوفہ کے اعیان کی مجلس منعقد کی، جن میں حضرت علیؓ کے قریبی معاونین بھی شامل تھے (طبری: ۵/ ۱۸۸)۔

صوبائی شوریٰ کی دارالخلافہ میں میٹنگیں:

صوبائی امور میں مشاورت کے لیے گورنروں کو اپنے صوبوں کے اہم قائدین کے ساتھ دارالخلافہ بلایا جاتا۔ اور اہم امور کے متعلق فیصلہ لیا جاتا تھا۔ سن ۵۹ھ میں بصرے کے امیر عبیداللہ بن زیاد کو طلب کیا گیا، وہ اعیان واشراف کے وفد کے ساتھ آیا۔ اس وفد میں احنف بن قیس جیسی موقر دینی وسیاسی شخصیت بھی تھی[۲]۔ حضرت معاویہؓ نے ان کا بہت اکرام کیا اور اپنے تخت پر بٹھایا۔ مشورہ یہ ہونا تھا کہ عبیداللہ کو گورنر باقی رکھا جائے یا

---

[۱] البدایہ والنہایہ: ۸/ ۲۵۱، تاریخ طبری: ۵/ ۲۹۶، الطبقات الکبری متمم الصحابۃ، الطبقۃ الرابعۃ: ۱۴۴۔

[۲] احنف بن قیس اس علاقے کے سب سے بڑے قبیلے بنو تمیم کے سردار تھے، عہد نبوی میں اسلام لائے تھے۔ مگر دیدار سے مشرف نہیں ہو سکے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے لیے دعا بھی کی تھی۔ حضرت عمر کے پاس مدینہ آئے تو وہ ان کی عقل وزبان سے متاثر ہوئے اور طویل مدت تک ان کو زیر نگرانی وتربیت رکھا، اور پھر اپنے علاقے میں سردار متعین کیا تھا۔ حضرت علیؓ کے پرزور مؤید تھے اور ان کے امراء میں سے تھے۔ بڑے صاحب علم وعبادت شخصیت تھے، تمام محدثین نے ان کی روایات لی ہیں۔ مجمع الزوائد: ۱۰/ ۲، بحوالہ مسند احمد وطبرانی، نیز ملاحظہ ہو سیر اعلام النبلاء: ۴/ ۸۶۔

نہیں۔لوگوں نے عبیداللہ کی تعریف کی مگر احنف خاموش رہے۔حضرت معاویہ نے اکرام ومحبت کے ساتھ ان کو کنیت سے مخاطب کیا اور پوچھا: ابوبحر! آپ کچھ نہیں بولتے؟ انہوں نے کہا: میں ان سب کی کیسے مخالفت کروں؟ بس حضرت معاویہ نے ان کے اس اشارہ پر ہی عبیداللہ کو معزول کرنے کا ارادہ کرلیا۔ کہا: اچھا اس وقت آپ لوگ جائیں، مشورہ کریں کہ کون مناسب رہے گا؟ چند دن بعد ان سب کو طلب کیا گیا۔حضرت معاویہؓ نے پوچھا کس کو گورنر بنانے کی رائے ہے؟ رائیں مختلف آئیں، حضرت معاویہ نے احنف سے دریافت کیا کہ آپ کی کیا رائے ہے؟ انہوں نے کہا: اگر اپنے خاندان میں سے کسی کو بنانا ہے تو عبیداللہ ہی مناسب ہے۔حضرت معاویہؓ نے انہی کی رائے کے مطابق فیصلہ کیا (طبری: ۳۱۶/۵)۔

حکومت میں کثیر تعداد میں صحابہؓ کی شرکت:

امیرالمومنین حضرت معاویہؓ کے نظام حکومت پر وسیع نظر ڈالنے سے ایک اہم پہلو یہ سامنے آتا ہے کہ ان کے کارپردازان مملکت میں ایک بڑی تعداد صحابۂ کرام کی ہوا کرتی تھی، اور ان میں بھی ایک تعداد ان صحابہ کی ہوتی تھی جن پر ان کے پیش رو خلفاء راشدین نے اعتماد کیا تھا۔محقق ڈاکٹر یاسین مظہر صدیقیؒ نے عمال معاویہؓ میں صحابہ کے نام گنائے ہیں، جن کی تعداد ۸۶ ہے۔اگرچہ اس فہرست میں بعض تسامحات پائے جاتے ہیں، مگر ظاہر بات ہے کہ مصادر میں اس دور کے تمام عمال صحابہ کی فہرست تو نہیں آئی ہے۔یقیناً عمالِ معاویہ میں صحابہ ۸۶ سے کہیں زیادہ ہوں گے۔جس نظام حکومت کو اتنی بڑی تعداد صحابہ کی چلاتی تھی اس کے بارے میں اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس میں کس طرح کی روح جاری وساری تھی، اس کا ظاہری نقشہ وکردار کیسا اور اس نظام حکومت کا مطمح نظر وہدف کیا رہا ہوگا۔حضرت معاویہؓ کے نظام حکومت کے منہاج وکردار اور معیار وطریقۂ کار کے بارے میں یہ سب سے بڑی شہادت وسند ہے۔

خلافت راشدہ کے کارپردازوں پر اعتماد:

ان صحابہ میں ایک تعداد ان حضرات کی تھی جو خلافت راشدہ میں بھی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھا چکے تھے۔ اور خلفائے راشدین کے پسندیدہ وآزمودہ تھے۔ایسے حضرات صحابہ کے نام درج ذیل ہیں۔

۱۔ **حضرت عمرو بن العاص:** عہد نبوی میں عمان کے گورنر، اور ایک لشکر کے سردار مقرر کیے گئے تھے۔پھر عہد فاروقی میں شام کی افواج میں سے ایک کے جنرل رہے۔ان کی ہی امارت میں مصر فتح ہوا، اور حضرت عمر اور حضرت عثمان کے دور میں مصر کے گورنر جنرل رہے۔حضرت معاویہ کے خاص مشیر ومعاون تھے اور مصر کے گورنر جنرل کے عہدے پر تعینات کیے گئے۔

۲۔ **حضرت مغیرہ بن شعبہ** رضی اللہ عنہ : عہد نبوی میں طائف کی ایک مہم میں بطور قائد روانہ کیے گئے۔ عہد عمری میں بصرے کے پھر کوفے کے گورنر تھے۔ اس دور میں انہوں نے بہت سی فتوحات انجام دیں۔ حضرت معاویہ نے ان کو دوبارہ کوفے کا گورنر مقرر کیا۔

۳۔ **حضرت عبد اللہ بن عامر** رضی اللہ عنہ : عہد عثمانی میں بصرے اور بحرین کے گورنر اور فوجی سپہ سالار و فاتح تھے۔ حضرت معاویہ نے ان کو دوبارہ بصرے کی کمان دی۔

۴۔ **حضرت سمرہ بن جندب** رضی اللہ عنہ : حضرت علی کے دور میں بصرے کے گورنر رہے۔ حضرت معاویہؓ نے ان کو بصرے اور کوفے میں گورنر جنرل زیاد کا نائب مقرر کیا۔ جہاں وہ ۶۔ ۶ ماہ علی الترتیب رہتے تھے (ان چاروں حضرات سے متعلق یہ معلومات اپنے حوالوں کے ساتھ گزر چکی ہیں)۔

۵۔ **حضرت سعید بن العاص** رضی اللہ عنہ : حضرت معاویہؓ نے ان کو دو مرتبہ مدینہ کا گورنر مقرر کیا۔ یہ حضرت عثمان کے دور میں جمع قرآن کے نگراں بنائے گئے تھے۔ پھر کوفہ کے گورنر اور سپہ سالار فوج مقرر ہوئے تھے، جس کے دوران انہوں نے بڑے کارنامے انجام دیے۔ نہایت صاحب عقل، باوقار اور باعزت و کریم النفس شخصیت تھے۔ حضرت معاویہؓ ان کو خلافت کا اہل سمجھتے تھے۔ ذہبی کہتے ہیں:

وكان أميرا، شريفا، جوادا، ممدحا، حليما، وقورا، ذا حزم وعقل، يصلح للخلافة۔

عالی نسب امیر، سخی، ستودہ صفات شخصیت تھی۔ وقار اور حلم و بردباری اور عقل و خرد سے آراستہ۔ خلافت تک کی اہلیت رکھتے تھے (سیر: ۳/ ۴۴۵)۔

بنوامیہ ہی میں سے تھے، لیکن جب حضرت علی و معاویہؓ کا اختلاف ہوا تو وہ دیگر بہت سے صحابہ کی طرح غیر جانب دار رہے (الاصابہ: ۳/ ۹۰)۔

۶۔ **حضرت فضالہ بن عبید لیثی** رضی اللہ عنہ : بڑے ذی علم صحابی تھے، احد اور اس کے بعد کے غزوات میں شریک رہے۔ عہد عمری میں دمشق کے قاضی بنائے گئے۔ پھر حضرت معاویہ کے دور میں بھی اس ذمہ داری پر رہے۔ حضرت معاویہ کہیں باہر تشریف لے جاتے تو یہ ان کے قائم مقام دمشق کے حاکم ہوتے (الاصابہ: ۵/ ۲۸۳، سیر: ۳/ ۱۱۴)۔ جب کوئی مشکل مسئلہ پیش آتا تو حضرت معاویہؓ ان سے دریافت کرتے۔

۷۔ **حضرت عبد اللہ بن قرط ثمالی** رضی اللہ عنہ : عہد فاروقی میں حضرت ابو عبیدہ بن الجراحؓ کے ماتحت حمص کے حاکم تھے۔ حضرت معاویہؓ نے بھی اپنی معروف پالیسی کے تحت عبد اللہ بن قرطؓ کو حمص میں ہی مقرر کیا (الاصابہ: ۴/ ۱۷۹)۔

۸۔ **عبد الرحمان بن سمرہ بن حبیب** رضی اللہ عنہ : عہد عثمانی میں سجستان جانے والی فوج کے قائد بنے، فتح کے بعد وہاں کے گورنر طے کیے گئے (الاصابہ: ۴/ ۲۶۳)۔ حضرت معاویہ نے بھی اپنے

معروف طرز کے مطابق اسی خدمت پر مامور کیا (اسد الغابہ: ۴۵۰/۳)۔

۹۔ **عتبہ بن ابی سفیان** رضی اللہ عنہ: حضرت عمر نے طائف کا امیر اور افسر مالیہ مقرر کیا تھا۔ حضرت معاویہؓ نے حضرت عمرو بن العاص کے بعد ۴۳ھ میں مصر کا گورنر مقرر کیا (الاصابہ: ۴۸/۵، الولاۃ للکندی: ۲۹)۔

۱۰۔ **حضرت ابوہریرہ** رضی اللہ عنہ: حضرت عمر کے دور میں بحرین کے گورنر بنائے گئے تھے (الاصابہ: ۳۶۰/۷)۔ اور حضرت معاویہ کے دور میں مدینہ کے قاضی رہے[۱]۔ گورنر مروان کہیں جاتے تو حضرت ابوہریرہ مدینہ میں ان کے قائم مقام حاکم کی ذمہ داری بھی نبھاتے۔

۱۱۔ **حضرت عمران بن الحصین** رضی اللہ عنہ: فتح مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہی کے ہاتھ میں خزاعہ کا جھنڈا دیا تھا۔ حضرت عمر نے بصرہ کا معلم مقرر کیا۔ حضرت معاویہ نے اپنی مذکورہ پالیسی کے تحت ان کو بصرے کا قاضی مقرر کیا، وہ قضا کے ساتھ بصرے میں دینی تعلیم کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔

۱۲۔ **حضرت شرحبیل بن السمط** رضی اللہ عنہ: حضرت عمر کے دور میں شامی افواج میں بطور افسر کام کیا اور مدائن کے حاکم بھی بنے[۲]۔ حضرت معاویہ نے خلافت عمری کے دور میں حمص کا حاکم مقرر کیا تھا، جس پر وہ حضرت معاویہؓ کے عہد خلافت میں بھی قائم کئے گئے (الاستیعاب: ۶۹۹/۲)۔

۱۳۔ **قثم بن العباس** رضی اللہ عنہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت علی کے چچا زاد بھائی اور ان کے دور میں مکہ کے گورنر تھے۔ عہد معاویہ میں حضرت سعید بن عثمان بن عفان کے ساتھ سمرقند کے جہاد میں بطور افسر گئے۔ وہیں شہادت پائی۔

۱۴۔ **حضرت خارجہ بن حذافہ** رضی اللہ عنہ: فتح مکہ میں اسلام لائے۔ شجاعت میں طاق شخص تھے۔ حضرت عمرؓ نے فتح مصر کے وقت فوج کی ایک ڈویژن کا افسر بنا کر بھیجا تھا۔ فتح مصر کے بعد افسر پولیس قرار دیے گئے تھے۔ حضرت معاویہؓ نے اسی منصب پر دوبارہ قائم فرمایا۔ چنانچہ مصر کے دار السلطنت فسطاط میں پولیس کے افسر اعلیٰ تھے۔ (تاریخ الاسلام: ۶۱۸/۳، الاصابۃ: ۱۸۹/۲)۔

یہ چند وہ صحابہ رضوان اللہ علیہم تھے، جو خلافت راشدہ میں کارپردازان سلطنت میں تھے، اور حضرت معاویہؓ کے دور میں بھی انہوں نے خدمات انجام دیں۔ ناظرین نے اس فہرست میں یہ بھی ملاحظہ فرمایا کہ حضرت معاویہؓ نے خلافت راشدہ خصوصاً حضرت عمرؓ کی اتباع کے طور پر اکثر حضرات کو وہی ذمہ داریاں تفویض کیں جو

---

[۱] اخبار القضاۃ لمحمد بن خلف المعروف بوکیع: ۱۱/۱۔

[۲] تاریخ دمشق: ۱۱۵/۲، نیز ۴۶۱/۲۲۔

وہ خلافت راشدہ میں انجام دیتے آئے تھے۔

حضرت معاویہ کی حکومت وفاقی تھی:

حضرت معاویہؓ کے دور میں اسلامی ریاست ایک وفاقی (Federal) نظام حکومت کے تحت تھی۔ صوبے بڑی حد تک خودمختار تھے۔جن کے گورنر خلیفۃ المسلمین کے تابع اور زیر حکم ہونے کے باوجود اپنے تمام سیاسی، اقتصادی اور انتظامی فیصلوں، عموماً ججوں کے تقرر بلکہ بڑی حد تک فوج اور دفاع میں بھی میں خودمختار تھے۔ تمام طرح کے محصولات ریاستی حکومت ہی وصول کرتی اور مصارف میں خرچ کرتی تھی، جو بچ جاتا، وہ مرکز بھیج دیا جاتا (معاویہ: ۳۴۰)۔

داخلی شورشوں کا مقابلہ، استحکام مملکت اور امن کا قیام:

حضرت حسنؓ کے ساتھ مصالحت کے بعد سب سے بڑا مسئلہ مملکت کی سلامتی واتحاد کا تھا۔ہم اس وقت دو قسم کی شورشیں دیکھتے ہیں۔ایک خوارج اور دوسرے عام باغی۔اس سلسلے میں حضرت معاویہؓ کے طرز عمل کا مطالعہ بتاتا ہے کہ خوارج کے سلسلے میں انہوں نے ابتدا سے ہی بہت سخت رویہ اختیار کیا، جو ان کے عام مزاج اور طرز عمل سے بالکل مختلف تھا۔ان کی عام پالیسی سیاسی مخالفین کے ساتھ نرمی، لچک اور حلم کی تھی۔اور اسی سے انہوں نے بڑی کامیابیاں حاصل کیں۔لیکن خوارج کے سلسلے میں ان کے بے لچک اور سخت طرز عمل کی بنیاد غالبا یہ حقیقت تھی کہ تمام صحابہ ان کے گمراہ اور باغی ہونے پر متفق تھے[۱]۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ آپ نے خوارج کی بغاوت کی پیشین گوئی فرمائی تھی۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو بدترین مقتول اور جو ان کے ہاتھوں مارا جائے اس کو بہترین مقتول قرار دیا تھا۔صحابی رسول حضرت ابوامامہ باہلیؓ نے ایک موقعے پر خوارج کے کچھ مقتول دیکھے، تو کہا کہ یہ زمین کے بدترین مقتول ہیں۔شاگرد نے پوچھا: آپ اپنے علم واجتہاد سے فرما رہے ہیں، یا آپ نے یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے؟ کہا میں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اگر یہ بات بار بار نہ سنی ہوتی تو اس وقت تم کو نہ سناتا[۲]۔

حضرت معاویہؓ کی دانشمندی اور ایک بڑی کامیابی:

ہم پیچھے ذکر کر چکے ہیں کہ خوارج اپنے انتہا پسند خیالات، جنونی باغیانہ مزاج اور غیر معمولی شجاعت کی وجہ سے امت کے لیے سخت خطرہ تھے۔ابووائل شقیق بن سلمہؒ کہتے ہیں کہ حضرت حسنؓ سے صلح کے بعد حضرت

۱۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ خوارج کی مخالفت پر تمام صحابہ کا اتفاق تھا، ایک بھی صحابی نہ ان کا ہم نوا تھا نہ ان کے ساتھ تھا۔سنن کبریٰ للنسائی: ۸۵۲۲، مستدرک: ۲۶۵۶، حافظ ذہبی نے اس کو صحیح مسلم کی شرط پر کہا ہے۔

۲۔ بسند حسن، سنن ترمذی: ۳۰۰۰، مستدرک: ۲۶۵۴، حافظ ذہبی نے اس کو صحیح مسلم کی شرط پر قرار دیا ہے۔

معاویہؓ کو سب سے بڑی فکر خوارج کے فتنے کی تھی، جن کا مرکز نہروان تھا۔ ولم یکن لمعاویة هم الا الذین بالنهروان۔ چنانچہ بیعتِ حسنؓ کے فوراً بعد، جب کہ ابھی حضرت معاویہؓ کوفے کے قریب مقام نخیلہ ہی میں تھے، نہروان میں موجود خوارج سے مذاکرات کیے گئے اور افہام وتفہیم کی کوشش کی گئی۔ اس کا نتیجہ کہیے، یا اِس مصالحت کی برکت، کہ یہاں کے خارجیوں کی اکثریت نے اپنی گمراہی سے رجوع کیا۔ خوارج اپنی بدعقیدگی سے توبہ کرتے اور جوق در جوق حضرت معاویہ کے ہاتھ پر بیعت کے لیے آتے تھے، فجعلوا یتساقطون علیه و یبایعونه [۱]۔ اس طرح خوارج کے سب سے بڑے مرکز میں اس فتنہ کو کمزور کر دیا گیا۔ یہ حضرت معاویہ کی بہت بڑی کامیابی اور ایک مبارک فال تھی، جس سے ان کے عہد خلافت کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد کبھی خوارج متحد ہو کر نہیں لڑے۔ ان کے الگ الگ گروہ بن گئے اور ان کے افکار میں بھی اختلاف ہوتا گیا۔

شورش پسندوں کے ساتھ حلم ومدارات:

دوسرا طبقہ کوفہ کے لوگوں میں (بلکہ بصرہ اور فارسی علاقہ جات وغیرہ میں بھی) اُن حضرات کا تھا جو حضرت حسنؓ کی صلح سے دل سے خوش نہیں تھے۔ حضرت حسنؓ تو صلح کے بعد یکسو ہو کر مدینہ تشریف لے گئے۔ بلکہ جیسا کہ تفصیل سے گزر چکا ہے، اُن حضرات پر ہر طرح حجت تمام کر کے گئے تھے کہ وہ دل سے اس صلح کو قبول کر کے حضرت معاویہؓ کی اطاعت کریں۔ مگر ان کا جی کسی طرح اِس اتحاد وصلح کو قبول نہیں کرتا تھا۔ یہ عناصر مسلسل شورش وانتشار پیدا کرنے کی کوششوں میں رہتے تھے۔ ان میں سبائی سازشی عنصر تو یقیناً کارفرما تھا، لیکن ایک بڑی تعداد ان عرب قبائلی لوگوں کی تھی جو فطری طور پر اعتراض وانتشار پسند واقع ہوئے تھے۔ اور جن کا رویہ حضرت عمر کے عہد سے حکومتوں کے لیے پریشان کن بنا ہوا تھا۔ طویل مدت تک ان کے ساتھ بڑی نرمی کا معاملہ رکھا گیا۔ حضرت معاویہ نے یہاں حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کو مقرر فرمایا۔ ان لوگوں کے ساتھ حضرت مغیرہؓ کا طرزِ عمل حضرت معاویہ کی پالیسی اور مزاج کے بالکل موافق نرمی وصرفِ نظر کا تھا (صحیح بخاری: ۵۸)۔ طبری کی روایت ہے کہ انہوں نے اہل فتنہ کے معاملے میں عافیت پسندی کا رویہ اختیار کیا۔ لوگوں کے ساتھ حسن سلوک اور حلم ونرمی کا معاملہ کیا۔ جب کسی کے بارے میں پتہ چلتا کہ اس کے نظریات باغیانہ یا خارجی قسم کے ہیں، تو بھی وہ اس کو اس وقت تک نظر انداز کرتے جب تک عملاً بغاوت کا خطرہ نہ ہوتا (طبری: ۵/ ۱۷۴)۔ اسی طرح بصرے کے عامل حضرت عبداللہ بن عامر بھی بہت نرم مزاج اور حلیم الطبع شخص تھے، ایک مدت تک ان دونوں کے تحت مجموعی طور پر حالات بہتر رہے۔ لیکن پھر حالات نے نرمی کی گنجائش نہیں چھوڑی اور ان علاقوں کے مخلصین نے حاکم بدلنے کا مشورہ دیا، تو یہاں زیاد

---

[۱] المطالب العالیہ: ۱۸/ ۲۱۶ بحوالہ مسند اسحاق بن راھویہ، ابن حجر نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔

کو بھیجا گیا۔ نئے گورنر کی سخت پالیسی سے حالات قابو میں آئے (تاریخ طبری: ۵/ ۲۱۲)۔

ترویج وتحکیم شریعت اور حفاظت واقامت دین:

ترویج شریعت اور امت کی دینی واخلاقی استقامت واستحکام کی فکر حضرت معاویہؓ کی حکمرانی کے سنہرے بابوں میں سے ایک باب ہے۔ صدیوں مسلمانوں کی حکومتوں میں عموما بطور قانون شریعت اسلامیہ کا نفاذ رہا ہے۔ حضرت معاویہ کا دور تو خیر القرون کا دور تھا۔ کثیر تعداد میں صحابہ کے مبارک نفوس باقی تھے۔ دینی واخلاقی قیادت انہی کے پاس تھی اور معاشرے کے ضمیر وعقیدہ پر ان کی، ان کے کبار تلامذہ کی اور صالحین امت کی نگہبانی قائم تھی۔ مملکت کا قانون اُسی طرح کتاب وسنت تھا، جس طرح عہد رسالت اور عہد خلافت راشدہ میں تھا۔ ہر صوبے اور شہر میں صحابہ اور اکابر تابعین دینی نگراں ومعلم کے فرائض انجام دیتے تھے اور ان ہی کی طرف ہر عام وخاص کا رجوع تھا۔ عدالتی فیصلوں کی صحت اور ان کے پورے طور پر شریعت کے مطابق ہونے کا جو اہتمام تھا، اس کی کچھ تفصیل نظام عدل سے متعلق باب میں آئے گی۔ اس کے علاوہ عام زندگی میں بھی شریعت کے قیام وترویج کو خلیفہ حکومت کی اولین ذمہ داری سمجھتا تھا اور اپنے ماتحتوں ہی کو نہیں علماء وعوام کو بھی حکم دیتا تھا کہ معاشرہ کو شریعت وسنت کی راہ پر قائم رکھنے کی کوششوں میں کوئی دریغ نہ کریں۔ اس سلسلے میں حکومت پورے تیقظ وسرگرمی سے کام لیتی تھی۔

حضرت معاویہؓ کی نظر میں حکومت وخلافت کا اولین مقصد اقامت دین، نصرت دین، حمایت ملت، دفاع مملکتِ اسلام، دینی واخلاقی اقدار کی حفاظت اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر تھا۔ ان کو اپنی اِس ذمہ داری کا ایسا اہتمام تھا کہ مملکتِ شام جیسے براہ راست اپنے زیر انتظام علاقوں ہی کی نہیں، صوبہ جات کی بھی فکر رکھتے تھے کہ کہیں کوئی امر خلاف شریعت تو نہیں ہو رہا۔ جہاں کسی خلاف شرع کام کی خبر ملتی؛ دار الخلافہ سے فرمان جاتا، جس میں گورنروں کو غیر شرعی امور کے خلاف متحرک کرتے۔

ایک مرتبہ خبر ملی کہ مدینہ میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے صاحب زادے عباس نے اپنی بیٹی کا نکاح عبدالرحمن بن الحکم سے کیا ہے اور عبدالرحمان نے اپنی بیٹی کا نکاح عباس سے کر دیا ہے۔ اور اسی کو ایک دوسرے کا مہر قرار دے دیا ہے۔ حضرت معاویہ نے شام سے مدینہ کے گورنر مروان کو حکم جاری کیا کہ یہ نکاح ''شغار'' ہے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔ عدالت کے ذریعہ نکاح فسخ کر کے علیٰحدگی کرادی جائے۔ (سنن ابی داوود: ۲۰۷۵ بسند حسن)۔ ائمۂ محدثین کو چوں کہ علماء صحابہ کی آراء کے جمع کرنے کا اہتمام تھا اور وہ ان کو احکام شریعت کا ماخذ سمجھتے تھے اس لیے حدیث کی کتابوں میں حضرت معاویہؓ کے اس طرح کے فرامین اور احکام

شریعت کے اجراء وترویج کی کوششوں کے بہت سے واقعات درج ہو گئے ہیں۔ تفصیل جمع کی جائے تو ایک بڑے مقالے کا موضوع بن سکتے ہیں۔

حج کے موقعہ پر ہر طرف کے لوگ جمع ہوتے، اعیان حکومت اور ممالک کے ذمہ داران بھی ہوتے۔ اسی موقعہ سے ان کو حفاظت دین اور بیداری کے ساتھ امت کو بدعات وانحرافات سے بچانے کی تاکید کرتے۔ ایک سفر کے دوران حرم میں ظہر کی نماز کے بعد کھڑے ہوئے اور اعیان حکومت اور صحابہ وعلماء کے مجمع میں نصیحت کی کہ:

> اوعربو! اگر تم نے دین کی حفاظت نہیں کی تو دوسری اقوام (یعنی عراق وشام ومصر وغیرہ) کے لوگ تو بدرجۂ اولیٰ گمراہ ہوجائیں گے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ بنی اسرائیل کے بہتر فرقے ہوئے، میری امت کے تہتر ہوں گے۔ سب جہنمی ہوں گے سوائے ایک ہدایت یافتہ کے۔ یہ وہ گروہ ہوگا جو جماعت (صحابہ) کے طریقے پر ہوگا۔ سو ہشیار! اس راستے کو مضبوطی سے پکڑلو، اور اسی پر جمے رہو۔ (السنۃ للمروزی، ص: ۱۹، بسند حسن، المعجم الکبیر: ۱۹/ ۳۷۶ بسند صحیح)۔

جنگ میں بھی پاسِ شرع ودین:

موجودہ دنیا میں خارجہ پالیسی تو صرف مفادات کی تابع ہوتی ہے۔ آج کے نظامہائے مملکت میں تصور بھی نہیں کیا جاتا کہ خارجہ پالیسی اور بین الاقوامی معاملات میں اصول واخلاق کی پابندی لازمی ہوسکتی ہے۔ مگر قرون اولیٰ میں عظیم اسلامی سلطنت کے خارجی ودفاعی امور بھی شریعت کے تابع رکھے جاتے تھے اور ان میں بھی اخلاقی اقدار کی پابندی کی جاتی تھی۔ بیزنطی سلطنت سے مسلسل جنگ جاری تھی۔ اس میں ایک موقعہ پر امن معاہدہ ہوا کہ حضرت معاویہ کچھ مال دیں گے اور رومی اپنے کچھ آدمی رہن کے طور پر مسلمانوں کے پاس رکھیں گے۔ حضرت معاویہؓ نے ان رومیوں کو بعلبک میں رکھا تھا۔ پھر رومیوں نے عہد شکنی کی۔ اس پر حضرت معاویہ کی حکومت نے جائز نہیں سمجھا کہ رومیوں کے آدمی قتل کیے جائیں۔ بلکہ فرمایا: ان کی عہد شکنی کے جواب میں ہم احسان کریں، یہ بہتر ہے۔ (فتوح البلدان: ۱۵۹، الاموال: ۲۱۱)۔

شرعی اصول کا ایسا اہتمام والتزام تھا کہ بڑی بڑی مہموں کے دوران بھی اگر اچانک یہ معلوم ہوا کہ اس میں خلاف شریعت امر کا ارتکاب ہورہا ہے تو وہ فوراروک دی جاتی تھیں، چاہے اس میں ریاست کا کتنا ہی خسارہ ہو۔ اس سلسلے کا ایک دلچسپ اور حیرت انگیز واقعہ سنیے: ایک مرتبہ ان کا حکومت روم سے ایک خاص مدت تک کا ناجنگ معاہدہ تھا، انھوں نے معاہدے کے ختم ہونے سے پہلے ہی اس حساب سے فوجوں کو لے کر سرحد کی جانب پیش قدمی شروع کردی کہ جیسے ہی مدت ختم ہوگی اچانک حملہ کردیں گے، دشمن تیار بھی نہیں ہوگا۔ حضرت امیرؓ کا خیال تھا کہ اس طرح معاہدہ شکنی نہیں ہوگی۔ ابھی پیش قدمی جاری تھی، اور فوجیں تیز گامی سے منزلیں طے کررہی

تھیں، کہ ایک گھوڑ سوار غبار اڑاتا ''اللہ اکبر، اللہ اکبر، وفاء لاغدر '' (وفاداری کرو غداری نہیں) کی آواز لگاتا چلا آرہا ہے۔ دیکھا تو یہ صحابی رسول حضرت عمرو بن عبسہؓ تھے۔ انہوں نے آکر حضرت معاویہ سے کہا: غضب ہے غضب! یہ کیا ہورہا ہے؟ میں نے رسول اللہؐ سے سنا ہے کہ جس کا کسی کے ساتھ معاہدہ ہو وہ اس میں کوئی تغیر وتبدیلی نہ کرے (اور کسی قسم کا اقدام نہ کرے ''فلا یحل عقدۃ ولا یشدھا '')، یہاں تک کہ معاہدے کی مدت گذر جائے۔ حضرت امیرؓ نے یہ حدیث سنی اور فوجوں کو واپسی کا حکم دے دیا[۱]۔

ایک بڑی فوجی مہم کو ادھورا چھوڑنا ریاست کے مالی وسائل کا زبردست خسارہ تھا۔ یہ کتنی بڑی مہم تھی اس کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ خود حضرت معاویہ اس میں شریک تھے۔ لیکن جیسے ہی معلوم ہوا کہ یہ ارشاد رسول کے خلاف ہے، قدم واپس لے لیے گئے۔ جو امیر غیر مسلم دشمن کے ساتھ شرعی اصولوں کا اس درجہ پابند ہو وہ مسلمانوں کے ساتھ کس قدر احتیاط کا معاملہ کرتا ہوگا، اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

جائزے کے دورے:

امیر المومنین نظام حکومت کے جائزے کے لیے مختلف علاقوں، خصوصا شامی اضلاع کے دورے بھی کیا کرتے تھے۔ اور ہر جگہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حمص کے دورے پر تھے۔ وہاں بھی جو خطبہ دیا اس میں بھی ترویج شریعت اور منکرات کے ازالہ پر زور دیا۔ ابوحریز کیسان کہتے ہیں کہ میں اس وقت ساتھ تھا۔ آپ نے خطبہ میں ارشاد فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نوحہ کرنے، گانے بجانے، تصویروں، نقلی بال لگانے، (مردوں کے) سونے اور ریشم پہننے، درندوں کی کھالوں پر بیٹھنے سے منع فرمایا تھا۔ آج میں تم کو اس سے روکتا ہوں [۲]۔ شاید ان چیزوں کی حرمت کا لوگوں کو عام طور پر علم نہیں تھا۔ ایک مرتبہ حج میں تشریف لے گئے، مختلف علاقوں کے مہاجرین وانصار صحابہ کو کعبۂ مقدسہ میں جمع فرمایا اور پوچھا کہ کیا آپ حضرات جانتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان شیاء سے منع فرمایا تھا۔ سب نے کہا: جی ہاں۔ حضرت معاویہ نے کہا، میں بھی آپ حضرات کی تصدیق میں گواہی دیتا ہوں۔ پھر ان اشیاء کی حرمت کا عام اعلان فرمایا[۳]۔

ازالۂ منکرات کا اہتمام:

مسلم معاشرے میں محرمات ومنکرات رائج نہ ہوں اس کے لیے ہمیشہ فکرمند و بیدار رہتے تھے۔ علماء کو

۱۔ سنن ابوداوود: ۲۷۵۹، امام ترمذی نے اس کو حسن صحیح قرار دیا ہے، سنن: ۱۵۸۰۔ اور محقق شیخ عبدالقادر ارناوط نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے، جامع الاصول: ۲/ ۶۴۷۔

۲۔ مسند احمد: ۱۶۹۳۵، نیز ۱۶۸۳۳ بسند صحیح، مسند ابویعلی: ۷۳۷۴ بسند حسن۔

۳۔ سنن نسائی کبریٰ: احادیث: ۹۷۳۰ تا ۹۷۳۷۔

توجہ دلاتے کہ وہ اپنی ذمہ داری پوری کریں، منکرات کے سدباب اور شریعت کے اجراء وعمل میں کوتاہی نہ کریں۔ حج کے سفر میں مدینہ تشریف لائے، معلوم ہوا کہ یہاں کچھ عورتیں مصنوعی بال لگا کر اپنی چوٹیاں لمبی کرنے لگی ہیں۔ شریعت میں یہ حرام تھا۔ امیر المومنین ؓ کو خیال ہوا کہ ایسا ناواقفی کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ سخت صدمہ کا اظہار کیا کہ مدینۂ رسول میں شریعت پامال ہو رہی ہے! حرم میں خطبہ کے دوران ارشاد فرمایا: اہل مدینہ! تمہارے علماء کہاں رہ گئے ہیں؟ دیکھتے نہیں کہ یہ منکر رائج ہو رہا ہے!! میں نہیں سمجھتا تھا کہ مسلمانوں میں ایسا ہونے لگا ہوگا! رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا تھا اور بتلایا تھا کہ بنی اسرائیل کی ہلاکت وتباہی کے دور میں یہ گناہ رائج ہو گیا تھا۔ (صحیح بخاری: ۳۴۶۸، ۳۴۸۸ و صحیح مسلم: ۲۱۲۷)۔

ایک مرتبہ لوگوں کو اونچی اونچی قبریں بنانے سے منع فرمایا اور کہا کہ یہ یہود و نصاریٰ کا طرز ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے اور صحیح طریقہ سنت کا یہ ہے کہ قبر اونچی نہ ہو[۱]۔

کیا حضرت معاویہ ؓ کے گھر میں ایسے محرمات ومنکرات موجود تھے؟

حضرت معاویہ ؓ کے حالات لکھنا، بڑے ریاض کا کام ہے۔ سچی اور جھوٹی روایات میں تمیز کے لیے متن وسند کی بڑی باریک بینی سے جانچ کرنی پڑتی ہے۔ اب دیکھیے کیسا امتحان آتا ہے؟ ہم نے حضرت معاویہ کی سیرت وکردار کے سلسلے کی کثیر تعداد میں صحیح روایات ذکر کی ہیں، جو یقیناً ایک صحابی رسول کے شایان شان تصویر پیش کرتی ہیں۔ جو ذاتی زندگی میں بھی ان کا قدم راہِ شریعت وسنت پر دِکھاتی ہے۔ اور جس کے آئینے میں وہ خوف خدا سے لرزاں، ترویج شریعت واقامت دین میں کوشاں اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر پر عامل نظر آتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ صحابہ اور اس دور کے صالحین ومخلصین بھی حضرت معاویہ ؓ کے ساتھ وہی معاملہ رکھتے ہیں جیسا کسی صالح وپرہیزگار امیر کے ساتھ رکھنا چاہیے۔ وہ ان کی مدح وثنا کرتے ہیں، ان کی مجلسوں میں محبت واکرام کے ساتھ حاضر ہوتے ہیں، ان کے لیے دعا کرتے ہیں، ان سے علم حاصل کرتے ہیں اور ان کے فتووں کو وقعت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس ؓ جیسا عالم ان کا احترام کرتا ہے۔ اب ایک روایت سنن ابی داود میں آتی ہے، جو بتاتی ہے کہ:

۱۔ حضرت معاویہ ؓ کے گھر میں سونا پہنا جاتا تھا، ریشمی کپڑے استعمال کیے جاتے تھے اور درندوں کی کھالوں کا بیٹھنے کے لیے اور سواری کی زین کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اور وہ یہ سب ٹھنڈے پیٹوں برداشت کرتے تھے۔

۱۔ معجم کبیر طبرانی، بسند صحیح، مجمع الزوائد: ۳/۵۷۔

۲۔ یہی روایت یہ بھی نقل کرتی ہے کہ حضرت حسنؓ کی جب وفات ہوئی تو حضرت معاویہؓ نے اس کو کوئی تکلیف دہ حادثہ ماننے سے انکار کر دیا۔ اور ایک حاضر مجلس شخص نے تو یہ تک تبصرہ کیا کہ ''ایک آگ تھی، خدا نے بجھادی''۔ یہ روایت ایسا تکلیف دہ تبصرہ کرنے والے کو صحابی رسول بھی بتاتی ہے۔ اُف! اللہ۔

اب پوری روایت پڑھیے:

حضرت مقدام بن معدی کربؓ، عمرو بن اسود اور بنی اسد کے قنسرین کے رہنے والے ایک شخص معاویہ بن ابی سفیان کے پاس آئے۔ (طبرانی کی روایت میں صراحت ہے کہ یہ شخص بھی صحابی تھے) تو معاویہؓ نے مقدامؓ سے کہا: کیا آپ کو خبر ہے کہ حسن بن علی کا انتقال ہو گیا؟ مقدام نے یہ سن کر ''انا للہ وانا الیہ راجعون'' پڑھا، تو ان سے ایک شخص (مسند احمد اور معجم کبیر طبرانی کی روایت میں ہے کہ یہ شخص حضرت معاویہ ہی تھے) نے کہا: کیا آپ اسے کوئی مصیبت سمجھتے ہیں؟ تو انہوں نے کہا: میں ان کی وفات کو مصیبت کیوں نہ سمجھوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں اپنی گود میں بٹھایا، اور فرمایا: یہ مجھ کو گیا ہے اور حسین علی کو۔ یہ سن کر اسدی صاحب بولے: ایک آگ تھی، خدا نے بجھا دی''۔ تو مقدام نے کہا: آج میں تجھ کو ضرور ایسی بات سناؤں گا جو تجھے بہت بری لگے گی۔

پھر انہوں نے (اسدی شخص کو سنانے کے لیے) کہا: معاویہ! اگر میں سچ کہوں تو میری تصدیق کرنا اور اگر میں جھوٹ کہوں تو جھٹلا دینا۔ حضرت معاویہؓ بولے: ٹھیک۔ حضرت مقدامؓ نے کہا: میں اللہ کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں: کیا تم کو معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سونا پہننے سے منع فرمایا ہے؟ حضرت معاویہ نے کہا: ہاں۔ پھر حضرت مقدام کہا: میں اللہ کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں: کیا تم کو معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے (مردوں کو) ریشمی کپڑا پہننے سے منع فرمایا ہے؟ کہا: ہاں معلوم ہے، پھر کہا: میں اللہ کا واسطہ دے کر تم سے پوچھتا ہوں: کیا تم کو معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے درندوں کی کھالیں پہننے اور ان پر سوار ہونے سے منع فرمایا ہے؟ کہا: ہاں معلوم ہے۔ حضرت مقدام نے کہا: معاویہ! قسم اللہ کی، میں نے یہ ساری چیزیں تمہارے گھر میں دیکھی ہیں۔ حضرت معاویہؓ نے کہا: مقدام! مجھے معلوم تھا کہ میں تم سے نہیں بچ سکتا۔

(سنن ابی داود: ۴۱۳۱، مسند احمد: ۱۷۱۸۹، معجم کبیر طبرانی: ۲۰/ ۲۶۹)

دراصل یہ روایت بہت ضعیف ہے۔ کہیں مکمل روایت آئی ہے اور کہیں مختصر، مگر تمام مآخذ میں اس کی سند کچھ یوں ہے:

بقيّة بن الوليد، عن بحير بن سعد، عن خالد بن معدان۔

اس روایت میں تین عیب ہیں:

پہلا یہ کہ بقیہ بن ولید کو بہت سے محدثین نے ضعیف ٹھیرایا ہے۔ ذہبی نے المغنی فی الضعفاء (۱/۱۰۹) میں ان کے سلسلے میں محدثین کی آراء کا خلاصہ ذکر کیا ہے۔ امام ابن خزیمہ کہتے ہیں کہ میں ان کی روایت سے استدلال نہیں کرتا۔ امام احمد کہتے ہیں کہ منکر اور غلط روایتیں بیان کرتے ہیں وہ بھی ثقہ راویوں کی طرف منسوب کر کے۔ ابن عدی کہتے ہیں کہ ان کی کچھ حدیثیں اچھی ہیں اور کچھ ایسی جن میں وہ ثقہ راویوں کی مخالفت کرتے ہیں۔

دوسرا یہ کہ وہ تدلیس بھی بہت کرتے ہیں [۱]۔ تدلیس کرنے والے کا حکم یہ ہے کہ اس کی روایت اسی وقت معتبر ہوتی ہے جب وہ ''عن فلان'' نہ کہے بلکہ صاف کہے کہ میں نے اس شیخ سے براہ راست یہ روایت سنی ہے۔ بقیہ نے یہاں ''عن'' کہہ کر ہی روایت کی ہے [۲]۔ بہرحال اس روایت میں پہلی بات تو یہ ہے کہ اس میں راوی بقیہ کو بھی بہت سے ائمہ ضعیف ٹھیراتے ہیں۔ اس کا دوسرا عیب بقیہ کی تدلیس ہے۔

---

۱ تدلیس اس کو کہتے ہیں کہ آدمی کسی ایسے شخص سے جس سے اس نے احادیث سنی ہوں ایسی روایتیں بیان کرے جو اس نے براہ راست اُس سے نہیں بلکہ کسی اور کے واسطے سے سنی ہوں۔ بقیہؒ یہ کرتے تھے کہ اگر اپنے کسی شیخ کی روایت انہوں نے براہ راست نہیں سنی، بلکہ کسی ضعیف راوی کے واسطے سے سنی، تو وہ اس ضعیف راوی کو حذف کر دیتے تھے۔ تدلیس کرنے والے راویوں کی وہی احادیث قابل قبول ہوتی ہیں جو وہ ''حدثنا'' یا ''اخبرنا'' جیسے الفاظ سے بیان کریں۔ ''عن فلان'' کہہ کر بیان کی جانے والی راویات میں شبہہ رہتا ہے کہ بیچ میں کوئی ضعیف یا جھوٹا راو چھوڑ نہ دیا ہو۔ ایسی روایات ضعیف ہوتی ہیں۔

۲ کوئی کہہ سکتا ہے کہ مسند احمد اور معجم کبیر: ۲۳/ ۴۳، پر اس روایت کا ایک چھوٹا سا حصہ مذکور ہے، وہاں سند کے الفاظ یوں ہیں: حدثنا حیوۃ بن شریح، حدثنا بقیۃ، حدثنا بحیر بن سعد، عن خالد بن معدان۔ یعنی یہاں حیوہ بن شریح کہتے ہیں کہ بقیہ نے یوں کہا تھا کہ ہم سے بحیر بن سعد نے یوں بیان کیا۔ لہٰذا اب (قاعدے کے مطابق) تدلیس کا عیب زائل ہو گیا۔ لیکن اس روایت میں وہ قابل اعتراض اضافہ نہیں ہے۔۔۔۔۔ علاوہ ازیں محدثین کو اللہ جزاء خیر دے بڑی دقیق باتوں تک کا انہوں نے رکارڈ تیار کیا ہے۔ محدثین نے بیان کیا ہے کہ اہل حمص عن اور تحدیث وغیرہ میں تساہل برت لیتے ہیں اور کبھی کبھی بقیہ کے عن فلان کو وہ یوں کہہ دیتے ہیں کہ حدثنا' یا 'اخبرنا' فلاں شیخ نے ہم سے بیان کیا'۔ حافظ ابوزرعہ جو روایات کی دقیق اور باریک کمزوریوں (علل) کے نہایت عظیم الشان امام ہیں کہتے ہیں: بقیہ نے فلاں حدیث خود اپنے شیخ عبدالعزیز سے نہیں سنی۔ عن کہہ کر روایت کی تھی۔ مگر حمص کے شاگرد اس کو حدثنا کہہ کر بیان کر دیتے ہیں۔ حمصی حضرات اس فرق کو ملحوظ نہیں رکھتے۔
هَذَا حديثٌ لَيْسَ لَهُ اصلٌ، لَمْ يَسْمَعْ بَقِيَّة هذا الحديثَ من عبد العزيز، إِنَّمَا هُوَ عَنْ اَهْلِ حِمْص، واهلُ حِمْص لا يميِّزون هَذَا۔ (علل الحديث لابن ابي حاتم: ۲/ ۲۷۰)۔
ہماری مذکورہ روایت اکثر مآخذ میں یوں ہی ہے کہ بقیہ نے 'عن بحیر' کہہ کر بیان کی ہے۔ ان کے تمام شاگرد اس کو یوں ہی نقل کرتے ہیں۔ صرف حیوہ بن شریح اس کو یوں بیان کرتے ہیں کہ بقیہ 'حدثنا بحیر' کہتے ہیں۔ اور حیوہ حمصی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ 'عن' کو 'حدثنا' کہہ دیا ہو۔ لہٰذا اس کا اعتبار نہیں ہے۔

تیسرا عیب یہ ہے کہ بقیہ تدلیس تَسوِیَہ بھی کرتے ہیں [1]۔ جو راوی تدلیس تسویہ کرتے ہیں ان کے بارے میں اصول یہ ہے کہ پوری سند میں اگر کہیں بھی عنعنہ ہو یعنی وہ سند کے اگلے مرحلوں میں بھی کہیں اگر دو راویوں کے درمیان 'عن' کہہ کر روایت کریں تو روایت ضعیف ہوگی۔ حافظ ابن حجر اور ان جیسے دوسرے ائمہ نے بقیہ کے بارے میں جا بجا کہا ہے کہ وہ تدلیس تسویہ کرتے ہیں، اس لیے جب تک اپنے بارے میں اور اوپر سند میں بھی وہ عن کہہ روایت کریں گے روایت ضعیف ہوگی۔ (موافقۃ الخبر الخبر فی تخریج أحادیث المختصر لابن حجر: ۱/۲۷۶)
اب اس روایت میں ہم دیکھتے ہیں کہ بقیہ نے سند میں 'بحیر بن سعد عن خالد بن معدان' کہا ہے۔ اس لیے یہ قابل قبول نہیں ہے۔ حافظ ابن حجر نے اسی سند کی ایک روایت کو اسی بنا پر ضعیف ٹھیرایا ہے کہ بقیہ نے (ہماری زیر بحث روایت کی طرح) اپنے شیخ بحیر اور شیخ کے شیخ خالد کے درمیان ''عن'' سے روایت کی ہے [2]۔

اب آیئے اس روایت کے متن پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ کیا ممکن ہے کہ حضرت معاویہ ساری مملکت میں ان منکرات کے ازالے کے لیے وعظ کہتے ہوں، حرم مکی میں ان کی حرمت کا اعلان کرتے ہوں، مدینے میں شکوہ کرتے ہوں کہ 'علماء کہاں ہیں؟ ان منکرات پر نکیر کیوں نہیں کرتے؟؟' اور پھر خود گھر میں انہی منکرات کو ڈھنڈے پیٹوں دیکھا کرتے ہوں۔ پھر اس کے بعد مکہ و مدینے سے لے کر حمص تک کوئی ان سے کچھ نہ کہے؟

اور کیا یہ ممکن ہے کہ دربار خلافت میں کوئی صحابیِ جگر گوشۂ رسول سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی وفات پر خوش ہو اور کہے ''ایک انگارہ تھا بجھ گیا''؟۔

حد ہے بھئی حد ہے! ایسی ناممکن باتیں بیان کرنے والے نے یہ بھی تو نہ سوچا کہ سیدنا حسن صلح کے بعد 'انگارہ' کہاں بچے تھے؟ وہ تو سراپا صلح و آشتی کی شبنم تھے۔ اور ان کا وجود حکومت کے لیے سامانِ اطمینان تھا۔ مگر 'دروغ گورا حافظہ نہ باشد' تو سنا تھا، 'عقل نہ باشد' بھی شاید صحیح ہو۔ بظاہر بقیہ نے یہ روایت کسی جھوٹے سے سنی، اور اس کا نام تدلیس کے طور پر حذف کر دیا۔

عبادات اور انفرادی معاملات کی بھی فکر:

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو صرف دیوانی یا فوجداری کے معاملات میں ہی نفاذ شریعت کا اہتمام نہیں تھا، بلکہ وہ اسلامی حکومت کی ذمہ داری سمجھتے تھے کہ وہ دین کے تمام شعبوں کے قیام و حفاظت کی فکر رکھے۔ چنانچہ اس کی بھی

---

[1] تدلیس تسویہ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کوئی راوی اپنے شیخ اور اپنے درمیان کے راوی کو حذف نہیں کرے بلکہ اوپر سند میں کسی بھی دو راویوں کے درمیان کی کڑی کو حذف کر دے۔ تدلیس کی یہ قسم محدثین کے یہاں زیادہ شنیع اور بری مانی گئی ہے۔

[2] ملاحظہ ہو: اتحاف المہرہ لابن حجر: ۱۳/ ۲۳۳۔ ہم نے دقیق اور خالص فنی ہونے کے باوجود اس روایت پر تنقید اس لیے ضروری سمجھی کہ کہیں نظر سے نہیں گزرا کہ کسی نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر الزام لگانے والی اس روایت کے ضعف کی وضاحت کی ہو۔

فکر رکھتے تھے کہ عبادات اور طہارت جیسے خالص انفرادی قسم کے دینی مسائل میں مسلمانوں کے قدم جادۂ شریعت سے نہ ہٹیں اور لوگ احکام دین کے پابند رہیں۔

اپنی خلافت کے عہد میں اہل مکہ کو عصر کے بعد دو رکعتیں نفل پڑھتے دیکھا۔ ان کو اشکال ہوا، عبداللہ بن الحارث بن جزءؓ کہتے ہیں کہ میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے ساتھ حضرت معاویہؓ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت معاویہ نے، حضرت ابن عباسؓ کا اکرام فرماتے ہوئے، ان کو اپنے ساتھ تخت خاص پر بٹھایا۔ اور دریافت کیا کہ لوگ یہ عصر کے بعد کیسی دو رکعتیں پڑھتے ہیں؟ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نہ پڑھتے دیکھا اور نہ کسی کو ان کی تلقین کرتے سنا۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ یہ عبداللہ بن زبیرؓ ہیں، جو لوگوں کو اس کی تلقین کر رہے ہیں۔ حضرت معاویہؓ نے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو بلوایا اور ان سے دریافت کیا کہ تم لوگوں کو یہ کیا فتویٰ دے رہے ہو؟ انہوں نے کہا کہ مجھے خالہ جان عائشہؓ نے بتایا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے یہاں عصر بعد دو رکعتیں پڑھی ہیں۔ حضرت معاویہؓ نے دو آدمیوں کو حضرت عائشہؓ سے استفسار کے لیے بھیجا (جو اس وقت حج کے لیے مکہ آئی ہوئی تھیں)، انہوں نے کہا کہ ابن زبیر کو بات یاد نہیں رہی۔ میں نے ان کو یہ بتایا تھا کہ ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میرے یہاں عصر بعد دو رکعتیں پڑھیں۔ تو میں نے پوچھا کہ یہ کون سی نماز ہے؟ آپ کبھی اس وقت تو نماز پڑھتے نہیں تھے؟۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ظہر بعد کی سنتیں کسی مجبوری سے چھوٹ گئی تھیں۔ اِس وقت میں نے ان کو پڑھ لیا ہے [۱]۔

عبادات کا اہتمام، ایسا کہ لوگوں کو خلیفہ خود وضو سکھاتے ہیں:

قرآن نے اصحابہ کی حکومت کے مقاصد میں سے ایک مقصد اقامت صلاۃ بھی ذکر کیا ہے۔ حضرت معاویہؓ کے نظام حکومت میں کس قدر دینی روح تھی، اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ اتنی بڑی سلطنت (Empire) کا فرماں روا، جو انتظامی امور کی باریک باریک چیزوں کو خود دیکھتا تھا، ساتھ ہی مصروفِ جہاد بھی رہتا تھا، کبھی خود افواج کی قیادت کرتا کبھی مرکز سلطنت سے امور جنگ کی نگرانی کرتا، بایں ہمہ وہ یہ بھی اپنی ذمہ داری سمجھتا تھا کہ لوگوں کو سنت کے مطابق وضو سکھائے۔ یزید بن ابی مالک کہتے ہیں کہ حضرت معاویہؓ لوگوں کو وضو کر کے دکھاتے تھے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایسے ہی وضو کیا کرتے تھے (سنن ابی داود: ۱۲۴، مسند احمد: ۱۶۸۵۴)۔

نفل عبادات کی ترویج اور ذکر و دعا کی تعلیم:

حضرت معاویہؓ ایک معلم و مربی کی حیثیت سے عوام میں اتباع سنت اور ذوق عبادت پیدا کرتے تھے۔

---

[۱] صحیح بخاری: ۵۸۷، مصنف ابن ابی شیبہ: ۶۳۴۷، مسند احمد: ۲۵۵۰۶۔

جہاں کسی سنت عبادت سے غفلت نظر آتی ممکن ہوتا تو خود اس کو جاری کرنے کی کوشش کرتے۔ یہاں تک کہ قریوں اور دیہاتوں میں سرکاری کارندوں کو بھیجا جاتا تھا کہ عاشورا کے روزے کا اہتمام کروائیں۔ حسن درجے کی سند سے روایت ہے کہ ایوب بن میسرہ کہتے ہیں کہ کناکر، زاکیہ اور قردا کی آبادیوں میں حضرت معاویہ اپنے خاص عملے کے لوگوں کو بھیجتے کہ وہ امیر المومنین کی طرف سے یہ اعلان کردیں کہ عاشور کا روزہ سنت ہے، امیر المومنین بھی روزہ رکھ رہے ہیں، سو جو چاہے اس سنت کو اختیار کرے۔ (یہ تینوں دمشق کے مضافات میں دیہی آبادیاں تھیں، جن میں عرب قبائل آباد تھے[۱]۔

کہیں کوتاہی دیکھتے تو امت میں ربانیت وعبادت کے فروغ کے سلسلے میں علماء کو اپنی ذمے داری کی طرف متوجہ کرتے۔ ایک واقعہ امام بخاری نے روایت کیا ہے۔ مدینے میں آپ نے دیکھا کہ عاشوراء کے روزے کا اہتمام نہیں ہو رہا اور علماء اس کا عوام میں بیان نہیں کررہے۔ مسجد نبوی میں دورانِ خطبہ کہا کہ اہل مدینہ! تمہارے علماء کہاں ہیں؟ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عاشوراء کے موقعے پر ارشاد فرماتے سنا کہ یہ عاشوراء کا دن ہے۔ اللہ نے اس کا روزہ فرض تو نہیں فرمایا ہے، لیکن میں رکھ رہا ہوں، سو جو چاہے رکھے اور جو چاہے نہ رکھے (صحیح بخاری: ۲۰۰۳)۔

اذکار مسنونہ کی ترویج کا بہت اہتمام کرتے۔ جب پتہ چلا کہ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرض نماز کے بعد کی ایک خاص دعا نقل کرتے ہیں، تو انہیں دربار سے خط لکھوایا کہ مجھے وہ دعا لکھوا کر بھیجیے۔ انہوں نے اپنے سکریٹری وراد سے لکھوا کے بھیجا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نماز کے بعد یہ دعا سنی ہے:

لا إله إلا الله وحده لا شريك له. اللهم لا مانع لما أعطيت، ولا معطي لما منعت، ولا ينفع ذا الجد منك الجد۔

کچھ عرصے بعد وراد کا دمشق جانا ہوا تو انہوں نے دیکھا کہ امیر المومنین خود مسجد میں بیٹھے لوگوں کو یہ دعا سکھا رہے ہیں اور پڑھنے کی ترغیب دے رہے ہیں[۲]۔

گورنروں کو بھی ترویج شریعت کا اہتمام تھا:

مرکز خلافت کی ہی طرح صوبائی گورنروں کا بھی کچھ ایسا ہی معمول تھا۔ نفاذ شریعت کا ہر جگہ اہتمام تھا۔ ہر حرام کام سے عوام کو روکا جاتا تھا۔ کچھ غلطی ہوجاتی تو تلافی کی جاتی۔ حضرت معاویہؓ کے دور میں حکومت کی طرف سے غلہ بانٹنے کا یہ نظام تھا کہ لوگوں کو ٹوکن دے دیے جاتے تھے۔ یہ گویا Public Rashion system

---

۱۔ تاریخ دمشق لابن عساکر: ۵۹/ ۱۶۴ بسند حسن۔

۲۔ صحیح بخاری: ۶۶۱۵، مسند احمد: ۱۸۱۳۹۔

تھا۔ مدینہ میں یہ ٹوکن بانٹے گئے تو لوگوں نے غلہ لینے کے بجائے وہ ٹوکن بیچ دیے۔ یہ اصل میں ٹوکن نہیں غلے کی بیع تھی۔ شرعی اعتبار سے کسی چیز پر قبضہ حاصل کیے بغیر بیچنا منع ہے۔ لوگوں کے اس عمل کی خبر حضرت زید بن ثابتؓ کو ہوئی، وہ اور ان کے ساتھ ایک اور صحابی گورنر مروانؒ کے پاس آئے۔ اور کہا: کیا آپ سودی کاروبار کی اجازت دے رہے ہیں؟ مروان کہنے لگے: معاذ اللہ، کیا ہوا؟ انہوں نے بتایا کہ لوگوں نے ایسا ایسا کیا ہے۔ مروان نے فوراً پولیس کے محکمہ کو متحرک کیا اور پتہ لگایا کہ کس کس نے اپنے ٹوکن بیچے ہیں؟ ان لوگوں کا پتہ لگوایا گیا اور ان سے پیسے واپس کروائے گئے (موطا: ۲۳۶۰ بسند صحیح)۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ صحابہ کرام حکومت پر کیسی نظر رکھتے تھے اور ہر غلطی کی اصلاح کرواتے تھے۔

امراء اور فوجی جنرلوں سے بھی اگر شریعت کے خلاف کچھ ہو جاتا تو علماء اس پر نکیر کرتے، افسران نادم ہوتے اور تلافی کی فکر کرتے تھے۔ حضرت خالد بن الولیدؓ کے بیٹے عبدالرحمان نے حضرت معاویہ کے دور میں سالہا سال بر و بحر میں جہاد فرمایا اور تاریخ ساز کارنامے انجام دیے۔ وہ حضرت معاویہ کے سپہ سالاروں میں بڑے دبدبے کے جنرل تھے، ایک مرتبہ انہوں نے دشمن کے چار مجرم قسم کے قیدیوں کو قتل کروایا، مگر طریقۂ قتل غیر شرعی تھا، جس کا ان کو علم نہیں تھا۔ حضرت ابو ایوب انصاریؓ نے اس پر نکیر کی اور بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو حرام قرار دیا تھا۔ اس پر عبدالرحمان نادم ہوئے اور توبہ و کفارے کے طور پر چار غلام آزاد کیے [۱]۔

گورنر دینی مسائل کی تحقیق کرواتے اور غلطیوں کی تصحیح کرتے تھے:

گورنر صرف دیوانی یا فوجداری کے اُن مسائل کی ہی تحقیق نہیں کرتے تھے جن کا تعلق محکمۂ قضا سے ہوتا تھا، بلکہ خالص انفرادی دینی معاملات کی تحقیق اور ترویج کو بھی اپنی ذمہ داری سمجھتے تھے۔ تاکہ صحیح احکام شریعت کی ترویج و اشاعت ہو سکے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ریاست و حکومت میں دینی روح جاری و ساری تھی اور حکمران شریعت کے استحکام و ترویج کو اپنی ذمے داری سمجھتے تھے۔ فقیہ مدینہ ابوبکر بن عبدالرحمن بن حارث بن ہشام کہتے ہیں کہ میں اور میرے والد ماجد مروانؒ کے پاس تھے۔ وہاں تذکرہ ہوا کہ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص پر صبح صادق اس حال میں ہو کہ وہ جنبی ہو تو اس کا روزہ نہیں ہوگا۔ اس پر مروانؒ نے کہا کہ عبدالرحمن! ذرا تم فوراً ام المومنین حضرت عائشہ اور ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہما کی خدمت میں جاؤ اور یہ مسئلہ دریافت کرو۔ ہم دونوں باپ بیٹے ان کی خدمت میں الگ الگ حاضر ہوئے اور حضرت ابو ہریرہ کی بات بتائی۔ ان دونوں نے کہا کہ نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی بیویوں میں سے کسی کے ساتھ صحبت فرماتے تھے، صبح صادق

---

[۱] سنن ابو داود ۲۶۸۷، حافظ ابن حجر نے اس کی سند کو قوی قرار دیا ہے: فتح الباری: ۹/۶۴۴۔

ہونے کے بعد غسل فرماتے تھے اوراس دن روزہ رہتے تھے۔مروان کے پاس واپس آ کر صحیح مسئلہ بتایا گیا،تو انہوں نے کہا اب تم دونوں فوراً جا کر حضرت ابو ہریرہ ؓ کو پوری بات بتلاؤ۔حضرت ابو ہریرہ نے اس پر کہا: اچھا، مجھے کسی نے ویسا ہی بتایا تھا۔اوراپنی بات سے رجوع کرلیا (موطاامام مالک ۱۰۱۷،بسند صحیح)۔

مساجد میں عوامی واعظوں کا تقرر اور دینی انحرافات کا سد باب:

مملکت کا دائرہ اب بہت پھیل گیا تھا۔اس لیے عوام میں دینی روح پیدا کرنے کے لیے وعظ و پند کے مستقل نظام کی ضرورت تھی۔ایک خاص اوراہم ضرورت اس کی یہ پیدا ہورہی تھی کہ ''فتنہ'' کے دور نے منحرف افکاراوراہل بدعت کی جماعتیں پیدا کردی تھیں۔ایسی گمراہ کن باتیں پھیلائی جارہی تھیں کہ ہرکسی پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا تھا۔ پہلے لوگ حدیث میں بھی سند نہیں پوچھتے تھے،لیکن اب علماء بلا سند کے کسی کی بات قبول نہیں کرتے تھے(مقدمہ صحیح مسلم)۔حضرت معاویہ ؓ نے محسوس کیا کہ غیر پختہ وغیرمحتاط واعظوں کے ذریعے دین میں تحریف کا دروازہ کھلنے جارہا ہے۔اب ایک طرف توضرورت تھی کہ عوام کے لیے وعظ وارشاد کی مجلسیں قائم ہوں اوردوسری طرف انحرافات سے بچانے کی بھی ضرورت تھی۔اس لیے امیرالمومنین ؓ نے باقاعدہ حکومت کی طرف سے واعظوں کا تقرر فرمایا۔یہ امیرالمؤمنین ؓ کا اہم کارنامہ ہے۔ابن شبہ نے نافع اوردیگر اہل علم سے روایت کیا ہے کہ جب ''فتنہ'' ظاہر ہونے لگا،توسب سے پہلے حضرت معاویہ ؓ نے واعظوں کا تقرر فرمایا (تاریخ المدینہ:۱۱/۱)۔

اس سلسلے میں سب سے اہم ضرورت حرمین کی تھی۔جلیل القدر تابعی عالم حضرت عبداللہ بن لُحَیؒ الہوزنیؒ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ حضرت معاویہ ؓ کے ساتھ حج میں تھے،انہوں نے دیکھا کہ ایک مخزومی صاحب وعظ فرما رہے ہیں اور بڑی غلط سلط باتیں بیان کررہے ہیں۔حضرت معاویہ ؓ نے طلب فرمایا اوران سے دریافت کیا کہ حکومت کی اجازت کے بغیرتم (مسجد حرام میں) کیسے وعظ کہہ رہے ہو؟اس پر وہ حضرت فرماتے ہیں: ہم تواپنا علم پھیلا رہے ہیں۔حضرت معاویہ سخت ناراض ہوئے۔فرمایا: اگر پہلے سے میں نے منع کررکھا ہوتا تو آج تم کوسخت سزا دیتا۔خبردار! آئندہ نہ سنوں کہ تم وعظ کہتے ہو۔

خود دمشق کی جامع مسجد میں، جوامیرالمومنین کی مسجد تھی، بھی واعظ مقرر تھے۔ان کو قاص الجماعة، یعنی عوام کے واعظ کہا جاتا تھا(المعجم الکبیر:۳۴۰/۱۹)۔یہ واعظ صرف حسبۃ للہ بلااجرت خدمت انجام دیتے تھے۔سری بن یحییٰ شیبانی کہتے ہیں کہ عوامی واعظوں کا تقرر سب سے پہلے حضرت معاویہ ؓ نے کیا۔اس سلسلے میں انہوں نے ایک صاحب سے کہا کہ وعظ کہا کیجیے،انہوں نے اس پر اجرت طلب کی توحضرت معاویہ ؓ نے کہا: اچھا، آپ گھر بیٹھیے (تاریخ مدینہ:۱۱/۱)۔

آزادیٔ تنقید اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر:

بے شمار اور یقینی شواہد کی روشنی میں یہ بات ثابت ہے کہ حضرت معاویہؓ کی حکومت کے اصولوں میں سے ایک اصول یہ تھا کہ رعایا کو تنقید ومخالفت کی پوری آزادی تھی۔لوگ اس آزادی کا بے خوف استعمال کرتے تھے۔ تنقید جب تک کسی باغیانہ عمل تک نہیں پہنچتی تھی، اس پر کچھ نہیں کہا جاتا تھا۔ لوگوں کے اعتراضات اور حکومت پر تنقید کے بعض واقعات (جو صحیح اسانید سے آئے ہیں) ذکر کیے جاتے ہیں۔تاریخ طبری میں بسند صحیح آیا ہے کہ:

> ایک شخص نے سخت تنقید کی، لوگوں نے روکنا چاہا تو کہا: کہنے دو، اگر بات بغاوت تک نہ پہنچے تو ہماری طرف سے کسی کے بولنے پر کوئی پابندی نہیں (تاریخ طبری: ۵/۳۳۶)۔

یہی ان کی حکومت کی مستقل پالیسی تھی۔بس یہ نظر رکھی جاتی تھی کہ بغاوت وفساد نہ رونما ہو، باقی تنقید واحتساب کے لیے سب آزاد ہیں۔

ان کی سب سے نمایاں صفت تمام اہل علم کے نزدیک حلم وبرداشت اور بردباری ودرگزر تھی۔تاریخ میں ان کا حلم ضرب المثل ہے۔صحیح روایات میں ہے کہ وہ اپنے سامنے بھی تنقید کو خاموشی سے سنتے تھے۔اور جن لوگوں کے نقد واعتراض کی ان کو خبریں ملتی رہتی تھیں، ان کو بھی کچھ نہیں کہتے تھے۔آگے درج واقعات سے، جو صحیح اسانید سے آئے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ حکمراں خودرائی اور استبداد کے ساتھ کام کرے۔ بلکہ چاہتے تھے کہ لوگ حکام پر نظر رکھیں اور ان سے اگر کچھ غلط ہو تو متنبہ کریں۔اپنی ذات کے سلسلے میں بھی ان کا یہی طرز تھا۔اگر کوئی عام اور معمولی شخص بھی ان کو ٹوکتا تھا تو وہ اس کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔اور جب کوئی روک ٹوک نہ ہو تو اس سے فکرمند ہوتے تھے کہ کوئی اصلاح وتنقید کرنے والا نہیں۔بے سند تاریخی روایات میں جو آیا ہے کہ اس دور میں تنقید ومخالفت کا مقابلہ جبر وزباں بندی سے کیا گیا (مندرجہ ذیل صحیح روایات طے کردیتی ہیں کہ) وہ 'مہربانوں' کی گھڑی داستانیں ہیں۔ورنہ امیر المومنینؓ کے یہاں تو اس کی بڑی فکر تھی کہ اہل نظر حکومت کا محاسبہ کرتے رہیں۔

تنقید واحتساب پر ہمت افزائی:

حافظ ابویعلیؒ اور حافظ طبرانیؒ نے طاقت ور سند سے روایت کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت معاویہؓ نے جمعہ کے خطبہ میں کہا کہ ہم اس مال کے مختارِکل ہیں، جس کو چاہیں دیں، جس کو چاہیں نہ دیں۔کسی نے کچھ نہیں کہا۔اسی طرح انہوں نے لگاتار تین ہفتوں تک خطبہ میں یہ بات کہی۔تیسری مرتبہ ایک صاحب[۱] کھڑے ہوگئے اور کہا:

---

[۱] یہ ابو بحریہ عبد اللہ بن قیس سکونی تھے (تاریخ دمشق: ۱۶۹/۵۹)۔جو بڑے عابد وزاہد عالم تھے اور حضرت معاویہؓ ان کا بڑا اکرام کرتے تھے۔تہذیب الکمال: ۴۵۸/۱۵۔

ہرگز نہیں ۔ آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ حکومت کا مال عوام کا ہوتا ہے ۔ جو ہم کو ہمارا مال نہیں دے گا ہم
اس سے زبردستی چھین لیں گے ۔

حضرت معاویہ بہت خوش ہوئے ۔ اور اس جرأت مند تنقید پر اُن کی بہت تعریف کی ۔ اور کہا کہ میں تین ہفتوں سے منتظر تھا کہ کوئی مجھ کو ٹوکتا ہے کہ نہیں؟ اس لیے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خود سنا ہے کہ:

کچھ حکام ایسے ہوں گے جن کی غلط باتوں کی کوئی تردید نہیں کر سکے گا، ایسے حاکموں کا انجام جہنم ہے ۔ میں اسی کا اندازہ کرنا چاہتا تھا ۔ جب کسی نے میری تردید نہیں کی تو مجھے ڈر ہوا کہ کہیں میں ان میں سے نہ ہوں ۔

(إن هذا أحياني أحياه الله) ان صاحب نے مجھ پر احسان کیا ہے، اللہ ان پر احسان کرے[1]۔

ام المومنین حضرت عائشہؓ کے سخت محاسبے اور تنقیدیں:

حضرت معاویہؓ کے دور حکومت کی ایک خاص بات یہ تھی کہ صحابہ اور علماء حکومت پر گہری نگاہ رکھتے تھے، اور معمولی سی غلطی یا شریعت سے انحراف پر علانیہ تنقید کرتے تھے ۔ ابھی گذرا کہ حضرت زید بن ثابت وغیرہ مدینہ میں حکومت پر کیسے نظر رکھتے تھے ۔ حضرت معاویہؓ کا سب سے سخت محاسبہ ام المومنین حضرت عائشہ کے یہاں ہوتا ۔ وہ وقتاً فوقتاً ان کی خدمت میں باادب حاضری دیتے ۔ اور خطوط سے نصیحت واصلاح کی درخواست کرتے رہتے تھے ۔ ام المومنین امت کی مادر محترم تھیں، ہر چھوٹا بڑا ان کا حق شناس تھا، خصوصا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جناب میں محبوبیت، اپنے علم وفضل، ذہانت ودانائی اور دیگر کمالات کی بناپر وہ ایک خاص قسم کا سیاسی مقام بھی رکھتی تھیں ۔ اپنی اسی حیثیت سے وہ حالات پر نظر رکھتی تھیں اور امور مملکت کے متعلق تفصیلی نصیحتیں کرتیں اور حضرت معاویہؓ باادب سماعت فرماتے اور ممنون ہوتے ۔ کبھی حضرت عائشہ تنبیہ وتوبیخ کا لہجہ بھی اپناتیں ۔ کبھی عام لوگوں کو نکال دیا جاتا، صرف حضرت معاویہؓ اور حضرت عائشہ کے اپنے ایک آدھ لوگ رہتے، وہ تنقید واحتساب کرتیں اور نصیحت فرماتیں ۔

تاریخ دمشق میں قوی سند سے وارد ہے کہ حضرت قاسمؒ بن محمد بن ابی بکر روایت کرتے ہیں، جو ام المومنین کے بھتیجے اور اُنہی محمد بن ابی بکرؓ کے بیٹے تھے، جو حضرت معاویہ کے لشکر ہاتھوں جنگ میں کام آئے تھے ۔ حضرت عائشہ کو اس حادثے کا سخت غم تھا ۔ جب حضرت معاویہ حجاز آئے، ام المومنینؓ کی خدمت میں حاضری دی ۔ ام المومنین، ان کے مولیٰ ذکوان اور حضرت معاویہؓ کے علاوہ کوئی چوتھا مجلس میں نہیں تھا ۔ ام المومنین سخت برافروختہ ہوئیں ۔ فرمایا: معاویہ! (تم اکیلے میرے گھر میں ہو، کوئی محافظ یا ساتھی بھی نہیں، جب کہ تمہاری فوج نے میرے بھائی محمد کو قتل کر دیا تھا) تمہیں اندیشہ نہ ہوا کہ میں نے گھر میں کسی کو چھپا کے بٹھا دیا ہو جو میرے بھائی کے بدلے

---

[1] معجم کبیر طبرانی: ۱۹/ ۳۹۳، مسند ابویعلی: ۱۳/ ۳۷۳، حافظ ابن حجر ہیثمی نے اس کے تمام راویوں کو ثقہ قرار دیا ہے ۔ مجمع الزوائد: ۵/ ۲۳۶، حافظ ذہبی نے بھی اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے، تاریخ الاسلام ۴/ ۳۱۴ ۔

تمہیں قتل کردے؟ عرض کیا: آپ کی ناراضگی قابل فہم ہے۔ پھر حضرت معاویہؓ نے ملکی حالات ان کی خدمت میں پیش کئے۔ اس کے بعد حضرت عائشہؓ نے اپنی گفتگو کا آغاز کیا۔ باقاعدہ اللہ کی حمد وثنا اور شہادتین کے کلمات پڑھ کر گویا خطبہ ارشاد فرمایا، اسلام کے اصول حکم رانی اور رسول اللہ ﷺ کے طرز عمل کا تذکرہ فرمایا اور خلفاء راشدین کی حکومتوں کا انداز یاد دلایا۔ اور اسی راستے پر چلنے کی تاکید ونصیحت کی۔ راوی ذکوان کہتے ہیں کہ ام المومنین نے اس سلسلے میں کافی طویل گفتگو فرمائی، کوئی بات جو حضرت معاویہؓ سے کہنے کی تھی، نہیں چھوڑی۔ ساری نصیحتیں اور مشورے سننے کے بعد حضرت معاویہؓ نے بڑے ادب سے عرض کیا:

أنت والله العالمة بأمر رسول الله (ﷺ) المناصحة المشفقة البليغة الموعظة، حضضت على الخير وأمرت به ولم تأمرينا إلا بالذي هو لنا وأنت أهل أن تطاعي.

آپ نے نیک باتوں کا حکم دیا اور وہی کہا جس میں ہمارے لیے خیر ہے۔ آپ کا مقام ہے کہ آپ کی ہر بات مانی جائے۔

ذکوان کہتے ہیں کہ اس کے بعد دیر تک اسی رنگ میں مجلس جاری رہی اور حضرت عائشہ نصیحت ومشوروں سے افادہ فرماتی رہیں۔ جب ہم باہر نکلے تو حضرت معاویہؓ پر اتنا اثر تھا کہ وہ کچھ دیر میرے کندھے پر سہارا لے کے کھڑے رہے اور کہا: رسول اللہ ﷺ کے بعد ایسی بلاغت اور گہری تاثیر کسی کے کلام میں نہیں۔ (تاریخ دمشق: ۵۹/ ۱۵۳۔ بسند صحیح)

ایک مرتبہ حاضر ہوئے تو حضرت عائشہؓ ناراض ہوئیں۔ فرمایا یہ تم نے کیا کیا؟ حج کے مقامات میں عمارتیں بنوا دیں، پیڑ لگوا دیے، پانی کے کوئیں کھدوا دیے؟ دوسری بات یہ کہ حجر بن عدی کو کیوں قتل کروا دیا؟ حضرت معاویہؓ نے عرض کیا کہ: جہاں تک پہلی بات کا سوال ہے تو یہ صرف حجاج کی سہولت وراحت کے لیے کیا ہے، سخت دھوپ میں ان کے لیے نہ کہیں بیٹھنے کی جگہ ہوتی تھی نہ سامان رکھنے کا انتظام۔ موسم کی شدت میں پانی بھی دور سے لانا پڑتا تھا۔ میرا اس سے کیا فائدہ؟؟ حضرت عائشہ نے فرمایا: اگر اس لیے کیا ہے تو ٹھیک ہے۔

حضرت معاویہؓ نے پھر عرض کیا: جہاں تک حجر بن عدی کے قتل کا تعلق ہے تو مجھے ان سے سخت فساد اور خوں ریزی پھیلنے کا ڈر تھا۔ میرا خیال تھا کہ ایک جان جانا سہل ہے اس سے کہ خانہ جنگی یا بغاوت میں بہت سے مارے جائیں۔ غالبا حضرت عائشہ مطمئن نہیں ہوئیں، تو حضرت معاویہؓ نے کہا کہ میں نے جو کیا حق سمجھ کے کیا، میرا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیجیے۔ تو حضرت عائشہ نے فرمایا: چھوڑ دیا، چھوڑ دیا، چھوڑ دیا۔ (تاریخ دمشق: ۱۲/ ۲۲۹، ۲۳۰ بسند حسن)۔

صغار صحابہ اور تابعین کی تنقید:

صرف بڑے مقام کے لوگ ہی تنقید اور حکومت کا احتساب نہیں کرتے تھے، بلکہ صغار صحابہ اور صلحاء تابعین بھی حضرت معاویہؓ پر برملا تنقید کرتے تھے۔ امیر المومنینؓ کے یہاں اس کی آزادی ہی نہیں استقبال تھا۔

حضرت مسور بن مخرمہؓ صغار صحابہ میں سے تھے۔ حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ کے بھانجے تھے۔ حضرت عمرؓ سے خصوصی استفادہ کیا تھا۔ مصنف عبدالرزاق وغیرہ میں نہایت صحیح سندوں سے روایت موجود ہے، جو بتاتی ہے کہ وہ حضرت معاویہ پر خوب تنقیدیں کرتے رہتے تھے۔ حضرت معاویہ کو ان سب کی خبریں ملتی رہتی تھیں۔ مگر داروگیر تو دور، اس کا اظہار بھی نہیں کیا کہ ان تک سب خبریں پہنچ رہی ہیں۔ ایک مرتبہ حضرت مسورؓ خود حضرت معاویہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت معاویہ نے ان کی تنقیدوں کا ذکر چھیڑ دیا۔ اور کہا بتاؤ، حکومت پر تمہارے کیا کیا اعتراضات ہیں؟ حضرت مسورؓ نے ٹالا اور کہا: اب چھوڑیے بھی۔ میں جس کام کے لیے آیا ہوں، ہم اس پر بات کرتے ہیں۔ لیکن حضرت معاویہؓ نے کہا: نہیں، اپنے دل کی بات کہو۔ حضرت مسورؓ فرماتے ہیں: پھر تو میں نے کوئی اعتراض، جو میرے دل میں تھا، روک کے نہیں رکھا، سب کچھ خوب صاف صاف کہہ دیا۔ حضرت معاویہ نے پورے اعتراضات سن کر بڑی تواضع سے کہا:

لا أبرأ من الذنوب. فهل لك ذنوب تخاف أن تهلك إن لم يغفرها الله لك؟ قال: قلت: نعم، قال: فما يجعلك أحق بأن ترجو المغفرة مني؟ فوالله لما ألي من الإصلاح بين الناس وإقامة الحدود والجهاد في سبيل الله والأمور العظام التي تحصيها أكثر مما تلي، وإني لعلى دين يقبل الله فيه الحسنات ويعفو فيه عن السيئات. والله مع ذلك ما كنت لأخير بين الله وغيره إلا اخترت الله على ما سواه.

میں غلطیوں سے مبرّا نہیں۔ یہ بتاؤ! کیا تم کو اپنی کچھ غلطیوں کا اعتراف ہے، کہ اگر اللہ تعالیٰ نے معاف نہ کیا تو ہلاک ہو جاؤ گے؟ (حضرت مسورؓ فرماتے ہیں:) میں نے کہا: ہاں، ضرور۔ حضرت معاویہ نے کہا: جس طرح تم اپنی غلطیوں کی معافی کی امید رکھتے ہو، میں بھی اپنی غلطیوں کی اللہ سے مغفرت کی امید رکھتا ہوں۔ پھر (حضرت معاویہؓ نے اپنے اقدامات کی وضاحت کرنے کے بعد کہا:) جیسا کہ تم جانتے ہو، مجھ پر عوامی معاملات کی اصلاح، حدود کا قیام، جہاد کا انتظام، اور حکومت کی دیگر سخت گراں بار ذمہ داریاں ہیں، جو تم پر نہیں ہیں۔ (تو غلطیاں ہو بھی سکتی ہیں)۔ اللہ کی ذات بڑی کریم ہے، حسنات کو قبول اور سیئات سے درگزر کرتی ہے۔

(پھر فرمایا:) اس کے باوجود اتنا کہتا ہوں کہ اللہ کی قسم <u>جب بھی اللہ اور غیر اللہ میں کسی کے انتخاب کا موقع یا امتحان آتا ہے، میں غیر کا نہیں، اللہ کی رضا کا ہی انتخاب کرتا ہوں۔</u>

حضرت مسور فرماتے ہیں: میں نے غور کیا تو خیال ہوا کہ حضرت معاویہ کی بات میری بات کے مقابلے میں صحیح تھی۔ حضرت مسور سے اس قصہ کو نقل کرنے والے ان کے ماموں زاد بھائی اور حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ کے صاحب زادے حمید اور حضرت عروہ بن زبیر دونوں کہتے ہیں کہ حضرت مسور کی نہ صرف تمام غلط فہمیاں دور ہو گئیں، بلکہ حضرت معاویہؓ کی گفتگو سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اس کے بعد جب بھی حضرت معاویہؓ کا تذکرہ آتا تو وہ ان کے لیے دعاء خیر ضرور کرتے[۱]۔

کاروبار حکومت کے بڑھنے اور خطرات کے پیش نظر حضرت معاویہؓ کے یہاں دربان رکھا گیا تھا۔ خلفاء راشدین کے دور میں اس کو برا سمجھا جاتا تھا۔ ایک صحابی حضرت ابومریمؓ دمشق آئے۔ حضرت معاویہ کے پاس آنا چاہا تو دربان دیکھا، ملاقات نہیں کی، چلے گئے۔ کافی دور مقام جُفَیر (جزیرۂ عرب کے مشرقی ساحل کا ایک گاؤں۔ معجم البلدان: ۱۴۸/۲) تک پہنچ کے اِسی سے متعلق ایک حدیث یاد آئی تو واپس شام آئے اور دروازے پر کسی سے کہا: ارے! تم میں کوئی ایسا سمجھ دار شخص نہیں جو امیر المومنین سے یہ کہہ دے کہ ان کا بھائی ابومریم آیا ہے؟ حضرت معاویہ کو اطلاع ملی تو لوگوں پر ناراض ہوئے کہ کم بختو! ان کو تم نے روک رکھا ہے؟ جلدی لاؤ۔ وہ آئے اور کہا بس ایک حدیث سنانے آیا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو میں نے خود یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کا حاکم بنایا پھر وہ ان کے ضرورت مندوں اور فقراء پر دروازہ بند کر کے بیٹھ رہا، اللہ قیامت کے دن اس کی پریشانی میں کام نہیں آئے گا۔ یہ تنقید سن کر حضرت معاویہ پر بڑا اثر ہوا اور انہوں نے عوام کی شکایتیں سننے کے لیے ایک افسر مقرر کر دیا[۲]۔

ایک عام مسلمان امیر المؤمنینؓ کو برسرعام ٹوک سکتا اور ان پر تنقید کر سکتا تھا۔ حضرت معاویہ نے حکومت کے کاموں پر تنقید کی کھلی آزادی دے رکھی تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ چھوٹے بھی برسرعام ٹوک دیتے تھے اور حضرت معاویہ کچھ برا نہ مانتے۔ ایک مرتبہ دمشق میں کارپردازان اور افواج کی تنخواہیں بٹنے میں تاخیر ہو گئی۔ حضرت ابومسلم خولانیؒ نے برملا ٹوکا اور کہا: یہ مال نہ تمہارا ہے نہ تمہارے باپ ماں کا۔ حضرت معاویہ اپنے دفتر تشریف لے گئے۔ اور تنخواہوں کی تقسیم کا حکم دے کر واپس آئے اور کہا: ابومسلم نے صحیح کہا۔ یہ مال نہ میرا ہے نہ میرے ماں باپ کا۔ لوگو! جاؤ، اپنی تنخواہیں لے لو۔ اللہ تم کو اپنی برکتوں سے نوازے۔ (تاریخ دمشق: ۱۶۹/۵۹)۔

۱۔ مصنف عبدالرزاق: ۲۰۷۱۷، بسند صحیح۔ حافظ ابن عبدالبر کہتے ہیں یہ امام زہری سے مروی سب سے صحیح روایات میں سے ہے، الاستیعاب ترجمۂ معاویہؓ۔ نیز طبقات ابن سعد قسم متمم الصحابہ، طبقۂ رابعہ: ۱۲۳ بسند صحیح۔

۲۔ سنن ابوداود: ۲۹۴۸ بسند صحیح و مسند الشامیین: ۳۰۶/۳ بسند حسن۔ الکنی والاسماء للدولابی: ۱۶۰/۱

گورنروں پر بھی کھلی تنقید اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا رواج:

آزادی تنقید اور حکمرانوں سے اختلاف کا یہ معمول صوبائی حکومتوں میں بھی اسی اسپرٹ کے ساتھ جاری تھا۔عوام، خصوصاً اہل علم، گورنروں پر بے محابا تنقید کیا کرتے تھے۔امیر مدینہ مروان بن الحکم صرف گورنر نہیں، حکومت کے اساطین میں سے تھے۔ابھی قریب ہی ان کے تذکرے کے تحت آزادی اظہار اور شرعی اصولوں کے مطابق تنقید کی آزادی کی متعدد مثالیں ہماری نظر سے گزر چکی ہیں۔

ایک مفسد شخص نے مدینہ آکر عین مسجد نبوی میں ایک حکومتی کارکن کو قتل کر دیا۔مروان نے اس کو (باغیوں سے متعلق شرعی حکم کے مطابق) قتل کرایا اور ذباب نامی ٹیلے پر سولی پر چڑھوا دیا۔اس ٹیلے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غزوۂ خندق کے دوران نماز پڑھی تھی۔حضرت عائشہ کو معلوم ہوا تو انہوں نے قاصد کے ہاتھ ڈانٹ کا پیغام بھیجا کہ: آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عبادت گاہ کو سولی گاہ بناتے ہو؟ (تاریخ مدینہ ابن شبۃ: ۱/ ۶۲)۔

مروان کے دور میں مدینہ میں کبار صحابہ موجود تھے، وہ حکومت کے اعمال پر نظر رکھتے تھے اور ہر وہ چیز جو ان کو غلط لگتی تھی، اس پر بے خوف تنقید کیا کرتے تھے۔عید کا خطبہ نماز کا ایک اہم حصہ ہے، جس کا سننا واجب ہے۔ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طریقہ یہ ہے کہ یہ نماز کے بعد ہوتا ہے۔مروان نے دیکھا کہ لوگ نماز پڑھ کے چلے جاتے ہیں اور خطبہ نہیں سنتے۔تو انہوں نے نماز سے پہلے خطبہ دینا شروع کیا۔ایک مرتبہ خطبہ کے لیے بڑھ ہی رہے تھے کہ حضرت ابوسعید خدریؓ نے امیر کے کپڑے پکڑ کر کھینچا اور کہا: تم یہ سنت میں تبدیلی کر رہے ہو۔بہرحال مروان نے حضرت ابوسعید خدریؓ کے اعتراض کے بعد بھی کیا تو اپنی رائے کے مطابق ہی، مگر گورنر ایک محترم عالم کی اس برملا دست اندازی اور تنقید پر ذرا برا نہ مانے[۱]۔

عوام کی شکایت پر گورنروں کا محاسبہ:

عبدالرحمان بن ام الحکم امیر المومنین کے بھانجے تھے۔آخر عمر میں کوفہ کے گورنر بنائے گئے۔وہاں کے

۱۔ صحیح بخاری: ۹۵۶۔حافظ ابن حجر نے بعض علماء سے نقل کیا ہے کہ خطبے کا نماز کے بعد ہونا مروانؒ کے نزدیک صرف ایک مستحب و اولیٰ قسم کا عمل تھا، جب کہ لوگوں کو خطبہ سنانا اصل اور مقصود درجے کی سنت تھی، جس کو محض ایک مستحب ترتیب کی خاطر قربان نہیں کرنا چاہیے۔فتح الباری: ۲/ ۴۵۰۔ایک روایت مسند احمد (۲۱۶۲۹) میں آئی ہے، جس میں مروان کی حضرت ابوسعید خدری کے ساتھ بڑی بے ادبی کا تذکرہ ہے، مگر وہ منقطع وضعیف ہے، اس کے راوی ابوالبختری سعید بن فیروز نے حضرت ابوسعید خدریؓ کو نہیں پایا ہے۔امام ابوحاتم اور امام ابوداوود وغیرہ ائمہ نے اس کی تصریح کی ہے۔ (ملاحظہ ہو: المراسیل لابن ابی حاتم: ۶۷، سنن ابوداوود، باب ماتجب فیہ الزکاۃ)۔

لوگوں کو ان سے شکایت ہوئی۔کسی شاعر نے چند خوبصورت اشعار میں ان کی شکایت کی۔حضرت معاویہؓ نے معزول کردیا (تاریخ دمشق:۵۲/۳۵)۔

گستاخانہ رویوں پر بھی تحمل ودرگذر:

نرمی ودرگزرحضرت معاویہؓ کی حکومت کی خاص پالیسی تھی۔حضرت ابوالدرداءؓ کہا کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مرتبہ معاویہ کو نصیحت کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر لوگوں کی چھپی غلطیوں کے پیچھے پڑو گے تو حالات خراب ہوجائیں گے۔بس معاویہ کا اسی پر عمل ہے۔ان کو اس نصیحت نے بہت فائدہ پہنچایا۔(سنن ابی داوود:۴۸۸۸)ابن کثیر کہتے ہیں کہ:حضرت ابوالدرداء کے اس تبصرے کا مطلب یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ کا لوگوں کے ساتھ بہت اچھا معاملہ تھا،بہت معاف ونظرانداز کرتے تھے،غلطیوں اور عیوب کی پردہ پوشی رکھتے تھے۔رحمہ اللہ''(البدایہ والنہایہ:۱۳۵/۸)۔

اپنی عظمت وشان کے باوجود حلم وشرافت کا یہ حال تھا کہ اگر کوئی بدو یا اجڈ سخت ودرشت انداز بھی اختیار کرتا تو ہنس کر ٹال دیتے۔ابن عون کہتے ہیں:

> حضرت معاویہؓ کا حال یہ تھا کہ بعض لوگ یہ تک کہتے کہ:معاویہ ہمارے ساتھ سیدھے رہنا،ورنہ ہم تم کو سیدھا کردیں گے۔وہ پوچھتے کیسے سیدھا کروگے؟ وہ کہتے:ڈنڈوں سے۔توحضرت معاویہؓ ہنس کر فرماتے:اچھا بھائی! پھر تو ہم سیدھے رہیں گے[۱]۔

یہ رویہ مزاجی شرافت اور حلم وبردباری کا نتیجہ تو تھا ہی،لیکن ساتھ ہی یہ ان کی ایک سوچی سمجھی حکمت عملی اور پالیسی بھی تھی۔جہاں ضرورت ہوتی وہ سخت گیر بھی واقع ہوتے۔خوارج کے مسئلے میں ان کا طرز عمل شدت ہی کا تھا۔کوفے وبصرے میں شورش تھی،تو گورنرزیادشدت سے کام لیتے تھے،انہوں نے ایک مرتبہ حضرت معاویہ کو خط لکھا کہ آپ کی نرمی سے میرے علاقے میں پریشانی پیدا ہوجائے گی۔میں جب کسی کے ساتھ سختی کرتا ہوں آپ کے پاس دمشق چلا جاتا ہے اور پناہ پاجاتا ہے۔توحضرت معاویہؓ نے جواب دیا:لوگوں کے ساتھ ہم سب کا ایک ہی معاملہ نہیں ہونا چاہیے۔سب نرمی کریں گے تو لوگ سرکش ہوجائیں گے۔اور سب سختی کریں گے تو وہ برباد ہوجائیں گے۔لہٰذا تم (مخالفوں کے ساتھ) سختی سے پیش آؤ۔اور میں نرمی اور محبت کا معاملہ کروں،تاکہ اگر کوئی خوف محسوس کرے تو (مجھ سے معذرت کرکے) عافیت پالے[۲]۔

---

۱ تاریخ دمشق:۱۸۴/۵۹،۱۸۵۔حلم معاویہ لابن ابی الدنیا:۲۶۔

۲ البدایہ والنہایہ:۱۴۵/۸،۱۴۶۔العقد الفرید:۲۷۲/۵۔

عوام کی فریاد رسی:

مملکت نہایت وسیع ہو چکی تھی، داخلی و خارجی امور کے ہجوم اور کاموں کی کثرت کے باوجود امیر المومنینؓ غریب اور عام آدمی سے قریب رہتے۔ انہوں نے عوام کی فریاد رسی کا ایک خاص وقت متعین کر رکھا تھا۔ صبح جب دن کا ایک پہر گزر جاتا تا مسجد میں تشریف لاتے، کرسی لگائی جاتی، گارڈ کھڑے ہو جاتے اور حاجت مند اور فریادیوں کو پیش کیا جاتا۔ اس وقت فقیر، مظلوم، دیہاتی، عورت، اور بچے تک حاضر ہوتے۔ کوئی کہتا: میرے ساتھ ظلم ہوا ہے، کوئی کہتا: مجھے پریشان کیا گیا ہے، کوئی اپنی حاجت مندی بتاتا، کوئی ناداری کا شکوہ کرتا، ہر ایک کی شکایت پر فوری کارروائی کا حکم ہوتا (مروج الذہب: ۳۱/۳)۔

قریب کے حاجت مند تو براہ راست حاضر ہو سکتے تھے، دور کے لوگوں کے سلسلے میں بھی حکومت کی دردمندی کا یہ حال تھا کہ اس کا بھی انتظام کیا گیا تھا کہ دور دراز کے لوگ بھی فریاد اور عرض حال کر سکیں۔ تمام علاقوں کے عمال جب مرکز خلافت کوئی قاصد روانہ کرتے یا کوئی مراسلہ سرکاری ڈاک سے بھیجتے، تو عوام میں اعلان کرتے کہ کسی کو امیر المومنین سے کوئی کام ہو تو لکھ کے خط بھیج دے، ڈاک جا رہی ہے[۱]۔

دربان اور افسر برائے فریاد رسی:

اس قدر مصروفیات کے باوجود ضرورت مندوں اور فریادیوں کو براہ راست اپنے پاس بلاتے اور خود ان کی ضرورتیں پوری کرتے تھے۔ مسعودی نے لکھا ہے کہ دوپہر کا کھانا اس طرح تناول فرماتے کہ دسترخوان لگ جاتا، سکریٹری پاس ہی کھڑا رہتا اور اعلان کر دیا جاتا کہ اہل حاجت اپنی اپنی درخواستیں لے کر حاضر ہوں۔ ایک ایک کر کے لوگ آتے، امیر المومنین کہتے بیٹھو، کھانا کھاؤ، وہ چند لقمے ساتھ کھاتا، اتنی دیر میں سکریٹری اس کی درخواست پڑھ کر سناتا اور حضرت معاویہؓ اس پر اپنا حکم جاری فرماتے وہ لکھا جاتا۔ اسی طرح سب یکے بعد دیگر پیش ہوتے۔ یہ سلسلہ اس وقت تک چلتا رہتا جب تک کھانے سے فراغت نہ ہو جاتی۔ کسی کسی دن تقریباً چالیس آدمیوں کی حاجتیں اسی مجلس میں پوری کی جاتیں (مروج الذہب: ۳۲/۳)۔ پھر (غالباً ضرورتوں کے لیے آنے والوں کی تعداد بڑھی تو) حضرت معاویہؓ نے اپنے دربار میں لوگوں کے مسائل سننے اور فریاد رسی کے لیے ایک افسر مقرر فرمایا۔

خلفاء راشدین کے دور میں حکام کے لیے دربان رکھنے کی سخت ممانعت تھی۔ حضرت معاویہؓ پہلے خلیفہ ہیں جنہوں نے اپنے دروازے پر باقاعدہ دربان رکھا۔ دربان کا کام منظم طریقے پر اجازت لے کے بالترتیب لوگوں کو خلیفہ کے پاس بھیجنا ہوتا تھا۔ دربان رکھنے کے بعد لوگوں کی شکایتیں سننے اور مسائل حل کرنے کے لیے

---

۱ انساب الاشراف: ۳۶/۵، تاریخ طبری: ۳۳۵/۵۔

دربار میں ایک الگ شخص رکھا گیا۔ جیسا کہ گزر چکا ہے، بعض صحابہ کو دربان رکھنے پر اشکال بھی تھا۔ لیکن اب کاروبار خلافت پہلا سا سادہ نہیں رہا تھا۔ اسلامی مملکت ایک متمدن حکومت تھی، جو دنیا کی سب سے بڑی فوجی اور اقتصادی طاقت ہونے کے ساتھ تیز رفتار تمدنی ترقیاں کر رہی تھی۔ ابن خلدون (۱/۲۹۶) نے اس کا معقول سبب بتایا ہے کہ حکام اگر ہر ایک کو ہر وقت آنے کی اجازت دیتے تو کچھ کام نہ ہو سکتا تھا، دوسری اہم وجہ یہ تھی کہ حکام کو داخلی خطرات کے علاوہ روم و فارس کی سازشوں سے بھی خطرہ تھا۔ سیدنا عمر اور سیدنا علی قاتلانہ حملے ہی میں شہید ہوئے تھے، اور خود حضرت معاویہ بال بال بچے تھے۔

بہر حال اس دور میں نظام حکومت میں دربانوں کا اضافہ ہوا۔ حضرت معاویہ اور ان کے گورنروں نے اپنے اپنے دروازوں پر دربان مقرر کیے۔ مگر حضرت معاویہؓ اس پر ڈرتے تھے کہ کہیں اہل حاجت کے بارے میں اللہ کے یہاں سوال نہ ہو۔ متعدد کتابوں میں صحیح اسانید سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابو مریم نامی ایک صحابی آئے، انہوں نے کہا کہ میں کسی کام سے نہیں آیا ہوں۔ تم کو یہ حدیث سنانی ہے کہ مسلمانوں کا کوئی حاکم اگر اہل حاجت اور ضرورت مندوں پر اپنے دروازے بند رکھے گا تو اللہ اس پر اپنی رحمت کے دروازے بند رکھے گا۔ حضرت معاویہ پر گریہ طاری ہو گیا، سر جھکا کے بیٹھ گئے۔ پھر اپنے دربان سعد کو بلوایا اور کہا: ابو مریم! دوبارہ حدیث سنائیے۔ انہوں نے پھر پوری حدیث سنائی۔ حضرت معاویہ نے سعد دربان سے کہا، دیکھو! جو بھی آئے مجھ تک پہنچانا۔ پھر دربار خداوندی میں یوں عرض کیا: اے اللہ اب یہ سعد کی ذمے داری ہے [1]۔۔۔ کیا حال ہے خوف خدا اور فکر آخرت کا!

دیوان الرسائل:

یہ امیر المؤمنین کا سکریٹریٹ تھا۔ تمام حکومتی فرامین، گشتی اعلانات، مراسلات، بین الاقوامی معاہدات اور دیگر دستاویزیں تیار کرنا اس کی ذمہ داری تھی۔ اس کے چیف سکریٹری کے عہدے پر جو مشہور شخصیات فائز رہیں ان میں عبداللہ ابن اوس غسانی اور زمل بن عمرو عذری تھے۔ یہ محکمہ سرکاری احکام و مراسلات کی نقلیں محفوظ رکھنے کا بھی ذمہ دار تھا (معاویہ: ۲۴۶)۔

دیوان الخاتم:

حضرت معاویہ نے ایک نیا شعبہ یا دفتر ''دیوان الخاتم'' نامی قائم کیا۔ خاتم عربی میں مہر کو کہتے ہیں۔ اس دفتر میں تمام سرکاری مراسلات اور فرامین کی نقل محفوظ رکھی جاتی، اور روانہ کیے جانے والے خطوط و فرامین کو مہر بند

[1] مسند الشامیین للطبرانی: ۳/۴۰۶، بسند حسن، مستدرک: ۲۰۷۲، حاکم اور ذھبی نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔

کیا جاتا۔مہر ایسے مادے سے لگائی جاتی کہ ٹوٹ تو سکتی تھی،لیکن کھولی نہیں جاسکتی تھی۔حضرت معاویہؓ نے اس محکمہ کی اہمیت کے پیش نظر اس کا افسر قاضی عبداللہ بن محمد حمیری کو بنایا۔اس محکمہ کی ضرورت اس وقت سامنے آئی جب امیرالمومنینؓ کے پاس ایک صاحب حاضر ہوئے۔حضرت معاویہؓ نے ان کو صوبائی گورنر کے نام ایک خط لکھ کر دیا،جس میں ان کو سو دینار دیے جانے کا حکم تھا۔اُن صاحب نے راستے میں اس کو دوسو کر دیا۔سالانہ حساب کی جانچ کے موقعہ پر یہ فرق سامنے آیا۔اس کے بعد یہ دفتر قائم کیا گیا اور فرمانوں کی نقل محفوظ کی جانے لگی اور ان کو مہر بند کیا جانے لگا[۱]۔

تعلیمی نظام:

خلافت معاویہؓ کے دور میں علوم اسلامیہ کو خصوصاً بہت ترقی ہوئی۔یہ صغار صحابہ اور کبار تابعین کی علمی سرگرمی و جولانی کا سنہرا دور تھا۔کابل ومرو سے لے کر قیروان تک مسلمانوں کا ہر شہر دین و شریعت کی نشر و اشاعت کا مرکز بنا ہوا تھا۔شام میں خود امیرالمومنین ایک بڑے عالم دین کا مقام رکھتے تھے اور پورے عالم اسلام میں دینی و علمی تحریک کے نگراں تھے۔

حفاظت حدیث:

اس علمی تحریک کے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ کہیں غلط سلط روایات کے ذریعے دین میں تحریفات نہ پیدا ہوجائیں۔آج جب کہ احادیث رسول معتبر کتابوں میں اپنی اسانید اور راویوں کے ساتھ ریکارڈ میں آگئی ہیں،ممکن نہیں کہ اب کوئی جھوٹا کذاب دین میں کوئی نئی بات خدا اور رسول کی طرف منسوب کردے۔محدثین نے یہ دروازہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا ہے۔لیکن اُس وقت تو یہ دروازہ بند نہیں تھا۔اس لیے خلفاء راشدین اور حضرت معاویہؓ اس طرف سے فکرمند رہا کرتے تھے۔خصوصاً حضرت معاویہؓ کے دور میں تو ''فتنہ'' کے ذریعہ وضع حدیث کا خطرناک مسئلہ پیدا ہوچکا تھا۔حضرت عمرؓ کی اتباع کرتے ہوئے حضرت معاویہؓ بھی روایت حدیث میں بے احتیاطی سے روکتے تھے۔انہی اقدامات کا نتیجہ ہے کہ حدیث کی حفاظت ہوسکی۔باوجود اس کے کہ وہ اپنے عہد کے بہت بڑے عالم تھے اور دو سال تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خصوصی معیت،خدمت اور سکریٹری شپ کا شرف رکھتے تھے،خود بھی بہت کم حدیث بیان کرتے تھے۔ایک مرتبہ مدینے میں تھے،صحابہ کے ایک حلقے کے پاس سے گذرے تو ان کو ایک حدیث سنائی۔ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ میری طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریب رہنے والوں میں مجھ سے کم حدیث کوئی نہیں بیان کرتا(صحیح مسلم:۲۷۰۱)معبد جہنی کہتے ہیں کہ حضرت معاویہؓ بہت کم

---

۱ الوزراء والکتاب للجهشیاری: ۲۴۔

حدیثیں بیان کرتے تھے (مسند احمد: ۱۶۸۴۶، بسند حسن)۔

اس سلسلے میں اس قدر احتیاط تھی کہ جو حدیثیں رسول اللہ ﷺ سے براہ راست سنی ہوتی تھیں ان کے بارے میں بھی اہل علم صحابہ کو خط لکھ کر دریافت کرتے تھے کہ کیا آپ نے بھی یہ حدیث سنی ہے۔ وہ اثبات میں جواب دیتے تو مطمئن ہوتے۔ ایک مرتبہ دمشق سے مصر کے افسر حضرت مسلمہ بن مخلّد کو خط لکھا کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے دریافت کریں کہ کیا انہوں نے یہ حدیث سنی ہے:

لا قدست امة لا يأخذ ضعيفها حقه من قويها وهو غير مضطهد.

وہ امت خدا کی رحمت سے محروم ہوتی ہے جس کا کمزور بغیر ظلم و زیادتی کے طاقت ور سے اپنا حق حاصل نہ کرلیتا ہو۔

انہوں نے جواب دیا جی ہاں میں نے خود یہ حدیث رسول اللہ ﷺ سے سنی ہے تو فرمایا: وَأَنَا قَدْ سَمِعْتُهُ، وَلَكِنْ أَحْبَبْتُ أَنْ أَثَّبَتَ" میں نے بھی سنی تھی۔ لیکن چاہا کہ اطمینان کرلوں [۱]۔

دیگر بہت سے امور کی طرح اس مسئلے میں بھی وہ حضرت عمرؓ کے متبع تھے۔ یہ حضرت عمر کا خاص حکم تھا کہ حدیث بیان کرنے میں بہت احتیاط کی جائے۔ لہٰذا حضرت معاویہؓ بھی علماء کو پابند کرتے تھے کہ جو احادیث حضرت عمر کے دور میں عام ہوچکی ہیں ان کے علاوہ نئی نئی احادیث نہ بیان کی جائیں۔ اس لیے کہ حضرت عمرؓ کا دور اسلام میں سند اور رسول اللہ ﷺ کا تصدیق یافتہ دور ہے۔ اپنے عہد کے ممتاز عالم عبداللہ بن عامر یحصبی کہتے ہیں کہ حضرت معاویہؓ نے ایک دن دمشق میں خطبۂ عام میں یہ فرمان جاری کیا کہ صرف وہ حدیثیں بیان کی جائیں، جو حضرت عمرؓ کے دور میں عام ہوچکیں تھیں۔ اس لیے کہ حضرت عمرؓ نے لوگوں کو خوف خدا اور احتیاط کا پابند کر رکھا تھا [۲]۔

امیر المومنین کو کسی نے خبر دی کہ حضرت عبداللہ بن عمرو کے حوالے سے لوگ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بنو قحطان میں ایک خلیفہ ہونے کی پیشین گوئی کی تھی۔ (حضرت عبداللہ بن عمرو کی طرف اس کی نسبت بالکل غلط تھی) صورت حال یہ تھی کہ شام میں قحطانی قبائل کثرت سے آباد تھے، اس لیے حضرت معاویہ کو اندیشہ ہوا کہ کہیں یہ غلط روایت ان کے طالع آزماؤں میں خلافت کی تمنا نہ پیدا کردے۔ لہٰذا حضرت معاویہ نے غصے کے حال میں خطبہ دیا اور حمد و ثنا کے بعد اہل دمشق کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: خبر ملی ہے کہ تم میں سے بعض لوگ ایسی باتیں بیان کرتے ہیں جو نہ قرآن میں ہیں اور نہ رسول اللہ ﷺ سے ہی نقل کی گئی ہیں۔ ایسے لوگ جاہل ہیں۔

---

۱ المعجم الکبیر: ۱۹/ ۳۸۷، مسند الشامیین: ۱/ ۱۹۰ بسند صحیح۔

۲ صحیح مسلم: ۷/ ۱۰۳، شرف اصحاب الحدیث للخطیب البغدادی: ۹۱۔

دیکھو، طالع آزمائی تم کو حق سے دور گم راہ نہ کر دے۔ میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ یہ خلافت قریش میں ہی رہے گی، جب تک وہ اقامت دین کا فرض ادا کرتے رہیں، اگر کوئی ان سے خلافت کے معاملے میں جھگڑے گا اللہ تعالیٰ اس کو جہنم رسید کرے گا (بخاری: ۳۵۰۰)۔

اہل علم صحابہ کو معلم مقرر کرنا:

پورے ملک میں معلم مقرر تھے۔ یہ نظام اصلاً حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا قائم کردہ تھا، جنہوں نے نوجوان علماءِ صحابہ کو مملکت کے تمام مراکز (امصار المسلمین) میں معلم بنا کر بھیجا تھا۔ حضرت معاویہ کا دور آیا تو یہ معلمین اپنی ذمہ داریوں میں مصروف اور تعلیم و تدریس کے فرائض ادا کر رہے تھے۔ حضرت معاویہ بھی علماءِ صحابہ کو مکلف کرتے کہ وہ لوگوں کو دین کی تعلیم دیں۔ چنانچہ حضرت عبدالرحمن بن شبل رضی اللہ عنہ، جو ایک قدیم الاسلام صحابی تھے، کو فرمان بھیجا کہ آپ قدیم الاسلام صحابی رسول ہیں، لوگوں کو تعلیم دیں۔ سوانہوں نے حلقۂ تعلیم قائم کیا[۱]۔

معلمین کی بڑی تعداد اور ان کی تنخواہیں:

معلمین کے لیے تنخواہوں کا انتظام حکومت کی طرف سے کیا جاتا تھا۔ سالانہ بجٹ میں سے وزراء، افسران اور علماء و فقہاء کی تنخواہیں الگ کر لی جاتی تھیں۔ ہر ضلع میں معلم اور دینی نگراں مقرر تھے۔ مورخین ہر ضلع کے سالانہ بجٹ کے مصارف میں سے علماء کی تنخواہوں کو ایک مد کے طور پر ذکر کرتے ہیں، (تاریخ دمشق: ۱/ ۲۵۳) جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ایک مستقل بڑی مد تھی اور بڑی تعداد میں علماء تعلیمی نظام سے باقاعدہ منسلک تھے۔ ہر محلے قریے میں تعلیم قرآن کے حلقے قائم تھے، جس کا مرکز وہاں کی مسجد ہوتی تھی۔ دمشق کی جامع مسجد کے معلمِ اکبر مغیرہ ابن ابی شہاب تھے، جنہوں نے براہ راست حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے قرآن پڑھا تھا۔ ان کے بعد ان کے شاگرد عبداللہ بن ابی عامر مقرر ہوئے، یہ حضرت معاویہ کے بھی شاگرد تھے[۲]۔

بچوں کے مکاتب کا نظام اور ان کا بنفس نفیس جائزہ:

خلافت اسلامیہ کے اہم مقاصد میں سے ایک اہم مقصد عوام کی دینی تعلیم ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ہر شہر و آبادی میں نہایت اہتمام سے بچوں کے مکاتب کا نظام قائم کیا تھا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو بھی ان مکاتب کا بڑا اہتمام تھا۔ ان کی حکومت میں دینی تعلیم اور مکاتب کا کیا مقام تھا اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ اس قدر بڑی اور وسیع الاطراف مملکت کا حکمراں بنفس نفیس دمشق اور دوسرے شہروں کے مکاتب کے دورے کرتا تھا، اعلیٰ سطحی وفود کے

---

۱ مسند احمد: ۱۵۶۶۶، الآحاد والمثانی لابن ابی عاصم: ۴/ ۱۳۶۔

۲ معرفة القراء، ذهبی، دار الکتب العلمیة، طبع اول: 1997 ص: ۲۵، ۴۶۔

ساتھ تعلیم کا جائزہ لیتا تھا اور مدرّسوں کو نصیحتیں کرتا تھا۔

شام کے جلیل القدر تابعی عالم حریز بن عثمان حمص کے تھے، شام میں اندرون عرب سے جو قبائل جہاد کے لیے آئے تھے ان کا ایک مرکز حمص بھی تھا، وہ جب حمص کے مکتب میں پڑھتے تھے اس وقت کا واقعہ بتاتے ہیں کہ حضرت معاویہ مکتب کے جائزے کے لیے آیا کرتے تھے اور معلم سے کہتے تھے کہ دیکھو! یہ ان لوگوں کے بچے ہیں جو عرب سے ہجرت کر کے آئے ہیں۔ ان کو خوب اچھی تعلیم دو (النفقۃ علی العیال لابن ابی الدنیا: ۱/ ۴۶۲)۔

ابوالمعطل ایک شامی تابعی تھے۔ بتاتے ہیں کہ جب ہم مکتب میں پڑھتے تھے، ایک دن حضرت معاویہ دس نفری وفد کے ساتھ ہمارے مکتب آئے۔ مدرس نے ہم سے کہا امیر المومنین کو سلام کرو۔ ہم نے سلام کیا۔ انہوں نے جواب دیا اور دعا کی کہ اے اللہ مسلمانوں کے بچوں کو برکت عطا فرما (تاریخ دمشق: ۲۴۶/۶۷)۔

اپنے اور اپنے عمّال کی اولاد کی تعلیم و تربیت کا اہتمام تھا۔ دغفل بن حنظلہؓ عرب میں مشہور دانش ور تھے۔ لغت، تاریخ اور انساب کے بڑے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ ان کو دمشق بلوا کے یزید کا اتالیق مقرر کیا۔ (تاریخ دمشق: ۲۸۶/۱۷)۔

تدوین تاریخ:

تاریخ سے بہت دلچسپی تھی۔ روزانہ قدیم بادشاہوں کے واقعات سننے کا معمول تھا (مروج الذھب: ۴۱/۲) دربار خلافت سے مورخین کی سرپرستی ہوتی تھی، اس لیے تاریخ دانوں کا حضرت معاویہؓ کے پاس کثرت سے آنا ہوتا تھا[۱]۔ یمن میں عبید بن شریہ نامی ایک بڑا شہرت یافتہ تاریخ داں تھا۔ حضرت معاویہؓ نے اس کو بلوایا۔ بات چیت کی تو بڑا فاضل شخص معلوم ہوا۔ آپ نے اس کو تاریخی روایات لکھنے کا حکم دیا۔ اس نے دو کتابیں: کتاب الملوک و اخبار الماضین اور کتاب الامثال لکھیں[۲]۔

علم لغت اور علم نحو کی تدوین:

حضرت معاویہؓ کے دور میں علم نحو اور قواعد عربیت کی اولین تدوین گورنر زیاد کے ایماء پر عمل میں آئی۔ عجمی اقوام خصوصا فارسی اور ترکمانی نسل کے لوگ کثرت سے اسلام میں داخل ہو رہے تھے، وہ خود تو غلط بولتے اور پڑھتے تھے ہی، ان کے اختلاط سے اچھے اچھے عرب اشراف کی زبان میں غلطیاں در آ رہی تھیں۔ ناواقفیت کی وجہ سے لوگ قرآن تک غلط پڑھنے لگے تھے۔ بصرے میں ابوالاسود الدؤلی لغت و نحو کے بڑے عالم تھے۔ زیاد

۱۔ التاریخ العربی والمؤرخون: ۱/ ۹۵، الدولۃ الامویۃ، حمدی شاھین: ۴۵۵۔

۲۔ الفہرست: ۱/ ۱۱۸، الاصابہ فی تمییز الصحابہ: ۵/ ۸۹۔

نے ان کو مکلف کیا کہ عربی کے قواعد مدون کریں۔ ابوالاسود نے اپنے لیے ایک سکریٹری رکھنے کا مطالبہ کیا۔ حکومت کی طرف سے انتظام کیا گیا۔ ابوالاسود نے پھر عربی کے قواعد مرتب کیے اور تصنیفات تیار کیں۔ یہی قواعد عربیت اور علم نحو کا آغاز تھا[۱]۔

اہل علم کے منشی:

جس طرح ابوالاسود دؤلی کو اپنی ضروریات کے لیے منشی یا سکریٹری دیا گیا، اسی طرح دیگر اہل علم وفضل کے لیے بھی حکومت کی طرف سے منشی دیے گئے تھے۔ پیچھے گزر چکا ہے کہ حضرت زید بن ثابت کے ایک منشی وُھیب نامی تھے، حضرت عثمان نے ان کو ایک ہزار درہم تنخواہ پر حضرت زید کی معاونت کے لیے رکھا تھا (تاریخ کبیر: ۱۷۶/۸)۔ حضرت معاویہؓ کے دور میں بھی وہ اس منصب پر فائز تھے اور حضرت زید بن ثابت کی معاونت کرتے تھے (الادب المفرد للبخاری ۱: ۳۸۶/)۔

غیر مسلم شہریوں کے حقوق کا تحفظ:

اسلامی شریعت میں شہریت کی بنیاد ایک معاہدہ تصور کیا جاتا ہے گویا ہر شہری ریاست اور معاشرے کے ساتھ معاہدہ میں مربوط ہوتا ہے، جس کے نتیجہ میں اس کو حقوق بھی ملتے ہیں اور ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں۔ غیر مسلم شہریوں کو اسی مناسبت سے ''معاھد'' یعنی اہلِ معاہدہ کہا جاتا تھا، اور ان کے حقوق کی یاددہانی ہی کے طور پر اسلام ان کو اہل ذمہ کہتا ہے، جس کا مفہوم ہے ایسے شہری جن کے حقوق کی حفاظت ریاست کی ذمہ داری ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا۔

''من ظلم معاهداً، أو انتقصه حقاً، أو أخذ منه شيئاً بغير طيب نفس منه فأنا حجيجه يوم القيامة'' (سنن ابوداود: ۳۰۵۲)۔

جو کسی ذمی پر ظلم کرے، یا اس کا کوئی حق مارے یا اس سے کچھ بغیر اس کے دل کی خوشی کے لے لے تو یاد رکھے قیامت کے دن میں اس کے خلاف اللہ کی عدالت میں نالش کروں گا۔

حضرت عمرؓ نے وفات سے ذرا پہلے اپنے بعد کے خلیفہ کے لئے جو وصیتیں کیں ان میں ریاست کے لئے نہایت قدر و احترام کے لائق ''مہاجرین اولین'' اور انصار کی حق شناسی کی نصیحت کی اور اس کے معاً بعد یہ فرمایا۔

وأوصيه بذمة الله وذمة رسوله، أن يوفى لهم بعهدهم وأن يقاتل من وراءهم، وأن لا يكلفوا فوق طاقتهم، (صحيح البخاري: ۱۳۹۲)

(مہاجرین وانصار کے بعد) میں وصیت کرتا ہوں ''اللہ و رسول کے ذمہ'' کا خیال رکھنے کا، غیر مسلم

---

[۱] طبقات النحويين للزبيدي: ۲۱، اخبار النحويين البصريين للسيرافي: ۱۳۔

شہریوں سے کئے گئے معاہدے کو پورا کیا جائے ان پر کوئی حملہ آور ہوتو ان کی حفاظت کے لیے جنگ کی جائے اور استطاعت سے زیادہ ٹیکس نہ لگایا جائے۔

اس وصیت میں اہل ذمہ کے حقوق کو ’’ذمة الله وذمة رسوله‘‘ (اللہ اور اس کے رسول کا ذمہ) کہہ کر جو تقدس اور احترام بخشا گیا ہے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ سیدنا عمرؓ کے بعد حضرت عثمانؓ نے منصب خلافت سنبھالنے کے بعد اپنے عاملوں کو جو پہلا فرمان جاری کیا اس میں تحریر فرمایا:

دیکھو! مفتوح غیر مسلم اقوام کا خیال رکھنا اور ان سے کیا عہد پورا کرنا۔ کسی یتیم یا ذمی کی حق تلفی نہ ہو، جو ان پر ظلم کرے گا قیامت میں اللہ اس کا دشمن ہوگا (تاریخ طبری: ۲۴۵/۴)۔

غیر مسلموں کے جان و مال کا تحفظ:

اہل ذمہ کی جان و مال کے مکمل تحفظ کی گارنٹی تھی۔ کسی گورنر سے بھی اگر غلطی ہو جاتی تو اس کا محاسبہ ہوتا تھا۔ عبدالرحمان بن ام الحکم کوفے کے حاکم اور بڑے مرتبے کے امیر اور جنرل تھے۔ انہوں نے ایک ذمی کو قتل کروایا۔ ذمیوں کو حصول انصاف کی ایسی آزادی تھی کہ مقتول کا باپ مسجد میں چیختا ہوا آیا اور اس نے گورنر کے خلاف مجمع کے سامنے دُہائی دی کہ مسلمانو! کیا عمر بن خطاب نے ہمیں جان کی حفاظت کی گارنٹی نہیں دی تھی؟ مسلمانوں پر ایسا اثر ہوا کہ گورنر کے خلاف ہنگامہ ہو گیا۔ اور وہ اپنے مقصورہ میں بند ہو کے بیٹھ گئے۔ حضرت معاویہؓ کو خبر ہوئی، تحقیق کے بعد ان کو محسوس ہوا کہ گورنر کا فیصلہ غلط تھا۔ فوراً معزول کر دیا[۱]۔ یہ عبدالرحمن حضرت معاویہؓ کے سگے بھانجے تھے، مگر امیر المؤمنین معاویہ کا عدل تھا کہ ایک ذمی کی شکایت پر بھانجے کو معزول کر دیا۔

ذمیوں کی مملوکہ زمینوں کا تحفظ اس درجہ کیا جاتا تھا کہ حکومت ریاستی منصوبوں کے لیے بھی انہیں نہیں لے سکتی تھی۔ مصر کے حاکم عقبہ بن نافع نے امیر المومنین کی خدمت میں درخواست کی کہ فلاں آبادی کے پاس جو نشیبی زمین خالی پڑی ہے، اس میں (غالباً گورنر ہاؤس کے لیے) تعمیرات کی اجازت دے دی جائے۔ حضرت معاویہ نے ایک ہزار مربع گز زمین لینے کی اجازت دے دی۔ عقبہ کے افسران اور بعض مشیروں نے رائے دی کہ کوئی اچھی زمین اس کام کے لیے منتخب کی جائے۔ تو انہوں نے کہا: نہیں ہمیں اس کا اختیار نہیں ہے۔ ہم ان کی مملوکہ زمین نہیں لے سکتے (الخطط: ۳۸۴/۱)۔

صوبوں کے عُمال اور اعلیٰ افسران بھی ذمیوں کے حقوق کا اتنا خیال رکھتے تھے کہ امیر المومنین کے بعض احکام پر بھی بلا تکلف جواب دے دیتے تھے کہ ان سے ذمیوں کے حقوق متاثر ہوں گے اس لیے عمل درآمد ممکن نہیں۔ اور امیر المومنین بھی اس پہلو کے سامنے آنے پر اپنا حکم واپس لے لیتے تھے۔ پوری مملکت میں غیر مسلم

---

۱ تاریخ دمشق: ۳۵۱/۵۱، نیز العلل ومعرفة الرجال: ۴۶۴/۲، بسند صحیح۔

اسلام قبول کرتے جاتے تھے۔ جیسے جیسے اسلام پھیلتا جاتا تھا، جزیہ کی مقدار میں کمی ہوتی جاتی تھی۔ اوراس کا اثر حکومت کے مالی نظام پر پڑتا تھا، مگر حضرت معاویہؓ اس کمی کو برداشت کرتے تھے۔ ایک مسئلہ یہ تھا کہ کوئی علاقہ اگر جنگ کرکے (عنوۃً) فتح ہوا ہے، تو اس پر جزیے کی رقم میں اضافہ ہوسکتا ہے اور اگر صلح کرکے لوگوں نے اطاعت قبول کی ہے تو جس رقم پر معاہدہ ہوا ہے اس میں کوئی اضافہ نہیں ہوسکتا۔ مصر کا کچھ علاقہ جنگ کرکے (عنوۃً) فتح ہوا تھا کچھ صلحاً، لہٰذا قدیم دور سے اختلاف تھا کہ اس کو کس دائرے میں رکھا جائے۔ حضرت معاویہؓ اس کو عنوۃً فتح شدہ ملک مانتے تھے اور نتیجۃً اس کے جزیے میں اضافے کی گنجائش مانتے تھے۔ لہٰذا ایک مرتبہ مصر کے وزیر مالیات وردان کو لکھا کہ ہر قبطی غیر مسلم کے جزیہ میں ایک قیراط (دینار کے چوبیسویں حصے) کا معمولی اضافہ کردیا جائے۔ وردان نے جواب دیا کہ ان سے فتح کے وقت طے ہوا تھا کہ جزیہ میں اضافہ نہیں کیا جائے گا، تو میں کیسے کردوں؟ لہٰذا یہ معمولی اضافہ بھی نہیں کیا گیا۔ (فتوح البلدان: ۲۱۵)۔

مذہبی آزادی:

اہل ذمہ کو مکمل مذہبی آزادی تھی۔ تمام ممالک میں فتح کے وقت اسلامی حکومت نے یقین دہانیاں لکھ کر دی تھیں کہ ان کو عقیدہ و عبادت اور مذہبی رسومات کی مکمل آزادی دی جائے گی۔ چنانچہ ان کے تمام عبادت خانوں کی حفاظت کی گئی۔ قدیم غیر مسلم مورخین نے مسلمانوں کے اس انصاف اور فراخدلی کا واضح اعتراف کیا ہے۔ ایک قدیم رومن مورخ John of Nikiou اعتراف کرتا ہے کہ مسلمانوں نے مصر میں عیسائیوں سے وعدہ کیا تھا کہ ان کے کلیسے اور دیر کی املاک محفوظ رہیں گی۔ قبطیوں کی مذہبی زندگی میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی جائے گی۔ یہی مورخ لکھتا ہے کہ عمرو بن العاص نے اپنی زندگی کے آخری لمحے تک اس عہد کی حفاظت کی۔ ٹریٹان لکھتا ہے کہ Edessa (اس کو عرب الرُّھا کہتے تھے، اب جنوب مشرق ترکی میں واقع ہے اور روفا کہلاتا ہے) میں مرکزی چرچ کا ایک حصہ زلزلے کی تاب نہ لاکر منہدم ہوگیا۔ حضرت معاویہؓ نے حکم دیا کہ حکومت کی طرف سے اس کی دوبارہ تعمیر کروائی جائے[۱]۔

مقریزی نے لکھا ہے کہ سن ۳۹ سے ۵۶ کے درمیان اسکندریہ کے سب سے بڑے پادری اغانو نے ایک نیا چرچ پادری مرقص کی طرف منسوب تعمیر کیا (الخطط: ۴/۴۰۸) اسی طرح حضرت مسلمہ بن مخلدؓ کی امارت کے دور میں مسلمانوں کے قائم کردہ شہر فسطاط میں پہلا کیتھڈرل چرچ تعمیر ہوا۔ کچھ لوگوں کو اعتراض ہوا کہ حضرت عمرؓ کے دور میں یہ اصول طے ہوا تھا کہ (امصار المسلمین) یعنی مسلمانوں نے اپنے رہنے کے لیے جو نئے

---

۱ ملاحظہ ہو: THE CALIPHS AND THEIR NON-MUSLIM SUBJECTS pg 39, 42

شہر بسائے ہیں، ان میں غیر مسلموں کی عبادت گاہیں نہیں بنائی جائیں گی۔ اختلاف جب بڑھا تو حضرت مسلمہ بن مخلد نے لوگوں کو سمجھایا کہ: إنها ليست في قيروانكم " یہ جگہ مسلمانوں کے آباد کردہ شہر سے باہر عیسائیوں کے علاقے میں ہے۔ اس پر اعتراض ختم ہو گیا (فتوح مصر والمغرب: ۱۵۹)۔

غیر مسلم افسران حکومت:

حقیقت پسندی اور فراخ دلی کا یہ عالم تھا کہ حکومتی حساب کتاب، خصوصاً تحصیل مالیات (Revenue) کا شعبہ تمام علاقوں میں ذمیوں سے متعلق تھا۔ صوبہ دمشق میں جو براہ راست امیر المومنین کے زیر عمل تھا، تحصیل و مالیات کا افسر اعلیٰ سرجون نامی ایک رومی شخص تھا، جو اس صیغے کا تجربہ کار افسر تھا۔ اس کے لڑکے بھی اس صیغے کے افسر تھے۔ یہ صیغہ بعد کے بھی کئی خلفاء کے دور میں اسی خاندان کے پاس رہا۔ حمص کا افسر مالیات ایک اور رومی عیسائی ابن اثال تھا۔ (الوزراء والکتاب: ۲۴، ۲۷)۔ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کو جب کوفے کا گورنر بنایا تو امیر المومنین نے اپنے ایک عجمی مولیٰ عبداللہ بن دراج کو ان کا افسر برائے مالیات مقرر کیا۔ یہ اس کام کے تجربہ کار تھے۔ پہلے شام میں تحصیل اور زمینوں کے رکارڈ کا کام دیکھ چکے تھے۔ انہوں نے نہایت عرق ریزی کر کے قدیم کسروی حکومت کے رکارڈ سے نئی زمینیں دریافت کیں جو مدت سے غیر مزروعہ چلی آرہی تھیں [۱]۔ بصرے میں زیاد کا افسر برائے تحصیل ایک فارسی النسل زاذان فروخ نامی شخص تھا اور ذاتی گارڈس کے افسر کا نام مہران تھا (تاریخ خلیفہ: ۲۱۲)۔

وردان شام میں مقیم رومیوں کی نسل سے تھے، نہایت اعلیٰ ذہنی اور انتظامی صلاحیتوں کے مالک اور بہت قابل اعتماد۔ یہ اسلام لے آئے تھے۔ حضرت عمروؓ بن العاص جب مصر کے گورنر بنے تو یہ ان کے سکریٹری تھے۔ وہ اِن کی رائے پر بہت اعتماد کرتے تھے، جب اُن کی وفات ہوئی تو حضرت معاویہؓ نے وردان کو پورے مصر کا وزیر مالیات طے فرمایا (تاریخ دمشق: ۶۲/ ۴۲۹)۔

معاویہؓ ایک تاریخ ساز انقلاب کا معمار:

یہ ایک واقعاتی حقیقت ہے کہ مسلم ریاست میں غیر مسلموں کا داخلہ مفتوح بن کر ہی ہوا تھا۔ لیکن کچھ مدت ہی کے اندر ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے سماجی انصاف نے دنیا کی تاریخ کا یہ عجیب اور عظیم کارنامہ انجام دیا کہ فاتح عربوں کے بجائے مفتوح قوموں کی بڑی تعداد اسلامی معاشرہ میں علم، فضیلت اور اختیارات میں بلند ترین مرتبوں پہ فائز نظر آتی ہے۔ ان فتوحات کا بڑا حصہ امیر المومنین حضرت معاویہ کے عہد امارت یا عہد خلافت

---

[۱] تاریخ دمشق: ۲۸/ ۳۵، نیز الخراج: ۱۳۴۔

میں انجام پاتا ہے۔ جو علاقے ان کے دورِ امارت میں فتح ہوئے لیکن ان کے دائرۂ کار سے باہر تھے، ان میں سے بڑے حصے میں استقرار اور نظم وضبط کا استحکام انہی کے دورِ خلافت میں انجام پاتا ہے۔ غیر مسلموں کے ساتھ ان کی حکومت کا طرز ایسا تھا کہ مفتوح اقوام میں تیزی سے اسلام پھیلتا گیا۔

اسلامی حکومت نے مفتوح اقوام کے ساتھ ایسا منصفانہ برتاؤ کیا کہ بتدریج مفتوح اقوام ہی معاشرے کی قیادت کے مقام تک پہنچتی گئیں۔ دوسری صدی ہجری کے تقریباً نصف کے بعد سے علم، عزت، حکومتی عہدوں، صنعت، تجارت، تہذیب اور یہاں تک کہ دینی رہنمائی میں بھی آپ کو فاتح عربوں کے بجائے مفتوح قوموں کے لوگ معاشرے میں نہایت فائق و برتر نظر آئیں گے۔ علم حدیث جو اس زمانے کا سب سے معزز علم اور اسلامی تہذیب کا سرتاج ہے، اس کی بزم عجمی نژادوں سے ہی آراستہ ہیں۔ یہی ماوراء النہر کا مفتوح علاقہ ہے جس کے آغوش میں تدوین حدیث یعنی اسلام کا سب سے شاندار و ممتاز علمی و تہذیبی کارنامہ منصۂ شہود پر آیا ہے۔ حدیث کی اکثر اہم کتابیں انہی عجمی نژاد ائمۂ اسلام نے لکھی ہیں۔

علم فقہ جو دینی رہنمائی کا خاص ذریعہ ہے، بڑی حد تک انہی عجمی علماء کا مرہون منت ہے۔ پھر نظر اٹھائیے تو نظر آتا ہے کہ بین الاقوامی تجارتی مراکز حجاز و نجد نہیں: دمشق، حمص، بصرہ، مدائن، سمرقند، مرو، بخارا، اسکندریہ اور فسطاط میں قائم ہیں۔ حکومت میں خلافت کا ادارہ اگرچہ عرب ہی رہا، لیکن فوج سے لے کر شہری تنظیم و ریاست کے ہر شعبے میں یہ عجمی مفتوحین ہی تھے جو مسلم حکومتوں میں مرکزی اور کلیدی مقام پر فائز رہے۔

اسی عدل وانصاف سے ایک نئی اسلامی تہذیب مراکش سے لے کر لے کر خراسان اور سمرقند و بخارا تک میں نشوونما پاتیہے اور ساری دنیا کی فاتح تہذیب بن جاتی ہے۔ یہ تہذیب عربی و عجمی، آرامی و فارسی اور ترکمانی و رومی عناصر کا مجموعہ ہے، لیکن اسلامی روح سے سرشار ہے۔ حضرت معاویہؓ اس بین الاقوامی تاریخ ساز انقلاب کے صف اول کے معماروں میں سے تھے۔

چودہواں باب

مالیاتی نظام

اسلامی مملکت کے مالیاتی نظام کی تشکیل سیدنا عمرؓ کے ہاتھوں انجام پائی تھی۔ انھوں نے ہی کتاب وسنتِ رسول کی روشنی میں مفاد عامہ اور مملکت کے مصالح کی بنیاد پر اس کے قواعد وضوابط مقرر کیے تھے۔ حضرت معاویہؓ نے اسی نظام کو باقی رکھا، البتہ زمانے اور حالات کی مناسبت سے اس میں اصلاح وترقی کا کام جاری رہا۔ اس سلسلے کی روایات پر عمومی نظر سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت معاویہؓ کے دور میں شعبۂ مالیات نے نہایت ترقی کی۔ روم وفارس میں تمدن کی قدیم تاریخ تھی۔ اسلامی حکومت نے مالیاتی نظم ونسق میں ان کے تجربہ کار افراد کو خوب استعمال کیا۔ ہر علاقے میں تحصیل ومالیہ کے قدیم کارکنوں کو بحال کیا۔ ان ہی کے افسران کو ذمہ داری دی۔ اموی خلافت کے اہم گورنر ومنتظم زیاد کہا کرتے تھے کہ محکمۂ خراج (تحصیل) میں عجمیوں کے افسران کو ہی استعمال کرنا چاہیے، وہی اس کے تجربہ کار ہوتے ہیں (یعقوبی: ۲/ ۲۳۴)۔

تحصیل کے بنیادی ذرائع زکات، عشر، تجارتی عشر، خراج، جزیہ اور مال غنیمت تھے۔

زکات:

زکات مسلمان مالداروں سے لیا جانے والا وہ مال ہے جو وہ خالص دینی جذبے اور رضائے الٰہی کے لیے دیتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی مقدار مقرر کردی تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہی طے فرمادیا تھا کہ اس کو جمع اور تقسیم کرنا حکومت کی ذمے داری ہے۔ خلفائے راشدین کے دور میں ایسا ہی نظام جاری رہا۔ البتہ حضرت عثمانؓ کے دور سے ایک فرق آیا۔ اموال کی کثرت کی بنا پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ حکومت اموال باطنہ (یعنی سونے چاندی ونقد وغیرہ) کی زکات کا مطالبہ نہیں کرے گی۔ اور لوگ ان کی زکات اپنے آپ دیں گے۔ البتہ تجارتی مال اور جانوروں کی زکات اور کھیتی کا عشر حکومت لیا کرے گی۔ (الاموال: ۶۳۶)۔ حضرت معاویہ کے دور میں بھی اسی پر عمل تھا۔

جزیہ:

جزیہ وہ ٹیکس ہے جو اسلامی مملکت غیر مسلموں سے لیتی ہے۔ یہ ایک سادہ حکومتی ٹیکس ہے۔ مسلمان زکات

دیتے ہیں، جو فقراء کی خدمت کے علاوہ ریاست کے دفاعی اخراجات میں بھی خرچ ہوتی ہے۔ یہ ایک عبادت ہے اور اس کا خاص مذہبی رنگ ہے۔ یہ صرف مسلمان دیتے ہیں۔ اور غیر مسلم جزیہ دے کر ریاست کے تئیں اپنی ذمہ داری ادا کرتے ہیں۔ جزیہ کی دو شکلیں تھیں، کچھ ریاستوں یا معاشروں سے اجتماعی طور پر کوئی خاص مقدار طے ہو جاتی تھی، جو وہ خود جمع کر کے دے دیتے تھے۔ جب کہ بعض علاقوں کے افراد پر ٹیکس طے کر دیا جاتا تھا، جو اسلامی حکومت خود وصول کرتی تھی۔ اس صورت میں یہ صرف کمانے والے غیر مسلم مردوں سے لیا جاتا تھا۔ یعنی بوڑھوں، عورتوں، بچوں، ناداروں اور نہ کمانے والوں، راہبوں وغیرہ سے نہیں لیا جاتا تھا۔ عراق اور فارس کے علاقوں میں اس کی مقدار مال دار پر ۴۸ درہم، اوسط معیشت والے پر ۲۴ درہم اور عام کمانے والے آدمی پر ۱۲ درہم سالانہ ہوا کرتی تھی۔ مملکت فارس کے زیر حکومت رہے علاقوں، مثلاً ایران، عراق وغیرہ، اسی طرح جزیرۃ العرب کی عام کرنسی فارسی درہم نقرئی تھی۔ جب کہ مصر و شام، آرمینیہ و افریقی ممالک چونکہ رومی سلطنت کے تحت تھے اس لیے ان کی عام کرنسی دینار طلائی تھی۔ ایک دینار قریباً ۱۲ درہم کا ہوتا تھا اس لیے دینار میں جزیہ کی مقدار علی الترتیب چار، دو اور ایک دینار ہوتی تھی۔ رسول اللہ ﷺ اور خلفاء راشدین کے زمانے میں ایسا ہی ہوتا آیا تھا۔ حضرت معاویہ کے عہد میں اس کے متعلق زیادہ معلومات نہیں ملتیں۔ لیکن جو ملتی ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہی نظام جاری رہا۔ (معاویہ للصلابی: ۱۸۵)۔

جزیہ میں نرمی:

جزیہ میں ہر طرح نرمی ملحوظ رکھی جاتی تھی۔ غیر مسلم غرباء کا خیال رکھا جاتا تھا کہ زیر بار نہ ہونے پائیں۔ نجران والوں سے رسول اللہ کے زمانے میں جو جزیہ طے ہوا تھا اس کی قیمت تقریباً اسی ہزار درہم بنتی تھی۔ انہوں نے حضرت عمرؓ سے درخواست کی کہ اب ہم لوگ شام و عراق کے (خوش حال) شہروں میں جا کر آباد ہونا چاہتے ہیں۔ حضرت عمر نے ان کو اجازت دے دی۔ ان کے لیڈر ہر سال جزیہ کی رقم اپنے لوگوں سے جمع کر کے پیش کر دیتے تھے۔ حضرت معاویہؓ کے دور میں ان لوگوں نے درخواست کی کہ ہماری تعداد میں کمی آ گئی ہے۔ اس لیے کہ بہت سے لوگ اسلام لے آئے۔ اب ہمارا جزیہ کم کر دیا جائے۔ حضرت معاویہؓ نے مقدار گھٹا کر ۶۴ ہزار کے مساوی کر دی (فتوح البلدان: ۴۷)۔

پوری مملکت میں غیر مسلم اسلام قبول کرتے جاتے تھے۔ جیسے جیسے اسلام پھیلتا جاتا تھا، جزیہ کی مقدار میں کمی ہوتی جاتی تھی۔ اور اس کا اثر حکومت کے مالی نظام پر پڑتا تھا، مگر حضرت معاویہؓ اس کمی کو برداشت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ مصر کے وزیر مالیات وردان کو لکھا کہ ہر قبطی غیر مسلم کے جزیہ میں ایک قیراط (دینار کے

چوبیسویں حصہ) کا معمولی اضافہ کر دیا جائے۔ وردان نے جواب دیا کہ ان سے فتح کے وقت طے ہوا تھا کہ جزیہ میں اضافہ نہیں کیا جائے گا، تو میں کیسے کر دوں؟ لہٰذا یہ معمولی اضافہ بھی نہیں کیا گیا (فتوح البلدان: ۲۱۵)۔

یعقوبی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مصر سے خراج کے تیس لاکھ دینار کے علاوہ حضرت معاویہؓ کے دور میں بیس لاکھ دینار جزیہ بھی وصول ہوتا تھا۔ (البلدان للیعقوبی: ۱۷۸) قبرص کے جزیہ کی مقدار سات ہزار دوسو دینار طے تھی۔ اسکندریہ مالی اعتبار سے مصر سے الگ ایک صوبہ تھا۔ اس کا جزیہ ۱۸ ہزار دینار ہوتا تھا (فتوح: ۲۲۱)۔ شامی صوبوں میں سے قنسرین اور دمشق کا جزیہ تین تین لاکھ دینار اور اردن کا ایک لاکھ بیس ہزار نیز فلسطین کا بھی ایک لاکھ بیس ہزار دینار ہوتا تھا (ادب الکتاب للصولی: ۲۱۶)۔ یہ تو چند علاقوں کی تفصیل دستیاب ہوسکی ہے، مگر اس سے ہی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ باقی علاقوں کا جزیہ مل کر ایک بڑی رقم جمع ہوتی تھی، جو مملکت کے دفاع و جہاد اور دیگر رفاہی و تمدنی کاموں میں خرچ ہوتی تھی۔

خراج:

مسلمانوں پر کھیتی کی زکات یعنی ''عشر'' کا نظام طے تھا۔ غیر مسلموں کی زمینوں سے خراج وصول کیا جاتا تھا۔ خراج کا پورا نظام حضرت عمرؓ کے عہد میں منظم کیا گیا تھا۔ دراصل ساسانی اور بیزنطینی علاقوں میں پہلے سے ہی زمینوں پر ٹیکس تھا، جس کو رومن زبان میں tributum Soli (یعنی زمین کا ٹیکس) کہتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے ان علاقوں میں فی الجملہ اسی نظام کو باقی رکھا، لیکن اس میں قدیم حکمرانوں نے بڑی سختیاں کر رکھی تھیں۔ حضرت عمرؓ نے اس کا گہرا جائزہ لیا اور ہر ناروا سختی کو ختم کر کے اس کو عوام کے لیے سہل اور ہلکا بنایا۔ شام میں حضرت معاویہؓ سے بھی اسی نقشہ کے مطابق نظام بنوایا۔ سب سے پہلے اس نظام کا ڈھانچہ عراق میں تشکیل دیا گیا۔ لہٰذا تاریخی مآخذ میں اس نظام کا حوالہ عراق کے تحت ہی آتا ہے۔ اگرچہ شام کا نظامِ تحصیل و مالیات بھی انہی خطوط پر تیار کیا گیا تھا۔ حضرت عمر فاروق نے حضرت عثمان بن حنیفؓ اور حضرت حذیفہ بن الیمانؓ کو عراق کا افسر برائے تحصیل (Revenue Officer) مقرر کیا اور تفصیلی ہدایات دیں کہ عوام دوست نظام بنایا جائے، جس کا تحمل کسانوں کے لیے آسان ہو۔ ٹیکس کی مقدار کم رکھی جائے اور وصولیابی میں بھی نرمی کا خیال رکھا جائے۔ (الخراج: ۴۸)۔

زمینوں کے نظام میں ایک انقلابی اصلاح:

کاشت کی زمینوں کے سلسلے میں اس دور میں ایک غیر معمولی اصلاحی انقلاب آیا۔ قدیم دور سے دنیا کے اکثر حصوں میں تمام زمینیں حکمرانوں، علاقائی نوابین اور راجاؤں، فوجی افسران، کلیساؤں و آتش کدوں کی جاگیریں تھیں۔ رومن اور فارسی مقبوضات میں بھی یہی حال تھا۔ زمین دار سے زمین کسی اور کو منتقل ہوتی تو ساتھ

ہی یہ کسان بھی نئے مالک کے تابعدار بن جاتے۔ کسان کی حیثیت زمین کے غلام (Villein یا Serf) کی تھی۔ ہر جاگیردار کے بندھوا کسان ہوتے تھے، جو نہایت مظلوم تھے۔ مسلمانوں نے اس ظلم کا خاتمہ اس طرح کیا کہ قدیم جاگیرداری ختم کر کے یہ تمام زمینیں کسانوں کو دے دی گئیں اور خراج لگا دیا گیا۔ یہ ایک انقلابی قدم تھا، جس نے مفلوک الحال کسانوں بلکہ صحیح معنیٰ میں قوموں کی زندگیاں بدل دیں۔ ان ممالک میں مسلمانوں کی تیز رفتار فتوحات اور پھر ان کے قدم جمنے میں اس پالیسی کا بہت بڑا کردار تھا۔ (دیکھیں الفاروق: ۲۰۸)۔

اگرچہ مفتوح علاقوں میں زمین کے قدیم ریکارڈ موجود تھے، مگر حضرت عمرؓ نے عراق کی زمینیں از سر نو نپوائیں اور سب کا لیکھا جوکھا تیار کرایا۔ ایک ایک کھیت ناپا گیا۔ اسی دوران آب پاشی کے نظام کو جو قدیم دور میں تباہ ہو گیا تھا، ٹھیک کیا۔ نہروں نالوں کی صفائی کروائی، بند پڑی نہروں کو جاری کیا گیا۔ اور یہ اصول طے کیا گیا کہ صرف انہی زمینوں پر خراج لگے گا جن کو سرکاری آبپاشی کے نظام سے جوڑا جا چکا ہے، دیگر زمینوں پر نہیں۔ خراج کی مقدار ایک جریب (۳۶۰۰ گز کا ایک پیمانہ) پر پیداوار میں سے ایک قفیز (تقریباً ۲۶ کلو) گیہوں یا جو اور ایک درہم نقد کا ٹیکس مقرر کیا گیا۔ (الاموال: ۹۰)۔ دیگر اجناس کا کچھ مختلف نظام طے کیا گیا۔ یہ نہایت ہلکا ٹیکس تھا۔ اس کے باوجود حضرت عمر بار بار تحصیل کے وزراء حضرت عثمان بن حنیفؓ اور حضرت حذیفہؓ سے کہتے تھے کہ مجھے ڈر لگتا ہے کہ تم نے کسانوں پر زیادہ بوجھ نہ ڈال دیا ہو۔ ان دونوں نے یقین دلایا کہ حقیقت برعکس ہے، اس سے دوگنے کی بھی گنجائش تھی، مگر ہم نے مقدار کم رکھی۔

شام اور دیگر علاقوں کا خراجی نظام:

اس کے بعد حضرت عمرؓ نے دیگر علاقوں کے گورنروں کو فرمان جاری کیا کہ زمین کے انتظام کے سلسلے میں جس طرح کی کارروائی ارض سواد یعنی جنوبی عراق میں ہوئی ہے، وہی اپنے یہاں بھی کرو۔ اسی مضمون کا خط حضرت ابوموسیٰ اشعری کو شمال عراق کی زمینوں کے سلسلے میں دیا گیا (تاریخ یعقوبی: ۲/ ۱۵۲)۔ جب اہواز فتح ہوا تو بھی ایسا ہی فرمان بھیجا گیا (تاریخ یعقوبی: ۲/ ۱۵۷)۔ یہی حکم کسکر میں بھی دیا گیا (طبری: ۴/ ۱۱۴)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شام کے سلسلے میں بھی اصولاً یہی پالیسی رکھی گئی تھی۔ البتہ یہاں بیزنطینی دور کے تحصیل کے ڈھانچے کو بنیاد بنایا گیا اور اس میں نرمی اور اصلاحات کی گئیں۔ یہ سب حضرت معاویہ کی امارت کے دور میں ہوا۔

جب ان کی خلافت کا دور آیا تو انہوں نے نے خراج کے نظام کو بہت ترقی دی۔ اس دور میں عراق میں زمینوں کی پیمائش میں مزید اصلاحات کی گئیں، کچھ زمینیں پیمائش اور ریکارڈ سے رہ گئی تھیں، نیز ملکیتیں بدل گئی تھیں، حضرت معاویہؓ کے گورنر نے ان کا از سر نو پیمائش کر کے ریکارڈ بنوایا (الخراج، ڈاکٹر غیداء خزنہ کاتبی: ۱۳۳، ۱۳۴)۔

فتوحات کی وسعت اور نظم مملکت کے متحرک ومنضبط ہونے کی وجہ سے خراج کی مقدار بہت زیادہ ہوگئی تھی۔ یاقوت حموی نے اکیلے مصر کے ایک سال کے خراج کی مقدار ۹۰ لاکھ دینار طلائی ذکر کی ہے۔(معجم البلدان: ۱۴۱/۵)۔ ایک سال پچاس لاکھ دینار بھی وصول ہوئے تھے(البلدان، یعقوبی: ۱۷۸)۔ مورخ یعقوبی حضرت معاویہؓ کے دور میں خراج کی سالانہ آمدنیوں کی تفصیل ذکر کی ہے۔ جو حسب ذیل ہے:

مصر:	تیس لاکھ دینار طلائی۔
فلسطین:	چارلاکھ پچاس ہزار دینار۔
اردن:	ایک لاکھ اسی ہزار دینار طلائی۔
دمشق:	چارلاکھ پچاس ہزار دینار۔
حمص:	تین لاکھ پچاس ہزار دینار
قنسرین:	چارلاکھ پچاس ہزار دینار
عراق وملحقات (یعنی کوفہ وبصرہ مع ایران وبلاد ماوراء النہر)	۶۵ کرور ۵۵ لاکھ درہم
الجزیرہ:	پانچ کرور پچاس لاکھ درہم نقرئی۔
موصل ومضافات:	چارکرور پچاس لاکھ درہم
	(تاریخ یعقوبی: ۲/ ۲۳۳، ۲۳۴)
قبرص:	۷ ہزار دینار (فتوح البلدان)

یہ اعداد وشمار ایک عظیم الشان خلافت کی زبردست مالی طاقت کے عکاس ہیں۔

تجارتی عشر:

تجارتی عشر وہ ٹیکس یا فیس تھی جو اسلامی مملکت میں آنے والے تاجروں کے مال سے (گویا کسٹم ڈیوٹی کے طور) پر وصول کی جاتی تھی۔ یہ اس دور کا معروف بین الاقوامی نظام تھا۔ حضرت عمر کو بتایا گیا کہ مسلمان تاجر جب غیر مسلم مما لک جاتے ہیں تو ان کے مال کا دس فی صد لیا جاتا ہے۔ توانہوں نے حکم دیا کہ غیر ملکی تاجروں سے اتنا ہی وصول کیا جائے۔ جب کہ اہل ذمہ سے پانچ فی صد اور مسلمانوں سے زکات کے بقدر سالانہ ڈھائی فی صد وصول کیا جاتا تھا (الخراج: ۱۴۸، ۱۴۹)۔ اس میں بھی یہ طے تھا کہ دوسو درھم سے کم مال پر کوئی ٹیکس وصول نہیں کیا جائے گا۔ تاجر کو وصول کی ایک رسید دی جائے گی۔ جس کے بعد اگلے سال تک اس مال پر کوئی عشر نہیں لیا جاتا تھا[۱]۔

---

۱ الاموال: ۶۴۳۔

بحرین و یمامہ کے علاقے سے (غالبا تجارتی عشر) کے طور پر ٹیکس وصول ہوتا تھا وہ پندرہ لاکھ درہم تھا ۱۔ اسی طرح یمن سے بھی تجارتی ٹیکس وصول ہوتا تھا، جس کی سالانہ مقدار بارہ لاکھ دینار تھی ۲۔ ان دو صوبوں کے تجارتی عشر کی مقدار سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مملکت کو اس مد سے بھی کافی آمدنی تھی۔

تجارتی عشر کا نظام بہت وسیع اور منظم تھا۔ دجلہ جیسی بڑی ندیوں میں مال بردار کشتیاں چلا کرتی تھیں اور دریاؤں ہی میں چنگیاں بھی قائم تھیں۔

تحصیل میں حکومت کی نرم پالیسی:

حضرت معاویہؓ کی حکومت کا رویہ تاجروں کے ساتھ نرم اور تسامح پر مبنی تھا، کوئی تاجر بتاتا کہ مجھ پر مال سے زیادہ قرض ہے، تو اس کی بات تسلیم کر لی جاتی تھی اور کوئی عشر نہیں لیا جاتا تھا (الاموال: ۶۴۳)۔ محصلین میں بڑے اونچے درجہ ومنزلت کے صالحین اور اہل علم شامل ہوا کرتے تھے جو تاجروں کے ساتھ بڑا شریفانہ معاملہ کرتے تھے۔ دجلہ میں خلیج فارس سے گزرتا ہوا درآمدات کا مال آتا تھا۔ جو شمال عراق میں اترتا اور وہاں سے آذربائیجان، آرمینیہ اور اناضول سے ہوتا یورپ کے شہروں کو جاتا تھا۔ اس بین الاقوامی تجارتی گزرگاہ میں واسط کے مقام پر ایک دریائی چنگی قائم تھی۔ جس کا طریقہ یہ تھا کہ ایک مضبوط فولادی زنجیر دریا کے دونوں کناروں سے بندھی تھی، جس سے راستہ بند رہتا تھا۔ یہاں ٹیکس کا عملہ موجود ہوتا تھا، جو عشر وصول کر کے راستہ کھولا کرتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہت مصروف تجارتی گزرگاہ تھی۔ زیاد نے اس چوکی پر حضرت مسروق بن الاجدعؒ اور ابو وائل شقیق بن سلمہؒ کو مقرر کر رکھا تھا، دونوں عظیم محدث وفقیہ اور مرجع خلائق تھے۔ یہ حضرات تاجروں کی زیادہ چھان بین نہیں کرتے تھے، بس یوں کہتے اگر قاعدے کے مطابق ہمارا کچھ حق بنتا ہو تو حوالے کر دو (تاریخ واسط: ۴۷، ۳۸)۔

صوافی:

خراج کے علاوہ مرکزی حکومت کو ایک اور قسم کی زمین سے بہت بڑی آمدنی ہوتی تھی۔ یہ قسم صوافی کہلاتی تھی۔ یہ وہ زمینیں تھیں جن کا کوئی متعین مالک نہیں پایا گیا تھا۔ یا وہ سابقہ حکومت کی ملکیت میں تھیں۔ لہٰذا ان کو خالص ریاست کی ملکیت قرار دیا گیا تھا۔ حکومت آبادکاری اور پیداوار میں اضافے کے مقصد سے ان میں سے

۱ بحرین خلیج عربی کے مشرقی ساحل کا وہ علاقہ کہلاتا تھا، جس میں اب عرب امارات، قطر اور سعودیہ کا مشرقی صوبہ واقع ہے۔ یہ بحری تجارت کی اہم بندرگاہ تھی، یہاں مجوس کی ایک قدیم ریاست تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے ان پر جزیہ طے فرمایا تھا۔ (صحیح بخاری: ۶۴۲۵، ۳۱۵۷) حضرت معاویہؓ کے دور میں یہ علاقہ مکمل طور پر اسلام لا چکا تھا، اس لیے یہاں سے جو رقم موصول ہوتی تھی وہ تجارتی عشر ہی ہو سکتی ہے۔

۲ تاریخ یعقوبی: ۲/ ۲۳۳، ۲۳۴، یمن میں بھی بڑی تجارتی بندرگاہیں تھیں۔

جاگیریں دیتی تھی، تاکہ اقتصادی ترقی ہو۔ ساتھ ہی ان سے مملکت کو خراج کی شکل میں کافی آمدنی بھی ہوتی تھی۔ مگر اصول یہ تھا کہ یہ صرف کھیتی کرنے کے لیے دی جاتی تھیں، کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتی تھیں۔

اس کی اصل یہ تھی کہ حضرت عمرؓ کے دور میں فتوحات کے وقت متعدد قسم کی زمینیں ایسی پائی گئی تھیں کہ ان کا کوئی مالک یا کسان نہیں تھا۔ یہ وہ زمینیں تھیں جو کسریٰ اور دیگر حکمراں طبقات کی ملکیت تھیں، ان میں کوئی کھیتی نہیں ہوتی تھی۔ ان کے علاوہ بڑے بڑے بنجر علاقے تھے، افتادہ جنگلی زمینیں تھیں، دجلہ وفرات کے درمیان وسیع وعریض نشیبی علاقے تھے، جن میں سال کا بڑا حصہ پانی بھرا رہنے کی وجہ سے کاشت ممکن نہیں تھی۔ ان زمینوں کی پیمائش ونشاندہی کر کے حضرت عمرؓ نے ان میں سے کچھ جاگیریں بانٹ دی تھیں، جن سے خراج وصول کیا جاتا تھا۔ باقی ایسے ہی پڑی تھیں (الخراج: ۷۰)۔

حضرت معاویہؓ خلیفہ بنے تو ان متروک زمینوں کی طرف توجہ دی۔ پتہ چلا کہ ابھی بہت بڑی مقدار میں ایسی زمینیں رکارڈ میں آنے سے رہ گئی ہیں۔ عموماً اقلیمی گورنر ہی مالیات کے نظام کا بھی سربراہ اعلیٰ ہوتا تھا۔ حضرت مغیرہ اگرچہ کوفہ کے گورنر تھے، مگر حضرت معاویہؓ نے عراق کا وزیر مالیات وتحصیل (Revenue) عبداللہ بن درّاج کو مقرر کیا تھا۔ یہ اس کام کے تجربہ کار تھے۔ پہلے شام میں تحصیل اور زمینوں کے رکارڈ کا کام دیکھ چکے تھے۔ انہوں نے نہایت عرق ریزی کر کے قدیم کسروی حکومت کے رکارڈ سے ایسی زمینیں دریافت کیں جو مدت سے غیر مزروعہ چلی آرہی تھیں۔ بصرہ کے گورنر زیاد نے ایک گز متعین کیا جو ان کے نام پر ''زیادی گز'' کہلاتا تھا۔ اس سے از سر نو نپائی ہوئی (صبح الاعشیٰ: ۳/ ۵۱۳، نیز الخراج: ۱۳۴)۔

یعقوبی نے تفصیل سے قصہ لکھا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے عبداللہ بن دراج کو لکھا کہ مرکزی بجٹ خسارہ سے دوچار ہے، مجھے حکومت کے انتظام کے لیے مزید پیسوں کی ضرورت پڑ رہی ہے، تم عراق کی تحصیل میں سے کچھ بھیج سکتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا کہ یہاں کے کھیتی کے افسران بتاتے ہیں کہ کسریٰ اور اس کے خاندان کی بیکار پڑی زمینیں ہیں، جن میں کھیتی نہ ہونے کی وجہ سے لگان نہیں آتا۔ حضرت معاویہؓ نے لکھا کہ ان زمینوں کو صوافی کے طور پر (قومی ملکیت میں) لے لیا جائے۔ یہ بالکل وہی پالیسی تھی جو حضرت عمرؓ نے اختیار کی تھی۔

عبداللہ بن دراج نے تحصیل داروں کو جمع کر کے مشورہ کیا، تو انہوں نے کہا کہ زمینوں کے کاغذات حُلوان (موجودہ مغربی ایران) میں ہیں۔ کاغذات منگائے گئے، ایسی زمینوں کا پتہ لگایا گیا اور ان زمینوں کو ریاستی ملکیت میں لیا گیا۔ یہ زمینیں مدت سے لاپروائی اور سنچائی کے نظام کی ابتری کی شکار تھیں۔ دریا میں طغیانی آتی تو ان میں پانی بھر جاتا اور پھر نکاسی کا کوئی راستہ نہیں ہوتا تھا۔ حضرت معاویہؓ کو حالات سے آگاہی ہوئی تو

حکم فرمایا کہ ان میں باندھ بنائے جائیں، کہ دریا کا پانی ان میں نہ آسکے اور وہ قابل زراعت ہوسکیں۔

دجلہ وفرات کے درمیان بہت سے لق ودق وسیع نشیبی علاقے تھے۔ بارش کے موسم میں پانی بڑھتا تو نہروں نالوں کے ذریعہ چڑھ آتا۔ پھر نشیبی ہونے کی وجہ سے یہاں پانی بھرا رہتا تھا، اس لیے مدت سے یہ علاقہ غیر مزروعہ چلا آرہا تھا۔ یہ زمینیں بطائح کہلاتی تھیں۔ حضرت معاویہؓ کے دور میں اقتصادی ترقیات کے جو کام ہوئے ان میں اس علاقے کو قابل کاشت بنا کر ان کو زراعتی ترقی کے لیے استعمال کرنے کا منصوبہ اہم حیثیت رکھتا ہے۔

'بطائح' کا یہ منصوبہ ایک غیر معمولی حد تک بڑا پروجیکٹ تھا۔ حضرت معاویہؓ نے عبداللہ بن دراج کو حکم دیا کہ اس علاقے میں زراعت ممکن بنانے کے لیے باندھ اور ڈیم بنائے جائیں، چنانچہ نہایت کثرت سے ایسے ڈیم بنائے گئے جن سے جب ضرورت ہوتی پانی کھولا جاسکے اور جب ضرورت نہ ہو بند رہے۔ پانی کی نکاسی کے لیے نالے صاف کروائے اور جنگلات کاٹے گئے۔ زمینوں کے نشیبی ہونے کی وجہ سے یہ کام بہت فنی مہارت اور مصارف کا محتاج تھا۔ جب یہ صاف ہوگئیں تو جاگیروں میں دے دی گئیں۔ حکومت کو ان کے خراج سے کثیر آمدنی ہوتی تھی۔ حضرت معاویہؓ کے دور میں خاص ان زمینوں (یعنی کوفہ کی بطائح) کی سالانہ خراج کی آمدنی پچاس لاکھ درہم تھی۔ یوں تو خراج کی آمدنی پر پہلا حق اس صوبائی حکومت کا ہوتا تھا، مگر صوافی کی آمدنی خالص مرکزی حکومت کا حق تھی۔ (فتوح البلدان: ۲۸۷، تاریخ یعقوبی: ۲/۲۱۸)۔

اسی طرح پورے ملک کے نظام کو منضبط کیا گیا۔ تمام اطراف کے ممالک میں بیکار زمینوں کو آباد کیا گیا۔ بصرہ کے پاس دجلہ کئی دھاروں میں بٹ جاتا ہے، یہ علاقہ شط العرب کہلاتا ہے، یہاں بھی بطائح کی طرح کے نشیبی علاقے تھے، چنانچہ امیر المومنینؓ نے یہاں بھی بصرہ کے افسر مالیات عبدالرحمان بن ابی بکرہ سے وہی کارروائی کروائی جو عبداللہ بن دراج سے کروائی تھی [۱]۔

عراق کے علاوہ شام میں بھی ایسی کافی افتادہ زمینیں تھیں۔ حضرت معاویہؓ نے حضرت عثمان کو لکھا تھا کہ حکومت کے مہمانوں کا بوجھ مجھ پر ہے۔ علاقائی افسران اور حکومتی کارندے مسلسل آتے رہتے ہیں۔ ان کے علاوہ رومیوں کے وفدوں کی ضیافت بھی میرے ہی ذمہ ہے۔ جو تنخواہ ملتی ہے وہ ان تمام ضروریات کے لیے کافی نہیں

---

[۱] تاریخ دمشق: ۲/۲۰۶۔ شیعہ مورخ یعقوبی نے ان واقعات کو اس تحریف کے ساتھ بیان کیا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے ان بڑی بڑی جائیدادوں کو اپنی ذاتی ملکیت میں لے لیا تھا (تاریخ یعقوبی: ۲/۲۱۸)۔ تمام مصادر میں موجود تاریخی شواہد اس بیان کی کھلی تکذیب کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو ڈاکٹر خزنہ کتبی کی تحقیقی تصنیف الخراج منذ الفتح الاسلامی حتیٰ اواخر القرن الثالث الھجری: ۳۰۷-۳۱۱۔

ہے۔ یہاں کچھ ایسی غیر مزروعہ اراضی ہیں، جو نہ خراج کی ہیں اور نہ اہل ذمہ کی ملکیت ہیں۔ اگر یہ مجھے مل جائیں تو کام میں سہولت ہو۔ حضرت عثمان نے یہ زمین حضرت معاویہؓ کو دے دی۔ جب حضرت معاویہؓ خلیفہ بن گئے تب بھی ان کی آمدنی کا یہی مصرف رہا۔ مگر حضرت معاویہؓ کی احتیاط کا یہ حال تھا کہ بعد میں ان زمینوں کو اپنے خاندان کے ضرورت مندوں اور مسلمانوں کے غرباء کے لیے وقف فرما دیا (تاریخ دمشق: ۲۰۶/۲)۔

صوبہ شام کی برکتیں:

شام کا ملک انتظامی طور پر دمشق، حمص، اردن اور فلسطین کے اجناد (صوبوں) پر مشتمل تھا۔ جس میں سے اکیلے دمشق کے بارے میں آتا ہے کہ یہاں حکومتی وزراء وافسران، فوج، علماء وفقہاء، عدلیہ کے عملے اور مؤذنوں وغیرہ کی تنخواہ دینے کے بعد ٦ لاکھ دینار طلائی بچ جاتے تھے، جو مرکزی خزانہ میں جمع ہوتے تھے۔ ان کا مملکت کے عام مصارف میں استعمال ہوتا تھا۔ مورخ ابن عساکر کہتے ہیں کہ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ دمشق کی آمدنی کتنی زیادہ تھی اور اللہ نے اس صوبہ کو کتنی برکات سے نوازا تھا (تاریخ دمشق: ۱/ ۲۵۳)۔

آمدنی میں اضافے کی تدبیریں:

مملکت کی ضرورتیں بے حساب تھیں، جہاد کے متعدد محاذ سرگرم تھے، جن کو لگاتار رسد اور کمک کی ضرورت رہتی، رفاہ عام اور پبلک ورکس کی مد میں بھی اخراجات روز افزوں تھے۔ اور امیر المومنینؓ کی حوصلہ مند طبیعت اسلام کے عروج کی کسی منزل پر دم لینے یا کسی مقام پر قناعت کرنے پر تیار نہ تھی۔ ان ضروریات کے لیے مالی انتظامات کا چیلنج تھا۔ چنانچہ مملکت کی آمدنی میں اضافے کی فکر فرمائی۔ سب سے بڑا ذریعۂ آمدنی خراج کی مد تھی۔ عہد فاروقی وعثمانی میں فتوحات بڑی سرعت کے ساتھ ہوئی تھیں، گرچہ زمینوں کی نپائی اور تحصیل کا نظام بڑی باریک بینی سے انجام پایا تھا لیکن پھر بھی کافی زمینیں اندراج سے رہ گئی تھیں۔ اس لیے حضرت معاویہؓ نے اقالیم میں قابل افسران کو مقرر فرمایا۔ اپنے ایک خاص نہایت مدبر افسر عبداللہ بن دراج کو دمشق سے کوفہ بھیجا اور حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کے ماتحت ان کو مالیات کا قلم دان سپرد کیا۔ پھر جب گورنر جنرل زیاد کو کوفہ وبصرہ دونوں کی امارت سپرد کی تو عبداللہ بن دراج کے زیر نگرانی سارے عراق کی زمینوں کی از سر نو نپائی کروائی گئی۔ ایک ایک کھیت کا اندراج درست کیا گیا۔ بہت ساری زمینیں نئی درج رجسٹر کی گئیں۔ اس طرح تحصیل کے نظام کو ایسا چست ودرست کیا کہ اقلیم عراق کے سب دینی، رفاہی، تمدنی اور دفاعی اخراجات پورے ہونے لگے۔ (فتوح البلدان: ۳۴۰، طبری: ۵/ ۲۰۴)۔ جو کمی ہوتی وہ مرکزی حکومت کے بجٹ سے حضرت معاویہ ادا کیا کرتے۔

ترقی زراعت:

حضرت معاویہؓ کے عہد میں زراعت میں غیر معمولی ترقی ہوئی، اس ترقی کا بڑا حصہ صوافی اور مردہ و بنجر زمینوں کو آباد و قابل کاشت بنانے سے انجام پایا تھا۔ حکومت نے دریاؤں کے باندھوں کی تعمیر اور پانی کی نکاسی کے انتظام کے ذریعہ اس کام میں حصہ لیا۔ لیکن ان زمینوں تک پانی پہنچانا اور ان کی اصلاح کے کام کے لیے بڑے سرمائے کی ضرورت تھی۔ فتوحات کی وسعت اور عطایا کی کثرت سے مسلمانوں خصوصا اہل شرف کے پاس اب مال کی کثرت تھی، اس لیے ایسے مالداروں ہی کو یہ زمینیں دی گئیں جو ان کو قابل کاشت بنا سکیں (التطور الاقتصادی: ۱۵۳)۔ ابھی ہم نے صوافی پر گفتگو کے ذیل میں جو کچھ لکھا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کتنے بڑے پیمانے پر زرعی ترقی ہو رہی تھی۔ عرب زراعت کے فن سے نا آشنا تھے، لہٰذا انہوں نے ایران اور مصر وغیرہ سے آلات درآمد کیے اور اور فن زراعت کے جاننے والوں کو بلوایا اور ان سے مدد لی (معاویہ: ۲۹۸)۔

زمینوں کی تقسیم یا ان کا نیشنلائزیشن:

اس ترقی و توسیع میں بڑا حصہ غیر مملوکہ زمینوں کی تقسیم کا تھا۔ حکومت نے بطائح کی وسیع و عریض آراضی بلکہ علاقے میں سے، جو صوافی کے طور پر مرکزی حکومت کے لیے خاص کی گئی زمینیں تھیں، لوگوں کو دے دیں۔ ان زمینوں کی وسعت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہر زمین کے لیے الگ مستقل نہر ہوتی تھی۔ حضرت معاویہؓ نے اصول طے کیا تھا کہ کسی کو اگر زمین دی جاتی تھی، تو اس کو دو سال تک دیکھا جاتا تھا، اگر اس نے زمین کی اصلاح کر کے کھیتی شروع نہیں کی تو زمین واپس لے لی جاتی تھی اور کسی اور کو دے دی جاتی تھی۔ (فتوح البلدان: ۳۵۲)۔ حضرت معاویہؓ اپنے اس اصول کے لیے سند کے طور پر بھی حضرت عمرؓ کے طرز عمل کو ہی پیش کرتے تھے کہ اگر کسی کو کوئی زمین دی جاتی تھی، وہ اس کی طرف توجہ نہیں کرتا تھا اور کوئی دوسرا آ کر اس میں کھیتی کرنے لگتا تھا تو حضرت عمرؓ اسی کھیتی کرنے والے کے نام وہ زمین لکھ دیتے تھے (انساب الاشراف: ۵/ ۱۳۲، ۱۳۳)۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان زمینوں کو قومی ملکیت میں لیا گیا تھا کسی کو ذاتی ملکیت میں نہیں دی گئی تھیں۔ کھیتی کرنے کے لیے ایک طرح سے عارضی طور پر زمینیں دی جاتی تھیں، جو حکومت واپس بھی لے لیتی تھی۔ اس کی دلیل یہ بھی ہے کہ حضرت معاویہؓ نے جن لوگوں کو یہ زمینیں دی تھیں، سالوں تک انہوں نے ان پر کھیتی کی، پھر کسی وقت ان کے باندھ ٹوٹ گئے تو ان میں پانی بھر گیا اور کھیتی بند ہو گئی۔ ولید بن عبد الملک کے دور میں حجاج نے انہی زمینوں کو دوسرے لوگوں کو کھیتی کے لیے دے دیا اور پچھلے مالکوں نے کوئی دعویٰ نہیں کیا کہ یہ تو ہماری جاگیر ہیں (فتوح البلدان: ۲۸۴)۔ علماء یہی کہتے ہیں کہ خلافت راشدہ کے دور سے ہی یہ طریقہ چلا آ رہا تھا کہ یہ زمینیں جن

کے حوالے کی جاتی تھیں، ان کو مالک نہیں بنایا جاتا تھا بلکہ خراج حاصل کرنے کے لیے استعمال کے لیے یا (گویا) کرائے پر دیا جاتا تھا (''اقطاع استغلال یا اقطاع اجارۃ لا اقطاع تملیك'' الاحکام السلطانیۃ: ۲۸۸) اسی طرح یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں کو زمینیں دی جاتی تھیں، اپنی زمینوں تک دریا کا پانی لانے کے لیے وہی نہریں کھدواتے تھے۔ بلاذری نے بصرہ کے سلسلے میں کثرت سے لکھا ہے کہ جن لوگوں کو زمینیں دی جاتیں وہی نہروں کے ذریعہ وہاں تک پانی لانے کا انتظام کرتے تھے (فتوح البلدان: ۳۵۱۔۳۵۵)۔

یہ ضرور ہے کہ اس دور میں جن لوگوں کو جاگیریں دی گئیں ان میں بنی امیہ کے خاندان کے رؤساء بھی تھے۔ لیکن ایسا نہیں تھا کہ صرف انہی کو دی گئی ہوں۔ بلکہ اکثر دوسروں یعنی قریش اور دیگر عرب کے بڑے بڑے سرداروں اور اشراف کو جاگیریں دی جاتی تھیں [۱]۔ بنو امیہ جاہلیت کے زمانے سے قریش کے سب سے بڑے مال دار تاجر تھے۔ حضرت عثمانؓ کی غیر معمولی ثروت اس کی ایک مثال ہے۔ عام لوگوں کے بجائے سرداروں کو جاگیریں دینے کا سبب یہ تھا کہ ان زمینوں کو قابل کاشت بنانے میں بڑا مالی صرفہ درکار ہوتا تھا۔ لیکن بایں ہمہ عام لوگوں کو بھی ۶۰ سے ۱۰۰ جریب تک کے چھوٹے کھیت دیے جاتے تھے (التطور الاقتصادی: ۱۵۸)۔

یعقوبی کی کتاب اپنے طرز تصنیف، مرتب بیانیہ اور کثرت معلومات کے لحاظ سے بہت اچھی کتاب ہے۔ لیکن ان کے بارے میں اتفاق ہے کہ وہ شیعیت زدہ بدگمان مورخ ہیں [۲]، انہوں نے یہاں سخت غلط بیانی کی ہے۔ ان کا بے سند و دلیل بیان ہے کہ یہ زمینیں حضرت معاویہؓ نے اپنی ذاتی ملکیت میں لے لیں۔ اور ان کو اپنے خاندان میں بانٹ دیا۔ یہ یعقوبی کا تنہا بیان ہے، ان کے علاوہ کوئی مورخ یہ بیان نہیں کرتا۔ بداندیش و بدگمان راویوں نے ایسے ہی افواہوں کو تاریخ بنا دیا ہے۔ اور پھر غیر محقق مصنفوں نے انہی سے حضرت معاویہ پر مملکت کے مالی وسائل میں ناجائز تصرفات کا الزام تراشا۔ اور بڑے فخرِ ناداں سے، اپنے ہاتھ خود، اپنی تاریخ کی روسیاہی کا انتظام کیا ہے۔

مرکز اور صوبہ جات میں آمدنی کی تقسیم:

حضرت عمرؓ نے یہ اصول طے فرمایا تھا کہ حکومت کو خراج و جزیہ جیسی مدوں سے جو آمدنی ہو وہ اسی اقلیم (صوبہ) [۳] کی ضروریات و مصالح میں تقسیم ہوگی۔ اگر ان میں صرف ہونے کے بعد کچھ بچ جائے تو وہ مرکزی

۱۔ فتوح البلدان: ۳۴۷ وما بعد، تاریخ دمشق: ۲/۲۰۶۔

۲۔ شیعہ علماء ان کو اپنا ہم مسلک تسلیم کرتے ہیں: ملاحظہ ہو، اعیان الشیعہ محسن عاملی: ۳/۲۰۲۔

۳۔ اس دور کے انتظامی صوبوں کو قلمرو کی وسعت کی بنا پر اقلیم کہنا درست معلوم ہوتا ہے، مثلاً بصرہ کے تحت موجودہ ایران وافغانستان سے لے کر ازبکستان وتاجکستان وغیرہ تک کے ممالک آتے تھے۔

حکومت کو بھیج دی جائے گی۔ حضرت معاویہؓ نے اسی اصول کے مطابق کام کیا۔ بلکہ اقلیمی مرکز کے تحت جو حکمران ماتحت علاقوں کے ہوتے تھے، وہ اپنے علاقے کے ٹیکس کو عموماً اپنے خطہ کی ضروریات میں خرچ کرتے تھے اور اگر کچھ بچتا تو اپنے اقلیمی گورنر جنرل کو بھیج دیتے، کم پڑتا تو گورنر جنرل مدد کرتا۔ اور اگر کسی اقلیم کے اخراجات وضروریات آمدنی سے زیادہ ہوتے تو حضرت معاویہؓ مرکز سے مدد کرتے تھے[۱]۔

بصرہ سے جو آمدنی ہوتی تھی وہ چھ کروڑ تھی، جس میں سے فوج کی تنخواہ میں تین کروڑ ساٹھ لاکھ جاتے تھے۔ ایک کروڑ ساٹھ لاکھ عورتوں بچوں کے وظیفوں میں خرچ ہوتے تھے۔ کارکنوں کی تنخواہ اور حکومت کے دیگر انتظامی امور کے لیے ۲۰ لاکھ کا بجٹ تھا۔ اسی طرح بیس لاکھ حوادث اور ناگہانی ضروریات کے لیے مختص کیے جاتے تھے۔ اور باقی ۴۰ لاکھ مرکزی بیت المال کے لیے بھیج دیے جاتے تھے۔ کوفہ سے کل آمدنی چار کروڑ درہم ہوتی تھی۔ جس میں سے ۲۶ لاکھ ۶۶ ہزار مرکز کو ارسال کر دیے جاتے تھے۔ (انساب الاشراف: ۵/ ۲۱۸، ۲۱۹) مصر سے ایک سال (حضرت مسلمہ بن مخلدؓ کے دور امارت میں) تمام اخراجات کے لیے بجٹ مختص کیا گیا، ۶ لاکھ دینار آمدنی میں سے بچ گئے، جو مصر سے مرکز کو بھیجے گئے (خطط مصر للمقریزی: ۱/ ۱۴۹)۔

ترقی تجارت:

شام مشرق میں چین اور ہند اور مغرب میں یورپ کے درمیان واقع تھا۔ اس جائے وقوع کی بدولت اس نے خصوصاً دمشق نے ایک بین الاقوامی تجارتی مرکز کی حیثیت سے بے حد ترقی کی۔ یہاں کے بازار طرح طرح کی مصنوعات اور درآمدات سے بھرے رہتے تھے۔ تمام عالم کا مال یہاں آتا اور برآمد ہوتا تھا۔ حضرت معاویہ نے تاجروں کے مفاد اور ترقی تجارت کو خاص توجہ دی۔ ان تاجروں میں بنو امیہ کے کافی افراد شامل تھے۔ عہد عثمانی میں خود حضرت معاویہؓ کے تجارتی قافلے اندرون عرب مال لے کر آتے جاتے رہتے تھے[۲]۔ غریب عوام کی سہولت کے لیے حکومت ہر ممکن تدبیر اختیار کرتی اور آمد و رسد کو مناسب سطح پر رکھنے کے لیے سعی و تدبیر کرتی۔ جب بازار میں مال کی قلت کی وجہ سے نرخ بڑھ جاتے اور عوام پر بوجھ پڑتا تو حکومت تاجروں کو قرض دیتی کہ نیا سستا مال لائیں تاکہ بازار میں قیمتیں معمول پر رہیں۔ (انساب الاشراف: ۵/ ۲۳۷)۔

ڈاکٹر صلابی لکھتے ہیں:

> اموی ریاست کا محل وقوع ایک طرف مشرق بعید کے ممالک جیسے چین، ہندوستان، اور دوسری طرف بازنطینی ریاست کے درمیان تھا، اور اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ اس کے سرگرم تجارتی تعلقات ان

۱۔ دیوان الجند: ۱۴۹، خطط مصر للمقریزی: ۱/ ۱۷۶۔

۲۔ معاویہ للصلابی: ۳۰۳ بحوالہ التطور الاقتصادی فی بلاد الشام فی العہد الاموی: ۱۶۸۔ ۱۷۲۔

دونوں جہتوں سے قائم تھے۔حضرت معاویہ کے خلافت پر فائز ہونے کے بعد حالات مستحکم ہوئے اور داخلی تجارت کی نقل وحرکت شروع ہوئی اور یہ پہلے کی طرح پروان چڑھی۔انہوں نے تاجروں کے مفادات کا خیال رکھا اور تجارت کے دائرے کو بڑھانے کے لیے کام کیا۔۔۔ شام کے لوگ تجارت میں ممتاز تھے۔انہوں نے مغربی یورپ کے ساتھ تجارتی تعلقات قائم کیے۔اس سلسلے میں انہوں نے مملکت کے بحری بیڑے سے استفادہ کیا۔تاجر بڑی بڑی کمپنیاں قائم کر کے تجارت کیا کرتے تھے اور ان کا مال مشرق ومغرب کے ملکوں سے آتا اور جاتا تھا۔

اس طرح دمشق اموی خلافت کا دارالحکومت اور بین الاقوامی تجارت کا مرکز بن گیا۔اس نے دنیا کے اقتصادی نظام پر اثر ڈالا اور تجارت کے طور طریقے اور سمتیں پہلے سے بدل دیں۔پہلے مشرقی سامان سے لدے قافلے شام کے شمالی ساحل پر براہ راست انطاکیہ آتے اور وہاں سے بحری راستوں سے یورپ جاتے تھے۔اب سارا مال دمشق کے مرکز سے درآمد وبرآمد ہوتا تھا۔اس طرح دمشق کی تجارت کی اہمیت بڑھ گئی،دنیا کی تمام مہنگی اشیاء اور نفیس مصنوعات دمشق کے بازار میں دستیاب تھیں۔ یاقوت حموی نے لکھا ہے کہ دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں کہ دمشق میں نہ ملتی ہو(معاویہ:۳۰۴)۔

مصارف:

مملکت کی آمدنی کا بڑا حصہ دفاع،حکومت کے انتظامات مثلاً کارکنوں کی تنخواہ وغیرہ،رفاہ عامہ،تعلیم ودینی امور،امداد غرباء اور پبلک ورکس وغیرہ میں خرچ ہوتا تھا۔حکومت کے مصارف میں سب سے بڑا حصہ حسب معمول دفاع اور افواج کی تنخواہوں میں جاتا تھا۔حکومت کا اولین فرض دشمنوں کا مقابلہ اور اسلام کی حفاظت تھا۔اس لیے مالیاتی پالیسی میں بھی اسی شعبے کو ترجیح حاصل تھی۔ان اخراجات کی کچھ تفصیل ہم نے دفاعی نظام کے تحت ذکر کی ہے۔

عوام کو حق تھا کہ مالیات میں حکومت کا برملا محاسبہ کریں:

مالیات کا نظام شفاف تھا۔حضرت معاویہؓ کی حکومت اپنے اخراجات میں عوام کے سامنے جواب دہ تھی۔ نہ صرف جواب دہ بلکہ آمد وخرچ کے سلسلے میں حضرت امیر المومنینؓ اس کی ہمت افزائی کرتے تھے کہ لوگ ان پر نظر رکھیں اور مطلق العنانی کا موقع نہ دیں۔کسی قابل اشکال بات پر کوئی اعتراض نہ کرتا تو فکر مند ہوتے کہ یہ بری علامت اور خطرے کی نشانی ہے۔کوئی بے دریغ محاسبہ کرتا تو خوش ہوتے،اطمینان ظاہر کرتے اور دعا دیتے۔

محدثین نے صحیح سند سے روایت کیا ہے کہ ایک مرتبہ جمعہ کے خطبہ میں کہا کہ ہم اس مال کے مختارِ کل ہیں، جس کو چاہیں دیں،جس کو چاہیں نہ دیں۔کسی نے کچھ نہیں کہا،لوگ خاموش رہے۔اسی طرح حضرت معاویہؓ نے لگاتار تین ہفتوں تک خطبہ میں یہ بات کہی۔ابو بحریہ عبداللہ بن قیس سکونی ایک بڑے عابد وزاہد عالم اور مشہور بے

نیاز وحق گو بزرگ تھے، حضرت معاویہؓ ان کا بڑا اکرام کرتے تھے [۱]۔ تیسری مرتبہ پر کھڑے ہوگئے اور کہا:

ہرگز نہیں۔ آپ غلط کہہ رہے ہیں؟ حکومت کا مال عوام کا ہوتا ہے۔ جو ہم کو ہمارا مال نہیں دے گا، ہم اس سے زبردستی چھین لیں گے۔

حضرت معاویہ بہت خوش ہوئے۔ اس جرأت مند تنقید پر ابو بحریہ کی بہت تعریف کی۔ اور کہا کہ میں تین ہفتوں سے منتظر تھا کہ کوئی مجھ کو ٹوکتا ہے کہ نہیں؟ اس لیے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے کہ کچھ لوگ ایسے ہوں گے جن کی غلط باتوں کی کوئی تردید نہیں کر سکے گا، ایسے حکام کا انجام جہنم ہے۔ میں اسی کا اندازہ کرنا چاہتا تھا۔ جب کسی نے میری تردید نہیں کی تو مجھے ڈر ہوا کہ کہیں میں ایسے حکام میں سے نہ ہوں۔ (**إن هذا أحياني أحياه الله**) اس شخص نے مجھ پر احسان کیا ہے اللہ اس پر احسان کرے [۲]۔

امام احمد نے صحیح سند سے روایت کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت معاویہؓ ممبر پر آکر بیٹھے۔ ابو مسلم خولانی نے نصیحت کرتے ہوئے کہا:

ایک دن آپ کو قبر میں جانا ہے۔ اور وہاں صرف اچھے اعمال ہی کام آئیں گے۔ آپ یہ خیال نہ کریں کہ خلافت کی حقیقت صرف بیت المال میں مال جمع کرنا اور لوگوں میں تقسیم کرنا ہے۔ بلکہ خلافت کی حقیقت ہے حق پر عمل، عدل وانصاف کی بات کرنا اور لوگوں کو اللہ کے راستے پر چلانا۔ معاویہ! کسی نہر کا اگر سرچشمہ صاف پانی دے تو راستے کے کسی وقتی گدلے پن سے کچھ نقصان نہیں۔ پھر سرچشمے سے صاف پانی آجائے گا۔ اور اس امت کا سرچشمہ آپ ہیں، آپ اگر حق پر قائم رہیں گے تو امت حق پر قائم رہے گی۔ اس لیے اپنی فکر کیجیے۔

حضرت معاویہؓ بالکل ساکت، ان کی نصیحت بغور سنتے رہے۔ جب وہ خاموش ہوئے تو حضرت معاویہؓ نے ان کو دعا دی: **یرحمك الله، یرحمك الله**۔ اللہ آپ پر رحمت کرے۔ اللہ آپ پر رحمت کرے [۳]۔

ایک مرتبہ دمشق میں کارپردازوں اور افواج کی تنخواہیں بٹنے میں تاخیر ہوگئی۔ حضرت ابو مسلم خولانیؒ نے برملا ٹوکا اور کہا: یہ مال نہ تمہارا ہے نہ تمہارے باپ ماں کا۔ حضرت معاویہ اپنے دفتر تشریف لے گئے۔ اور تنخواہوں کی تقسیم کا حکم دے کر واپس آئے اور کہا: ابو مسلم نے صحیح کہا۔ یہ مال نہ میرا ہے نہ میرے ماں باپ کا۔ لوگو! جاؤ، اپنی تنخواہیں لے لو۔ اللہ تم کو اپنی برکتوں سے نوازے (تاریخ دمشق: ۵۹/ ۱۶۹)۔

۱۔ تاریخ دمشق: ۵۹/ ۱۶۹، تہذیب الکمال: ۱۵/ ۴۵۸۔

۲۔ معجم کبیر طبرانی: ۱۹/ ۳۹۳، مسند ابویعلی: ۱۳/ ۳۷۳، حافظ ابن حجر ہیثمی نے اس کی تمام راویوں کو ثقہ قرار دیا ہے۔ مجمع الزوائد: ۵/ ۲۳۶، ذہبی اس کو حسن حدیث قرار دیتے ہیں، تاریخ الاسلام: ۴/ ۳۱۴۔

۳۔ **الزهد لاحمد بن حنبل: ۳۱۷، بسند صحيح۔ الراوی یونس الهرم هو یونس بن ميسرة بن حلبس۔**

عُمّال کا مالیات میں شریعت کی پابندی اور احتیاط کرنا:

ماتحت حکام شریعت کی پابندی میں پوری احتیاط برتتے تھے۔ یہاں تک کہ ایسا بھی ہوا کہ حضرت معاویہؓ نے کسی تصرف کو جائز سمجھا، لیکن ذیلی عامل یا افسر کے نزدیک وہ جائز نہیں تھا تو بھی وہ عمّال پر اپنی رائے کے مطابق عمل کرنے کا اصرار نہیں کرتے تھے بلکہ ان کو اپنی رائے پر عمل کرنے دیتے تھے۔ شرعی اصول یہ ہے کہ کوئی علاقہ اگر جنگ کر کے (عنوۃً) فتح ہوا ہے تو اس پر جزیے کی رقم میں اضافہ ہوسکتا ہے اور اگر صلح کر کے لوگوں نے اطاعت قبول کی ہے تو جس رقم پر معاہدہ ہوا ہے، اس میں کوئی اضافہ نہیں ہوسکتا۔ مصر کا کچھ علاقہ عنوۃً فتح ہوا تھا کچھ صلحاً، لہٰذا قدیم دور سے اختلاف تھا کہ اس کو کس دائرے میں رکھا جائے۔ حضرت معاویہؓ اس کو عنوۃً فتح شدہ ملک مانتے تھے اور نتیجۃً اس کے جزیے میں اضافے کی گنجائش مانتے تھے۔ لہٰذا مصر کے وزیر مالیات وردان کو لکھا کہ ہر شخص پر ایک قیراط (یعنی دینار کا چوبیسویں حصے کا سالانہ اضافہ کر دیا جائے) وردان نے صاف جواب دیا یہ کیسے ممکن ہے؟ ان سے معاہدہ ہوا تھا کہ جزیے کی رقم نہیں بڑھائی جائے گی؟ (الاموال: ۱۹۱)۔ بس، پھر حضرت معاویہ نے اپنی رائے پر اصرار نہیں کیا۔

حضرت حکم غفاریؓ اور حضرت معاویہؓ کی رائے کا اختلاف:

جبل اسل کی فتح میں حکومت کے خزانے سے کافی سیم وزر اور نقدی غنیمت کے طور پر ملی تھی۔ یہاں مرو کے مرکز سے جہاد کے لیے افواج گئی تھیں۔ حضرت معاویہؓ کو ہر طرف افواج کی پیش قدمیوں اور فتوحات کی خبریں دی جاتی تھیں۔ فتح کی خبر آئی تو انہوں نے مرکز بصرہ کے گورنر جنرل زیاد (جن کی کمانڈ میں مرو کا فوجی مرکز تھا) کے ذریعے حکم بھیجا کہ نقدی اور سونا چاندی مرکزی بیت المال کے لیے لے لیے جائیں، مجاہدین میں تقسیم نہ کیے جائیں۔ مگر وہاں کے مقامی امیر حضرت حکم غفاری کے نزدیک یہ شرعی قانون کے خلاف تھا۔ انہوں نے زیاد کو پوری آزادی سے جواب لکھا کہ قرآن نے حکم دیا ہے کہ مال غنیمت کے پانچ میں سے چار حصے مجاہدین میں تقسیم کر دیے جائیں (الانفال: ۴۱)۔ قرآن کا حکم امیر المومنین کے حکم سے نہیں بدلا جاسکتا۔ اور مال غنیمت اپنی رائے کے مطابق تقسیم کر دیا[1]۔

اگرچہ حضرت معاویہؓ کا حکم بھی شریعت کے خلاف نہیں تھا۔ اصل میں مال غنیمت کی معروف تقسیم (یعنی یہ کہ اس کے چار حصے مجاہدین میں تقسیم کر دیے جائیں، قرآن وسنت کے واضح دلائل بتاتے ہیں کہ) ہمیشہ لازمی نہیں ہے، بلکہ یہ حکومت کی صواب دید پر منحصر ہے، قرآن میں ہے کہ غنیمت کا مال اللہ اور اس کے رسول کا ہے۔

---

[1] المعرفۃ والتاریخ: ۳/ ۲۵ بسند صحیح، نیز تاریخ طبری: ۵/ ۲۵۱ بسند ضعیف، البدایہ والنہایۃ: ۸/ ۳۲، ۳۳۔

"قل الانفال للہ والرسول" (سورہ انفال:۱)۔سنت بھی یہی کہتی ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہوازن کے مال غنیمت کو اسی طرح حکومت کی ملکیت میں لے لیا تھا، پھر صرف مؤلفۃ القلوب نومسلموں میں تقسیم کر دیا تھا، جو شریکِ جہاد نہیں تھے، اور مجاہدین کو اس میں سے کچھ نہیں دیا۔(اس کے علاوہ بھی عہد نبوی میں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ہماری کتاب "جہاد کیا ہے؟ کا مال غنیمت سے متعلق باب)۔حضرت معاویہؓ بھی اسی طرح اس مال کو حکومت کے دیگر کاموں میں استعمال کرنا چاہتے تھے جو سنت نبوی کے عین مطابق عمل تھا۔

ایک افسوسناک مغالطہ:

اس واقعہ میں کچھ بھی قابل اعتراض نہیں تھا۔ بلکہ جو تھا وہ قابل ستائش ہی تھا۔حضرت معاویہؓ نے اس مال کو مرکزی بیت المال کے لیے لینا چاہا تھا، قرآن وسنت کی رو سے اس کا پورا جواز تھا۔مگر خلافت وملوکیت کے مرحوم مصنف نے اس کو اس صورت میں نقل کیا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے مال غنیمت میں سے یہ سونا چاندی اپنی ذات کے لیے لینے کا حکم دیا۔اور اس طرح مجاہدین کا مال خود کھانا چاہا۔تحریر فرماتے ہیں:

> مال غنیمت کے سلسلے میں بھی حضرت معاویہؓ نے کتاب اللہ وسنت رسول اللہؐ کے صریح احکام کی خلاف ورزی کی۔کتاب وسنت کی رو سے پورے مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ بیت المال میں داخل ہونا چاہیے اور باقی چار حصے اس فوج میں تقسیم کیے جانے چاہئیں جو لڑائی میں شریک ہوئی ہو۔لیکن حضرت معاویہؓ نے حکم دیا کہ مال غنیمت میں سے سونا چاندی ان کے لیے الگ نکال لیا جائے، پھر باقی مال شرعی قاعدے کے مطابق تقسیم کیا جائے (خلافت وملوکیت:۱۷۵)۔

(۱) اس عبارت کو جو بھی پڑھے گا یہی سمجھے گا کہ حضرت معاویہؓ نے مال غنیمت میں سے سارا سونا اور چاندی (جس میں کسی حکومت کا کل نقد خزانہ بھی شامل ہوتا تھا) اپنی ذات کے لیے نکال لیے جانے کا حکم دیا تھا۔اور اس طرح وہ مال غنیمت کے ایک بہت بڑے حصے پر ناجائز قابض ہو گئے تھے۔ یہ تاریخی نصوص کی صریح غلط فہمی ہے۔

(۲) بلکہ موصوف کی عبارت میں یہ صاف مغالطہ بھی پایا جاتا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے ایسا حکم صرف ایک جگہ (جبل الاسل) کے سلسلے میں نہیں دیا تھا بلکہ مستقل طور سے یہ حکم جاری کر دیا تھا۔ان کا ایک خالی الذہن قاری یہی سمجھے گا کہ حضرت معاویہ کے عہد میں یہی طریقہ جاری تھا اور اس استبدادی حکم اور (معاذ اللہ خیانت وظلم کے طریقے) پر مسلسل عمل ہوا کرتا تھا۔اور اس طرح حضرت معاویہؓ بے شمار دولت (معاذ اللہ) ہڑپ کر جاتے تھے۔

حالاں کہ صورت واقعہ اس کے بالکل خلاف تھی۔ مسلسل عمل تو کیا؟ تمام تاریخی مآخذ یہ بھی ذکر کرتے ہیں کہ حضرت معاویہؓ کے اس حکم پر خود اِس (جبل اسل کی فتح کے) موقعے پر بھی عمل نہیں ہوا۔

(۳) مآخذ میں جو تعبیر ''یُصطفیٰ له، کلّ صفراء وبیضاء'' استعمال ہوئی ہے، خلافت وملوکیت کے مصنف نے اس کے سمجھنے میں ٹھوکر کھائی ہے۔ اس لفظ کا مادہ وہی ہے جو صوافی کا ہے، جس کے معنیٰ حکومتی ملکیت کی جائیدادیں ہوتا ہے۔ خود حضرت حکم بن عمرو غفاریؓ نے (اس روایت کے مطابق) اس کی جو مخالفت شروع سے کی وہ اس بنیاد پر کی کہ یہ مال غنیمت کی تقسیم کے شرعی اصول کے خلاف ہے، انھوں نے یہ نہیں کہا کہ امیر المومنین اس کو ذاتی ملک میں لے کر خیانت اور ظلم کریں گے۔ بلکہ ان کے نزدیک غلط صرف یہ تھا کہ وہ جس طریقے کو تقسیم غنیمت کا شرعی قانون سمجھ رہے تھے، یہ اُس کے خلاف ہے۔

بہت سے مورخین نے یہ روایت نقل کی ہے اور کسی نے اس کو ذاتی ملک میں لینے کے معنیٰ میں نہیں سمجھا۔ یہاں تک کہ شیعہ مورخ ابن اعثم (وفات ۳۱۴ھ)[۱] نے بھی اس سے یہی سمجھا ہے اور اس کی صراحت کی ہے کہ حضرت معاویہؓ نے یہ مال بیت المال میں جمع کرنے کا حکم دیا تھا (الفتوح: ۳۱۵/۴)۔ مگر خلافت وملوکیت کے مصنف نے اس کو وہ رنگ دیا جو اس شیعہ مورخ نے بھی نہیں دیا تھا۔

(۴) اس واقعے کے لیے مصنف نے البدایہ والنہایہ کا بھی حوالہ دیا ہے۔ حال آں کہ البدایہ والنہایہ (۳۱/۸) میں یہ صراحت موجود ہے کہ حضرت معاویہؓ نے سونا اور چاندی مرکزی بیت المال میں جمع کرنے کا حکم دیا تھا، نہ کہ اپنے ذاتی ملک میں لینے کا ''یجمع کله من هذه الغنیمة لبیت المال''۔ اب ہماری حیرت کی انتہا نہیں رہتی کہ موصوف نے البدایہ والنہایہ سے واقعہ تو نقل کیا لیکن یہ صراحت کیوں نقل نہیں کی؟ اور اس روایت کو بالکل غلط معنی کیوں پہنائے؟ ہم سمجھنے سے قاصر ہیں کہ البدایہ والنہایہ کا حوالہ بھی دیا گیا اور اس کی اِس صراحت کو کس منشا سے اور کیوں حذف کر دیا گیا؟ ہم کیا باور کریں کہ حضرت معاویہ پر اس تہمت تراشی کا باعث اور منشا کیا ہے؟ اور مذکورہ کتاب میں اس طرح کے مغالطوں کا مقصد کیا ہے؟ ہم اس طرز فکر کی سوائے اس کے کیا توجیہ کریں کہ شیعی روایتوں کے غیر تحقیقی مطالعے نے ذہن وفکر پراگندہ کر رکھے ہیں؟

چوں کہ ہمارے علم کی حد تک برصغیر کے اہل سنت میں سے کسی نے حضرت معاویہؓ کے عمل وکردار پر ایسی سخت اور بے اصل تنقید نہیں کی ہے جیسی مذکورہ کتاب میں کی گئی ہے، اس لیے ہم بطور نمونہ دکھانا چاہتے ہیں کہ حضرت معاویہؓ سے بدگمان حضرات کس قدر مغالطوں کے شکار، بلکہ مغالطہ انگیزی سے کام لیتے ہیں۔ ہم موصوف کے بارے

[۱] جس کی کتاب میں شیعی روایات کثرت سے ہیں، آقا بزرگ طہرانی نے اپنی کتاب الذریعہ الیٰ تصانیف الشیعہ: ۲۲۰/۲ میں اس کو شیعی کتب میں شمار کیا ہے۔

میں کوئی بدگمانی نہیں کرتے، ہمارا خیال یہ ہے کہ صدیوں سے ہمارے یہاں بے اصل روایتوں کا پروپیگنڈا، بشکل طوفان، کچھ ایسا موجزن ہے، کہ بہت سے لوگوں کو پتہ ہی نہیں کہ وہ شیعیت کے مسموم اثرات کے کس قدر شکار ہیں۔

رفاہ عامہ (Social Security):

حضرت معاویہؓ نے ہر شعبۂ حکومت کو نہایت ترقی دی تھی۔ اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ سوشل سیکیورٹی یا تکافل اجتماعی (یعنی یہ کہ امراء کے مال میں فقراء کا حصہ ہو اور معاشرہ ان کی ضروریات کا تکفل کرے) کو نظام ریاست کا حصہ بنائے۔ حضرت معاویہ نے جہاں اسلامی ریاست کے تمام شعبوں کو بہت ترقی دی، وہیں رفاہ عامہ کے کاموں میں نہایت وسعت اور تنظیم کے اقدامات کیے۔ بہت سے ایسے کام کیے گئے جن کی ان سے پہلے کہیں نظیر نہیں ملتی۔ اُس وقت دنیا میں شاید ہی کہیں کسی نے راشن کارڈ کا نظام سوچا ہوگا۔ حضرت معاویہؓ کے دور میں مستحقین کے باقاعدہ کارڈ بنے ہوئے تھے۔ غلہ کی تقسیم کا ایک شعبہ قائم تھا۔ اس کے غلہ کے نہایت عظیم الشان اسٹور اور بڑے بڑے ڈپو ہوتے تھے۔ حکومت کی طرف سے ٹوکن بانٹے جاتے تھے، جن کو دے کر لوگ غلہ کی متعین مقدار حاصل کر لیتے تھے۔ مدینہ میں ''الجار'' نامی ساحلی مقام کے ڈپو سے غلہ آتا اور ٹوکن کے ذریعے تقسیم ہوتا۔

ایک مرتبہ غلہ کی تقسیم کے لیے ٹوکن دیے گئے کہ لوگ ان ٹوکنوں کو دے کر اپنے حصہ کا غلہ لے لیں۔ مگر کچھ لوگوں نے غلہ لینے کے بجائے، وہ ٹوکن بیچ کر اس میں لکھی مقدار کی قیمت وصول کر لی۔ اب خریدار وہ غلہ حاصل کر لے۔ شرعی اعتبار سے کسی چیز پر قبضہ حاصل کیے بغیر بیچنا منع ہے، صحیح طریقہ یہ ہے کہ مالک پہلے سامان کو اپنے قبضے میں لے، پھر بیچے۔ لوگوں کے اس عمل کی خبر حضرت زید بن ثابتؓ کو ہوئی، وہ اور ان کے ساتھ ایک اور صحابی (حضرت رافع بن خدیجؓ) گورنر مروانؒ کے پاس آئے اور کہا کیا آپ سودی کاروبار کی اجازت دے رہے ہیں؟ مروان کہنے لگے: میں اس سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں کہ ایسا گناہ کروں۔ ایسا کیا ہوا؟ ان دونوں نے ان کو بتایا کہ لوگ کیا کر رہے ہیں۔ مروان نے فوراً پولیس کے محکمہ کو متحرک کیا اور پتہ لگایا کہ کس کس نے اپنے ٹوکن بیچے ہیں اور ان کو واپس کروایا (موطا: ۲۳۶۰ بسند صحیح)۔ ہر غریب خاندان کو ایک کنٹل غلہ ماہانہ دیا جاتا تھا۔ بصرے میں ہر غریب خاندان کو ماہانہ دو جریب (تقریباً دو کنٹل) غلہ ملتا تھا (انساب الاشراف: ۵/۷/۲۳)۔

حکومتی کارکنوں کے اہل وعیال اور غرباء کے وظائف:

اسلام میں ریاست وحکومت کا مقصد وجود غرباء کی خبر گیری اور عوامی بہبود کو قرار دیا گیا ہے۔ حضرت معاویہؓ کی حکومت اس سلسلے میں بڑی مستعد تھی۔ عطایا کا جو نظام کام کرتا تھا اس میں بہت بڑے پیمانے پر

امدادی وظائف دیے جاتے تھے۔حکومتی کارکنوں،فوجیوں اور دیگر عملے کے اہل وعیال میں جو کمانے والے نہ ہوتے ان کو بھی سو درہم وظیفہ ملتا تھا۔بچوں کا بھی وظیفہ طے ہوتا تھا، جس کا آغاز دودھ چھوڑنے سے ہی ہوجاتا تھا۔حضرت معاویہؓ کے عہد میں اس کو مزید منظم کرنے کے لیے عیال اور بچوں کے وظائف کا الگ دیوان تیار کیا گیا (الاموال:۳۰۶)۔ہر کارکن کے خاندان کو ایک جریب (تقریباً ایک کنٹل) غلہ اور سو درہم کا وظیفہ ملتا تھا۔عید الفطر اور عید الاضحیٰ پر پچاس پچاس درہم ملتے تھے۔یہ امدادی وظائف ہر سال ذوالحجہ میں بانٹے جاتے۔

حکومت نہایت سخاوت وکشادہ دلی سے کام کرتی تھی۔بیت المال پر افواج کا پہلا حق تھا۔سالانہ بجٹ سے اگر کچھ رقم بچ جاتی تو وہ عوام میں تقسیم کردی جاتی۔ایک مرتبہ سالانہ اخراجات کے بعد بیت المال میں رقم بچ گئی،عطیہ بن قیس کہتے ہیں میں نے سنا کہ حضرت معاویہ خطبے میں ارشاد فرماتے ہیں کہ (دمشق کے) بیت المال میں اس مرتبہ اخراجات کے بعد پیسے بچ گئے ہیں، وہ میں تقسیم کررہا ہوں۔آئندہ اگر پھر فاضل ہوا تو تقسیم کیا جائے گا۔اور اگر نہیں تو زائد کی ہماری کوئی ذمہ داری نہیں۔اس لیے کہ یہ بیت المال ہمارا مال نہیں، اللہ کا مال ہے، جو مسلمانوں کا حق ہے (الاموال:۳۱۹)۔

نئے بسائے گئے شہروں اور مراکز حکومت مثلاً،کوفہ، بصرہ،فسطاط وغیرہ میں ہر قبیلہ کا علاقہ جدا ہوتا تھا۔حضرت معاویہ نے ہر قبیلہ پر ایک افسر خاص اس کام کے لیے مقرر کیا تھا کہ وہ اندرون عرب سے آکر نئے بسنے والوں اور نومولود بچوں کا دیوان میں اندراج کرائے اور ان کی تنخواہیں اور وظائف جاری کیے جائیں۔وہ افسر روزانہ صبح اپنے مفوضہ علاقے کا دورہ کرتا اور دیوان کے سکریٹری کو نئے لوگوں کے نام فراہم کرتا اور ان کے وظائف جاری کیے جاتے (خطط مصر للمقریزی:۱/۱۷۶)۔شام میں بھی اس کام کے لیے ایک افسر مقرر کیا گیا تھا، اس منصب کے افسر کو ''ابوالجیش'' کہا جاتا تھا۔وہ چوپالوں اور مجلسوں میں گھوم گھوم کر سروے کرتا اور عطایا و وظائف کے محکمے کو نو واردین اور نومولود بچوں کا ریکارڈ فراہم کرتا، تاکہ ان کے نام بھی تنخواہیں اور وظائف جاری کیے جائیں (البدایۃ والنہایۃ:۸/۱۴۳)۔

حاجت مندوں کی فکر:

دربار خلافت سے اعیان سلطنت اور سرداروں کو اس کی تاکید کی جاتی کہ وہ محتاجوں اور کمزوروں کی خود بھی فریاد رسی کریں اور آبرومند وعفیف لوگوں کے حالات حکمرانوں تک پہنچائیں۔ایک مرتبہ بڑی تعداد میں دمشق کے اشراف وکبار حاضر مجلس تھے۔امیر المؤمنین نے ارشاد فرمایا:تم حکام تک حالات اور ضروریات پہنچا سکتے ہو، اس میں کوتاہی نہ کرنا۔یہ تمہارا فرض منصبی ہے۔بتایا کرو کون کون کن پریشانیوں میں ہے، تاکہ حکومت

ان کی ضروریات پوری کرے۔ پھر لوگوں نے ضرورت مندوں کے حالات بتانے شروع کیے اور حضرت معاویہؓ فوری دادرسی فرماتے رہے (مروج الذہب: ۳۱/۳)۔

قحط میں خصوصی انتظامات:

جو لوگ حکومتی خدمات سے منسلک نہ ہونے کی وجہ سے تنخواہ دار نہیں تھے، ان پر بھی کوئی ناگہانی آجاتی تو بھی ان کی مدد حکومت کی ذمہ داری تھی۔ قدرتی آفتوں کے موقعہ پر ہنگامی انتظامات کیے جاتے۔ حکومت کے پاس وسائل کی قلت ہوتی تب بھی ہر طرح مصیبت زدگان کی دادرسی کی جاتی اور عوام سے مدد طلب کی جاتی۔ ایک مرتبہ عرب کے داخلی علاقوں میں سخت قحط پڑا۔ بدو اپنے اپنے دیہاتوں سے نکل کر عراق وغیرہ پہنچ گئے، جہاں ان کے رشتے دار خوش حال وخوش باش تھے۔ عراق میں زیاد نے لوگوں کو جمع کیا اور کہا کہ بڑی تعداد میں لوگ ہجرت کر کے آگئے ہیں۔ حکومت اتنا بوجھ نہیں اٹھا سکتی۔ کچھ تم لوگ حقِ قرابت ادا کرو اور کچھ حکومت انتظام کرے۔ ہر شخص یا تو اپنے رشتہ داروں کو اپنے ساتھ اپنے گھر میں مہمان بنائے، یا اپنی تنخواہ اور گھر والوں کے وظیفہ میں سے نصف چندہ دے، اور اتنا ہی حکومت اس میں ملا کر ان لوگوں کا انتظام کرے۔ کچھ لوگوں نے اپنے رشتے داروں کو مہمان بنالیا، حکومت نے باقی لوگوں کا عوام کی شرکت سے انتظام کیا۔ جن کا حکومت نے انتظام کیا ان کو سو درھم اور دو جریب غلہ دیا گیا۔ گورنر زیاد روزانہ ان پردیسیوں کی خبر گیری کے لیے ان کی قیام گاہ آتے، خدمات کا جائزہ لیتے اور حال دریافت کرتے۔ (انساب الاشراف: ۵/ ۲۱۸، ۲۱۹، ۷/ ۲۳)۔

رمضان اور عید کے خصوصی تحفے:

غرباء کے علاوہ عام لوگوں کو رمضان اور عید میں خصوصی تحفے تقسیم ہوتے تھے۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ سزا دینے میں بے جا شدت پسندی اور خوں ریزی نہ کرتے تو زیاد بہترین حاکم تھے۔ ہمارے یہاں بصرے میں رمضان سے پہلے غذائی اشیاء تقسیم ہوتی تھیں، لوگ رمضان کے لیے طرح طرح کی کھٹی اور میٹھی اعلیٰ درجہ کی اشیاء خوردنی سے گھر بھر لیتے۔ تنخواہوں کے بارے میں اہتمام تھا کہ ہر سال کے شروع میں مل جائیں۔ لہٰذا کبھی عاشوراء کے دن سے دیر نہیں ہوئی۔ (انساب الاشراف: ۵/ ۲۱۹)۔

خیانتوں کا سدباب:

حضرت معاویہؓ تاریخ انسانی کے ایک عبقری مدبر اور بیدار مغز حکمراں تھے۔ خلیفۂ عام بننے کے بعد ملک کے مالیاتی نظام کا بڑی باریکی سے جائزہ لیا۔ جہاں جو کمیاں یا نقائص تھے ان کے تدارک کے لیے نہایت اعلیٰ

قابلیت کے افراد مقرر کیے۔ حجاز کے مالی نظام میں بڑی خرابیاں آ گئی تھیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ وظائف اور تنخواہوں کی تقسیم میں درمیانی لوگ خیانتیں کرنے لگے تھے۔ صوبہ حجاز کا نظام یہ تھا کہ ہر قبیلہ کا ایک عریف (نمائندہ) طے تھا، وہی سب کی تنخواہیں لیتا اور تقسیم کرتا تھا۔ بعض عریف یہ حرکت کرتے کہ مرجانے والوں اور ہجرت کر جانے والوں کا دیوان میں کوئی اندراج نہیں کراتے تھے اور سب کی تنخواہیں اور وظائف لے جاتے تھے۔ اس سے خزانۂ عام کو نقصان اٹھانا پڑتا تھا۔ حضرت معاویہ نے عاصم بن ابی ہاشم بن عتبہ کو وہاں افسر خاص بنا کر بھیجا[۱]۔ ان کو ہدایت دی کہ پورا تحصیل و تقسیم کا نظام از سر نو مرتب کیا جائے۔ عریفوں کا نظام ختم کیا جائے۔ اور تقسیم کے لیے ایک الگ دفتر قائم کر کے ہر شخص کی تنخواہ یا وظیفہ اسی کو بلا کر اس کے ہاتھ میں دیا جائے۔ مکہ میں اس پر عمل کیا گیا تو عریفوں نے بڑا اعتراض کیا اور اپنے قبیلہ والوں سے بائیکاٹ کرا دیا۔ کچھ عرصے تک یہ تعطل قائم رہا۔ مکے کی اہم شخصیات حضرت حسینؓ، حضرت عبداللہ بن الزبیرؓ وغیرہ نے عاصم سے اس سلسلے میں بات کی تو انہوں نے کہا کہ امیر المومنین نے مجھے اسی کا حکم دے کر بھیجا ہے (نسب قریش: ۱۵۴)۔

عوامی بہبود کی فکر اور نظام کی کمزوریوں کی اصلاح:

حجاز و اطراف کا دار الحکومت مدینہ تھا۔ جب تک مرکز خلافت کوفہ منتقل نہیں ہوا تھا یہاں تنخواہوں اور وظائف کا نظام درست رہا۔ خانہ جنگی و انتشار کے دور میں جہاں اور سب کچھ درہم برہم رہا، وظائف بھی معطل رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب حضرت معاویہ خلیفہ ہوئے اور تمام انتظامات درست کیے تو عبداللہ بن صفوان بن امیہ دار السلطنت دمشق آئے[۲]۔ انہوں نے آ کر حضرت معاویہؓ سے عرض کیا کہ مکے میں مدت سے تنخواہیں نہیں ملیں۔ اسی طرح فقراء اور ناداروں کی بڑی تعداد ہے، جن کے وظائف عرصے سے رکے ہوئے ہیں، بیوائیں حکومت سے کچھ مدد کی منتظر ہیں، مدت سے ان کو کچھ نہیں ملا۔ نیز اس مدت میں ایک تعداد ایسی پیدا ہو چکی اور عمر پا چکی ہے، جس کو دیوان میں درج ہو کر تنخواہ ملنی چاہیے تھی، مگر ابھی تک ایسا نہیں ہو سکا۔ حضرت معاویہؓ نے فوراً خزانۂ عام سے وظائف جاری کیے اور حکم جاری کیا کہ مکے کے دیوان میں ایسے سب لوگوں کا اندراج کیا جائے۔ عبداللہ بن صفوان نے بتایا کہ وہ صرف اہل مکہ کی ان ضروریات کے لیے سفارش کرنے دمشق آئے ہیں۔ حضرت معاویہؓ نے ان کا بڑا اکرام کیا (نسب قریش: ۳۸۹)۔

۱۔ یہ حضرت معاویہؓ کے ماموں زاد بھائی تھے۔ ان کے والد ابو ہاشم نہایت صالح صحابی تھے حضرت ابو ہریرہ ان کا تذکرہ کرتے تو کہتے "الرجل الصالح"۔ قریش میں مقام رکھتے تھے۔ الاستیعاب: ۴/ ۱۷۶۷۔

۲۔ یہ مکے کے سردار اور ایک بڑی غریب پرور شخصیت تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حین حیات ان کی پیدائش ہو چکی تھی۔ ابن حبان نے ان کو صحابہ میں شمار کیا ہے، الاصابہ: ۵/ ۱۲۔

یہ واقعات اس کا اندازہ کرانے کے لیے کافی ہیں کہ حضرت معاویہؓ کے دور میں امدادی وظائف کا کیسا وسیع ترقی یافتہ انتظام تھا۔

معزز اشخاص کی سفارش:

کمزور طبقوں اور غرباء کے سلسلے میں صحابہ کرام بھی فکر رکھتے تھے اور حکومت کو مشوروں کے ذریعے توجہ دلاتے رہتے تھے۔ ان کے مشورے فوراً قبول کیے جاتے تھے۔ ابوداود وغیرہ کتب حدیث میں حسن سند سے روایت آئی ہے کہ اپنے عہد کے ممتاز فقیہ محدث اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے خاص شاگرد زید بن اسلم بیان کرتے ہیں کہ حضرت معاویہ نے جس سال حج کیا، مدینے بھی تشریف لائے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ ملاقات کو تشریف لائے۔ حضرت معاویہؓ نے اکرام فرماتے ہوئے ان کو ان کی کنیت ابوعبدالرحمان سے مخاطب فرمایا اور کہا کوئی کام ہو تو بتائیں۔ انہوں نے فرمایا: آزاد کردہ غلاموں کے وظائف مقرر کیجیے۔ رسول اللہ ﷺ جب بھی مال آتا تو ان کا خیال کرتے تھے۔ حضرت معاویہؓ نے اس کے مطابق حکم جاری کر دیا[۱]۔

اشراف وقائدین کے وظائف:

خلافتمعاویہؓ کا دور مالی فراوانی اور معیار زندگی کی تیز رفتار ترقی کا دور تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ معاشرے کے اشراف اور قیادت کے مقام پر فائز حضرات کو دارالخلافۃ سے بڑی مقدار میں سالانہ وظائف جاری کیے جاتے تھے۔ ان میں حضرات حسنین رضی اللہ عنہما اور بنو ہاشم کے سربراہان اور دیگر بڑی شخصیات شامل تھیں۔

یہ چیز خلافت راشدہ کے دور میں نہیں تھی، اس کا آغاز حضرات حسنینؓ کے عطایا سے ہوا تھا، جن کا تذکرہ صلح کے وقت آیا تھا۔ مصالحت کے بیان میں ہم نے ذکر کیا تھا کہ (علماء یہ سمجھتے ہیں کہ) حضرت حسنؓ نے اپنے محاذ کے لوگوں میں سے کچھ لوگوں کو صلح پر راضی کرنے کے لیے اس کی ضرورت ظاہر فرمائی تھی۔ بعد میں دیگر بہت سے افراد کو اسی طرح عطایا دیے جاتے تھے۔ حضرت حسن کے وظیفے کی مقدار سالانہ چار لاکھ درہم تھی[۲]۔

یہ خواص کے علاوہ فقراء میں تقسیم کا نظام تھا، کسی نے بھی اس پر اعتراض نہیں کیا:

جن لوگوں نے ان خواص کو بڑی رقومات پیش کرنے پر اعتراض کیا ہے، وہ دراصل اس وقت کے مسلم معاشرے اور خصوصاً اس نسل کی خصوصیات واوصاف کا ادراک نہیں رکھتے۔ ان کو سوچنا چاہیے کہ اس دور میں کسی

۱۔ سنن ابی داوود: ۲۹۵۱، بسند حسن، نیز شرح مشکل الآثار: ۱۱/۵۱۔

۲۔ مصنف ابن ابی شیبہ: ۶/۱۸۸، بسند حسن۔

نے اس تقسیم وعطاء پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ جانتے تھے کہ یہ امت کے مفاد میں ایک بالکل صحیح طرز ہے۔اس سلسلے کی روایات کا تفصیل سے جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مال ان سربرآوردہ شخصیات کی (جوامت کے قائدین کا مقام رکھتے تھے) اپنی ضروریات کی تکمیل کے علاوہ فقراء ومساکین اوراہل حاجت میں تقسیم کے لیے دیا جاتا تھا۔حکومت کے پاس زائد (Surplus) آمدنی تھی،اس طرح وہ فقراء ومستحقین کی امداد کا ایک انتظام کرتی تھی۔

ایک مرتبہ حضرت حسنؓ،حضرت حسین اوران کے چچازاد بھائی عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب کوایک ایک لاکھ درہم بھجوائے،سب نے اسی وقت تقسیم کردیے (تاریخ دمشق:۵۹/ ۱۹۴)۔حضرت معاویہؓ کے بعد عبداللہ بن جعفر بادشاہ یزید کے پاس گئے،اس نے پوچھا کہ امیرالمومنین معاویہؓ کے دور میں آپ کا کتنا وظیفہ تھا؟انہوں نے کہا:ایک لاکھ،یزید نے چار لاکھ دیے۔کسی نے پوچھا:ایک آدمی کواس قدر؟ کہا:تم کومعلوم نہیں،یہ ان کونہیں مدینے کے لوگوں کو دیا ہے(العقد الفرید:۱/ ۳۲۱)۔

ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ کوایک لاکھ درہم بھیجے،انہوں نے اسی وقت سب فقراء میں تقسیم کردیے۔خود روزے سے تھیں،افطار میں کچھ بھی نہیں تھا،خادمہ نے عرض کیا:ایک لاکھ آئے تھے،کم ازکم آج کے لیے گوشت تومنگوالیا ہوتا۔فرمایا:اُسی وقت کہتیں تو منگوالیتی [۱]۔ایک مرتبہ حضرت عائشہ کے پاس ستر ہزار آئے، بھانجے عروہ کہتے ہیں:اس وقت کرتے پر پیوند لگارہی تھیں۔دیکھتے دیکھتے سب بانٹ دیے،دانہ بھی نہیں رکھا[۲]۔

---

۱ مستدرک:۴/ ۱۵،ذہبی نے اس کوصحیح کہا ہے،سیر:۲/ ۱۸۶۔

۲ الزھد لاحمد:۱۳۶،بسند صحیح،الطبقات الکبریٰ:۸/ ۵۳ بسند صحیح۔

پندرہواں باب

فوجی ودفاعی نظام

حضرت معاویہؓ کے عہد میں مملکت کا دائرہ بہت وسیع ہوگیا تھا۔افواج کی ضرورت صرف خارجی حملوں سے حفاظت ہی کے لیے نہیں تھی، داخلی سلامتی اور بغاوتوں کی سرکوبی کے لیے بھی بڑی تعداد میں ان کی ضرورت تھی۔اسلام کے اس باتمکین وپرشکوہ عہد میں دفاعی اخراجات کتنے وسیع تھے،اس کا اندازہ ان تاریخی تفصیلات سے خوب ہوتا ہے جو بتاتی ہیں کہ حضرت معاویہؓ نے قلعۂ اسلام کی حفاظت وتقویت کے لیے کتنے وسیع انتظامات کیے تھے۔ان کی قسمت میں یہ سعادت لکھی تھی کہ وہ فتنوں کے گرداب سے کشتیِ اسلام کو نکال کر پھر رواں دواں کردیں گے۔خلافت معاویہؓ کی پیشین گوئی میں ہم وہ صحیح حدیث نقل کر چکے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مجھے ایک خواب میں دکھایا گیا کہ قرآن کا ''عمود'' وستون [۱] میرے سر کے نیچے سے نکال لیا گیا۔مجھے لگا کہ یہ اب کہیں لے جایا جائے گا،تو میں اس کو دیکھتا رہا۔آخر وہ شام لے جایا گیا (جہاں بعد میں حضرت معاویہؓ کی حکومت قائم ہوئی اور پھر شام قلعۂ اسلام بنا)۔پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: سن لو! فتنوں (یعنی خانہ جنگی) کے وقت ایمان کا مرکز شام ہوگا [۲]۔

اس حدیث کا صاف مفہوم یہی ہے کہ قرآنی دین وشریعت کا قیام واستحکام جس طرح مدنی خلافت سے ہوا تھا،اب شامی خلافت سے انجام پائے گا۔لہٰذا فطری تھا کہ ان کے عہد میں اسلام کی عسکری طاقت میں اضافہ ہوتا اور وہ ایسی منظم ہوتی کہ تمام رخنوں شگافوں کو بند کردیا جاتا۔

۱۔ عمود اس لکڑی کو کہتے ہیں جو خیمے کے مرکز میں ہوتی ہے اور خیمہ کو کھڑا رکھتی ہے۔

۲۔ مسند احمد (۲۱۷۳۳)،امام بیہقی نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے، دلائل: ۶/ ۴۴۷۔مستدرک حاکم: (۸۵۵۴)، ذہبی نے اسے بخاری اور مسلم کی شرط یعنی معیار کے مطابق صحیح قرار دیا ہے، نیز مسند شامیین: ۱/ ۱۷۹۔۱۸۱ صحیح اسانید سے، المعجم الکبیر طبرانی بسند صحیح، مجمع الزوائد ۱۰/ ۵۸۔

دفاعی پالیسی میں سب سے اہم رومیوں کا مقابلہ تھا:

حضرت معاویہؓ کی جنگی پالیسی میں (بلکہ خلافت راشدہ کے دور میں بھی) سب سے زیادہ اہمیت بیزنطینی سلطنت سے مقابلہ کو حاصل تھی۔ کیوں کہ وہی سب سے بڑا خطرہ تھی۔ مسلمانوں کے ساتھ دنیا کی سب سے بڑی طاقت کے مقام پر بیزنطین ہی تھا۔ اور شام اور مصر وغیرہ کو مسلمانوں سے واپس لینے کے لیے سب کچھ کرنے کے لیے تیار تھا۔ امیر المومنینؓ کو رومیوں کی طرف سے اس قدر فکر رہتی تھی کہ سفر آخرت کے وقت انہوں نے جو سب سے آخری وصیت کی وہ یہی تھی کہ "شُدّوا خناق الروم" یعنی رومیوں کا قافیہ تنگ کیے رکھنا۔ اس سے دوسری قومیں بھی حد میں رہیں گی (تاریخ خلیفہ: ۲۳۰)۔

محکمۂ دفاع میں اقلیمی خودمختاری:

کوفہ، بصرہ، خراسان، مدینہ، دمشق، (فسطاط) مصر اور (قیروان) افریقہ مملکت کے اہم اقلیمی صدر مقام تھے۔ تمام حکومتی نظاموں میں سارے شعبے صوبوں سے متعلق لامرکزی (Decentralised) ہو سکتے ہیں، مگر دفاع مکمل طور پر مرکز کے ہاتھ میں ہوتا ہے، جس میں صوبوں کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ قیصر و کسریٰ کی حکومتوں میں بھی یہی نظام تھا، لیکن حضرت عمر نے اپنی عبقری بصیرت و ذہانت سے جو نظام حکومت ترتیب دیا تھا وہ نہایت لامرکزی قسم کا تھا، جس میں اقالیم کو بڑی حد تک خودمختاری حاصل تھی۔ حضرت معاویہؓ کے دور میں خلافت راشدہ کا نظامِ عمل ہر شعبۂ حکومت میں برقرار رکھا گیا۔ اسی کا ایک حصہ یہ بھی تھا کہ دفاع میں بھی یہ مراکز (امصار) ایک خاص حد تک خودمختار تھے۔

مرکز خلافت دمشق اور شام کی افواج کی حیثیت اقلیمی فوج کے علاوہ مرکز کی حامی خاص افواج کی بھی تھی، جو خلیفہ کی برتر حیثیت اور حاکمانہ مقام کی محافظ تھیں، لیکن علاقائی مراکز میں مقیم فوجوں کا نظام اقلیمی گورنر جنرل ہی دیکھتا تھا۔ وہی ان کا کمانڈر ان چیف ہوتا تھا۔ سب سے اوپر حضرت معاویہؓ کی حیثیت افواج کے سربراہ اعلیٰ کی تھی۔ اسی لیے اہم اور سرگرم محاذوں کے فوجی سربراہوں کا تقرر براہ راست دربار خلافت سے ہوتا تھا اور جنگوں کے سلسلے میں احکام بھی وہیں سے آتے تھے۔ خراسان اور مشرقی افواج کا ڈویژن بصرے کے حاکم کے تحت تھا، ۵۴ھ میں عبیداللہ بن زیاد کو حضرت معاویہ نے خود خراسان کا فوجی جنرل (امیر علی الحرب) مقرر کیا تھا، بعد میں وہاں کی امارت اسی کے تابع کر دی تھی، اس کو جب ۵۵ھ میں بصرے کا گورنر طے کیا تو اس نے اسلم بن زرارہ کو خراسان کی کمان سپرد کی۔ مگر وہ کچھ خاص کامیاب ثابت نہیں ہوئے تو حضرت معاویہ نے خود سعید بن عثمان بن عفان کو خراسان کا امیر مقرر کیا[۱]۔ مشرقی ممالک کی فتوحات کے سلسلے میں گزر چکا ہے کہ جبل اسل کے مال

۱۔ طبری: ۵/۳۰۵، مرویات خلافۃ معاویہ: ۲۱۳۔

غنیمت کی تقسیم کے سلسلے میں حضرت معاویہ نے بصرہ کے گورنر کو براہ راست احکام جاری کیے تھے۔

ایک مکمل ترقی یافتہ نظام:

حضرت معاویہ نے فوج کے نظام کو نئی اور بڑی ترقیاں دیں، فوج میں ضرورت کے تمام کاموں کے الگ شعبے تھے۔گھوڑ سواروں کی الگ بٹالینیں تھیں، پیادہ الگ بٹالینیں ہوتی تھیں اور تیر اندازوں کی الگ۔فوجی صلاحیت کی ترقی کی ایسی فکر تھی کہ اکناف عالم سے بہترین صلاحیتوں اور مہارتوں کو افواج میں لایا جاتا تھا۔جب بخارئ فتح ہوا تو معلوم ہوا کہ یہاں نہایت ماہر تیر انداز ہیں۔لہٰذا دو ہزار نو مسلم تیر اندازوں کی بھرتی کی گئی اور وہ بصرہ میں مقیم ہوئے۔ان کا محلہ بخاریۃ کہلاتا تھا[۱]۔امیر المومنین نے افواج کی تنظیم و ترقی میں وہ اہتمام کیا تھا، جو پہلے کبھی نہ ہوسکا تھا۔طباخوں اور آلات وسامان جنگ بنانے والے کارندوں کے الگ الگ مستقل محکمے تھے۔اطباء اور بیاطرہ (جانوروں کے طبیبوں) کا الگ شعبہ تھا۔یہاں تک کہ دواسازی کا اطباء سے الگ ایک مستقل محکمہ تھا، جن کے ساتھ دواوں اور آلات دواسازی کا اتنا سامان ہوتا تھا کہ صرف اس سامان کے لیے بہت سے اونٹوں کا انتظام کیا گیا تھا۔اس کے علاوہ جوش وولولہ پیدا کرنے کے لیے واعظوں (قُصّاص) کا بھی انتظام ہوتا تھا[۲]۔

بری افواج کی تنظیم:

فتنہ اور خانہ جنگی کے دور میں سب سے زیادہ جو نقصان پہنچا تھا وہ فوجی نظام کو پہنچا تھا۔عراق اور شام میں مقیم مراکز کے علاوہ مشرق میں فارس وخراسان اور سندھ اور مغرب میں مصر وافریقہ کے تمام علاقوں میں افواج کا نظام تعطل کا شکار تھا۔حضرت معاویہؓ نے اس بکھرے اور پژمردہ شیرازے کو از سرنو منظم کیا اور اتنی ترقی دی کہ وہ دنیا کی سب سے منظم اور بڑی فوج بن گئی۔ہم یہاں افواج کی تعداد، ان کی تنظیمی ڈھانچے (دیوان) اور تنخواہوں کے مصارف کا ایک جائزہ لیتے ہیں۔

مملکت کے اور شعبوں کی طرح حضرت عمرؓ کا تشکیل دیا ہوا فوج کا نظام جاری رکھا گیا (دیوان الجند للسلومی: ۱۴۹)۔حضرت عمرؓ نے عرب قبائل کو سرحدی فوجی مراکز کوفہ، بصرہ، فسطاط، دمشق، حمص، قنسرین اور اردن وغیرہ میں لے جا کر بسایا تھا، ان کا ہر مرد فوج میں درج تھا، جہاد کے لیے تیار رہتا اور تنخواہ پاتا تھا۔ان میں سے ہر مرکز میں فوج کا ایک رجسٹر (دیوان) تیار کیا گیا تھا۔جس میں ہر قبیلے کے فوجیوں کی الگ الگ فہرستیں تھیں۔ہر فوجی کے نام کے ساتھ اس کی Rank اور تنخواہ لکھی گئی تھی۔اندرون عرب میں حجاز کے لوگوں کا بھی فوج

۱۔ تاریخ طبری: ۵/۲۹۸، فتوح البلدان ۳۹۷۔

۲۔ تنظیمات الجیش فی العصر الاموی، در خالد الجنابی: ۱۱۴۔۱۴۱، نیز دیوان الجند عبدالعزیز سلومی: ۳۳۸۔۳۵۷۔

میں اندراج تھا۔ ان کو جو تنخواہیں ملتی تھیں ان کو ''عطایا'' کہا جاتا تھا۔ (طبقات ابن سعد: ۳/ ۲۱۴)۔ مذکورہ شہروں میں وزارت دفاع کے مراکز تھے جو دیوان الجند کہلاتے تھے۔

حضرت معاویہؓ نے اس پورے ڈھانچے کو باقی رکھا[1]۔ لیکن اس میں یہ ترقی دی کہ دمشق میں تمام سرحدوں اور چھاؤنیوں کا ایک جامع مرکزی ریکارڈ تیار کرایا جو وزارت دفاع کے مرکزی دفتر (دیوان) واقع دمشق میں تیار ہوا، جس کے افسر اعلیٰ حضرت عمروؓ بن سعید بن العاصؓ بنائے گئے (**الوزراء والكتاب للجهشياري**: ۲۴)۔ رجسٹرڈ فوجی سب باتنخواہ تھے، ان کے لیے فوجی مراکز (امصار، چھاونیوں) میں قیام اور ہر وقت جنگ کے لیے تیار رہنا ضروری تھا۔ اگر کوئی جہاد سے پہلوتہی کرتا تو اس کو سزا دی جاتی تھی۔ اس کی پگڑی اتروادی جاتی اور پبلک کے درمیان کھڑا کر کے اعلان کیا جاتا کہ یہ جہاد میں نہیں گیا[2]۔

ہر خطہ میں مجاہدین کے لیے الگ شہر بسائے گئے تھے، یہ امصار المسلمین کہلاتے تھے۔ افواج کا قیام اس طرح ہوتا تھا کہ ہر قبیلہ کے لوگ الگ الگ محلہ میں رہتے تھے۔ شہر کے قلب میں دار الامارۃ یعنی گورنر ہاؤس، مرکزی جامع مسجد اور سرکاری دفاتر کی عمارت ہوتی تھی۔ اسی مقام سے سڑکیں جاتی تھیں اور ہر قبیلہ کے محلے تک پہنچتی تھیں۔ ہر قبیلہ میں ایک عریف ہوتا اور بہت سے نقیب ہوتے تھے، انکا کام قبیلہ کی ضروریات اور اطلاعات امراء تک پہنچانا ہوتا تھا (نسب قریش: ۱۵۴)۔ بصرہ میں خوارج کا خصوصا بہت خطرہ رہتا تھا، دیگر باغی اور شر پسند عناصر بھی عراق میں سرگرم تھے۔ عبیداللہ بن زیاد کو جب بصرے کا گورنر بنایا گیا تو اس نے خاص طور پر ان عریفوں کو فتنہ انگیز عناصر اور باغیوں کی خبر دینے کا مکلف بنایا اور کہا اگر کسی عریف کے ماتحت کوئی فسادی چھپا ملا تو اس کو سزا دی جائے گی (طبری: ۵/ ۳۵۹)۔

افواج میں اضافہ:

اس وقت سب سے نازک صورت حال مشرقی بازو (یعنی عراق اور فارس سے لے کر ماوراء النہر کے علاقوں) کی تھی جہاں بغاوتیں سر اٹھاتی رہتی تھیں۔ اس مشرقی بازو کے فوجی و سیاسی مرکز کوفہ اور بصرہ تھے۔ حضرت علیؓ خانہ جنگیوں کے ایسے کارزار میں مصروف رہے کہ ان علاقوں کے انتشار کو روک نہ سکے۔ حضرت معاویہؓ خلیفہ بنے تو پہلا مسئلہ یہ تھا کہ کوفہ و بصرہ اور عراق میں انتشار پسند عناصر خصوصا خوارج کی مسلسل انتشار انگیزی اضطراب کا باعث تھی۔ دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ ایران سے لے کر بلاد سندھ تک اور خراسان سے لے کر

---

[1] تنظیمات الجیش فی العصر الاموی، ڈاکٹر خالد الجنابی: ۸۵۔
[2] تنظیمات الجیش فی العصر الاموی ۶۲۔

آذربیجان تک طوائف الملوکی پھیل رہی تھی۔ پرانے راجا رئیس بغاوتیں پھیلا رہے تھے۔ سارے مفتوحہ علاقے شورش پسندوں کی زد میں آگئے تھے۔ اگر ان علاقوں کو قابو میں نہ کیا جاتا تو خلافت اسلام کا مشرقی بازو کٹ جاتا۔ پھر آج ان وسیع اقالیم میں جو مسلم اقوام آباد ہیں وہ شاید دولت اسلام سے محروم ہوتیں۔ ان علاقوں میں مسلمانوں کے پھر سے پاؤں جما دینا امیر المومنین ؓ کا عظیم کارنامہ تھا۔

ان حالات کے پیش نظر کوفہ اور بصرے کے مراکز میں افواج کی تعداد میں بہت اضافے کی ضرورت تھی۔ بصرے کی افواج کی تعداد چالیس ہزار تھی، حضرت معاویہ ؓ نے زیاد سے نئی بھرتیاں کرا کے یہ تعداد دوگنی یعنی اسّی ہزار کروادی (انساب الاشراف: ۵/ ۲۲۰)۔ اسی طرح کوفہ میں یہ تعداد ساٹھ ہزار کروادی۔ کوفہ میں ایک اور فوج ہوا کرتی تھی، حضرت معاویہ ؓ نے بیس ہزار فارسی نسل کے لوگوں کو کوفہ لا کر بسایا تھا اور فوج میں بھرتی کر کے ان کی تنخواہیں جاری کی تھیں۔ (الاخبار الطوال ص: ۲۲۸) ظاہر ہے کہ دیگر مراکز کی تعداد میں بھی اسی طرح کا اضافہ کیا گیا ہوگا۔

مصر کی افواج میں اضافہ اور مالیات کی کثرت:

مصر کا دیوان سب سے پہلے عہد عمری میں گورنر جنرل حضرت عمرو بن العاص ؓ نے تیار کرایا تھا۔ حضرت معاویہ ؓ کے زمانے میں نئے سپاہی بھرتی کیے گئے تو مصر میں موجود فوجیوں کی تعداد ۴۰ ہزار ہوگئی۔ ان میں سے بڑے افسران کی تعداد چار ہزار تھی، جن کی تنخواہ دو دو سو دینار (یعنی تقریباً دو ہزار درہم) تھی۔ مصر کی خوش حالی اور آمد کی کثرت کا یہ حال تھا کہ علماء کے وظائف فوجیوں کی تنخواہ، ان کے اہل وعیال کے عطایا، حکومت کے تمام اہل کاروں، نہروں اور پلوں کی مرمت کرنے والوں کی تنخواہوں کی ادائیگی کے بعد، ایک سال ۶ لاکھ دینار کی خطیر رقم بچ رہی۔ جو عاملِ مصر مسلمۃ بن مخلد نے مرکز کو بھیج دی (خطط مصر للمقریزی: ۱/ ۱۷۶)۔ اس کے علاوہ شام کے فوجی مراکز، دمشق، حمص، قنسرین، اردن، قیروان اور فارس وخراسان جیسے اقالیم میں جو افواج تھیں ان کا اندازہ کیا جائے تو مسلم افواج کی تعداد سات آٹھ لاکھ سے کم نہیں ہونا چاہیے۔

دیگر علاقوں سے ماہرین جنگ کو لانے کا اہتمام:

حضرت معاویہ ؓ کے عہد میں اس کا اہتمام ہوتا تھا کہ جو علاقے فتح ہوتے جائیں، وہاں اسلام قبول کرنے والوں میں سے، جو جنگی فنون میں ماہرین ہوں ان کو لا کر فوج میں شامل کیا جائے۔ تاکہ ان کی صلاحیتوں سے مملکت اسلامیہ کو فائدہ حاصل ہو۔ خلافت اسلامیہ کے عروج خصوصاً اس کی شاندار فتوحات میں ایک کارفرما عنصر یہ بھی تھا۔ ابھی گزرا کہ بخارا کے لوگ تیراندازی میں نہایت ماہر تھے۔ چنانچہ جب وہ ان کے عہد میں دوبارہ

فتح ہوا تو وہاں سے دو ہزار ماہر تیر انداز لائے گئے اور بصرہ کے مرکز سے ان کو ملحق کیا گیا۔

اہم مہمات کے لیے خصوصی بٹالین:

جس طرح جدید نظام میں کمانڈوز کی جماعت ہوتی ہے اسی طرح حضرت معاویہؓ نے نازک اور اہم مہمات کے لیے بہت ہی اعلیٰ درجے کے فوجیوں پر مشتمل ایک بٹالین بنائی تھی۔ جس کے قائد حضرت سفیان بن عوف ازدیؓ تھے۔ یہ عہدِ عمری سے رومیوں کے خلاف جہاد میں اہم خدمات انجام دیتے آرہے تھے۔ ان کے تحت گھوڑ سواروں کی ایک نہایت منتخب فوج تھی، جس میں شام کی تمام فوجی یونٹوں سے نہایت ممتاز سورما لئے گئے تھے۔ قسطنطنیہ کا سات سالہ محاصرہ جب کیا گیا تو یہ بٹالین اس میں خاص طور پر سب سے پہلے بری راستے سے گئی ۱۔

صوائف وشواتی:

بیزنطینی سلطنت صدیوں کی پر شکوہ تاریخ کے قلعے پر قائم ایک سپر پاور تھی۔ شام اور مصر جیسے جو ممالک فتح ہوئے تھے، رومیوں کے لیے ناممکن تھا کہ وہ ان کو واپس لینے اور آگے بڑھ کر خطرہ بننے والی کسی ریاست کے وجود کو مٹانے کے لیے کمر نہ کسیں۔ لہٰذا رومی شامی علاقوں پر مسلسل حملے کرتے تھے۔ جن سے ان علاقوں کا مسلمانوں کے ہاتھ میں رہنا مشکل ہوسکتا تھا۔ اور اگر شام ہاتھ سے جاتا تو رومیوں کے لیے مصر اور افریقہ کا راستہ صاف تھا۔ رومیوں جیسی سپر پاور کے مقابلے کے لیے غیر معمولی منصوبہ بندی، فولادی ہمت، انتھک عزم اور بلند و مضبوط ارادے کی ضرورت تھی۔ قدرت نے یہ کمالات حضرت معاویہ کو جس فیاضی سے عطا فرمائے تھے، تاریخ میں کم لوگوں کے حصے میں آئے ہوں گے۔ ایک مورخ کو ان کی امارت وخلافت کے چالیس سالوں میں جہاد و رباط ۲ کا جو تسلسل نظر آتا ہے اور جو تاریخ ساز اولوالعزمی و استقامت دکھائی دیتی ہے، اس کی نظیر حضرت عمر فاروقؓ کے بعد اسلامی تاریخ میں نایاب ہے۔ ان چالیس سالوں میں، سوائے اس نامبارک دور کے جس کو صحابہ ''فتنہ'' کا دور کہا کرتے تھے، انہوں نے رومیوں کے مقابلہ کا یہ محاذ لگاتار سرگرم رکھا۔ اور کمال یہ کہ اس اختلاف کے دور میں بھی رومیوں کو شام و مصر میں دوبارہ حملے کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

اسی سرگرمیِ جہاد کا نتیجہ تھا صوائف وشواتی کا وہ نظام، جس سے حضرت معاویہ رومیوں کے محاذ کو لگاتار گرم رکھتے تھے۔ یعنی ہر سال گرمی کے موسم میں اسلامی افواج بری اور بحری راستوں سے رومی علاقوں خصوصاً ایشیائے کوچک میں ان کے قلعوں اور بحر متوسط میں ان کی بندرگاہوں پر حملے کریں۔ یہ مہمات صائفہ کہلاتی تھیں، انہی

---

۱ تاریخ دمشق: ۳۵۰/۲۱۔

۲ محاذ پر مسلسل جمے رہنے کو حدیث میں رباط کہا گیا ہے۔

کی جمع صوائف ہے۔اسی طرح سردیوں میں الگ موسم کی تیاریوں کے ساتھ دوسرے لشکروں کو بھیجا جائے، جو شاتیہ کہلاتے تھے۔انہی کی جمع شواتی ہے۔

رومیوں کا ترقی یافتہ جنگی نظام اوراس کا مقابلہ:

رومیوں کا فوجی نظام نہایت ترقی یافتہ تھا۔امانوس اور ٹارس کے پہاڑی سلسلے شام کو ایشیائے کوچک سے الگ کرتے تھے، یہ گویا رومیوں کے لیے ایک قدرتی حفاظتی فصیل تھی۔رومیوں نے اپنے صدیوں کے عروج واقتدار کے دور میں، اور خصوصا فارسی امپائر سے جنگوں کے مدنظر، ان پہاڑی سلسلوں پر بے شمار قلعے اور فوجی تنصیبات قائم کر رکھی تھیں۔جہاں بھی کوئی درہ یا وادی ایشیائے کوچک کو جانے والی تھی، ان پر فوجوں کی نگرانی رہا کرتی۔رومیوں کے لیے یہاں سے نکل کر شام میں حملے کرنا بہت آسان تھا۔اور پہاڑی دروں اور وادیوں کے اوپر قائم ان کے قلعوں کی وجہ سے کسی کے لئے رومیوں کے علاقوں پر حملہ کرنا نہایت مشکل تھا۔حضرت عمرؓ اس محاذ کی قریب سے معلومات حاصل کرنے کے مقصد سے جب شام آئے اور ان کے علم میں تفصیل سے یہاں کے جغرافیائی اور عسکری پہلو رکھے گئے تو انہوں نے فرمایا: اللہ کی قسم، میرا جی چاہتا ہے کہ ان پہاڑی دروں میں کوئی آگ دہکنے لگے، تاکہ رومیوں کا علاقہ اُدھر کا ہو اور وہ اِدھر نہ آسکیں (تاریخ یعقوبی: ۲/ ۱۴۳)۔اسی موقع پر حضرت عمر نے صوائف وشواتی کا یہ نظام طے فرمایا تھا اور حکم دیا تھا کہ ان پہاڑی راستوں اور دروں کو بند کرنے کا انتظام کیا جائے (طبری: ۴/ ۶۲)۔

رومیوں کے حملوں کو روکنے کے لئے ان پہاڑی سلسلوں، خصوصا اس کے دروں، قلعوں اور اہم چوٹیوں پر موجود رومی تنصیبات پر غلبہ قائم کرنا اور ان کو رومی افواج سے خالی کرانا ضروری تھا۔حضرت معاویہؓ نے اپنی گورنرشپ کے ہی دور میں رومیوں کے خلاف جہادی مہمات کے لئے صوائف وشواتی کا نظام قائم کیا تھا۔خانہ جنگی کے دور میں یہ سلسلہ بالکل منقطع ہو گیا تھا۔بحیثیت خلیفہ ذمہ داریاں سنبھالنے کے بعد اس نظام کو پھر سے جاری فرمایا۔اس نظام کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ رومیوں کی فوجی نقل وحرکت پر نظر رکھی جائے اور ان کی تیاریوں کا اندازہ کیا جاتا رہے۔نیز سرحدی قبائل اور آبادیوں پر حکومت کے رعب وقبضہ کا اظہار بھی مقصود تھا۔جو ان کو تابع اور وفادار رکھنے کے لیے ضروری تھا۔

تاریخی مآخذ میں کثرت سے ان مہمات کا تذکرہ ملتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ تمام سرحدی علاقے مسلمانوں کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے۔سن ۲۲ اور ۲۳ میں حضرت معاویہ نے ان مہموں کی خود قیادت فرمائی تھی، جن میں سے مؤخر الذکر مہم میں تو وہ رومیوں کے دفاع کو چیرتے ہوئے مملکت کے نہایت اندرونی علاقے عموریہ

تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے تھے (طبری: ۴/ ۱۴۴، ۱۶۰)۔ یہ مہمات رومی علاقوں کے اندر کافی آگے تک جایا کرتی تھیں اور ملکی حالات اور جغرافیہ نیز راستوں اور دارالحکومت قسطنطنیہ پر حملے کی منصوبہ بندی کے لیے ضروری معلومات بھی حاصل کرتی تھیں۔ سن ۴۴ھ میں عبدالرحمان بن خالد بن ولید ایک لشکر لے کر اس جگہہ تک پہنچ گئے جہاں موجودہ انقرہ ہے، یہ اناطولیہ کے شمال مغرب میں واقع ہے اور یہاں سے قسطنطنیہ زیادہ دور نہیں تھا۔

اس طرح حضرت معاویہ نے میدان جنگ رومیوں کی سرزمین میں منتقل کر کے ان کو دفاعی موقف میں لا کھڑا کیا تھا۔ یہ مہمات جاتیں اور رومیوں کی دفاعی تنصیبات کو نقصان پہنچا کے آتی تھیں، جس سے ان میں لگاتار ایک نفسیاتی شکست خوردگی کا احساس پیدا ہوتا تھا[۱]۔ صوائف وشواتی کا نظام ایسا سرگرم تھا کہ معتبر مورخ محمد بن عائذ دمشقی (وفات: ۲۳۳ھ) نے ان پر ایک مستقل کتاب لکھی تھی، جس کا خاصا حصہ تاریخ خلیفہ، اور تاریخ دمشق میں مختلف روایات کی شکل میں پھیلا ہوا ہے۔

ان صوائف وشواتی کے قائد حضرت جنادہ بن امیہؓ، سفیان بن عوفؓ ازدی، فضالہ بن عبیدؓ، عبداللہ بن کرز بجلی، یزید بن شجرہ رہاویؓ، مالک بن ہبیرہ سکونیؓ، مالک بن عبداللہ الخثعمی جیسے مشہور کمانڈر ہوا کرتے تھے۔ مالک خثعمی تو مالک الصوائف ہی کے نام سے مشہور ہو گئے تھے (معاویہ: ۳۹۴)۔

نئے فوجی مراکز، چھاونیوں اور قلعوں کی تعمیر:

رومیوں کو مشرقی اقوام کے حملوں سے محفوظ رکھنے کے لیے قدرت نے پہاڑی سلسلوں کی شکل میں زبردست قدرتی قلعہ وفصیل بخشے تھے۔ آرمینیہ کے پہاڑی سلسلے عراق ومشرق سے حفاظت کرتے تھے۔ شام کے شمال میں Amanus کا پہاڑی سلسلہ تھا۔ اسی طرح بحر متوسط کے شمال مشرق میں Taurus کا پہاڑی سلسلہ تھا، جو بحری حملوں سے خطۂ اناطول کی حفاظت کرتا تھا۔ رومی سلطنت کی شوکت وقوت کی تاریخ صدیوں پرانی تھی۔ اس دوران انہوں نے زبردست فوجی ومعاشی طاقت کے ذریعہ اپنے ملک کو ناقابل تسخیر بنانے میں (انسانی کوشش اور تدبیر کی حد تک) کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ ان پہاڑوں کے ہر درے اور قابل عبور راستے پر انہوں نے اپنے فوجی وشہری مراکز، قلعے اور چھاونیاں بنا رکھی تھیں۔

ان درّوں اور گھاٹیوں کو عرب ''ثغور'' (جس کا واحد ثغر ہے) کہتے تھے۔ مشرق میں یہ سلسلہ آرمینیہ کے ملطیہ، زبطرہ، حصن منصور (Adiyaman)، مرعش اور شمشاط کے قلعوں، چھاونیوں، گڑھیوں اور چھوٹے بڑے مراکز پر مشتمل تھا۔ عراق کا صوبہ الجزیرہ کی کمانڈ اس طرف فوجی مہمات کی ذمہ دار تھی۔ اس کے جنوب

---

۱ الامویون والبیزنطیون: ۱۰۵۔۱۰۸۔

مغرب میں اور شام کے شمال میں پہاڑی درے اور ناکے ثغور شامیہ کہلاتے تھے اور شام کی افواج ادھر جہاد کرتی تھیں (معاویہ: ۵۲)۔ سن ۱۶ ہجری میں جب شام کی فتح مکمل ہوئی اور بادشاہ ہرقل شام چھوڑ کے گیا تھا تو اپنے ساتھ اسکندرون سے لے کر طرسوس تک کے تمام مقامات سے آبادیوں کو لے کر چلا گیا تھا۔ کبھی کبھی رومی فوجیں یہاں گشت لگاتی رہتی تھیں۔ اور مسلمانوں کی گشتی افواج پر پہاڑی کمین گاہوں سے شب خون مار دیا کرتی تھیں، جس سے بہت چوکنا رہنا پڑتا تھا (فتوح البلدان: ۱۶۴)۔

حضرت معاویہؓ کا ایک حیرت ناک حد تک بڑا منصوبہ:

حضرت عثمانؓ نے سن ۲۴ ہجری میں ہی حضرت معاویہ کو دونوں طرف کے محاذوں (یعنی شام اور الجزیرہ) کا گورنر اور امیر الافواج مقرر فرما دیا تھا۔ غلبۂ اسلام اور رومیوں کے مقابلے کے نقطۂ نظر سے یہ فیصلہ بہت کامیاب اور نہایت نتیجہ خیز ثابت ہوا۔ حضرت معاویہؓ نے بڑی عسکری ذہانت سے رومیوں کے مقابلہ کا منصوبہ بنایا۔ رومیوں کی طاقت، عزائم اور ان کی مملکت کی جغرافیائی وسعتوں اور عزائم کا جائزہ لینے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ ان کا مقابلہ اس کے بغیر ممکن نہیں کہ شام اور الجزیرہ کی ان ثغور پر غلبہ حاصل کر کے وہاں اپنی فوجی تنصیبات قائم کی جائیں اور افواج مقرر کی جائیں۔ یہ ایک حیرت ناک حد تک بڑا منصوبہ تھا۔ یہ سرحد ہزاروں میل پر پھیلی ہوئی تھی، اور ساری ہی سنگلاخ اونچی پہاڑیوں پہ واقع تھی۔ اس کی دشواری اور خطرناکی کا اندازہ اس سے کیجئے کہ سیدنا عمر جیسا پہاڑ صفت انسان تمنا کرتا تھا کہ کاش کوئی طبعی رکاوٹ ہوتی جو روم کے حملوں سے ہمیں محفوظ کر دیتی اور ہم ان خطرناک محاذوں پر جنگ سے بچ جاتے۔

آخر حضرت معاویہؓ نے اس محاذ کو سنبھالا۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے وہ مدبرانہ شان، الوالعزمی اور جوش جہاد دیے تھے، جو ایسے پرخطر اور دشوار کارنامے کے لئے ضروری تھے۔ چنانچہ بے شمار مہمات سر کر کے اسلامی افواج نے رومیوں کو ان پہاڑی مقامات سے کھدیڑا۔ اور اہم اسٹریٹجک مقامات پر نئے قلعے بنائے۔ قدیم گڑھیوں اور قلعوں کی مرمت کی گئی۔ یہاں افواج کی نفریاں تعینات کی گئیں اور دوسرے شہروں سے لا کر مسلمانوں کی آبادیاں بسائی گئیں۔

'سدّ آہنی' کی شکست، ایک تاریخ ساز کارنامہ:

یہ ایک تاریخ کا رخ موڑنے والا اور محیر العقول کارنامہ تھا۔ رومیوں نے اپنی سلطنت (Empire) کے دفاع کے لئے صدیوں میں غیر معمولی مالی اور انسانی وسائل صرف کر کے جو حصار قائم کیا تھا، حضرت معاویہؓ نے وہ

چند سالوں میں توڑ ڈالا۔ یہ حصار ان پہاڑی مقامات پر قلعوں، فوجی بیرکوں، گڑھیوں اور شہروں کی شکل میں تھا، اس نے پورے سلسلۂ امانوس اور ٹارس کو ایک ناقابل عبور ''سدّ آہنی''[۱] بنا دیا تھا، جو رومن امپائر کی پورے مشرق سے حفاظت کرتا تھا۔ اس کارنامے نے صورت حال یکسر بدل دی اور جنگ کے پلڑے کو مستقل طور پر مسلمانوں کے حق میں کر دیا۔ اب امانوس اور ٹارس کے پہاڑی سلسلہ (ماضی کے برعکس) مسلمانوں کی رومیوں سے حفاظت کا کام کرتے تھے۔ رومی اب اِس طرف نہیں آسکتے تھے۔ اور مسلمان لگاتار ایشیائے کوچک اور آرمینیہ میں حملے کرتے رہتے تھے۔

اسی طرح حضرت معاویہؓ نے شام کے ساحلوں پر اسلامی افواج کے قدم جمائے۔ لبنان سے فلسطین واردن تک کے ساحلوں پر رومیوں کے بحری اڈے تھے، جاتے وقت وہ انہیں اور وہاں موجود جنگی جہازوں اور آلات حرب کو ممکن حد تک برباد کر گئے تھے۔ حضرت معاویہؓ نے ایک ابتدائی سطح کی بحریہ سے اس پورے ذیلی ڈھانچے (Infrastructure) کو پھر سے تعمیر کیا اور قابل استعمال بنایا۔ خلیج اسکندرون سے لے کر طرسوس تک کے یہ بحری اڈے بحر متوسط پر مسلمانوں کے غلبے کی حفاظتی پشت پناہ تھے اور بیزنطینی سلطنت کے اندرونی علاقوں اور قسطنطنیہ تک پر حملوں میں بہت مدد دیتے تھے۔ مجاہدین کو ان اڈوں سے تیز وجلد رسد اور کمک ملتی رہتی تھی۔ یہ وہ دوسرا عامل (Factor) تھا جس سے اسلامی مملکت رومیوں سے صدیوں تک کے لئے محفوظ ہوگئی۔

سن ۲۴ھ میں حضرت معاویہؓ اس سلسلے کی ایک مہم پر خود ایک بڑے لشکر کے ساتھ نکلے اور شامی ثغور کا جائزہ لیا۔ اس دورہ میں انہوں شام کے شمال میں انطاکیہ سے لے کر بحر متوسط کے ساحلی مقام طرسوس تک کی گڑھیوں اور قلعوں پر قبضے کو مستحکم کرنے کے لیے شام کے ایک صوبائی مرکز قنسرین کی افواج اور الجزیرہ کی افواج میں سے ایک تعداد کو ان قلعوں اور فوجی اڈوں پر تعینات کیا تھا۔ وہاں کی صورت حال کا تقاضہ ہوا تو اس کے دو سال بعد یزید بن الحر عبسی کو قلعوں کی مرمت اور ان میں نئی افواج کی تعینات کی تفصیلی ہدایات دے کر انہی علاقوں میں صائفہ کی مہم پر بھیجا تھا۔ ان پہاڑی گزرگاہوں پر موجود قلعوں اور گڑھیوں میں مسلم افواج مستقل متعین رہتی تھیں (فتوح البلدان: ۱۶۸)۔ سن ۳۱ھ میں حضرت معاویہ پھر شامی ثغور کی ایک مہم پر نکلے۔ اس مرتبہ ٹارس پہاڑوں کے نسبۃً شمالی حصے کے ایک اہم فوجی مرکز مصیصہ اور درولیہ تک گئے، اس سمت میں رومیوں کے متعدد قلعے تھے۔ حضرت معاویہؓ نے تمام قلعے منہدم کروا دیے۔

اسی طرح الجزیرہ کی طرف کی ثغور پر بھی مسلم افواج کی چھاونیاں بنائی گئیں۔ اس سلسلے میں سب سے اہم ملطیہ کا قلعہ تھا۔ ایک صائفہ میں، جو غالباً ۳۱ھ ہی میں انجام دیا گیا تھا، حضرت معاویہ نے کچھ مدت وہاں

---

[۱] گذر چکا ہے کہ رومی اس کو سدّ آہنی ہی کہتے تھے۔

قیام کیا۔ وہاں الجزیرہ اور شام کی افواج سے بٹالینیں متعین کیں، ملطیہ کا مقامی آبادی میں سے ایک حاکم بھی متعین کیا۔ ان چھاونیوں اور قلعوں سے صائفہ کے حملوں کے لیے راستہ محفوظ رہتا تھا اور مسلم افواج ایشیائے کوچک میں رومیوں کی فوجوں پر اچانک جا پڑتی تھیں (فتوح البلدان: ۱۶۵)۔ الجزیرہ کی ثغور میں ایک قلعہ مرعش تھا۔ اس مقام کی اسٹریٹیجک اہمیت کے پیش نظر رومیوں نے یہاں اپنے لوگوں کو لا کر شہر بھی بسا دیا تھا۔ حضرت خالد بن الولید نے حملہ کر کے اس قلعے کو منہدم کر دیا تھا اور وہاں کے لوگوں کو وہاں سے ہٹا دیا تھا تا کہ مسلم افواج کے لیے راستہ کھل جائے۔ حضرت معاویہ نے یہ قلعہ پھر سے تعمیر کیا، شہر مسلمانوں سے آباد کیا اور یہاں افواج کو مقرر کیا کہ کہیں رومی اس پر دوبارہ قبضہ نہ کر لیں (فتوح البلدان: ۱۸۸)۔

ساحلی ثغور کے انتظامات اور ان کی از سر نو آبادکاری:

حضرت عمرؓ کے زمانے میں حضرت معاویہؓ کے زیر قیادت شام کے ساحلی شہر اور بحری اڈے فتح ہوئے تھے۔ لیکن رومی بحریہ مسلمانوں پر بے روک ٹوک حملے کرتی تھی، اس وقت اسلامی بحریہ قائم نہیں ہوئی تھی۔ حضرت معاویہؓ نے یہ صورت حال حضرت عمرؓ سے ذکر کر کے بحریہ بنانے کی اجازت چاہی۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اجازت نہیں دی۔ ساحلوں پر رومیوں کے بہت سے بحری اڈے اور تنصیبات تھیں، جو وہ چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ پہلے ساحل پر حفاظتی افواج کو مقرر کیا جاتا تھا، جو حَفَظَہ کہلاتے تھے (فتوح البلدان: ۱۶۳)۔ حضرت معاویہؓ نے ساحل پر سمندری نگرانی کے لیے اونچے اونچے برج بنائے۔ اور ایسی روشنی کے انتظام کیے کہ رات میں بھی سمندر میں کسی نقل وحرکت پر نظر رکھی جا سکے۔ اب یہ کیا گیا کہ جو ساحلی قلعے یا بحری اڈے رومی افواج نے خالی کیے ہیں ان کی مرمت کی گئی، اور ان قلعوں میں مستقل فوجیں اور عام شہریوں کو بسایا گیا۔ پہاڑی چوٹیوں پر سمندر میں دور تک دیکھنے کے لیے اونچی برجیاں بنائی گئیں اور ان پر پہرے دار متعین کیے گئے۔ رات میں خوب آگ جلائی جاتی تا کہ سمندری نقل وحرکت پر نظر رکھی جا سکے۔ اور ہر ساحلی قلعے میں مختصر تعداد میں افواج چھوڑ دی جاتیں۔ جیسے ہی دشمن کے کسی حملہ کی ٹوہ ملتی وہاں سے قریب ترین فوجی مرکز کو اطلاع جاتی اور فوراً کمک پہنچتی۔

لیکن رومی بحریہ کے حملوں کو روکنے کے لئے یہ انتظامات کافی نہیں ثابت ہو رہے تھے۔ خلافت فاروقی کے اواخر یا خلافت عثمانی کے اوائل میں رومیوں نے زبردست بحری حملے کیے اور کئی ساحلی شہروں اور ان کی بندرگاہوں پر قبضہ کر لیا۔ حضرت معاویہؓ نے خیال فرمایا کہ اسلام و مسلم مملکت کے استحکام کے لیے اور بڑے اقدامات کی ضرورت ہے۔ لہٰذا انہوں نے ان تمام علاقوں کی Demography میں تبدیلی کا فیصلہ کیا۔ صیدا، عرقہ، جبیل، بیروت (سب موجودہ لبنان میں ہیں) کو پھر سے فتح کیا۔ ان کے قلعوں میں افواج کی تعداد میں

اضافہ کیا، اور ساحلی شہروں میں دوسری جگہوں سے مسلمان لاکر بسائے اور ان کو گزر بسر کے لیے بطور جاگیر زمینیں دی گئیں۔ اسی طرح شام کے شمال میں لاذقیہ، جبلہ اور طرطوس تین اہم ساحلی اڈے تھے۔ حضرت معاویہؓ نے ان تمام اڈوں پر قلعے بنائے اور فوجوں کو متعین کیا۔ طرطوس کو ایک بڑا شہر بنایا گیا اور یہاں لاکر مسلمانوں کو بسایا اور ان کو جاگیریں دیں۔ اسی طرح مرقیہ اور بلنیاس کے ساحلی مقامات پر شہری آبادیاں بسائی گئیں اور بحری قلعوں میں فوجوں کو متعین کیا گیا (فتوح البلدان: ۱۲۹، ۱۳۵)۔

شام میں انطاکیہ کے بعد رومیوں کا سب سے طاقتور مرکز طرابلس تھا۔ یہاں بیزنطینیوں کی کافی آبادی تھی۔ دیگر ساحلی شہروں پر مسلمانوں کے قبضے کے بعد وہاں کی رومی آبادیاں ہجرت کر کے یہاں آتی رہیں۔ رومی حکومت اپنے اس فوجی مرکز کو کمک پہنچاتی رہتی تھیں اور رومیوں کے بحری بیڑے یہاں آتے رہتے تھے۔ سن ۲۵ھ میں یہ مضبوط مرکز مفتوح ہوا تو حضرت معاویہؓ نے اس کو آباد کرنے کا یہ نقشہ بنایا کہ یہودیوں کی ایک بڑی تعداد کو یہاں لاکر بسایا۔ ہر سال بڑی تعداد میں فوجیں طرابلس آتی تھیں، بلاذری کے مطابق جب موسم سرما میں سمندری راستے بند ہو جاتے اور رومیوں کے حملوں کا خدشہ نہیں رہتا تو فوجیں واپس چلی جاتیں۔ اور وہاں کا حاکم ایک مختصر بٹالین کے ساتھ وہاں رکا رہتا[۱]۔

حکومت کے دفاعی نظام میں ان ثغور کی بہت اہمیت تھی۔ ان کے استحکام کے لیے یہاں مستقل افواج کا قیام ضروری تھا۔ لہٰذا یہاں فوجیں متعین کی جاتیں۔ لیکن دور دراز دشوار علاقوں میں مستقل قیام کچھ آسان بات نہ تھی۔ سو رغبت پیدا کرنے کے لیے فوجیوں کو یہاں زمینیں بھی دی جاتی تھیں۔ انطرسوس، مدقیہ اور بالس نامی شہروں سے رومی چلے گئے تو حضرت معاویہؓ نے از سر نو اسلامی خطوط پر شہر آباد کیے اور بسنے والے لوگوں میں زمینیں تقسیم کیں[۲]۔ حمص کے مغرب میں ساحل پر مرقیہ کا اہم قلعہ خالی پڑا تھا اور بوسیدہ ہو گیا تھا۔ یہ بہت بڑا قلعہ تھا۔ اس کے شمال میں دو اہم ساحلی قلعے جبلہ اور لاذقیہ میں تھے۔ رومیوں سے ڈر تھا کہ سمندر میں کہیں سے بھی فوجیں لاکر اتار سکتے تھے۔ پھر ان قلعوں سے ان کو نکالنا مشکل ہوتا۔ اس لحاظ سے ان قلعوں کی بہت اہمیت تھی۔ انہی کے پاس ایک قلعہ بلنیاس تھا، حضرت معاویہ نے ان سب قلعوں کی مرمت کروائی اور ان میں افواج کا قیام کروایا۔ ابھی تک ان علاقوں کی آبادی نے اسلام قبول نہیں کیا۔ مزید حفاظت و تقویت کے نقطۂ نظر سے حضرت معاویہؓ نے یہاں مسلمانوں کی آبادی بسائی اور ان کو زمینیں دیں (معجم البلدان: ۵/۱۰۹)۔

ہم نے پہاڑی اور ساحلی ثغور کے ان انتظامات کی جو تفصیل دی ہے، لکھنے کو تو یہ چند سطروں میں سمٹ گئی،

۱۔ فتوح البلدان ص: ۱۲۹، وتاریخ دمشق ابن عساکر ۲۱/۳۵۶۔
۲۔ بغیۃ الطلب فی تاریخ حلب: ۱/۱۲۰۔

مگر ذرا اندازہ کیجیے کہ ان مقامات کی فتح، پھر انتظامات، خصوصا نئے خطوط پر ان کی آبادکاری اور نقل مکانی میں حکومت کے کتنے وسائل اور حضرت معاویہؓ اور ان کے کارندوں کی کیسی ذہنی صلاحیتیں اور توانائیاں خرچ ہوئی ہوں گی۔ اور یہ سب کس قدر پیہم کاوشوں اور انتھک محنتوں سے انجام پایا ہوگا۔ نیز یہ کہ یہ کس قدر ذہانت اور کامیاب منصوبہ بندی کا نتیجہ تھا! رضی اللہ عنہ وأرضاہ۔

بحریہ کا نظام:

حضرت معاویہؓ کے اہم ترین کارناموں میں ایک اسلامی بحریہ کی تاسیس تھی۔ ہم پیچھے تفصیل سے روشنی ڈال آئے ہیں کہ رومیوں سے اسلامی ممالک کا مستحکم دفاع ان کی طاقت ور بحریہ کا مقابلہ کیے بغیر ممکن نہیں تھا۔ رومیوں کے پاس دنیا کی سب سے بڑی بحریہ تھی، جو بحری راستوں سے کہیں بھی (بلا مبالغہ) لاکھوں کی تعداد میں فوج اتار سکتی تھی۔ شام و مصر اور شمال مغربی افریقہ کے ممالک ان کی بحری افواج کی براہ راست زد پر تھے، جہاں سے ان کے حملے ہوتے تھے اور ان ممالک میں اسلامی وجود کے لیے لگاتار خطرہ بنے رہتے تھے۔

مسلمان برّی جنگوں میں تو اپنے حوصلے اور شوق جہاد کے بل پر اپنے سے کہیں برتر طاقتوں پر بھاری پڑتے تھے، مگر رومیوں کی بحریہ کے سامنے کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ جس کی وجہ سے مصر اور فلسطین و شام کے ساحلی مقامات بار بار ہاتھ سے نکل جاتے تھے۔ یہ حضرت معاویہؓ کی اولوالعزم طبیعت اور خدا پر اعتماد کی بات تھی کہ ایسی ناقابل تسخیر نظر آنے والی بحری فوج کا مقابلہ کرنے کا ارادہ کر لیا۔

عہد عثمانی کے آغاز میں حضرت معاویہؓ نے پہلا بحری بیڑا تیار کروایا۔ اور ابو بحریہ عبداللہ بن قیس کو اپنا امیر البحر (Admiral) طے کیا۔ اسی مناسبت سے ان کو ''غازیۃ السفن'' کا لقب ملا تھا۔ یہ بہت صالح تابعی تھے۔ بنو امیہ ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ انہوں نے اللہ سے بڑی عاجزی سے دعا کی کہ: اے اللہ! میرے لشکر میں سے کوئی ایک بھی نہ ڈوبے۔ مرد خدا کی یہ دعا ایسی قبول ہوئی کہ بے شمار بحری مہمات میں ان کا ایک فوجی بھی ڈوب کر نہیں مرا، جبکہ ان کی سرگرمی و جولانی کا یہ حال تھا کہ تھوڑی سی مدت میں انہوں نے پچاس جنگی مہمات سر کیں [۱]۔

جس طرح بری فوجوں کے ذریعہ صوائف و شواتی کا سلسلہ تھا، اسی طرح بحری صوائف اور شواتی بھی ہوا کرتے تھے۔ جن میں مسلم افواج ساحلی علاقوں اور بحر متوسط کے اہم جزائر میں قائم رومی فوجی اڈوں پر حملے کرتیں۔

ابتدائی مہمات کی کامیابی کے بعد حضرت معاویہ نے مزید پیش قدمی فرماتے ہوئے بحر متوسط کے اہم جزائر پر مسلمانوں کے بحری اڈوں کے قیام کا مشن شروع کیا۔ یہ ایک اہم اور فیصلہ کن اقدام تھا۔ ان بحری اڈوں

---

۱ فتوح البلدان: ۱۳۴۔ طبری: ۲۶۰/۴۔

کے ذریعے بحر متوسط پر برتری قائم ہوئی اور مسلمان فوجی اور اقتصادی سپر پاور بن سکے۔ اس سلسلے میں پہلی کامیابی جزیرۂ قبرص سے رومیوں کو بے دخل کر کے حاصل ہوئی تھی، جہاں ۳۳ھ میں اسلامی افواج کو متعین کیا گیا تھا۔ ۵۲ھ یا ۵۳ھ میں روڈس فتح ہوا، یہ جزیرہ بحر متوسط کے مغرب میں بحر ایجہ کے دہانے پر واقع نہایت اہم اسٹریٹجک مقام ہے۔ رومیوں کا یہاں بحری اڈہ اور افواج تھیں، اس پر مسلمانوں کا قبضہ ایک اہم فتح تھی۔ اس کی فتح سے رومیوں کی بحر متوسط میں آمد ورفت متاثر ہوتی تھی۔ حضرت معاویہؓ نے وہاں ایک بڑا بحری اڈہ تعمیر کیا، قلعہ بنایا اور بحری افواج متعین کی گئیں۔ جن کی کشتیاں مسلسل سمندر میں گشت کرتی رہتی تھیں اور رومیوں کا راستہ روکتی تھیں۔ روڈس کے مسلم اڈے سے (اس کی اسٹریٹیجک جائے وقوع کی وجہ سے) بحر متوسط میں طاقت کا توازن مسلمانوں کے حق میں ہو گیا۔ اور رومیوں میں بہت خوف پیدا ہوا۔ سن ۵۴ھ میں ارواد (Cyzicus) جو قسطنطنیہ کے بالکل سامنے ایک جزیرہ نما تھا، فتح ہوا۔ وہاں بھی بحری اڈہ اور فوج متعین فرمائیں۔ اس کے بعد جزیرۂ کریٹ (اقریطش) کے ساحل پہ مسلم افواج نے قبضہ کر لیا۔ اس سے رومیوں کو بہت نقصان پہنچا۔ کیوں کہ اب ان کے لیے بحر متوسط میں داخلہ بہت مشکل بلکہ تقریباً ناممکن ہو گیا تھا[۱]۔

اسکندریہ (مصر) میں رومیوں کا ایک بہت بڑا فوجی کشتیاں بنانے کا کارخانہ تھا، اسی سے اسلامی بحریہ کا کل کام انجام پاتا تھا۔ حضرت معاویہ نے عکا (شام) کے بحری اڈے پر کشتیاں بنانے کا ایک مکمل نیا کارخانہ قائم کیا اور انجینئروں اور چوب کاروں کی ایک بڑی تعداد کو اس کام پر مامور کیا[۲]۔ دھیرے دھیرے حضرت معاویہ بحریہ کو ترقی دیتے رہے۔ اعلیٰ قسم کی فوجی کشتیوں کے کچھ حصے شام کی مختلف لکڑیوں کے ہوتے تھے اور کچھ مصر کی لکڑیوں کے۔

۵۴ھ میں حضرت معاویہ نے مصر کے گورنر مسلمہ بن مخلّد کو حکم دیا کہ مصری جزیرے ''الروضہ'' میں کشتی سازی کا ایک بڑا ترقی یافتہ کارخانہ بنایا جائے۔ یہ وہی سال ہے جب اسلامی بحری و بری افواج نے قسطنطنیہ کا سات سالہ محاصرہ شروع کیا تھا۔ اس کارخانے سے محاصرے میں نئے جہاز شامل ہوئے۔

مصر و شام کے ساحلوں پر بڑے اور منظم بحری اڈے بنائے گئے، جن کو ''رباط'' کہتے تھے، ان میں فوجی بیرکس ہوتی تھیں، اسلحہ کے ڈپو ہوتے تھے، غذائی اشیاء کا اسٹاک ہوتا تھا اور سمندری نگرانی کے لیے اونچے اونچے

---

۱ فتوح البلدان: ۲۳۳، نیز ملاحظہ ہو آر کی بالڈ لیوس کی کتاب
Naval Power and Trade in the Mediterranean:69-85

۲ عہد عثمانی میں ہم ذکر کر کے آئے ہیں کہ حضرت معاویہ نے عکا و صور میں رومیوں کے چھوڑے ہوئے کارخانوں کو کشتیوں کی مرمت کے قابل بنا لیا تھا (فتوح البلدان: ۱۲۰)۔

برج ہوتے تھے۔ یہ بحری اڈے جہاد کے بڑے اہم مراکز تصور کئے جاتے تھے اور جذبہ جہاد رکھنے والوں کے لیے منزل شوق بنے رہتے تھے[۱]۔ جب بحر متوسط کے اہم جزائر فتح ہوئے تو ان کو بھی رباط کا درجہ دیا گیا، جہاں بحریہ کے اسلحہ ڈپو، بیرکس اور قلعے وغیرہ بنائے جاتے تھے۔

آتش گیر اسلحہ کی ایجاد:

رومیوں کو بحری فنون جنگ اور اسلحہ سازی میں صدیوں کا تجربہ تھا۔ مسلمان اس میدان کے نووارد تھے۔ مگر حضرت معاویہؓ کی عبقری ذہانت وانتظام کہ مسلمانوں نے چند سالوں ہی میں بحری اسلحوں میں بھی رومیوں کی برابری کر لی۔ ان میں ایک خاص چیز یہ تھی کہ رومی بحری کشتیوں پر کچھ تیز جلنے والا کیمیکل پھینکتے تھے جس سے کشتیوں میں آگ لگ جاتی تھی۔ یہ آگ پانی سے بھی نہیں بجھتی تھی۔ حضرت معاویہ کے عہد میں مسلمانوں نے بھی ایسی آتش بار کشتیاں تیار کر لی تھیں جو جلتا ہوا مادہ دشمن کی کشتیوں اور بحریہ کے اڈوں پر پھینکتی تھیں۔ ان آتش بار کشتیوں کو حرقات یا محرّقات کہتے تھے۔ ۴۹ھ میں ایک بحری معرکے میں حضرت عبداللہ بن قیس کی جماعت کے پاس ہم آتش بار کشتیاں دیکھتے ہیں، جن کا رومی کشتیوں سے شعلہ زن مقابلہ ہوا اور اسلامی کشتیوں نے رومیوں کو شر رفشانی میں شکست دے دی (تاریخ دمشق: ۳۲/۱۱۹)۔

فوجیوں کی تنخواہیں:

فوجیوں کی Ranks اور تنخواہوں میں کافی تفاوت پایا جاتا تھا۔ عام سپاہیوں کی تنخواہ تین سو ۳۰۰ درہم سالانہ سے ایک ہزار تک ہوتی تھی۔ اہم لوگوں کی تنخواہ پندرہ سو اور دو ہزار بھی ہوتی تھی (معاویہ للصلابی: ۲۹۳)۔ یہ فرق اسلامی خدمات اور دینی درجہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قربت کی بنا پر رکھا گیا تھا، یا اسلامی ریاست کے لیے خدمات کے پیش نظر کیا گیا تھا۔ ہم جتنی تفصیل سے حضرت معاویہؓ کے نظام حکومت کا جائزہ لیتے ہیں اتنا ہی زیادہ امام زہری کے قول کا مصداق سامنے آتا جاتا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے سیدنا عمر فاروق کی سیاست اور طرز کی مکمل اتباع کی کوشش کی۔ اس معاملے میں بھی حضرت معاویہؓ نے حضرت عمر فاروق کی اتباع کی تھی۔ جب سلطنت کا تفصیلی نظام عہد فاروقی میں ترتیب پا رہا تھا تو ریاستی گورنروں کو حضرت عمرؓ نے تنخواہوں (عطاء) کا یہی نظام بنا کر دیا تھا۔ جس میں اہم اور بڑی شخصیات کی تنخواہیں دو سو دینار (جو دو ہزار درہم کے برابر ہوتا تھا) رکھیں۔ مصر کے گورنر جنرل حضرت عمرو بن العاص کو فرمان گیا کہ بیعت الرضوان والے صحابہ کی تنخواہ دو سو دینار طے کرو۔ اپنی بھی اتنی ہی رکھو اس لیے کہ تم گورنر ہو۔ حضرت خارجۃ بن حذافۃ اور حضرت بسر بن ارطاۃؓ کے

۱۔ الامویون والبیزنطیون ۷۶۔۸۰۔

لیے بھی کہا کہ وہ نہایت دلیر فوجی جنرل ہیں، جنہوں نے متعدد فتوحات میں اہم کردار ادا کیا ہے، اس لیے ان کی بھی دوسو اور حضرت عثمان بن قیس سہمیؓ اور حضرت عمیر بن وہب جمحیؓ کے لیے بھی فرمایا کہ وہ بڑے سردار ہیں، مہمانوں کی کثرت رہتی ہے، اس لیے ان کی بھی دوسو تنخواہ طے کرو، اس اعلیٰ درجے کے مرتبہ کو عطاء الشرف کہتے تھے (الاموال للقاسم بن سلام: ۲۸۸، ۲۸۹، فتوح مصر: ۲۵۸)۔

تنخواہوں کے یہ تمام اخراجات عموماً خراج اور جزیہ کی آمدنی سے پورے ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ مدینہ میں افواج کی تنخواہوں کا انتظام مشکل ہو رہا تھا۔ گورنر مروان نے حضرت معاویہؓ کو لکھا کہ ایک لاکھ درہم کی کمی پڑ رہی ہے۔ حضرت معاویہؓ نے کہا کہ یمن سے صدقہ کی رقم آ رہی ہے۔ اس کا گزر مدینہ سے ہوگا، تم اس میں سے لے لینا۔ مروان نے مدینہ کے رؤساء کو بتایا کہ امیر المومنین نے ایسا کہا ہے۔ تو انہوں نے کہا کہ ہماری تنخواہ صدقے سے نہیں، خراج اور جزیہ سے ادا ہوتی ہے، ہم صدقے سے نہیں لیں گے۔ حضرت معاویہؓ سے رجوع کیا گیا تو انہوں نے دار الخلافہ سے ایک لاکھ درہم بھیجے (الاموال: ۳۳۰)۔

سولھواں باب

محکمۂ عدل

محکمۂ عدل کا خصوصی اہتمام:

حکومت کے صیغوں میں حضرت معاویہؓ کو خصوصاً عدلیہ کا بہت اہتمام تھا۔ تمام اقالیم وصوبہ جات کے نظام قضا کی براہ راست اور گہری نگرانی فرماتے تھے۔ عدالتیں بے لاگ انصاف کرتیں۔ قاضی بے خوف ہوکر اور مکمل طور پر غیر جانب داری کے ساتھ کام کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کے عہد میں اس شعبے میں انتظامی طور پر بھی کافی ارتقا ہوا۔ اسلامی حکومت کے مقاصد میں ایک اہم مقصد عدل وانصاف کا بے لاگ قیام بھی ہے۔ کسی ریاست یا کسی قوم کی اجتماعی زندگی میں محکمۂ عدل کا کیا مقام ہوتا ہے، اس سلسلے میں حضرت معاویہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے یہ حدیث روایت کرتے تھے:

لا قدست أمة لا يأخذ ضعيفها حقه من قويها وهو غير مضطهد۔

وہ امت خدا کی رحمت سے محروم ہوتی ہے جس کا کمزور بغیر ظلم وزیادتی کے طاقت ور سے اپنا حق حاصل نہ کرلیتا ہو۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ محکمۂ عدل کا اپنی مکمل اسپرٹ کے ساتھ قیام حکومت اور ریاست کو خدا کی رحمت وفضل سے فیض یاب رکھنے کے لیے اہم شرط ہے۔ حضرت معاویہؓ نے یہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے خود سن رکھی تھی، مگر ان کو اس کا ایسا اہتمام اور فکر تھا، کہ محض اطمینان کے لیے، مصر کے افسر افواج مسلمہ بن مخلد کو سرکاری ڈاک کے ذریعہ خط بھیجا کہ ذرا گورنر جنرل عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے پوچھو، انہوں نے بھی یہ حدیث سنی ہے؟ جواب کے متعلق حکم دیا کہ سرکاری ڈاک کے ذریعہ ہی جواب دیا جائے۔ وہاں سے جواب آیا کہ جی ہاں وہ تصدیق کرتے ہیں[۱]۔ اس سے خوب اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو اپنی حکومت میں عدل وانصاف کے قیام کا کیسا فکر واہتمام تھا۔ اور وہ مسلمانوں کے بحیثیت ''امت مسلمہ'' کے بقا اور ریاست کے استحکام وبرکت کے لیے نظامِ

---

۱ المعجم الکبیر: ۱۹/ ۳۸۷، مسند الشامیین: ۱/ ۱۹۰ بسند صحیح۔

عدل کو کیسا ضروری خیال کرتے تھے۔

خلافت راشدہ کے نظامِ عدل کا تسلسل:

حضرت معاویہؓ نے اپنے عہد حکومت میں محکمۂ عدل کو انہی بنیادوں پر استوار رکھا جن میں وہ خلافت راشدہ کے دور میں تھا۔ اسلامی نظام عدل وقانون کے مورخ استاذ محمد الزحیلی لکھتے ہیں کہ حضرت معاویہ کا عہد مختلف پہلوؤں سے خلافت راشدہ کا ایک تسلسل تھا۔ علم وفقہ اور محکمۂ قضا میں بڑی تعداد میں صحابہ اور کبار تابعین ذمہ داریاں ادا کرتے آئے تھے (تاریخ القضاء فی الاسلام: ۱۶۷)۔ عہد فاروقی کے مشہور قاضی شریح جیسے خلافت راشدہ کے قاضیوں کی ایک جماعت اس دور میں بھی مصروف عمل رہی۔ خلافت راشدہ کے عہد میں تمام خلفاء قضاء کا منصب بھی سنبھالتے تھے، حدیث کی کتابوں میں بہت سی روایات بتاتی ہیں کہ حضرت معاویہؓ خود بھی خلفاء راشدین کے دور سے ہی قضاء کا فریضہ انجام دیتے تھے۔ خلیفہ بننے کے بعد بھی یہ کام انجام دیتے رہے۔ (مثلاً دیکھیے: موطا، باب جامع عقل الاسنان)۔

حضرت معاویہ کو عدالتی نظام کے اصول کی تعلیم حضرت عمر فاروقؓ نے دی تھی:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد امت کی تعلیم وتربیت میں اور اس کے اجتماعی نظام کی تشکیل کے سلسلے میں حضرت عمر فاروقؓ کا کردار لاثانی ہے۔ صدیق اکبرؓ کی فضیلت وعالی مرتبی کے باوجود ملتِ اسلام کے عظیم ترین معمار عمر فاروقؓ ہیں۔ اور یہ نبوی پیشین گوئی کے عین مطابق تھا۔ نظام قضا کے خطوط بھی انہوں نے ہی طے فرمائے تھے، جس کی تعلیم علماء واصحاب قضاء دیتے آئے ہیں۔ خلافت راشدہ کے گورنر عموماً قضا کی ذمہ داری بھی سنبھالتے تھے۔ اس لیے حضرت معاویہؓ کو خود قضاء کا طویل تجربہ تھا۔ ان کا مقام صحابہ کے اہل علم میں تھا۔ حضرت عمرؓ نے حضرت معاویہؓ کے ذمہ جب مملکت شام کی امارت کی تھی، تو قضاء کا عہدہ بھی (حسب معمول) ان کے سپرد کیا تھا۔ اس سلسلے میں ایک مکتوب میں اسلامی عدالت کے بنیادی اصول یہ بھی تحریر فرمائے تھے۔

> ''میں تم کو پورے اہتمام کے ساتھ اصولِ قضاء لکھتا ہوں۔ چند باتوں کی پابندی کرو، تمہارا دین محفوظ رہے گا اور افضل عمل کا درجہ حاصل ہوگا۔

(۱) جب مدّعی مدّعا علیہ حاضر ہو جائیں تو ضابطے کے مطابق معتبر گواہوں کے گواہی کے مطابق یا صریح قسم لے کر فیصلہ کرنا۔

(۲) کمزور کو اپنے قریب کرنا تاکہ جرأت واطمینان سے اپنا مدّعا پیش کر سکے۔

(۳) دور سے آئے شخص کو عدالت قاضی جلد وقت دے، اگر اس کو دیر لگے گی تو حق چھوڑ کے چلا جائے گا۔ اور اس حق

تلفی کی ذمہ داری قاضی پر ہوگی جس نے اس کی شکایت سننے میں دیر کی۔

(۴) جب انصاف کے مطابق کوئی فیصلہ سمجھ میں نہ آئے، تو کوشش کرکے صلح کرادی جائے'' (اخبار القضاۃ: ۱/ ۷۵)۔

کوفہ کے گورنر حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو پہنچنے والے ایک فرمان میں، جو غالباً تمام گورنروں کے نام جاری ہوا تھا اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو بھی ملا ہوگا، ارشاد فرماتے ہیں:

''قضاء وعدالت کا قیام ایک ضروری فرض اور دین حنیف کا لازم الاتباع حصہ ہے۔

(۱) جب دلیل پیش کی جائے تو خوب اچھی طرح مسئلے کو سمجھو۔ اور جب حق واضح ہو جائے تو اس کے مطابق فیصلہ کرو۔

(۲) قاضی کے فیصلے کا عملی نفاذ بھی حکومت کی ذمہ داری ہے۔ صرف فیصلہ دے دینا کافی نہیں۔

(۳) سب کے ساتھ مساویانہ سلوک ہونا چاہیے۔ تاکہ کمزور انصاف سے مایوس اور طاقتور کو غلط فیصلے کی توقع نہ ہو سکے۔

(۴) نظام قضا کا اصول یہ ہے کہ مدعی گواہ پیش کرے ورنہ منکر کی قسم پر فیصلہ کیا جائے۔ فریقین میں ہر وقت صلح جائز ہے، سوائے اس صلح کے جس میں کسی حرام کو حلال یا حلال کو حرام قرار دیا جائے۔

(۵) قاضی کو اپنا فیصلہ واپس لینے کا حق ہے۔ کسی مسئلے میں اگر علم ہو جائے کہ فیصلہ غلط ہو گیا تو اس سے رجوع کرکے حق کے مطابق فیصلہ دینا ضروری ہے۔

(۶) جس مسئلے میں کتاب وسنت سے کوئی حکم نہ ملے اس میں خوب غور وفکر سے کام لے کر (حق وانصاف کے تقاضوں کے مطابق، اجتہاد سے) فیصلہ کیا جائے۔ جس کا طریق یہ ہے کہ قیاس سے فیصلہ کیا جائے اور یہ غور کیا جائے کہ شارع کی منشا کے مطابق کیا ہے۔

(۷) مقدمہ کی کوئی تاریخ متعین ہونی چاہیے۔ مدعی اگر گواہ پیش کرنے کو کہے تو اس کے لیے کوئی وقت مقرر کیا جائے۔ اس کے بعد (منکر سے قسم لے کر) اس کے خلاف فیصلہ دے دیا جائے۔

(۸) گواہی کا اصول یہ ہے کہ ہر مسلمان کو عادل (قابل گواہی) تسلیم کیا جائے گا، الا یہ کہ کسی نے قابل حد جرم کیا ہو، یا جس نے کبھی پہلے جھوٹی گواہی دی ہو، یا جو کسی فریق کا قریبی رشتہ دار ہو۔

(۹) عدالت میں صرف ظاہری ثبوتوں اور گواہیوں پر فیصلہ کیا جائے گا، باطن اللہ کے حوالے۔

(۱۰) قاضی لوگوں سے خشونت ودرشتی سے نہ پیش آئے۔ اس لیے کہ اس کا کام حق کی مدد کا اور ایک ثواب کا کام ہے [۱]۔

اسلامی حکومت میں یہی گویا محکمۂ عدل کے بنیادی قوانین ہیں اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد میں یہی عدلیہ کے اصول کار تھے۔

امیر المومنین حضرت معاویہ نہایت عادل ومنصف حکمراں:

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عدل وانصاف کا یہ حال تھا کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ جو عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں، اور

---

[۱] سنن دار قطنی: ۱/ ۴۴۷، ۴۴۷۲، سنن بیہقی الصغیر: ۳۲۵۹۔

خلافت راشدہ کے اہم اساطین حکومت میں سے تھے۔ انہوں نے معاویہ کے عدل وانصاف کے اعلیٰ مرتبہ ومعیار کی شہادت دی ہے۔ صحیح سند سے وارد ہے کہ حضرت سعدؓ فرماتے تھے: میں نے معاویہ سے زیادہ (ان کے دور میں) حق کے مطابق فیصلہ کرنے والا نہیں دیکھا[۱]۔ امام سلیمان بن مہران الاعمش کی مجلس میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کے عدل گستری کا تذکرہ ہورہا تھا کہ امام موصوف نے فرمایا: تم اگر حضرت معاویہؓ کو دیکھتے تو کیا کہتے؟ لوگوں نے پوچھا ان کے حلم وشرافت کے بارے میں؟؟ کہا نہیں خدا کی قسم ان کا عدل وانصاف!! (السنۃ للخلال: ۲/۷ ۴۳)۔

محکمۂ عدل کی خودمختاری اور استقلال:

نظام حکومت میں شفافیت اور عدلیہ کی آزادی کا تقاضہ ہے کہ انتظامیہ اور عدلیہ الگ ہوں۔ اور انتظامیہ عدلیہ کے کاموں میں کسی قسم کی دخل اندازی نہ کرے۔ اسلامی نظام حکومت میں حضرت عمرؓ نے ابتداءً اس طرز کی داغ بیل ڈال دی تھی۔ اور مختلف شہروں میں حکام سے الگ مستقل قاضیوں کی تعیین کی گئی تھی۔ لیکن اکثر گورنر خود قاضی بھی ہوا کرتے تھے، اور ان کے ساتھ تعاون کے لیے قاضی بھی مقرر ہوتے تھے۔ خصوصا خلفاء راشدین مرکزِ خلافت میں خود قاضی کا منصب بھی اپنے پاس رکھتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کو اور حضرت عمرؓ نے حضرت سائب بن یزید کو اپنا نائب مقرر کیا تھا۔

لیکن عدلیہ کی خودمختاری کو یقینی بنانے کے لیے سب سے پہلے حضرت معاویہؓ نے مکمل طور پر عدلیہ کو ایک مستقل شعبہ قرار دیا۔ اور اس ذمہ داری سے خود سبک دوشی اختیار کی۔ اس طرح انتظامیہ اور عدلیہ کی علحٰدگی کا کام مکمل طور پر انجام پایا۔ اور عدلیہ کے سامنے حکمرانوں کی جوابدہی کو یقینی بنایا گیا۔ امام زہری اور امام مالک فرماتے ہیں کہ پہلے خلیفہ خود قضا کا کام انجام دیا کرتے تھے۔ سب سے پہلے حضرت معاویہؓ نے مستقل قاضی مقرر کیا۔ (اخبار القضاۃ: ۱/ ۱۰۵، ۱۱۱)۔

صوبوں میں بھی مستقل قاضیوں کا تقرر کیا گیا۔ مدینہ میں سب سے پہلے مستقل قاضی حضرت عبداللہ بن نوفل بن الحارثؓ مقرر ہوئے[۲]۔ یہ مروانؒ کی گورنری کا دور تھا۔ حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں میں نے گورنر سے الگ پہلا جو مستقل قاضی دیکھا وہ یہی عبداللہ ہیں۔ یہ رسول اللہ ﷺ سے شکل میں مشابہ تھے۔ (طبقات

---

[۱] تاریخ دمشق 59 / 161، بسند صحیح۔

[۲] یہ رسول اللہ ﷺ کے خاندان بنوہاشم کے ایک بڑے معزز فرد تھے۔ ببّہ لقب تھا، ان کے والد نوفل رسول اللہ ﷺ کے چچازاد بھائی کے بیٹے تھے۔ حضرت معاویہؓ کے بھانجے ہوتے تھے، ان کی والدہ حضرت ابوسفیانؓ کی بیٹی ہند تھیں۔ جب یہ پیدا ہوئے تو ان کی والدہ نے ان کو اپنی بہن ام المومنین حضرت ام حبیبہ کے پاس بھیج دیا کہ رسول اللہ ﷺ سے تحنیک کرادیں۔ آپ ﷺ نے اپنا لعاب مبارک بچے کے منہ میں ڈالا۔ (طبقات بن سعد: ۵/ ۱۷)۔

بن سعد: ۴/ ۳۳۳)۔ دوسرے گورنروں نے بھی یہی طرز اختیار کیا اور محکمۂ عدل سے اپنے آپ کو بے دخل کرلیا (تاریخ القضاء: زحیلی: ١٦٦)۔ یہ حضرت معاویہؓ کا کارنامہ کا تھا جس کے نتیجہ میں عدلیہ، انتظامیہ سے الگ مستقل شعبہ اور خودمختار قرار پائی۔ ہر ضلع اور شہر میں عدالتیں قائم تھیں۔ صوبوں کے صدر مقام کے علاوہ ہر ضلع میں عدالتیں قائم تھیں، تاکہ لوگوں کو انصاف پانے کے لیے صوبوں کے صدر مقام کا سفر نہ کرنا پڑے۔ مثلاً مدینہ کی گورنری میں شہر یمامہ کی عدالت کا تذکرہ ابھی آگے آتا ہے۔

حضرت معاویہؓ کی نظر میں منصب قضاء کی نزاکت:

حضرت معاویہؓ کے نزدیک قضاء کا منصب حقیقت میں امانت کا ایک بھاری بوجھ تھا، جس بوجھ کو وہ اپنے لیے بھی بھاری سمجھتے تھے اور اس سلسلے میں عنداللہ جوابدہی سے ڈرتے تھے۔ حضرت فضالہؓ ایک بڑے ذی علم اور عالی مقام صحابی تھے۔ احد اور مابعد تمام غزوات نبوی میں شریک رہے تھے۔ حضرت عمرؓ نے ان کو دمشق کا قاضی مقرر کیا تھا۔ پھر حضرت معاویہؓ نے اپنے دور میں دوبارہ ان کو یہ ذمہ داری تفویض کی۔ انہوں نے از راہ تقویٰ بچنا چاہا۔ حضرت معاویہؓ نے فرمایا: یہ میں آپ کو کچھ دے نہیں رہا۔ بلکہ ایک نازک ذمہ داری سپرد کررہا ہوں۔ اور خود اپنے کو اللہ کی پکڑ سے بچانے کے لیے آپ کو یہ کام سپرد کیا ہے۔ اس لیے تقوے اور خوف خدا کے ساتھ کام کیجیے گا[۱]۔

منصب قضا کے لیے باکردار و خوش نام پس منظر رکھنے والوں کا انتخاب:

قاضی کے لیے حضرت معاویہؓ کا کیا معیار تھا، اس کا اندازہ ان کے عہد کے قاضیوں کے احوال اور علمی مقام پر نظر ڈال کر بخوبی ہوسکتا ہے۔ حضرت معاویہؓ اپنے گورنروں کو خاص طور پر تاکید کرتے تھے کہ قضاء کے منصب پر عرب کے شریف و اعلیٰ خاندانوں کے امانت دار اور بھروسہ مند لوگوں ہی کا تقرر کیا جائے۔ مصر کے گورنر کو ایک خط میں ہدایت جاری کی کہ (وہاں مقیم قبائل میں سے) کسی ازدی یا حضرمی کو ہی قاضی بنانا۔ اس لیے کہ یہ دونوں قبائل امانت داری میں مشہور ہیں۔ (رفع الاصر: ۱۸۸)۔

عدل کا پاسبان نظام اور اہل علم و تقویٰ قاضی:

ان کے دور میں محکمۂ قضا اپنی پوری اسلامی اسپرٹ اور عدل کے تقاضوں کے مطابق کام کرتا تھا۔ اس کا یقینی ثبوت ان کے عہد کے قاضیوں کی شخصیت و کردار اور ان کے امانت کے معیار اور تدین و صلاح کو دیکھ کر فراہم ہوجاتا

[۱] تاریخ ابی زرعہ: ۱۱۹۹، بسند حسن۔ تاریخ دمشق: ۴۸/ ۳۰۲۔

ہے۔حضرت معاویہؓ نے مختلف اقالیم کے گورنروں کو اپنے قاضیوں کے انتخاب کا اختیار دے رکھا تھا، البتہ کبھی خود بھی مختلف جگہوں پر قاضی مقرر کر دیا کرتے تھے (تاریخ القضا: زحیلی: ۱۷۲)۔قاضیوں کے انتخاب میں بنیادی طور پر تو دو چیزیں ضروری تھیں۔(۱) علم وفقہ، قضا کا سلیقہ اور فہم وذکا۔(۲) پاکبازی وتقویٰ اور راستبازی۔

حضرت معاویہؓ کے قاضیوں کی شخصیتوں پر نظر ڈالنے سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ نظام حکومت کس قدر عدل وانصاف پر قائم تھا۔ یہ سب امت کے بلند مقام اہل علم وفقہ اور تقویٰ ودیانت میں ممتاز شخصیات تھیں، جن کے علم وتقویٰ اور دیانت داری کا عام اعتراف کیا جاتا تھا۔اور محض ان کی شخصیتیں ہی عدلیہ کے اعلیٰ معیار انصاف اور امانت وغیر جانب داری کی ضمانت تھیں۔

دمشق کے قاضی حضرت فضالہ بن عبیدؓ اور حضرت نعمان بن بشیرؓ:

مثلاً خود حضرت معاویہؓ کے پاس دار الحکومت دمشق کے قاضی حضرت فضالہ بن عبیدؓ تھے۔ یہ ایک قدیم الاسلام صحابی تھے، غزوۂ بدر میں تو شریک نہیں ہو سکے، لیکن اس کے بعد تمام غزوات میں شرکت فرمائی۔اصحاب بیعت رضوان میں سے تھے۔علم وفضل کے علاوہ جہاد میں بھی کارنامے انجام دیے۔بحریہ کے اہم جرنیلوں میں شمار تھا۔شام اور مصر میں بری وبحری مہمات کے قائد رہے۔قاضیوں کے انتخاب میں حضرت معاویہؓ بزرگ صحابہ سے مشورہ فرماتے تھے۔دمشق میں حضرت عمرؓ نے نہایت صالح وصاحب علم صحابی حضرت ابوالدرداءؓ کو قاضی اور دینی نگراں ومعلم کے عہدے پر مقرر فرمایا تھا۔حضرت معاویہ کی گورنرشپ کا بڑا زمانہ ان کے ساتھ ہی گزرا۔ عہد عثمانی میں ان کی وفات ہوئی۔ جب ان کا آخری وقت آیا تو حضرت معاویہؓ نے ان سے ہی پوچھا کہ آپ کے بعد کس کو یہ ذمہ داری دی جائے؟ انہوں نے حضرت فضالہؓ کا نام لیا۔

حضرت فضالہؓ بڑے صاحب ورع وانابت بزرگ تھے۔فرمایا کرتے تھے: کاش میرا ایک دانہ صدقہ اللہ قبول فرما لے، یہ مجھے دنیا بھر کی دولت سے زیادہ عزیز ہے۔ایک صاحب نے آکر عرض کی: حضور کچھ نصیحت فرمادیں۔ارشاد فرمایا: اگر ہو سکے تو گمنام بن کر رہو۔بہتر یہ ہے کہ تم اہل علم کی باتیں سنو اور کوئی تم سے کچھ نہ سننا چاہے۔اور تم اہل علم وفضل کی مجلسوں میں حاضر ہو اور تمہارے پاس کوئی نہ آئے۔یہ گم نامی کی حالت بہت اچھی ہے (تاریخ دمشق: ۴۸/۳۰۵)۔حضرت معاویہؓ کو ان پر بڑا اعتماد تھا۔حضرت معاویہؓ دمشق سے باہر جاتے تو وہ ان کے نائب ہوتے تھے۔حضرت فضالہؓ نے سن ۵۳ ہجری میں وفات پائی۔ جب ان کا جنازہ اٹھا تو حضرت معاویہؓ نے

خود کندھا دیا اور اپنے بیٹے عبداللہ سے کہا: آؤ یہ سعادت حاصل کرلو، پھر کبھی اس جیسی شخصیت کا جنازہ نہیں ملے گا[1]۔

ان کے بعد حضرت نعمان بن بشیرؓ کو یہ منصب تفویض کیا گیا جو صغار صحابہ میں سے بڑے صاحب علم شخصیت تھے۔

مدینہ کے قاضی حضرت مروان بن الحکمؒ:

مدینہ طیبہ میں پہلے قدیم دستور کے مطابق والی مدینہ مروان بن الحکم ہی قضا کی ذمہ داری ادا کرتے تھے۔ جن کا علم وفضل معروف ہے۔ ائمہ حدیث وفقہ ان کے خوشہ چین رہے ہیں۔ سن دو ہجری میں ولادت ہوئی۔ بعض علماء ان کو صحابی شمار کرتے ہیں۔ جب کہ دیگر حضرات کے نزدیک وہ کبار تابعین اور اس نسل کے ائمۂ علم میں ہیں۔ عمر کا بڑا حصہ مدینہ میں گزارا۔ امام مالک، امام بخاری وغیرہ تمام ائمہ نے ان کی سند سے احادیث روایت کی ہیں۔ اور سب کا ان کی ثقاہت وعدالت پر اعتماد ہے۔ یہاں تک کہ حضرت سہل بن سعد ساعدی صحابیؓ بھی ان سے روایت بیان کرتے ہیں، جو صحیح بخاری میں ہے۔ محدثین ان کو صدق وامانت سے متصف کبار علماء میں بتاتے ہیں۔ عہد صحابہ ہی میں وہ صاحب علم شخصیت کے طور پر معروف تھے۔ اور اس درجہ کے عالم اور اصحاب افتا میں شمار ہوتے تھے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پہلو بہ پہلو ان کی علمی آراء اور فتوے نقل کیے جاتے تھے[2]۔ وہ حضرت ابو ہریرہؓ جیسے صاحب علم شخصیت کی آراء پر تنقید کرتے تھے اور تحقیق کے بعد حضرت ابو ہریرہ اپنی رائے سے رجوع کرتے تھے (موطا، باب صیام الذی یصبح جنبا)۔

خصوصا امام مالک تو ان کے فتووں اور عدالتی فیصلوں کو بہت اہمیت دیتے ہیں اور ان کو شرعی استدلال میں پیش کرتے ہیں۔ طلاق کے ایک مسئلہ میں ان کا ایک عدالتی فیصلہ نقل کر کے کہتے ہیں: میں نے جتنے اقوال سنے ہیں اس میں مجھے مروانؒ کا فیصلہ سب سے اچھا لگا۔ یہی نہیں اپنے خاص شیخ واستاد امام قاسم بن محمد بن ابی بکر (جو مدینہ کے فقہاء سبعہ میں سے تھے) کے بارے میں نقل کرتے ہیں کہ ان کو مروان کا یہ فیصلہ بہت پسند آیا (موطا: باب مایجب فیہ تطلیقۃ واحدۃ)۔ حضرت قاسم کے والد محمد بن ابی بکر حضرت معاویہؓ کی فوج کے ہاتھوں ہی قتل کیے گئے تھے۔ مگر سلف صالحین کی کشادہ دلی اور بلند ظرفی کی مثال دیکھیے کہ امام قاسم اسی حکومت کے ایک اہم رکن کی اس طرح تحسین فرماتے ہیں۔ حافظ ابن حجر بعض اکابر سے نقل کرتے ہیں: امام مالک اور دیگر ائمہ کا مروان کی روایات پر تکیہ تھا۔ (ھدی الساری: ۶۶۴) موطا وبخاری میں ان کے بارے میں آتا ہے کہ شرعی مسائل کی سنت کے مطابق تحقیق کا خاص اہتمام رکھتے تھے۔ امام احمد کہتے تھے کہ وہ فیصلوں اور مسائل میں حضرت عمرؓ کی اتباع کرتے تھے (البدایہ والنہایہ: ۸/ ۲۸۳)۔

---

[1] اخبار القضاۃ: ۳/ ۱۹۹، سیر: ۳/ ۱۱۳، الاصابۃ: ۵/ ۲۸۳، تاریخ ابی زرعہ: ۱۱۹۹۔

[2] ملاحظہ ہو موطا، باب ماجاء فیمن احصر بغیر عدو۔

حضرت عبداللہ بن حارث بن نوفلؒ:

پھر جب حضرت معاویہؓ کے عہد میں عدلیہ کو منتظمہ سے جدا کر کے مستقل شعبہ بنایا گیا تو گورنر مروان بھی اس ذمہ داری سے سبک دوش ہوئے اور عبداللہ بن حارث بن نوفل کو قاضی مقرر کیا گیا۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچازاد بھائی نوفل کے پوتے تھے اور حضرت ابوسفیانؓ کے نواسے تھے۔ عہد نبوی میں پیدا ہو گئے تھے، حصول برکت کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس لائے گئے۔ آپ نے اپنا لعاب مبارک ان کے منہ میں ڈالا۔ حضرت عمرؓ کے خاص منظور نظر تھے، چنانچہ سفر شام میں ان کو اپنے ساتھ لے گئے تھے (تاریخ دمشق: ۲۷/ ۳۱۳)۔ اختلاف کے دور میں حضرت علیؓ کے کیمپ کے اہم لوگوں میں تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے ان کو بصرے میں اپنا قائم مقام گورنر بھی بنایا تھا۔ حضرت حسنؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان مصالحت میں حضرت حسن نے انہی کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا تھا[۱]۔ مگر حضرت معاویہؓ کی حکومت میں قاضی بنائے گئے۔ ذہبی کہتے ہیں کہ اپنے زمانے میں بنی ہاشم کے سرداروں میں تھے (سیر الاعلام: ۳/ ۲۵۹)۔

جب قاضی بنائے گئے تو پہلا مقدمہ جو پیش ہوا وہ حضرت معاویہؓ کے ایک قریبی رشتہ دار اور گورنر مدینہ مروانؒ کے بہنوئی ابن حنطب کا تھا۔ انہوں نے بے تکلف ابن حنطب کے خلاف فیصلہ دیا۔ مروان نے اس سلسلے میں کچھ استفسار کیا تو انہوں نے نہایت صفائی اور بے پروائی سے مقدمے کی تفصیل بتائی اور اپنا فیصلہ قائم رکھا۔ مروان کو یہ بے لاگ طرز بہت پسند آیا اور اس کے بعد وہ ان کا مزید اکرام کرنے لگے (اخبار القضاۃ: ۱/ ۱۱۴)۔

حضرت ابوہریرہؓ:

ان کے بعد مدینہ میں قاضی کے منصب پر حضرت ابوہریرہؓ جیسا عالم صحابی جلوہ افروز ہوا۔ مروان کو جب بھی مدینہ سے کہیں باہر جانا ہوتا تو حضرت ابوہریرہؓ ان کے مستقل قائم مقام ہوتے تھے۔ (طبقات ابن سعد: ۴/ ۲۵۰)۔ حضرت ابوہریرہ کے دینی و علمی مقام کی شہرت کی بنا پر مزید کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔

ابوسلمہ بن عبدالرحمان بن عوفؓ:

حضرت معاویہ کے عہد میں مدینہ کے منصب قضاء پر کبار تابعین میں سے ایک جلیل القدر عالم مامور ہوئے، یہ حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ کے صاحب زادے ابوسلمہؒ تھے۔ حدیث وفقہ کی بڑی شخصیت تھے۔ امام ذہبی کہتے ہیں کہ تحصیل علم کا غیر معمولی شغف تھا۔ بڑے مجتہدین میں سے تھے۔ اپنے دور کی نہایت بلند مرتبہ شخصیت تھی (سیر: ۴/ ۲۸۹)۔ علم وفضل کا یہ حال تھا کہ مشہور تابعی محدث ابواسحاق سبیعی کہتے ہیں:

---

۱ طبقات بن سعد، القسم المتمم للصحابہ، الطبقۃ الخامسۃ: ۱/ ۶/ ۱۷۶، ۳۲۲۔

ابو سلمة فی زمانه خیر من ابن عمر فی زمانه۔

اپنے زمانے میں جو حیثیت عبداللہ بن عمرؓ کی تھی، ابوسلمہ کا مقام اپنے زمانے میں اس سے بلند تھا۱۔

قاضی بصرہ حضرت عمران بن حصینؓ :

بصرہ کے اہم قاضیوں میں حضرت عمران بن حصینؓ تھے۔ یہ صحابہ میں علمی و دینی مرتبے میں ممتاز تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ متعدد غزوات میں شریک رہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احترام و تعظیم کا یہ حال تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ کو بیعت اسلام کے وقت جو داہنے ہاتھ سے لمس کیا تو پھر اس کو کبھی شرم گاہ تک نہیں لے گئے ۲۔ صحیح مسلم (۱۲۲۶) میں خود ان کا بیان موجود ہے کہ مجھے فرشتے سلام کیا کرتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے ان کو بصرہ میں دینی معلم و مرجع بنا کر بھیجا تھا۔ بصرہ کو بہت سے صحابہ کی قدم بوسی کا شرف حاصل ہوا، مگر حضرت حسن بصریؒ حلفیہ کہتے تھے: بصرے میں عمران بن حصینؓ سے افضل کوئی نہیں آیا (سیر: ۲/۵۰۸) جو حق سمجھتے تھے، بے خوف کہتے تھے۔ خلفاء کی رائے کے خلاف بے محابا فتویٰ دیتے تھے اور ان کی رائے پر آزادانہ تنقید کرتے تھے۔ آزادی رائے اور تنقید میں یہ بھی جاننا چاہئے کہ حضرت عمرؓ اور حضرت معاویہؓ حج اور عمرہ ایک ساتھ کرنے (یعنی قران و تمتع) سے منع کرتے تھے۔ حضرت عمران بن حصینؓ برملا کہتے تھے کہ یہ رائے غلط ہے۔ قرآن اور حدیث سے ثابت ہے کہ قران و تمتع جائز ہیں، جو اس کے خلاف کہتا ہے (اشارہ حضرت معاویہؓ کی طرف تھا) اپنی رائے سے کہتا ہے۔ قَالَ رَجُلٌ بِرَأْيِهِ بَعْدُ مَا شَاءَ ۳۔

حضرت زرارہ بن اوفی :

پھر ان کے شاگرد حضرت زرارۃ بن اوفیٰ قاضی مقرر ہوئے۔ امام ذہبی ان کا تذکرہ ''الامام الکبیر'' کہہ کر شروع کرتے ہیں۔ عہد تابعین میں بصرے کے کبار علماء و صلحاء میں سے تھے۔ علماء صحابہ مثلاً حضرت انسؓ اور حضرت ابن عباسؓ کے شاگرد تھے۔ خوف وخشیت کا یہ حال تھا کہ (صحیح سند سے وارد ہے کہ) ایک دن فجر پڑھا رہے تھے، جب یہ آیت پڑھی "فاذا نقر فی الناقور" (جب (قیامت کے) صور میں پھونک ماری جائے گی) بس خوف سے روح پرواز کر گئی (سنن ترمذی: ۴۴۵، سیر: ۴/۵۱۵)۔

قاضی کوفہ حضرت شریحؒ :

کوفہ میں سب سے بڑے قاضی شریح تھے۔ کچھ روایات ان کے صحابی ہونے کا اشارہ کرتی ہیں۔ اسلامی

۱۔ تاریخ ابن ابی خیثمہ، السفر الثالث: ۲/۱۳۶ مطبوعہ مکتبۃ الفاروق الحدیثۃ۔ قاہرہ ۲۰۰۶ء، بسند صحیح۔

۲۔ مسند احمد ۱۹۹۴۳، بسند صحیح۔

۳۔ صحیح بخاری: ۴۵۱۸ صحیح مسلم ۱۲۲۶۔

تاریخ کے مشہور قاضیوں میں ہیں۔ان کا عدل اور قضا کی مہارت تاریخ میں منفرد شہرت رکھتی ہے۔یمنی تھے۔ عہد نبوی میں ایمان لائے تھے،مگر دیدار نصیب نہ ہوسکا تھا۔یمن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو دینی معلم اور گورنر بنا کر بھیجا تھا۔حضرت شریح نے ان سے علم حاصل کیا۔پھر مدینہ آ گئے۔یہاں حضرت عمرؓ نے ان کو خود اصول قضاء کی تعلیم دی اور کوفہ کا قاضی مقرر فرمایا،ساتھ ہی ہدایت کی کہ مشکل معاملات میں مجھ سے استفسار کرتے رہنا۔فقہ وقضاء میں امامت کا مقام تھا۔حضرت علیؓ نے ان کو أقضیٰ العرب (قضا کی صلاحیت میں سب سے فائق) کا لقب دیا تھا۔حضرت شریحؒ تقریباساٹھ سال تک لگاتار اس منصب پر رہے۔ (سیر: ۴/۱۰۰)۔کوفہ نہایت بڑا شہر اور ایک بڑے اقلیم کا علمی وسیاسی مرکز تھا۔حضرت معاویہ کا دور آنے تک ان کو یہاں منصب قضا پر ۲۷ سال کی مدت گزر چکی تھی۔کوفہ جیسے عظیم سیاسی،تمدنی وعلمی مرکز میں لمبی مدت تک چیف جسٹس کے عہدے پر رہنا ان کی علمی ودینی عظمت کے علاوہ وقت کے ساتھ بڑھتے تجربہ کا بھی پتہ دیتا ہے۔

حضرت مسروق بن الاجدعؒ:

کوفہ ایک وسیع عملداری رکھتا تھا۔لہٰذا قاضی شریح کے ساتھ ائمۂ تابعین میں سے مشہور شخصیت مسروق بن الاجدع بھی قضاء کی ذمہ داری ادا کرتے تھے۔یہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے خاص شاگرد تھے اور خلافت راشدہ کے دور میں کوفہ کے مرکز میں دینی معلم کے مقام پر فائز تھے۔امام علی بن المدینی کہتے ہیں میرے نزدیک حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے شاگردوں میں مسروق سے بلند مقام کسی کا نہیں۔حضرت ابوبکر وعمر سے بھی روایت کرتے ہیں۔اور حضرت عائشہؓ کے تو وہ متبنّیٰ اور خصوصی شاگرد وتربیت یافتہ تھے۔علم وفضل اور تقویٰ میں اپنے دور کے امام اور فقہ وفتویٰ میں قاضی شریح سے بھی بلند مقام سمجھے جاتے تھے۔شعبی کہتے ہیں کہ فتوے میں تو مسروق شریح سے بھی بڑے عالم تھے۔علم میں بھی وہی فائق تھے۔چنانچہ حضرت شریح ان سے مشورہ لیتے اور استفادہ کرتے تھے (سیر: ۴/۶۳)۔حضرت عائشہؓ نے ان کو اپنا بیٹا بنالیا تھا۔ایک مرتبہ فرمایا تھا۔مسروق تم میرے سب سے محبوب بچوں میں ہو (تاریخ دمشق: ۵۷/۴۰۷)۔

زہد وعبادت میں قدوہ ونمونہ شخصیت تھی۔تمام عمر اپنی خدمات پر حکومت سے کوئی تنخواہ نہیں لی۔رات کو لمبی نماز کا معمول تھا،جس سے پاؤں پر ورم تک ہوجاتا اور اہلیہ دیکھ دیکھ ترس کھاتی رہتیں۔کوفی ہونے کے باوجود اختلاف کے دور میں کسی کا ساتھ نہیں دیا۔صفین تشریف لے گئے اور اتفاق واتحاد کی کوششوں میں مصروف رہے،مگر جنگ میں حصہ نہیں لیا۔کسی نے کبھی پوچھا کہ آپ نے یہ موقف کیوں اختیار کیا تھا؟ تو (صحابۂ کرام کی اس جماعت کی طرح جو ان جنگوں سے بیزار اور دور رہی) کہتے: اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو آپسی خوں ریزی سے منع فرمایا تھا،سو میں اور کیا کرتا؟ (تاریخ دمشق: ۵۷/۴۳۳)۔

قاضی مصر سُلیم بن عتر التُّجیبی:

اسی طرح مصر میں قاضی سلیم بن عتر تجیبی کو حضرت معاویہؓ نے ابتدائے خلافت میں ہی قاضی مقرر کیا تھا۔ وہ ان کے پورے عہد حکومت میں قاضی رہے۔ ذہبی ان کا تذکرہ ان کلمات سے شروع کرتے ہیں: الإِمَامُ، الفَقِيهُ، قَاضِي مِصْرَ، وَوَاعِظُهَا، وَقَاصُّهَا، وَعَابِدُهَا، (امام، فقیہ، مصر کے قاضی اور واعظ تھے، پورے مصر میں عبادت گذاری میں ممتاز تھے) عبادت و زہد میں معروف اور ''الناسک'' کے لقب سے مشہور تھے۔ پہلے ان کا منصب واعظِ عام کا تھا۔ نہایت مؤثر وعظ کہتے تھے۔ مصر کی فتح میں بھی کارنامے انجام دیے اور بحری غزوات میں بھی حصہ لیتے رہے تھے (رفع الاصر: ۱۰۶)۔

سن چالیس میں حضرت معاویہؓ نے قضاء کے لیے اس عابد و زاہد اور محترم شخصیت کا انتخاب کیا۔ قتل خطا اور زخموں کی دیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کے مطابق ''عاقلہ'' پر تقسیم کی جاتی تھی۔ عاقلہ اس دور میں وہ لوگ قرار دیے جاتے تھے، جن کے نام اُس شخص کے دیوان کے رجسٹر میں ہوں، جس نے قتل یا کسی کو زخمی کیا ہو۔ اہل دیوان سے وصولی میں پریشانی ہوتی تھی۔ اس کا حل حضرت معاویہؓ نے یہ نکالا کہ قاضی سلیم بن عتر کو لکھا کہ دیت کے فیصلے کرنے کے بعد محکمۂ دیوان کو فیصلے کی نقل بھیج دی جائے۔ اور وہاں (عاقلہ) لوگوں کی تنخواہ میں سے تین سال کی قسطیں باندھ دی جائیں، تاکہ کسی پر بوجھ بھی نہ ہو[1]۔

عدلیہ کے اعلیٰ معیار کی سب سے بڑی شہادت:

ان قاضیوں کا تقویٰ واحتیاط، حق گوئی و جرأت اور خدا پرست سیرتیں، نیز معاشرے میں ان کا احترام یقینی شاہد ہیں کہ حضرت معاویہؓ کی حکومت میں عدلیہ کے لیے بہت اونچا معیار طے تھا۔ عدلیہ کے ذریعہ معاشرے میں ہر قسم کے ظلم کا سد باب کیا جاتا تھا۔ اور عوام و خواص ہر طرح کی حق تلفیوں اور استبداد سے محفوظ تھے۔ ان قاضیوں کی بلند و بالا شخصیات اور پاکباز سیرتیں بے لاگ عدل کی مکمل ضمانت تھیں۔ یہ حضرات جہاں شریعت اور قانون اسلامی کے ماہرین تھے وہیں ان کی خداترس زندگی، جرأت و حق گوئی، امانت و غیر جانب داری اور بے لوثی بلکہ تقدس ہر شک شبہے سے بالاتر تھا۔

نظام عدل پر اہل علم صحابہ کی نظر:

حضرت معاویہؓ کے دور میں عدالتوں کے فیصلوں پر اہل علم صحابہ کی نظر رہتی تھی۔ اگر کوئی فیصلہ غلط فہمی یا ناواقفی کی وجہ سے شریعت کے خلاف ہوتا تو وہ قاضی یا گورنر سے کہہ کر اسے بدلواتے۔ اور قرآن وسنت کی دلیل

---

[1] کتاب القضاۃ للکندی: رفع الاصر عن قضاۃ مصر: ۱۶۷۔

سامنے آنے کے بعد کسی حیص بیص کی گنجائش نہیں ہوتی۔ایک غلام نے کچھ کھجوریں چرالیں۔مروان کی عدالت میں مقدمہ گیا تو انہوں نے حد جاری کرنے کا ارادہ کیا۔غلام کے مالک نے حضرت ابوسعید خدری ؓ سے تذکرہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ میں نے رسول ؐ اللہ سے سنا ہے کہ پھل چوری کرنے پر حد سرقہ جاری نہیں ہوگی۔مروان کو اطلاع دی گئی تو فیصلہ بدل کر محض تعزیراً چند کوڑے لگا کر غلام کو چھوڑ دیا گیا(سنن ابی داؤد:۴۳۸۸،۴۳۸۹بسند صحیح)۔

جس زمانے میں مدینے کے گورنر سعید بن العاص تھے انہوں نے فیصلہ دے دیا کہ فرار غلام (آبق) اگر چوری کرے تو ہاتھ نہیں کٹے گا۔حضرت ابن عمر ؓ نے کہا: یہ قرآن میں کہاں لکھا ہے؟ سعید بن العاص نے اپنے فیصلے سے رجوع کیا(موطا:۳۰۸۱)۔

عدالتی نظام کی گہری نگرانی:

صوبائی حکومتوں کو عموماً اپنے اپنے علاقوں میں قاضی مقرر کرنے کا اختیار ہوتا تھا۔البتہ حضرت معاویہ براہ راست پورے ملک کے عدالتی نظام پر نظر رکھتے تھے(تاریخ القضاء فی الاسلام:۱۶۶)۔ان کا محکمۂ برید(جس کا تذکرہ آئے گا) جہاں مملکت اور حکومت کے احوال کی تازہ بتازہ خبریں لاتا تھا؛ وہیں صیغۂ عدالت کی بھی خبریں پہنچاتا رہتا تھا۔اس طرح قاضیوں کے فیصلوں پر مسلسل نظر رکھی جاتی تھی۔اور امیر المومنین جہاں کوئی امر قابل اصلاح دیکھتے اس کی اصلاح کے احکام جاری کرتے۔مورخ اندلس قاضی علی بن عبداللہ النباھی لکھتے ہیں: جب حضرت معاویہ خلیفہ بنے تو اپنے پیشرو خلفاء راشدین کے طرز کے مطابق بڑی توجہ کے ساتھ مملکت کے قاضیوں کی مسلسل نگرانی کرتے تھے(تاریخ قضاۃ الاندلس:۲۴)۔

امیر المومنین نے اگرچہ محکمۂ قضاء ملک کے بڑے علماء و اکابر فقہاء کے حوالہ کر دیا تھا،لیکن پھر بھی شریعت کے صحیح صحیح نفاذ کا یہ اہتمام تھا کہ عدالتوں میں پیش آمدہ پیچیدہ مسائل کی خود تحقیق فرماتے اور دور دراز علاقوں میں قاصد بھیج کر کبار علماء سے ان کی رائے یا روایت تحریری طور پر طلب کرتے،تاکہ مملکت میں ان کے مطابق فیصلے ہوں۔میت کے ورثہ میں اگر صرف دادی اور بھائی ہوں تو میراث کیسے تقسیم ہوگی؟ غالباً شام میں ایسا کوئی واقعہ پیش آیا تھا۔یہ مسئلہ حل طلب معلوم ہوا۔حضرت زید بن ثابت قانون میراث کے سب سے بڑے عالم تھے۔ان کا قیام مدینہ طیبہ میں تھا۔ان کی خدمت میں حکومتی مراسلہ کے ذریعہ استفسار کیا۔حضرت زید بن ثابت ؓ نے اپنے سکریٹری وُھیب سے جواب لکھوایا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ کے بندے امیر المومنین معاویہ کے نام، زید بن ثابت کی طرف سے۔

امیر المومنین !السلام علیک۔

خدائے وحدہ لاشریک کی حمد وثنا کرتا ہوں۔امابعد! آپ نے دادی اور بھائیوں کی میراث کے بارے میں سوال کیا ہے......اس کے بعد خط کا مضمون ہے......(جس کو راوی نے اسی طرح اجمالاً ذکر کیا ہے)۔اللہ تعالیٰ ہم لوگوں کو صحیح جادہ پر گامزن رکھے اور تمام معاملات میں راست روی کی توفیق دے۔اللہ کی پناہ کہ ہم گمراہ ہوں یا جہالت کی رائے دیں اور بے جانے باتیں بتائیں۔

خط کا خاتمہ اس طرح تھا: امیر المومنین! والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ومغفرتہ"۔

اس خط کی نقل حضرت زید کے صاحب زادے خارجہ اور دیگر اہل خاندان کے پاس تھی [۱]۔

میراث ہی کے سلسلے کا ایک واقعہ اور قابل ذکر ہے۔دمشق میں احوص نامی ایک شخص نے اپنی بیوی کو طلاق دی۔طلاق کے بعد پہلا حیض آیا، دوسرا آیا، تیسرا چل رہا تھا ختم نہیں ہوا تھا کہ احوص کی وفات ہوگئی۔یہ فیصلہ نہیں ہو پاتا تھا کہ بیوی کو میراث ملے گی کہ نہیں؟ حضرت معاویہؓ نے قاضی دمشق حضرت فضالہ بن عبیدؓ اور دیگر مقامی علماء سے استفسار کیا، کسی سے جواب نہیں ملا۔تو حضرت زید بن ثابتؓ کے پاس ایک آدمی بھیج کر مسئلہ کی تحقیق کروائی۔انہوں نے کہا کہ تیسری ماہواری شروع ہوتے ہی علیحدگی مکمل ہوگئی اور اب میراث کا استحقاق نہیں رہا (موطا: ۲۱۴۲ و تاریخ دمشق: ۷/ ۳۵۹)۔

یمامہ گورنر مدینہ کے تابع ایک ریاست تھی، یہ نجد کے جنوب مشرق میں کافی بڑا علاقہ تھا [۲]۔یہاں کے قاضی حضرت اسید بن ظہیر انصاریؓ امیر مدینہ مروانؒ کے ماتحت کام کرتے تھے۔ان کا ایک فیصلہ حضرت معاویہؓ کے نزدیک صحیح نہیں تھا۔معاملہ چھوٹا سا تھا، مگر امیر المومنین کا مطمح نظر شریعت اسلامیہ کا صحیح صحیح نفاذ تھا۔اور ان کی نظر عدالتوں کے فیصلوں پر رہا کرتی تھی۔صوبائی گورنر کو خط لکھا کہ تمہارے قاضی کا فیصلہ شریعت کے خلاف ہے، بدلواؤ۔

مروان نے دار الخلافہ کے مراسلے کی نقل قاضیِ یمامہ حضرت اسید بن ظہیر کو اپنی ہدایت کے ساتھ بھیج دی۔انہوں نے کہا کہ میں نے جو فیصلہ کیا ہے یہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ تھا اور عہد صدیقی، فاروقی اور عہد عثمانی میں اسی کے مطابق فیصلے کیے گئے ہیں۔حضرت معاویہؓ کو مروان نے قاضی کے جواب سے مطلع کیا۔حضرت معاویہؓ کو پھر بھی اپنی رائے شریعت کے مطابق لگی اور وہ حضرت اسیدؓ کے جواب سے مطمئن نہیں ہوئے۔لہٰذا لکھوایا کہ تم دونوں کے اوپر میں قاضی ہوں۔جو میں کہوں اس کے مطابق فیصلہ کرو۔مگر قاضی اسید بن ظہیرؓ نے فیصلہ بدلنے سے انکار کر دیا اور صاف کہہ دیا کہ جب تک میں قاضی رہوں گا اس مسئلے میں حضرت معاویہؓ کی

---

[۱] الادب المفرد للبخاری ۱/ ۳۸۶، بسند حسن۔

[۲] معجم البلدان: ۵/ ۴۴۱۔ایک معاصر محقق کا خیال ہے کہ آج سعودیہ کا جو علاقہ شہر ریاض کے تابع ہے وہی تقریباً یمامہ تھا، تاریخ الیمامہ فی صدر الاسلام، عبداللہ ابراہیم العسکر: ۳۱۔

رائے کو تسلیم نہیں کروں گا اور وہی فیصلہ کروں گا جو مجھے صحیح لگے گا۔ آخر حکومت کو قاضی کی بات ماننی پڑی[۱]۔

اس صحیح روایت کی چار شہادتیں:

یہ راویت، جو صحیح ہے اور محدثین کی بہت سی کتابوں میں آئی ہے، چار بہت اہم باتیں تاریخی ریکارڈ میں لاتی ہے:

۱۔ پہلی یہ کہ امیر المؤمنین کی نظر پوری مملکت کی کس قدر باریک جزئیات پر رہتی تھی۔

۲۔ دوسری یہ کہ دور دراز مقامات کی عدالتوں کے فیصلوں پر بھی وہ گہری نظر رکھتے تھے۔ یمامہ کے قاضی کے فیصلے پر انہوں نے دمشق سے نوٹس لیا۔

۳۔ تیسری یہ کہ حضرت معاویہؓ کو ملک میں شریعت کے نفاذ کا کس قدر اہتمام تھا، کہ ایک جزئی فیصلے کے لیے خلیفہ اور گورنر کے درمیان مکاتبت کا سلسلہ چلتا ہے۔

۴۔ چوتھی یہ کہ عدلیہ کس قدر آزاد تھی، امیر المومنین کے دو دو مرتبہ لکھنے اور گورنر کی تائید کے باوجود قاضی نے فیصلہ نہیں بدلا۔

عدلیہ کی آزادی اور طبقۂ حکام کے خلاف فیصلے:

اس واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت معاویہ کے دور میں محکمۂ قضا میں حکومت کا کچھ دخل نہیں تھا۔ خلیفہ یا گورنر کا اختیار صرف قاضی مقرر کرنے یا معزول کرنے کی حد تک تھا، اس کے بعد قاضی آزاد ہوا کرتے تھے اور ان کے فیصلے نافذ کیے جاتے تھے۔ عدلیہ کی آزادی ایسی مطلق تھی کہ حکام کی طرف سے اس پر اثر انداز ہونے کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس عہد کی پوری تاریخ شاہد ہے کہ قاضی کو مکمل آزادی حاصل تھی۔ مذکور واقعہ بھی بتاتا ہے کہ امیر المومنین کی واضح ہدایت کے باوجود قاضی نے اپنے اجتہاد کے مطابق جو صحیح سمجھا وہی فیصلہ باقی رکھا۔ اور حکومت نے اس میں دخل اندازی نہیں کی۔

قاضی اپنے فیصلوں میں خود مختار ہوتے تھے اور اگر وہ خلیفہ یا گورنروں کے اعزہ و مقربین کے خلاف بھی فیصلے دیتے تھے تو ان کی تحسین وقدر کی جاتی تھی۔ مروان نے عبداللہ بن نوفل بن حارث کو مدینہ کا قاضی مقرر کیا تھا، یہ بڑے صالح بزرگ تھے۔ حضرت عمر کی صحبت اٹھائی تھی۔ پہلے ہی مقدمے میں انہوں نے مروان کے قریبی اعزہ کے خلاف فیصلہ سنا دیا۔ یہ لوگ حضرت معاویہؓ کے بھی قریبی رشتے دار تھے۔ مروان نے استفسار کیا تو انہوں نے بڑی صفائی سے کہا کہ اللہ کی شریعت کا فیصلہ ہے۔ اس بے لاگ انصاف سے مروان بڑے خوش

---

[۱] مصنف عبدالرزاق: ۱۸۸۲۹ بسند صحیح، ومسند احمد: ۱۷۹۸۶، بسند صحیح، سنن نسائی کبریٰ: ۶۲۳۲۔

ہوئے اور عبداللہ بن نوفل کا مقام ان کی نگاہ میں بہت بڑھ گیا (اخبار القضاۃ: ۱/ ۱۱۴)۔

عدالت میں حکام اور عوام کے ساتھ مساویانہ سلوک:

اصول عدل کے مطابق عدالت میں سب کے ساتھ مساویانہ سلوک کیا جاتا تھا۔ کوئی کتنا ہی بڑا سردار کیوں نہ ہو، خلیفہ ہو، خلیفۂ وقت کا رشتے دار ہو یا گورنر کا بھائی، اس کی حیثیت ایک عام مدعی کی برابر ہوتی تھی۔ مجال نہیں تھی کہ عدالت میں کوئی امیر یا رئیس کسی ادنیٰ شخص سے ممتاز حیثیت پائے۔ مقدمات کی سماعت کے دوران قاضی اُس کو فریق مخالف کے ساتھ بٹھاتا تھا۔ جب مدینہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ قاضی تھے تو قریش کی ایک بڑی شخصیت اور گورنر مروان بن الحکم کے بھائی حارث بن الحکم مجلس قضا میں ان کے پاس آئے۔ ایک معزز شخصیت تھے، بے تکلفی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے پاس ہی بیٹھ گئے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سمجھے یوں ہی آئے ہوں گے، بیٹھنے دیا۔ پیچھے سے ایک آدمی آیا اور اس نے کہا کہ میں حارث کے خلاف مقدمہ کرنا چاہتا ہوں، بس، پھر کیا تھا؛ لمحے بھر میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا طرز بدل گیا۔ کہا: حارث! اٹھو اور مدعی کے برابر جا کے بیٹھو۔ حارث کو کچھ تردد ہوا، حضرت ابو ہریرہ نے صاف حکم دیا: اٹھو، مدعی کے پاس جا کے بیٹھو، یہی حکم رسول ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ابوبکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ کے دور سے اسلامی عدالت کا یہی قانون چلا آ رہا ہے کہ مجلس قضا میں فریقین قاضی کے سامنے یکساں بیٹھیں''۔ گورنر کا بھائی جو امیر المومنین کا بھی بھائی ہوتا تھا، کچھ نہ کر سکا، چپ چاپ اس عام آدمی کے برابر جا بیٹھا (تاریخ دمشق: ۱۱/ ۴۱۴)۔

عدالتیں امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے خلاف بھی فیصلہ دے سکتی تھیں:

عدالت میں امیر المومنین بھی ایک عام شخص کے برابر ہوتا تھا۔ اور اس کے خلاف بھی فیصلہ ہوتا تھا۔ مدینہ میں حضرت معاویہ کی ایک بڑی زمین تھی، جس پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے نضیر نامی کارکن نے پانچ ہزار کھجور کے پودے لگائے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بھتیجے عبدالرحمان بن زید بن الخطاب نے مروان کی عدالت میں اس پر دعویٰ کیا کہ یہ زمین میری ہے، مجھے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس وقت بطور جاگیر دی تھی جب میرے والد جنگ یمامہ میں شہید ہوئے تھے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے نمائندے کا کہنا تھا کہ میرے پاس وثیقہ موجود ہے کہ حضرت عثمان نے یہ زمین حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو بطور جاگیر دی تھی۔ غالباً دونوں کے پاس وثیقے تھے۔ مروان کچھ فیصلہ نہ کر سکے تو کہا دونوں مصالحت سے معاملہ حل کر لو۔ مگر عبدالرحمان مقدمہ لے کر سیدھے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس جا پہنچے اور کہا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ میری زمین آپ کو کیسے دے سکتے ہیں؟ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ تم نے زمین میں کھیتی نہیں کی، اس کو غیر آباد چھوڑ دیا۔ اور

دستور یہی ہے (جس کے مطابق حضرت عمرؓ کے فیصلے بھی موجود ہیں) کہ کوئی غیر مملوکہ زمین اگر کسی کو جاگیر کے طور پر دی جاتی ہے اور وہ اس میں کھیتی نہیں کرتا، تو وہ کسی اور کو دے دی جاتی ہے۔ (خود حضرت معاویہؓ کے دور میں بھی اس پر عمل ہوتا تھا، جیسا کہ گزر چکا ہے) لہٰذا حضرت عثمانؓ کا فیصلہ قانون کے مطابق ہے۔

بہر حال عبدالرحمان نے بات نہیں مانی۔ اب خلیفۂ وقت کے خلاف مقدمہ تھا اور وہ اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ حضرت معاویہ نے کہا قاضیِ دمشق حضرت فضالہ بن عبیدؓ کو بلایا جائے۔ قاضی صاحب نے صاف کہلا دیا کہ کوئی مشورہ یا گفتگو ہوتی تو بات دیگر تھی، مگر مقدمہ کے لیے تو قاضی کے پاس آپ ہی کو آنا ہوگا، یہ اصول کے خلاف ہے کہ قاضی خلیفہ کے پاس آئے۔ حضرت معاویہؓ اور عبدالرحمان مجلس قاضی میں پہنچے تو دونوں کو دستور کے مطابق مساویانہ طور پر ایک جگہ ہی بٹھایا گیا۔ دونوں فریقوں نے اپنا مدعا رکھا۔ عدالتیں کس قدر آزاد تھیں اس کا نمونہ سامنے اس طرح آیا کہ شواہد دیکھ کے قاضی نے حضرت معاویہؓ کے خلاف فیصلہ دیا۔ حضرت معاویہؓ نے کہا کہ میں نے جو اس پر پانچ ہزار پودے لگوائے ہیں اس کا کیا ہوگا؟ قاضی نے فیصلہ کیا کہ اس کی قیمت عبدالرحمان دیں گے۔ یا اگر وہ یہ دینے پر تیار نہ ہوں تو امیر المومنین اُن کو زمین کی قیمت دیں۔ قاضی کا فیصلہ حرف آخر ہوتا تھا۔ نافذ نہ کرنا تو دور کی بات، امیر المومنین نے اپنے خلاف اس فیصلے کو بخوشی قبول کیا اور کہا ''ہمیں قبول ہے''۔

یہ تو عدالتی فیصلہ ہوا۔ اس کے بعد قاضی فضالہ بن عبید انصاریؓ نے حضرت معاویہؓ سے کہا کہ کیا آپ عمر فاروقؓ کے بھتیجے اور زید بن خطابؓ شہید کے بیٹے کے ساتھ ایسا معاملہ کریں گے؟ آپ کو ان نسبتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ اس پر حضرت معاویہؓ نے کہا: نہیں، اب میں ان سے کچھ بھی نہ لوں گا اور اپنے نمائندے نضیر کو لکھ بھیجا کہ میری اپنی جو زمین اِس زمین سے متصل ہے اُسے بھی عبدالرحمان کو ہدیے میں دے دیا جائے۔ (انساب الاشراف: ۵/ ۱۳۲، ۱۳۳)۔

حضرت معاویہؓ کی حکومت کے اسی مثالی انصاف کی گواہی مشہور تابعی امام سلیمان بن مہران الاعمش نے دی ہے۔ کسی نے ان کے سامنے حضرت عمر بن عبدالعزیز کا تذکرہ کیا۔ تو کہنے لگے: اگر تم حضرت معاویہؓ کا زمانہ پاتے تو کیا کہتے؟ لوگوں نے سوال کیا یعنی حضرت معاویہؓ کا حلم و برداشت؟ فرمایا: نہیں، خدا کی قسم ان کا عدل وانصاف ایسا تھا کہ دیکھتے تو حیران رہ جاتے (السنۃ للخلال: ۲/ ۴۳۷)۔

افتراء وکذب یا نادانی:

جن لوگوں کو حضرت معاویہؓ سے پرخاش ہے ان کا دعویٰ ہے کہ ان کے عہد میں عدل وانصاف کا خون کیا جاتا تھا۔ جس کے ثبوت میں ان کے پاس سوائے بے سند داستانوں یا محض دل کے غبار کے علاوہ کچھ نہیں۔ اوپر دی

گئی تاریخی شہادتوں اور محدثانہ اصول پر صحیح روایتوں سے ان کے دور میں عدلیہ کی ایک پاک اور شاندار تصویر سامنے آتی ہے۔ان سب پر سوا یہ نا قابل اشتباہ حقیقت کہ ان کے دور میں اسلامی تاریخ کی سرتاج شخصیات منصب قضا پر فائز تھیں۔ یہ مستند شہادتیں بتاتی ہیں کہ اس عہد کا نظامِ عدل شرعی اصول وقواعد اور انصاف کی مسلّم بنیادوں پر قائم تھا اور ریاست میں عدل کے قیام میں ایک تابناک کردار ادا کر رہا تھا جو عہد خلافت راشدہ کا ایک تسلسل تھا۔

عدالتوں کے انتظامات:

کسی مملکت کے سیاسی استحکام کے بعد ہی نظام حکومت اور تمدن کی ترقیاں انجام پاتی ہیں۔حضرت معاویہؓ کے عہد میں یہ نعمت نصیب ہوئی تو جہاں ہر شعبے نے ترقی کی وہیں عدلیہ میں بھی نظم ونسق کی ترقیاں ہوئیں۔ ابھی تک عدالتوں میں اپنے فیصلوں کی نقل محفوظ نہیں رکھی جاتی تھی۔ایک بہت اہم کام یہ انجام پایا کہ قاضیوں کے فیصلوں کی نقل عدالت میں محفوظ کی جانے لگی اور کارروائی مقدمہ کا باقاعدہ رکارڈ رکھا جانے لگا۔تاکہ کوئی شخص فیصلے کے بعد کوئی دھوکہ بازی نہ کر سکے۔اس شعبہ کا قیام سب سے پہلے مصر میں قاضی سلیم بن عتر کی عدالت میں انجام پایا (رفع الاصر عن قضاۃ مصر: ۱۶۷)۔

عدالتوں میں اردلی اور پیش کار مقرر کیے گئے۔حضرت شریح کے پیچھے ایک پیش کار کھڑا رہتا، فریقین کے نام کی وہی آواز لگاتا اور اسی کے کہنے پر مقدمے کی کارروائی چلتی۔قاضیوں کے پیش کار بھی بڑے بڑے اہل علم ہوتے تھے۔امام ابراہیم نخعی، جو کوفے کے سب سے بڑے فقیہ ہوئے، قاضی شریح کی عدالت میں پیش کار تھے۔عدالتوں کے دروازوں پر دربان رکھے گئے کہ قاضی یکسوئی سے عدالتی کارروائی سن سکے (تاریخ القضاء للزحیلی: ۱۸۰۔۱۸۱)۔

ستر ہواں باب

پولیس اور چند دوسرے شعبے

پولیس اور حفاظتی گارڈس کے شعبوں کا قیام:

اگرچہ پولیس کا محکمہ خلافت راشدہ کے دور میں قائم ہو چکا تھا اور حضرت عبداللہ بن مسعود کو حضرت ابوبکرؓ نے مدینہ کا پہلا پولیس افسر طے فرمایا تھا (الاستیعاب: ۳/ ۱۱۵۰)، لیکن ایک مستقل ایجنسی کے طور پر تمام مملکت میں اس کا قیام اور ترقی وانتظام حضرت معاویہؓ کے عہد میں ہی انجام پایا۔ مملکت اسلام اب ایک وسیع اور منظم ومتمدن مملکت تھی۔ ساتھ ہی اس کو داخلی طور پر کئی قسم کے باغی اور سرکش عناصر سے خطرہ بھی تھا۔ خوارج اور حکومت مخالف شیعوں کی بغاوتوں کی چنگاریاں راکھ تلے زندہ تھیں۔ خلفاء اور امراء پر قاتلانہ حملے ہو چکے تھے، جس میں حضرت علیؓ شہید اور حضرت معاویہؓ زخمی ہو کر جانبر ہوئے تھے۔ سازش تو حضرت عمرو بن العاصؓ کے قتل کی بھی ہوئی، مگر قاتل کو دھوکہ ہوا اور اس کے ہاتھوں اقلیم مصر کے اہم افسر حضرت خارجہ بن حذافہؓ شہید ہو گئے۔

اس صورت حال کے پیش نظر پولیس کے محکمہ کو ترقی دینے اور امیر المومنین نیز دیگر وزراء واعیان سلطنت کی حفاظت کے لیے ایک محافظ فورس بنانے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ حضرت معاویہؓ نے دمشق اور دیگر شہروں میں محکمۂ پولیس میں بڑی توسیع کی اور اس کو ترقی دی۔ چنانچہ یہ اس دور کی متمدن ریاست کے انداز کا ایک منظم شعبہ بن گیا۔ مملکت کے تمام مراکز (امصار المسلمین) میں داخلی امن وامان کا قیام، جرائم کا انسداد اور مجرموں کی گرفتاری اسی محکمہ کی ذمہ داری تھی۔ مرکز میں یہ صیغہ امیر المومنین کے اور صوبوں میں گورنروں کے تابع ہوتا تھا۔ اور عموماً اسی کے ذمہ امیر المومنین اور حکام کے تحفظ کا کام بھی ہوتا تھا۔ خوارج اور دیگر بغاوتوں کا پتہ لگانا اور ابتدائی مرحلے میں ہی ان کی دارو گیر پولیس کا محکمہ ہی کرتا تھا۔

محکمۂ پولیس کی خصوصی ذمہ داری امن وامان کا قیام تو تھا ہی، ساتھ ہی اخلاقی خرابیوں کی روک تھام اور دینی بے راہ رویوں کا سدّ باب بھی اس کا خاص کام تھا۔ بصرہ میں پولیس کی دو ڈویژن تھیں۔ ایک کے افسر عبداللہ

بن حصن اور دوسری کے جعد بن قیس تھے۔ پہلی ڈویژن بدامنی اور بغاوتوں کی سرکوبی اور دوسری ڈویژن خصوصا بے دینی اوراخلاقی خرابیوں کی روک تھام کے لیے تھی۔ گورنر زیاد شہر کے جائزے کے لیے نکلتے تو پولیس کا گھیرا رہتا اور یہ دونوں افسران نیزہ لیے آگے چلتے۔

افسرانِ پولیس کے انتخاب میں اخلاق ودیانت کا اونچا معیار:

تاریخ کی کتابوں میں جن افسران پولیس کا نام مذکور ہے ان کی سیرت اور حالات پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس منصب کے لیے انتخاب کے وقت طاقت ورشخصیت اور قائدانہ وانتظامی صلاحیت کے علاوہ دیانت وصلاح اور امانت وعلمِ دینی کی صفات بھی ملحوظ رکھی جاتی تھیں۔ ان میں متعدد صحابہ اور اہل علم بھی تھے۔ ہم کو حضرت معاویہؓ کے عہد کے جن پولیس افسران کا سراغ تاریخی مآخذ سے مل سکا ہے ان کی شخصیتوں کے آئینے میں یہ اونچا معیار نظر آتا ہے۔

حضرت معاویہؓ نے صوبۂ دمشق کا پولیس افسر یزید بن حر عبسی کو بنایا تھا۔ یہ بڑے نیک شخص شمار ہوتے تھے، حضرت عثمانؓ نے ۳۶ھ کے صائفہ کے لیے حضرت معاویہؓ کو لکھا تھا کہ کسی زیرک وہوشمند اور تجربہ کار شخص کو امیر لشکر بنا کر رومیوں کے خلاف جنگ کے لیے بھیجو۔ تو حضرت معاویہؓ نے انہی کا انتخاب کیا۔ جنگ صفین میں جب صلح ہوئی تو حضرت معاویہؓ کی طرف سے گواہوں میں یہ بھی شامل تھے (تاریخ دمشق: ۶۵/۱۵۱)۔

یزید بن حر کی وفات کے بعد حضرت معاویہؓ نے قیس بن حمزہ ہمدانی کو پولیس کا افسر اعلیٰ مقرر کیا۔ مورخین لکھتے ہیں کہ یہ شام کے بڑے صاحب رسوخ شخص تھے۔ (تاریخ دمشق: ۴۹/۸/۷۳) ان کے بعد ایک صحابی حضرت زمل بن عمروؓ کو حضرت معاویہ نے اس منصب پر مقرر کیا۔ جب حضرت زمل رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے تو رسول اللہ ﷺ نے ان کو اپنے قبیلہ بنوعذرہ کا سردار طے فرمایا تھا۔ اور ان کو بنفس نفیس ایک جھنڈا عطا فرمایا۔ انہوں نے اس جھنڈے کو بڑے اہتمام سے محفوظ رکھا۔[۱]

حضرت معاویہؓ کے عہد میں ایک بڑے مقتدر شخص حضرت ضحاک بن قیس فہریؓ بھی تھے۔ یہ بھی صوبۂ دمشق میں پولیس کے افسر اعلیٰ تھے۔ حضرت معاویہؓ ان کی بڑی قدر کرتے تھے۔ رسول اللہ نے ان کو صدقات کی تحصیل میں اپنا عامل بھی بنایا تھا، یہ جس علاقے میں گئے وہاں سے شاندار شاندار اونٹ لے آئے۔ آپ ﷺ نے کہا: یہ تم نے کیا کیا؟ لوگوں کے بہترین اونٹ صدقے میں وصول کر لیے؟ انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ آپ کسی غزوے کا ارادہ فرما رہے ہیں، میں نے سوچا اس وقت سواری کے لیے ایسے ہی اونٹوں کی ضرورت

۱۔ اسد الغابۃ: ۲/۱۰۸، تاریخ دمشق: ۱۹/۶/۷۔

ہوگی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جاؤ، یہ اونٹ لوگوں کو واپس کرو اور اُن کے معمولی اونٹ لے کر آؤ۔ ہم صدقے میں لوگوں کے اچھے جانور نہیں لیتے (مسند احمد: ۲۰۶۹۳)۔ حضرت معاویہؓ کی عدم موجودگی میں دمشق کی امارت انہی کے سپرد ہوتی۔ حضرت معاویہؓ کا جنازہ بھی انہوں نے ہی پڑھایا (تاریخ دمشق: ۲۴/ ۲۸۰)۔

بعض روایات سے اندازہ ہوتا ہے کہ دمشق کا پولیس افسر اعلیٰ وسیع اختیارات اور گویا صوبہ دمشق کا حاکم ہوتا تھا۔ ذہبی نے بعض مورخین کی روایت نقل کی ہے کہ حضرت معاویہؓ نے زیاد کے انتقال کے بعد حضرت ضحاکؓ کو کوفے کا گورنر مقرر کیا، مگر کچھ دنوں بعد ان کو وہاں سے بلا کر دمشق میں حاکم بنایا، ''وَوَلَّاهُ دِمَشْقَ'' (سیر الاعلام: ۳/ ۲۴۲)۔ ابن ابی عاصم نے بسند حسن روایت کیا ہے کہ ایک مرتبہ دمشق میں بارش نہیں ہوئی، (وعلیٰ الناس یومئذ الضحاك ابن قیس) اس وقت حضرت ضحاک ابن قیسؓ حاکم تھے۔ وہ صلاۃ استسقاء کے لیے نکلے۔ نماز کی جگہ پہنچ کر کہا: یزید بن اسود جرشی کہاں ہیں؟ کوئی جواب نہیں آیا تو بار بار کہا: اور اصرار کر کے ان سے دعا کروائی۔ پھر کیا تھا؟ لوگ گھروں کو بھیگتے پہنچے۔ (الآحاد والمثانی: ۲/ ۱۳۶)۔ یہ یزید ابن اسود بڑے بزرگ اور صاحب کرامت تابعی تھے۔

مدینہ میں جب مروان کو دوبارہ سن ۵۴ھ میں گورنر بنایا گیا تو، امن وامان کی صورت حال خراب تھی۔ مروان نے حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ کے صاحب زادے مصعب کو قاضی اور پولیس افسر دونوں کی ذمہ داریاں تفویض کیں۔ مصعب بڑے عالم، صالح وعبادت گزار شخص ہونے کے ساتھ اعلیٰ انتظامی صلاحیت کے مالک تھے۔ انہوں نے مجرموں اور مشتبہ قسم کے لوگوں پر سختی کی۔ گرفتاریاں کیں۔ یہاں تک کہ امن قائم ہوا اور اہل مدینہ مامون [1]۔ مصر میں حضرت سائب بن ہشامؓ کو افسر پولیس بنایا گیا تھا۔ یہ اور ان کے والد بھی صحابی تھے۔ ان کے بعد عابس بن سعید مرادی کو قاضی اور افسر پولیس طے کیا گیا، منصب قضا پر فائز ہونے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ کس درجہ کے عالم وفقیہ اور امین ومعتبر شخص تھے۔ (کتاب القضاۃ: ۳۵)۔

ان تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ اعلیٰ درجے کی دینی وسماجی شخصیتوں کو پولیس افسر بنایا جاتا تھا۔

بدمعاشوں کی نگرانی اور مشتبہ شخصیات پر نظر:

قیام امن کے لیے مشتبہ لوگوں کی نگرانی ایک اہم احتیاطی تدبیر ہوتی ہے۔ حضرت معاویہؓ نے اپنے قاضی حضرت ابوالدرداءؓ سے فرمائش کی کہ پورے صوبہ دمشق کے بدمعاشوں کی فہرست تیار کروائی جائے [2]۔ اسی طرح ایسے حضرات جن کی خفیہ باغیانہ سرگرمیوں کا پتہ چلتا رہتا تھا، ان پر خاص نظر رکھنے کے لیے یہ ہدایات دی

[1] طبقات: ۵/ ۱۲۰، مشاہیر علماء الامصار لابی حاتم البستی: ۱۱۲۔

[2] الادب المفرد۔ ط: دار البشائر الاسلامیۃ ۱۹۸۹ء: ۴۳۸۔

گئی تھیں کہ وہ تمام نمازیں کسی متعین مسجد میں پڑھیں، تا کہ ان کی نقل وحرکت پر نظر رکھی جا سکے۔ اس سلسلے میں کوفہ کے گورنر حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کو خط لکھا کہ فلاں فلاں لیڈروں پر خاص نظر رکھیے اور ان کو اپنی مسجد میں جماعت سے نماز پڑھنے کا پابند بنایئے (طبری: ۱۷۹/۵)۔

کوفے اور بصرے میں پولیس کا وسیع اور بیدار نظام:

سب سے زیادہ وسیع اور منظم پولیس کا نظام کوفہ اور بصرے میں تھا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ باغیوں کی شورش کا مرکز عراق وفارس کے جو علاقے تھے وہ انہی مرکزوں کے تابع تھے۔ کوفہ میں حضرت مغیرہ بن شعبہؓ عہد معاویہؓ کے پہلے گورنر تھے۔ انہوں نے صحابی رسول حضرت قبیصہ بن دمونؓ کو افسر برائے پولیس طے کیا تھا۔ یہ اصلا یمنی تھے، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ پر بیعتِ اسلام کی تو آپ نے ان کو طائف میں بسنے کا حکم دیا۔ نہایت متیقظ اور سخت گیر افسر تھے۔ حضرت معاویہ کی بیعت کے فورا بعد کوفہ میں خوارج خفیہ اجتماع کر کے بغاوت کی تیاری کر رہے تھے۔ اس کا پتہ پولیس نے ہی لگایا تھا۔ اور حضرت معاویہؓ نے افسر پولیس قبیصہ کو ہی ان کا محاصرہ کرنے کا حکم دیا تھا۔ بالآخر پولیس نے ان کو گرفتار کیا اور جیل میں ڈالا۔ مستورد بن علفہ کی قیادت میں جو بہت بڑی بغاوت خوارج نے کی تھی اس کو شکست دینے میں بھی محکمۂ پولیس کا بڑا کردار تھا[۱]۔

تشدد پسند نظریات کے حامل خوارج نے حالات بدتر اور امن وامان کی صورت حال بہت خراب کر دی تھی، کئی سالوں کے انتشار نے ان کو اپنی جڑیں پھیلانے کا خوب موقعہ بھی دیا تھا۔ صلح کے بعد اب خلافت اسلامیہ کے پاس فرصت تھی۔ لہٰذا اس صورت حال سے نپٹنے کے لیے زیاد کی شکل میں ایک سخت اور متیقظ گورنر مقرر کیا گیا۔ زیاد نے پہلے اپنی پولیس کے ذریعہ بصرہ کے حالات کو قابو میں کیا، پھر دیہاتوں اور دیگر علاقوں میں جرائم کا انسداد کیا۔ یہاں تک کہ امن وامان کی صورت حال نہایت اچھی ہو گئی۔ اسی وجہ سے حضرت معاویہؓ نے کوفہ کی ذمہ داری بھی ان کو ہی دے دی۔

بصرہ اور کوفہ میں زیاد نے محکمۂ پولیس کو ایسی ترقی دی کہ وہ داخلی دائرے کی سب سے بڑی اور فعال ایجنسی بن گئی۔ بصرے میں پولیس کی تعداد چار ہزار تک ہو گئی۔ زیاد سے کسی نے شکایت کی کہ سفری راستوں پر رہزنی کے واقعات ہو رہے ہیں۔ انہوں نے کہا پہلے شہروں کو قابو کر لوں، پھر دیکھتا ہوں۔ لہٰذا شہروں میں امن وامان اور اخلاقی نگرانی کی صورت حال کو مستحکم کرنے کے بعد انہوں نے شہروں کے باہر راستوں پر پولیس کا جال بچھایا۔ یہاں تک کہ وہ کہا کرتے تھے کہ اگر یہاں سے لے کر خراسان تک ایک رسی بھی گم ہو جائے گی تو مجھے پتہ

۱۔ اسد الغابۃ: ۸۲/۴، طبری: ۱۸۱/۵۔ ۲۰۹۔

چل جائے گا کہ کس کی حرکت ہے۔ زیاد کی سختی سے حکومت کی پکڑ مضبوط ہوئی، امن وامان کی صورت حال بہت اچھی ہوگئی، کسی کی کوئی چیز اگر گر بھی جاتی تو کوئی نہیں اٹھاتا تھا، تاآں کہ اس کا مالک آ کے لے جاتا۔

(طبری: ۵/ ۲۲۲۔ ۲۲۳، ۲۵۳)۔

حفاظتی گارڈس:

حفاظتی گارڈ کا شعبہ سب سے پہلے حضرت معاویہؓ نے ہی قائم کیا۔ حضرت معاویہؓ پر خوارج نے قاتلانہ حملہ کیا تھا، حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ بھی قاتلانہ حملوں ہی میں شہید ہوئے تھے۔ لہٰذا حضرت معاویہؓ نے مملکت میں حکام کے لیے حفاظتی گارڈس کی ایک نئی فورس تشکیل دی۔ ان گارڈس کو ''حرس'' کہا جاتا تھا۔ حضرت معاویہ کی حفاظت ان ہی کے ذمہ تھی۔ یہ ہر وقت ساتھ رہتے تھے، حضرت معاویہؓ کہیں بھی اپنے محافظوں کے بغیر نہیں جاتے تھے۔ مجلس عام میں جب وہ عوام کی شکایتیں اور مسائل سنتے تو بھی گارڈس تعینات رہتے، نماز میں بھی ان کے پاس کھڑے رہتے تھے، رات میں بھی ان کی ڈیوٹی رہتی تھی۔ دمشق میں اس جماعت کے افسر ابوالمخارق مالک نامی ایک شخص تھے۔ ۔ کوفہ میں اس فورس کی تعداد ۵۰۰ تھی۔ اس بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ دیگر مراکز میں بھی اسی معیار کی فورس بنائی گئی ہوگی۔ اور امیر المومنین کا حفاظتی دستہ غالباً اس سے بھی بڑا ہوگا۔

۴۴ھ میں حضرت معاویہؓ اور ان کے گورنروں نے مسجد میں اپنی حفاظت کے لیے مقصورے بنوائے، جس میں رہ کر وہ امامت کرتے تھے۔ مسجد میں محراب کے حصے کو دیواروں سے گھیر دیا جاتا تھا، جس کے اندر سے امیر المومنین اور گورنر امامت کرتے تھے، اس کو مقصورہ کہتے تھے [1]۔

جیل خانے:

قید خانوں کا وجود خلافت راشدہ کے ابتدائی دور سے تھا۔ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ نے کچھ عمارتیں قید خانوں کے طور پر خاص فرمائی تھیں۔ حضرت علی کے بارے میں روایت ہے کہ انھوں نے کوفہ میں باقاعدہ جیل کی عمارت بنوائی (المنتظم: ۵/ ۳۰۹)۔ لیکن حضرت معاویہؓ کے دور میں مملکت کی عمومی ترقی و تنظیم کے ساتھ وسیع پیمانے پر جیلیں بنوائی گئیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ مورخین نے لکھا ہے کہ اسلامی مملکت میں سب سے پہلے جیل خانے حضرت معاویہؓ نے بنوائے۔ ہر اقلیم میں اس کی ضرورت کے لحاظ سے جیل خانے بنوائے۔ مقریزی نے لکھا ہے کہ سب سے پہلے جیلیں حضرت معاویہؓ کے عہد میں بنائی گئیں۔ انھوں نے تنہا مصر میں آٹھ جیلوں کے نام لکھے ہیں (خطط: ۳/ ۳۲۸)۔ امام ابو یوسف کی کتاب الخراج (ص: ۱۶۳) سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت معاویہؓ کے دور میں جیلوں میں قیدیوں کے نہ صرف کھانے پینے کا بندوبست ہوتا، بلکہ ہر گرمی و سردی میں قیدیوں

---

[1] طبری: ۵/ ۳۳۰، ۵/ ۳۲۴۔ البدایۃ والنہایہ: ۸/ ۲۴، ۱۵۶۔

کے لیے موسم کے لحاظ سے مناسب جوڑوں کا انتظام بھی حکومت کیا کرتی تھی۔

محکمۂ ڈاک اور خبر رسانی:

ڈاک کا شعبہ یوں تو خلافت راشدہ کے عہد سے چلا آتا تھا۔اس کو اس دور میں برید کہا جاتا تھا۔جس سے دراصل حکومتی احکام اور خبریں پہنچانے اور مراسلات کا کام لیا جاتا تھا۔گورنروں، سرحدوں اور افواج کی اطلاعات واحکام کو ممکنہ حد تک کم سے کم وقت میں پہنچانا اس محکمہ کا کام ہوتا تھا۔مگر حضرت معاویہ کے عہد میں نظم حکومت میں جو انضباط اور وسعت پیدا ہوئی اس کا ایک حصہ یہ بھی تھا کہ انہوں نے برید کو ایک مستقل وزارت (دیوان) بنایا اور اس کا الگ دفتر وعمارت بنائی گئی (الاوائل للعسکری:۱/۲۳۷)۔روم وفارس میں برید کا ترقی یافتہ نظام تھا، اس لیے دونوں علاقوں کے برید کے کارندوں کو بلایا گیا اور انہوں نے نقل وحمل کے پورے نظام کا نقشہ بنا کر دیا۔تمام بڑے شہروں کے درمیان ہر بارہ میل پر برید کے مرکز ہوتے۔جن میں گھوڑے مع سواروں کے تیار رہتے۔ہر اسٹیشن والا اگلے اسٹیشن تک ڈاک پہنچاتا۔وہاں سے وہ فوراً اگلے مرکز کے لیے روانہ ہو جاتی۔ اس طرح امیر المومنین تک تمام صوبوں اور سرحدی محاذوں سے پل پل کی اطلاعات پہونچتی رہتیں اور ان کے احکام وہدایات گورنروں اور جرنیلوں کو جلد موصول ہو جاتے [۱]۔اضلاع سے جب بھی امیر المومنین ؓ کے لیے ڈاک روانہ کی جاتی تو وہاں کا حاکم اعلان کرواتا کہ کسی کو امیر المومنین کو کوئی پیغام یا درخواست بھیجنی ہو تو وہ بھیج سکتا ہے۔لوگ اپنے مسائل لکھ بھیجتے اور دار الخلافہ سے ان پر کارروائی ہوتی (طبری:۵/۳۳۵)۔

محکمۂ سراغ رسانی:

نظام حکومت ایسا چست وچاق تھا کہ حضرت معاویہ ؓ کے جاسوس رومی دربار میں ہوتے تھے اور وہاں جو سازش یا منصوبے ہوتے ان کی خبریں بھیجتے تھے۔(أخبار أبي القاسم الزجاجي:۲۴)۔اندرون مملکت بھی سراغ رسانی کا شعبہ بہت سرگرم تھا۔ابراہیم بن محمد بیہقی نے ذکر کیا ہے کہ ہر صوبے اور ضلع، نیز تمام فوجی مراکز میں حضرت معاویہ ؓ کے نہایت تیز قسم کے خفیہ خبر رساں موجود رہتے تھے، جن کے ذریعے ہر گورنر اور حاکم کی اطلاعات صبح شام پہنچتی تھیں۔اس سے عمال کو ہر وقت اندیشہ لگا رہتا تھا۔ملکی استحکام میں اس سراغ رساں شعبے کا بہت دخل تھا۔یہاں تک کہ عدالتوں میں اگر کچھ متنازعہ فیصلے ہو جاتے تھے، یا نکاح وطلاق کا کوئی ایسا واقعہ پیش آتا تھا جس کی صحت مشتبہ ہوتی تھی، تو ان کی خبریں بھی امیر المومنین تک پہنچ جاتی تھیں اور وہاں سے ضروری کارروائی کی ہدایت آ جاتی تھی۔یہ سب اسی برید کے نظام کے ذریعہ انجام پاتا تھا [۲]۔

---

[۱] الفخری فی الآداب السلطانیۃ:۱۱۲، دار القلم العربی، بیروت ۱۹۹۷ء۔

[۲] المحاسن والمساوئ:۱۴۳، ۱۴۴، دار صادر بیروت۔نیز زہر الآداب وثمر الالباب، ابو اسحاق الحصری القیروانی:۱/۱۰۱)۔

اٹھارہواں باب

نظارت نافعہ یا پبلک ورکس

ہماری روایتی تاریخ نویسی کا مرکز توجہ دربارِ حکومت اور رزم گاہیں ہی رہی ہیں، اس میں عوامی زندگی اور تہذیب وتمدن کے ارتقا کی تفصیلات کمیاب ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو حضرت معاویہؓ کے عہد کی تمدنی ترقیوں کی تفصیل نگاہوں کو خیرہ کر دیتی۔ لیکن پھر بھی اس سلسلے کی جو معلومات تاریخی مآخذ میں دستیاب ہیں، وہ چشم کشا ہیں اور ایک کامیاب و مدبر حکمراں اور خلق کے نفع رساں نظام حکومت کی شہادت دیتی ہیں۔ ان متفرق معلومات کی بنا پر، قیاس وتصور کی مدد سے، تمدنی ترقیات کے لیے ریاست کے پیہم عمل و سرگرمی کی جو بڑی تصویر بنتی ہے، وہ یقیناً دلکش ومتاثر کن ہے۔ جس تصویر میں تیز رفتار ترقی وخوش حالی کی نہریں بہتی نظر آتی ہیں۔ مورخ ابن کثیرؒ حضرت معاویہؓ کے عہد کی راحت واطمینان پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> حضرت معاویہ کی بیعت خلافت سن ۴۱ھ میں انجام پائی۔ اس کے بعد وہ اپنی وفات یعنی سن ساٹھ تک تنہا حکمراں رہے۔ اس پورے عہد میں جہاد کا سلسلہ پوری آن بان سے جاری رہا، اسلام کی شان وشوکت میں اضافہ ہوتا رہا۔ مسلمان ان کے دور میں بڑی راحت سے اور عدل وانصاف کے سائے میں رہتے تھے (البدایہ والنہایہ: ۸/ ۱۲۷)۔

غذائی اشیاء کے اسٹور:

امن واستحکام کے ساتھ ریاست کے مالی وسائل میں بھی خوب برکت تھی، جس کو وہ رعایا کی خوشحالی ورفاہیت کے کاموں میں خرچ کرتی تھی۔ ہر ضلع میں غلے کے ڈپو بنائے جاتے تھے۔ جن میں اجناس کا ذخیرہ رہتا تھا۔ لوگوں اور خصوصاً افواج کی ضروریات کی فراہمی میں حکومت اس قدر چست اور منظم تھی کہ ان ڈپوز میں صرف انسانی استعمال کی اجناس ہی نہیں رہتی تھیں، جانوروں کا چارہ اور بھوسا وغیرہ بھی ہوتا تھا۔ ان کو دارالرزق کہتے تھے۔ یہاں سے غرباء کو راشن بھی ملتا تھا۔ اور اس کا مقصد تمام علاقوں میں اجناس کی قلت نہ ہونے دینا بھی تھا۔ زیاد نے بصرہ میں نیا ڈپو بنایا، یہ اتنا بڑا تھا کہ دارالرزق کے بجائے 'مدینۃ الرزق' کہلاتا تھا، جس سے معلوم

ہوتا ہے کہ غلہ کی حکومتی خرید میں اضافہ کیا گیا تھا۔ بصرے کے دارالرزق کے افسر عبداللہ بن حارث بن نوفل ہاشمیؓ مقرر کیے گئے۔ ان کے بعد یہ عہدہ حضرت ابوبکرہؓ کے صاحب زادے رَوّاد کو ملا۔

حضرت معاویہؓ کے افسران ہر ضلعے میں اجناس کی رسد کا جائزہ لیتے رہتے تھے کہ کہیں قلت نہ پیدا ہوجائے۔ بازار میں اشیاءِ ضرورت کی قیمتوں پر بھی نظر رکھتے تھے۔ زیاد نے جمعہ کا دن مقرر کر رکھا تھا جس دن وہ مدینۃ الرزق کا جائزہ لیتے تھے کہ غلہ کی کتنی رسد موجود ہے، کتنی گئی، اور کتنی آئی؟ جائزہ لیتے کہ بازار میں اشیاء خوردنی کے نرخ کیسے ہیں؟ تاکہ اس کے مناسب اقدامات کیے جائیں[1]۔ مدینہ کے لوگوں کو جس ڈپو سے غلہ تقسیم ہوتا تھا وہ ساحل پر واقع ''الجار'' نامی بندرگاہ سے ملحق تھا (موطا: ۲۳۶۰، شرح زرقانی: ۳/ ۴۳۳)۔ یہاں مصر سے غلہ آتا اور محفوظ کیا جاتا تھا۔

شہری تحفظ یا Civil Defence:

حضرت معاویہؓ نے مملکت اسلام کو جو غیر معمولی تمدنی ترقی دی اور عوامی بہبود و فلاح کے جو وسیع انتظامات کیے ان میں ایک Civil Defence کا نظام بھی تھا۔ اسلامی تاریخ میں حضرت معاویہؓ ہی Civil Defence کے صیغے کے موجد و بانی ہیں۔ شہری مراکز میں آگ زنی، زلزلے یا سیلاب جیسے حوادث میں بچاؤ کے کاموں کے لیے آلات اور بڑی تعداد میں لوگ امدادی کاموں کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ مصر میں روضہ نامی ایک شہر دریائے نیل پر واقع تھا۔ یہ پہلے الجزیرۃ کہلاتا تھا اور مصر کے دارالسلطنت فسطاط (موجودہ قاہرہ) کے قریب واقع تھا۔ حضرت معاویہؓ کے عہد میں یہاں (Civil Defence) یعنی آفات و حوادث میں امداد کا بڑا مرکز تھا، جس میں ۵۰۰/ افراد ہمہ وقت تیار رہتے تھے، کہ آگ یا زلزلے کی ناگہانیوں میں لوگوں کے تحفظ کا کام کریں (خطط المقریزی: ۳/ ۳۱۳)۔

نہریں اور آب پاشی:

عوام اور ریاست کی اقتصادی ترقی حضرت معاویہؓ کے نظام حکومت کا ایک زریں باب ہے۔ اس سلسلے کے ان کے انتظامات اور اقدامات (دیگر بہت سے امور کی طرح) عین عہد فاروقی کے نقش قدم پر تھے۔ اسی معاشی استحکام و ترقی سے داخلی امن و استحکام میں بھی مدد ملتی تھی اور یہی ترقی جہاد و دفاع کی وسیع و عریض سرگرمیوں کی پشتیبان بھی تھی۔ اس موضوع کا ڈاکٹر عصام عیدروس نے اپنے تحقیقی مقالہ التطور الاقتصادی فی العصر الاموي (عہد اموی میں معاشی ارتقا) میں بہت تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ روایتی معیشت میں زراعت معیشت کی شہ رگ ہوا کرتی تھی۔ اور زراعت کا دارومدار اس پر تھا کہ آبپاشی کا نظام کس قدر ترقی یافتہ اور وسیع ہے۔ حضرت

---

[1] انساب الاشراف: ۵/ ۲۱۴، طبری: ۵/ ۲۲۲۔

معاویہؓ نے خلیفہ بننے کے بعد عراق، شام اور مصر میں اس طرف خصوصی توجہ دی۔

نہروں اور نالوں کا وسیع جال:

ڈاکٹر عصام عیدروس لکھتے ہیں کہ حضرت معاویہؓ کے دور میں تقریبا پورے عراق میں آب پاشی کے نظام کو بہت ترقی دی گئی۔ اس سلسلے میں بڑے دریاؤں سے بڑی نہریں اور ان سے چھوٹی نہریں Canals جاری کی گئیں۔ خصوصا شط العرب (دجلہ میں جب فرات آکر مل جاتی ہے تو اس کو شط العرب بھی کہتے ہیں) کے مغرب میں اقلیم بصرہ کے تابع بڑی قابل زراعت زمینیں تھیں مگر سینچائی کا مناسب انتظام نہ ہونے سے پیداوار سے محروم تھیں۔ عراق میں مقیم قبائلی سردار اور اہم شخصیات اپنے علاقے کے مسائل لے کر دربار خلافت جایا کرتے تھے۔ انہوں نے عراق میں کسانوں کی پریشانیوں کا خصوصا آبپاشی کے مسائل کا ذکر کیا۔ لہٰذا حضرت معاویہؓ نے وہاں نہریں کھدوائیں۔ سب سے پہلے اس سلسلے میں ایک بڑی نہر نہرِ اُبُلّہ کھدوائی گئی۔ یہ چار فرسخ یعنی تقریبا بیس کلومیٹر لمبی ایک قدیم نہر تھی، مگر مدت سے پٹی پڑی تھی (معجم البلدان: ۱/۷۷)۔

اس کے بعد بصرے کے ایک نہایت معزز سردار منذر بن جارود عبدی، جو حضرت علیؓ کے گورنروں میں سے رہ چکے تھے، حضرت معاویہؓ کے پاس تشریف لائے اور عراق کے مسائل پر تبادلۂ خیال کیا۔ انہوں نے تجویز رکھی کہ شط العرب سے ایک اور نہر کھدوائی جائے۔ حضرت معاویہ نے گورنر زیاد کے نام اس کا حکم جاری کیا۔ انہوں نے ایک اور نہر کھدوائی۔ کھدائی کا آغاز تبرکا صحابی رسول حضرت عبدالرحمن بن ابی ابکر رضی اللہ عنہما سے کروایا، نہر جب کھد کر تیار ہوگئی تو اس میں پانی چھوڑنے کا کام حضرت معقل بن یسارؓ کے دست مبارک سے کروایا گیا۔ اور اس نہر کا نام بھی انہی کے نام پر نہر معقل رکھا گیا[۱]۔ یہ ایک تیز بہاؤ کی وسیع وعریض نہر تھی، اس قدر وسیع کہ اس میں مال بردار کشتیاں چلا کرتی تھیں اور جس کے ذریعہ بصرہ اور اہواز جیسے شہروں کو سارے عراق سے مال آتا جاتا تھا۔ اس سے بہت سی چھوٹی نہریں نکالی گئیں تھیں۔ ایک بڑی نہر دُبیس نامی کھودی گئی اور اس سے نہر ابلہ اور نہر معقل کو جوڑ دیا گیا (خطط البصرہ، صالح العلی: ۱۵۰)۔

تنہا بلاذری نے فتوح البلدان (۳۴۸۔ ۳۵۳) میں دسیوں چھوٹی نہروں اور باندھوں کا تذکرہ کیا ہے جو بصرے کے اطراف میں حضرت معاویہؓ کے دور میں بنائی گئیں۔ اسی طرح عراق کے علاقے انبار میں نہر شیلی نام کی ایک نہر کبھی قدیم زمانے کی موجود تھی، مگر زمانے سے پَٹی پڑی تھی۔ حضرت معاویہؓ کے عہد میں دوبارہ کھودی گئی اور اس سے کھیتوں کی سیرابی کا کام لیا گیا (معجم البلدان: ۵/۳۲۱)۔

۱؎ معجم البلدان: ۵/۳۲۴، فتوح البلدان: ۳۴۸۔

ڈیم اور بیراج:

جگہ جگہ ڈیم اور بیراج بنائے گئے، کنویں اور تالاب کھدوائے گئے۔ دریاؤں کا پانی زراعتوں کو نقصان نہ پہنچائے، اس مقصد سے باندھ بنائے گئے۔ دجلہ خلیج فارس میں آکر گرنے سے پہلے متعدد دھاروں میں بٹ جاتا ہے۔ بارش کے موسم میں پانی بڑھتا تو ان سب میں پانی بھرتا اور نہروں نالوں کے ذریعہ چڑھ آتا۔ پھر علاقہ نشیبی ہونے کی وجہ سے یہاں پانی بھرا رہتا تھا، اس لیے مدت سے یہ وسیع علاقہ غیر مزروعہ چلا آرہا تھا۔ یہ متروکہ زمینیں بطائح کہلاتی تھیں۔ حضرت معاویہؓ نے عراق میں وزیر مالیات وزراعت کے طور پر ایک تجربہ کار افسر عبداللہ بن دراج کو معین کر رکھا تھا۔ لہٰذا اُن کو حکم دیا کہ اس علاقے میں زراعت ممکن بنانے کے لیے باندھ اور ڈیم بنائے جائیں، چنانچہ نہایت کثرت سے ایسے ڈیم بنائے گئے جن سے جب ضرورت ہوتی پانی کھولا جاسکے اور جب ضرورت نہ ہو بند رہے۔ پانی کی نکاسی کے لیے نالے صاف کروائے اور جنگلات کاٹے گئے [۱]۔ دیگر علاقوں میں بھی ڈیم بنائے گئے۔ ان میں سے ایک ڈیم کا نام ابن الفقیہ نے ''مسناۃ مصعب'' ذکر کیا ہے (البلدان: ۲۳۴)۔ کوفہ میں زیاد نے فرات پر باندھ اور پل تعمیر کیے۔ جن کے نیچے دریا کے پانی کو روکنے اور نہروں میں لے جانے کے لیے بیراج بنائے گئے [۲]۔

پینے کے پانی کے انتظامات:

شہروں کی آبادی بڑھتی جاتی تھی۔ جو شہر نہروں کے قریب نہیں تھے، ان میں بھی پانی پہنچانے کے لیے دور دراز کے چشموں اور کنوؤں سے نہریں نالیاں کھود کے پینے کا پانی لایا جاتا تھا۔ مکہ ایک ریگ زار وادی تھی، جہاں سب سے بڑی مشکل پانی کی تھی۔ دور دراز علاقوں میں چند چشمے تھے۔ آبادی کے بڑھنے کی وجہ سے سارے ہی مکینوں کو مشکلات کا سامنا تھا، خصوصاً حج کے موقع پر یہ مشکل اور بڑھ جاتی تھی۔ حضرت معاویہؓ نے اس کے لیے بڑے انتظامات کیے۔ دور دراز علاقوں میں جو چشمے جاری تھے، ان سے شہر تک نالیاں بنائی گئیں، ایک سنگلاخ وادی کے نشیب وفراز سے پانی لے کر جانا نہایت مشکل کام تھا۔ اس کے لیے بڑے ماہر انجینئروں کی ضرورت پڑی۔ ان چشموں کے پاس ہی بڑے بڑے باغات بنائے گئے۔ وہ پانی جابجا تالابوں میں جمع کیا جاتا جہاں سے انسان اور جانور سیراب ہوتے (اخبار مکہ: ۲/۲۲۸)۔

مدینہ میں بھی پانی کی قلت تھی۔ قباء میں ایک بہت بڑا کنواں تھا۔ وہاں سے ایک نہر کاٹ کر مشرقی جانب

۱۔ فتوح البلدان: ۲۸۷، تاریخ یعقوبی: ۲/۲۱۸۔

۲۔ فتوح البلدان: ۲۸۶، الادارۃ فی العصر الاموی: ۲۴۷۔

سے ہوتی ہوئی شہر کے شمال تک لائی گئی۔اس کنویں سے غالباً رہٹ جیسی چیزوں سے پانی نکالا جاتا ہوگا۔بہر حال پورے شہر کو یہ نہر سیراب کرتی تھی اور صدیوں جاری رہی[1]۔

حرمین شریفین کی خدمت:

حرمین شریفین کی خدمت، توسیع اور حجاج وزائرین کی سہولتوں نیز ان مقامات کی ترقی کا خصوصی اہتمام تھا۔شریعت نے اس خطۂ زمین کو جسے حرم مکی کہا جاتا ہے، نہایت محترم ومقدس قرار دیا ہے۔یہ کہیں کعبہ سے ۴ میل دور تک اور کہیں ۹ میل تک کا علاقہ ہے۔اس سے متعلق بہت سے خصوصی احکام ہیں۔اس لیے حضرت عمرؓ نے حرم مکی کے حدود متعین کروانے کا خصوصی اہتمام فرمایا تھا۔ہر چوٹی پر اور وادی میں ماہرین کے ذریعہ نشان کے پتھر نصب کیے گئے تھے۔ان کو انصاب الحرم کہا جاتا تھا۔حضرت عثمانؓ کے دور تک ہر سال واقف صحابہ ان کا جائزہ لیتے تھے اور ان کی مرمت وتجدید کرتے تھے۔پھر اس پر عمل جاری نہیں رہ سکا تھا۔حج وعمرہ اور دیگر شرعی احکام کا ان حدود اور نشانوں سے تعلق تھا۔ضروری تھا کہ ان کو مٹنے نہ دیا جائے۔حضرت معاویہؓ کا دور آیا تو اس طرف توجہ فرمائی۔مکہ کے حاکم کو حکم دیا کہ ان نشانات کو پھر سے لگایا جائے (اخبار مکہ ازرقی: ۲/ ۱۲۹)۔

حرم مقدس کی خدمت کے لیے مرکز خلافت سے خدام بھیجنے کا اہتمام کیا۔چراغوں، قندیلوں اور ان کے لیے تیل وغیرہ کے لیے بیت المال سے بجٹ مختص کیا (حوالۂ بالا: ۱/ ۱۸۶، ۲/ ۱۵۳)۔

شام کے بازار میں دنیا کی ترقی یافتہ اشیاء ملتی تھیں۔حضرت معاویہ نے شام سے طرح طرح کی خوشبو اور بخور بھیجنا شروع کیے، جن سے ہر نماز کے وقت مسجد کو معطر کیا جاتا اور غلاف کعبہ اور پورے ماحول کو دھونی دی جاتی۔ہر سال حج کے موقع پر اور رجب میں دمشق سے یہ خوشبو کا سامان مکہ بھیجا جاتا۔حضرت عمرؓ نے سال میں ایک مرتبہ مصری قباطی کا غلاف بھیجنا شروع کیا تھا، حضرت معاویہؓ نے سال میں دو غلاف ارسال کرنا شروع کیے۔ایک مصری قباطی اور دوسرا یمنی دیباج کا ہوتا تھا، جو یوم عاشور کو پہنایا جاتا تھا (اخبار مکہ: ۱/ ۲۵۳)۔خدمت حرم کا اس درجہ اہتمام تھا کہ اپنے ساتھ حج کے موقع پر شام سے ایک منبر بنوا کر لائے، وہ مسجد حرام میں رکھا گیا۔یہ مکہ کا پہلا منبر تھا (حوالۂ بالا: ۲/ ۱۰۰)۔

حجاج کی سہولتوں کے بڑے انتظامات کروائے۔منی وعرفات میں حجاج کو موسم کی شدت میں کھلے آسمان تلے رہنا پڑتا تھا۔پانی کی بھی قلت ہوتی تھی۔حضرت معاویہؓ نے بڑے وسیع انتظامات کروائے۔ان مقامات پر

---

[1] تاریخ مکۃ المشرفۃ والمسجد الحرام والمدینۃ الشریفۃ والقبر الشریف۔ المؤلف: محمد بن احمد بن الضیاء: ۲۵۱۔

عمارتیں بنوائیں کہ حجاج سائے میں رہیں اور اپنا ساز وسامان درست رکھیں۔ کنویں اور نہریں بنوائیں، سائے کے لیے کثرت سے پیڑ لگوائے۔ حضرت عائشہؓ کو اعتراض ہوا، لیکن جب حضرت معاویہؓ نے حجاج کی پریشانیاں یاد دلائیں تو وہ مطمئن ہو گئیں (تاریخ دمشق: ۲۳۰/۱۲، بسند حسن)۔

مکہ مکرمہ کی ترقی اور آب رسانی کے انتظامات:

مکہ مکرمہ کی ترقی وتوسیع کا بہت کام ہوا۔ جا بجا سرکاری عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ جن میں ایک عظیم الشان عمارت سفید رنگ کی تھی اور الدار البیضاء کہلاتی تھی۔ اسی کے پاس ایک اور عمارت الرقطاء نامی تھی۔ رقطاء دھاری دار دورنگی شے کو کہتے ہیں۔ یہ سفید پتھر اور لال پکی اینٹ کی بنی تھی۔ ام المومنین حضرت خدیجہؓ بنت خویلد کا وہ گھر، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا قیام رہتا تھا، ابھی تک محفوظ اور قبلۂ دل ونگاہ تھا۔ ہجرت کے بعد اس پر عقیل بن ابی طالب نے قبضہ کر لیا تھا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فتح مکہ کے بعد اس کو واپس نہیں لیا۔ امیر المؤمنینؓ کو رسول اللہؐ کے آثار ونشانات سے عشق تھا، چنانچہ حضرت عقیلؓ کی اولاد سے اس گھر کو خریدا اور یہاں ایک بڑی مسجد تعمیر کروائی۔ مسجد میں اس مبارک گھر کے حدود اربعہ کے نشانات لگوائے (اخبار مکہ: ۱۹۹/۲)۔ ان کثیر تعداد میں سرکاری عمارتوں کی تعمیر کے لیے عرفات کی وادی عرنہ میں ایک بڑا اینٹ کا بھٹہ لگوایا گیا۔ اور اس میں کام کرنے کے لیے نبطیوں کو لا کر بسایا گیا۔ بعد میں یہ علاقہ نبطی محلے کے نام سے ہی مشہور ہوا۔

حج کا زمانہ آتا تو امیر المومنین کو فکر رہتی کہ مناسک بخیر وعافیت ادا ہو جائیں۔ گورنر مدینہ، جو مکہ کا بھی حاکم ہوتا تھا، مناسک مکمل ہوتے ہی فوراً برید روانہ کرتا کہ مکہ، منیٰ اور عرفات میں سب خیریت رہی (حوالۂ بالا: ۱۸۸/۳)۔

مکہ اب ایک بڑا آباد وپر رونق شہر تھا۔ آبادی بھی بڑھ گئی تھی، حجاج ومعتمرین کی تعداد بھی روز افزوں تھی۔ ہر وقت انسانوں اور اموال واجناس کی آمد ورفت رہتی۔ حضرت ابوسفیانؓ کے گھر کے آگے کی جانب ایک نہایت وسیع آنگن (میدان) تھا۔ یہی وہ گھر تھا جس کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فتح مکہ کے موقع پر عام دار الامان قرار دیا تھا۔ حضرت معاویہؓ نے اس میدان کو آنے جانے والے قافلوں کی فرودگاہ بنایا۔ یہاں طائف ویمن یعنی مکہ کے جنوب کی طرف سے اجناس لانے والے تجارتی قافلے اترتے اور ان کا بازار لگتا (اخبار مکہ: ۲۳۷/۲۔۲۳۹)۔

بیمارستان یعنی ہسپتال:

امیر المؤمنین حضرت معاویہؓ کے مبارک عہد میں ہمہ جہت تمدنی ترقی ہوئی۔ اسلام کی تاریخ کا پہلا بیمارستان مکہ میں حضرت معاویہؓ ہی نے بنوایا۔ ایک بڑی عمارت دار الحدادین تھی، جس کو بعد میں دار مال اللہ کہا جانے لگا تھا۔ وہ

بیماروں کے قیام وعلاج کا مرکز تھی۔ عباسیوں کے عہد تک اس میں مریض بھرتی ہوتے تھے(اخبار مکہ: ۲/ ۲۳۹)۔

سرکاری لنگر خانہ:

انہی ترقیات میں سے ایک یہ بھی تھا کہ حج کے ایام میں حجاج کے لیے مکہ میں سرکاری لنگر کا انتظام کیا گیا۔ اس کے لیے ایک بڑا مطبخ قائم کیا گیا تھا۔ اس کو دارالمراجل کہتے تھے۔ (مراجل دیگوں کو کہتے ہیں)۔ حج کے علاوہ ہر سال رمضان میں فقراء کے لیے یہاں سے مفت کھانا تقسیم ہوتا تھا۔

مدینہ طیبہ کی تمدنی ترقیات:

مدینہ نبویہ ابھی تک اپنی قدیم سادہ حالت پر تھا۔ حضرت معاویہؓ نے اس کی ترقی کی طرف بھی توجہ فرمائی۔ گورنر مروان کو حکم دے کر دمشق وبصرہ جیسے متمدن شہروں کے طرز پر مسجد نبوی کے چاروں طرف کچے راستوں کو پکا کرایا اور زمینوں پر پتھر کا فرش لگوایا۔ ان زمینوں سے پانی کی نکاسی کے لیے تین بڑے نالے بنائے گئے جن سے شہر کا پانی دور وادیوں تک جاتا تھا(تاریخ المدینہ لابن شبہ: ۱/ ۱۶)۔

قلعوں، سرکاری دفاتر اور بازار کی تعمیر:

مدینہ طیبہ کی دوطرف حرّے تھے، شمال کی طرف احد پہاڑ اور جنوب میں گھنے باغات۔ یہ چیزیں مدینہ کو فطری شہر پناہ فراہم کرتی تھیں۔ جبل احد سے جبل سلع تک، جو خالی حصہ بچتا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہاں خندق کھدوائی تھی۔ اس طرح اب مدینہ مکمل طور پر محصور ومحفوظ شہر تھا۔ بس جنوب وشمال کو جانے والے راستے بچے تھے۔ حضرت معاویہؓ نے دونوں طرف دو مضبوط قلعے تعمیر کروائے۔ پہلا شمال کی جانب حرہ غربیہ میں بئر رومہ کے پاس، جہاں جنگ خندق میں مشرکین کا لشکر ٹھیرا تھا۔ یہ قصر الخل کہلاتا تھا۔ مورخین نے لکھا ہے کہ حروں کے درمیان سے گزرنے والے راستے کو خلّ کہتے ہیں۔ حضرت معاویہؓ نے مروان کو اس قلعے کی تعمیر کا حکم دیا۔ انہوں نے حضرت نعمان بن بشیرؓ کو تعمیر کا نگراں مقرر کیا۔ اس کے صدر دروازے پر ایک پتھر پر یہ عبارت منقوش تھی:

لِعَبْدِ اللّٰهِ مُعَاوِيَةَ أَمِيرِ الْمُؤْمِنِينَ، مِمَّا عَمِلَ النُّعْمَانُ بْنُ بَشِيرٍ۔

اللہ کے بندے امیر المومنین معاویہ کے حکم سے نعمان بن بشیر نے بنوایا۔

دوسرا قلعہ جنوب مشرق کی سمت تھا، اس کے عین درمیان میں مشہور کنواں بیرحاء واقع تھا۔ اس کی تعمیر حضرت معاویہؓ کے حکم سے مشہور صحابی حضرت ابی بن کعبؓ کے صاحبزادے طفیل نے کروائی تھی[۱]۔

دیگر صوبائی مراکز کی طرح مدینہ میں بھی سرکاری دفتر کے لیے ایک وسیع عمارت خریدی، جو اصلاً حضرت

---

[۱] تاریخ المدینہ لابن شبہ: ۱/ ۲۷۱، ۲۷۲۔

عبدالرحمان بن عوف کا محل تھی۔ یہ شہر کے مرکز میں مسجد نبوی سے بالکل ملحق تھی۔ ان کی اولاد سے خرید کر اس میں دیوان الجند اور سرکاری دفاتر بنائے گئے۔ اسی کے ایک حصے میں بیت المال یعنی سرکاری خزانہ تھا۔ گورنر کے قیام کے لیے ایک محل بنایا گیا، جو دار مروان کہلاتا تھا اور مدتوں مدینہ کے گورنروں کی سرکاری قیام گاہ رہا۔

قدیم دور میں بازار، دیہاتی پینٹھوں کی طرح، یونہی افتادہ زمینوں میں لگ جایا کرتے تھے۔ حضرت معاویہؓ نے مدینہ میں بازاروں کی عمارتیں بنوائیں۔ ایک کا نام دار القطران، اور دوسری کا دار النقصان تھا۔ ایک سرکاری عمارت قَصْرُ الدَّ ارِیِّین کہلاتی تھی۔ یہ حضرت حسان بن ثابتؓ کے اس باغ میں تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو دیا تھا۔ حضرت معاویہؓ نے اونچی قیمت کے بدلے وہ باغ خریدا اور اس میں یہ عمارت بنائی گئی۔

(تاریخ المدینہ لابن شبہ: ۱/ ۲۳۳، ۲۵۶، ۲۷۰، ۲۷۳)۔

انیسواں باب

- یزید کی ولی عہدی
- آخری ایام، بیماری، وصیتیں اور وفات
- اوصاف وکمالات، جسمانی حلیہ، معمولات اور ازواج واولاد

فصل اول

یزید کی ولی عہدی

امیر المومنین حضرت معاویہؓ کی حکومت کا سب سے متنازعہ فیصلہ اپنے بیٹے یزید کو ولی عہد مقرر کرنا تھا۔ مورخین ابن جریر طبری، ابن کثیر اور ابن اثیر وغیرہ کے بیان کے مطابق سن ۵۶ ہجری میں حضرت معاویہ نے اپنے بعد خلافت کے لیے یزید کو نامزد کرنا چاہا[۱]۔ اور اس نامزدگی کو قانونی شکل دینے کے لیے انہوں نے تمام مراکز سے ولی عہدی کے لیے باقاعدہ بیعت لینے کا اہتمام کیا، تاکہ کسی اختلاف کی گنجائش نہ رہے۔ جس کے نتیجہ میں تمام اقالیم و مراکز کے اعیان نے یزید کی بیعت قبول کر لی۔ ابن کثیر لکھتے ہیں:

> اسی سال (۵۶ھ میں) حضرت معاویہؓ نے تحریک کی کہ لوگ ان کے بعد ان کے بیٹے یزید کے لیے بیعت کریں۔۔۔ پس تمام اقلیموں کے لوگوں نے بیعت کر لی، سوائے عبدالرحمان بن ابی بکر، عبداللہ بن عمر، حسین بن علی، عبداللہ بن زبیر اور عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہم) کے۔ (۸/۸۶)۔

اقالیم کے وفدوں سے مشورہ:

اس سلسلے میں سن ۵۶ھ ہی کے غالبا شروعات کی بات ہے کہ امیر المومنین نے تمام اقالیم کے گورنروں کو حکم بھیجا کہ اس مسئلے میں گفتگو کے لیے اپنے اپنے علاقوں کے قائدین و اہل حل و عقد کے وفد میرے پاس بھیجو۔

[۱] طبری: ۵/۳۰۱، البدایۃ والنہایۃ: ۸/۸۶۔ یہی صحیح ہے۔ خلیفہ بن خیاط اور ذہبی کا بیان ہے کہ ولی عہدی کی تجویز و تحریک سن ۵۱ ہجری کا قصہ ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ متعدد صحیح روایات (جن میں سے بعض آگے آ رہی ہیں) بتاتی ہیں کہ اس تحریک کے وقت مروان مدینے کے گورنر تھے۔ اور مروان سن ۴۲ سے سن ۴۹ ہجری تک اور پھر دوبارہ ۵۴ سے ۵۷ ہجری تک مدینہ کے گورنر رہے۔ لہٰذا یہ ان کی دوسری مدت کا واقعہ ہی ہوسکتا ہے۔ ملاحظہ ہو: مرویات خلافۃ معاویہ: ۳۶۳۔

طبری اور ابن اثیر کی بعض روایات میں ہے کہ یزید کی ولی عہدی کی تجویز اصلا حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی طرف سے پیش کی گئی تھی۔ اس روایت کے بنیادی طور پر غلط ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ حضرت مغیرہؓ تمام مورخین کے نزدیک سن پچاس میں وفات پا چکے تھے (الاصابۃ: ۶/۱۵۶)۔ حضرت مغیرہ کی تجویزِ ولی عہدی کی روایات یا تو بے سند ہیں یا ان کی سند میں کذاب راوی ہیں۔ اس روایت کے داخلی تضادات کے لیے ملاحظہ ہو واقعہ کربلا اور اس کا پس منظر: ۸۳، ۸۴۔

یہ گفتگوان سے مشورے کے لیےتھی، یا اگر حضرت معاویہؓ ولی عہدی کا پختہ فیصلہ کر چکے تھے تو قائدین کو قائل کرنے اوران کی رائے ہموار کرنے کے لیےتھی، دونوں امکان ہو سکتے ہیں۔ بہر حال یہ وفد پہنچے۔ ابن عبدربہ نے مورخ مدائنی کی تفصیلی روایت ذکر کی ہے، اس کی رو سے تمام اقلیموں اور فوجی مراکز سے بڑے طاقت ور قبائل کے زعماء حاضر ہوئے۔ حضرت معاویہؓ نے اپنی پوری بات پیش کی۔ تمام زعماء نے تجویز کے بابت اپنی رائے رکھی۔ مدائنی کی اس تفصیلی روایت (اور دیگر مورخین کی بھی روایات) کے بموجب ان سب نے ان حالات میں، اختلاف وفتنہ سے بچنے کے لیے، اس رائے کو امت کے حق میں بہتر بتایا اور بیعت کی (العقد الفرید: ۱۱۸/۵، البدایہ والنہایہ: ۸۶/۸)۔

حضرت عمرو بن حزم انصاریؓ کی نصیحت اور حضرت معاویہ کا گہرا اثر:

محدث ابویعلیٰ نے حضرت محمد ابن سیرین سے حسن سند سے روایت کیا ہے کہ اس موقعے پر مروان نے مدینے کی اہم شخصیت حضرت عمرو بن حزم انصاریؓ کو بھیجا تھا۔ ان سے حضرت معاویہؓ کی الگ ملاقات ہوئی۔ انہوں نے نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

> یزید کو دنیا میں مال ومرتبہ سب کچھ ملا ہوا ہے، کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ معاویہ! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ جس کسی کو اللہ تعالیٰ حکومت واقتدار کی امانت سپرد کرتا ہے، اس سے قیامت کے دن ضرور سوال ہوگا کہ اس نے اس امانت کا کتنا خیال رکھا۔ معاویہ! میں تم کو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت کے بارے میں خدا کا خوف رکھنے کی نصیحت کرتا ہوں، سوچ لینا! امت کو کس کے حوالے کر کے جاؤ گے اور اپنے رب کو کیا جواب دو گے؟

حضرت معاویہؓ یزید کی ولی عہدی کا فیصلہ کر چکے تھے، لیکن ان پر اس عبرت انگیز نصیحت کا گہرا اثر ہوا۔ روایت کے الفاظ ہیں کہ:

> ''وہ کانپ گئے، سانس پھولنے لگی، سرد موسم میں پسینہ چھوٹ گیا''۔

کچھ دیر بعد سکون ہوا تو پسینہ صاف کرتے ہوئے فرمایا: تم بڑے سچے خیر خواہ شخص ہو، اپنی رائے کے مطابق تم نے ہر کسی کی ناراضی یا رضامندی سے بے پرواہ ہو کر حق کہا۔ پھر اس کے بعد حضرت معاویہؓ نے ان سے اپنی رائے بتائی کہ موجودہ لوگوں میں وہ یزید ہی کو اپنے بعد خلافت کے لیے زیادہ موزوں سمجھتے ہیں[۱]۔

---

[۱] مسند ابویعلیٰ: ۷۴۷۱، ہیثمی نے اس کے راویوں کو صحیح کے راوی قرار دیا ہے، مجمع الزوائد: ۲۴۹/۷، حافظ ابن حجر نے بھی اس کے رجال کی توثیق کی ہے الاصابۃ، تذکرۂ عمرو بن حزم۔

حافظ ابن حجرؒ نے وضاحت فرمائی ہے کہ امارت وخلافت کے سلسلے میں حضرت معاویہؓ کی رائے یہی تھی کہ فضل وکمال اور تقویٰ ودیانت میں برتر شخص کے مقابلے میں وہ شخص امارت کے لیے زیادہ مناسب ہے، جو تدبیرِ مملکت اور قیادت وسیاست کی صلاحیتیں زیادہ رکھتا ہو۔ یعنی جس کے خلیفہ بننے سے انتظام سلطنت کے بہتر ہونے کی توقع زیادہ ہو[۱]۔ اسی لیے وہ اپنے آپ کو بھی افضل وبزرگ تر صحابہ کی موجودگی میں خلافت کے لیے زیادہ مناسب سمجھتے تھے (فتح الباری: ۷/ ۴۰۴)۔

حضرت عمرو بن حزمؓ نے اگرچہ حضرت معاویہؓ کو آگاہ فرمایا، لیکن اس روایت میں یہ نہیں ملتا کہ انہوں نے ولی عہدی کی تجویز کو سرے سے رد کر دیا ہو اور یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ حضرت معاویہؓ کا نقطۂ نظر جاننے کے بعد ان کی رائے کیا رہی، وہ حضرت معاویہؓ کی رائے سے متفق ہو سکے یا نہیں؟

تمام اقالیم میں ولی عہدی کی بیعت، مگر چار اہم حضرات کا اختلاف:

اب جب کہ ان اقالیم کے وفدوں سے بھی ولی عہدی پر اتفاق حاصل کر لیا گیا تو (تاریخی مآخذ بتاتے ہیں کہ) حضرت معاویہؓ نے تمام گورنروں کو حکم دیا کہ اپنے اپنے صوبوں (اقالیم) میں یزید کی ولی عہدی پر بیعت لیں۔ تمام صوبوں میں بالاتفاق بیعت ہوئی، صرف مدینہ میں نہ ہو سکی۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ چار بزرگوں نے ولی عہدی کی بیعت سے انکار کر دیا۔ یہ چار تھے: عبدالرحمن بن ابی بکر، عبداللہ بن عمر، حسین بن علی اور عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہم۔ ان حضرات کے مقام ومرتبے کی وجہ سے صوبۂ مدینہ کی بیعت رکی ہوئی تھی۔

حضرت معاویہؓ کا سفر حجاز:

ان حضرات کو متفق کرنے میں گورنر مدینہ مروان کو کوئی کامیابی نہیں ملی۔ اور مدینہ میں بیعت نہیں ہو سکی۔ رجب سن ۵۶ھ میں حضرت معاویہ عمرے کے لیے حرمین حاضر ہوئے۔ تب ان حضرات سے علیحدہ علیحدہ ملاقات کی۔ روایات کے مطابق کچھ خاص بات نہیں بنی۔ البتہ طبری کی روایات کے مطابق حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت حسینؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے بس یہ کہا کہ اگر سب اتفاق کر لیں گے تو ہم بھی بیعت کر لیں

---

۱ یعنی (حضرت معاویہ کے نزدیک) جو لوگ ممکنہ طور پر ان کے بعد خلیفہ بن سکتے تھے، ان میں یزید اگرچہ دینی یا علمی طور پر کم تر تھا، لیکن اس منصب کے لئے زیادہ اہل تھا۔ گزر چکا ہے کہ حضرت معاویہ کو جب حضرت شرحبیل کے تابع علاقہ سپرد کیا گیا اور حضرت شرحبیل کو کچھ خیال ہوا، تو حضرت عمر نے بھی ایسا ہی نقطۂ نظر ظاہر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''ارید رجلا اقویٰ من رجل''، یعنی میں زیادہ باصلاحیت آدمی چاہتا تھا طبری: ۴/ ۶۵۔

گے۔حضرت معاویہؓ نے بس اتنے کو ہی کافی سمجھا (طبری: ۳۰۴/۵)۔

عبدالرحمان بن ابی بکرؓ کے بارے میں طبری کی روایت میں یہ بھی ہے کہ انہوں نے صاف انکار کیا تو حضرت معاویہؓ نے ان کو قتل کی دھمکی دی اور خاموش رہنے کو کہا۔مورخین کی روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ حضرت معاویہؓ جب ان حضرات کو قائل نہیں کر سکے تو انہوں نے ان کو سخت دھمکیاں دیں کہ خبردار اگر کچھ مخالفت کی تو خیر نہیں۔ یہاں تک کہ بعض روایات کے مطابق ولی عہدی پر علانیہ بیعت کے لیے جب جلسہ منعقد کیا تو ان میں سے ہر ایک کو حاضر کیا گیا اور ہر ایک کے سر پر دو تلوار بردار کھڑے کر دیے کہ اگر کچھ بولیں تو سر قلم کر دیا جائے۔ اس طرح ان حضرات کو جبراً خاموش کر دیا گیا۔

ان روایات میں یہ بھی مذکور ہے کہ اہل مدینہ سے حضرت معاویہؓ نے جلسۂ عام میں یہ جھوٹ بولا کہ ان حضرات نے بیعت کر لی ہے اور وہ یہاں منبر کے پاس ہی موجود ہیں۔ یہ روایات، مجمل یا مفصل، طبری، ابن کثیر، ابن اثیر اور دیگر مورخین کی کتابوں میں درج ہیں، عموماً سب بے سند بیانات ہیں۔طبری نے کچھ سند ذکر بھی کی ہے تو راوی کا نام نہیں، محمد بن عون فرماتے ہیں کہ مجھ سے ''مقام نخلہ میں کسی شخص'' نے بتایا۔اس شخص کا کچھ پتہ سرا نہیں کہ کون تھا؟ کس قسم کا آدمی تھا؟ بس مقام نخلہ میں ملا تو بتایا۔ایسی بے سند روایتوں سے اس قدر خطرناک باتیں کیسے قبول کی جائیں؟ [۱]۔

کیا یہ ممکن ہے کہ ان حضرات کو جان کی دھمکی دے کر خاموش کیا جائے، پھر اہل مدینہ سے یہ جھوٹ بول کر بیعت لے لی جائے کہ یہ حضرات راضی ہیں، اس کے بعد حضرت معاویہؓ واپس چلے جائیں اور مدینہ میں یہ بات کھل جائے کہ معاویہؓ نے زبردستی مجبور کر کے ان حضرات کو خاموش کیا تھا اور لوگوں سے جھوٹ بولا تھا کہ یہ راضی ہیں، تو کیا یہ ممکن ہے کہ اہل مدینہ میں اس جھوٹی بیعت کے خلاف کوئی آواز نہ اٹھے اور ہم کو کوئی ایک فرد بشر بھی نہ ملے جو کہے کہ وہ اس بیعت کو نہیں مانتا؟؟؟ جب کہ انہی کی چار کی وجہ سے مدینے کی بیعت رکی ہوئی تھی۔ پھر ان پانچ میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ بھی ہیں جنہوں نے یزید اور اس کی فوجوں کو لوہا چبوا دیا اور ایک بڑے خطے پر اپنی حکومت قائم کر لی۔اور حضرت حسینؓ جیسے جیالے اور بے خوف بھی ہیں، جنہوں نے بعد میں یزید کے خلاف علم جنگ بھی بلند کیا اور کسی ناصح و خیر خواہ کے مشورے سے بھی کسی مصلحت پر نظر نہیں کی اور جو صحیح سمجھا کر گزرے۔کیا ان جیالوں کو اس پر راضی کیا جا سکتا تھا کہ وہ اس ذلت کے ساتھ مجلس میں بٹھائے جائیں کہ سر پر

---

[۱] بعض ریسرچ اسکالرس نے ان روایات کا جائزہ لیا تو ان میں سے کسی ایک کی بھی سند قابل اعتماد نہیں پائی، ملاحظہ ہو صحیح تاریخ الطبری: ۳۲/۴۔

جلا دتلوار لیے کھڑے ہیں۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ اُس وقت منہ بھینچ دیے گئے تھے، کچھ چارانہ تھا۔ مگر کیا سن ۵۶ ھ سے لے کر حضرت معاویہؓ کی وفات یعنی ۶۰ ھ تک بھی ان حضرات نے سانس لینے کا موقع نہ پایا؟؟ حد ہے بے تکی باتوں کی۔

ہاں بالکل قرین قیاس ہے کہ حضرت معاویہؓ نے اصرار کیا ہو اور دباؤ ڈالا ہو۔ ذرا غور کیجیے! صورت یہ تھی کہ تمام صوبوں سے موافقت لے لی گئی تھی اور ہر جگہ کے نمایاں اشخاص نے بیعت کر لی تھی، مدینہ کے لوگوں کی بیعت صرف ان چار بزرگوں کے انکار کی بنا پر معلّق تھی۔ اب حضرت معاویہؓ صرف ان چار بزرگوں کے انکار کی بنا پر اپنی اس پوری کارروائی کی بساط لپیٹ کر تو نہ رکھ دیتے۔ ان جیسے اولوالعزم اور پختہ ارادے والے شخص سے یہ تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ خصوصاً اِس پس منظر میں کہ حضرت علیؓ کے دارالخلافت کوفہ منتقل فرمانے کے بعد مدینے کی وہ پہلی سی سیاسی اہمیت وقوت نہیں رہی تھی۔ لہٰذا اگر حضرت معاویہؓ نے دباؤ ڈال کر ان حضرات کو بیعت کی مخالفت سے روکا ہو تو کچھ ناممکن نہیں۔ غالباً ان کے لیے اس کے علاوہ کچھ اور ممکن نہیں ہوگا۔ بظاہر صورت واقعہ یوں ہی رہی ہوگی کہ ان حضرات کی موافقت یا شرکت کے بغیر ہی بیعت کی کارروائی مکمل کر لی گئی ہوگی۔ اور اسی لیے حضرت معاویہؓ کی وفات کے بعد حضرت حسین اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما دونوں نے یزید کے خلاف ہتھیار اٹھانے میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات نے ولی عہدی کی بیعت نہیں کی تھی، اگر کر لی ہوتی تو پھر ہتھیار اٹھانے کا کیا سوال تھا؟ واللہ اعلم [۱]۔

یزید کی ولی عہدی کیوں؟ حضرت معاویہ کا نقطۂ نظر:

اب سوال یہ ہے کہ یزید کو ولی عہد بنانے کی ضرورت کیا تھی؟ بعض حضرات حضرت معاویہؓ کے اس اقدام کو بہر صورت قرین مصلحت بتلاتے ہیں۔ مگر ایسی اہم شخصیتوں (خصوصاً عبداللہ بن عمرؓ جیسے شخص) کے اختلاف کے بعد ممکن نہیں کہ حضرت معاویہؓ کے موقف کو یک طرفہ طور پر کسی اختلاف یا اندیشے سے بالاتر قرار دیا جائے۔ پھر بھی، کم از کم حضرت معاویہؓ کی سوانح میں، یہ ضروری ہے کہ غیر جانب دارانہ طور پر اور حقیقت پسندی کے ساتھ، یہ جاننے کی کوشش کی جائے کہ خود اُن کا نقطۂ نظر کیا تھا۔

---

[۱] دوسری طرف سیدنا عبداللہ بن عمرؓ کو جب یزید کے خلیفہ بننے کی خبر ملی تو انہوں نے فرمایا: اگر خیر ہے تو ہم راضی ہیں۔ اور اگر آزمائش ہے تو ہم صابر ہیں۔ (طبقات ابن سعد: ۱۳۸/۴، مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۰۵۷۵ بسند صحیح) پھر انہوں نے یزید کی بیعت کر لی اور وہ اس کو ''اللہ و رسول کی بیعت'' فرماتے تھے۔ جب اہل مدینہ نے یزید کے خلاف بغاوت کی تو انہوں نے اپنے اہل خانہ اور متعلقین کو جمع فرمایا اور ان کو تاکید کی کہ خبردار! کوئی اس میں حصہ نہ لے۔ ''ہم نے اس شخص سے اللہ و رسول کی بیعت کی ہے۔ ایسی بیعت کے بعد بغاوت بڑا غدر ہے۔ جس کا انجام آخرت کی رسوائی ہے۔ سن لو! تم میں سے اگر کوئی اس میں شریک ہوا تو مجھ سے تعلق ختم (صحیح بخاری: ۷۱۱۱، مسند احمد: ۵۰۸۸)۔

سیدنا عثمانؓ کی شہادت کے بعد امت کو جس خانہ جنگی اور افتراق و فتنے کی آگ میں جھلسنا پڑا تھا، اس نے ہر معمولی سی عقل رکھنے والے کے سامنے یہ اندیشہ تو کھڑا کر دیا تھا کہ؛ 'خلیفہ کون' کا سوال پھر مسلمانوں میں خونریزی کرا سکتا ہے۔ سب ہی کو یہ خطرہ فکرمند کرتا رہا ہوگا کہ مبادا معاویہؓ کے بعد یہ بھٹّی پھر بھڑک اٹھے۔ قبیصہ ابن جابر ایک بڑے بزرگ عالم اور محترم شخصیت تھے۔ زمانۂ رسالت کو پایا تھا، لیکن رویت ثابت نہیں ہے۔ کبار تابعین میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کو زیاد نے کچھ کاموں سے حضرت معاویہؓ کی خدمت میں خصوصی قاصد کے طور پر بھیجا۔ ابو زرعہ دمشقی اپنی تاریخ میں بسند صحیح ان سے روایت کرتے ہیں کہ؛ میں جن معاملات میں گفتگو کے لیے آیا تھا، ان کے بعد میں نے عرض کیا کہ امیر المومنین جن امور کے لیے آیا تھا، ان پر تو گفتگو ہوگئی۔ میرے دل میں ایک بات اور ہے اس پر بھی کچھ غور فرما لیجیے۔ امیر المومنین نے فرمایا: کہو! میں نے عرض کیا کہ اس امت کا آپ کے بعد کون ذمے دار ہوگا؟ امیر المومنین نے فرمایا: تم کیوں پوچھتے ہو؟ میں نے عرض کیا: میں آپ کا رشتے دار بھی ہوں (رضاعی بھائی تھے) اور خیر خواہ بھی۔ ساتھ ہی باحیثیت و مرتبہ آدمی ہوں۔ بالآخر حضرت معاویہؓ نے ۶ قریشی شخصیتوں کے نام لیے کہ میرے بعد یہ لوگ ہو سکتے ہیں۔ سعید بن العاص، عبداللہ بن عامر، حسن بن علی، مروان بن الحکم، عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن الزبیر[۱]۔ حضرت حسن کی وفات سن ۵۰ ہجری میں ہوئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مشاورت ۵۰ھ سے پہلے کی ہے۔ اور یہ بھی کہ صرف مرکز خلافت ہی میں نہیں، دور دراز علاقوں میں کافی پہلے سے یہ فکرمندی موجود تھی۔ اور حضرت معاویہؓ کے یہاں اس وقت یزید کا نام قابل ذکر نہیں تھا۔

طبری اور ابن کثیر کی روایتوں میں مذکور ہے کہ ولی عہدی کی تحریک کے دوران حضرت معاویہؓ نے اپنی اسی فکر کا حوالہ دیتے ہوئے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے کہا تھا کہ میرے بعد کہیں انتشار نہ پھیل جائے:

إني خفت أن أذر الرعية من بعدي كالغنم المطيرة ليس لها راع۔

مجھے اندیشہ ہے کہ میرے بعد لوگ اس طرح منتشر نہ ہو جائیں جیسے بارش میں بھیڑوں کا گلہ، جس کا کوئی نگراں چرواہا نہ ہو (البدایہ: ۸/ ۸۷، طبری: ۵/ ۳۰۴)۔

لیکن یہ سوال باقی رہتا ہے کہ پھر اپنے بیٹے ہی کا انتخاب کس لیے کیا گیا؟ غور کیا جائے تو اوپر کے جملے ہی میں اس کا جواب بھی موجود ہے۔ وہ یہ کہ حضرت معاویہؓ یزید ہی کی نامزدگی کی شکل میں انتشار و پراگندگی سے حفاظت کا امکان دیکھتے تھے۔ یہ روایت سنداً مضبوط ہوتی تو حضرت معاویہؓ کے دفاع و براءت کے لیے بالکل کافی ہوتی۔

لیکن متعدد دوسری روایات بھی موجود ہیں جو اشارہ کرتی ہیں کہ (کم از کم اپنی نیت اور شعور کی حد تک) حضرت معاویہؓ نے جو کیا دین و ملت کی خیر خواہی سے ہی کیا اور اس میں اولاد کی محبت کو دخل نہیں تھا۔

---

[۱] تاریخ ابی زرعہ: ۵۹۲، ۵۹۳، بسند صحیح۔ تاریخ دمشق: ۲۱/ ۱۱۸ بحوالہ و بسند ابوزرعہ۔

(۱) مذکورہ روایت کے علاوہ ایک اور روایت ایسی ہے جو حضرت معاویہؓ کے مقصد و محرک ـــــ اور ان کے نقطۂ نظر کو سامنے لاتی ہے۔ ذہبی اور ابن کثیر نے نقل کیا ہے کہ (اپنے آخری ایام میں) حضرت معاویہؓ نے ایک دن یوں دعا فرمائی کہ:

اللهم إن كنت إنما عهدت ليزيد لما رأيت من فضله، فبلغه ما أملت وأعنه، وإن كنت إنما حملني حب الوالد لولده، وأنه ليس بأهل، فاقبضه قبل أن يبلغ ذلك.

خدایا! اگر میں نے یزید کو ولی عہد اس لیے بنایا ہے کہ اُس میں اِس منصب کی صلاحیت پاتا تھا، تو اس ولی عہدی کو تو پایۂ تکمیل تک پہنچا دے۔ اور اگر میں نے یہ صرف بیٹے کی محبت میں کیا ہے اور وہ اس منصب کا اہل نہیں ہے، تو اس کو اس منصب تک پہنچنے سے پہلے اپنے پاس بلا لے۔ (تاریخ الاسلام: ۱۶۹/۴)

حضرت معاویہؓ سے بدگمانی کی گنجائش نہیں:

مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ کے بقول اس روایت کے بعد اس بدگمانی کی کوئی گنجائش نہیں رہتی کہ ولی عہدی کے پیچھے پدری محبت کا جذبہ تھا نہ کہ مصلحت و اہلیت کا خیال (حضرت معاویہ اور تاریخی حقائق)۔ اور واقعہ ہے کہ اگر اس دعا کے ثبوت میں کوئی شبہہ نہ ہو تو پھر بدگمانی بڑے دل گردے کا کام ہے [۱]۔

اس کے علاوہ بھی ایسے طاقت ور شواہد موجود ہیں جو حضرت معاویہؓ کے سلسلے میں کسی شبہے کی گنجائش نہیں چھوڑتے، کہ انہوں نے جو کیا دین وملت کی خیر خواہی کے جذبے ہی سے کیا۔ اس مسئلے میں وہ آخرت کی باز پرس سے لرزاں رہتے تھے۔ مگر اِس کے علاوہ کوئی تدبیر ان کو سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

(۲) مسند ابی یعلیٰ کے حوالے سے پیچھے گزرے ہوئے حضرت عمرو بن حزم کے قصہ سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت معاویہؓ بھی سمجھتے تھے کہ مسئلہ بہت نازک ہے۔ اور ان کی رائے غلط ہو سکتی ہے۔ انہوں نے یہ فیصلہ بہت ڈرتے ڈرتے کیا تھا، ایسے ڈرتے ڈرتے کہ حضرت عمرو بن حزم نے نصیحت کرتے ہوئے جب ان کو خدا و آخرت کی باز پرس یاد دلائی تو روایت کے الفاظ ہیں کہ ''کانپ گئے، سانس پھولنے لگی، سرد موسم میں پسینہ چھوٹ گیا''۔ مگر پھر بھی رائے نہ بدل سکی۔ اِس لیے اُسی پر عمل کیا۔ جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا ہے کہ یہ روایت سنداً محدثین کے معیار کی ہے [۲]۔ یہ روایت بتاتی ہے کہ حضرت معاویہؓ کو کیسا احساس ذمہ داری تھا اور یہ فیصلہ

---

[۱] مگر روایت محدثین کے اصول کے لحاظ سے خاص طاقت ور نہیں ہے۔ اس کے راوی ابوبکر بن ابی مریم بڑے نیک بزرگ اور محدث تھے، مگر حافظے کی کمزوری کی وجہ سے ضعیف قرار دیے گئے ہیں۔

[۲] مسند ابو یعلیٰ: ۷۴۷۱، ہیثمی نے اس کے راویوں کو صحیح کے راوی قرار دیا ہے، مجمع الزوائد: ۲۴۹/۷، حافظ ابن حجر نے بھی اس کے رجال کی توثیق کی ہے الاصابۃ، تذکرۂ عمرو بن حزم۔

ان کے لیے کوئی آسان فیصلہ نہیں تھا۔انہوں نے بڑی مشکل سے،سوچ سمجھ کر،امت کی مصلحت میں یہ فیصلہ کیا تھا۔مگر کمال خشیت کہ پھر بھی روتے اور کانپتے تھے۔

(۳) اپنے سیاسی اور حکومتی فیصلوں ہی کے بارے میں انہوں نے بڑے دردمند لہجے میں حضرت مسور بن مخرمہؓ سے کہا تھا کہ ذمہ داری بہت بڑی ہے اور مسائل بہت مشکل،اس لیے مجھ سے غلطیاں ہوسکتی ہیں،مگر پھر کہا:

وَمَعَ ذٰلِكَ مَا كُنْتُ لِأُخَيَّرَ بَيْنَ اللّٰهِ وَغَيْرِهٖ إِلَّا اخْتَرْتُ اللّٰهَ عَلٰى مَا سِوَاهُ[1]۔

اس کے باوجود اتنا کہتا ہوں کہ جب بھی اللہ اور غیر میں کسی ایک کے انتخاب کا موقع یا امتحان آتا ہے، میں غیر کا نہیں،اللہ کی رضا کا ہی انتخاب کرتا ہوں''۔

ان روایات کے بعد حضرت معاویہؓ کی نیت اور جذبے میں شبہے کی واقعی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔رہی رائے کی غلطی،اس کا پورا امکان ہے۔

ابن کثیر اور ابن خلدون کی رائے:

ابن کثیر کہتے ہیں کہ حضرت معاویہؓ یزید کو سیاسی وفوجی قیادت کے اوصاف میں دوسروں سے فائق جانتے تھے،اور یہ اس فیصلے کا ایک سبب تھا،مگر ساتھ ہی ان کے نزدیک اس فیصلے میں حضرت معاویہؓ کی محبت پدری کو بھی دخل تھا۔جب کہ ابن خلدون اس دور کے حالات،سیاسی اور قبائلی توازن کی صورت حال،خاص طور پر شامی افواج کی بنوامیہ سے وابستگی جیسے پہلوؤں کو ملحوظ رکھتے ہوئے،اس کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ یزید کے علاوہ سیاسی اثر ورسوخ رکھنے والی شخصیات میں سے اگر کسی کو خلیفہ بنایا جاتا تو اتحاد باقی رہنا مشکل ہوتا۔ان کا خیال ہے کہ:

ملت کے اتحاد اور اس کی اجتماعیت کے بقاء کے نقطۂ نظر سے اس کے سوا کوئی دوسرا فیصلہ ممکن نہیں تھا۔کیوں کہ اس دور میں دینی ضمیر اصل اجتماعی محرک کے مقام پر نہیں رہا تھا۔بلکہ قبائلی عصبیت نے پھر سے اصل اجتماعی طاقت کا مقام حاصل کر لیا تھا۔اور حالات کے اس نقشے میں بنی امیہ کی عصبیت سب سے بڑی عصبی طاقت تھی۔اور یزید بنی امیہ کا وہ فرد تھا جس کے بارے میں سب سے زیادہ اعتماد کیا جاسکتا تھا کہ یہ عصبی طاقت اس کی حامی ہوکر ادارۂ خلافت کی پشتی بان ثابت ہوگی۔

اس کے علاوہ تجزیہ نگار مورخین نے یہ بھی لکھا ہے کہ یزید کا ننھیال قبیلہ بنی کلب میں تھا۔جو شام میں ایک بڑا وسیع اور طاقت ور قبیلہ تھا۔وادی سرحان اور جنوب شام کے میدانی علاقوں میں اس کی شاخوں کی بڑی آبادیاں تھیں۔جن سے شام میں اسلامی حکومت کو استحکام ملتا تھا۔عربوں میں ننھیالی رشتہ اور سسرالی رشتہ ایک طرح کا مدد

---

[1] مصنف عبدالرزاق: ۲۰۷۱۷ بسند صحیح۔حافظ ابن عبدالبر کہتے ہیں یہ امام زہری سے مروی سب سے صحیح روایات میں سے ہے،الاستیعاب ترجمۂ معاویہؓ۔نیز طبقات ابن سعد قسم متمم الصحابہ،طبقۂ رابعہ: ۱۲۳ بسند صحیح۔

وحمایت کا رشتہ ہوتا تھا۔اس لیے حضرت معاویہؓ کی افواج میں ان قبائل کی بڑی تعداد تھی (معاویہ: ۲۲۵،۲۵۶)۔

ایک واضح اور اہم نظیر:

حاکم کے انتخاب میں اِس قلبی وابستگی وجذبۂ حمایت کا (جسے ابن خلدون ''عصبیت'' کا نام دیتے ہیں) کردار کیسا ہوتا ہے، نیز اتفاق اور حکومت کے استحکام وقوت کے لیے اس پہلو کو ملحوظ رکھنا کتنا ضروری ہوتا ہے، اِس کی ہم کو اُسی دور میں ایک عملی مثال ملتی ہے۔سیدنا علیؓ کی شہادت کے بعد امت میں حضرت حسنؓ سے بہت افضل شخصیتیں موجود تھیں۔حضرت سعد بن ابی وقاصؓ موجود تھے، جو عشرۂ مبشرہ میں سے تھے۔اُس وقت مقام ومرتبے میں ان کا ہم سر کوئی نہیں تھا۔حکومت وامارت کی اہلیت بھی ممتاز درجے میں رکھتے تھے۔خلافت راشدہ کے اہم جرنیلوں اور گورنروں میں سے تھے۔حضرت عبداللہ بن عمرؓ موجود تھے اور حضرت علیؓ کے چچازاد عبداللہ بن عباسؓ بھی۔اس کے باوجود حضرت علیؓ کے ساتھیوں نے حضرت حسنؓ کے ہاتھ پر بیعت کی حالاں کہ ان سے بلند مرتبہ اور زیادہ سیاسی صلاحیتوں کے حامل صحابہ موجود تھے۔مگر سب نے یہی سمجھا کہ یہ صورت حال کا بالکل فطری تقاضہ تھا اور حضرت علیؓ کے ارکان حکومت اور افواج میں ان سے زیادہ کسی پر اتفاق نہیں ہوسکتا تھا۔

ابن خلدون کے کلام پر ناقدانہ نظر:

اجتماع وعمران کے معاملے میں ابن خلدون کے تجزیوں اور فیصلوں کی جو اہمیت حاصل ہے اس سے انکار کسی کے لیے ممکن نہیں۔اس لیے ان کا یہ تجزیہ، کسی خوش عقیدگی کی بنا پر نہیں، بلکہ سنجیدگی کی بنا، پر لائق اعتنا ہونا چاہیے۔(یعنی یہ) کہ یزید کی ولی عہدی کے پیچھے کوئی اور چیز نہیں بلکہ صرف اجتماعی مصلحت کا شعور کام کر رہا تھا کہ اس انتخاب کے ذریعہ خلافت کا ادارہ ٹوٹ پھوٹ سے بچ جائے گا۔اس تجزیے کی روشنی میں ہمیں پورے اطمینان کے ساتھ یہ سمجھنا چاہئے کہ حضرت معاویہؓ کو جو اپنی تجویز پر اصرار تھا، اس کی اصل وجہ (ان کی رائے اور اندازے میں) ملت کی مصلحت ہی تھی ـــــــ لیکن یہ سمجھنا کہ یہ مصلحت اندیشی ایسی تھی کہ اس میں کوئی کلام نہیں کیا جاسکتا تھا، یہ ماننا بہت مشکل ہے۔......کیوں کہ ان چار آدمیوں کا اختلاف ہوتے ہوئے، خصوصا حضرت حسینؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی مخالفت کے ساتھ، یہ بات ماننا مشکل ہے کہ یزید کی ولی عہدی کے ذریعے ملت کو شقاق وانتشار سے بچانے کا اطمینان کیا جاسکتا تھا۔

اس لیے ابن خلدون کا نقطۂ نظر (کہ حضرت معاویہؓ نے جو ولی عہدی کا فیصلہ کیا، وہی واقعۃً قرینِ مصلحت اور صحیح تھا) حقیقت سے کچھ زائد معلوم ہوتا ہے۔ظاہر بات ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ جیسی شخصیت کا اختلاف بے وجہ نہیں ہوسکتا، نہ ہم ان کی رائے کو وزن دیے بغیر رہ سکتے ہیں۔ہمارے لیے کچھ بھی فیصلہ یا رائے

قائم کرنا مشکل ہے، خصوصاً صدیوں بعد، جب ہمارے سامنے حالات نہیں، صرف روایات ہیں۔

انتخابِ خلیفہ کے لیے کسی دستوری طریقہ کی ضرورت؟

قرآن وسنت میں خلیفۂ اسلام کے تقرر کے لیے کسی متعین طریقے کی تعیین نہیں کی گئی، بس اتنا امر طے تھا کہ اہل حل وعقد کے مشورے سے امور حکومت طے کئے جائیں اور اسی لچک اور گنجائش کو خلافت راشدہ کے دور میں باقی رکھا گیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کو اپنے بعد کے لیے نامزد کر دیا تھا۔ جس کی وجہ سے بلا کسی انتشار بلکہ بلا کسی ذہنی تذبذب کے وہی خلیفہ قرار پائے۔ پھر حضرت عمرؓ نے اپنے بعد کے لیے ایک چھ رکنی کمیٹی بنا دی کہ آپس ہی میں سے کسی کو منتخب کر لیں۔ اس کمیٹی نے حضرت عثمان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ غرض اس سے یہ واضح ہو گیا کہ اسلامی قانون کسی خاص طریقہ کو متعین نہیں کرتا۔ تمدن کے ارتقا اور نظم حکومت کے تقاضوں کے تحت جو بھی طریقہ اختیار کر لیا جائے وہ صحیح ہے۔

اسلام کی قانونی وسعت کے لیے ضرورت تھی کہ خلافت راشدہ کے دور میں بھی خلیفہ کے تقرر کا کوئی منضبط و متعین قاعدہ وطریقہ طے نہ ہو، اس لیے کہ خلافت راشدہ کے اجتماعی فیصلے اسلامی قانون کا ماخذ تھے اگر وہ کوئی متعین طریقہ طے کر دیتے تو ہمیشہ کے لئے امت اسی طریقے کی پابندی کرتی۔ زمانے، حالات، تمدن اور اجتماعی زندگی کے مزاج کی تبدیلیوں کے ساتھ کسی ایک طریقے کی پابندی مشکل اور مسائل کا باعث ہوتی ——— لیکن یہی دستوری طریق کا نہ طے پاسکنا ساری پیچیدگی کا سبب بنا۔ اگر نصب خلیفہ کے لیے کسی خاص طریق پر شوریٰ کے انتخاب اور اس کے فیصلہ کا طریق اہل حل وعقد اور علماء واساطین امت کے ذریعہ طے پا جاتا اور نظام حکومت کو اس کا پابند بنا دیا جاتا، تو ان تمام خطرات کا بھی سدِّ باب ہو سکتا تھا جن کا خدشہ (ولی عہد نہ بنانے کی صورت میں) حضرت معاویہؓ کو تھا اور ان خطرات کا بھی جو دیگر اختلاف کرنے والوں کو (ولی عہدی کی صورت میں) نظر آتے تھے۔ ولکن لیقضی اللہ أمرا کان مفعولاً۔

ولی عہدی سے اختلاف یزید کی شخصیت کی وجہ سے نہیں:

مگر یہ جو مشہور ہے کہ یہ لوگ یزید کو ولی عہد بنانے کے مخالف اس لیے تھے کہ وہ فاسق وفاجر، شرابی وبدقماش تھا، یہ سراسر افسانہ ہے۔ یزید کے بارے میں اس دور کے لحاظ سے کسی معیاری دین داری کا ثبوت ہمیں نہیں ملتا، مگر وہ کوئی علانیہ فاسق وفاجر شخص تھا، بے بنیاد بات ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ حضرت معاویہؓ کی شخصیت پر ایسے بے اصل اتہام کی حقیقت واضح کریں۔ تاریخ وتراجم اور محدثین کی روایات میں یزید کی ولی عہدی اور مخالفین کے اختلاف کی بہت سی مختصر وطویل روایات موجود ہیں۔ مگر کسی ایک کمزور سی روایت میں بھی یہ اشارہ نہیں کہ جن

معاصرین نے اس کی ولی عہدی کی مخالفت کی انہوں نے کہیں اپنی مخالفت کا سبب یہ بتایا ہو کہ یزید بداطوار شخص ہے۔ اوراس کے فسق وفجور کی بناپر وہ اس کی ولی عہدی کے مخالف ہیں۔ مورخین کے یہاں کیسی کیسی نا قابل یقین شیعی من گھڑت داستانیں آ گئی ہیں، مگر ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ یہ چار صحابہ ولی عہدی کے جو مخالف تھے، اس کے پیچھے یزید کے فسق وفجور کی خبروں کا کچھ دخل تھا۔ صحیح بخاری اور دوسرے مآخذ کی صحیح روایات حضرت عبدالرحمان بن ابی بکر کا اعتراض ان ہی کی زبانی ہم کو سناتی ہیں کہ ''باپ کے بعد بیٹے کی ولی عہدی، بادشاہانہ نظام اور ہرقلیت وکسرویت کا طرز ہے''۔ انہوں نے مروان سے صاف کہا کہ ''یہ جو تم نظیر پیش کرتے ہو کہ حضرت ابوبکرؓ نے بھی اپنے بعد کے لیے حضرت عمرؓ کو نامزد کیا تھا، تو سنو! عمر ابوبکر کے نہ بیٹے تھے نہ خاندانی۔ معاویہ اپنے بعد اپنے بیٹے کو خلیفہ بنا رہے ہیں''۔ اسی طرح کا موقف تاریخ خلیفہ کی روایت میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی زبانی بھی نقل کیا گیا ہے (تاریخ خلیفہ: ۲۱۳) لہٰذا ماننا چاہیے کہ سبب اختلاف یہی تھا، نہ کہ کوئی علانیہ فسق وفجور یا اخلاقی خرابی۔ بلکہ یہی روایات صاف اشارہ کرتی ہیں کہ ان حضرات کی نظر میں یزید میں کوئی ایسا فسق وفجور نہیں تھا کہ وہ اس بنا پر ان کے لئے نا قابل قبول ہوتا۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ یہ اعتراض بھی ضرور بالضرور کرتے کہ یزید تو بڑا فاسق و بداطوار شخص ہے۔ لیکن انہوں نے بس یہی اعتراض کیا کہ اس طرح تو اسلام میں موروثی بادشاہت جاری ہو جائے گی۔ اور پھر یہ اندیشہ صحیح ثابت ہوا اور وہی ہوا جو ان حضرات نے کہا تھا۔

بلکہ حضرت معاویہؓ کی زندگی ہی میں نہیں، یزید کے بادشاہ بننے کے بعد بھی جب حضرت حسینؓ نے یزید کے خلاف عملی اقدام فرمایا تو بھی کہیں نہیں ملتا کہ ان کے مسلح اقدام میں کوئی دخل یزید کے فسق وفجور کو ہے۔

بلکہ مورخ مدائنی نے اپنی حسن درجے کی سند سے روایت کیا ہے کہ سن ۶۰ میں جب مدینے میں یزید کے خلاف شورش ہوئی اور لوگوں نے مدینے کے بڑے عالم اور دینی شخصیت، سیدنا علیؓ کے صاحب زادے، حضرت محمد بن الحنفیہؒ کا ساتھ لینا چاہا اور اس کے لیے بتایا کہ یزید شراب پیتا ہے، نماز چھوڑتا ہے۔ تو حضرت محمد بن الحنفیہؒ نے کہا: تم جھوٹ کہتے ہو۔ میں اس کے پاس رہا ہوں میں نے ایسا کچھ نہیں پایا۔ میں نے تو پایا کہ وہ نماز کا پابند ہے، سنت کا ہمیشہ اہتمام کرتا ہے اور دینی علم کی باتیں پوچھتا رہتا ہے۔ ان لوگوں نے ہزار چاہا کہ حضرت محمدؒ ان کا ساتھ دے دیں مگر وہ کسی طرح تیار نہیں ہوئے (البدایہ والنہایہ: ۸/ ۲۵۵، تاریخ الاسلام: ۵/ ۲۷۴)۔

فصل دوم

آخری ایام بیماری، وصیتیں اور وفات

اب حضرت معاویہؓ پر ضعف و پیری کے آثار ظاہر ہونے لگے تھے۔ عمر کے آخری سالوں میں سفر کے دوران مکہ و مدینہ کے درمیان ابواء نامی مقام پر لقوہ کا حملہ ہوا۔ اس وقت آپ کی عمر ۷۷ کے لگ بھگ (**بضعا وسبعين سنة**) تھی۔ کچھ افاقہ ہوا تو فرمایا:

> مومن کے لیے ہر حال میں خیر ہے۔ اگر تکلیف ہوتی ہے تو اجر و ثواب سے نوازا جاتا ہے، اور اگر عافیت کا سایہ کیا جاتا ہے، شکر بجالاتا ہے۔ اور اگر گناہوں کی سزا کے طور پر تکلیف دی جاتی ہے تو گناہ معاف ہوتے ہیں (اور مجھے ڈر ہے کہ یہ بیماری میرے گناہوں کی سزا نہ ہو)۔ جسم کے ایک حصے میں اگر مرض ہے تو اللہ کا شکر ہے کہ بہت سے اعضا سلامت ہیں۔ اللہ کا جو بندہ میرے لیے عافیت کی دعا کرے اللہ اس پر رحم فرمائے (تاریخ دمشق: ۵۹/ ۲۱۵، انساب الاشراف: ۵/ ۲۸)۔

آخری خطبہ اور مرض الموت:

مرض وفات میں ایک زخم پیدا ہو گیا تھا، جو تکلیف دہ تھا۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کے صاحب زادے ابو بردہ (جو خود بڑے عالم تھے) عیادت کے لیے تشریف لائے۔ ان سے کہا: ذرا اس کو دیکھو۔ انہوں نے دیکھ کر کہا: کوئی بات نہیں ٹھیک ہو جائے گا۔ مگر حضرت معاویہؓ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ مرض وفات ہے۔ یزید کو بلایا اور وصیت کی کہ ان (یعنی ابو بردہ) کا خیال رکھنا۔ ان کے والد میرے دوست تھے۔ ہاں جنگ کے سلسلے میں میری اور ان کی رائے ایک نہیں تھی۔ (اشارہ تھا اس طرف کہ حضرت ابو موسیٰ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان اختلاف و جنگ میں غیر جانب دار رہے تھے)[۱]۔

جامع مسجد میں اپنے آخری خطبے میں لوگوں کو الوداع کہتے ہوئے فرمایا: میں تو اس سوکھ چکی کھیتی کی طرح

---

۱ تاریخ طبری: ۵/ ۳۳۲، بسند صحیح، طبقات ابن سعد: ۴/ ۸۴، بسند صحیح۔

ہوں، کہ بس اب کٹنے کا وقت آ گیا ہے۔ لمبی مدت تک میں تمہارا حاکم رہا۔ اب میں تم سے اکتا چکا اور تم مجھ سے اکتا گئے۔ میرے بعد مجھ سے بہتر نہیں آئے گا، جیسے کہ مجھ سے پہلے کے خلفاء مجھ سے بہتر تھے۔ (حدیث نبوی میں) کہا گیا ہے کہ جو اللہ سے ملنے کا مشتاق ہو، اللہ بھی اس سے ملاقات کا خواہش مند ہوتا ہے۔ اللهم إني قد أحببت لقاءك فأحب لقائي (اے اللہ! میں آپ کی ملاقات کا مشتاق ہوں، آپ بھی میری ملاقات کو پسند فرمایئے)۔ یہ آپ کا آخری خطبہ تھا[۱]۔

پھر مرض بڑھتا گیا۔ کبھی سردی لگتی تھی، مگر لحاف برداشت نہ ہوتا تھا۔ بار بار اڑھایا جاتا اور ہٹایا جاتا۔ اسی پریشانی کے عالم میں حسرت کے ساتھ دنیا کی بے ثباتی بیان فرماتے ہوئے کہا: اے دنیا! تو کیسا برا گھر ہے۔ میں بیس سال گورنر رہا، اور بیس سال خلیفہ، مگر اب کیا بے کلی حال اور بے بسی کا عالم ہے!![۲]۔ پھر بڑی حسرت سے فرمایا: کاش میں قریش کا ایک گمنام آدمی ہوتا اور حکومت کی ذمہ داری نہ اٹھائی ہوتی (معرفۃ الصحابۃ: ۵/۲۴۹۷)۔

نصف مال بیت المال میں جمع کیا جائے:

ابن سعد اور طبری نے مورخ مدائنی کی سند سے روایت نقل کی ہے کہ بالکل آخری وقت میں، اس احتیاط کی وجہ سے کہ ان کے ذمے کچھ مالی حقوق نہ رہ جائیں، وصیت کی کہ میری جائیداد اور مال میں سے نصف بیت المال میں جمع کر دیا جائے۔ یہ بھی حضرت عمرؓ کے نمونے پر عمل تھا[۳]۔

یزید کو وصیت و ہدایت:

آخری وقت ولی عہد یزید موجود نہیں تھا، لہٰذا حضرت ضحاک بن قیس فہریؓ کو (جو پولیس افسر اور دمشق میں نائب الامور تھے) اور مسلم بن عقبہ کو بلایا، اور ان کو یزید کو پہنچا دینے کے لیے وصیت کی کہ:

> اہل حجاز کا خیال رکھو جو تمہاری اصل ہیں۔ ان میں سے جو کوئی تمہارے پاس آوے اس کا اکرام کرو اور جو نہیں آتا ہو، اس کی خبر رکھو۔ اور عراق والوں کا بھی خیال رہے کہ وہ اگر تم سے روز ایک عامل (حاکم) معزول کرنے کا مطالبہ کریں تو ان کا مطالبہ پورا کر دو، اس لیے کہ ایک عامل کی معزولی اس سے کہیں بہتر ہے کہ ایک لاکھ تلواریں تمہارے خلاف حرکت میں آئیں۔ اور اہل شام کا بھی خیال رہے کہ انہیں کو تمہارے قریبی خواص کا مرتبہ ملنا چاہیے۔ کبھی دشمن کی طرف سے کوئی چیلنج آئے تو ان کی مدد حاصل کرو۔ اور جب مہم تمام ہو جائے تو انہیں ان کے ملک واپس کر دو۔ اگر وہ غیر ملک میں زیادہ ٹھہرے تو وہاں کی خصلتیں اختیار کر لیں گے۔

۱۔ تاریخ دمشق: ۵۹/۲۱۶، الطبقات الکبریٰ، متمم الصحابۃ، الطبقۃ الرابعۃ: ۱۴۱۔
۲۔ المحتضرین ابن ابی الدنیا: ۶۵، بسند لا باس بہ، الطبقات الکبریٰ متمم الصحابۃ الطبقۃ الرابعۃ: ۱۴۲۔
۳۔ طبری: ۵/۳۲۷، الطبقات الکبریٰ، متمم الصحابہ، الطبقۃ الرابعۃ: ۱۴۹۔

اس کے بعد کہا کہ تین لوگوں سے خطرہ ہے کہ وہ تمہاری خلافت تسلیم نہ کریں گے۔ حسین بن علی، عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیر۔ عبداللہ بن عمر تو بڑے نیک صالح آدمی ہیں، مجھے یقین ہے کہ وہ مقابلہ آرائی نہیں کریں گے۔ حضرت حسینؓ کے بارے میں فرمایا کہ وہ ذرا ہلکے آدمی ہیں۔۔۔۔۔اور یہ یاد رکھنا کہ ان کا بہت قریبی رشتہ ہے، بہت بڑا حق ہے۔ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اہل عراق انہیں میدان میں لائے بغیر چھوڑ دیں گے۔ اگر ایسا ہوا اور تم ان پر قدرت پاؤ تو درگزر کرنا۔ کیونکہ اگر میرے اور ان کے درمیان ایسی صورت پیش آتی تو میں درگزر ہی کرتا۔ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے سلسلے میں فرمایا: وہ زبردست داؤں باز ہے، وہ خروج کرے تو جم کے مقابلہ کرنا، ہاں اگر صلح چاہے تو ضرور صلح کر لینا اور اپنی قوم (قریش) کا خون جہاں تک تم سے ہو سکے، بہنے سے بچانا (تاریخ طبری: ۵/ ۳۲۳)۔

(ملکی معاملات کے سلسلے میں) سب سے آخری کلمات جو بطور وصیت ارشاد فرمائے، یہ تھے کہ ''شدوا خناق الروم، فانکم تضبطون بذلك غيرهم من الامم'' رومیوں کا قافیہ تنگ کیے رہنا، اس طرح دوسری قومیں بھی حد میں رہیں گی (تاریخ خلیفہ: ۲۳۰)۔

تبرکاتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تدفین کی وصیت:

ابن سعد اور بلاذری نے حسن درجے کی سند سے روایت کیا ہے کہ آخری مرض میں آپ نے بتایا کہ ایک دن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وضو کرا رہا تھا کہ آپ نے مجھ سے کہا کہ میں تم کو اپنی قمیص دے دوں؟ میں نے عرض کیا: میرے ماں باپ آپ پر قربان، مرحمت فرما دیجیے۔ آپ نے مجھے اپنی قمیص پہنا دی [۱]۔ ایک دن آپ نے ناخون کاٹے تو میں نے وہ بھی لے لیے اور ایک شیشی میں کر کے محفوظ کر لیے۔ سو جب میں مر جاؤں تو کفن میں سب سے اندر مجھے وہی کرتا پہنا دینا۔ اور ان مبارک ناخونوں کو باریک کاٹ کر میری آنکھ اور منہ ناک میں رکھ دینا۔ ان کی برکت سے ان شاء اللہ رحمت کا معاملہ ہوگا [۲]۔ بعض روایات میں اضافہ ہے کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بال تراشے تھے، وہ بھی میرے پاس محفوظ ہیں وہ میرے ناک اور منہ میں رکھ دینا (المحتضرین: ۶۸)۔

ابن کثیرؒ کہتے ہیں کہ مختلف اسانید سے وارد ہے کہ حضرت معاویہؓ نے رسول اللہ کا ایک کرتا اسی نیت سے اٹھا رکھا تھا کہ اس کو اپنا کفن بنائیں گے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بال اور ناخون کے تراشے بھی محفوظ کیے تھے کہ دفن

۱۔ راقم سطور کے ذہن میں ایک نکتہ آ رہا ہے، شاید اہل علم نے لکھا ہو۔ حضرت عثمانؓ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ''اللہ تم کو ایک قمیص پہنائے گا''۔ حضرت عثمان اور حضرت عائشہؓ دونوں نے اس سے یہی سمجھا تھا کہ اللہ تعالیٰ حضرت عثمان کو قبائے خلافت پہنائے گا، مجھے گمان ہوتا ہے کہ شاید حضرت معاویہؓ کو قمیص پہنانا بھی خلافت وامارت کا اشارہ تھا۔

۲۔ انساب: ۵/ ۱۵۳، الطبقات، متمم الصحابۃ: ۱۴۶، بسند حسن۔

کے وقت کان، ناک، منہ اور آنکھوں میں رکھ دیے جائیں، سوایسی ہی وصیت کی (البدایہ والنہایہ: ۸/ ۱۵۲)۔

آخری وصیت، وفات اور نماز جنازہ:

پھر غشی ہوگئی۔ افاقہ ہوا تو جو اعزہ پاس تھے ان کو آخری وصیت کی کہ ''تقویٰ اختیار کرو، اللہ تعالیٰ تقوے والوں کی حفاظت کرتا ہے۔ اور جو تقوی نہ اختیار کرے اس کا کوئی محافظ و پاسبان نہیں۔ پھر جان جان آفریں کے سپرد کردی (طبری: ۵/ ۳۲۷)۔ یہ رجب کا مہینہ اور ساٹھ ہجری کا سال تھا۔ یوم وفات کی تاریخ کے سلسلے میں کئی قول ہیں، زیادہ مشہور ۲۲ ہے (البدایہ النہایۃ: ۸/ ۱۵۲)۔ وفات کے وقت عمر ۷۸ سال تھی، ایک قول یہ بھی ہے کہ ۸۰ سے متجاوز تھی۔ ابن حجر کہتے ہیں کہ آپ کی ولادت کے سلسلے میں ایک قول سات سال قبل بعثت اور ایک ۱۳ سال قبل بعثت کا ہے۔ مگر زیادہ مشہور یہی ہے کہ آپ کی ولادت بعثت نبوی سے پانچ سال قبل ہوئی ہے (الاصابۃ: ۶/ ۱۲۰)۔ اس لحاظ سے عمر ۷۸ بنتی ہے۔

جنازہ تیار ہوا تو حضرت ضحاک بن قیسؓ کفن ہاتھ میں لیے جامع مسجد تشریف لائے اور حمد وصلاۃ کے بعد ارشاد فرمایا: معاویہ قومِ عرب کے بزرگ تھے۔ اللہ نے ان کے ذریعے فتنہ واختلاف ختم فرمایا، حاکم بنایا اور فتوحات مقدر فرمائیں۔ ان کی وفات ہوگئی ہے۔ یہ ان کا کفن ہے جو پہنایا جائے گا اور ان کو قبر کے حوالے کر دیا جائے گا۔ پھر وہ ہوں گے اور ان کا عمل۔ قیامت تک یہی برزخی زندگی ہوگی۔ نماز جنازہ میں جو لوگ شرکت کرنا چاہیں وہ ظہر میں آجائیں۔ برید کے ہاتھ یزید کو بھی خبر بھجوادی گئی۔ حضرت ضحاک نے ہی نماز جنازہ پڑھائی، طبری نے کل مدت خلافت شمار کرکے ۱۹ سال ۳ ماہ اور ۲۷ دن بتائی ہے (۵/ ۳۲۴، ۳۲۸)۔ تدفین الباب الصغیر کے پاس عوامی قبرستان میں ہوئی (البدایہ والنہایہ: ۸/ ۱۵۲)۔

فصل سوم:

خصوصیات وکمالات، جسمانی حلیہ، معمولات اور ازواج واولاد

ا۔ حلم وعفو:

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے حضرت معاویہ کو حلم وعفو اور درگزر وبرداشت کے اعلیٰ اخلاق واوصاف بڑی فیاضی سے مرحمت فرمائے تھے۔ غصہ پر بلا کا قابو تھا۔ کوئی کیسا ہی مخالف کیوں نہ ہو حضرت معاویہ کے یہاں اس کے لیے ہمیشہ نرم گوشہ تھا۔ کیسی ہی کوئی سخت کلامی کرے، مگر مجال تھی جو سخت جواب ملے۔ سوانح نگاروں اور مورخین نے جہاں بھی ان کی شخصیت پر کچھ لکھا ہے ان کی غیر معمولی کشادہ ظرفی، نرم خوئی اور حلم کا تذکرہ ضرور کیا ہے۔ ذہبی لکھتے ہیں کہ حضرت معاویہؓ کا حلم تو ضرب المثل ہے۔ ابن ابی الدنیا اور ابوبکر ابن ابی عاصم نے حضرت معاویہؓ کے حلم وبرداشت کے واقعات اور شہادتوں پر مستقل کتابیں لکھی ہیں (تاریخ الاسلام: ۴/ ۳۱۵)۔

مخالف محاذ کے لوگ بھی ان کے حلم اور وسیع القلبی کے مداح ہوئے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔ حضرت قبیصہ بن جابرؒ حضرت علیؓ کے سپہ سالاروں اور کوفے کے ذمے دار لوگوں میں تھے۔ معتبر اسانید سے وارد ہوا ہے کہ انہوں نے گنایا کہ وہ حضرت عمرؓ، حضرت طلحہ بن عبید اللہؓ، حضرت عمرو بن العاص، حضرت معاویہؓ اور حضرت مغیرہ بن شعبہ جیسے امراءِ مملکت کی صحبت میں رہے۔ قبیصہ ان سب شخصیات کی خصوصیات واوصاف گناتے جاتے تھے۔ آخر میں کہا کہ میں معاویہ کے ساتھ بھی رہا، میں نے حلم وبردباری اور کریم النفسی میں ان کی مثال نہیں دیکھی [۱]۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ایک دن فرمایا: معاویہ نہایت حلیم الطبع شخص ہیں، کسی نے کہا حضرت ابوبکر کے حلم کے بارے میں کیا خیال ہے؟ فرمایا: ابوبکر معاویہ سے افضل وبہتر ہیں، مگر حلم میں معاویہ بڑھے ہوئے ہیں (تاریخ دمشق: ۵۹/ ۱۷۷)۔

---

[۱] التاریخ الکبیر للبخاری: ۷/ ۱۷۵، بسند حسن۔ المعرفة والتاریخ: ۱/ ۴۵۸۔

صحابہ کہتے تھے کہ رعایا کے ساتھ حضرت معاویہؓ کا معاملہ بڑی چشم پوشی ودرگزر کا تھا۔حضرت ابوالدرداءؓ شام میں دینی اموراور تعلیم کے لیے حضرت عمرؓ کی طرف سے بھیجے گئے تھے۔انہوں نے حضرت معاویہؓ کا طرز عمل اورحلم وعفو کی صفت کا مشاہدہ کیا۔کہتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے معاویہ کوایک نصیحت کی تھی۔میں سن رہا تھا،آپ ﷺ نے ان سے کہا تھا’’اگر تم لوگوں کی پوشیدہ باتوں کے تجسس میں پڑو گے توان کو بگاڑ دو گے‘‘۔ حضرت ابوالدرداء فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی اس نصیحت کا معاویہ پر بہت اثر پڑااوران کواس سے نفع پہنچا۔(سنن ابی داوود:۴۸۸۸،بسند صحیح)۔یعنی ان کا معاملہ عوام کے ساتھ بہت چشم پوشی ومدارات کا تھا۔خود کہا کرتے تھے کہ میرے لیے یہ بات عار کی ہے کہ کوئی جرم یا غلطی میرے حلم سے بڑی ثابت ہو۔(تاریخ دمشق: ۱۷۹/۵۹)۔طرز حکومت اور پالیسی کے سلسلے میں پیچھے گزر چکا ہے کہ انہوں نے یہ طے کیا ہوا تھا کہ اگر حکومت کے لیے کوئی مسئلہ نہ بنے تو تنقیداور برا بھلا کہنے پر کسی کو کچھ نہیں کہنا ہے۔(طبری:۳۳۶/۵)۔

مخالفین کے ساتھ اعلیٰ ظرفی اور حسن سلوک:

اس حلم وبرداشت اور کشادہ ظرفی نے بڑے بڑے ناقدوں کا نقطۂ نظر بدل دیا تھا۔بہت سے لوگ جو کبھی پہلے سخت ناقد تھے،ثناخواں ودعاگو بن گئے تھے۔حضرت مسور بن مخرمہؓ صغار صحابہ میں سے تھے، حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ کے بھانجے تھے۔حضرت عمرؓ سے خصوصی استفادہ کیا تھا(الاصابہ)۔مصنف عبد الرزاق وغیرہ میں نہایت صحیح سندوں سے روایت موجود ہے،جو بتاتی ہے کہ وہ حضرت معاویہ کی حکومت پر برملا خوب تنقیدیں کرتے رہتے تھے۔حضرت معاویہ کوان سب کی خبریں ملتی رہتی تھیں۔مگر داروگیرتو دور،کبھی کوئی باز پرس بھی نہیں کی۔ایک مرتبہ حضرت مسورؓ خود حضرت معاویہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔حضرت معاویہ نے ان کی تنقیدوں اوراعتراضات کا ذکر چھیڑ دیا۔اور کہا بتاؤ،حکومت پر تمہارے کیا اعتراضات ہیں؟ حضرت مسورؓ نے ٹالا اور کہا:اب چھوڑیے بھی۔میں جس کام کے لیے آیا ہوں،ہم اس پر بات کرتے ہیں۔لیکن حضرت معاویہؓ نے کہا:نہیں،اپنے دل کی بات کہو۔حضرت مسورؓ فرماتے ہیں:پھرتو میں نے کوئی اعتراض،جومیرے دل میں تھا، روک کے نہیں رکھا،سب کچھ خوب صاف صاف کہہ دیا۔حضرت معاویہ نے پوری باتیں سن کر بڑی تواضع سے کہا:

> میں غلطیوں سے مبرّ انہیں۔یہ بتاؤ!کیا تم بھی مانتے ہو کہ تم نے بھی کچھ گناہ کیے ہیں،جواگر اللہ تعالیٰ نے معاف نہ کیے تو ہلاک ہوجاؤ گے؟(حضرت مسورؓ فرماتے ہیں:)میں نے کہا:ہاں،ضرور۔ حضرت معاویہ نے کہا:جس طرح تم اپنی غلطیوں کی معافی کی امید رکھتے ہو،میں بھی اپنی غلطیوں کی اللہ سے مغفرت کی امید رکھتا ہوں--------اس کے بعد کہا:پھر(جیسا کہ تم جانتے ہو)مجھ پر عوامی معاملات کی اصلاح،حدود کا قیام،افواج اور جہاد کا انتظام اورحکومت کی دیگر بے شمار گراں بار

ذمہ داریاں ہیں، جو تم پر نہیں ہیں۔ (تو غلطیاں ہو بھی سکتی ہیں)۔ اللہ کی ذات بڑی کریم ہے، حسنات کو قبول اور سیئات سے درگزر کرتی ہے۔ اس کے باوجود اتنا کہتا ہوں کہ جب بھی اللہ اور غیر میں کسی ایک کے انتخاب کا موقع یا امتحان آتا ہے، میں غیر کا نہیں، اللہ کی رضا کا ہی انتخاب کرتا ہوں۔

حضرت مسور فرماتے ہیں: میں نے غور کیا تو خیال ہوا کہ حضرت معاویہ کی بات میری بات کے مقابلے میں صحیح تھی۔ حضرت مسور سے اس قصہ کو ان کے ماموں زاد بھائی حمید بن عبدالرحمان بن عوف اور حضرت عروہ بن زبیر نقل کرتے ہیں، دونوں کہتے ہیں کہ اس کے بعد جب بھی حضرت معاویہؓ کا تذکرہ آتا تو حضرت مسور ان کے لیے دعاءِ خیر ضرور کرتے [1]۔

حضرت معاویہؓ کا یہی وہ مشہور زمانہ حلم اور وسعت ظرفی تھی جس سے مخالف موافق بنتے جاتے تھے اور جس کی اس وقت مسلمانوں کو سب سے زیادہ ضرورت تھی۔

یمن کے اقیال (نوابوں) میں ایک وائل بن حجر جب مدینہ آئے، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی ضیافت اور قیام کا انتظام بھی حضرت معاویہؓ رضی اللہ تعالی کے سپرد کیا۔ قیام مدینہ کے دوران وائل حضرت معاویہؓ کے ساتھ نوابانہ طمطراق سے پیش آئے۔ کہیں جاتے ہوئے میں وائلؓ اپنی اونٹنی پر سوار تھے اور حضرت معاویہ پیدل۔ زمین گرمی سے تپ رہی تھی اور معاویہ ننگے پاؤں، حضرت معاویہ نے ان سے کہا کہ مجھے پیچھے سوار کر لیجئے۔ وائل نے بڑے طنطنے سے کہا۔ تم بادشاہوں کے ساتھ سوار ہونے کے لائق نہیں۔ حضرت معاویہ نے کہا: زمین گرم ہو رہی ہے، مجھے اپنے چپل ہی دے دیجئے۔ وائل نے اس کو بھی اپنی شان کے خلاف سمجھا اور صاف منع کر دیا (مسند احمد: ۲۷۲۳۹، صحیح ابن حبان: ۷۲۰۵، بسند صحیح)۔ حضرت معاویہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس کی شکایت کی۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا وائل نئے نئے اسلام لائے ہیں، ابھی جاہلی کبر و نخوت باقی ہے (طبقات ابن سعد: ۱/ ۲۶۴)۔

حضرت معاویہ کی خلافت کے دور میں وائلؓ ان کے پاس جب حاضر ہوئے تو حضرت معاویہؓ نے ان کا خوب اکرام کیا۔ حضرت وائلؓ نے بھی اپنے اُس رویہ پر معذرت کی اور اعتراف کیا کہ میں نیا نیا اسلام لایا تھا۔ میرے اندر جاہلی نخوت باقی تھی (معجم کبیر: ۲۲/ ۴۶)۔ حضرت معاویہ کی یہی کریم النفسی اور کریمانہ عفو و حلم ان کی امارت و سیادت سے کا سب سے بڑا عنوان تھا۔

اسی سلسلے میں وہ تمام حضرات آتے ہیں جو سیدنا علیؓ کی جماعت کے امراء اور قائدین میں تھے۔ حضرت معاویہؓ کی خلافت کا دور آیا تو انہوں نے ان سب کا بہت اکرام کیا اور ان کے ساتھ ان کے مقام و مرتبے کے

[1] مصنف عبدالرزاق: ۲۰۷۱۷، بسند صحیح۔ حافظ ابن عبدالبر کہتے ہیں یہ امام زہری سے مروی سب سے صحیح روایات میں سے ہے، الاستیعاب ترجمۂ معاویہؓ۔ نیز طبقات بن سعد قسم متمم الصحابہ، طبقۂ رابعہ: ۱۲۳ بسند صحیح۔

مطابق معاملہ فرمایا۔ان میں غالباً حضرات حسنینؓ کا نام سب سے نمایاں اور جلی ہے۔ان حضرات کے عطایا سب سے زیادہ تھے۔وہ تشریف لاتے تو حضرت معاویہ 'مرحبا و اھلا بابن رسول اللہ' کہہ کر استقبال کرتے (تاریخ دمشق: ۵۹/ ۱۹۴)۔

حضرت ابن عباسؓ کی شخصیت سیدنا علی کی جماعت کے اہم قائد کی تھی۔ان کے ساتھ اکرام وعزت افزائی کا تذکرہ گزر چکا۔ان کو اپنی مجلس خاص پر بٹھاتے۔ان سے علمی مذاکرے فرماتے۔امیر المومنینؓ کے دور خلافت میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے ساتھ ان کے حسن تعلق وربط کا تذکرہ تفصیل سے گذر چکا ہے۔

حضرت علی کے حامیوں کے ساتھ سلوک:

ان کے علاوہ بھی حضرت علی کے حامیوں اور ان کے ارکان حکومت کے ساتھ حضرت معاویہؓ کے سلوک ومعاملت میں ہمیں اسی سلامتی قلب اور محبت وحسن اخلاق کا منظر نظر آتا ہے۔حضرت علی کے حامیوں اور ان کے ارکان حکومت میں سے بہت سے حضرت معاویہ کے دور خلافت میں آتے جاتے اور محبت واکرام پاتے نظر آتے ہیں۔قبیصہ ابن جابر ایک بڑے بزرگ عالم اور محترم شخصیت تھے۔نیز حضرت علیؓ کے ایک سپہ سالار بھی تھے۔زمانۂ رسالت کو پایا تھا،لیکن رویت ثابت نہیں ہے۔کبار تابعین میں شمار ہوتے ہیں۔ان کو زیاد نے کچھ کاموں سے حضرت معاویہؓ کی خدمت میں خصوصی قاصد کے طور پر بھیجا۔امام بخاری اپنی تاریخ میں بسند حسن ان سے روایت کرتے ہیں کہ میں حضرت عمرؓ،حضرت طلحہ بن عبید اللہؓ،حضرت عمرو بن العاص،حضرت معاویہؓ اور حضرت مغیرہ بن شعبہ جیسے امراء مملکت کی صحبت میں رہا۔قبیصہ ان سب شخصیات کی خصوصیات واوصاف گناتے جاتے تھے۔پھر فرمایا اور میں معاویہ کے بھی ساتھ رہا:

وصحبت مُعَاوِيَة فما رأيت أحدا أكثر حلما منه ولا أكرم ولا ابعد أناة منه۔

میں معاویہ کے ساتھ بھی رہا،میں نے ان جیسا حلیم الطبع،بردبار اور کریم النفس آدمی نہیں دیکھا[۱]۔

حضرت معاویہؓ جب خلیفہ بنے تو قبیصہ بن جابر سے امور مملکت میں تعاون لیا گیا۔ایک اور مرتبہ وہ اہل کوفہ کے نمائندے کے طور پر صوبائی امور میں مشاورت کے لیے دمشق بھی بھیجے گئے تھے (تاریخ ابو زرعہ: ۵۹۳ بسند حسن)۔

عبداللہ بن الحارث بن نوفل (جو ببّہ کہلاتے تھے) بنی ہاشم کے سردار تھے۔بڑے عالم وفاضل شخص تھے۔حضرت علی کے دور میں کوفہ کے گورنر حضرت عبداللہ بن عباس کے نائب تھے۔صلح کے مذاکرات میں

۱۔ تاریخ کبیر: ۷/ ۱۷۵،۱۷۶،اس کی تائید میں ایک روایت المعرفة والتاریخ للفسوی (۱/ ۴۵۷،۴۵۸) میں بھی مروی ہے جس کی سند میں ہلکا سا ضعف ہے،لیکن اس سے امام بخاری کی روایت کی مزید تائید ہوتی ہے اور وہ صحیح لغیرہ کا درجہ پالیتی ہے۔

حضرت حسن کے نمائندے تھے۔ حضرت معاویہ کی خلافت کا دور شروع ہوا تو مدینہ کا پہلا قاضی انہی کو بنایا گیا۔ اورانہوں نے پہلا فیصلہ حضرت معاویہؓ کے ایک قریبی رشتے دار کے خلاف سنایا[۱]۔

حضرت قیس بن سعد بن عبادہؓ صحابی ابن صحابی تھے۔ حضرت علی کی حکومت کے گورنروں اوران کی جماعت کے اہم قائدین میں تھے۔ معروف ہے کہ سیدنا حسن کے دور میں وہ ایک بہت بڑے لشکر کے کمانڈر تھے اور صلح کے مخالف تھے۔ ایک مرتبہ دمشق تشریف لائے تو حضرت معاویہؓ نے بڑا اکرام فرمایا اوران کی خدمت میں ہدایا پیش کیے (سیر اعلام النبلاء: ۳/ ۱۰۲)۔

بصرے کے ایک نہایت معزز سردار منذر بن جارود عبدی، حضرت علیؓ کی طرف سے اصطخر کے حاکم رہ چکے تھے (تاریخ دمشق: ۶۰/ ۲۸۱)۔ حضرت معاویہ کے دور میں بھی ان کا بصرے کی ریاست میں ایک مقام تھا۔ حضرت معاویہؓ کے پاس تشریف لائے اور عراق کے مسائل پر تبادلۂ خیال کیا۔ اوراپنے علاقے کے بارے میں تجویز رکھی کہ شط العرب سے ایک بڑی نہر کھدوائی جائے۔ حضرت معاویہ نے گورنر زیاد کے نام کے اس کا حکم جاری کیا۔ انہوں نے نہر کھدوائی۔ اوراس میں پانی چھوڑنے کا کام حضرت معقل بن یسارؓ کے دست مبارک سے کروایا گیا۔ اوراس نہر کا نام بھی انہی کے نام پر نہر معقل رکھا گیا (معجم البلدان: ۵/ ۳۲۴)۔

عبداللہ بن الکواء حضرت علی کے قریبی لوگوں میں تھے، صفین کی جنگ میں شریک تھے۔ یہ حضرت معاویہؓ کے پاس اہل کوفہ کے وفد کے ساتھ آئے۔ حضرت معاویہؓ نے ان سے عراق کے عموماً اور خصوصاً بصرے کے حالات پوچھے۔ انہوں نے بتایا کہ انتشار ہے، باغی سر چڑھ رہے ہیں اور گورنر عبداللہ بن عامر بہت نرم آدمی ہیں، کسی سخت منتظم کی ضرورت ہے۔ حضرت معاویہؓ نے مشورہ قبول کیا اور حضرت عبداللہ بن عامر کو سبک دوش کر دیا (طبری: ۵/ ۲۱۳، ۲۱۴)۔

احنف ابن قیس بنو تمیم کے سردار، عراق میں نہایت محترم اور بڑی اہم سیاسی شخصیت تھے۔ حضرت علی کی جماعت کے بڑے لیڈروں اوراہم کمانڈروں میں تھے۔ جنگ صفین میں ان کی فوج کے ایک حصے کے قائد تھے۔ لیکن جب حضرت معاویہ کا دور آتا ہے تو وہ کوفہ کی مجلس شوریٰ میں اہم مقام پاتے ہیں۔ ایک وفد کے ساتھ دمشق جاتے ہیں تو حضرت معاویہؓ ان کا بہت اکرام فرماتے ہیں اوراپنے تخت پر ساتھ بٹھاتے ہیں (سیر اعلام النبلاء: ۴/ ۸۷۔ ۹۵)۔

یہی امیر المومنین کا طرز تھا۔ اس کی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ خود زیاد بھی اس کی ایک مثال ہیں۔ یہ حضرت علیؓ کے ساتھ تھے۔ حضرت معاویہ نے ان کو بصرے اور کوفہ کا گورنر بنایا۔ حضرت سمرہ بن

۱۔ (الطبقات الکبریٰ، قسم متمم الصحابۃ، الطبقۃ الخامسۃ: ۱/ ۱۷۶، ۳۲۲۔ سیر الاعلام: ۳/ ۲۵۹)۔

جندبؓ بصرے میں حضرت علیؓ کے گورنر رہ چکے تھے۔ حضرت معاویہؓ نے ان کو بصرے اور کوفے میں زیاد کا ڈپٹی گورنر بنایا تھا، زیاد کے بعد وہ گورنر بھی رہے۔

ذہانت ونکتہ رسی:

ذہانت وہوشیاری میں بھی وہ ضرب المثل تھے۔ انہوں نے اتنی بڑی مملکت کو جیسے حالات میں سنبھالا، وہ خود ان کی حد درجے ذہانت و بالغ نظری کی دلیل اعظم ہے۔ ذرا یاد کیجیے! کیسا انتشار تھا جب وہ امیر المومنین بنے! مملکت کتنی پراگندہ تھی! شہادت عثمان اور فتنوں نے کیسی مایوسی و بے سمتی کا حال طاری کر رکھا تھا! یہ اسی زیرک ودانا بادشاہ کا ناخن تدبیر تھا، جس نے تمام عقدوں کو کھول کر رشتۂ مملکت مستقیم ومضبوط کیا۔

فاروق اعظم جیسا عبقری بھی ان کی ہوشیاری کی داد دیتا تھا۔ شام تشریف لے گئے تو امیر معاویہ (فوج کے) ایک عظیم الشان جلوس کے ساتھ استقبال کو نکلے حضرت عمر کو شان وشوکت کا یہ اظہار پسند نہیں آیا۔ سوال کیا کہ حکومت کے پاس ضرورت مندوں کی ابھی بڑی جماعت باقی ہے، اور تمہارا یہ طرز؟ انہوں نے عرض کیا: امیر المؤمنین ہم دشمن کے مقابلہ پر ہیں، رومیوں کے جاسوس ہر وقت ہم کو دیکھ رہے ہیں۔ حکومت اگر شان وشکوہ کا مظاہرہ کرے گی تو وہ اس کی خبریں رومیوں کو دیں گے اور ان پر رعب پڑے گا۔ دوسری صورت میں ان کی ہمت بڑھے گی۔ اب آپ اگر اس طرز کو ترک کرنے کا حکم فرمائیں گے تو ہم ضرور آپ کا حکم مانیں گے۔ حضرت عمر نے فرمایا: معاویہ! تم بھی خوب ہو، میں جب بھی کچھ باز پرس کرتا ہوں، تم مجھے ہی حیرت میں ڈال دیتے ہو۔ تم جو کہہ رہے ہو اگر واقعہ ہے تو تمہاری رائے بڑی ہوش مندانہ ہے۔ اور اگر واقعہ کے خلاف ہے تو دھوکہ ہے۔ حضرت معاویہ نے عرض کیا آپ کا جو حکم ہو ہم مانیں گے، ارشاد فرمائیں۔ حضرت عمرؓ نے فیصلہ حضرت معاویہ پر ہی چھوڑ دیا۔ حاضر موقعہ کسی شخص نے کہا کہ آپ نے معاویہ کی ہوشیاری دیکھی؟ حضرت عمر نے فرمایا اسی ذہانت وہوشیاری کی وجہ سے تو ہم نے ان پر اتنی بڑی ذمہ داریاں ڈالی ہیں [۱]۔

خلیفہ کے ساتھ ایک عالم ربانی کی شخصیت:

امیر المؤمنین حضرت معاویہؓ کی شخصیت ایک عالم ربانی کی شخصیت تھی۔ اللہ تعالیٰ کی ہیبت سے لرزاں دل اور خوف سے گریاں چشم۔ فکر آخرت ہمہ وقت طاری رہتی۔ ذات نبوی سے فدویانہ وعاشقانہ محبت تھی۔ نماز نہایت مکمل، پرسکون اور نماز نبوی سے ہم رنگ ومشابہ پڑھتے تھے۔ دل نرم واثر پذیر تھا۔ نصیحت کے جویا رہتے اور چھوٹوں کی بھی تنقیدوں کا استقبال کرتے تھے۔ اتباع سنت میں قدم بہت راسخ تھا اور بادشاہت کے ساتھ

---

۱ حلم معاویۃ لابن ابی الدنیا: ۱۹، البدایۃ والنہایۃ: ۸/ ۱۳۳، تاریخ طبری: ۵/ ۳۳۱، نیز انساب الاشراف: ۵/ ۱۴۷۔

مومنانہ تواضع سے رہتے تھے۔ آ گے ان احوال کی کچھ جھلکیاں دیکھتے چلیے۔

خشیت وخوف الٰہی اور رقت قلبی:

خوف الٰہی اور رقت قلبی کا یہ حال تھا کہ کوئی مؤثر واقعہ یا حدیث سنتے تو اتنا روتے کہ حاضرین کو ترس آنے لگتا۔ حضرت ابو ہریرہؓ ریا کاروں کے دردناک انجام کو بتانے والی ایک حدیث سنایا کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ بندوں کے بارے میں فیصلے فرمائیں گے، تو سب سے پہلے تین لوگوں کو لایا جائے گا۔ پہلا ایک عالم ہوگا جس نے خوب علم پھیلایا ہوگا، دوسرا ایک مجاہد ہوگا، جس نے میدان میں خوب جوہر دکھائے ہوں گے۔ اور تیسرا ایک صاحب خیر فیاض ہوگا، جس نے نیکیوں کے ہر راستے میں خوب مال خرچ کیا ہوگا۔ ہر ایک سے الگ الگ سوال ہوگا کہ دنیا میں کیا کر کے آئے؟ سب جواب دیں گے کہ ساری زندگی ان نیک کاموں میں گذاری ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ جھوٹ بکتے ہو، تمہارا مقصود صرف تعریف اور شہرت تھی۔ تم بس مرتبہ چاہتے تھے، سو دنیا میں یہ چیزیں تم کو مل گئیں۔ پھر یہی ریا کار شہرت کے طالب ہوں گے، جن کو سب سے پہلے جہنم رسید کیا جائے گا۔ .... حضرت عبداللہ بن مبارک صحیح سند سے روایت کرتے ہیں کہ بعض شام کے لوگ حضرت ابو ہریرہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حدیث سنانے کی درخواست کی، انہوں نے ریا کاروں کے رسوا کن انجام کو بتلانے والی یہی حدیث سنانے کا ارادہ کیا، فرمایا: ایک حدیث سناتا ہوں۔ مگر اس حدیث میں آئی وعید سے خوف کا یہ عالم تھا کہ حضرت ابو ہریرہؓ حدیث شروع بھی نہ کر پاتے، کہ خوف ودہشت سے ایک چیخ مارتے اور بے ہوش ہو جاتے، تین مرتبہ ایسا ہی ہوا۔ پھر روتے کانپتے یہ حدیث سنائی۔ شُفَیؒ اصبحی اسی حاضرِ مجلس شامی وفد میں تھے۔ وہ واپس آئے تو حضرت معاویہؓ کو یہ حدیث من وعن سنائی۔ اور حضرت ابو ہریرہؓ کا جو سبق آموز حال دیکھا وہ بھی بتایا۔ درباری اور محافظ موجود تھے۔ حضرت معاویہؓ پر نہایت اثر ہوا۔ آبدیدہ ہو گئے۔ کہا: اللہ اور اس کے رسول کی بات برحق ہے۔ جب ان تین کا یہ انجام ہوگا تو باقیوں کا کیا ہوگا؟ پھر شدید رقت طاری ہوئی۔ اتنا روئے، اتنا روئے کہ حاضرین کو ڈر لگنے لگا کہ کہیں کچھ ناگہانی پیش نہ آجائے۔ پھر کچھ افاقہ ہوا، چہرے سے آنسو پونچھے اور یہ آیت تلاوت فرمائی:

مَنۡ كَانَ يُرِيۡدُ الۡحَيٰوةَ الدُّنۡيَا وَزِيۡنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيۡهِمۡ اَعۡمَالَهُمۡ فِيۡهَا وَهُمۡ فِيۡهَا لَا يُبۡخَسُوۡنَ۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ لَـيۡسَ لَهُمۡ فِى الۡاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ‌ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوۡا فِيۡهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ (ھود:١٦)۔

جس کا مقصد دنیا کی زندگی اور اسی کی چمک دمک ہو تو ہم اس کو اس کے نیک اعمال کا پورا صلہ دنیا ہی میں دے دیں گے، اس میں ان کے ساتھ کچھ کمی نہیں ہوگی۔ یہ وہ (بدنصیب) لوگ ہیں جن کے لیے

آخرت میں سوائے جہنم کے کچھ نہیں ہے۔ دنیا میں جو نیک کام کیے سب ضائع گئے، اور جو بھی وہ کیا کرتے تھے سب بے کار اور کالعدم کر دیے گئے[۱]۔

امیر المومنین رضی اللہ عنہ اس سے ڈرتے تھے کہ کہیں ان کا حکومتی نظام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وعیدوں کا مصداق نہ ہو۔ ایک مرتبہ مسجد میں جان بوجھ کر ایک متکبرانہ بات کہی، کسی نے نہیں ٹوکا، تو دوسرے اور پھر تیسرے جمعے کو وہی بات کہی۔ ایک شخص کھڑا ہو گیا اور برملا تنقید کی۔ حضرت معاویہ نے بہت داد و دعا دی اور کہا:

میں تین ہفتوں سے منتظر تھا کہ کوئی مجھ کو ٹوکتا ہے کہ نہیں؟ اس لیے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے کہ کچھ لوگ ایسے ہوں گے جن کی غلط باتوں کی کوئی تردید نہیں کر سکے گا، ایسے حکام کا انجام جہنم ہے۔ وہ بندروں کی طرح جہنم میں کودیں گے۔ میں اسی کا اندازہ کرنا چاہتا تھا۔ جب کسی نے میری تردید نہیں کی، تو مجھے ڈر ہوا کہ کہیں میں ان میں سے نہ ہوں۔ (إن هذا أحياني أحياه الله) اس ٹوکنے والے شخص نے مجھ پر احسان کیا ہے اللہ اس پر احسان کرے۔ اب مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے ایسے حکام میں نہیں رکھے گا۔

نماز کے بعد اس شخص کو مجلس خاص میں بلایا اور اکرام و عزت افزائی کے طور پر تخت پر بٹھایا[۲]۔

ایک مرتبہ ابو مریم نامی ایک صحابی آئے، انہوں نے بطور نصیحت یہ حدیث سنائی کہ مسلمانوں کا کوئی حاکم اگر اہل حاجت اور ضرورت مندوں پر اپنے دروازے بند رکھے گا تو اللہ اس پر آسمان کے دروازے بند رکھے گا۔ حضرت معاویہ پر گریہ طاری ہو گیا اور سر جھکا کے رونے لگے[۳]۔ قریب ہی گزر چکا ہے کہ یزید کو ولی عہد تو مقرر کر دیا تھا، لیکن اس سلسلے میں آخرت کی باز پرس سے بہت ڈرتے تھے۔ جب حضرت ابو بکر بن عمرو بن حزم نے نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ سوچ لیجیے! اللہ کو کیا جواب دیں گے؟ تو آبدیدہ ہو گئے، خوف خدا سے کانپنے لگے اور پسینہ سے شرابور۔

قرآن کا شوق و محبت:

قرآن سے شغف تھا۔ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سب سے اچھی آواز سے قرآن پڑھتے تھے۔ براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قرآن پڑھنے والوں میں تھے۔ ازواج مطہرات بھی ان کا قرآن سننے کا اہتمام کرتی تھیں (سیر الاعلام)۔ لہجہ ایسا مؤثر و دل نشین تھا کہ ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو

۱۔ الزهد والرقائق لابن المبارک: ۴۶۹، سنن الترمذی: ۲۳۸۲، صحیح ابن حبان بترتیب ابن بلبان: ۱۳۶/۲، بسند صحیح۔

۲۔ معجم کبیر طبرانی: ۳۹۳/۱۹، مسند ابو یعلیٰ: ۷۳۸۲، حافظ ابن حجر ہیثمی نے اس کی تمام راویوں کو ثقہ قرار دیا ہے۔ مجمع الزوائد: ۲۳۶/۵، ذہبی اس کو حسن درجے کی روایت قرار دیتے ہیں، تاریخ الاسلام: ۳۱۴/۴۔

۳۔ مسند الشامیین للطبرانی: ۲۵۵۹، وسنن ابو داود: ۲۹۴۸، بسند صحیح۔

رات کے نوافل میں قرآن پڑھتے سنا تو دیر تک کھڑے سماعت فرماتے رہے۔ صبح کو کہا: تم کو بارگاہ خداوندی سے لحن داودی کا خاص حصہ عطا ہوا ہے (صحیح مسلم: ۷۹۳)۔ ایک مرتبہ حضرت ابوموسیٰ اشعری دمشق تشریف لائے اور کسی گھر میں قیام کیا۔ تو حضرت معاویہ تہجد کے وقت ان کی تلاوت سننے جایا کرتے تھے (تاریخ ابی زرعہ: ۲۳۱)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تبرکات سے عقیدت:

تمام ہی صحابہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر دل وجان سے نثار تھے۔ دیکھنے والے دشمن بھی شہادت دیتے تھے کہ جو عظمت ومحبت صحابہ کے دلوں میں محمد کی ہے، اس کی کوئی نظیر دنیا میں نہیں مل سکتی۔ حضرت معاویہؓ کا بھی یہی حال تھا۔ اسلام لانے کے بعد سکریٹری شپ کی خدمت کے علاوہ ذاتی خدمات بھی انجام دیتے اور نہایت نیازمندانہ وفدویانہ انجام دیتے۔ وضو کراتے، ناخون تراشتے، بال کاٹتے، لیٹنے بیٹھنے کا انتظام کرتے اور ذاتی سامان برداری کرتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد آپ کے آثار وتبرکات سے گہری عقیدت تھی۔ ان کو آنکھوں کا سرمہ بنانا چاہتے تھے۔ حضرت عائشہؓ کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تبرکات محفوظ تھے۔ ایک مرتبہ مدینے حاضری کے موقعے پر ان کے پاس قاصد بھیجا اور درخواست کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی انجبانی (ایک قسم کی اونی) چادر اور موئے مبارک بھیج دیں۔ انہوں نے بھیج دیے، حضرت معاویہؓ نے چادر مبارک پہن لی اور موئے مبارک کو پانی میں ڈال کے وہ پانی پیا اور اس کو اپنے جسم پر لگایا[۱]۔

ایک دن آپ حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وضو کرا رہے تھے، آپؐ نے اپنا کرتا عنایت فرمایا۔ حضرت معاویہؓ نے اس کو اپنے کفن کے لیے محفوظ کرلیا۔ وفات کے وقت اس عاشق نے وصیت کی کہ محبوب کی اس قمیص کو کفن کا حصہ بنا دیا جائے۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تراشے ہوئے ناخون بھی محفوظ کررکھے تھے، وصیت کی کہ ان کو میری آنکھوں اور منہ میں رکھ دیا جائے۔ (أنساب الاشراف: ۵/ ۱۵۳، بسند جید)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حرم میں حضرت ماریہ قبطیہ بھی تھیں، جو اصلا مصر کی تھیں۔ حضرت حسنؓ نے سفارش کی تو ان کے پورے گاؤں کا خراج معاف کر دیا گیا[۲]۔

نہایت اچھی نماز پڑھتے تھے:

نماز کا بہت اہتمام تھا، بڑی اچھی اور خوبصورت نماز ادا فرماتے تھے۔ حضرت ابو الدرداءؓ علم وتقویٰ میں ممتاز صحابہ میں سے تھے۔ اپنے دور کی نہایت محترم شخصیت تھے۔ حضرت عمرؓ نے پورے شام کا دینی معلم ونگراں

---

۱ طبقات ابن سعد، متمم الصحابہ۔ الطبقۃ الرابعۃ: ۱۱۲، بسند حسن۔

۲ الاموال للقاسم بن سلام: ۱۲۱، المواعظ والاعتبار بذکر الخطط والآثار: ۱/ ۵۷۔

بنا کر بھیجا تھا۔ ان کی شہادت ہے کہ میں نے معاویہؓ کی نماز سے زیادہ کسی کی نماز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نماز سے مشابہ نہیں پائی (مجمع الزوائد: ۱۵۹۲۰، بحوالۂ طبرانی۔ ہیثمی نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔ معجم الصحابہ للبغوی: ۳۶۷/۵، بسند صحیح) اتنے بڑے عالم و بزرگ صحابی کی شہادت و اعتراف بہت بڑی بات ہے۔

اتباعِ سنت:

اتباعِ سنت کا ایسا اہتمام تھا کہ کوئی چھوٹی سی بات بھی ہدایت نبوی کے خلاف نہیں رہنے دیتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسجد میں تھوک یا بلغم سے منع فرمایا تھا۔ اور فرمایا تھا اس غلطی کا کفارہ یہ ہے کہ اس کو مٹی میں دبا دیا جائے۔ ایک رات غفلت سے حضرت معاویہؓ نے مسجد میں تھوک دیا۔ جیسے ہی تنبّہ ہوا، خود باہر گئے۔ چراغ لائے، اس کو ڈھونڈا اور دفن کیا (تاریخ المدینہ: ۲۷/۱)۔

عام دینی و شرعی امور ہی نہیں اتفاقی واقعات میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عمل کے بارے میں اہتمام سے پتہ کر کے اس کے مطابق عمل فرماتے۔ کعبہ میں داخل ہوئے تو فکر کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فتح مکہ کے موقعے پر جب کعبے کے اندر داخل ہوئے تھے، تو کہاں نماز ادا فرمائی تھی؟ معلوم تھا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ اُس وقت کعبے میں گئے تھے۔ کسی کو بھیجا کہ جاؤ حضرت عبداللہ بن عمر کو بلا لاؤ۔ وہ تشریف لائے تو بتایا کہ میں جب پہنچا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واپس ہو رہے تھے۔ مجھے بلالؓ نے بتلایا تھا کہ اگلے دونوں ستونوں کے درمیان دیوار سے دو گز پیچھے ہٹ کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دوگانہ ادا فرمایا ہے۔ حضرت معاویہؓ نے اسی جگہ دو رکعتیں ادا فرمائیں (مسند احمد: ۲۳۹۰۹، بسند صحیح۔ اخبار مکہ: ۲۷۱/۱)۔

ہر ہر سنت پر عمل بھی فرماتے اور لوگوں کو اس کی تعلیم بھی دیتے تھے۔ حضورؐ ہر سال کے شروع میں شہداء احد کی قبروں پر تشریف لے جاتے اور سلام فرماتے تھے۔ پھر اس پر حضرات ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم بھی عمل کرتے تھے۔ حضرت معاویہ حج کے سفر پر آئے تو اس سنت پر عمل فرمایا اور حاضرین کو سکھلایا کہ رسول اللہؐ جب یہاں پہنچتے تو شہداء کو اِس طرح سلام کرتے: **سلام علیکم بما صبرتم فنعم أجر العاملین۔** (تاریخ المدینہ: ۱۳۲/۱)۔

مندرجہ ذیل واقعے سے بھی اندازہ لگایئے کہ اداؤں اور اعمال و الفاظ میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کس درجے اتباع و محاکات کا اہتمام تھا۔ ایک مرتبہ خبر ملی کہ کچھ نیک لوگ فجر کی نماز کے بعد مسجد کے ایک گوشے میں جمع ہو کر ذکر کرتے ہیں۔ امیر المومنین فوراً نکلے اور ایک خاص انداز میں سبک گامی کرتے ہوئے ان کے پاس آئے۔ اور کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی ایک مرتبہ پتہ چلا کہ مسجد میں ذکر کرنے والوں کا ایک حلقہ یادِ الٰہی میں مشغول ہے، تو آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بالکل اسی انداز میں دوڑتے ہوئے ان کے پاس آئے جس طرح اِس وقت میں آیا ہوں۔ اور ان کو خوش خبری دی کہ اللہ تعالیٰ اپنے ملائکہ کے سامنے تم پر فخر کر رہا ہے (المعجم الکبیر: ۳۴۰/۱۹)۔ اس کے بعد ان

سے پوچھا: کیا اللہ کو گواہ بنا کر کہہ سکتے ہو تم صرف ذکر خداوندی کرنے کے لیے یہاں بیٹھے ہو؟ انہوں نے کہا: اللہ کی قسم، ہم اللہ کا ذکر اور اس کی حمد وثنا ہی کر رہے ہیں۔ پھر فرمایا: میں نے جو تم سے قسم لی وہ اس لیے نہیں کہ تم پر جھوٹ کا شبہہ تھا، بلکہ ہوا یوں کہ اس ذاکرین کے حلقہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اسی طرح اور انہی الفاظ میں قسم لی تھی، اور پھر یوں ہی فرمایا کہ "میں نے جو تم سے قسم لی وہ اس لیے نہیں کہ تم پر جھوٹ کا شبہہ تھا" بلکہ ابھی جبریل آئے اور مجھے خبر دی کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں کے سامنے تمہارا تذکرہ کر کے تم پر فخر فرما رہا ہے (صحیح مسلم: ۲۷۰۱)۔

حضرت معاویہؓ اور حضرت ابن عباسؓ ایک ساتھ طواف کر رہے تھے۔ حضرت معاویہؓ نے بیت اللہ کے چاروں ارکان (کونوں) کا استلام کیا۔ حضرت ابن عباس نے ٹوکا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صرف حجر اسود اور رکن یمانی کا استلام کرتے تھے۔ حضرت معاویہؓ نے کہا بیت اللہ کا کوئی حصہ چھوڑا نہیں جائے گا۔ حضرت ابن عباس نے تردید کی کہ ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع کا حکم ہے۔ اور آیت قرآنی لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب: ۲۱) کا حوالہ دیا۔ بس حضرت معاویہؓ نے فوراً اپنی رائے سے رجوع کر لیا (مسند احمد: ۱۸۷۷)۔

خلوص اور دین وملت کی خیر خواہی:

دین وملت کی خیر خواہی ہر ذاتی مصلحت پر غالب تھی۔ جس وقت حضرت معاویہؓ کی حضرت علیؓ کے ساتھ کشمکش جاری تھی، ایک جاسوس نے، جو رومیوں کے دربار میں رسائی رکھتا تھا، رپورٹ بھیجی کہ بادشاہ کی نیت مسلمانوں پر حملے کی ہے۔ رومی کہہ رہے ہیں کہ یہی وقت عربوں کو ختم کر دینے کا ہے۔ حضرت معاویہؓ نے بادشاہ روم کے نام خط میں لکھا کہ اگر تم باز نہ آئے تو میں علیؓ سے صلح کر لوں گا۔ اور ان کے لشکر کا مقدمہ لے کر قسطنطنیہ پر سب سے پہلے میں حملہ کروں گا اور جیسے تم پہلے خنزیر چراتے تھے اسی حال میں لوٹا دیے جاؤ گے۔ (اخبار ابی القاسم الزجاجی: ۲۴)۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ اسی خانہ جنگی وانتشار کے دور میں رومیوں نے اسلامی سرحدوں پر فوجیں لانا شروع کیں تو حضرت معاویہؓ نے لکھا کہ اگر فوجیں واپس نہ ہوئیں تو میں حضرت علی کے لشکر کے ساتھ مل کر رومیوں پر حملہ کروں گا (البدایہ والنہایہ: ۸/ ۱۲۷)۔

امانت داری واحتیاط:

حضرت معاویہؓ نے حضرت عثمان کو لکھا تھا کہ حکومت کے مہمانوں کا بوجھ مجھ پر ہے۔ علاقائی افسران اور حکومتی کارندے مسلسل آتے ہیں۔ ان کے علاوہ رومیوں کے وفدوں کی ضیافت بھی میرے ہی ذمہ ہے۔ جو تنخواہ ملتی ہے وہ ان تمام ضروریات کے لیے کافی نہیں ہے۔ یہاں کچھ ایسی غیر مزروعہ اراضی ہیں، جو نہ خراج کی ہیں اور نہ اہل ذمہ کی ملکیت ہیں۔ اگر یہ مجھے مل جائیں تو کام میں سہولت ہو۔ حضرت عثمان نے یہ زمین حضرت معاویہ کو

دے دی۔ جب حضرت معاویہؓ خلیفہ بن گئے تب بھی ان کی آمدنی انہی مصارف میں خرچ ہوتی رہی۔مگر حضرت معاویہؓ کی احتیاط کا یہ حال تھا کہ بعد میں ان زمینوں کو اپنے خاندان کے ضرورت مندوں اور مسلمانوں کے غرباء کے لیے وقف فرما دیا۔(تاریخ دمشق: ۲۰۶/۲)۔اوپر قریب ہی گزرا ہے کہ وفات کے وقت خیال کیا کہ کہیں ریاست کے کچھ حقوق اپنے ذمے نہ رہ گئے ہوں، لہٰذا احتیاطاً اپنی نصف ملکیت کو بیت المال میں جمع کروا دیا۔

نصیحت واصلاح کی طلب اور ایک اثر پذیر دل:

اگرچہ حضرت معاویہؓ کو اونچا دینی وعلمی مقام حاصل تھا، جس کا اعتراف عموماً صغار صحابہ اور تابعین کیا کرتے تھے، ساتھ ہی ان کو بلند ترین دنیوی جاہ وحشمت بھی حاصل تھی، مگر بایں ہمہ وہ ہمیشہ اپنے لیے نصیحت کے جویا اور اصلاح کے طالب رہتے تھے۔حضرت عائشہ ساری امت کی مادر محترم تھیں، پھر اپنی دینی وعلمی فضیلت کی بنا پر گویا خلیفہ کے لیے ایک نگراں ومصلح کی حیثیت رکھتی تھیں۔حضرت معاویہؓ کو اپنی بلند ومحترم حیثیت سے ٹوکتی بھی رہتی تھیں۔اس کے باوجود حضرت معاویہؓ ان سے درخواست کرتے کہ خط کے ذریعے نصیحت سے سرفراز فرمائیں۔ایک مرتبہ حضرت معاویہؓ نے دمشق سے مدینہ خط لکھا کہ میرے لیے نصیحت پر مشتمل خط لکھوا دیجیے۔ انہوں نے لکھوایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے کہ جو کوئی اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے مخلوق کی ناراضی مول لے گا، اللہ مخلوق سے اس کو بے نیاز ومستغنی کر دے گا۔اور مخلوق کی رضا جوئی کے لیے جو اللہ کو ناراض کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو مخلوق ہی کے حوالے کر دے گا (سنن ترمذی: ۲۴۱۴)۔

نصیحت واصلاح کی بات کا قلب پر گہرا اثر ہوتا تھا۔کبھی کوئی صالح ومخلص توجہ دلا دیتا کہ حکومت کی ذمے داری کیسا بھاری بوجھ ہے اور اللہ کے یہاں اس کے بارے میں آپ کو جواب دینا ہوگا تو نہایت اثر ہوتا۔حضرت عمرو بن حزم انصاریؓ نے یزید کی ولی عہدی کے سلسلے میں عند اللہ مسئولیت کی یاد دہانی کرائی اور یہ کہا کہ معاویہ! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ فرمان سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ اگر کسی کو حکومت کا کوئی معاملہ سپرد کرتا ہے تو اس سے قیامت کے دن ضرور حساب لے گا کہ اس نے کیا طرز عمل اپنایا؟ سوچ لو، اللہ پوچھے گا کہ امت کا معاملہ کس کے سپرد کر کے آئے ہو تو کیا جواب دو گے (روایت کے الفاظ ہیں کہ)؟ یہ سننا تھا کہ ''کانپ گئے، سانس پھولنے لگی، سرد موسم میں پسینہ چھوٹ گیا''۔اور کچھ دیر بعد قرار آیا (مسند ابو یعلیٰ: ۷۳۷۱، بسند صحیح)۔

حجاز تشریف لاتے تو ام المؤمنینؓ کی خدمت میں نہایت باادب حاضری دیتے۔وہ امور مملکت کے متعلق تفصیلی نصیحتیں کرتیں، کبھی تنبیہ وتوبیخ کا لہجہ بھی اپناتیں۔کبھی عام لوگوں کو نکال دیا جاتا صرف حضرت معاویہؓ اور ایک آدھ لوگ رہتے اور نصیحتوں سے نوازتیں۔تاریخ دمشق میں صحیح سند سے وارد ہے کہ حضرت قاسمؒ بن محمد بن ابی

بکر روایت کرتے ہیں، جو ام المومنین کے بھتیجے اور انہی محمد بن ابی بکرؓ کے بیٹے تھے جن کو حضرت عثمانؓ کے خلاف بغاوت کے سلسلے میں حضرت معاویہؓ کے افسر حضرت مسلمہؓ بن مخلد نے قتل کیا تھا۔ حضرت عائشہ کو اس حادثے کا سخت غم تھا۔ غالباً حادثے کو زیادہ مدت نہیں گزری تھی کہ حضرت معاویہ حجاز آئے، ام المومنینؓ کی خدمت میں حاضری دی۔ حضرت عائشہ کے مولیٰ ذکوان کے علاوہ کوئی چوتھا مجلس میں نہیں تھا۔ ام المومنین سخت برافروختہ ہوئیں اور اپنے بھائی کے قتل پر ناراضگی کا اظہار کیا۔ حضرت معاویہؓ نے معذرت چاہی۔ اس کے بعد ملکی حالات پر کچھ دیر تک گفتگو کی۔ اس کے بعد حضرت عائشہؓ نے اپنی گفتگو کا آغاز اللہ کی حمد وثنا اور شہادتین سے کیا پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہدایت اور اسلام کے اصول حکمرانی کا تذکرہ فرمایا اور خلفاء راشدین کی حکومتوں کا طرز یاد دلایا۔ اور اسی راستے پر چلنے کی تاکید ونصیحت کی۔ راوی ذکوان کہتے ہیں کہ ام المومنین نے اس سلسلے میں بہت کچھ کہا، کوئی بات جو حکومت کے سلسلے میں حضرت معاویہ سے کہنے کی تھی نہیں چھوڑی۔ ساری نصیحتیں اور مشورے سننے کے بعد حضرت معاویہؓ نے عرض کیا:

أنت والله العالمة بأمر رسول الله ﷺ المناصحة المشفقة البليغة الموعظة، حضضت على الخير وأمرت به ولم تأمرينا إلا بالذي هو لنا وأنت أهل أن تطاعي۔

اللہ کی قسم، ام المؤمنین! آپ رسول اللہؐ کے دین وشریعت کی بڑی عالمہ اور ایک شفیق ومہربان ناصح ہیں۔ آپ نے نیک باتوں کا حکم دیا اور وہی کہا جس میں ہمارے لیے خیر ہے۔ آپ کا مقام ہے کہ آپ کی ہر بات مانی جائے۔

اس کے بعد دیر تک اسی رنگ میں مجلس جاری رہی۔ ذکوان کہتے ہیں کہ جب ہم باہر نکلے تو حضرت معاویہؓ پر اتنا اثر تھا کہ کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔ میرے کندھے پر سہارا لے کے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد ایسی بلاغت اور قوت وتاثیر کسی کے کلام میں نہیں (تاریخ دمشق: ۵۹/ ۱۵۳)۔

گزر چکا ہے کہ امور سلطنت کے بڑھنے کے ساتھ حضرت معاویہؓ نے اپنے دروازے پر ایک دربان رکھ لیا تھا، کہ ہر وقت ہر ایک نہ پہونچ سکے۔ ایک مرتبہ ابو مریم نامی ایک صحابی آئے، انہوں نے کہا کہ میں کسی کام سے نہیں آیا ہوں۔ تم کو یہ حدیث سنانی ہے کہ مسلمانوں کا کوئی حاکم اگر اہل حاجت اور ضرورت مندوں پر اپنے دروازے بند رکھے گا تو اللہ اس پر آسمان کے دروازے بند رکھے گا۔ حضرت معاویہ پر گریہ طاری ہو گیا اور سر جھکا کے رونے لگے۔ پھر اپنے دربان سعد کو بلوایا اور کہا: ابو مریم! اب دوبارہ وہ حدیث سنائیے۔ انہوں نے پھر پوری حدیث سنائی۔ حضرت معاویہ نے سعد دربان سے کہا، دیکھو! جو بھی آئے مجھ تک پہنچانا۔ اے اللہ اب میں اپنی گردن سے اس ذمہ داری کا بوجھ اتارتا ہوں۔ اب یہ سعد کی ذمے داری ہے۔ (مسند الشامیین للطبرانی: ۳/ ۴۰۶، بسند حسن،

مستدرک: ۲/ ۷۰۷، حاکم اور ذھبی نے اس کو صحیح قرار دیا ہے)۔

چھوٹوں کی نصیحت کا بھی استقبال:

حضرت معاویہ صحابہ ہی کی نصیحتوں اور تنقیدوں کا استقبال نہیں کرتے تھے، بلکہ تابعین کی صف کے معروف صالحین کا بھی ان کے دربار میں خاص مقام ہوا کرتا تھا۔ایک جلیل الشان بزرگ ابومسلم خولانی تھے۔ جن کی عظمت وتقویٰ کے سب ہی معترف تھے۔حضرت معاویہ ان کی بہت تکریم فرماتے تھے۔ابونعیم اصفہانی نے تابعین میں جن آٹھ شخصیتوں کو زہد وعبادت اور تقویٰ وللّٰہیت میں اپنے عہد کا امام قرار دیا ہے، ان میں ایک شخصیت ان کی بھی ہے (حلیۃ الاولیاء: ۲/ ۸۷، ۵/ ۱۲۰)۔ان بزرگ کا نام عبداللہ بن ثوب تھا۔کنیت ابومسلم سے ہی مشہور تھے۔عہد نبوی میں ہی اسلام لے آئے تھے۔مگر مدینہ آئے تو آپ ﷺ کی وفات ہوچکی تھی۔ جب یمن میں اسود عنسی نے نبوت کا دعویٰ کیا تو ابومسلم خولانیؒ نے علانیہ اس کو جھوٹا کہنا شروع کیا۔اس نے ان کو گرفتار کرلیا۔انہوں نے اس کے منہ پر بھی کہہ دیا کہ تو جھوٹا ہے۔ظالم نے ایک زبردست آگ دہکوائی اور ان کو اس میں ڈلوادیا۔اللہ کی خاص شانِ حفاظت جلوہ گر ہوئی۔لوگوں نے دیکھا کہ ابومسلم صحیح سلامت آگ سے نکل کر چلے آرہے ہیں۔اسود عنسی نے ان کو جلاوطن کردیا۔پھر وہ یمن سے مدینہ آگئے۔ان سے پہلے اس واقعے کی خبر مدینہ پہنچ چکی تھی۔مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے کہ حضرت عمرؓ نے دیکھ لیا۔ان سے پوچھا کہاں سے آئے ہو؟ کہا: یمن سے؟ کہا اس شخص کا کیا حال ہے جس کو اسود عنسی کذاب نے آگ میں ڈال دیا تھا۔انہوں نے اخفا سے کام لیتے ہوئے کہا: ہاں وہ عبداللہ بن ثوب ہیں۔عمر فاروقؓ کی فراست بھلا کہاں چوکنے والی تھی! فرمایا: تمہیں اللہ کی قسم ہے، صحیح بتاؤ، وہ تم ہی ہو؟ انہوں نے اعتراف کیا تو حضرت عمر رو پڑے۔گریہ کے ساتھ ان کو گلے لگایا اور فرمایا: الحمدللہ، مرنے سے پہلے اللہ نے دکھلا دیا کہ اس امت میں بھی اللہ کے ایسے بندے ہیں، جن کے ذریعہ سنت خلیل زندہ ہوئی اور ان کو اللہ تعالیٰ نے اسی طرح آگ سے محفوظ رکھا جس طرح حضرت ابراہیمؑ کو رکھا تھا۔

(تاریخ دمشق: ۲۷/ ۲۰۰)۔

یہ ہجرت کرکے شام آباد ہوگئے تھے۔حضرت معاویہؓ ان کے بڑے قدرداں تھے، بلکہ ان کا احترام فرماتے تھے۔اور وہ بھی حضرت معاویہ کو وقتا فوقتا نصیحت کرتے رہتے تھے۔صحیح روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت معاویہؓ منبر پر آکر بیٹھے۔ابومسلم خولانی نے نصیحت کرتے ہوئے کہا: ایک دن آپ کو قبر میں جانا ہے۔اور وہاں صرف اچھے اعمال ہی کام آئیں گے۔آپ یہ خیال نہ کریں کہ خلافت کی حقیقت صرف بیت المال میں مال جمع کرنا اور لوگوں میں تقسیم کرنا ہے۔بلکہ خلافت کی حقیقت ہے حق پر عمل، عدل وانصاف کی بات کرنا اور لوگوں کو اللہ

کے راستے پر چلانا۔ معاویہ! کسی نہر کا اگر سرچشمہ صاف پانی دے، تو وقتی گدلے پن سے کچھ نقصان نہیں۔ اس امت کا سرچشمہ آپ ہیں، آپ اگر حق پر قائم رہیں گے تو امت حق پر قائم رہے گی۔ حضرت معاویہؓ ان کی نصیحت بغور سنتے رہے، جب وہ خاموش ہوئے تو حضرت معاویہؓ نے ان کو دعا دی: یرحمک اللہ، یرحمک اللہ۔ اللہ آپ پر رحمت کرے۔ اللہ آپ پر رحمت کرے [1]۔

تواضع وانکسار اور سادگی:

ساری دنیا قدموں میں تھی، بخاریٰ سے تیونس تک زمین زیر اقتدار اور آسمان سے سیم وزر کی بارش تھی، مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ایک سچے پیروکار کی طرح حضرت معاویہؓ تواضع وانکسار کے پیکر تھے۔ حامی ومخالف سب سے واسطہ تھا، ہر کہ ومہ دربار میں آتا تھا، تنقید واعتراض کرنے والے بھی کچھ کم نہ تھے، مگر کسی نے کبر ونخوت کا سایہ بھی نہیں دیکھا، نہ کسی نے طرز وانداز میں تعلّی یا لہجہ وگفتار میں تمکنت کا شکوہ کیا۔ مجلس میں تشریف لاتے تو لوگ احترام میں کھڑے ہونا چاہتے، مگر حضرت معاویہؓ کو پسند نہیں تھا کہ کوئی احترام میں کھڑا ہو جائے، ٹوک کے منع فرماتے۔ امام احمد اور امام ابوداؤد نے صحیح سند سے روایت کیا ہے کہ ایک مرتبہ پہنچے۔ حضرت عبداللہ بن زبیر اور عبداللہ بن عامر پہلے سے موجود تھے۔ عبداللہ بن عامر اداباً کھڑے ہو گئے۔ آپ نے فرمایا: بیٹھ جاؤ، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ارشاد فرماتے سنا ہے کہ جس کو یہ اچھا لگے کہ لوگ اس کے لیے کھڑے رہا کریں تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے [2]۔

حضرت مِسوَر بن مخرمہؓ حکومت پر اتنی کثرت سے تنقیدیں کرتے تھے کہ مدینے سے دمشق تک خبریں پہنچتی تھیں۔ جب خود ملاقات کو پہنچے تو حضرت معاویہ نے اس بابت دریافت کیا۔ حضرت مسور نے کسی قدر تردّد کیا۔ امیر المومنین نے اصرار کیا، تو پھر خود حضرت مسور کہتے ہیں کہ میں نے کچھ بھی روک کر نہیں رکھا، سب ہی کچھ کہہ دیا۔ قصہ گزر چکا ہے، مگر پھر پڑھ لیجیے۔ اس لیے کہ سخت تنقیدوں کے بعد حضرت معاویہؓ کا جواب ان کی تواضع، اعترافِ تقصیر اور خودشکنی کا عکاس ہے۔ تنقیدیں سن کر حضرت معاویہؓ نے فرمایا:

> میں خود کو گناہوں سے بری نہیں کہتا۔ یہ بتاؤ! کیا تم کو اپنی کچھ غلطیوں کا اعتراف ہے، کہ اگر اللہ تعالیٰ نے معاف نہ کیا تو سخت نقصان ہوگا۔ (حضرت مسورؓ فرماتے ہیں:) میں نے کہا: ہاں، ضرور۔ حضرت معاویہ نے کہا: جس طرح تم اپنی غلطیوں کی معافی کی امید رکھتے ہو، میں بھی اپنی غلطیوں کی اللہ سے مغفرت کی امید رکھتا ہوں۔ پھر (جیسا کہ تم جانتے ہو) مجھ پر عوامی معاملات کی اصلاح، حدود کا قیام،

---

[1] مسند الشامیین للطبرانی: ۲۵۵۹، وسنن ابوداود: ۲۹۴۸، بسند صحیح۔

[2] سنن ابی داود: ۵۲۲۹، مسند احمد: ۱۶۸۳۰ بسند صحیح۔

جہاد کا انتظام، اور حکومت کی دیگر سخت گراں بار ذمہ داریاں ہیں، جو تم پر نہیں ہیں۔ (تو غلطیاں ہو بھی سکتی ہیں)۔ اللہ کی ذات بڑی کریم ہے، حسنات کو قبول اور سیئات سے درگزر کرتی ہے۔ پھر فرمایا: اس کے باوجود اتنا کہتا ہوں کہ جب بھی اللہ اور غیر میں کسی ایک کے انتخاب کا موقع یا امتحان آتا ہے، میں غیر کا نہیں، اللہ کی رضا کا ہی انتخاب کرتا ہوں [۱]۔

مدح سرائی قطعاً پسند نہیں تھی۔ معبد جہنی کہتے ہیں تقریباً ہر جمعے کے خطبے میں یہ حدیث بیان کرتے تھے کہ ''منہ پر تعریف مت کیا کرو، یہ (ممدوح) کا قتل ہے، یعنی اس کو غرور میں مبتلا کر دیتا ہے۔ (مسند أحمد: ۱۶۸۴۶، بسند صحیح)۔ اسی تواضع کا نتیجہ تھا کہ ہر چھوٹا بڑا نکتہ چینی اور اعتراض کر سکتا تھا۔

دربار میں بھی کوئی کروفر اور خدم وحشم نہیں تھے۔ ایک معمولی درجہ کا اہتمام تھا جس کو حضرت عمر کے دور میں ناپسند کیا جاتا تھا، مگر حضرت معاویہؓ اس کو رومیوں پر ہیبت ورعب کے لیے ضروری کہتے تھے۔ اسی لیے عام طور پر خود شان دار لباس پہنتے تھے، مگر مسلمانوں کے سامنے سادگی سے بھی رہتے تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ جمعے کے دن لوگ دیکھتے کہ خطبہ دے رہے ہیں اور کرتا پیوند لگا ہوتا۔ (الزہد لاحمد: ۱۴۲، الآحاد والمثانی: ۱/۳۷۹)۔

ایک رات غفلت سے مسجد میں تھوک دیا۔ جیسے ہی تنبّہ ہوا، خود باہر گئے۔ چراغ لائے، اس کو ڈھونڈا اور خود دفن کیا (تاریخ المدینۃ: ۱/۲۷)۔

یہ امیر المومنین تھا، خلیفۃ المسلمین تھا، پادشاہ اعظم تھا، اور تواضع کا یہ عالم تھا۔

علمی مقام:

اس حقیقت سے کم لوگ واقف ہیں کہ حضرت معاویہ صحابہ کے کبار اہل علم میں سے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کی خاص صحبت کی برکت سے فہم دین اور تفقّہ کا ایک خاص ملکہ عطا ہوا تھا۔ جس کا اعتراف حَبر الامت حضرت عبداللہ بن عباس جیسے عظیم عالم کو بھی تھا۔ حافظ ابن القیم کی کتاب اعلام الموقعین فقہ وفتویٰ میں نہایت اہم رہنما کتاب مانی جاتی ہے۔ اس میں ایک مقام پر وہ بتاتے ہیں کہ صحابہ کی وہ کون سی شخصیات ہیں جو تبلیغ شریعت میں رسول اللہ ﷺ کی اس درجے خاص وارث ہوئی ہیں، کہ امت کو دین انہی کے ذریعے سے پہنچا ہے۔ اور آج دنیا میں جو دین موجود ہے، ان ہی عالی قدر نفوس کا ہی فیض ہے اور وہی اس کا سرچشمہ ہیں۔ ان ہی کے اجتہادات وفتاویٰ علم فقہ کی اساس بنے ہیں۔ اس مختصر سی فہرست میں حضرت معاویہؓ کا نام شامل ہے۔ فرماتے ہیں:

فهؤلاء برك الإسلام، وعصابة الإيمان، وأئمة الهدى، ومصابيح الدجى، وأنصح الأئمة

---

[۱] مصنف عبدالرزاق: 20717، بسند صحیح۔ حافظ ابن عبدالبر کہتے ہیں یہ امام زہری سے مروی سب سے صحیح روایات میں سے ہے، الاستیعاب ترجمۂ معاویہؓ۔ نیز طبقات ابن سعد قسم متمم الصحابہ، طبقۂ رابعہ: ۱۲۳ بسند صحیح۔

للأمة، وأعلمهم بالأحكام وأدلتها، وأفقههم في دين الله، وأعمقهم علما، وأقلهم تكلفا، وعليهم دارت الفتيا، وعنهم انتشر العلم، وأصحابهم هم فقهاء الأمة، ومنهم من كان مقيما بالكوفة كعلي وابن مسعود، وبالمدينة كعمر بن الخطاب وابنه وزيد بن ثابت، وبالبصرة كأبي موسى الأشعري، وبالشام كمعاذ بن جبل ومعاوية بن أبي سفيان، وبمكة كعبد الله بن عباس، وبمصر كعبد الله بن عمرو بن العاص، وعن هذه الأمصار انتشر العلم في الآفاق (اعلام الموقعین عن رب العالمین: ۱/ ۴۸)۔

یہ حضرات اسلام کے قائد، قافلۂ ایمان کے سالار، ائمۂ ہدایت اور روشنی کے مینار ہیں۔ائمۂ دین میں ان سے زیادہ امت کا خیر خواہ کوئی نہیں۔احکام اور ان کے دلائل سے سب سے زیادہ واقف اور علم شریعت میں سب سے برتر ہیں۔ان کا علم سب سے گہرا اور تکلف وتصنع کے شائبہ سے پاک ہے۔یہی لوگ علم فقہ کے مدار اور فتویٰ کے سلسلے میں ساری امت کے مرجع ہیں۔یہی وہ سرچشمۂ خیر تھے جن سے اگلی نسلوں کو شریعت کا آب حیات پہنچا۔یہی شخصیات وہ منارۂ نور تھیں جن سے امت کو علم کی روشنی ملی۔ اگلی نسل کے فقہاء سب انہی کے شاگرد اور مستفیدین تھے۔ان میں سے کوفہ میں علی اور ابن مسعود تھے، مدینہ میں عمر فاروق، ان کے صاحب زادے عبداللہ بن عمر اور زید بن ثابت تھے۔بصرہ میں ابو موسیٰ اشعری تھے۔شام میں معاذ بن جبل اور معاویہ بن ابی سفیان تھے۔مکہ میں عبداللہ بن عباس اور مصر میں عبداللہ بن عمرو بن العاص تھے۔انہی لوگوں سے سارے عالم میں علم پھیلا۔رضی اللہ عنہم۔

حضرت ابن عباس اس دور کے سب سے بڑے علماء میں تھے۔حَبر الامۃ لقب پایا۔ایک موقعے پر ان کے شاگرد عکرمہ نے حضرت معاویہؓ کو دیکھا کہ انہوں نے ایک ہی رکعت وتر پڑھی۔انہوں نے اس کا حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے تعجب کے ساتھ اظہار کیا۔حضرت ابن عباس نے کہا: معاویہ نے صحیح کیا، انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی صحبت اٹھائی ہے، وہ یقیناً فقیہ شخص ہیں۔اور مزید یہ بھی کہا کہ ہم میں سے کوئی معاویہ سے زیادہ علم والا نہیں[۱]۔حَبر الامۃ ابن عباسؓ کا یہ ارشاد کہ ''ہم میں سے کوئی معاویہ سے زیادہ علم والا نہیں'' حضرت معاویہؓ کے علمی مقام کی غیر معمولی شہادت ہے۔

اپنے دور میں وہ عالم اسلام کے ایک اہم علمی مرجع تھے۔اطراف واکناف کے گورنر اور قاضی اپنے علمی سوالات خدمت میں پیش کرتے اور جوابات پاتے تھے۔مروان جیسا عالم جب کوئی مشکل مسئلہ عدالت میں آتا تو خط لکھ کر حضرت معاویہؓ سے فتویٰ پوچھتا۔ایک مرتبہ مدینہ کے دار القضاء میں ایک مسئلہ یہ آیا کہ ایک پاگل شخص نے قتل کر دیا۔مروان نے حضرت معاویہؓ سے خط کے ذریعہ دریافت کیا۔انہوں نے جواب دیا کہ اس کو قید کر دیا

---

۱ صحیح بخاری: ۳۷۶۴، ۳۷۶۵۔ مسند الشافعی: ۸۶، مصنف عبدالرزاق: ۴۶۴۱۔

جائے (تاکہ دوسروں کی حفاظت رہے) مگر پاگل کو قصاص میں قتل نہیں کیا جاتا (موطا: ۳۱۴۶:۶)۔

پورے عالم اسلام کے بڑے بڑے علما تلاش میں رہتے کہ حضرت معاویہؓ کے فتاویٰ اور آراء معلوم ہوتے رہیں۔ حضرت جبیر بن مطعم کے صاحب زادے نافع خود بہت بڑے عالم اور مدینہ کے مفتی اور مرجع تھے۔ ان کو خبر ملی کہ سائب ابن اخت نمر دمشق گئے تھے، وہاں حضرت معاویہ نے ان کو نماز سے متعلق کوئی مسئلہ بتایا ہے۔ تو اپنے شاگرد عمر بن عطاء کو بھیجا کہ پتہ کر کے آؤ۔ وہ گئے۔ تو سائب نے ان کو مسئلہ بتایا (صحیح مسلم: ۸۸۳)۔

بڑے بڑے اہل علم قضا کے منصب پر فائز تھے۔ مگر حضرت معاویہ ان قاضیوں اور ان کے فیصلوں کی بنفس نفیس خود نگرانی فرماتے تھے۔۔ مورخ اندلس قاضی علی بن عبداللہ النباھی لکھتے ہیں: جب حضرت معاویہ خلیفہ بنے تو اپنے پیشرو خلفاء راشدین کے طرز کے مطابق بڑی توجہ کے ساتھ مملکت کے قاضیوں کی مسلسل نگرانی کرتے تھے (تاریخ قضاۃ الاندلس: ۲۴)۔

علم کی غیر معمولی طلب و جستجو:

اس علمی مقام کا سبب ایک تو وہی ہے جس کی طرف حضرت ابن عباس نے توجہ دلائی، یعنی رسول اللہ ﷺ کی خصوصی صحبت و معیت جو کسب علم اور تفقہ فی الدین کا لاثانی نظام تھا۔ جس سے صرف علم ہی نہیں حاصل ہوتا تھا، شریعت کے اسرار و رموز بھی کھلتے تھے اور اس کی روح سے بھی آشنائی و سیرابی ہوتی تھی۔ خصوصی صحبت نبوی سے فیضیاب صحابہ کے علاوہ کسی کو اس چشمۂ نور سے سیرابی حاصل نہیں ہوئی۔ حضرت معاویہؓ صرف صحابی ہی نہیں تھے، دو سال تک رسول اللہ ﷺ کی گویا ہمہ وقت معیت و خدمت کا شرف رکھتے تھے۔ عہد صدیقی میں شام بھیجا گیا تو حضرت ابوعبیدہ بن جراح، حضرت ابوالدرداء اور دیگر اہل علم صحابہ کی معیت رہی۔ اس کا تیسرا سبب یہ تھا کہ حضرت معاویہؓ نے بڑی لمبی مدت تک حضرت عمرؓ کے زیر نگرانی کام کیا تھا۔ حضرت عمر کو اپنے گورنروں کی تعلیم و تربیت کا بھی بہت اہتمام تھا۔ لگاتار اقامت دین، علم سیاست مدن اور قضاء سے متعلق خطوط کے ذریعے وہ ان کو مستفید کرتے رہتے تھے۔ علماء صحابہ میں سے جن کے ذریعے علم و فقہ کی نشر و اشاعت ہوئی قریباً سب ہی حضرت عمرؓ کے خوشہ چیں تھے۔ ان اسباب کے علاوہ علم میں اس درجہ کے حصول کا ایک اور سبب حضرت معاویہؓ کی ایک خاص صفت یعنی علم کی غیر معمولی طلب و حرص اور جستجو بھی تھی۔

خلافت کے دور میں وہ پختہ سن ہو چکے تھے۔ پورے عالم اسلام میں ان کے علم سے استفادہ کیا جا رہا تھا۔ مگر وہ ایک ایک سنت اور روایت کی تلاش اور کھوج میں رہتے تھے اور دیگر فقہائے صحابہ سے فقہ و فتویٰ میں تبادلۂ خیال کرتے رہتے تھے۔ جب معلوم ہوتا کہ کوئی صحابی شریعت و سنت کی کوئی چیز رسول اللہ ﷺ سے روایت

کرتا ہے فوراً بذریعۂ خط اس کی تفصیل معلوم کروائی جاتی۔

معلوم ہوا کہ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نماز کے بعد ایک خاص ذکر یا دعا نقل کرتے ہیں۔ امیر المومنین کا خط گیا کہ آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جو تسبیح نماز کے بعد سنی ہے، مجھے لکھ کر بھیج دیجیے۔ انہوں نے اپنے سکریٹری وراد کے ہاتھوں لکھوایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نماز کے بعد یہ تسبیح پڑھتے سنا ہے: لا إله إلا الله وحده لا شريك له، له الملك، وله الحمد، وهو على كل شيء قدير، اللهم لا مانع لما أعطيت، ولا معطي لما منعت، ولا ينفع ذا الجد منك الجد۔ حضرت معاویہؓ کے یہاں سنت کی اشاعت وترویج کا اہتمام ملاحظہ ہو، وراد کہتے ہیں کہ اس کے بعد میں دمشق گیا تو کیا دیکھتا ہوں؟ حضرت معاویہ مسجد میں بیٹھے لوگوں کو یہ تسبیح سکھا رہے ہیں اور پڑھنے کی تلقین کر رہے ہیں (صحیح بخاری: ۶۳۳۰، ۶۶۱۵، مسند احمد: ۱۸۱۳۹)۔ حضرت عبداللہ بن عباس سے ملاقات ہوتی تو طویل علمی مذاکرے فرماتے اور دیر رات تک مجلسیں رہتیں۔

حدیث کے سلسلے میں نہایت احتیاط:

حضرت معاویہؓ حضرت عمرؓ کی پیروی کا خاص اہتمام کرتے تھے۔ روایت حدیث میں قلت واحتیاط بھی ان میں سے ایک پہلو ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مستقل ساتھ رہنے اور اتنا بڑا علمی مقام رکھنے کے باوجود حدیث بہت کم بیان کرتے تھے۔ ابن ابی عاصم نے صحیح سند سے روایت کیا ہے:

> إنكم لا تجدون رجلا منزلته من رسول الله صلى الله عليه وسلم منزلتي أقل حديثا عنه، إني كنت ختنه و كنت في كتابه، و كنت أرحل له راحلته. (الآحاد والمثاني:: ۱/۳۸۰)
>
> آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مجھ جیسا تعلق وصحبت والے کسی شخص کو تم اتنا کم حدیث بیان کرتے ہوئے نہیں دیکھو گے۔ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا برادر نسبتی تھا، آپ کے کاتبوں میں سے تھا، اور (خادم بھی کہ) آپ کی سواری کا بندوبست کرتا اور اس پر کجاوہ باندھتا۔

حضرت ابوسعید خدریؓ حضرت معاویہ سے روایت کرتے ہیں، کہ ایک مرتبہ مسجد میں ذاکرین کا ایک حلقہ لگا ہوا تھا۔ حضرت معاویہؓ نے ان کو ذکر کے حلقوں کی فضیلت میں ایک حدیث سنائی، مگر پہلے یوں کہا: سنو! میں حدیث بہت کم ہی بیان کرتا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے میں جتنا قریب رہا ہوں ایسا قرب رکھنے والا کوئی شخص اتنا کم حدیثیں نہیں بیان کرتا ہوگا، جتنا میں (صحیح مسلم: ۲۷۰۱)۔

ایک مرتبہ مصر کے گورنر مسلمہ بن مخلّد کو خط لکھوایا کہ دیکھو! عبداللہ بن عمرو بن العاص یہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ:

لَا قُدِّسَتْ أُمَّةٌ لَا يَأْخُذُ ضَعِيفُهَا حَقَّهُ مِنْ قَوِيِّهَا وَهُوَ غَيْرُ مُضْطَهَدٍ۔

وہ امت اللہ کی رحمت کی سزاوار نہیں جس کا کمزور ظلم سے محفوظ نہ ہو اور طاقتور سے اپنا حق وصول نہ کر سکتا ہو۔

ان سے دریافت کرلو، اگر وہ یہ حدیث بیان کریں تو ان کو سرکاری برید کی سواری سے شام بھیج دو۔ حضرت مسلمہ نے ایسا ہی کیا، پھر حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص آئے، تو ان سے براہ راست یہ حدیث سنی۔ پھر فرمایا کہ یہ حدیث میں نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنی تھی۔ لیکن مزید اطمینان حاصل کرنا چاہا[۱]۔

حضرت معاویہؓ صحابہ کی نظر میں:

امیر المومنین حضرت معاویہؓ شروع سے ہی اکابر صحابہ کے معتمد رہے۔ بلکہ سب سے پہلے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو اپنا مستقل سکریٹری اور کاتب رکھ کر ان پر غیر معمولی اعتماد و خصوصیت کا اظہار کیا۔ یہیں سے ان کی قسمت کا ستارا طلوع اور ان کے عروج کا آغاز ہوتا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے ان کو جہادِ شام کے موقعے پر ایک جماعت کا امیر بنایا، جو بعد میں ان کے بھائی حضرت یزید بن ابی سفیان کے لشکر میں شامل ہوگئی۔ حضرت عمرؓ کے دور کے شروع ہی میں وہ مملکتِ اسلام کے ایک اہم رکن بن گئے۔ ان کے بھائی حضرت یزید کی وفات کے بعد، جو اقلیم شام کے ایک بڑے حصے کے امیر تھے، جس کا مرکزی مقام دمشق تھا، حضرت عمر نے ان پر اعتماد کیا اور امیر بنایا۔ حضرت عمر کو ان پر اس قدر اعتماد تھا کہ کچھ ہی عرصے بعد صوبۂ حمص کے گورنر حضرت عمیر بن سعیدؓ کو سبک دوش کر کے اس کو بھی حضرت معاویہؓ کی عمل داری میں شامل کر دیا۔ اس طرح حضرت عمرؓ ان کے دائرۂ حکومت میں دھیرے دھیرے اضافہ فرماتے گئے، یہاں تک کہ ان کی شہادت کے وقت حضرت معاویہؓ تقریباً پورے شام کے حاکم ہو چکے تھے۔

حضرت عمرؓ اکثر دو امیر مقرر فرماتے تھے۔ ایک امیر علیٰ الصلاۃ (یعنی امیر عام) اور ایک امیر علیٰ الخراج (افسر مالیات) ہوتا تھا۔ مگر حضرت معاویہؓ کو ہمیشہ دونوں ذمے داریاں دیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شہادت ہے کہ حضرت عمرؓ صاحب الہام اور مؤیّد من اللہ شخص تھے۔ ان کا انتخاب و اعتماد بڑی سند ہے۔ پھر حضرت عثمانؓ کا دور آیا۔ جو خلیفۂ راشد اور برحق امام تھے۔ انہوں نے حضرت معاویہؓ پر مکمل اعتماد فرمایا۔ حضرت معاویہؓ ان کے خاص الخاص معتمد تھے۔ حافظ ذہبی ان دونوں کے اعتماد کو حضرت معاویہؓ کی فضیلت کی شہادت اور ان کی حقانیت کی سند بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

۱۔ معجم کبیر طبرانی: ۱۹/ ۳۸۷، مجمع الزوائد: ۵/ ۲۰۹، بحوالہ طبرانی۔ ہیثمی نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔

ان کے لیے یہی سند کافی ہے کہ ان کو حضرت عمر اور پھر حضرت عثمان نے شام جیسے صوبے کا گورنر بنایا، جو صرف ایک صوبہ نہیں محاذ جنگ اور بڑا فوجی یونٹ بھی تھا۔ انہوں نے اس کا بہترین انتظام سنبھالا۔ اپنی سخاوت اور حلم و برداشت سے لوگوں کو خوش رکھا۔ کچھ لوگوں کو ان سے کبھی شکایت بھی ہوئی، مگر حکومت میں تو یہ ہوتا ہی ہے۔ یقیناً اصحاب رسول میں ان سے بہت زیادہ صالح اور افضل لوگ بھی تھے، مگر یہ شخص اپنی عقل مندی و ذہانت، حلم و برداشت، کشادہ دلی اور ذہانت و فطانت سے دنیا پہ چھا گیا۔ (سیر اعلام النبلاء: ۳/ ۱۳۳)۔

سیاست و تدبیر حکومت میں حضرت عمر اپنے تمام والیوں اور قائدین میں حضرت معاویہ کو فوقیت دیتے تھے، فرمایا کرتے تھے کہ: تعجب ہے تم لوگ قیصر و کسریٰ کی سیاسی زیرکی ''دھاء'' پر حیرت کرتے ہو، معاویہ کو نہیں دیکھتے؟ (طبری: ۵/ ۳۳۰، بسند صحیح۔ تاریخ الاسلام: ۴/ ۳۱۱)۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں۔ حضرت معاویہ کے عدل و انصاف کے متعلق فرماتے ہیں:

ما رأيت أحدًا بعد عثمان أقضى بحقٍّ من صاحب هذا الباب يعني معاوية.
(تاریخ دمشق: ۵۹/ ۱۶۱، بسند صحیح)

میں نے عثمان کے بعد اس دروازے والے یعنی معاویہ سے زیادہ حق فیصلہ کرنے والا نہیں دیکھا۔

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کہتے تھے:

ما رأيت بعد رسول الله صلى الله عليه وسلم أسود من معاوية، فقيل: ولا أبوك؟ قال: أبي عمر رحمه الله خير من معاوية، وكان معاوية أسود منه۔ (السنة للخلال: ۶۸۰، بسند حسن)

میں نے قیادت و سرداری کی صفت میں معاویہ سے بڑھ کر کوئی نہیں دیکھا۔ کسی نے دریافت کیا: آپ کے والد ماجد سے بھی زیادہ؟ فرمایا: میرے والد ماجد معاویہ سے افضل تھے، مگر قیادت و سرداری کی صفات معاویہ میں زیادہ تھیں۔

حضرت شرحبیل رضی اللہ عنہ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے معزول کر کے ان کی جگہ جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو ذمہ داری سونپی تو یہ اشارہ فرمایا کہ معاویہ زیادہ باصلاحیت آدمی ہیں۔ ''رجل اقوى من رجل'' (طبری: ۴/ ۶۵)۔ اس طرح ایک مرتبہ برسر عام حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو کچھ تنبیہ فرمائی، پھر لوگوں سے کہا۔ میں معاویہ کو جو دیکھا تو خیر ہی دیکھا اور جو اطلاعات ملی ہیں اچھی ہی ملیں (الطبقات الكبرى، القسم المتمم للصحابة، الطبقة الرابعة: ۱۱۳)۔

صحیح بخاری کے حوالے سے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے علم و فقہ کا اعتراف گذر چکا

ہے۔ان کی حکمرانی کی بابت فرماتے ہیں: میں نے معاویہ سے زیادہ بادشاہت کے لائق کسی کو نہیں پایا۔لوگوں کے ساتھ بہت ہی کشادہ دلی کا معاملہ کرتے تھے اور فلاں کی طرح تنگ دل نہیں تھے ۱؎۔

حضرت عمرؓ نے حمص کی امارت سے حضرت عمیر بن سعدؓ کو سبک دوش کر کے اس کو بھی حضرت معاویہؓ کے ماتحت کر دیا، تو کچھ چہ می گوئیاں ہونے لگیں۔حضرت عمیرؓ نے فرمایا: لوگو! معاویہ کے بارے میں سوائے خیر کے کچھ نہ کہو! میں نے رسول اللہ ﷺ کو سنا آپ دعا دیتے تھے کہ اے اللہ معاویہ کے ذریعے لوگوں کو ہدایت دے (سنن ترمذی: ۳۸۴۳)۔

دوران خلافت روزانہ کے معمولات:

مسعودی نے امیر المومنین معاویہؓ کے صبح سے شام تک کا معمول (Schedule) ذکر کیا ہے۔لکھتے ہیں:

حضرت معاویہ کا معمول یہ تھا کہ دن میں پانچ مرتبہ لوگوں سے ملاقات کے لیے بیٹھتے تھے۔فجر بعد مسجد میں مقرر واعظ کے وعظ میں شریک ہوتے۔اس کے بعد خلوت میں چلے جاتے، قرآن مجید پیش کیا جاتا اور اپنے مقرر ورد کی تلاوت کرتے۔پھر گھر چلے جاتے، گھریلو گفتگو کرتے اور گھر والوں کو وعظ ونصیحت کرتے۔اس کے بعد چاشت کی چار رکعتیں پڑھتے۔پھر باہر اپنی نشست گاہ میں آجاتے۔یہ بہت خاص لوگوں اور وزراء سے ملنے کا وقت تھا۔ان سے گفت گو اور تبادلۂ خیال ہوتا اور شام تک کے لیے حکومتی معاملات سے متعلق ہدایات دیتے۔اس کے بعد ناشتہ آجاتا جو عموما رات کا بچا سالن وغیرہ ہوتا۔پھر دیر تک لوگوں سے ملاقات وگفتگو کرتے۔اس کے بعد گھر تشریف لے جاتے۔کچھ دیر بعد باہر آتے۔تخت بچھا دیا جاتا اور مقصورہ کی طرف ٹیک لگا کر بیٹھ جاتے۔اس وقت اذنِ عام ہوتا۔حفاظتی گارڈ کھڑے رہتے۔کمزور، دیہاتی، غریب، بچے، عورتیں سب آتے۔سب اپنے مسائل اور فریادیں پیش کرتے۔اسی وقت متعلقہ افسران کو حکم صادر ہوتا کہ ان کی مدد کی جائے۔

جب کوئی نہیں بچتا تو اپنی نشست گاہ میں تشریف لے جاتے یہ اشراف اور اہل منزلت کا وقت ہوتا۔ہر ایک کے سلام کا جواب دیتے اور حال چال پوچھتے اور جواب دیتے۔جب لوگ بیٹھ جاتے۔تو فرماتے کہ آپ لوگوں کے لیے یہ خاص مجلس اس لیے رکھی گئی ہے کہ آپ ان لوگوں کے مسائل اور حاجتیں ہم تک پہنچائیں جو ہم تک نہیں پہنچ پاتے۔کوئی بتاتا کہ ہمارے یہاں کا فلاں شخص شہید ہو گیا، تو اس کی اولاد کا وظیفہ جاری کرتے۔کوئی کہتا فلاں شخص لاپتہ ہے، حکم دیتے کہ گھر والوں کی ضروریات کی فکر رکھی جائے اور خدمت کی جائے۔

یہاں تک کہ دوپہر کے کھانے کا وقت ہو جاتا۔تو کھانا آجاتا۔اس وقت بھی عام لوگوں کو بلا لیا جاتا۔ہر ایک تحریری درخواستیں لاتا۔آپ اس کو دسترخوان پر بٹھاتے وہ لقمے دو لقمے کھاتا، اسی اثنا میں کاتب

۱؎ مصنف عبدالرزاق: ۲۰۹۵۸ بسند صحیح، طبقات ابن سعد، القسم المتمم للصحابۃ، الطبقۃ الرابعۃ: ۱۲۱ بسند صحیح۔

کھڑا اس کی درخواست پڑھ کر سناتا، آپ مناسب ہدایات جاری کرتے۔ اس کو واپس کر کے دوسرے کو بلا لیا جاتا، آپ کہتے دسترخوان پہ بیٹھو۔ اسی طرح کبھی کبھی چالیس چالیس درخواستیں نپٹاتے۔ دسترخوان اٹھا لیا جاتا اور آپ لوگوں سے کہتے اب اجازت دیں۔ پھر گھر میں چلے جاتے۔ اب کسی کے لیے ملاقات کی اجازت نہیں ہوتی۔

ظہر کے وقت باہر آتے، نماز ادا کرتے، پھر اندر جا کے چار رکعتیں پڑھتے۔ اس وقت پھر اپنی نشست گاہ میں بیٹھتے اور دوبارہ وزراء اور اعیان حکومت حاضر ہوتے۔ سردی کے موسم میں خشک میوہ جات، میٹھے شیرمال اور کیک وغیرہ اور گرمی کے موسم میں تازے پھلوں سے مہمانوں کی ضیافت ہوتی۔ امور مملکت میں مشورے ہوتے اور احکام صادر کیے جاتے۔ عصر تک یہ مجلس چلتی۔ عصر ادا کر کے گھر چلے جاتے۔ مغرب سے کچھ قبل بیرونی نشست گاہ میں آتے اور شام کا کھانا لگ جاتا، اس وقت بھی خواص کو اذن ہوتا۔ مغرب کی نماز مسجد میں ادا کرتے اس کے بعد چار نوافل کا معمول تھا۔ یہ کسی قدر طویل نماز ہوتی۔ ہر رکعت میں تقریباً ۵۰ آیات پڑھتے، کبھی ہلکے جہر سے کبھی آہستہ۔ عشاء تک گھر میں رہتے۔

عشاء کے لیے مسجد تشریف لاتے۔ عشاء بعد پھر وزراء اور حکومتی کارندوں کا وقت ہوتا۔ ان کو ہدایات دیتے۔ پھر تقریباً تہائی رات تک مجلس رہتی۔ جس میں عرب و عجم کی تاریخ، بادشاہوں کے واقعات اور جنگوں کے حالات وغیرہ سے متعلق گفتگو رہتی۔ اس وقت اہل خانہ مٹھائی یا حلوہ جات بھیجتے۔

پھر تقریباً ایک تہائی رات سو کے اٹھ جاتے۔ کچھ نوجوان مقرر تھے جو اس وقت تاریخ و سیاست سے متعلق کتابیں سناتے۔ اس طرح روزانہ سیاست و تدبیر مملکت سے متعلق چیزیں مستقل زیر غور رہتی تھیں۔ پھر فجر کے لیے تشریف لاتے۔ یہ روزانہ کا معمول تھا (مروج الذھب: ۳/۳۱، ۳۲)۔

سراپا اور حُلیہ:

حضرت معاویہ کو باری تعالی نے ظاہری حسن و جمال اور ایک پر کشش و باوقار پیکر بھی بخشا تھا۔ قد دراز، جسم فربہ و تنومند تھا۔ رنگت سپید و ملیح، آب دار و بارونق۔ اور سراپا نہایت بارعب و پروقار۔ عجب دیدہ زیب حسن تھا۔ حضرت عمر کے عہد میں حج کے لیے آئے تو ان کے خادم اسلم کا بیان ہے کہ سارے حج میں معاویہؓ جیسا حسین و جمیل کوئی نہ تھا۔ ہم نے دیکھا: سفید و رعنا رنگ اور حسن کے پیکر ایسے کہ سارے مجمع میں منفرد نظر آتے تھے [۱]۔ فطری طور پر سر کے داہنے اور بائیں جانب بال ہلکے تھے۔ ڈاڑھی گھنی اور چہرے کے حسن کو دوبالا کرتی تھی۔ عمر کے ساتھ ڈاڑھی اور سر بالکل سفید ہو گئے۔ ان پر خضاب کرتے تو دیکھنے والا کہتا کہ سونے جیسے چمک رہے ہیں۔ ہنستے تو اوپر کا لب کچھ اوپر کی طرف کو اٹھ جاتا تھا [۲]۔

۱۔ الزھد لابن المبارک: ۱/ ۲۰۲، بسند صحیح۔

۲۔ تاریخ دمشق: ۵۵۹/ ۶۰، تاریخ اسلام: ۴/ ۳۰۸۔

ازواج واولاد:

حضرت معاویہؓ کی ایک اہلیہ کا نام میسون بنت بحدل تھا۔ یہ شام میں مقیم عرب قبائل میں سب سے طاقتور قبیلہ کلب کے سردار بحدل بن انیف کی بیٹی تھیں۔ ابن کثیر کہتے ہیں کہ بہت حسین وجمیل اور عقل مند خاتون تھیں۔ دین دار، نہایت درجہ حیادار اور پردہ پوش تھیں (البدایہ والنہایہ: ۸/ ۱۵۵)۔

ایک اور اہلیہ حضرت فاختہ بنت قرظۃ بن عمرو تھیں، یہ قریش کے خاندان بنونوفل سے تھیں اور صحابیہ تھیں۔ حضرت معاویہ کے ساتھ اس پہلے بحری غزوے میں قبرص گئی تھیں، جس کی بشارت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دی تھی (الاصابہ: ۸/ ۲۵۷، ۳۷۶)۔ ان کا انتقال ہوا تو ان کے بعد ان کی بہن کنود سے نکاح کیا۔ ان کے علاوہ قبیلۂ بنوکلب سے ہی ایک اور خاتون نائلہ بنت عمارہ بھی ان کے حرم میں تھیں (البدایہ والنہایہ: ۱۱/ ۴۶۲)۔

اولاد میں ایک بیٹے یزید اور ایک بیٹی اَمَۃُ ربِّ المشارق میسون کے بطن سے تھے۔ حضرت فاختہؓ کے بطن سے عبداللہ، عبدالرحمان نامی صاحب زادے تھے، جن میں سے عبدالرحمان صغر سنی ہی میں وفات پا گئے تھے۔ ان کے علاوہ ہند نامی بیٹی بھی تھیں۔ جن کا نکاح عبداللہ بن عامر بن کریز سے ہوا۔ حضرت کنودؓ کے بطن سے رملہ نامی صاحب زادی تھیں، جو حضرت عثمانؓ کے صاحب زادے عمرو سے منسوب تھیں۔ ان کے علاوہ مورخین نے حضرت معاویہ کی اولاد میں عائشہ، عاتکہ اور صفیہ نامی بیٹیوں کا بھی تذکرہ کیا ہے۔

(البدایہ: ۸/ ۱۵۵، نسب قریش: ۱۲۷)

ضمیمہ

حضرت معاویہؓ اوران کے عہد سے متعلق کچھ صحیح اور طاقت ور روایات

ان روایات میں کوئی معنوی ترتیب ملحوظ نہیں رکھی گئی ہے۔ کتاب میں جس ترتیب سے وہ درج ہوئی ہیں، بڑی حدتک اسی ترتیب سے یہاں دے دی گئی ہیں۔ ان کے یکجا مطالعہ سے حضرت معاویہ کی شخصیت وکردار کا جو تصور قائم ہوتا ہے اور حکومت ومعاشرے کی جو تاریخی تصویر بنتی ہے وہ ایک کسوٹی اور معیار ہے۔ جو تاریخی روایات اس شخصیت وکردار اور اس عمومی تصویر سے جوڑ نہیں کھاتیں وہ ناقابل قبول ہیں۔ ان کی اسی اہمیت کی وجہ سے ان کو ہم نے یکجا درج کرنا مناسب ومفید سمجھا ہے۔

جنگ یرموک میں حضرت ابوسفیان کا پرخلوص جہاد:

(۱) حضرت سعید بن مسیبؒ اپنے والد حضرت مسیبؓ سے (جو جنگ یرموک میں شریک تھے) روایت کرتے ہیں کہ جنگ یرموک کے دوران ایک وقت ایسا ہول طاری ہوا کہ کوئی آواز ہی نہیں نکل رہی تھی۔ بس ایک آواز گونج رہی تھی اور وہ حضرت ابوسفیانؓ کی تھی۔ وہ اپنے بیٹے یزید کی جماعت میں کھڑے دعا کر رہے تھے: اواللہ! مدد جلد بھیج دے ''یا نصر اللہ اقترب''۔ مسلمانو! جم کرلڑنا''۔ اسی جنگ میں ان کی ایک آنکھ بھی شہید ہوگئی (الطبقات الکبریٰ، متمم الصحابۃ، الطبقۃ الرابعۃ: ۹۱، بسند صحیح۔ حافظ ابن حجر نے فرمایا ہے کہ ابن سعد اور یعقوب بن سفیان فسوی نے اس کو سند صحیح سے روایت کیا ہے۔ الاصابہ: ۳/ ۳۳۴)۔

ہندؓ کا قبولِ اسلام اور ان کے ایمان کی سچائی کی رسول اللہؐ کی طرف سے تصدیق:

(۲) فتح مکہ کے بعد ہندؓ نے بھی اسلام قبول کیا۔ مکہ کی سربرآوردہ خواتین نے باقاعدہ رسول اللہ ﷺ سے بیعت کی، ان میں ہندؓ بھی تھیں۔ صحیح بخاری میں حضرت ہندؓ کا ایک بہت اہم اعتراف درج ہوا ہے۔ بیعت کے بعد انہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! پہلے میرا حال یہ تھا کہ دنیا میں آپ کی جماعت سے زیادہ کسی کی شکست وخواری پسند نہیں تھی۔ اور خدا کی قسم، اب ایسا انقلاب حال ہوا ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ آپ کی جماعت کا غلبہ محبوب ہو گیا ہے۔

یا رسول الله ما كان على ظهر الارض من اهل خباء احب الىّ ان يذلوا من اهل خبائك،
ثم ما اصبح اليوم على ظهر الارض اهل خباء احب الى ان يعزوا من اهل خبائك۔

حضرت ہندؓ نے اپنے جذبات میں جس تبدیلی کا اظہار کیا، رسول اللہ ﷺ نے اس کی تصدیق فرمائی اور مستقبل میں اِس ایمان اور محبت میں، بتوفیق خداوندی، مزید اضافہ کی خوش خبری دی۔ آپ نے فرمایا: وأيضاً، والذى نفسى بيده'' (صحیح بخاری: ۳۸۲۵، نیز فتح الباری، عمدۃ القاری)۔

رسول اللہؐ کے سکریٹری اور حکومت کے نمائندے:

(۳) مسند احمد کی صحیح روایت میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ معاویہ حضورؐ کے کاتب تھے۔ (حدیث: ۲۶۵۱، ذھبی نے تاریخ الاسلام: ۲/۵۴۰ میں اسے صحیح قرار دیا ہے، البدایہ والنھایہ: ۸/۱۲۶)۔

(۴) حضرت عبداللہ بن عمرو بھی دربار نبوی میں حضرت معاویہؓ کے اس منصب کا تذکرہ کرتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو: المعجم الکبیر للطبرانی، ھیثمی لکھتے ہیں: اس کی سند حسن ہے، مجمع الزوائد: ۹/۳۵۷)۔

(۵) فتح یمن کے بعد حضرت معاویہؓ کو اسلامی حکومت کے خاص نمائندے اور انتظام کار کے طور پر بھیجا گیا۔ قبیلہ کندہ کے سردار حضرت وائل بن حجر کو رسول اللہ ﷺ نے یمن کے اقیال (نوابوں) کا امیر طے فرمایا اور ایک بڑی جاگیر عطا فرمائی۔ اس کی ادائیگی وسپردگی کے لیے حضرت معاویہ کو اپنے فرستادہ اور حکومت کے نمائندہ افسر کے طور پر ساتھ بھیجا (مسند احمد: ۲۷۲۳۹، محقق شعیب ارناؤوط نے اس کی سند حسن قرار دی ہے۔ اس روایت کو ابن حبان (۷۲۰۵) نے بھی اپنی صحیح میں نقل کیا ہے۔ اور اس کی سند کو بھی شیخ شعیب ارناؤوط نے صحیح قرار دیا ہے)۔

(۶) سرداران عرب میں سے دو بڑے سردار عیینہ بن حصن اور اقرع بن حابس رسول اللہ ﷺ سے

مال کے طلب گار رہتے تھے۔ ایک مرتبہ دونوں خدمت نبوی میں حاضر ہوئے اور مال مانگا۔ آپؐ نے ان کو (غالباً کسی جاگیر کا پروانہ عطا کیا، یا اس علاقے کے عامل کو حکم جاری کیا کہ ان کو مال دیا جائے۔ بہر حال جو بھی واقعہ ہو) یہ تحریر حضرت معاویہ سے لکھوائی گئی (مسند احمد: ۱۷۶۲۵، بسند صحیح علی شرط مسلم۔ سنن ابو داوود: ۱۶۲۹)۔

غزوۂ تبوک میں شرکت اور رسول اللہؐ سے خصوصی قرب:

(۷) حضرت معاویہؓ اس غزوے میں نہ صرف شریک تھے، بلکہ روایات شاہد ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مصاحبین خاص میں سے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں فرمانروائے مملکت روم قیصر کا قاصد آیا۔ دربار نبوی میں حاضر ہوا تو مجلسِ خاص میں حضرت معاویہ حضوؐر کے پیچھے کھڑے تھے۔ اس نے قیصر کا خط خدمت میں پیش کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت معاویہؓ سے ہی پڑھوایا (مسند احمد: ۱۶۶۹۳، مسند ابو یعلی: ۱۷۰/۳، مجمع الزوائد: ۲۳۵/۸۔ ہیثمی نے مسند احمد اور مسند ابو یعلی دونوں کے راویوں کو ثقہ قرار دیا ہے۔ ابن کثیر نے (البدایہ والنہایہ: ۲۱/۵) اس کی اسناد کو 'لا باس بہٖ' کسی اعتراض سے پاک قرار دیا ہے)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتی خدمت:

(۸) حضرت معاویہؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذاتی خادم ہونے کا شرف بھی حاصل تھا۔ حدیث کی کتابوں میں اس سلسلے کے متعدد واقعات روایت کئے گئے ہیں۔ صحیحین کی روایت ہے کہ خود فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بال مبارک پہاڑی مروہ کے پاس اپنے ہاتھ سے تراشے ہیں (صحیح بخاری: ۱۷۳۰)۔ اس خاص خدمت کا شرف پانا بتاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان پر کتنی شفقت تھی۔

(۹) وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سواری کے بھی منتظم تھے۔ (الآحاد والمثانی: ۵۱۸، بسند حسن)۔

(۱۰) اس کے علاوہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وضو بھی کرایا کرتے تھے۔ آخر عمر میں یہ خدمت اصلا حضرت ابو ہریرہؓ کے ذمہ تھی۔ لیکن وہ بیمار ہوتے تو حضرت معاویہؓ وضو کا برتن لئے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے پیچھے رہتے تھے، جیسے ہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وضو کا ارادہ فرماتے حضرت معاویہ پانی ڈالنے کی خدمت انجام دیتے۔ (مسند احمد: ۱۶۹۳۳، و مسند ابو یعلی: ۷۳۸۰)۔

اے اللہ! معاویہ کو ہادی و مہدی بنا اور اس کے ذریعہ ہدایت عام فرما:

(۱۱) امام ترمذی اور دیگر بہت سے محدثین نے حضرت عبد الرحمن بن ابی عمیرہؓ صحابی کی روایت ذکر کی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معاویہؓ کو یہ دعا دیتے ہوئے سنا کہ:

اللھم اجعلہ ھادیا مھدیا، واھد بہ۔

اے اللہ! اس کو ہادی ومہدی (یعنی ہدایت یافتہ اور دوسروں کو ہدایت دینے والا) بنا اور اس کے ذریعہ اپنے بندوں کو راہ حق پر چلا۔ (سنن ترمذی: ۳۸۴۲، مسند احمد: ۱۷۸۹۵ بسند صحیح، امام ترمذی کی سند نہایت اعلیٰ درجہ کی ہے)۔

اے اللہ! معاویہ کو قرآن اور حساب کا علم عطا فرما اور اس کو عذاب سے بچا:

(۱۲) حضرت عرباض بن ساریہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے معاویہ کو سحری کھانے کی دعوت یہ کہہ کر دی کہ "آؤ بابرکت کھانا کھالو"۔ پھر میں نے آپ ﷺ کو (اس مبارک وقت میں) معاویہ کے لیے یہ دعا کرتے ہوئے سنا کہ: اللھم علم معاویۃ الکتاب والحساب وقہ العذاب، یعنی اے اللہ! معاویہ کو علم قرآن اور حساب سکھلا دے۔ اور اس کو عذاب سے محفوظ فرما۔ (صحیح ابن خزیمہ: ۱۹۳۸، صحیح ابن حبان بترتیب ابن بلبان: ۷۲۱۰، مسند احمد: ۱۷۱۵۲)۔

حضرت عمرؓ کا خاص تربیت کا معاملہ:

(۱۳) حضرت عمرؓ حج میں تھے، حضرت معاویہ آئے، صورت، شکل اور جسم پر خوش حالی کے آثار تھے۔ حضرت عمرؓ نے دیکھا اور (از راہ تلطّف) حضرت معاویہؓ کی کمر پر ہاتھ رکھا، اور کہا: واہ، واہ۔ اگر اس طرح دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائیاں جمع ہوسکتی ہیں تو تو ہم بڑے خوش نصیب ہیں۔ حضرت معاویہ نے عرض کیا: امیر المومنین میں بتاتا ہوں، ہم ایک ایسے خوش حال ملک میں ہیں جہاں اچھے کھانے بھی دستیاب ہیں اور حمام وغیرہ ہوتے ہیں، (تو اس کا اثر جسم پر پڑتا ہے)۔ حضرت عمر نے فرمایا: جی نہیں، میں بتاتا ہوں اس کا راز یہ ہے کہ تم نے اپنے آپ کو لطیف اور پر تفلّہ غذاؤں کا عادی بنالیا ہے، عیش سے رہتے ہو، ضرورت مند باہر کھڑے انتظار کرتے رہتے ہیں اور تم دیر تک سوئے رہتے ہو۔ اس لیے موٹے تازے ہو گئے ہو۔

اسلم کہتے ہیں کہ ہم نے دیکھا کہ معاویہ نے ایک جوڑا پہنا جس میں حضرت عمر کو کچھ خوش بو محسوس ہوئی، تو حضرت عمر نے پھر ڈانٹا۔ تو حضرت معاویہ نے عرض کیا، آپ شام سے لے کر مکہ تک ہر جگہ مجھے تنگ فرماتے رہتے ہیں۔ مجھے آج اپنے رشتے داروں سے ملنے جانا تھا اس لیے اچھا جوڑا پہن لیا تھا، اسلم کہتے ہیں: میں نے دیکھا کہ معاویہؓ پر شرمندگی کے آثار تھے۔ فوراً اُن کپڑوں کو اتار کر احرام کے کپڑے جن میں حج کیا تھا پھر پہن لیے۔ (الزھد لابن المبارک: ۱/ ۲۰۳، حافظ ابن حجر نے اس کی سند کو قوی قرار دیا ہے۔ الاصابۃ: ٦/ ۱۲۲)۔

نبوی پیشین گوئی کہ عمرؓ کے بعد فتنۂ کبریٰ ظاہر ہوگا:

(۱۳) سیدنا عثمانؓ کے قتل کے دل خراش واقعے اوراس کے نتیجہ میں پیش آنے والے غم انگیز واقعات واختلافات کو صحابۂ کرام ''فتنہ'' کا نام دیا کرتے تھے۔ اس نام کی وجہ دراصل یہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بہت سے مواقع پر صحابہ کو ''عنقریب'' اورانہی کی زندگی میں ایک خطرناک پرجوش سمندر کی طرح متلاطم ''فتنہ'' کے وقوع کی خبردی تھی، یہ روایات متواتر درجے کی ہیں۔ آپؐ نے یہ بھی بتایا تھا کہ عمرؓ کا وجود ہی وہ دروازہ ہے جو اس فتنے کو روکے ہوئے ہے۔ اور یہ دروازہ کھولا نہیں توڑا جائے گا۔ یہ بات خود حضرت عمرؓ اور صحابہ میں فتنوں کے سب سے بڑے واقف وعالم حضرت حذیفہ دونوں یقین کے ساتھ جانتے تھے۔ (صحیح بخاری: ۵۲۵)۔

(۱۴) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بھی خبر دی تھی کہ حضرت عثمان اس وقت حق پر ہوں گے اوران کے مخالفین ظالم اور باطل پرست ہوں گے۔ حضرت عبداللہ بن حوالہؓ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے کہا کہ عن قریب ایک عظیم فتنہ رونما ہوگا۔ پھر آپ نے ایک صاحب کی طرف اشارہ کرکے فرمایا: تم اس وقت اِس شخص کی اتباع کرنا۔ راوی حضرت عبداللہ بن حوالہ فرماتے ہیں کہ وہ شخص حضرت عثمانؓ تھے۔ نیز آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بھی فرمایا تھا کہ اس فتنہ کے وقت یہ اوران کے اصحاب حق وہدایت پر ہوں گے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بھی پیشین گوئی فرمادی تھی کہ حضرت عثمانؓ بھی اپنے عظیم پیش رو سیدنا عمر بن الخطاب کی طرح شہید ہوں گے۔ (بخاری: ۳۶۹۹)۔

شہادت عثمانؓ کے سلسلے کی ایک بہت اہم روایت:

(۱۵) محدث بزار، اسحاق ابن راہویہ اورابن ابی شیبہ اپنی متصل صحیح سندوں سے بیان کرتے ہیں کہ سیدنا عثمانؓ کی باتوں سے مطمئن ہوکے بصرہ، کوفہ اورمصر کے باغی اپنے اپنے راستوں پر روانہ ہوگئے۔ ایک عجیب واقعہ یہ ہوتا ہے کہ مصری قافلہ کے سامنے ایک مشتبہ اونٹ سوار اس طرح آتا ہے کہ بار بار سامنے قریب آتا ہے اور بار بار دور چلا جاتا ہے، پھر سامنے آتا ہے پھر دور بھاگ جاتا ہے، (گویا وہ ان سے کہتا ہے کہ مجھے پکڑو)۔ لوگوں نے پکڑ کر اس کی تلاشی لی تو پایا کہ اس کے پاس (حضرت عثمان کی طرف سے مصر کے گورنر کے نام) ایک خط ہے جس پر حضرت عثمانؓ کی مہر ہے۔ اوراس میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ اس وفد کے فلاں فلاں سرداروں کو پہنچتے ہی قتل کردیا جائے۔۔۔ بس پھر کیا تھا؟ مصری خط لیے مدینہ میں آدھمکے۔ اور ساتھ ہی بصرہ کی جماعت بھی آگئی اور کوفہ والی بھی آگئی۔ اوراب ان کے تیور نہایت خشم ناک تھے۔ اب وہ صاف کہتے تھے کہ عثمان نے ہمارے ساتھ غداری کی ہے اب ہم اس کو قتل کرکے ہی مانیں گے۔ معاذ اللہ۔

سب سے پہلے یہ لوگ حضرت علیؓ کے پاس گئے اوران کو یہ خط دکھایا اوران سے چاہا کہ وہ اب ان کا ساتھ دیں۔انھوں نے انکار کیا تو انھوں نے حضرت علیؓ سے پوچھا کہ یہ بتایئے کہ پھر آپ نے ہمیں بغاوت کے لیے خط کیوں لکھے تھے؟ حضرت علیؓ نے قسم کھائی کہ میں نے ایسا کوئی خط نہیں لکھا تو وہ لوگ آپس میں کہنے لگے کہ ''لو! یہ ہیں وہ، جن کو خلیفہ بنانے کے لیے تم لوگ لڑنے آئے ہو!!''۔(اس جملے سے بھی پتہ چلتا ہے کہ لوگوں کو حضرت علیؓ کو خلیفہ بنانے کے نام پر بےوقوف بنایا جارہا تھا)۔۔۔باغی یہی خط لیے حضرت عثمانؓ کے پاس پہنچے تو انھوں نے قسم کھا کے فرمایا: یہ صاف جھوٹا خط ہے۔اور مہر نقلی بنائی جاسکتی ہے۔(مسند بزار: ۲/۲ ۴، بسند صحیح، مصنف ابن ابی شیبہ: ۷/ ۵۲۰ بسند صحیح، نیز مسند اسحاق بن راھویہ بحوالہ المطالب العالیہ: ۴۳۷۲، ابن حجر کہتے ہیں: یہ ثقات کی متصل سند ہے)۔یہ روایت بتاتی ہے کہ اس بغاوت کے پیچھے ایک بڑی زبردست خفیہ سازش کام کررہی تھی۔

قاتلان عثمان کی بدانجامی:

(۱۶) عمرہ بنت قیس عدویہ، حضرت عائشہ کی شاگرد تھیں، بصرے ہی کی رہنے والی تھیں، کہتی ہیں کہ میں نے وہ مصحف دیکھا جس میں تلاوت کرتے ہوئے حضرت عثمان شہید ہوئے۔میں نے دیکھا کہ ان کا خون اس آیت پر گرا تھا ''فسیکفیکھم اللہ وھو السمیع العلیم'' (ترجمہ: تمہاری طرف سے اللہ ان (کو بدلہ دینے) کے لیے کافی ہے۔اور وہ بہت سننے اور دیکھنے والا ہے)۔یہ گویا غیبی اشارہ تھا کہ قاتلان عثمان کو سزا ضرور ملے گی۔عمرہ کہتی ہیں: کہ ایسا ہی ہوا، ان میں سے کوئی ڈھنگ کی موت نہیں مرا۔یعنی سب قتل کیے گئے۔(فضائل الصحابۃ: ۱/ ۵۰۱، الزھد لابن حنبل: ۱۰۵، بسند حسن)۔

قاتلانِ عثمان پر حضرت علیؓ کی لعنت:

(۱۷) حضرت علیؓ کے صاحب زادے محمد ابن الحنفیۃ قصہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن میں حضرت عثمانؓ پر کچھ نقد کررہا تھا، کچھ تجاوز ہو گیا، تو حضرت عبداللہ بن عباسؓ (گویا ٹوکنے کے لیے) میری طرف متوجہ ہوئے۔میں نے عرض کیا: جنگ جمل کا واقعہ یاد ہے؟ جب میں ابا جی (یعنی حضرت علیؓ) کی ایک جانب اور آپ دوسری جانب تھے کہ زور کی آوازیں آئیں، ابا جی نے کسی کو بھیجا کہ پتہ کرے کہ کیا بات ہے؟ پتہ چلا کہ حضرت عائشہ میدان میں کھڑی بددعا فرمارہی ہیں: اے اللہ! قاتلان عثمانِ پر لعنت فرما۔تو ابا جی (یعنی حضرت علیؓ) نے بھی ہاتھ اٹھا کر اس دعا میں شرکت کی اور بآواز بلند دعا فرمائی: اے اللہ قاتلان عثمان بحر و بر اور دشت و جبل میں جہاں ہوں، ان پر لعنت فرما (فضائل الصحابۃ: ۷۳۳، بسند صحیح۔نیز مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۷۷۹۳)۔

جنگ پر سب ہی کو افسوس تھا:

(۱۸) صحیح سند سے ثابت ہے کہ جنگ جمل کے دوران حضرت علی پر ایسا غم تھا کہ حضرت حسن سے بڑے سوز سے فرماتے: کاش تمہارا باپ آج سے بیس سال پہلے مر گیا ہوتا۔ حضرت حسن نے عرض کیا: میں تو پہلے ہی آپ کو روکتا تھا۔ حضرت علی نے فرمایا: مجھے اندازہ نہیں تھا کہ بات یہاں تک پہنچ جائے گی۔ (السنۃ لعبداللہ بن احمد: ۲/۵۶۶، ۵۸۹۔ بسند صحیح۔ ومصنف ابن ابی شیبہ: ۷/۵۴۵)

فریق مخالف سے محبت اور اس کے لیے دعا:

(۱۹) جنگ ختم ہوئی، سیدنا علیؓ میدان میں نکلے۔ حضرت طلحہ کی نعش پر پہنچے تو ان کو بٹھایا، خود ہاتھ سے مٹی صاف کرتے جاتے تھے اور روتے جاتے تھے، ان کے حق میں دعائے رحمت کی اور کہنے لگے: کاش آج سے بیس سال پہلے ہی مجھ کو موت آ گئی ہوتی۔ (طبرانی: ۱/۱۱۳، ہیثمی نے اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے، مجمع الزوائد: ۹/۱۵۰)۔

(۲۰) میدان میں حضرت طلحہ کے صاحبزادے محمد کی لاش دیکھ کر پاس بیٹھ گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا، اور کہا: اللہ اس پر رحم کرے۔ خدا کی قسم بڑا نیک جوان تھا۔ (المستدرک: ۳/۱۱۱، الفتن لنعیم: ۱/۱۸۱ بسند صحیح)۔

(۲۱) سیدنا علیؓ کے گھر میں بھی سخت رنج والم کا ماحول تھا، اہل خانہ اور صاحب زادیاں رو رہی تھیں۔ اسی اثنا میں سیدنا علیؓ تشریف لے آئے اور ان کو رونے سے منع فرمایا۔ نیز کہا کہ ہم لوگ اس آیت کے ان شاء اللہ مصداق ہیں:

ونزعنا ما فی صدورھم من غل إخوانا علی سرر متقابلین (سورہ حجر: ۴۷)۔

ان کے دلوں میں جو کچھ رنجش ایک دوسرے سے ہوگی ہم جنت میں اسے نکال پھینکیں گے، وہ بھائی بھائی بن کر آمنے سامنے اونچی نشستوں پر بیٹھنے ہوں گے۔

پھر کئی بار پورے اعتماد و یقین سے بھرے لہجے میں فرمایا: اس کے مصداق ہم نہ ہوں گے تو کون ہوگا؟ ہم نہ ہوں گے تو کون ہوگا؟ ہم نہ ہوں گے تو کون ہوگا؟ (مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۷۷۹۵، بسند حسن)۔

(۲۲) حضرت طلحہؓ کے ایک دوسرے بیٹے عمر کچھ عرصہ بعد ملنے آئے تو آپؓ نے ان کا بڑی گرم جوش محبت سے استقبال کیا اور یہی آیت پڑھ کر کہا: میں اور تمہارے والد طلحہؓ ان شاء اللہ ان لوگوں میں سے ہوں گے جن کے بارے میں اللہ کا یہ وعدہ ہے۔ اس کے بعد حضرت طلحہ کے اہل خانہ کا حال پوچھتے رہے۔ حضرت علیؓ کے ساتھ بیٹھے کسی جاہل نے کچھ بری بات کہی، تو سخت غصہ ہوئے فرمایا: نکل جا منحوس! اگر میں اور طلحہ اس آیت کے مصداق نہیں ہوں گے تو کون ہوگا؟ اس کے بعد عمر بن طلحہ سے بانداز شفقت فرمایا: بھتیجے اگر کوئی کام ہو تو مجھ سے بتانا''۔ (مستدرک: ۳/۴۲۴، حاکم اور ذہبی دونوں نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے)۔

ام المومنین حضرت عائشہ کا اکرام وحق شناسی:

(۲۳) حضرت علی نے جنگ تھمتے ہی حضرت عمار بن یاسرؓ اور حضرت عبداللہ بن بدیلؓ کو حضرت عائشہ کی خدمت میں بھیجا۔ ابھی وہ اونٹ پر ہی تھیں، وہ اُن کے کجاوہ کو اونٹ سے اتار کر لائے۔ پھر ان کو عبداللہ بن بدیلؓ کے خیمے میں بھجوایا، یہ ایک بڑے باحیثیت شخص تھے، ان کے خیمہ میں خدمت کرنے والے اور سامان راحت موجود تھے۔ چنانچہ خواتین نے ان کی خدمت کی۔ (مصنف ابن ابی شیبہ: ۵۴۵/۷ بسند صحیح، فتح الباری: ۵۷/۱۱)۔

حضرت عثمان کے خلاف باغیوں کو رسول اللہؐ نے منافق قرار دیا تھا:

(۲۴) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عثمانؓ سے فرمایا تھا کہ اللہ تم کو خلافت کی قباء پہنائے گا۔ اگر ''منافقین'' تم کو اس سے دستبردار ہونے پر مجبور کریں تو تم دستبردار نہ ہونا، یہاں تک کہ مجھ سے آملنا (یعنی شہید ہوجانا)۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عثمان سے یہ بات تاکیداً تین مرتبہ فرمائی۔ باغیوں کو منافق کہے جانے سے حضرت معاویہؓ کو اپنے موقف کی ایسی تائید نظر آئی کہ انہوں نے حضرت عائشہ سے درخواست کی کہ وہ یہ حدیث ان کو لکھ کر بھیج دیں۔ سو انہوں نے پورا واقعہ لکھ کر ان کو بھیجا (مسند احمد: ۲۴۵۶۶، بسند صحیح)۔

(۲۵) حضرت معاویہؓ کے یہاں کسی فوجی مرکز میں اعیان حکومت کا اجلاس منعقد ہوا، بہت سے لوگوں نے گفتگو کی۔ سب سے اخیر میں حضرت مرّہ بن کعبؓ کھڑے ہوئے اور کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک حدیث سنی ہے۔ ہم چند لوگ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مستقبل قریب میں آنے والے ایک فتنے کا ذکر فرمایا اور حضرت عثمانؓ کے بارے میں فرمایا کہ یہ اور ان کے ساتھی اس وقت حق پر ہوں گے۔ یہ سن کر مجلس میں موجود حضرت عبداللہ بن حوالہ ازدیؓ نے حضرت مرہؓ سے پوچھا: تم نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ حدیث سنی ہے؟ پھر کھڑے ہو کر کہا: میں گواہی دیتا ہوں کہ میں بھی اس موقعہ پر موجود تھا۔ حضرت معاویہؓ نے یہ سمجھا کہ وہ اور ان کی جماعت حضرت عثمانؓ کے ساتھی ہیں۔ اور اس حدیث کو اپنے برحق ہونے کی دلیل سمجھا۔ (مسند احمد ۱۸۰۶۷۔ ۱۸۰۶۸، مستدرک حاکم: ۱۰۹/۳ اور حاکم اور ذھبی نے اس کو بخاری ومسلم کی شرط پر قرار دیا ہے۔ نیز اس واقعہ کو ابن حوالہؓ کے حوالہ سے امام احمد نے بھی بسند صحیح روایت کیا ہے، مسند: ۱۷۰۰۴)۔

حضرت معاویہؓ حضرت علیؓ کو افضل اور خلافت کا مستحق جانتے تھے:

(۲۶) مشہور عالم تابعی ابو مسلم خولانی (اور ان کے ساتھ علماء کی ایک جماعت) حضرت معاویہ کے پاس آئے اور ان سے دریافت کیا کہ حضرت آپ حضرت علی کے مقابل میں خلافت کے مدعی ہیں، یا اپنے کو ان

کے مساوی درجہ کا خیال کرتے ہیں؟ حضرت معاویہ نے کہا کہ نہیں! نہیں! وہ مجھ سے افضل بھی ہیں اور خلافت وامامت بھی ان کا ہی حق ہے۔لیکن یہ بتاؤ کہ حضرت عثمانؓ کا ظلماً قتل ہوا؟ میں ان کا چچازاد اور ان کے قصاص کے مطالبہ کا ذمہ دار ہوں۔تم بس اتنا کروا دو کہ: حضرت علیؓ قاتلین عثمان کو ہمارے حوالہ کر دیں، میں ان کو فوراً بیعت دے دوں گا۔(تاریخ دمشق: ۵۹/ ۱۳۲، بحوالہ یحییٰ بن سلیمان جعفی، حافظ ابن حجر نے اس کی سند کو جید قرار دیا ہے، فتح الباری: ۱۳/ ۸۶)۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ بھی مطالبۂ قصاص کو صحیح سمجھتے تھے:

(۲۷) حضرت عبداللہ بن عباسؓ (جو کہ حضرت علی کے اہم ساتھی اور ان کے موقف کے داعی وحامی تھے) عوامی خطبے میں فرماتے تھے کہ اگر حضرت عثمانؓ کے قاتلوں کو سزا دینے کا مطالبہ نہ کیا جاتا تو آسمان سے پتھر برس پڑتے (طبقات ابن سعد: ۳/ ۵۸، معجم کبیر طبرانی: ۱/ ۸۴، بسند حسن)۔

اکیلے حضرت معاویہؓ نے بیعت سے انکار نہیں کیا تھا:

(۲۸) مصنف ابن ابی شیبہ میں نہایت صحیح سند سے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا یہ بیان نقل کیا گیا ہے کہ: علیؓ جب بیعت سے فارغ ہوئے تو میرے گھر تشریف لائے۔کہا کہ شام میں تم کو محبوبیت حاصل ہے، میں تم کو وہاں کا گورنر بناتا ہوں۔میں نے پہلے تو اپنے اور ان کی گوناگوں رشتوں کا ذکر کیا۔پھر عرض کیا کہ (گورنری تو بعد کی بات ہے، بحالت موجودہ تو) میں اللہ کی قسم، آپ کی بیعت بھی نہیں کروں گا۔علیؓ نے مجھ سے کچھ نہیں کہا اور واپس تشریف لے گئے۔اس کے بعد حضرت عبداللہ بن عمرؓ خاموشی سے اپنی سوتیلی والدہ اور سیدنا علیؓ کی صاحب زادی ام کلثومؓ کے پاس گئے اور ان کو بتایا کہ میں مکہ نکل جا رہا ہوں، اور چلے گئے۔(مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۰۶۷۱، ۳۲۵۷۳۔واضح رہے کہ اس روایت کی سند (ایوب عن نافع عن ابن عمر) ان اسانید میں سے ہے جن کو دنیا کی سب سے طاقت ور سند کہا گیا ہے (النکت علیٰ کتاب ابن الصلاح: ۱/ ۲۵۳)۔

جنگ صفین میں صلح کو حضرت علیؓ نے مجبوراً نہیں، اپنی خوشی سے قبول فرمایا تھا:

(۲۹) تاریخی کتابوں کی یہ روایت کہ جنگ صفین میں حضرت علیؓ صلح پر راضی نہیں تھے، اپنے ساتھیوں کے دباؤ کی وجہ سے انہوں نے صلح قبول کی تھی، غلط ہے۔صفین میں صلح کی جو صحیح اور قوی ومستند روایت بخاری اور مسند احمد وغیرہ کتب حدیث میں ہے، وہ بتاتی ہے کہ سیدنا علیؓ نے حضرت معاویہؓ کی پیشکش کو بخوشی قبول ہی نہیں

کیا، بلکہ پسند فرمایا۔ تابعی بزرگ ابووائل شقیق بن سلمہ صفین میں حضرت علیؓ کی جانب سے شریک تھے۔ بخاری کی روایت کے مطابق، وہ بیان کرتے ہیں کہ شامی گروہ نے تحکیم پر صلح کی اپیل کرتے ہوئے سورۂ آل عمران آیت: ۲۳ پڑھی:

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِنَ الْكِتَابِ يُدْعَوْنَ إِلَى كِتَابِ اللَّهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلَّى فَرِيقٌ مِنْهُمْ وَهُمْ مُعْرِضُونَ۔

کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب (الہی) کا کچھ حصہ ملا تھا، اُن کو اللہ کی کتاب کی طرف بلایا جاتا ہے کہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے، اس کے باوجود ان میں سے ایک گروہ منہ موڑ کر چل دیتا ہے؟

سیدنا حضرت علیؓ نے جیسے ہی قرآن پر صلح کی یہ ندا سنی؛ فوراً کہا: ضرور، اور جنگ روک دی (صحیح بخاری: ۴۸۴۴)۔

یہ بخاری کی روایت ہے۔ کچھ تفصیل سے مسند احمد و سنن النسائی الکبریٰ، میں یہی روایت بخاری کی ہی سند سے آئی ہے، لہٰذا اُسی درجہ کی صحیح ہے۔ اس میں ہے کہ جب شامی لشکر میں بہت لوگ مارے گئے تو انہوں نے ایک پہاڑی پر چڑھ کر پناہ لی۔ عمرو بن العاصؓ نے معاویہؓ سے کہا کہ علیؓ کے پاس ایک قرآن مجید لے کر کسی کو بھیجو اور کہو اِس پر ہم صلح کر لیتے ہیں۔ مجھے یقین ہے علیؓ تمہاری یہ بات رد نہیں کریں گے، "أَرْسِلْ إِلَى عَلِيٍّ بِمُصْحَفٍ، وَادْعُهُ إِلَى كِتَابِ اللَّهِ، فَإِنَّهُ لَنْ يَأْبَى عَلَيْكَ" ایک قاصد حضرت علیؓ کے پاس قرآن مجید کا نسخہ لے کر آیا اور قرآن کی آیات پڑھ کر تحکیم کی دعوت دی۔ "بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ كِتَابُ اللَّهِ"۔ حضرت علی نے سنتے ہی فرمایا "نَعَمْ أَنَا أَوْلَى بِذَلِكَ، بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ كِتَابُ اللَّهِ"، ہاں! تم لوگوں سے زیادہ مجھ پر حق ہے کہ صلح قبول کروں۔ ہمارے درمیان قرآن فیصلہ کرے گا۔ اور تحکیم کی پیشکش قبول فرمالی (مسند احمد: ۱۵۹۷۵، وسنن نسائی الکبریٰ: ۱۱۴۴۰)۔ ابووائل کہتے ہیں کہ خوارج نے، جن کو ہم اس وقت قرّاء کہتے تھے، اس پر اعتراض کیا، تو حضرت سہل بن حنیفؓ نے ان کی فہمائش کے لیے ایک تقریر کی اور تحکیم کی تائید فرماتے ہوئے اس صلح کو صلح حدیبیہ کی مبارک صلح سے تشبیہ دی۔ (صحیح بخاری: ۴۸۴۴۔ مسند احمد: ۱۵۹۷۵، وسنن نسائی الکبریٰ: ۱۱۴۴۰، نیز مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۷۹۱۴، تینوں کتابوں کی سندیں صحیح بخاری کی روایت والی ہی ہیں)۔

حضرت عمرو بن العاص کے فضائل:

حضرت عمرو بن العاصؓ کو متعدد تاریخی روایات میں ایک غدار و مکار، فریبی اور دولت دنیا کے حریص کے کردار میں پیش کر کے سخت ظلم و افترا پردازی کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ یہ بالکل بے اصل اور کذاب راویوں کی روایات ہیں اور صحیح روایات و ثابت حقائق کے خلاف ہیں۔

(۳۰) صحیح مسلم میں ہے کہ انہوں نے حبشہ میں اسلام لانے کا فیصلہ کیا۔ وہاں سے وہ سیدھے خدمت نبوی میں حاضر ہوئے، اسی وقت ان کے اخلاص کا یہ حال بیان ہوا ہے کہ انہوں نے آں حضرت ﷺ سے کہا: میرے جاہلیت کے گناہوں کی معافی کیسے ہوگی؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا اسلام لانے کے بعد پچھلے گناہ نہیں بچتے۔ رسول اللہ ﷺ کی تعظیم کا یہ حال تھا کہ اسلام لانے کے بعد کبھی نظر بھر کے چہرۂ انور نہیں دیکھ سکے (صحیح مسلم: ۱۲۱)۔

(۳۱) حضور ﷺ کے نزدیک وہ "رجل صالح" تھے، آپؐ نے ان کو سریۂ ذات السلاسل میں ۳۰۰ مہاجرین وانصار کا امیر بنایا۔ اور جب بھیجتے وقت آں حضورؐ نے مال غنیمت کا وعدہ فرمایا تو انہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول میں مال کے لیے مسلمان نہیں ہوا، میں تو آپ کی اور اسلام کی محبت میں مسلمان ہوا ہوں۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا: يَا عَمْرُو! نِعِمَّا بِالْمَالِ الصَّالِحِ لِلرَّجُلِ الصَّالِحِ۔ یعنی اللہ اگر کسی نیک بندے کو حلال مال دے تو وہ بڑی نعمت ہے (مستدرک حاکم: ۲۱۳۰، بسند صحیح، حاکم اور ذہبی نے اس کو امام مسلم کی شرط پر قرار دیا ہے)۔

(۳۲) امام احمد نے کئی حسن اسانید سے حضور اکرم ﷺ کی یہ بشارت نقل فرمائی ہے کہ عمرو بن العاص اور ان کے بھائی ہشام مومن بندے ہیں (مسند احمد حدیث نمبر: ۸۶۴۱، ۸۶۴۲، محقق شعیب ارناوط نے اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے۔ ہیثمی: ۹/ ۳۵۲ نے طبرانی کی معجم کبیر اور مسند احمد کی سند کو حسن قرار دیا ہے)۔

(۳۳) ایک مرتبہ صحابہ کو مدینہ پر شب خون کا خطرہ محسوس ہوا۔ سب لوگ پریشان ہو گئے۔ سالم مولیٰ ابی حذیفہؓ اور عمرو بن العاصؓ نے تلوار لی اور مسجد میں آ گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کو جمع کیا اور کہا: ایسے وقت تم کو ان دونوں مردان مومن کی طرح اللہ و رسول کی طرف رجوع کرنا (یعنی مسجد نبی میں آ کر دعا میں مشغول ہو جانا) چاہیے تھا۔ (مسند احمد حدیث: ۱۷۸۱۰، صحیح ابن حبان حدیث: ۷۰۹۲۔ حافظ ابن حجر نے اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے، الاصابۃ: ۴/ ۵۴۰)۔

(۳۴) مستدرک حاکم میں صحیح سند سے مروی ہے کہ زہیر بن قیس بلوی کہتے ہیں کہ حضرت علقمہ بن رمثہؓ نے سنایا کہ آں حضرت ﷺ نے عمرو بن العاصؓ کو ایک مہم پر بحرین بھیجا۔ اور خود آپ ﷺ ایک سفر پر روانہ ہو گئے۔ ایک مقام پر جا کر آرام فرمایا، تھوڑی سی نیند کے بعد آپؐ بیدار ہوئے اور دعا فرمائی: اللہ عمرو پر رحم فرمائے۔ ہم لوگوں نے ایک دوسرے سے پوچھا کہ یہ خوش نصیب عمرو کون سے ہو سکتے ہیں۔ پھر آپ ﷺ کو نیند آ گئی، آنکھ کھلی، تو پھر دعا فرمائی: اللہ عمرو پر رحم فرمائے۔ پھر آنکھ لگ گئی، کچھ دیر بعد آپ اٹھے اور پھر تیسری مرتبہ دعا فرمائی: اللہ عمرو پر رحم فرمائے۔ ہم نے دریافت کیا کہ حضورؐ! کون سے عمرو؟ آپ نے فرمایا عمرو بن العاصؓ۔ ہم نے عرض کیا: اس خصوصی دعا کی وجہ؟ آپ نے فرمایا: میں نے لوگوں سے اللہ کے راستے میں مال

دینے کو کہا تو عمرو بہت سا مال لائے، میں نے پوچھا: کہاں سے اتنا لائے؟ کہنے لگے: اللہ نے دیا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: عمرو نے سچ کہا۔ اور عمرو کے لیے اللہ کے پاس خیرِ کثیر ہے"۔ زہیر بن قیسؓ، جو خود صحابی ہیں، فرماتے ہیں: جب فتنہ ہوا (یعنی حضرت علی اور حضرت معاویہ کے درمیان جنگ) ہوئی تو میں نے سوچا کہ میں اِس شخص کے ساتھ رہوں گا جس کے بارے میں حضور ﷺ نے یہ تعریفی ارشادات اور دعائیہ کلمات فرمائے تھے۔ پس میں ان ہی کے ساتھ رہا (مستدرک حاکم: ۵۹۱۶، حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے اور ذہبی نے بھی۔ نیز معجم کبیر طبرانی: ۱۸/۵ ہیثمی نے طبرانی کی سند کو حسن قرار دیا ہے، مجمع الزوائد: ۹/ ۳۵۲)۔

جنگ صفین میں اکثر صحابہ کا موقف:

صحابہؓ کی اکثریت کی رائے یہ تھی کہ یہ جنگیں وہ "فتنے" ہیں، جن کے واقع ہونے کی خبر رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کو متعدد مواقع پر دی تھی اور وصیت کی تھی کہ وہ اس میں شامل نہ ہوں۔

(۳۵) بسند صحیح ثابت ہے کہ حضرت محمد بن سیرین تابعی فرماتے تھے:

هَاجَتِ الْفِتْنَةُ وَأَصْحَابُ رَسُولِ اللهِ صلى الله عَلَيْهِ وَسلم عشرَةُ آلَافٍ فَمَا خَفَّ فِيهَا مِنْهُم مائَة بل لم يبلغُوا ثَلَاثِين۔ (العلل ومعرفۃ الرجال لاحمد، روایۃ عبداللہ: ۳/ ۱۸۲، بسند صحیح۔ نیز ملاحظہ ہو المصنف: حدیث نمبر: ۲۰۷۳۵، اس کی سند بھی صحیح ہے: عبدالرزاق عن معمر عن ایوب، تاریخ مدینہ: ۴/ ۱۲۷، بسندین صحیحین)۔

فتنہ کی جنگ (یعنی صفین) بھڑکی۔ اس وقت تقریبا دس ہزار (بعض روایتوں میں ہے: دسیوں ہزار) صحابہ دنیا میں موجود تھے۔ مگر ان میں سے سو بھی، بلکہ تیس نے بھی اس میں حصہ نہیں لیا۔

ان جنگوں میں شریک صحابہ کی تعداد و تناسب کے سلسلے میں یہ صحیح ترین روایت ہے۔ امام احمد اس کے راوی ہیں۔ ان کی سند ہے: اسماعیل عن ایوب عن محمد بن سیرین۔ امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں یہ دنیا کی سب سے صحیح اسانید میں سے ہے۔ (منہاج السنۃ: ۶/ ۲۳۶)

(۳۶) حضرت ابو ہریرہؓ انہی غیر جانب دار رہنے والے لوگوں میں تھے۔ صحیح بخاری میں ان کی بیان کردہ یہ حدیث آئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم سے فرمایا تھا: جلد ہی فتنے آئیں گے، جن میں بیٹھ رہنے والا کھڑے ہونے والے سے بہتر ہوگا..... جس کو کوئی چھپنے کی جگہ مل جائے وہ چھپ کے بیٹھ جائے (صحیح بخاری: ۳۶۰۱، مستدرک: ۸۳۳۱، ذہبی نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے)۔

(۳۷) حضرت ابو بکرہ ثقفیؓ بھی انہی صحابہ میں تھے۔ صحیح مسلم میں انؓ کی روایت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ نے اسی موضوع پر ایک خطبہ ارشاد فرمایا: جس میں پیشین گوئی فرمائی کہ جلد فتنہ کی

جنگیں آئیں گی۔اور تاکید فرمائی کہ ان میں شرکت مت کرنا۔

إنها ستكون فتن: ألا! ثم تكون فتنة القاعد فيها خير من الماشي فيها، والماشي فيها خير من الساعي إليها. ألا! فإذا نزلت أو وقعت، فمن كان له إبل فليلحق بإبله، ومن كانت له غنم فليلحق بغنمه، ومن كانت له أرض فليلحق بأرضه، قال فقال رجل: يا رسول الله أرأيت من لم يكن له إبل ولا غنم ولا أرض؟ قال: يعمد إلى سيفه فيدق على حده بحجر، ثم لينج إن استطاع النجاء (صحیح مسلم:۲۸۸۷)۔

جلد فتنہ کی جنگیں آئیں گی۔خبردار!ان میں بیٹھ رہنے والے سے چلنے والے شخص کی آزمائش کم ہوگی۔ ان میں سست روی سے چلنے والا دوڑنے والے اور سرگرم رہنے والے سے بہتر ہوگا۔سن لو!جب یہ جنگیں ہوں تو جس کسی کے پاس بکری یا اونٹ ہوں یا زمینیں ہوں تو شہر چھوڑ کر کسی گاؤں دیہات میں جا بسے تاکہ ان جنگوں میں نہ پڑے۔کسی نے پوچھا کہ اگر کسی کے پاس اونٹ،بکری،زمین (یعنی گاؤں میں رہ کر گزربسر کا کوئی انتظام) نہ ہو تو؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ یہ کرے کہ اپنی تلوار توڑ ڈالے (یعنی جنگ میں حصہ نہ لے) اور اپنی جان بچا سکے تو ان فتنوں سے جان بچا کے بھاگ لے۔

(۳۸) حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فتنوں کی آگ سے بچنے کے لیے مدینہ چھوڑ کر گاؤں میں رہنے لگے۔لوگوں نے ان کو کسی کا ساتھ دینے کی ترغیب دیتے ہوئے پوچھا کہ آپ اس مقام وحیثیت کے شخص ہیں، پھر امت کے اس معاملے میں کنارہ کش ہو کر کیوں بیٹھ رہے ہیں؟ کہنے لگے: میں اس وقت تک اس جنگ میں حصہ نہیں لوں گا، جب تک مجھے کوئی ایسی تلوار نہیں لا دو گے جس کی دو آنکھیں اور زبان ہوں، جو مجھے بتا دے کہ یہ کافر ہے اور یہ مومن''۔(مصنف عبدالرزاق:۲۰۷۳۶،بسند صحیح۔معجم طبرانی بسند ثقات،مجمع الزوائد:۷/۲۹۹)۔

(۳۹) جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جنگ (جمل) کی تیاریاں کیں تو کوفہ کے گورنر حضرت ابوموسیٰ اشعری نے اس میں خلیفہ کی اطاعت ضروری نہیں سمجھی۔حضرت ابوموسیٰ بڑی سرگرمی سے وہاں کے لوگوں کو اس ''فتنہ'' کی جنگ میں شرکت سے روکتے تھے۔(مصنف ابن ابی شیبہ حدیث: ۳۷۷۰۳،بسند صحیح، والفتن لنعیم بن حماد بسند صحیح صفحہ:٦٦۔ نیز ملاحظہ ہو البدایہ والنہایہ: ۷/۲۶۳) اور لوگوں کو اس سلسلے کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات سناتے تھے۔حضرت ابوموسیٰ بیان کرتے تھے کہ ''فتنہ'' کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اپنے اسلحے توڑ دینا۔اور آدم علیہ السلام کے بیٹے کی طرح مقتول ہو جانا برداشت کر لینا مگر قتل وقتال نہ کرنا۔ (مسند احمد حدیث: ۱۹۶۶۳،سنن ابوداود حدیث: ۴۲۵۹ بسند حسن)۔

(۴۰) اسی طرح حضرت حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ لوگوں کو بتاتے تھے کہ یہ وہی فتنہ کی جنگ ہے،جس سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آگاہ فرمایا اور جس میں شرکت سے منع فرمایا تھا۔حضرت عمران رضی اللہ عنہ دور دراز قبائل میں اپنے

قاصد بھیجا کرتے تھے کہ وہ لوگوں کو کسی بھی جانب سے جنگ میں شرکت سے روکیں۔ وہ اعلان کرواتے تھے کہ لوگو! میں اس جنگ میں کسی طرف سے بھی حصہ لینے سے اس کو بہتر سمجھتا ہوں کہ ایک کالا حبشی غلام ہو جاؤں جو پہاڑوں پر بکری چراتا پھرے۔ وہ یہ بھی فتویٰ دیتے تھے کہ فتنہ و خانہ جنگی کے اس دور میں اسلحہ تک بیچنا جائز نہیں ہے۔(مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۷۱۱۷، بسند صحیح، معجم کبیر طبرانی، بروایت ثقات، مجمع الزوائد: ۷/ ۲۹۹۔ صحیح بخاری (معلقا) باب بیع السلاح فی الفتنۃ ۔ فتح الباری: ۴/ ۳۲۳)۔

(۴۱) یہی رویہ حضرت ابوبکرہؓ کا تھا، وہ بھی لوگوں کو اس جنگ میں شرکت سے روکتے تھے۔ احنف بن قیس بنوتمیم کے سردار اور صفین میں حضرت علیؓ کے سپہ سالاروں میں سے تھے۔ کہتے ہیں کہ مجھے کوفہ میں حضرت ابوبکرہؓ ملے۔ پوچھا: کدھر کا قصد ہے؟ میں نے کہا: حضرت علیؓ کا ساتھ دینے جا رہا ہوں۔ انہوں نے کہا واپس جاؤ، پھر انہوں نے اس سلسلے میں ایک حدیث بھی سنائی (صحیح بخاری: ۳۱)۔

(۴۲) حضرت ابوہریرہ بھی لوگوں سے کہتے تھے: سنو! بڑا سیاہ 'فتنہ' آ گیا ہے۔ اس سے محفوظ وہ شخص رہے گا، جو بالکل کنارہ کش رہے گا (مستدرک: ۸۳۳۱، مصنف عبدالرزاق: ۲۰۷۶۲، بسند صحیح)۔

(۴۳) حضرت ابواسید مالک بن ربیعہ ساعدیؓ انصار کے بڑے صحابہ میں سے تھے۔ بدر اور تمام غزوات میں شریک رہے۔ آخر عمر میں نابینا ہو گئے تھے۔ وہ ان جنگوں سے پہلے نابینا ہو جانے پر اللہ کا شکر ادا کیا کرتے تھے۔ (مستدرک: ۶۱۸۹، المعجم الکبیر: ۱۹/ ۲۶۰، نیز ہیثمی نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔ مجمع الزوائد: ۹/ ۳۶۳)۔

(۴۴) اس سلسلے کی ایک اہم شخصیت حضرت محمد بن مسلمہ انصاریؓ بھی تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بدر و احد و تمام جہاد کے مواقع میں شرکت فرما چکے تھے۔ امانت و دیانت کا یہ مقام تھا کہ حضرت عمرؓ نے ان کو اپنے گورنروں کے محاسبہ و جائزہ کی ذمہ داری و منصب دیا تھا۔ وہ بھی ان جنگوں سے مکمل کنارہ کش رہے۔ لوگوں کے نزدیک ان کی علیٰحدگی و کنارہ کشی کی اہمیت اس لیے بہت زیادہ تھی، کہ ان کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے پیشین گوئی فرمائی تھی کہ محمد بن مسلمہ اُس ''فتنہ'' سے محفوظ رہیں گے (جس کے آنے کی خبر آپؐ نے دی تھی اور جو آ کر رہا)۔ اس سے بہت سے لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ ان حالات میں کنارہ کشی و یکسوئی ہی حکم نبوی ہے۔

جب یہ حالات آئے اور لوگوں نے ان کے غیر جانب دار رہنے اور کسی کا ساتھ نہ دینے کی وجہ پوچھی، تو انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے خود اپنے دست مبارک سے مجھے ایک نجرانی تلوار عنایت فرمائی۔ اور فرمایا اس سے اللہ کے راستہ میں جہاد کرنا، لیکن جب دیکھنا کہ خود مسلمانوں میں چھڑ گئی ہے تو اس کو کسی پتھر پر دے مارنا اور گھر میں خاموش بیٹھ جانا۔ اس لیے میں تو رسول اللہ ﷺ کے حکم پر عمل پیرا ہوں۔(معجم کبیر:

۲/۶ ۳۲بسند ثقات۔ معجم اوسط: ۵۷ ۲۳، بسند ثقات۔ حضرت محمد بن مسلمہ سے اس سلسلے میں متعدد روایات صحیح سند سے آئی ہیں۔ ملاحظہ ہو: مجمع الزوائد ۷/ ۳۰۱۔ ۳۰۵)۔

(۴۵) سنن ابوداوود، مستدرک حاکم اور دیگر کتب حدیث میں وارد صحیح روایت کے مطابق حضرت حذیفہ بن الیمانؓ فرماتے تھے کہ:

مَا أَحَدٌ مِنَ النَّاسِ تُدْرِكُهُ الْفِتْنَةُ، إِلَّا أَنَا أَخَافُهَا عَلَيْهِ، إِلَّا مُحَمَّدُ بْنُ مَسْلَمَةَ، فَإِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: لَا تَضُرُّكَ الْفِتْنَةُ۔

یعنی مجھے ہر شخص کے فتنوں سے متاثر وآلودہ ہونے کا خطرہ ہوسکتا ہے مگر محمد بن مسلمہ کے بارے میں نہیں۔ اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ محمد بن مسلمہ ''فتنہ'' سے محفوظ رہیں گے۔ (سنن ابی داوود: ۴۶۶۳، بسند صحیح۔ مصنف ابن ابی شیبہ: ۸/ ۲۳۷ ۳بسند صحیح۔ نیز مستدرک حاکم: ۷ ۵۸۳ اور ذہبی نے اس کو صحیح ٹھیرایا ہے)۔

(۴۶) مذکورہ بالا حدیث کو حضرت حذیفہ سے سننے کے بعد کچھ علماء ایک قافلہ کے ساتھ مدینہ آرہے تھے۔ ربذہ کے مقام پر انہوں نے دیکھا کہ خیمہ لگائے کوئی بزرگ قیام پذیر ہیں۔ پتہ چلا یہ بزرگ صحابی رسول حضرت محمد بن مسلمہؓ ہیں۔ اس خانہ جنگی کے دوران وہ مقام ربذہ کی طرف ہجرت کر گئے تھے۔ ان لوگوں نے پوچھا اب کیا ہوگیا؟ آپ ان حالات میں امت کی اصلاح اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر تک کو ترک کر کے گوشہ نشیں ہوگئے ہیں؟ کہنے لگے جب تک یہ انتشار وخانہ جنگی ختم نہیں ہوتی میں ایسے ہی لوگوں سے دور کسی گاؤں میں رہوں گا (مستدرک حاکم: ۷ ۵۸۳ حاکم اور ذہبی نے اس کو صحیح ٹھیرایا ہے)۔

(۴۷) بغوی نے بسند حسن روایت کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلامؓ خود بھی نہیں نکلے اور حضرت علیؓ کو بھی (جنگ کے ارادے سے) مدینہ سے نکلنے سے روکا، تو حضرت علیؓ نے فرمایا: ان کو کوئی کچھ نہ کہے، 'إنه منا رجل صالح' یہ ہماری جماعت کے نیک آدمی ہیں۔ (معجم الصحابہ للبغوی: ۴/ ۱۰۴، مکتبہ دار البیان، ۱۴۲۱ھ ۲۰۰۰ء۔ حافظ ابن حجر نے اس کی سند کو جید قرار دیا ہے، الاصابہ: ۴/ ۱۰۳۔ ۱۰۴۔ اتحاف الخیرۃ: ۸/ ۱۱، بحوالہ مسند اسحاق، اتحاف میں مسند اسحاق کی جو سند مذکور ہے وہ بھی صحیح ہے۔ بوصیری نے بھی اس کے راویوں کو ثقہ قرار دیا ہے)۔

(۴۸) صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت اسامہ بن زیدؓ نے حضرت علی کے پاس اپنے خادم حرملہ کو بھیجا اور کہا کہ اگر پوچھیں کہ ہمارا ساتھ کیوں نہیں دیتے؟ تو کہہ دینا: لو كُنْتَ فِي شِدْقِ الأَسَدِ لَأَحْبَبْتُ أَنْ أَكُونَ مَعَكَ فِيهِ، وَلَكِنَّ هَذَا أَمْرٌ لَمْ أَرَهُ۔ کہ خدانخواستہ ان کو کچھ پیش آجائے تو، ان کو بچانے کے لیے میں شیر کے منہ میں بھی جانے کو تیار ہوں۔ مگر اس جنگ میں حصہ لینا سمجھ میں نہیں آتا۔ ان سے بھی حضرت علی نے کچھ

نہیں فرمایا (صحیح بخاری: ۷۱۱۰)۔

سیدنا علی اور حضرت معاویہؓ اس اختلاف کو رائے اور اجتہاد کا ہی اختلاف سمجھتے تھے:

(۴۹) امام ابوداود نے بسند صحیح روایت کیا ہے کہ قیس بن عُباد بصری نے سیدنا علیؓ سے دریافت کیا کہ آپ کا یہ (جنگ کے لیے) جانا آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کسی وصیت وہدایت کی بنیاد پر ہے یا آپ نے ایسا صرف اپنی رائے اور (شرعی) اجتہاد کی بنیاد پر کیا ہے۔ حضرت علی نے صاف ارشاد فرمایا کہ: نہیں! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ کو اس سلسلے میں کوئی خاص ہدایت نہیں فرمائی تھی۔ یہ صرف میری رائے اور اجتہاد ہے۔ (سنن ابوداود: ۴۶۶۶، مسند احمد: ۱/۱۴۸)۔

(۵۰) حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے صاحب زادے ابو بردہ کہتے ہیں کہ میں حضرت معاویہؓ کے مرض وفات میں حاضر ہوا تو انہوں نے بیٹے یزید سے کہا:

إِنْ وَلِيتَ مِنْ أَمْرِ النَّاسِ شَيْئًا فَاسْتَوْصِ بِهَذَا، فَإِنَّ أَبَاهُ كَانَ لِي خَلِيلاً أَوْ نَحْوَ ذَلِكَ مِنَ الْقَوْلِ غَيْرَ أَنِّي رَأَيْتُ فِي الْقِتَالِ مَا لَمْ يَرَهُ۔

(تاریخ طبری: ۵/ ۲۳۲، طبقات ابن سعد: ۴/ ۸۴، بسند صحیح۔)

یعنی اگر تم حکمراں ہو تو ان کا خیال رکھنا۔ ان کے والد میرے دوست تھے۔ بس جنگ کے سلسلے میں میری رائے ان کے خلاف تھی۔

حضرت علیؓ حق کے زیادہ قریب تھے:

(۵۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خوارج کے ظہور کی پیشین گوئی فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا کہ اس وقت مسلمانوں میں افتراق ہوگا اور خوارج کو ''دو جماعتوں میں حق کے زیادہ قریب جماعت'' (اولیٰ الطائفتین بالحق) شکست دے گی (صحیح مسلم: ۱۰۶۴)۔ اور اختلاف کے دوران خوارج سے جنگ حضرت علیؓ نے ہی فرمائی تھی۔

حضرت عمارؓ ایک باغی گروہ کے ہاتھوں قتل ہوں گے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنگ خندق کے وقت، یا مسجد نبوی کی تعمیر کے وقت، پیشین گوئی فرمائی تھی کہ ''عمار! تم کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا'' (صحیح مسلم: ۲۹۱۶)۔ بقول ابن کثیرؒ ان کی شہادت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیشین گوئی بھی صحیح ثابت ہوئی اور یہ بھی طے ہو گیا کہ اس اختلاف وجنگ میں حضرت علیؓ حق پر ہیں اور حضرت معاویہؓ کا گروہ باغی (البدایۃ والنہایۃ: ۷/ ۲۹۶)۔ اس جنگ کے بارے میں یہی اہل سنت کی متفقہ رائے ہے۔

جنگ کے باوجود محبت واعتماد:

(۵۲) موطا میں امام مالک نے روایت کیا ہے کہ حضرت معاویہؓ کی عدالت میں قتل کا ایک معاملہ پیش ہوا۔ معاملہ کچھ ایسا پیچیدہ تھا کہ حضرت معاویہؓ کو سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا فیصلہ کیا جائے۔ سوان کو کچھ باک نہیں ہوا کہ حضرت علیؓ سے رجوع کیا جائے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کوفہ میں مقیم تھے۔ ان کو خط لکھا کہ اس مسئلے کو حضرت علیؓ سے دریافت کریں اور مجھے ان کا جواب لکھیں۔ حضرت علی کو جب معلوم ہوا کہ مسئلہ معاویہ نے پوچھا ہے تو فرمایا: ہاں! میں ابوالحسن ہوں۔ اور جواب دلوایا (بسند صحیح، موطا، باب القضاء فی من وجد مع امراتہ رجلاً)۔

لسان نبوت کی بشارت کہ صحابہ کے دین کو ان جنگوں سے کوئی نقصان نہیں پہنچا:

(۵۳، ۵۴) حضرت سعید بن زیدؓ اور حضرت طارق بن اشیمؓ کی روایتیں ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شدید فتنوں کے آنے کی خبر دی، جن کے سیلاب میں کثرت سے لوگ بہہ جائیں گے۔ لوگوں نے پریشان ہو کے پوچھا کہ اگر ہم اس دور میں ہوئے تو کیا ہمارا دین تباہ ہو جائے گا؟؟؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اطمینان دلاتے ہوئے فرمایا: (نہیں) میرے صحابہ کو بس یہی نقصان پہنچے گا کہ وہ مقتول ہوں گے "بِحَسْبِ أَصْحَابِي الْقَتْلُ"۔ (مسند احمد: ۷ ۱۶۴، عن سعید بن زیدؓ، بسند حسن، نیز حدیث: ۱۵۸۷۶، عن طارق بن اشیمؓ، بسند صحیح، المعجم الکبیر: ۱/ ۱۵۰، بسند ثقات۔ حافظ ابن کثیر اس کی سند کی نہایت پرزور توثیق کرتے ہوئے کہتے ہیں: اس کی سند جید، صحیح، اچھی اور طاقتور ہے۔ وإسناده جيد قوي صحيح حسن. جامع المسانيد والسنن: ۳/ ۴۴۸)۔

سیدنا علیؓ حضرت معاویہؓ کے لوگوں کو جنتی کہتے ہیں:

(۵۵) مصنف ابن ابی شیبہؒ میں حسن سند سے روایت آتی ہے کہ یزید بن اصم کہتے ہیں: جنگ کے بعد حضرت علیؓ میدان جنگ میں مقتولین کو دیکھنے تشریف لے گئے۔ اپنی جماعت کے مقتولین کے درمیان پہنچے تو فرمایا: یہ جنتی لوگ ہیں۔ اس کے بعد حضرت معاویہؓ کی جماعت کے مقتولوں کے بیچ کھڑے ہو کر فرمایا: یہ بھی جنتی ہیں۔ پھر حسرت آمیز لہجے میں گویا ہوئے: ذمہ داری تو میری اور معاویہ کی ہے" (مصنف حدیث: ۳۷۸۸۰، بسند حسن۔ المعجم الکبیر: ۱۹/ ۳۰۷، تاریخ دمشق: ۵۹/ ۱۳۹)۔

(۵۶) حضرت عمار بن یاسرؓ اپنے موقف کے بہت سرگرم داعی تھے۔ زیاد بن الحارث کہتے ہیں: میں جنگ صفین میں حضرت عمار کے بالکل برابر میں تھا۔ کسی نے کہا: شامی محاذ کے لوگ کافر ہو گئے۔ حضرت عمار نے فوراً تردید کی اور کہا: غلط بات ہے۔ ہمارا اور ان کا نبی ایک، قبلہ ایک۔ ہاں وہ لوگ فتنے میں آ گئے، جادۂ حق سے

ہٹ گئے۔اس لیے ان سے قتال جائز ہوا (مصنف ابن ابی شیبہ: ۱۸۴۷۳، تعظیم قدر الصلاۃ، مطبوعہ مکتبۃ الدار، مدینہ طیبہ طبع اول ۱۴۰۶ھ حدیث: ۵۹۸ بسند حسن)۔

(۵۷) صحیح بخاری کی روایت ہے کہ بزرگ تابعی ابووائل شقیق بن سلمہؒ، جو جنگ صفین میں حضرت علیؓ کی طرف سے شریک تھے، کہتے ہیں: ایک دن میں حضرت عمارؓ کے ساتھ بیٹھا تھا کہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور حضرت ابومسعودؓ ملاقات کے لیے تشریف لائے اور حضرت عمار سے کہا کہ آپ کی پوری زندگی عیب سے پاک رہی ہے، سوائے اس کے کہ آپ اس معاملے میں بہت متحرک ہیں۔ہم لوگوں کو جو سب سے غلط و ناپسندیدہ چیز نظر آتی ہے وہ اس (جنگ کے) معاملے میں آپ کی سرگرمی ہے۔حضرت عمار نے جواب دیا کہ ہم کو آپ دونوں کی سب سے غلط بات یہ لگتی ہے کہ آپ ہمارا ساتھ نہیں دے رہے۔اس گفتگو کے بعد جب وہ حضرات واپس ہوئے تو حضرت عمارؓ نے ان دونوں صحابیوں کی خدمت میں از راہ محبت تحفے میں ایک ایک جوڑا بھی پیش فرمایا۔اس کے بعد تینوں ساتھ ہی جمعے کی نماز کے لیے تشریف لے گئے (صحیح بخاری: ۷۱۰۲، ۷۱۰۵)۔

حضرت معاویہ اور خاندان علیؓ کے تعلقات:

امیر المومنین حضرت معاویہؓ نے خلافت سنبھالنے کے بعد حضرات حسنین، حضرت عبداللہ بن عباس اور دیگر خاندان بنی ہاشم کے بزرگوں کے ساتھ نہایت حسن سلوک اور تکریم کا تعلق رکھا تھا۔یہی صحیح و معتبر روایات بتاتی ہیں۔

(۵۸) ۱ے حضرت معاویہؓ حضرات حسنینؓ کی فضیلت و شرف اور احترام کے نہ صرف قائل تھے بلکہ اس کو برسرعام بیان بھی کرتے تھے۔ایک مجلس میں فرمایا کہ میں نے خود دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حسن کے ہونٹ کو اس طرح بوسہ دے رہے تھے کہ گویا انہیں چوس رہے ہیں۔جن ہونٹوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چوما اور چوسا ہو ان پر جہنم کی آگ حرام ہے۔مسند احمد: ۱۶۸۴۸ بسند صحیح، مجمع الزوائد: ۹/۱۷۷، ہیثمی نے بھی اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔

(۵۹) ۲ے آجری نے بسند صحیح روایت کیا ہے کہ حضرت حسین کے پوتے محمد باقر فرماتے ہیں کہ حضرات حسنینؓ حضرت معاویہؓ کے وظائف قبول کرتے تھے (الشریعہ: ۵/۲۴۷۰)۔

(۶۰) ۳ے حضرت ابن عباس کے خاص شاگرد عکرمہ ایک سفر میں ساتھ تھے۔بیان کرتے ہیں کہ یہ دونوں حضرات عشاء بعد آدھی آدھی رات مسجد میں علمی مذاکرہ میں مشغول رہتے تھے (مصنف عبدالرزاق: ۴۶۴۱، بسند حسن)۔

اپنی خلافت کے عہد میں حج کے لیے مکہ تشریف لے گئے، تو عبداللہ بن الحارث بن نوفل کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ حضرت معاویہؓ سے ملاقات کے لیے تشریف لے گئے۔میں ساتھ تھا۔حضرت

معاویہؓ نے حضرت ابن عباسؓ کا اکرام فرماتے ہوئے ان کو اپنے ساتھ تخت خاص پر بٹھایا۔(مصنف ابن ابی شیبہ:۳۲۴۶۷، یہ روایت کم از کم حسن درجے کی ہے، خصوصاجب کہ اس کے متابع مسند احمد: ۲۵۵۰۶ کی روایت بھی موجود ہے)۔

(۶۱) ۴۴ھ اسی سفر میں حضرت معاویہ نے طواف کیا تو حضرت ابن عباس نے بھی ان کے ساتھ طواف کیا۔(مسند احمد: ۳۰۷۴،سنن ترمذی: ۸۵۸،بسند حسن)۔

(۶۲) صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس کی والدہ ام الفضل نے اپنے مولی کریب کو کسی کام سے دربار خلافت بھیجا۔کریب کہتے ہیں کہ حضرت معاویہؓ نے کام کردیا(صحیح مسلم:۱۰۸۷)۔

(۶۳) حضرت حسینؓ کے عالی مقام صاحب زادے حضرت زین العابدین علی بن حسینؒ کا مدینے کے گورنر اور عالم مروان اموی سے بہت گہرا تعلق تھا۔امام زہری ان دونوں کے معاصر وہم وطن (مدنی) ہیں، نیز دونوں ہی کے شاگرد بھی ہیں، ان سے صحیح سند سے روایت ہے کہ:

كان علي بن الحسين من أفضل أهل بيته، وأفقههم، وأحسنهم طاعة، وأحبهم إلى مروان بن الحكم، وابنه عبد الملك بن مروان۔

حضرت علی بن حسینؒ خاندان نبوت کے سب سے افضل اور سب سے ذی علم افراد میں سے تھے۔مروانؒ کے ساتھ بہت اطاعت وفرماں برداری سے رہتے تھے۔اور وہ اور ان کے بیٹے خلیفہ عبدالملک بھی ان سے بڑی محبت کرتے تھے(تاریخ ابی زرعۃ الدمشقی: ۴۱۳،ودلائل بیہقی: ۲۴۸/۷،بسند صحیح)۔

صلح حسن ومعاویہ ایک مبارک صلح:

(۶۴) حضرت ابوبکرہ رضی اللہ تعالی عنہ فرماتے ہیں:

میں نے دیکھا تھا کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حسن کو لیے ہوئے تھے۔کبھی لوگوں کی طرف دیکھتے، کبھی حسن کی طرف۔اور پھر فرمانے لگے؛ میرا یہ بیٹا سردار ہے۔امید ہے اللہ تعالی اس کے ذریعے مسلمانوں کی دو عظیم جماعتوں کے درمیان صلح کروائے گا۔(صحیح بخاری: ۷۱۰۹)۔

حضرت حسنؓ صلح کے لیے زمین سازگار فرماتے ہیں:

(۶۵) حضرت حسنؓ نے حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد اپنے اعوان وانصار کو جمع کر کے خطبہ دیا، اس میں انہوں نے فرمایا:

اللہ کی تقدیر میں جو لکھا ہوتا ہے، وہ لامحالہ پیش آکر رہتا ہے۔کسی کے پسند نہ کرنے سے اللہ کا تکوینی فیصلہ رکتا نہیں ہے۔میں خدا کی قسم کسی معمولی منصب یا عہدے کی خاطر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت

میں خوں ریزی نہیں کرسکتا۔(فضائل الصحابہ:۲/ ۷۷۳،نیز الشریعۃ للآجری:۵/ ۲۱۶۹،بسند صحیح)

(۶۶) انہوں نے اپنے حامیوں اور اہم شخصیتوں سے بیعت کے وقت ہی یہ شرط لگائی کہ میں جس سے جنگ کروں، جنگ کروگے اور جس سے صلح کروں گا تو اس سے تم بھی صلح کروگے۔

واللہ لا أبایعکم الا علی ما أقول لکم۔ قالوا: ما ھو؟ قال: تسالمون من سالمت وتحاربون من حاربت''(طبقات بن سعد: القسم المتمم للصحابۃ، الطبقۃ الخامسۃ:۱/ ۲۸۷،بسند حسن، و:۱/ ۳۲۵بسند حسن)۔

اپنے خواص سے مشورہ اوران کی ذہن سازی:

(۶۷) حضرت حسنؓ نے اپنے خواص سے خصوصاً اپنے قریبی رشتہ داروں سے مشورہ کیا۔ان کے چچازاد بھائی یعنی حضرت عبداللہ بن جعفرؓ (بن ابی طالب) نے مصالحت کی تجویز کا استقبال کیا اور کہا: اللہ آپ کو امت مسلمہ کی اس خیر خواہی کا بدلہ دے۔میں اس خیال میں آپ کے ساتھ ہوں۔عبداللہ بن جعفر بیان کرتے ہیں کہ ایک دن میں حضرت حسنؓ کے پاس تھا، اٹھنے لگا تو انہوں نے میرے کپڑے پکڑ کر مجھے اصرار کے ساتھ بٹھایا۔اور کہا: سنو! میری اب ایک خاص رائے ہوگئی ہے۔جی چاہتا ہے کہ تم میرا اس میں ساتھ دو۔میں نے کہا: فرمائیے۔کہا:

قد رأیت أن أعمد إلی المدینۃ، فأنزلھا وأخلی بین معاویۃ وبین ھذا الحدیث. فقد طالت الفتنۃ وسقطت فیھا الدماء وقطعت فیھا الأرحام وقطعت السبل وعطلت الفروج -یعنی الثغور-. فقال ابن جعفر: جزاك اللہ عن أمۃ محمد خیرا، فأنا معك علی ھذا الحدیث. فقال الحسن: ادع لی الحسین. فبعث إلی حسین، فأتاہ. فقال: أی أُخیَّ! إنی قد رأیت رأیا وإنی أحب أن تتابعنی علیہ. قال: ما ھو؟ قال: فقص علیہ الذی قال لابن جعفر. قال الحسین: أعیذك باللہ أن تکذِّب علیا فی قبرہ وتصدق معاویۃ. فقال الحسن: واللہ ما أردت أمرا قط إلا خالفتنی إلی غیرہ. واللہ لقد ھممت أن أقذفك فی بیت، فأطینہ علیك حتی أقضی أمری، قال: فلما رأی الحسین غضبہ قال: أنت أکبر ولد علی وأنت خلیفتہ وأمرنا لأمرك تبع فافعل ما بدا لك.

میری رائے ہے کہ اب بس، بہت ہوگیا۔اختلاف وجنگ کا سلسلہ دراز ہوگیا، جن میں بڑی خوں ریزی ہوئی اور رشتہ داروں نے ایک دوسرے کو قتل کیا۔ملک میں داخلی بدامنی بھی پیدا ہوگئی اور سرحدیں بھی غیر محفوظ ہوگئیں۔میں سوچتا ہوں کہ اب میں کاروبار خلافت معاویہ کے حوالے کردوں اور مدینہ جاکر یکسو ہوجاوں۔میں نے عرض کیا: جزاك اللہ عن أمۃ محمد خیرا، فأنا معك علی ھذا الحدیث'' اللہ آپ کو امت مسلمہ کی اس خیر خواہی کا بدلہ دے۔میں خود اس خیال میں آپ کے ساتھ ہوں۔حضرت حسنؓ نے فرمایا: حسین کو بلاؤ۔ان سے حضرت حسن نے وہی بات تفصیل سے کہی جو مجھ سے فرمائی تھی۔انہوں

نے اس رائے کی مخالفت کی اور کہا: ابا جی قبر میں ہیں، آپ ان کی مخالفت کرتے ہیں اور معاویہ کی تصدیق کرنا چاہتے ہیں؟۔ حضرت حسن نے کہا: تم میری ہمیشہ مخالفت کرتے آئے ہو۔ اب میرا جی چاہتا ہے کہ تم کو کسی گھر میں قید کر کے یہ صلح کا کام طے کر دوں۔ حضرت حسینؓ نے جب اُن کی یہ ناراضگی دیکھی تو عرض کیا کہ آپ ہی علیؓ کے جانشین اور بڑے صاحب زادے ہیں، میں آپ کے تابع ہوں (طبقات ابن سعد ،القسم المتمم للصحابۃ: ۱/۱ ۳۳۱، بسند صحیح۔ نیز ابن سعد ہی کے حوالے سے تاریخ دمشق: ۱۳/ ۲۶۷)۔

صلح کا اصل مقصد صرف رضائے الٰہی کا حصول اور خانہ جنگی کا خاتمہ تھا:

(۶۸) صحیح روایات سے بھی ثابت ہے کہ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے یہ صلح خالص رضائے الٰہی کی خاطر اور دین وملت کی خیر خواہی کے جذبہ سے اور آخرت کے اجر کی خاطر فرمائی تھی۔ امام احمد فضائل الصحابہ میں، ابن ابی شیبہ مصنف میں اور ابن سعد طبقات میں صحیح اسانید سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت حسن نے مدائن میں (صلح کا معاہدہ طے ہونے کے بعد) ایک خطبہ دیا اور اس میں فرمایا:

> ''چاہے لوگوں کو ناپسند ہو اللہ کی تقدیر کا حکم ضرور پیش آتا ہے۔ اللہ کی قسم میں حکومت کا کوئی معمولی سا حصہ بھی خون بہا کر نہیں حاصل کرنا چاہتا۔ مجھے اپنے (اخروی) نفع نقصان کا خوب علم ہے۔ پس تم لوگ اپنے اپنے ٹھکانوں پر جاؤ'' (فضائل الصحابہ: ۲/ ۷۷۳، مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۷۳۵۸۔ طبقات القسم المتمم للصحابۃ، الطبقۃ الخامسۃ: ۱/ ۳۱۷، تینوں کی سندیں صحیح ہیں)۔

(۶۹) ابوغریف عبیداللہ کہتے ہیں کہ: میں حضرت حسن کے مقدمۃ الجیش میں تھا، ہم بارہ ہزار کی تعداد میں جان دینے کے لیے تیار تھے۔ ہماری تلواریں خون کی پیاسی ہو رہی تھیں۔ جب صلح کی خبر ہم کو ملی تو شدت غم سے ایسا لگا جیسے کمر ٹوٹ گئی۔۔ صلح کا معاملہ طے کر کے حضرت حسن جب کوفہ پہنچے ایک شخص سفیان بن لیل آیا اور ان سے یوں مخاطب ہوا: او مومنوں کو ذلیل کرنے والے! حضرت حسن نے کہا: ایسا نہ کہو، میں نے اہل ایمان کو ذلیل نہیں کیا۔ میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ حکومت کی خاطر اہل ایمان کا خون بہاؤں (مستدرک: ۳/ ۱۹۲، مصنف ابن ابی شیبہ: بسند حسن)۔

اپنے حامیوں کو تاکید کہ حضرت معاویہؓ کے ہاتھ پر بیعت اور سمع وطاعت کریں:

(۷۰) حضرت معاویہؓ نے فرمائش کی کہ آپ ذرا اس مصالحت کا عوامی اعلان بھی کر دیں۔ حضرت حسنؓ نے خطبہ دیا۔ اس خطبے کی روایات صحیح سند سے آئی ہیں۔ حضرت انس بن سیرین نے نقل کیا ہے کہ حضرت حسنؓ نے (لوگوں کو اس صلح پر مطمئن کرنے اور اتفاق پیدا کرنے کے لیے) اپنی عالی نسبی کا بھی حوالہ دیتے ہوئے فرمایا:

لوگو! تم کو اس سرزمین پر میرے اور حسین کے علاوہ نبی کا نواسہ نہیں ملے گا۔ میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت میں اتحاد قائم کرنا چاہتا ہوں، اور یہی میرے لیے زیبا ہے۔ میں نے معاویہ کی بیعت کر لی ہے۔ لہذا (میری سنو!)۔ میں کہتا ہوں کہ معاویہ کی امارت پر متفق ہو جاؤ۔ (مصنف عبدالرزاق: ۱۱/ ۴۵۲، بسند صحیح، فضائل الصحابہ: ۲/ ۷۶۹ بسند صحیح)۔

نیز فرمایا: اواہل عراق تم نے میرے والد ماجد کو شہید کیا، مجھ پر حملہ کیا اور میرا مال واسباب لوٹا۔ سنو! تم سے میں نے عہد لیا تھا کہ جس سے میں صلح کروں گا تم میری اتباع کرو گے۔ اب میں نے معاویہ سے بیعت کر لی ہے۔ سو تم ان کے ساتھ سمع وطاعت کا معاملہ کرو۔ (الطبقات الکبری، متمم الصحابۃ، الطبقۃ الخامسۃ: ۱/ ۳۲۵، بسند حسن)۔

(۷۱) صلح کا اعلان فرماتے ہوئے حضرت حسنؓ نے ارشاد فرمایا: میں اس (لڑائی) کو شروع سے ہی سب سے زیادہ ناپسند کرنے والوں میں سے تھا"۔ (طبقات ابن سعد، القسم المتمم للصحابۃ: ۱/ ۳۳۱ بسند صحیح۔ نیز ابن سعد ہی کے حوالے سے تاریخ دمشق: ۱۳/ ۲۶۷)۔

صلح کے بعد فتنہ انگیزیاں:

(۷۲) یزید ابن الاصم کہتے ہیں کہ: حضرت حسن کے پاس ایک گٹھری خطوط کی آئی۔ میں موجود تھا، انہوں نے اپنی خادمہ سے کہا کہ ذرا پانی کا ٹب لاؤ، اس میں پانی ڈالا اور پوری گٹھری اس میں ڈال دی۔ میں نے دریافت کیا کہ کس کے خط ہیں؟ کہنے لگے: وہی عراق والے ہیں، نہ حق مانتے ہیں، نہ باطل سے رکتے ہیں۔ پھر کہنے لگے: مجھے اپنے بارے میں ڈر نہیں کہ وہ مجھے پھانس سکیں گے۔ (حضرت حسینؓ کی طرف اشارہ کر کے کہا) لیکن اس کے بارے میں ڈر ہے۔ (المعرفۃ والتاریخ: ۲/ ۷۵۶ بسند حسن، المعجم الکبیر: ۳/ ۷۰، حافظ ابن حجر ہیثمی نے اس کی سند کی توثیق کی ہے. مجمع الزوائد: ۶/ ۲۴۳۔)

حضرت حسنؓ نے پھر کبھی خلافت کو نہیں سوچا:

(۷۳) مستدرک حاکم میں بسند صحیح آیا ہے کہ کسی نے سوال کیا کہ لوگوں میں مشہور ہے کہ آپ اب پھر خلافت کی فکر میں ہیں؟ آپ نے صاف انکار کرتے ہوئے کہا کہ میرے پاس (عراق میں) عربوں کی بہت بڑی تعداد جنگ کے لیے تیار تھی، مگر میں نے اللہ کی رضا کی خاطر اور امت کے اتحاد کے لیے اس کو چھوڑ دیا۔ تو کیا اب حجاز کے لوگوں کے سہارے اس کے لیے جنگ کروں گا؟ (مستدرک: ۴۷۹۵، حاکم اور ذہبی نے اس کو صحیح قرار دیا ہے، نیز طبقات، متمم الصحابۃ، طبقۂ خامسہ: ۱/ ۳۱۹ بسند حسن)۔

رسول اللہؐ کی پیشین گوئی کہ حضرت معاویہؓ کی خلافت سے دین قائم اور قرآن نافذ ہوگا:

(۷۴) امام احمد اور دیگر محدثین نے حضرت ابوالدرداءؓ سے بسند صحیح نقل کیا ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

بينا أنا نائم اذ رأيت عمود الكتاب احتمل من تحت رأسي فظننت أنه مذهوب بـــه، فأتبعته بصري، فعمد به الى الشام، ألا وإن الايمان حين تقع الفتن بالشام۔

مجھے ایک خواب میں دکھایا گیا کہ قرآن کا ''عمود'' میرے سر کے نیچے سے نکال لیا گیا۔ مجھے لگا کہ یہ اب کہیں لے جایا جائے گا، تو میں اس کو دیکھتا رہا۔ آخر وہ شام لے جایا گیا۔ سن لو! فتنوں کے وقت ایمان کا مرکز شام ہوگا۔ (مسند احمد: ۲۱۷۳۳، امام بیہقی نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے، دلائل: ۶/ ۴۴۷)۔

حافظ ابن حجر نے ذکر کیا ہے کہ حضرت ابوالدرداء کی یہ روایت امام بخاری کی شرط ومعیار کی ہے اور امام بخاری نے کتاب التعبیر میں اس روایت کی طرف اشارہ بھی فرمایا ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ علماء تعبیر کے نزدیک اگر کوئی شخص خواب میں خیمہ کا عمود دیکھے تو اس سے مراد دین اور ایسا شخص ہے جس پر دین کے سلسلے میں اعتماد کیا جائے (فتح الباری: ۱۲/ ۴۰۳)۔

(۷۵، ۷۶) حضرت ابوالدرداء کے علاوہ یہ حدیث تقریبا ان ہی الفاظ میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص اور حضرت ابوامامہؓ نے بھی روایت کی ہے۔ (مستدرک حاکم: ۸۵۵۴، ذھبی نے اسے بخاری اور مسلم کی شرط یعنی معیار کے مطابق صحیح قرار دیا ہے، نیز مسند شامیین: ۱/ ۱۷۹۔ ۱۸۱، صحیح اسانید سے۔ نیز المعجم الکبیر: ۸/ ۱۷۰، بسند صحیح، مجمع الزوائد ۱۰/ ۵۸)۔

حضرت معاویہؓ کی خلافت کا عہد بادشاہت اور رحمت کا عہد تھا:

(۷۷) طبرانی نے بسند حسن حضرت ابن عباسؓ کے حوالے سے رسول اللہؐ کا یہ ارشاد روایت کیا ہے کہ:

اس دین کا شروع کا زمانہ نبوت ورحمت کا دور ہوگا، پھر خلافت ورحمت کا، اس کے بعد بادشاہت ورحمت کا دور ہوگا، پھر امارت اور رحمت کا زمانہ آئے گا۔ اس کے بعد تو (لوگ) حکومت پر قبضہ کرنے کے لیے گدھوں کی طرح ایک دوسرے کو کاٹیں گے (معجم کبیر: ۱۱/ ۸۸، مجمع الزوائد: ۵/ ۱۹۰، ہیثمی نے اس کے تمام راویوں کو ثقہ قرار دیا ہے)۔

حضرت حسینؓ کے صاحب زادے حضرت علی زین العابدین کے حضرت مروانؒ سے تعلقات:

(۷۸) خاندان علوی وفاطمی کے گل سر سبد، حضرت حسین کے صاحب زادے، حضرت علی بن حسین زین العابدین حضرت مروانؒ سے علم حاصل کرتے ہیں۔(ملاحظہ ہو صحیح بخاری: ۱۵۶۳، منہاج السنۃ: ۴/۴۸)۔مروان ان پر بڑے شفیق ومہربان ہیں اور حضرت زین العابدین ان سے بڑی محبت کرتے ہیں اور اطاعت وفرماں برداری کا رویہ رکھتے ہیں۔امام زہری جوان دونوں کے معاصر وہم وطن (مدنی) ہیں، نیز دونوں ہی کے شاگرد بھی ہیں، کہتے ہیں کہ:

كان علي بن الحسين من أفضل أهل بيته، وأفقههم، وأحسنهم طاعة، وأحبهم إلى مروان بن الحكم، وابنه عبد الملك بن مروان.

حضرت علی بن حسین خاندان نبوت کے سب سے افضل اور سب سے ذی علم افراد میں سے تھے۔ مروانؒ کے ساتھ بہت اطاعت وفرماں برداری سے رہتے تھے۔اور وہ اور ان کے بیٹے خلیفہ عبدالملک بھی ان سے بڑی محبت کرتے تھے (تاریخ ابی زرعۃ دمشقی: ۴۱۳، ودلائل بیہقی: ۷/۲۴۸ بسند صحیح)۔

عہد معاویہؓ کے بارے میں امام زہری کی شہادت:

(۷۹) امام زہری کہا کرتے تھے کہ:

عمل معاوية بسيرة عمر بن الخطاب سنين لا يخرم منها شيئاً

(السنۃ للخلال: ۲/۴۴۴، بسند صحیح)۔

حضرت معاویہؓ نے بالکل خلافت فاروقی کے نقش قدم پر چل کر سالوں حکومت کی، کچھ بھی کمی نہیں کی‘‘۔

ترویج وتحکیم شریعت اور حفاظت واقامت دین:

(۸۰) ایک مرتبہ خبر ملی کہ مدینہ میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے صاحب زادے عباس نے اپنی بیٹی کا نکاح عبدالرحمن بن الحکم سے کیا ہے اور عبدالرحمٰن نے اپنی بیٹی کا نکاح عباس سے کر دیا ہے۔اور اسی کو ایک دوسرے کا مہر قرار دے دیا ہے۔حضرت معاویہ نے شام سے مدینہ کے گورنر مروان کو حکم جاری کیا کہ یہ نکاح ’’شغار‘‘ ہے جس سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے۔عدالت کے ذریعہ نکاح فسخ کر کے علیٰحدگی کرادی جائے (سنن ابی داوود: ۲۰۷۵ بسند حسن)۔

(۸۱) اپنی خلافت کے عہد میں اہل مکہ کو عصر کے بعد دو رکعتیں نفل پڑھتے دیکھا۔ان کو اشکال ہوا، عبد اللہ بن الحارث بن جزءؓ کہتے ہیں کہ میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے ساتھ حضرت معاویہؓ کی خدمت میں

حاضر ہوا۔حضرت معاویہ نے حضرت ابن عباسؓ کا اکرام فرماتے ہوئے، ان کو اپنے ساتھ تخت خاص پر بٹھایا۔ اور دریافت کیا کہ لوگ یہ عصر کے بعد کیسی دو رکعتیں پڑھتے ہیں؟ ہم نے رسول اللہ ﷺ کو نہ پڑھتے دیکھا اور نہ کسی کو ان کی تلقین کرتے سنا۔حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ یہ عبداللہ بن زبیرؓ ہیں، جو لوگوں کو یہ بتا رہے ہیں۔حضرت معاویہؓ نے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو بلوایا اور ان سے دریافت کیا کہ تم لوگوں کو یہ کیا فتویٰ دے رہے ہو؟ انہوں نے کہا کہ مجھے خالہ جان عائشہؓ نے بتایا ہے کہ حضور ﷺ نے ان کے یہاں عصر بعد دو رکعتیں پڑھی ہیں۔حضرت معاویہؓ نے دو آدمیوں کو حضرت عائشہؓ سے استفسار کے لیے بھیجا (جو اس وقت حج کے لیے مکہ آئی ہوئی تھیں)، انہوں نے کہا کہ ابن زبیر کو بات یاد نہیں رہی۔میں نے ان کو یہ بتایا تھا کہ ایک مرتبہ آپ ﷺ نے میرے یہاں عصر بعد دو رکعتیں پڑھیں۔تو میں نے پوچھا کہ یہ کون سی نماز ہے؟ آپ کبھی اس وقت تو نماز پڑھتے نہیں تھے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ظہر بعد کی سنتیں کسی مجبوری سے چھوٹ گئی تھیں۔اِس وقت میں نے ان کو پڑھ لیا ہے (صحیح بخاری: ۵۸۷، مصنف ابن ابی شیبہ: ۶۳۴۷، مسند احمد: ۲۵۵۰۶)۔

(۸۲) ایوب بن میسرہ کہتے ہیں کہ کناکر، زاکیہ اور قردا کی آبادیوں میں حضرت معاویہؓ اپنے خاص لوگوں کو بھیجتے کہ وہ امیر المومنین کی طرف سے یہ اعلان کر دیں کہ عاشورکا روزہ سنت ہے، امیر المومنین بھی روزہ رکھ رہے ہیں، سو جو چاہے اس سنت کو اختیار کرے۔(یہ تینوں دمشق کے مضافات میں دیہی آبادیاں تھیں، جن میں عرب قبائل آباد تھے (تاریخ دمشق لابن عساکر: ۵۹/۱۶۴، سنده جيد، غير أن أيوب بن ميسرة ذكره ابن حبان في الثقات وذكره البخاري في التاريخ ولم يذكر فيه جرحا)۔

(۸۳) مدینے میں آپ نے دیکھا کہ عاشوراء کے روزے کا اہتمام نہیں ہو رہا اور علماء اس کا عوام میں بیان نہیں کر رہے۔مسجد نبوی میں دورانِ خطبہ کہا کہ اہل مدینہ! تمہارے علماء کہاں ہیں؟ میں نے رسول اللہ ﷺ کو عاشوراء کے موقع پر ارشاد فرماتے سنا کہ یہ عاشوراء کا دن ہے۔اللہ نے اس کا روزہ فرض تو نہیں فرمایا ہے، لیکن میں رکھ رہا ہوں (یعنی یہ افضل اور سنت ہے)، سو جو چاہے رکھے اور جو چاہے نہ رکھے (صحیح بخاری: ۲۰۰۳)۔

(۸۴) پتہ چلا کہ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ رسول اللہ ﷺ سے فرض نماز کے بعد کی ایک خاص دعا نقل کرتے ہیں، تو انہیں دربار سے خط لکھوایا کہ مجھے وہ دعا لکھوا کر بھیجیے۔انہوں نے اپنے سکریٹری وراد سے لکھوا کے بھیجا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے نماز کے بعد یہ دعا سنی ہے:

لا إله إلا الله وحده لا شريك له. اللهم لا مانع لما أعطيت، ولا معطي لما منعت، ولا ينفع ذا الجد منك الجد۔

کچھ عرصے بعد وراد کا دمشق جانا ہوا تو انہوں نے دیکھا کہ امیر المومنین خود مسجد میں لوگوں کو یہ دعا سکھا رہے ہیں اور پڑھنے کی ترغیب دے رہے ہیں (صحیح بخاری: ۶۶۱۵، مسند احمد: ۱۸۱۳۹)۔

گورنروں کو بھی ترویج شریعت کا اہتمام تھا:

(۸۵) حضرت معاویہؓ کے دور میں حکومت کی طرف سے غلہ بانٹنے کا یہ نظام تھا کہ لوگوں کو ٹوکن دے دیے جاتے تھے۔ یہ گویا Public Rashion System تھا۔ مدینہ میں یہ ٹوکن بانٹے گئے تو لوگوں نے غلہ لینے کے بجائے وہ ٹوکن بیچ دیے۔ یہ اصل میں ٹوکن نہیں غلے کی بیع تھی۔ شرعی اعتبار سے کسی چیز پر قبضہ حاصل کیے بغیر بیچنا منع ہے۔ لوگوں کے اس عمل کی خبر حضرت زید بن ثابتؓ کو ہوئی، وہ اور ان کے ساتھ ایک اور صحابی گورنر مروانؒ کے پاس آئے اور کہا کیا آپ سودی کاروبار کی اجازت دے رہے ہیں؟ مروان کہنے لگے: معاذ اللہ، کیا ہوا؟ انہوں نے بتایا کہ لوگوں نے ایسا ایسا کیا ہے۔ مروان نے فوراً پولیس کے محکمہ کو متحرک کیا اور پتہ لگایا کہ کس کس نے اپنے ٹوکن بیچے ہیں، ان لوگوں کا پتہ لگوایا گیا اور ان سے پیسے واپس کروائے گئے۔ (موطا: ۲۳۶۰ بسند صحیح)۔

(۸۶) حضرت خالد بن الولیدؓ کے بیٹے عبدالرحمٰن نے حضرت معاویہ کے دور میں سالہا سال بر و بحر میں جہاد فرمایا اور تاریخ ساز کارنامے انجام دیے۔ وہ حضرت معاویہ کے سپہ سالاروں میں بڑے دبدبے کے جنرل تھے، ایک مرتبہ انہوں نے دشمن کے چار مجرم قسم کے قیدیوں کو قتل کروایا، مگر طریقۂ قتل غیر شرعی تھا، جس کا ان کو علم نہیں تھا۔ حضرت ابو ایوب انصاریؓ نے اس پر نکیر کی اور بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو حرام قرار دیا تھا۔ اس پر عبدالرحمٰن نادم ہوئے اور توبہ و کفارے کے طور پر چار غلام آزاد کیے۔ (سنن ابو داود ۲۶۸۷، حافظ ابن حجر نے اس کی سند کو قوی قرار دیا ہے: فتح الباری: ۹/ ۶۴۴)۔

(۸۷) ایک مرتبہ حمص کے دورے پر تھے۔ وہاں بھی جو خطبہ دیا اس میں بھی ترویج شریعت اور منکرات کے ازالہ پر زور دیا۔ ابو حریز کیسان کہتے ہیں کہ میں اس وقت ساتھ تھا۔ آپ نے خطبہ میں ارشاد فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نوحہ کرنے، گانے بجانے، تصویروں، نقلی بال لگانے، (مردوں کے) سونے اور ریشم پہننے، درندوں کی کھالوں پر بیٹھنے سے منع فرمایا تھا۔ آج میں تم کو اس سے روکتا ہوں۔ (مسند احمد: ۱۶۹۳۵، نیز ۱۶۸۳۳، بسند صحیح، مسند ابو یعلیٰ: ۷۳۷۴ بسند حسن)۔

شاید ان چیزوں کی حرمت کا لوگوں کو عام طور پر علم نہیں تھا۔ ایک مرتبہ حج میں تشریف لے گئے، مختلف علاقوں کے مہاجرین و انصار صحابہ کو کعبۂ مقدسہ میں جمع فرمایا اور پوچھا کہ کیا آپ حضرات جانتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان اشیاء سے منع فرمایا تھا۔ سب نے کہا: جی ہاں۔ حضرت معاویہؓ نے کہا، میں بھی آپ حضرات کی تصدیق میں

گواہی دیتا ہوں۔ پھر ان اشیاء کی حرمت کا عام اعلان فرمایا (سنن نسائی کبریٰ: احادیث: ۹۷۳۰ تا ۹۷۳)۔

جنگ میں بھی پاسِ شرع و دین:

(۸۸) ایک مرتبہ ان کا حکومت روم سے ایک خاص مدت تک کا ناجنگ معاہدہ تھا، انہوں نے معاہدے کے ختم ہونے سے پہلے ہی اس حساب سے فوجوں کو لے کر سرحد کی جانب پیش قدمی شروع کر دی کہ جیسے ہی مدت ختم ہوگی، اچانک حملہ کر دیں گے، دشمن تیار بھی نہیں ہوگا۔ حضرت امیر کا خیال تھا کہ اس طرح معاہدہ شکنی نہیں ہوگی۔ ابھی پیش قدمی جاری تھی، اور فوجیں تیز گامی سے منزلیں طے کر رہی تھیں، کہ ایک گھوڑ سوار غبار اڑاتا ''اللہ اکبر، اللہ اکبر، وفاء لا غدر'' (وفاداری کرو غداری نہیں) کی آواز لگاتا چلا آرہا ہے۔ دیکھا تو یہ صحابیِ رسول حضرت عمرو بن عبسہؓ تھے۔ انہوں نے آکر حضرت معاویہ سے کہا: غضب ہے غضب! یہ کیا ہو رہا ہے؟ میں نے رسول اللہؐ سے سنا ہے کہ جس کا کسی کے ساتھ معاہدہ ہو وہ اس میں کوئی تغیر و تبدیلی نہ کرے (اور کسی قسم کا اقدام نہ کرے ''فلا یحلّ عقدة و لا یشدّها'') یہاں تک کہ معاہدے کی مدت گذر جائے۔ حضرت امیرؓ نے یہ حدیث سنی اور فوجوں کو واپسی کا حکم دے دیا۔ (سنن ابوداود: ۲۷۵۹، امام ترمذی نے اس کو حسن صحیح قرار دیا ہے، سنن: ۱۵۸۰۔ اور محقق شیخ عبدالقادر ارناوط نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے، جامع الاصول: ۲/ ۶۴۷)۔

آزادی تنقید اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر:

(۸۹) حافظ ابو یعلیٰؒ اور حافظ طبرانیؒ نے ثقات کی سند سے روایت کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت معاویہؓ نے جمعہ کے خطبہ میں کہا کہ ہم اس مال کے مختارِ کل ہیں، جس کو چاہیں دیں، جس کو چاہیں نہ دیں۔ کسی نے کچھ نہیں کہا۔ اسی طرح انہوں نے لگاتار تین ہفتوں تک خطبہ میں یہ بات کہی۔ تیسری مرتبہ ایک صاحب کھڑے ہو گئے اور کہا:

> ہرگز نہیں۔ آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ حکومت کا مال عوام کا ہوتا ہے۔ جو ہم کو ہمارا مال نہیں دے گا ہم اس سے زبردستی چھین لیں گے۔

حضرت معاویہ بہت خوش ہوئے اور اس جرأت مند تنقید پر اُن کی بہت تعریف کی۔ اور کہا کہ میں تین ہفتوں سے منتظر تھا کہ کوئی مجھ کو ٹوکتا ہے کہ نہیں؟ اس لیے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خود سنا ہے کہ: کچھ حکام ایسے ہوں گے جن کی غلط باتوں کی کوئی تردید نہیں کر سکے گا، ایسے حاکموں کا انجام جہنم ہے۔ میں اسی کا اندازہ کرنا چاہتا تھا۔ جب کسی نے میری تردید نہیں کی تو مجھے ڈر ہوا کہ کہیں میں ان میں سے نہ ہوں۔ (إن هذا أحياني أحياه الله) ان صاحب نے مجھ پر احسان کیا ہے اللہ ان پر احسان کرے۔ (معجم کبیر طبرانی: ۱۹/ ۳۹۳، مسند ابو یعلیٰ: ۱۳/ ۳۷۳، بسند ثقات، حافظ ابن حجر ہیثمی نے اس کے تمام راویوں کو ثقہ قرار دیا ہے۔ مجمع الزوائد: ۵/ ۲۳۶،

حافظ ذہبی نے بھی اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے، تاریخ الاسلام ۴/ ۳۱۴)۔

ام المومنین حضرت عائشہؓ کے سخت محاسبے اور تنقیدیں:

(۹۰) تاریخ دمشق میں صحیح سند سے وارد ہے کہ حضرت قاسمؒ بن محمد بن ابی بکر روایت کرتے ہیں: حضرت معاویہؓ حجاز آئے، اور ام المومنینؓ کی خدمت میں حاضری دی۔ حضرت معاویہؓ نے ملکی حالات پر کچھ دیر تک گفتگو کی۔ اس کے بعد حضرت عائشہؓ نے اپنی گفتگو کا آغاز کیا۔ باقاعدہ اللہ کی حمد وثنا اور شہادتین کے کلمات پڑھ کر گویا خطبہ ارشاد فرمایا، اسلام کے اصول حکم رانی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طرز عمل کا تذکرہ فرمایا اور خلفاء راشدین کی حکومتوں کا انداز یاد دلایا۔ اور اسی راستے پر چلنے کی تاکید ونصیحت کی۔ راوی ذکوان کہتے ہیں کہ ام المومنین نے اس سلسلے میں کافی طویل گفتگو فرمائی، کوئی بات جو حضرت معاویہؓ سے کہنے کی تھی، نہیں چھوڑی۔ ساری نصیحتیں اور مشورے سننے کے بعد حضرت معاویہؓ نے بڑے ادب سے عرض کیا:

> أنت والله العالمة بأمر رسول الله (ﷺ) المناصحة المشفقة البليغة الموعظة، حضضت على الخير وأمرت به ولم تأمرينا إلا بالذي هو لنا وأنت أهل أن تطاعي.
>
> اللہ کی قسم آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین وشریعت کی بڑی عالم ہیں۔ آپ ایک شفیق ومہربان ناصح ہیں۔ آپ نے نیک باتوں کا حکم دیا اور وہی کہا جس میں ہمارے لیے خیر ہے۔ آپ کا مقام ہے کہ آپ کی ہر بات مانی جائے۔

ذکوان کہتے ہیں کہ اس کے بعد دیر تک اسی رنگ میں مجلس جاری رہی اور حضرت عائشہؓ نصیحت ومشوروں سے افادہ فرماتی رہیں۔ جب ہم باہر نکلے تو حضرت معاویہؓ پر اتنا اثر تھا کہ وہ کچھ دیر میرے کندھے پر سہارا لے کے کھڑے رہے اور کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد ایسی بلاغت وقوت اور گہری تاثیر کسی کے کلام میں نہیں (تاریخ دمشق: ۵۹/ ۱۵۳۔ بسند صحیح)۔

(۹۱) ایک مرتبہ حاضر ہوئے تو حضرت عائشہؓ ناراض ہوئیں۔ فرمایا یہ تم نے کیا کیا؟ حج کے مقامات میں عمارتیں بنوا دیں، پیڑ لگوا دیے، پانی کے کوئیں کھدوا دیے؟ دوسری بات یہ کہ حجر بن عدی کو کیوں قتل کروا دیا؟ حضرت معاویہؓ نے عرض کیا کہ: جہاں تک پہلی بات کا سوال ہے تو یہ صرف حجاج کی سہولت وراحت کے لیے کیا ہے، سخت دھوپ میں ان کے لیے نہ کہیں بیٹھنے کی جگہ ہوتی تھی نہ سامان رکھنے کا انتظام۔ موسم کی شدت میں پانی بھی دور سے لانا پڑتا تھا۔ میرا اس سے کیا فائدہ؟ حضرت عائشہ نے فرمایا: اگر اس لیے کیا ہے تو ٹھیک ہے۔ حضرت معاویہؓ نے پھر عرض کیا: جہاں تک حجر بن عدی کے قتل کا تعلق ہے تو مجھے ان سے سخت فساد اور خوں ریزی پھیلنے کا ڈر تھا۔ میرا خیال تھا کہ کہ ایک جان جانا سہل ہے اس سے کہ خانہ جنگی یا بغاوت میں بہت سے مارے جائیں۔ غالبا حضرت

عائشہ مطمئن نہیں ہوئیں، تو حضرت معاویہؓ نے کہا کہ میں نے جو کیا حق سمجھ کے کیا، میرا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیجیے۔ تو حضرت عائشہ نے فرمایا: چھوڑ دیا، چھوڑ دیا، چھوڑ دیا (تاریخ دمشق: ۱۲/ ۲۲۹، ۲۳۰ بسند حسن)۔

صغار صحابہ اور تابعین کی تنقید:

(۹۲) مصنف عبدالرزاق وغیرہ میں نہایت صحیح سندوں سے روایت موجود ہے، جو بتاتی ہے کہ حضرت مسور بن مخرمہؓ حضرت معاویہؓ کی حکومت پر خوب تنقیدیں کرتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت مسورؓ خود حضرت معاویہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت معاویہ نے ان کی تنقیدوں کا ذکر چھیڑ دیا۔ اور کہا بتاؤ، حکومت پر تمہارے کیا کیا اعتراضات ہیں؟ حضرت مسورؓ نے ٹالا اور کہا: اب چھوڑیے بھی۔ میں جس کام کے لیے آیا ہوں، ہم اس پر بات کرتے ہیں۔ لیکن حضرت معاویہؓ نے کہا: نہیں، اپنے دل کی بات کہو۔ حضرت مسورؓ فرماتے ہیں: پھر تو میں نے کوئی اعتراض، جو میرے دل میں تھا، روک کے نہیں رکھا، سب کچھ خوب صاف صاف کہہ دیا۔ حضرت معاویہ نے پورے اعتراضات سن کر بڑی تواضع سے کہا:

> میں غلطیوں سے مبرّا نہیں۔ یہ بتاؤ! کیا تم کو اپنی کچھ غلطیوں کا اعتراف ہے، کہ اگر اللہ تعالیٰ نے معاف نہ کیا تو ہلاک ہوجاؤ گے؟ (حضرت مسورؓ فرماتے ہیں:) میں نے کہا: ہاں، ضرور۔ حضرت معاویہ نے کہا: جس طرح تم اپنی غلطیوں کی معافی کی امید رکھتے ہو، میں بھی اپنی غلطیوں کی اللہ سے مغفرت کی امید رکھتا ہوں۔ پھر جیسا کہ تم جانتے ہو، مجھ پر عوامی معاملات کی اصلاح، حدود کا قیام، جہاد کا انتظام، اور حکومت کی دیگر سخت گراں بار ذمہ داریاں ہیں، جو تم پر نہیں ہیں۔ (تو غلطیاں ہو بھی سکتی ہیں)۔ اللہ کی ذات بڑی کریم ہے، حسنات کو قبول اور سیئات سے درگزر کرتی ہے۔
>
> (پھر فرمایا:) اس کے باوجود اتنا کہتا ہوں کہ جب بھی اللہ اور غیر اللہ میں کسی ایک کے انتخاب کا موقع یا امتحان آتا ہے، میں غیر کا نہیں، اللہ کی رضا کا ہی انتخاب کرتا ہوں۔

حضرت مسورؓ فرماتے ہیں: میں نے غور کیا تو خیال ہوا کہ حضرت معاویہؓ کی بات میری بات کے مقابلے میں صحیح تھی۔ حضرت مسور سے اس قصہ کو نقل کرنے والے ان کے ماموں زاد بھائی اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے صاحب زادے حمید اور حضرت عروہ بن زبیر دونوں کہتے ہیں کہ حضرت مسور کی نہ صرف تمام غلط فہمیاں دور ہوگئیں، بلکہ وہ حضرت معاویہؓ کی گفتگو سے اس قدر متأثر ہوئے کہ اس کے بعد جب بھی حضرت معاویہؓ کا تذکرہ آتا تو وہ ان کے لیے دعاءِ خیر ضرور کرتے (مصنف عبدالرزاق: ۲۰۷۱۷، بسند صحیح۔ حافظ ابن عبدالبر کہتے ہیں یہ امام زہری سے مروی سب سے صحیح روایات میں سے ہے، الاستیعاب ترجمۂ معاویہؓ۔ نیز طبقات ابن سعد قسم متمم الصحابہ، طبقۂ رابعہ: ۱۲۳ بسند صحیح)۔

(۹۳) حضرت ابومریمؓ دمشق آئے اور کہا بس ایک حدیث سنانے آیا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ کو میں نے خود یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کا حاکم بنایا پھر وہ ان کے ضرورت مندوں اور فقراء پر دروازہ بند کر کے بیٹھ رہا، اللہ قیامت کے دن اس کی پریشانی میں کام نہیں آئے گا۔ یہ تنقید سن کر حضرت معاویہ پر بڑا اثر ہوا اور انہوں نے عوام کی شکایتیں سننے کے لیے ایک افسر مقرر کر دیا۔ (سنن ابوداود: ۲۹۴۸ بسند صحیح و مسند الشامیین: ۳/۴۰۶ بسند حسن۔ الکنی و الاسماء للدولابی: ۱/۱۶۰)۔

گورنروں پر بھی کھلی تنقید اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا رواج:

(۹۴) مروان کے دور میں مدینہ میں کبار صحابہ موجود تھے، وہ حکومت کے اعمال پر نظر رکھتے تھے اور ہر وہ چیز جو ان کو غلط لگتی تھی، اس پر بے محابا تنقید کرتے تھے۔ خطبہ عید کا ایک اہم حصہ ہے جس کا سننا واجب ہے۔ سنت رسول ﷺ یہ ہے کہ یہ نماز کے بعد ہوتا ہے۔ مروان نے دیکھا کہ لوگ نماز پڑھ کے چلے جاتے ہیں اور خطبہ نہیں سنتے۔ تو انہوں نے نماز سے پہلے خطبہ دینا شروع کیا۔ ایک مرتبہ خطبہ کے لیے بڑھ ہی رہے تھے کہ حضرت ابوسعید خدریؓ نے امیر کے کپڑے پکڑ کر کھینچا اور کہا تم یہ سنت میں تبدیلی کر رہے ہو۔ بہر حال حضرت ابوسعید خدریؓ کے اعتراض کے بعد مروان نے عمل تو اپنی رائے کے مطابق ہی کیا، مگر گورنر ایک محترم عالم کی اس برملا دست اندازی اور تنقید پر ذرا برا نہ مانے (صحیح بخاری: ۹۵۶)۔

غیر مسلموں کے جان و مال کا تحفظ:

(۹۵) اہل ذمہ کی جان و مال کے مکمل تحفظ کی گارنٹی تھی۔ کسی گورنر سے بھی اگر غلطی ہو جاتی تو اس کا محاسبہ ہوتا تھا۔ عبدالرحمٰن بن ام الحکم کوفے کے حاکم اور بڑے مرتبے کے امیر اور جنرل تھے۔ امیر المؤمنینؓ کے حقیقی بھانجے بھی تھے۔ انہوں نے ایک ذمی کو قتل کروایا۔ ذمیوں کو حصول انصاف کی ایسی آزادی تھی کہ مقتول کا باپ مسجد میں چیختا ہوا آیا اور اس نے گورنر کے خلاف مجمع کے سامنے دُہائی دی کہ مسلمانو! کیا عمر بن خطاب نے ہمیں جان کی حفاظت کی گارنٹی نہیں دی تھی؟ مسلمانوں پر ایسا اثر ہوا کہ گورنر کے خلاف ہنگامہ ہو گیا۔ اور وہ اپنے مقصورہ میں بند ہو کے بیٹھ گئے۔ حضرت معاویہؓ کو خبر ہوئی، تحقیق کے بعد ان کو محسوس ہوا کہ گورنر کا فیصلہ غلط تھا۔ فوراً معزول کر دیا (تاریخ دمشق: ۵۱/۳۰۵، نیز العلل و معرفۃ الرجال: ۲/۴۶۴، بسند صحیح)۔

حضرت معاویہ کے عدل کی شہادت:

(۹۶) حضرت سعد بن ابی وقاصؓ جو عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں، اور خلافت راشدہ کے اہم اساطین

حکومت میں سے تھے، شہادت دیتے ہیں کہ میں نے معاویہ سے زیادہ (ان کے دور میں) حق کے مطابق فیصلہ کرنے والا نہیں دیکھا (تاریخ دمشق: ۵۹/۱۶۱، بسند صحیح)۔

منصب قضا کی آزادی:

(۹۷) حضرت عمران بن حصین بصرہ کے قاضی تھے۔ خلفاء کی رائے کے خلاف بے محابا فتویٰ دیتے تھے اور حضرت معاویہؓ کی رائے پر آزادانہ تنقید کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ اور حضرت معاویہؓ حج اور عمرہ ایک ساتھ کرنے (یعنی قران وتمتع) سے منع کرتے تھے۔ حضرت عمران بن حصین برملا کہتے تھے کہ یہ رائے غلط ہے۔ قرآن اور حدیث سے ثابت ہے کہ قران وتمتع جائز ہیں، جو اس کے خلاف کہتا ہے (اشارہ حضرت معاویہؓ کی طرف تھا) اپنی رائے سے کہتا ہے۔ قَالَ رَجُلٌ بِرَأْيِهِ بَعْدُ مَا شَاءَ۔ (صحیح بخاری: ۴۵۱۸، صحیح مسلم ۱۲۲۶)۔

(۹۸) یمامہ کے قاضی حضرت اسید بن ظہیر انصاریؓ امیر مدینہ مروانؒ کے ماتحت کام کرتے تھے۔ ان کا ایک فیصلہ حضرت معاویہؓ کے نزدیک صحیح نہیں تھا۔ معاملہ چھوٹا سا تھا، مگر امیر المومنین کا مطمح نظر شریعت اسلامیہ کا صحیح صحیح نفاذ تھا۔ اور ان کی نظر عدالتوں کے فیصلوں پر رہا کرتی تھی۔ صوبائی گورنر کو خط لکھا کہ تمہارے قاضی کا فیصلہ شریعت کے خلاف ہے، بدلواؤ۔ مروان نے دار الخلافہ کے مراسلے کی نقل حضرت اسید بن ظہیر کو اپنی ہدایت کے ساتھ بھیج دی۔ انہوں نے کہا کہ میں نے جو فیصلہ کیا ہے یہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فیصلہ تھا اور عہد صدیقی، فاروقی اور عہد عثمانی میں اسی کے مطابق فیصلے کیے گئے ہیں۔ حضرت معاویہؓ کو مروان نے قاضی کے جواب سے مطلع کیا۔ حضرت معاویہؓ کو پھر بھی اپنی رائے شریعت کے مطابق لگی اور وہ حضرت اسیدؓ کے جواب سے مطمئن نہیں ہوئے۔ لہٰذا لکھوایا کہ تم دونوں کے اوپر میں قاضی ہوں۔ جو میں کہوں اس کے مطابق فیصلہ کرو۔ مگر قاضی اسید بن ظہیرؓ نے فیصلہ بدلنے سے انکار کر دیا اور صاف کہہ دیا کہ جب تک میں قاضی رہوں گا اس مسئلے میں حضرت معاویہ کی رائے کو تسلیم نہیں کروں گا اور وہی فیصلہ کروں گا جو مجھے صحیح معلوم ہوگا۔ آخر حکومت کو قاضی کی بات ماننی پڑی۔ (مصنف عبدالرزاق: ۱۸۸۲۹ بسند صحیح، ومسند احمد: ۱۷۹۸۶، سنن نسائی کبریٰ: ۶۲۳۲)

محبت رسول:

(۹۹) حضرت عائشہؓ کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تبرکات محفوظ تھے۔ ایک مرتبہ مدینے حاضری کے موقعے پر ان کے پاس قاصد بھیجا اور درخواست کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی انبجانی (ایک قسم کی اونی) چادر اور موئے مبارک بھیج دیں۔ انہوں نے بھیج دیے، حضرت معاویہؓ نے چادر مبارک پہن لی اور موئے مبارک کو پانی میں ڈال کے وہ پانی پیا اور اس کو اپنے جسم پر لگایا (طبقات بن سعد، متمم الصحابہ۔ الطبقۃ الرابعۃ: ۱۱۲، بسند حسن)۔

تبرکات رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تدفین کی وصیت:

(۱۰۰) ابن سعد اور بلاذری نے حسن درجے کی سند سے روایت کیا ہے کہ آخری مرض میں آپ نے بتایا کہ ایک دن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وضو کرا رہا تھا کہ آپ نے مجھ سے کہا کہ میں تم کو اپنی قمیص دے دوں؟ میں نے عرض کیا: میرے ماں باپ آپ پر قربان، مرحمت فرما دیجیے۔ آپ نے مجھے اپنی قمیص پہنا دی۔ ایک دن آپ نے ناخون کاٹے تو میں نے وہ لے لیے اور ایک شیشی میں کر کے محفوظ کر لیے۔ سو جب میں مر جاؤں تو کفن میں سب سے اندر مجھے وہی کرتا پہنا دینا۔ اور ان مبارک ناخونوں کو باریک کاٹ کر میری آنکھ اور منہ ناک میں رکھ دینا۔ ان کی برکت سے ان شاء اللہ رحمت کا معاملہ ہوگا۔ (انساب: ۵/ ۱۵۳، الطبقات، متمم الصحابۃ: ۱۴۶، بسند حسن)۔

خشیت وخوف الٰہی اور رقت قلبی:

(۱۰۱) خوف الٰہی اور رقت قلبی کا یہ حال تھا کہ کوئی مؤثر واقعہ یا حدیث سنتے تو اتنا روتے کہ حاضرین کو ترس آنے لگتا۔ حضرت عبداللہ بن مبارک صحیح سند سے روایت کرتے ہیں کہ بعض شام کے لوگ حضرت ابو ہریرہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حدیث سنانے کی درخواست کی، انہوں نے ریا کاروں کے دردناک اور رسوا کن انجام کو بتلانے والی یہ حدیث سنانی شروع کی کہ؛ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ بندوں کے بارے میں فیصلے فرمائیں گے، تو سب سے پہلے تین لوگوں کو لایا جائے گا۔ پہلا ایک عالم ہوگا جس نے خوب علم پھیلایا ہوگا، دوسرا ایک مجاہد ہوگا، جس نے میدان میں خوب جوہر دکھائے ہوں گے۔ اور تیسرا ایک صاحب خیر فیاض ہوگا، جس نے نیکیوں کے ہر راستے میں خوب مال خرچ کیا ہوگا۔ ہر ایک سے الگ الگ سوال ہوگا کہ دنیا میں کیا کر کے آئے؟ سب جواب دیں گے کہ ساری زندگی ان نیک کاموں میں گذار دی۔ مگر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ جھوٹ بکتے ہو، تمہارا مقصود صرف تعریف اور شہرت تھی۔ تم بس مرتبہ چاہتے تھے، سو دنیا میں یہ چیزیں تم کو مل گئیں۔ پھر یہی وہ تین بدبخت ہوں گے جن کو سب سے پہلے جہنم رسید کیا جائے گا۔

مگر اس حدیث میں آئی وعید سے خوف کا یہ عالم تھا کہ حضرت ابو ہریرہؓ کہتے کہ ہاں میں حدیث سناتا ہوں، مگر حدیث شروع بھی نہ کر پاتے کہ خوف ودہشت سے ایک چیخ مارتے اور بے ہوش ہو جاتے، تین مرتبہ ایسا ہی ہوا۔ پھر روتے کانپتے یہ حدیث سنائی۔ شُفَیّ اصبحی اسی شامی وفد کے ساتھ حاضرِ مجلس تھے۔ وہ واپس آئے تو حضرت معاویہؓ کو یہ حدیث من وعن سنائی۔ ساتھ ہی حضرت ابو ہریرہؓ کا وہ حال بھی بتایا جو حدیث بیان کرتے وقت دیکھا تھا، حضرت معاویہؓ پر نہایت اثر ہوا، آبدیدہ ہو گئے۔ کہا: اللہ اور اس کے رسول کی بات برحق ہے۔ جب ان تین کا یہ انجام ہوگا تو باقیوں کا کیا ہوگا؟ پھر اپنے بارے میں خوف کرنے لگے اور شدید رقت طاری ہوئی۔ اتنا روئے، اتنا

روئے کہ حاضرین کوڈر لگنے لگا۔ پھر کچھ افاقہ ہوا، چہرے سے آنسو پونچھے اور یہ آیت تلاوت فرمائی:

مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا نُوَفِّ إِلَيْهِمْ أَعْمَالَهُمْ فِيهَا وَهُمْ فِيهَا لَا يُبْخَسُونَ۔ أُولَئِكَ الَّذِينَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ إِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوا فِيهَا وَبَاطِلٌ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (هود:۱۶)۔

جس کا مقصد دنیا کی زندگی اور اسی کی چمک دمک ہو تو ہم اس کو اس کے نیک اعمال کا پورا صلہ دنیا ہی میں دے دیں گے، اس میں ان کے ساتھ کچھ کمی نہیں ہوگی۔ یہ وہ (بدنصیب) لوگ ہیں جن کے لیے آخرت میں سوائے جہنم کے کچھ نہیں ہے۔ دنیا میں جو نیک کام کیے سب ضائع گئے، اور جو بھی اعمال وہ کیا کرتے تھے سب بے کار اور کالعدم کردیے گئے۔ (الزهد والرقائق لابن المبارك: ۴۶۹ سنن الترمذی: ۲۳۸۲، صحیح ابن حبان بترتیب ابن بلبان: ۱۳۶/۲، بسند صحیح)۔

(۱۰۲) محدث ابویعلیٰ نے حضرت محمد ابن سیرین سے حسن سند سے روایت کیا ہے کہ جب یزید کی ولی عہدی پر مشورہ چل رہا تھا، اس موقعے پر مروان نے مدینے کی اہم شخصیت حضرت عمرو بن حزم انصاری ؓ کو بھیجا تھا۔ انہوں نے نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

معاویہ! میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا ہے کہ جس کسی کو اللہ تعالیٰ حکومت واقتدار کی امانت سپرد کرتا ہے، اس سے قیامت کے دن ضرور سوال ہوگا کہ اس نے اس امانت کا کتنا خیال رکھا۔ معاویہ! میں تم کو محمد ﷺ کی امت کے بارے میں خدا کا خوف رکھنے کی نصیحت کرتا ہوں، سوچ لینا امت کو کس کے حوالے کر کے جاؤ گے اور اپنے رب کو کیا جواب دو گے؟

حضرت معاویہ ؓ یزید کی ولی عہدی کا فیصلہ کر چکے تھے، لیکن ان پر اس عبرت انگیز نصیحت کا گہرا اثر ہوا۔ روایت کے الفاظ ہیں کہ:

''وہ کانپ گئے، سانس پھولنے لگی، سرد موسم میں پسینہ چھوٹ گیا''۔

کچھ دیر بعد سکون ہوا تو پسینہ صاف کرتے ہوئے فرمایا: تم بڑے سچے خیر خواہ شخص ہو، اپنی رائے کے مطابق تم نے ہر کسی کی ناراضگی یا رضامندی سے بے پروا ہو کر حق کہا۔ پھر اس کے بعد حضرت معاویہ ؓ نے ان سے اپنی رائے بتائی کہ موجودہ لوگوں میں وہ یزید ہی کو اپنے بعد خلافت کے لیے زیادہ موزوں سمجھتے ہیں۔ (مسند ابویعلیٰ: ۷۱۴، ہیثمی نے اس کے راویوں کو صحیح کے راوی قرار دیا ہے، مجمع الزوائد: ۲۴۹/۷، حافظ ابن حجر نے بھی اس کے رجال کی توثیق کی ہے الاصابۃ، تذکرۂ عمرو بن حزم)۔

نہایت اچھی نماز پڑھتے تھے:

(۱۰۳) حضرت ابوالدرداء ؓ، جو ایک بڑے عالم صحابی ؓ تھے، کی شہادت ہے کہ میں نے معاویہ ؓ کی نماز سے زیادہ کسی کی نماز رسول اللہ ﷺ کی نماز سے مشابہ نہیں پائی۔ (مجمع الزوائد: ۱۵۹۲۰، بحوالہ طبرانی۔

ہیثمی نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے (معجم الصحابہ للبغوی: ۵/ ۳۶۷، بسند صحیح)۔

اتباع سنت کی شان:

(۱۰۴) ایک عالم ربانی کی طرح ایک ایک عمل اور ادا میں اتباع سنت کا اہتمام تھا۔ سفر حج میں کعبہ میں داخل ہوئے تو فکر کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فتح مکہ کے موقع پر جب کعبے کے اندر داخل ہوئے تھے تو کہاں نماز ادا فرمائی تھی۔ معلوم تھا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ اُس وقت کعبے میں گئے تھے۔ کسی کو بھیجا کہ جاؤ حضرت عبداللہ بن عمر کو بلا لاؤ۔ وہ تشریف لائے۔ انہوں نے بتایا کہ میں جب پہنچا تھا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واپس ہو رہے تھے۔ بلالؓ شروع سے ساتھ تھے، انہوں نے بتلایا تھا کہ اگلے دونوں ستونوں کے درمیان دیوار سے دو گز پیچھے ہٹ کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دوگانہ ادا فرمایا ہے۔ حضرت معاویہؓ نے اسی جگہ دو رکعتیں ادا فرمائیں (مسند احمد: ۲۳۹۰۹، بسند صحیح۔ اخبار مکہ: ۱/ ۲۷۱)۔

(۱۰۵) ایک مرتبہ خبر ملی کہ کچھ نیک صالح لوگ فجر کی نماز کے بعد مسجد کے ایک گوشے میں جمع ہو کر ذکر کرتے ہیں۔ امیر المومنین فوراً نکلے اور ایک خاص انداز میں سبک گامی کرتے ہوئے ان کے پاس آئے۔ اور کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی ایک مرتبہ پتہ چلا کہ مسجد میں ذکر کرنے والوں کا ایک حلقہ یادِ الٰہی میں مشغول ہے، تو آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بالکل اسی انداز میں تیز تیز ان کے پاس آئے جس انداز سے اِس وقت میں آیا ہوں۔ اور ان کو خوش خبری دی کہ اللہ تعالیٰ اپنے ملائکہ کے سامنے تم پر فخر کر رہا ہے۔ (المعجم الکبیر: ۱۹/ ۳۴۰)۔ اس کے بعد حضرت معاویہؓ نے ان سے پوچھا: کیا اللہ کو گواہ بنا کر کہہ سکتے ہو تم صرف اسی مقصد سے یہاں بیٹھے ہو؟ انہوں نے کہا اللہ کی قسم، ہم اللہ کا ذکر اور اس کی حمد وثنا ہی کر رہے ہیں۔ پھر فرمایا: میں نے جو تم سے قسم لی وہ اس لیے نہیں کہ تم پر جھوٹ کا شبہہ تھا، بلکہ ہوا یوں کہ اس ذاکرین کے حلقہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اسی طرح اور انہی الفاظ میں قسم لی، اور پھر یوں ہی فرمایا کہ ''میں نے جو تم سے قسم لی وہ اس لیے نہیں کہ تم پر جھوٹ کا شبہہ تھا'' بلکہ ابھی جبریل آئے اور مجھے خبر دی کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں کے سامنے تمہارا تذکرہ کر کے تم پر فخر فرما رہا ہے (صحیح مسلم: ۲۷۰۱)۔ اس طرح ایک ایک ادا میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع ومحاکات فرماتے۔

تواضع وانکسار:

(۱۰۶) مجلس میں تشریف لاتے تو پسند نہیں تھا کہ کوئی احترام میں کھڑا ہو جائے۔ ایک مرتبہ کسی مجلس میں پہنچے۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور عبداللہ بن عامر پہلے سے موجود تھے۔ عبداللہ بن عامر اداباً کھڑے ہو گئے۔ آپ نے فرمایا: بیٹھ جاؤ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ارشاد فرماتے سنا ہے کہ جس کو یہ اچھا لگے کہ لوگ اس کے لیے

کھڑے رہا کریں تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے (سنن ابی داود: ۵۲۲۹، مسند احمد: ۱۶۸۳۰ بسند صحیح)۔

نصیحت قبول کرنا:

(۱۰۷) ایک مرتبہ حضرت معاویہؓ ممبر پر آکر بیٹھے۔ ابو مسلم خولانی نے نصیحت کرتے ہوئے کہا: ایک دن آپ کو قبر میں جانا ہے۔ اور وہاں صرف اچھے اعمال ہی کام آئیں گے۔ آپ یہ خیال نہ کریں کہ خلافت کی حقیقت صرف بیت المال میں مال جمع کرنا اور لوگوں میں تقسیم کرنا ہے۔ بلکہ خلافت کی حقیقت ہے حق پر عمل، عدل وانصاف کی بات کرنا اور لوگوں کو اللہ کے راستے پر چلانا۔ معاویہ! کسی نہر کا اگر سرچشمہ صاف پانی دے تو راستے کے کسی وقتی گدلے پن سے کچھ نقصان نہیں۔ پھر سرچشمے سے صاف پانی آجائے گا۔ اور اس امت کا سرچشمہ آپ ہیں، آپ اگر حق پر قائم رہیں گے تو امت حق پر قائم رہے گی۔ حضرت معاویہؓ بالکل ساکت، ان کی نصیحت بغور سنتے رہے۔ جب وہ خاموش ہوئے تو حضرت معاویہؓ نے ان کو دعا دی: یرحمك الله، یرحمك الله۔ اللہ آپ پر رحمت کرے۔ اللہ آپ پر رحمت کرے۔ (الزہد لاحمد بن حنبل: ۱۷۳۱، بسند صحیح۔ الراوی یونس الہرم ھو یونس بن میسرہ بن حلبس)۔

حضرت معاویہؓ صحابہؓ کی نظر میں:

(۱۰۸) حضرت ابن عباسؓ اس دور کے سب سے بڑے علماء میں تھے۔ حَبر الامۃ لقب پایا۔ ایک موقعے پر ان کے شاگرد عکرمہ نے حضرت معاویہؓ کو دیکھا کہ انہوں نے ایک ہی رکعت وتر پڑھی۔ انہوں نے اس کا حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے تعجب کے ساتھ اظہار کیا۔ حضرت ابن عباس نے کہا: معاویہ نے صحیح کیا، وہ صحابی ہیں، انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی صحبت اٹھائی ہے، وہ یقیناً فقیہ شخص ہیں۔ اور مزید یہ بھی کہا کہ ہم میں سے کوئی معاویہ سے زیادہ علم والا نہیں۔ (صحیح بخاری:: ۳۷۶۴، ۳۷۶۵۔ مسند الشافعی: ۸۶، مصنف عبد الرزاق: ۴۶۴۱)۔

(۱۰۹) امام عبدالرزاق صنعانی اور ابو بکر الخلال وغیرہ نے صحیح سند سے روایت کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہتے تھے کہ میں نے معاویہ سے زیادہ حکم رانی کے لائق کسی کو نہیں پایا۔ نہایت وسیع القلب اور کشادہ اخلاق کے حامل تھے۔ فلاں ـــ کی طرح تنگ دل وسخت خو نہیں تھے (مصنف عبدالرزاق: ۲۰۹۸۵، السنۃ للخلال: ۲/۴۴۰، بسند صحیح)۔

(۱۱۰) حضرت عمرؓ اپنے تمام والیوں اور قائدین میں حضرت معاویہؓ کو فوقیت دیتے تھے، فرمایا کرتے تھے کہ: تعجب ہے تم لوگ قیصر وکسریٰ کے ''دھاء'' یعنی سیاسی زیرکی پر حیرت کرتے ہو، معاویہ کو نہیں دیکھتے؟ (طبری: ۵/۳۳۰، بسند صحیح۔ تاریخ الاسلام: ۴/۳۱۱)۔

(۱۱۱) حضرت سعد بن ابی وقاصؓ عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں۔ حضرت معاویہ کے عدل وانصاف کے متعلق فرماتے ہیں:

ما رأيت أحدًا بعد عثمان أقضىٰ بحق من صاحب هذا الباب يعني معاوية۔
(تاریخ دمشق: ۵۹/۱۶۱، بسند صحیح)

میں نے عثمان کے بعد معاویہ سے زیادہ حق فیصلہ کرنے والا نہیں دیکھا۔

(۱۱۲) حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے تھے:

ما رأيت بعد رسول الله ﷺ أسود من معاوية، فقيل: ولا أبوك؟ قال: أبي عمر رحمه الله خير من معاوية، وكان معاوية أسود منه (السنة للخلال: ۶۸۰، بسند حسن)۔

میں نے قیادت وامارت کی صفت میں معاویہ سے بڑھ کر کوئی نہیں دیکھا۔ کسی نے دریافت کیا: آپ کے والد ماجد سے بھی زیادہ؟ فرمایا: میرے والد ماجد معاویہ سے افضل تھے، مگر سرداری معاویہ میں زیادہ تھی۔

مراجع

* قرآن مجید
* صحیح بخاری، ترقیم: محمد فؤاد عبدالباقی۔
* صحیح مسلم، ترقیم: محمد فؤاد عبدالباقی۔
* سنن ابوداؤد، ترقیم: محمد محی الدین عبدالحمید۔
* سنن ترمذی، ترقیم: بشار عواد معروف۔
* سنن نسائی، ترقیم: عبدالفتاح أبی غدہ۔
* سنن ابن ماجہ، ترقیم: محمد فؤاد عبدالباقی۔
* الآحاد والمثانی لابن أبی عاصم، دارالرایۃ، الریاض۔
* اتحاف الخیرۃ المھرۃ للبوصیری، دارالوطن للنشر، الریاض۔
* إتحاف المھرۃ لابن حجر، مرکز خدمۃ السنۃ والسیرۃ، المدینۃ المنورۃ۔
* الاخبار الطوال لابی حنیفۃ الدینوری، داراحیاء الکتب العربی۔
* اخبار القضاۃ لمحمد بن خلف المعروف بوکیع، المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ بیروت۔
* اخبار مکہ للازرقی، دارالاندلس للنشر، بیروت۔
* أخبار النحویین البصریین للسیرافی، مصطفی البابی الحلبی۔
* الادارۃ فی العصر الاموی لنجدۃ خمّاش، دارالفکر، دمشق۔
* ادب الکتاب لابی بکر محمد بن یحییٰ الصولی، المکتبۃ العربیۃ، بغداد۔
* الادب المفرد۔ دارالبشائر الاسلامیۃ۔
* ازالۃ الخفاء للمحدث الشاہ ولی اللہ الدھلوی، دیوبند

* اسد الغابۃ، عزالدین بن الاثیر علی بن محمد الجزری، المکتبۃ العلمیۃ، بیروت۔
* الاستیعاب لابن عبدالبر، دارالجیل، بیروت۔
* اسمیٰ المطالب فی سیرۃ علی ابن ابی طالب لمحمد الصلابی، مکتبۃ الصحابۃ، الشارقۃ۔
* الاصابہ لابن حجر العسقلانی، دارالکتب العلمیۃ، بیروت۔
* اطلس الخلیفۃ عثمان لسامی بن عبداللہ بن احمد المغلوث، مکتبۃ العبیکان، الریاض۔
* فن الحرب الاسلامی لبسام العلی، دارالفکر، بیروت۔
* اعلام الموقعین عن رب العالمین لابن القیم الجوزیۃ، دارالکتب العلمیۃ، بیروت۔
* اعیان الشیعہ للسید محسن الامین العاملی، دارالتعارف، بیروت۔
* اکمال المعلم للقاضی عیاض، طبعہ دارالوفاء مصر ۱۹۹۸ء، دارالوفاء، مصر۔
* الامبراطوریۃ البیزنطیۃ، نارمن بینز، لجنۃ التالیف والتربیۃ، القاھرۃ۔
* الاموال للقاسم بن سلام، دارالفکر، بیروت۔
* الامویون والبیزنطیون لابراھیم العدوی، مکتبۃ النجلو المصریۃ۔
* اَنساب الاشراف للبلاذری، دارالفکر، بیروت۔
* البحرین فی صدرالاسلام لعبدالرحمٰن العانی، الدارالعربیۃ للموسوعات۔
* البدایہ والنہایہ لابن کثیر، داراحیاء التراث، بیروت۔
* بحوث فی تاریخ الشام، محمد عدنان بخیت، محمد یونس العبادی، مکتبۃ المھتدین، عمان۔
* البیان المغرب لابن عذاری المراکشی، دارالثقافۃ، بیروت۔
* تاریخ ابن ابی خیثمہ، مطبوعہ مکتبۃ الفاروق الحدیثۃ۔ قاہرہ۔
* تاریخ ابن خلدون، دارالفکر، بیروت۔
* تاریخ ابی زرعۃ الدمشقی، مجمع اللغۃ العربیۃ، دمشق۔
* تاریخ الاسلام للذھبی، دارالکتاب العربی، بیروت۔
* تاریخ الخلفاء الراشدین لجلال الدین عبدالرحمٰن بن ابی بکر السیوطی، مکتبۃ نزار مصطفیٰ الباز۔
* تاریخ خلیفہ بن خیاط، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت۔
* تاریخ دمشق للحافظ ابی القاسم علی بن الحسن الشافعی المعروف بابن عساکر، دارالفکر، بیروت۔

* التاریخ صغیر للبخاری، دار الوعی، القاہرۃ۔
* التاریخ الکبیر للبخاری، دائرۃ المعارف العثمانیۃ، حیدر آباد۔
* تاریخ الطبری لابی جعفر محمد بن جریر الطبری، دار التراث، بیروت۔
* التاریخ العربی والمؤرخون لشاکر مصطفیٰ، دار العلم للملایین، بیروت۔
* تاریخ القضاء فی الاسلام لمحمد الزحیلی، دار الفکر، دمشق۔
* تاریخ المدینہ لابن شبہ، حبیب محمد احمد، جدۃ۔
* تاریخ المغرب الکبیر لمحمد علی دبوز۔ مؤسسۃ تاوالت الثقافیۃ، لیبیا۔
* تاریخ مکۃ المشرفۃ والمسجد الحرام والمدینۃ الشریفۃ والقبر الشریف، لمحمد بن أحمد بن الضیاء، دار الکتب العلمیۃ، بیروت۔
* تاریخ واسط لبحشل، عالم الکتب، بیروت۔
* تاریخ یحییٰ بن معین، رواۃ الدوری، مرکز البحث، مکۃ۔
* تاریخ الیعقوبی، لاحمد بن ابی یعقوب، دار صادر، بیروت۔
* تاریخ الیمامہ فی صدر الاسلام، لعبد اللہ ابراہیم العسکر، جداول للنشر، الکویت۔
* التحفۃ اللطیفۃ فی تاریخ المدینۃ الشریفۃ، لشمس الدین السخاوی، دار الکتب العلمیۃ، بیروت۔
* تحقیق مواقف الصحابۃ فی الفتنۃ لمحمد امحزون، دار السلام للنشر والتوزیع، القاھرۃ۔
* التطور الاقتصادی فی العصر الاموی، عصام عیدروس۔
* تعریف بالاماکن الواردۃ فی البدایۃ والنہایۃ، (المکتبۃ الشاملۃ)
* تفسیر ابن کثیر، دار طیبۃ، المدینۃ المنورۃ۔
* تقریب التہذیب لابن حجر العسقلانی، دار ابن الجوزی، الدمام۔
* تنظیمات الجیش فی العصر الاموی، لخالد الجنابی، وزارۃ الثقافۃ والاعلام، دولۃ العراق۔
* تہذیب التہذیب لابن حجر العسقلانی، دائرۃ المعارف النظامیۃ، حیدر آباد۔
* تہذیب الکمال فی اسماء الرجال، للحافظ جمال الدین ابی الحجاج یوسف المزی، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت۔
* جامع الاصول، لابن الاثیر ابی الحسن علی بن محمد الجزری، مکتبۃ الحلوانی، دمشق۔

* جامع التحصیل فی أحکام المراسیل للحافظ صلاح الدین ابی سعید بن خلیل العلائی، عالم الکتب، بیروت۔
* جامع المسانید والسنن، لابن کثیر، دار خضر، بیروت۔
* الجرح والتعدیل، لابن أبی حاتم، دار احیاء التراث العربی، بیروت۔
* جمہرۃ انساب العرب، لابی محمد علی بن احمد بن سعید حزم الاندلسی، دار الکتب العلمیۃ، بیروت۔
* الحدود الاسلامیہ البیز نطیہ، لفتحی عثمان، الدار القومیۃ، القاھرۃ۔
* حرکۃ الخوارج للطیفۃ البکّای، ط دار الطلیعۃ بیروت ۲۰۰۱ء۔
* حضرت معاویہ اور تاریخی حقائق، از حضرت مولانا محمد تقی عثمانی، مکتبہ معارف القرآن، کراچی۔
* حلم معاویۃ، لابن ابی الدنیا، دار البشائر۔
* حلیۃ الاولیاء، للامام الحافظ ابی نعیم الاصبھانی، دار الفکر، بیروت۔
* الخراج منذ الفتح الاسلامی حتیٰ اواخر القرن الثالث الہجری، لغیداء خزنۃ کاتبی، مرکز دراسات الوحدۃ، بیروت۔
* خطط البصرۃ۔ للدکتور صالح العلی، المجمع العلمی العراقی۔
* خطط مصر للمقریزی، دار الکتب العلمیۃ۔
* خلافت اموی خلافت راشدہ کے پس منظر میں، ڈاکٹر یسین مظہر صدیقی۔
* خلافۃ علی بن ابی طالب، عبدالحمید الفقیہی، مکتبۃ الرشد، الریاض۔
* خلافت وملوکیت، از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور۔
* دلائل النبوۃ، امام بیہقی، دار الکتب العلمیۃ، بیروت۔
* دول الاسلام: ذہبی۔ دار صادر ۱۹۹۹ء۔
* دیوان الجند، عبدالعزیز عبداللہ السلومی، مکتبۃ الطالب الجامعی، مکۃ المکرمۃ۔
* الذریعۃ الیٰ تصانیف الشیعۃ، للشیخ آغا بزرگ طہرانی، دار الاضواء، بیروت۔
* رجال النجاشی، لاحمد بن علی النجاشی، موسسۃ النشر، قم۔
* رفع الاصر، لابن حجر العسقلانی، مکتبۃ الخانجی، القاھرۃ۔
* الروض الانف، لابی القاسم عبدالرحمن بن عبداللہ السھیلی، دار احیاء التراث العربی۔
* الزھد والرقائق، لعبداللہ بن المبارک المروزی، دار الکتب العلمیۃ۔

* الزہد، لاحمد بن حنبل، دار الکتب العلمیۃ۔
* زہر الآداب وثمر الالباب، لابی اسحاق الحصری القیروانی، دار الجیل، بیروت۔
* السنۃ، لابی بکر احمد بن عمرو بن ابی عاصم، المکتبۃ الاسلامی، بیروت۔
* السنۃ، لابی بکر احمد بن محمد الخلال، دار الرأیۃ۔ الریاض۔
* السنۃ، لعبد اللہ بن احمد، دار ابن القیم، الدمام۔
* السنۃ، لابی عبد اللہ محمد بن نصر المروزی، مؤسسۃ الکتب الثقافیۃ، بیروت۔
* سنن الدارقطنی، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت۔
* سنن سعید بن منصور، دار الکتب العلمیۃ، بیروت۔
* السنن الکبری للنسائی، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت۔
* سوالات البرقانی للدارقطنی، لاحمد بن محمد ابوبکر المعروف بالبرقانی، کتب خانہ جمیلی، لاہور۔
* السیرۃ لابن ہشام، شرکۃ الطباعۃ الفنیۃ، بیروت۔
* السیرۃ النبویۃ، للدکتور مہدی رزق اللہ احمد، مرکز الملک فیصل، الریاض۔
* سیرت النبی، دار المصنفین ۲۰۱۹ء۔
* سیر اعلام النبلاء، لشمس الدین محمد بن احمد بن عثمان الذہبی، مؤسسۃ الرسالہ، بیروت۔
* شرح الزرقانی لمحمد بن عبد الباقی بن یوسف الزرقانی، دار الکتب العلمیۃ، بیروت۔
* شرح الشفا، للقاضی عیاض، دار الکتب العلمیۃ، بیروت۔
* شرح مشکل الآثار، لابی جعفر الطحاوی، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت۔
* شرح معانی الآثار، لابی جعفر الطحاوی، عالم الکتب، مصر۔
* شرح النووی علی صحیح مسلم، لابی زکریا یحیٰی بن شرف النووی، دار احیاء التراث العربی، بیروت۔
* شرف اصحاب الحدیث، للخطیب البغدادی، دار احیاء السنۃ، انقرۃ۔
* الشعر والشعراء لابن قتیبۃ الدینوری، دار الحدیث، انقرۃ۔
* الشریعۃ، لابی بکر محمد بن الحسین الآجری، دار الوطن، الریاض۔
* صبح الاعشیٰ، للشیخ ابی العباس احمد القلقشندی، دار الکتب العلمیۃ۔
* صحیح ابن حبان بترتیب ابن بلبان، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت۔

* صحیح ابن خزیمہ، المکتب الاسلامی، بیروت۔
* الضعفاء، لابی جعفر محمد بن عمرو العقیلی، دار الکتب العلمیۃ، بیروت۔
* الطبقات الکبریٰ لابن سعد، دار الکتب العلمیۃ، بیروت۔
* الطبقات الکبریٰ، متمم الصحابۃ، الطبقۃ الرابعۃ، مکتبۃ الصدیق، طائف، ۱۴۱۶ھ۔
* الطبقات الکبری، متمم الصحابۃ، الطبقۃ الخامسۃ، مکتبۃ الصدیق، طائف، ۱۴۱۶ھ۔
* طبقات النحویین، لابی بکر محمد بن الحسن الزبیدی، دار المعارف القاہرۃ، مصر۔
* عبداللہ بن سبا وأثرہ فی أحداث الفتنۃ فی صدر الاسلام، لسلیمان بن فہد العودۃ، دار الطیبۃ المدینۃ المنورۃ۔
* عصر الخلافۃ الراشدۃ، لاکرم ضیاء العمری، مکتبۃ العبیکان الریاض۔
* العقد الفرید، لابی عمر احمد بن محمد بن عبدربہ، دار الکتب العلمیۃ، بیروت۔
* علل الحدیث، لابی محمد عبدالرحمن بن أبی حاتم، مطابع الحمیدی، الریاض۔
* العلل مع شرح ابن رجب، لعبدالرحمٰن بن احمد بن رجب البغدادی، مکتبۃ المنار، اردن۔
* العلل ومعرفۃ الرجال، لاحمد بن حنبل، درایۃ عبداللہ، دار الخانی، الریاض۔
* اسمیٰ المطالب فی سیرۃ علی بن ابی طالب، لعلی محمد الصلابی، مکتبۃ الصحابۃ، الشارقۃ۔
* عمدۃ القاری، لبدر الدین العینی، دار إحیاء التراث العربی، بیروت۔
* عمرو بن العاص، لعباس محمود العقاد، شرکۃ نہضۃ مصر۔
* العواصم من القواصم، لابی بکر بن محمد بن العربی، درالجیل، بیروت۔
* الفاروق، از علامہ شبلی نعمانی، دار المصنفین، اعظم گڑھ۔
* فتح الباری، لابن حجر العسقلانی، دار المعرفۃ، بیروت۔
* فتنۃ مقتل عثمانؓ، للدکتور محمد بن عبداللہ الغبان، الجامعۃ الاسلامیۃ المدینۃ المنورۃ۔
* الفتن، لنعیم بن حماد المروزی، مکتبۃ التوحید القاہرۃ۔
* فتح العرب للمغرب، مکتبۃ الثقافۃ الدینیۃ، الاسکندریۃ۔
* عصر الخلافۃ الراشدہ، الفتوحات والانجازات السیاسیۃ، محمد سہیل طقوش، دار النفائس بیروت۔
* الفتوح، لابی محمد احمد بن اعثم الکوفی، دار الاضواء بیروت۔
* فتوح البلدان، لاحمد بن یحیٰ البلاذری، مکتبۃ الھلال، بیروت۔

* فتوح مصر والمغرب لابن عبدالحکم، مکتبۃ الثقافۃ الدینیۃ، الاسکندریۃ۔
* الفخری فی الآداب السلطانیۃ، لابن الطقطقی دار القلم العربی، بیروت ۱۹۹۷ء، دار المعرفۃ، بیروت۔
* فضائل الصحابۃ، لاحمد بن محمد بن حنبل، موسسۃ الرسالۃ، بیروت۔
* الفہرست، لابن الندیم، دار المعرفۃ، بیروت۔
* قادۃ فتح السند وافغانستان لمحمود شیت خطاب، دار ابن حزم، بیروت۔
* قطف الازہار المتناثرۃ للسیوطی، المکتبۃ الاسلامی، بیروت۔
* القیادۃ العسکریۃ فی عہد الرسول، للدکتور عبداللہ محمد الرشید، دار القلم، دمشق۔
* الکامل فی التاریخ، لابن الاثیر الجزری، دار الکتاب العربی، بیروت۔
* الکامل فی ضعفاء الرجال، لابی احمد بن عدیؒ الجرجانی، دار الکتب العملیۃ بیروت۔
* کتاب القضاۃ، لابی عمر محمد بن یوسف بن یعقوب الکندی المصری، دار الکتب العملیۃ بیروت۔
* رفع الاصر عن قضاۃ مصر، لابن حجر العسقلانی، مکتبۃ الخانجی، القاھرۃ۔
* الکنی والاسماء، للدولابی، دار ابن حزم بیروت۔
* الکنیٰ والالقاب، للشیخ عباس القمی، موسسۃ النشر الاسلامی، قم۔
* لسان المیزان، لابن حجر العسقلانی، دار البشائر الاسلامیۃ دمشق۔
* مجمع الزوائد، ابی الحسن نور الدین علی بن ابی بکر بن سلیمان الھیثمی، مکتبۃ القدس القاھرۃ۔
* مجموع الفتاوی، تقیؒ الدین ابو العباس احمد بن عبدالحلیم بن تیمیۃ الحرانی، مجمع الملک فھد المدینۃ۔
* مجموعۃ الوثائق السیاسیہ، از ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم، دار النفائس بیروت۔
* المحاسن والمساویٔ، لابراھیم بن محمد البیھقی، دار صادر بیروت۔
* مختصر تاریخ البصرۃ، لعلی ظریف الاعظمی، مکتبۃ الثقافۃ الدینیۃ الاسکندریۃ۔
* المحتضرین لابن ابی الدنیا، دار ابن حزم، بیروت۔
* المراسیل لابن ابی حاتم، موسسۃ الرسالۃ، بیروت۔
* المرتضی مجلس تحقیقات ونشریات، لکھنؤ۔
* مروج الذہب، لابی الحسن علی بن الحسین بن علی المسعودی، المکتبۃ العصریۃ، بیروت۔
* مرویات خلافۃ معاویہ، خالد بن محمد الغیث، دار الاندلس الخضراء، جدۃ۔

* مسائل الامام احمد روایۃ ابنہ صالح، الدار العلمیۃ، الھند
* مسالک الممالک، لابی اسحاق ابراھیم بن محمد الاصطخری، دار صادر، بیروت۔
* مستدرک حاکم، دار الکتب العلمیۃ، بیروت۔
* مسند ابی داود الطیالسی، دار ھجر، بیروت۔
* مسند ابی یعلی، دار المامون للتراث۔
* مسند احمد، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت۔
* مسند اسحاق بن راھویہ، مکتبۃ الایمان، المدینۃ المنورۃ۔
* مسند بزار، مکتبۃ العلوم والحکم المدینۃ المنورۃ۔
* مسند الشاشی، مکتبۃ العلوم والحکم المدینۃ المنورۃ۔
* مسند الشامیین للطبرانی، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت۔
* مشاھیر علماء الامصار لابی حاتم البستی، دار الوفاء، مصر۔
* مصنف ابن ابی شیبہ، مکتبۃ الدار، مدینہ طیبہ۔
* مصنف عبد الرزاق، المکتب الاسلامی، بیروت۔
* معاویہ بن ابی سفیان شحاتہ محمد صقر، دار الخلفاء الراشدین، الاسکندریۃ۔
* معاویہ لعلی الصلابی، دار الاندلس مصر۔
* معجم اماکن الفتوح، لصلاح الدین المنجد، دار المقتبس، مصر۔
* المعجم الاوسط، للطبرانی، دار الحرمین، القاھرۃ۔
* معجم الصحابہ للبغوی۔ مکتبہ دار البیان، کویت۔
* المعجم الصغیر، للامام الطبرانی، المکتب الاسلامی، کویت۔
* معجم کبیر، للامام الطبرانی، مکتبۃ ابن تیمیۃ، القاھرۃ۔
* معرفۃ الصحابۃ، لابی عبد اللہ بن مندۃ العبدی، جامعۃ الامارات العربیۃ المتحدۃ۔
* معرفۃ الصحابۃ، لابی نعیم الاصبھانی، دار الوطن الریاض۔
* معرفۃ القراء، للذھبی، دار الکتب العلمیۃ، بیروت۔
* المعرفۃ والتاریخ لیعقوب بن سفیان الفسوی، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت۔

* المغنی فی الضعفاء للذھبی، إدارۃ إحیاء التراث الاسلامی، قطر۔
* المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام، للدکتور جواد علی، دار الساقی، مصر۔
* مناقب امیر المؤمنین عمر بن الخطاب، لابن الجوزی، دار ابن خلدون مصر۔
* المنتخب من تاریخ المنبجی، لاغابیوس بن قسطنطین المنبجی، دار المنصور طرابلس، لبنان۔
* منہاج السنۃ، لابن تیمیۃ، جامعۃ الامام محمد الریاض۔
* المواعظ والاعتبار بذکر الخطط والآثار، للمقریزی، دار الکتب العلمیۃ، بیروت۔
* موافقۃ الخبر الخبر فی تخریج احادیث المختصر لابن حجر، مکتبۃ الرشد، الریاض۔
* المواہب اللدنیۃ مع شرح الزرقانی، للعلامۃ محمد بن عبد الباقی الزرقانی، دار الکتب العلمیۃ، بیروت۔
* الموقظۃ، للذھبی، مکتبۃ المطبوعات الاسلامیۃ، حلب۔
* موطا مالک، دار إحیاء التراث العربی، بیروت۔
* میزان الاعتدال، للذھبی، دار المعرفۃ، بیروت۔
* النجوم الزاہرۃ لیوسف بن تغری بردی، دار الکتب، مصر۔
* نسب قریش لمصعب بن عبد اللہ الزبیری، دار المعارف، القاھرۃ۔
* النفقۃ علی العیال لابن ابی الدنیا، دار ابن القیم، الدمام۔
* النکت علیٰ کتاب ابن الصلاح، لابن حجر العسقلانی، الجامعۃ الاسلامیۃ المدینۃ المنورۃ۔
* نہایۃ الارب، لشھاب الدین احمد بن عبد الوھاب النویری، دار الکتب والوثائق القومیۃ، القاھرۃ۔
* واقعہ کربلا اور اس کا پس منظر، حضرت مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی، مکتبہ الفرقان، لکھنؤ۔
* کتاب الوزراء والکتاب، لابی عبد اللہ محمد بن عبدوس الجھشیاری، مصطفی بابی الحلبی، مصر۔
* وقعۃ صفین، لنصر بن مزاحم المنقری، المؤسسۃ العربیۃ الحدیثۃ، القاھرۃ۔
* الولایۃ علی البلدان، عبد العزیز بن ابراھیم العمری، دار اشبیلیۃ، الریاض۔

انگریزی مآخذ:

* Naval Power and Trade in The Mediterranean, Archibald Lewis, Princeton University, New Jersey۔
* The Chronicle of the Theophanes, University of pencylvania press Philadelphia.

❋ A History of the later Roman Empire, By Bury, Macmillan and Company, Newyork.

❋ Encyclo Pedia Brittanica (Web Edition).

❋ The Caliphs and Their Non-Muslim Subjects, Oxford University Press, London.